Scanned by TapScanner

حسن کی صورت حال

خالی.....جگہیں.....پُر.....کرو

مرزا اطہر بیگ

سانجھ

"To write, "to form," where no forms hold sway, an absent meaning. Absent meaning (and not the absence of meaning or a potential or latent but lacking sense). To write is perhaps to bring to the surface something like absent meaning, to welcome the passive pressure which is not yet what we call thought, for it is already the disastrous ruin of thought."

(The Writing of the Disaster)

Maurice Blanchot

حسن کی صورت حال

خالی......جگہیں......پُر......کرو

مرزا اطہر بیگ

سانجھ

"To write, "to form," where no forms hold sway, an absent meaning. Absent meaning (and not the absence of meaning or a potential or latent but lacking sense). To write is perhaps to bring to the surface something like absent meaning, to welcome the passive pressure which is not yet what we call thought, for it is already the disastrous ruin of thought."

(The Writing of the Disaster)

Maurice Blanchot

صارم اور باسم کے لیے

حسن کی صورت حال
خالی جگہیں پُر کرو — ناول — مرزا اطہر بیگ

اشاعت اوّل : 2014ء
اشاعت دوم : 2015ء
ٹائٹل : صارم اطہر بیگ
قیمت : 1000

اس ناول کے تمام کردار، واقعات، مقامات، حوالہ جات (کتب و تاریخ) سب فرضی ہیں۔
کسی سطح پر کسی حقیقی صورتِ حال سے کسی قسم کی کوئی بھی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔

Hassan ki soort-e-hal
Khali......jaghein....pur...karo
(*Urdu* Novel by *Mirza At'her Baig*)

Printed by:
M H N Communication, Lahore.

Price:
In Pakistan Rs. 1000

Published by:
سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-107-3

تشکر

میں اپنے عزیز دوست عارف وقار کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ زبان و بیان کے پیچیدہ مسائل کے حوالے سے اُن کی ہمدردانہ رہنمائی مجھے ہمیشہ حاصل رہی ہے۔

فہرست

(1)

اُچٹتے خوف کی داستان

حسن رضا ظہیر کو وہ واقعہ عمر بھر کی ''اُچٹتی منظر بینی'' کے بعد پیش آیا۔

اِس بے ہنگم خود ساختہ ترکیب کا الزام اپنے سر لیتے ہوئے اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ حسن کو اُچٹتی منظر بینی کی عادت کب کیوں اور کیسے پڑی تو اِس کے لیے ہمیں حسن کی زندگی میں کچھ دیر اُس کے ساتھ چلنا ہوگا...... بلکہ زیادہ اہم یہ کہ ہمیں اُس کے ساتھ دیکھنا ہوگا کیونکہ معاملہ سارا دیکھنے کا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ یہ کیسا دیکھنا ہے، گو اس بیان میں ہمیں اختصار سے کام لینا ہوگا۔

حسن رضا ظہیر نے مالیاتی امور سے متعلق تعلیم حاصل کرنے کے بعد چوبیس سال کی عمر میں شہر سے پندرہ کلو میٹر باہر واقع ایک کیمیکل فیکٹری میں اکاؤنٹینٹ کی ملازمت حاصل کی۔ یہ ایک اچھی ملازمت تھی، مالی اعتبار سے معقول، تابعداری، اچھی کارکردگی اور محنت کا صلہ اچھی سالانہ ترقی کی صورت میں ملتا تھا۔ دوپہر کا کھانا مفت تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر صبح کمپنی کی گاڑی اپنے ملازمین کو شہر کے مختلف مقامات سے اٹھا کر فیکٹری لے جاتی تھی اور شام واپس گھر چھوڑ جاتی تھی۔ حسن ہمیشہ گاڑی ـــــ جو اصل میں ایک بڑی وین تھی جس میں بیس افراد سوار ہو سکتے تھے ـــــ کے درمیانی حصے میں کھڑکی کے قریب بیٹھتا تھا۔ بیٹھنے کے چند لمحے بعد ہی اس کی گردن دائیں طرف مڑ جاتی تھی اور پھر گاڑی چل پڑنے کے ساتھ ہی ''اُچٹتی منظر بینی'' کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ محلے کے مانوس مکانات، دکانیں پھر دوسرے علاقے، بیکریاں، ورکشاپیں، حجاموں کی دکانیں، سکول، کالج، ہوٹل، کھوکھے، چوک،

گلیاں، بازار، دفتری عمارتیں، پٹرول پمپ، پل، دریا، ریلوے لائن، مضافاتی بھورے میلے کچیلے علاقے، کھیت، دیہاتی کچے پکے مکان، ڈیرے، اکھاڑے، نہروں کے کھالے، بے شمار اقسام کے درخت، فیکٹریاں...... اور پھر نظر کے ان ساکن اہداف کے علاوہ متحرک اجسام، پیدل افراد، جانور، گاڑیاں، سائیکل، موٹر سائیکل، رکشے، کاریں، بس، ٹریکٹر، ٹرک...... فیکٹری کی پارکنگ، ''اتر و سرجی''..... حسن کی نظر اپنے ان لاتعلق اہداف پر سے اُچٹتی، اُچکتی آگے بڑھتی رہتی تھی۔ واپسی پر یہی سلسلہ اُسی پورے متعین راستے کی بائیں طرف دہرایا جاتا تھا۔ حسن کے دیکھنے کے اس عمل میں بظاہر کوئی بات بھی غیر معمولی نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص کسی ایک مقام سے دوسرے پر منتقل ہونے کے دوران اپنے دائیں، بائیں اور سامنے کی دنیا کو اسی انداز میں دیکھے گا۔ گویا لاتعلق ''اُچٹتی منظر بینی'' کی بنیادی شرط ہے اور ''دنیا دیکھنے'' کی ہماری تربیت کا لازمی حصہ ہے۔ اور پھر یہ کسی کے سیکھنے سکھانے کی بات نہیں ہوش سنبھالتے ہی ہم از خود جان جاتے ہیں کہ چلتے چلتے اگر کبھی ہماری نظر کسی پریشان کن منظر پر اٹک جائے تو اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دینا ہی ہوش مندی ہے۔ لیکن حسن کے ساتھ یہ ہوا کہ یہ بظاہر معمولی انسانی عمل اُس کے لیے کبھی کبھی غیر معمولی ہونے لگا۔ اس کی اُچٹتی نظر رکنے لگی اور پھر جب اچانک کسی مقام کسی واقعے کسی نظارے پر اٹکتی تو بظاہر وہ خالی لمحات اس کے لیے حیرت اور خوف کے منظر نامے بن جاتے جن کی تفصیل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود مرتب کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اُس کی اُچٹتی منظر بینی، خالی لمحوں اور خالی جگہوں کو پُر کیے بغیر آگے بڑھ نہ پاتی تھی۔

حسن رضا ظہیر کے ساتھ ساتھ دیکھتے ہوئے ایسے اٹکاؤ کے لمحات کی درجنوں مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن اختصار کی خاطر ہم صرف خلاصہ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ وین اپنے متعین روٹ پر آگے بڑھتے ہوئے ایک رہائشی علاقے میں بنے سپیڈ بریکر پر آ کر دھیمی ہو جاتی ہے اور انہی چند لمحوں میں حسن کو دائیں طرف گلی کے پہلے مکان کی سڑک کی جانب کھلتی بند کھڑکی کے ٹوٹے شیشے کی راہ سے اندر کمرے میں دیوار پر ایک بڑا آئینہ آویزاں نظر آتا ہے جس کے وسط میں کسی بڑی ضرب کے نتیجے میں ٹوٹتے ستارے جیسا نشان بنا ہے اور یہیں سے خون کی تین لکیریں نیچے کو اترتی ہیں۔ اگلے دس برسوں کے دوران وہ لکیریں سیاہ ہو گئیں، آئینہ دھندلا گیا اور ٹوٹتے ستارے جیسی ضرب بھی اتنی نمایاں نہ رہی۔ لیکن حسن نے

اس منظر کو کبھی مکمل طور پر نظر انداز نہ کیا یعنی وہ ہوش مندانہ نظارہ بازی کی لاتعلقی کی بنیادی شرط پر قائم نہ رہ سکا۔ اس نے اس پریشان کن اور شاید حیران کن منظر کو اپنانے کے لیے کئی متبادل خوف کہانیاں بنا لیں۔ ایسے کئی اٹکتے مناظر کے بارے میں کئی کہانیاں حسن رضا ظہیر کے پاس موجود ہیں۔

اختصار اور خلاصے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہمیں گمان ہو رہا ہے کہ یہ تحریر شاید حسن رضا ظہیر کی ''اُچٹتی منظر بینی'' اور اس کے دوران ''اٹکتے خوف کے خالی لمحات'' اور پھر ''بصری لاتعلقی'' کے تصور کے حوالے سے کئی سوالوں کے جواب دینے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو رہی۔ اور یہ کہ حسن کی ''حقیقی ذاتی زندگی'' کی تفہیم کے لیے ایسی کسی نپی تلی مختصر نویسی کی بجائے غیر مربوط بلکہ ''منتشر تفصیل نگاری'' کو آزمانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کچھ مختلف انداز میں بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

کوئی بڑا مفروضہ قائم کیے بغیر ہم سمجھتے ہیں کہ ''حسن کی صورت حال'' کو سمجھنے کے لیے اولاً ہمیں حسن کے بچپن میں جانا پڑے گا...... حسن رضا ظہیر جب سکول جانے کی عمر میں پہنچا تو اس کے والدین نے اسے ایک ایسے سکول کی انتظامیہ کے سامنے پیش کیا جو صرف پُراعتماد (Confident) بچوں کو تعلیم دینا پسند کرتی تھی تاکہ وہ بڑے ہو کر جو کچھ بھی کریں پورے اعتماد کے ساتھ کریں۔ حسن اس سکول کے امتحانی انٹرویو میں ناکام ہو گیا۔ ادارے کے سربراہ نے حسن کے والدین کو بتایا۔

''بچے میں اعتماد کی شدید کمی ہے۔ دیکھیں بچے کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے اور بات کر سکے۔''

انٹرویو روم سے باہر آنے کے بعد حسن کی ماں نے اُس سے پوچھا تھا ''بیٹا تم لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتے؟''

''نہیں'' حسن نے ایک چھوٹے بچے کی دنیا میں پہلی شکست کی گہری اداسی اور رُلانے والی تنہائی سے کہا اور اس نے کیاریوں میں کھلے سورج مکھی کے پھولوں کو دیکھا۔ بڑے بڑے زرد رنگ کے وہ پھول سورج کو دیکھتے تھے اور حسن ان کی طرف دیکھتا تھا اور پھر اُس نے سکول کی گھنٹی کی آواز سنی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسی واقعے کے بعد حسن ''اُچٹتی منظر بینی'' کا عادی بن گیا کیونکہ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ صرف انسانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا ہی اس کے لیے مشکل نہیں بلکہ چیزوں کی طرف بھی ایسے دیکھنا اس کے لیے محال ہے۔ اس لیے کہ چیزوں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں، مناظر جواباً آپ کو گھورتے ہیں، چوک آپ پر تیوری چڑھاتے ہیں، گلیوں کی نکڑیں آپ پر ہنستی ہیں اور کھڑکیاں آنکھیں مارتی ہیں۔ پس دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں اور دوسرے وہ جو ایسا نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ حسن کا تعلق موخرالذکر قسم سے تھا۔

لیکن ہم اپنی اس رائے کی صحت پر بالکل اصرار نہیں کریں گے۔ بس اسے ظاہر کر دیا گیا ہے۔ صرف ایک احتمال کے طور پر، امکان کے طور پر۔ شاید اس لیے بھی کہ احتمالی، غیر احتمالی، ممکن، ناممکن جیسی کیفیات جیسا کہ ہم واضح کرنے کی کوشش کریں گے ''حسن کی صورت حال'' میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی بھی شخص کی ''حقیقی ذاتی زندگی'' کو سمجھنے کے لیے اس قسم کی نیم تشخیصی آرا، اکثر بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ شاید کسی بھی شخص کی حقیقی زندگی کو سمجھنا ناممکن ہے صرف کسی کے ساتھ کچھ دیر چلنا ممکن ہو سکتا ہے۔ ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔

فرض کریں آپ حسن کے ساتھ ایک معمول کی صبح کمپنی کی وین میں سوار ہوتے ہیں۔ جلد ہی دائیں طرف آپ کی اُچٹتی نظر رواں دواں ہو جاتی ہے یا کہہ لیں اُس میں ایک اُچٹتی روانی آ جاتی ہے۔ مکانوں کی چھتیں، انسانوں کے کان، آنکھیں، فلتھ ڈپو میں پڑے گلے سڑے پھل، نیم کا درخت، موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی خاتون کا دوپٹہ جو گھومتے پہیے کے اتنا قریب لٹک رہا ہے کہ اگلے ہی لمحے کہیں پھنس کر کسی مہلک حادثے کا سبب بن سکتا ہے، ایک ورکشاپ میں کھڑی ایک ڈھانچہ بنی کار جس کے ڈیش بورڈ پر ایک کتاب پچھلے دس سال سے ویسی کی ویسی رکھی ہے اور جو حسن کے لیے اٹکتے خوف کی ایک منزل بن سکتی ہے۔ لیکن حسن اب جانتا ہے کہ یہ سب کچھ جو نظر کو اٹکاتا ہے اس کے پیچھے ''اصل'' میں کیا ہے۔ اور وہ ''اصل'' مکمل طور پر حسن کا اپنا ہے۔ کھلی کھڑکی میں سے شکستہ آئینہ اور جمے خون کی لکیریں نظر آتی ہیں لیکن حسن یہ مسئلہ بھی حل کر چکا ہے وہ یہ خالی جگہیں پُر کر چکا ہے۔ آگے بڑھتے ہیں۔

ٹرک، بس، ریڑھیاں، بیل، ایک کچے دیہاتی مکان کی چھت پر ایک چھتے ہوئے کونے میں ایک تھری پیس مردانہ سوٹ لٹکا ہوا نظر آتا ہے اور حسن کی اُچٹتی نظر اٹکتی ہے۔ عجیب بات ہے اس ٹوٹے پھوٹے گندے سے کچے دیہاتی مکان کی چھت کے چھتے ہوئے کونے میں لٹکا یہ تھری پیس گرم سوٹ کیا کر رہا ہے۔ کمپنی کی گاڑی آگے گزر جاتی ہے۔ بند گوبھیوں سے لدی ہوئی ایک ٹریکٹر ٹرالی گزرتی ہے گوبھیوں کے بیچ ایک انسانی سر نظر آتا ہے۔ کمپنی کی بھاگتی گاڑی دوسری نظر ڈالنے کا موقع ہی نہیں دیتی اور یہ تو ناممکن ہے کہ گاڑی روک کر ٹرالی کا پیچھا کیا جائے تاکہ مسئلہ حل ہو۔ ''اُچٹتی منظر بینی'' کی راہ میں حائل حیرت اور خوف کی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے دنیا میں براہِ راست مداخلت کا تو بہرحال حسن سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جیسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں سوچتا اور اگلے ہی لمحے بھول جاتا ہے۔

ہم حسن کے ساتھ ہی چلتے رہیں گے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ''دنیا میں براہِ راست مداخلت'' نہ کرنے کی صورت حال وضاحت طلب ہے۔ فرض کریں آپ کہیں جا رہے ہیں۔ ضروری نہیں گاڑی میں۔ پیدل، سائیکل پر، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی سڑک پر، کسی شاہراہ پر کسی گلی میں، کسی بازار میں، کہیں بھی، بس آپ آگے کو متحرک ہیں۔ دائیں طرف آپ کی نظر کسی خاتون کے غیر معمولی طور پر خوبصورت چہرے سے یا سینے کے متوازن ابھار سے اُچٹ کر ایک پولیس پک اپ میں جا ٹھہرتی ہے جس میں دو پولیس والے ایک ملزم کو ہتھکڑی لگا کر کہیں لے جا رہے ہیں۔ اچانک آپ کو ایسا لگتا ہے کہ ملزم کی شکل حیرت انگیز حد تک آپ کے لڑکپن کے ایک دوست سے ملتی ہے جو میٹرک میں آپ کا ہم جماعت بھی تھا بہت ذہین طالب علم تھا اور بہت شریف بچہ تھا۔ ''میرے خدا یہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' یہ ''کیا'' ایک ''خالی'' ہے لیکن کیا آپ اس خلا کے اٹکاؤ کو دور کرنے کے لیے پولیس پک اپ کا پیچھا کریں گے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کا دوست نہ ہو، آخر شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں۔ عمر کے ساتھ شکلیں بدل بھی جاتی ہیں اور اپنی بجائے کسی دوسرے جیسی نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ شخص آپ کے دوست کا ہم شکل جڑواں بھائی بھی ہو سکتا ہے۔ غرض یہ کہ تھوڑی دیر میں آپ سب کچھ بھول جائیں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اٹکتے خوف کے لمحات میں براہِ راست مداخلت انتہائی بیکار بات ہے۔

حسن بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا بلکہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسی مداخلت انتہائی
مہلک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن حسن بھولتا نہیں تھا۔ وہ اکھٹے خوف کے لمحات کے خالی پن کو
برداشت نہیں کر پاتا تھا اور کچھ نہ کچھ ان کے آگے پیچھے لگا کر تصویر مکمل کر لیتا تھا اور مطمئن ہو
جاتا تھا جیسے خالی جگہیں پُر کرو کا سوال کسی بھی طرح حل کر کے طالب علم مطمئن ہو جاتا ہے۔
اور یہ کوئی بہت مشکل بات بھی نہ تھی۔ ہم وہی چند مثالیں لیتے ہیں۔ فیکٹری پہنچنے تک حسن سمجھ
جاتا ہے کہ وہ ٹوٹا پھوٹا دیہاتی مکان اغوا برائے تاوان وصول کرنے والوں کا اڈہ ہوسکتا ہے
جنہوں نے پچھلے دنوں ایک اہم شخصیت کو اغوا کیا تھا اور تاوان وصول کرنے کے باوجود اُسے
قتل کر دیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ شخصیت تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہی ہو۔ ہوسکتا ہے شخصیت کو
وہاں قید کرنے کے بعد عام کپڑے پہنائے گئے ہوں اور اس کا سوٹ وہاں لٹکتا چھوڑ دیا گیا
ہو جہاں سے اغوا کنندگان کے خیال کے مطابق اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن وہ یہ نہیں جانتے
کہ بیرونی سڑک سے گزرنے والی کسی گاڑی میں بیٹھا کوئی شخص اگر دائیں طرف دیکھ رہا ہو تو
کالی پٹی اور سوہنے نائی کی دکان کے درمیان سے گزرنے کے دوران پانچ سیکنڈ کے لیے وہ
اس سوٹ کو وہاں لٹکا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے یہ مکان شہر میں کام کرنے والے کسی
درزی کا ہو اور درزی نے یہ سوٹ دبئی میں کام کرنے والے اور جلد ہی چھٹی پر گھر واپس آنے
والے بیٹے کے لیے چرایا ہو (لیکن جب سوٹ کئی برس تک وہیں لٹکا رہا تو حسن نے اس
متبادل احتمالی منظرنامے کو رد کر دیا تھا)۔ ہوسکتا ہے یہ گھر کسی میراثی کا ہو جو شہر میں کسی اسٹیج
ڈرامے میں کام کرتا ہو اور اپنے پارٹ میں سوٹ پہنتا ہو اور رات گھر واپس آ کر وہاں لٹکا دیتا
ہو۔ ہوسکتا ہے یہ سب کچھ میری نظر کا دھوکہ ہو۔ "نظر کا دھوکہ" حسن کے لیے کسی بھی اُچٹتے
اکھٹے خوف کا آخری متبادل منظرنامہ ہوتا تھا۔ بند گوبھیوں کے ڈھیر میں انسانی سر کی مثال میں
بھی حسن کئی متبادل منظرنامے بنا سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص گوبھیوں کے ڈھیر میں اس
طرح آڑا ترچھا لیٹا ہو کہ صرف اس کا سر نظر آ رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ بند گوبھی کی کسی نئی قسم کی
کاشت شروع ہو چکی ہو جس کی شکل انسانی سر جیسی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی عام بند گوبھی کی
نشوونما رک گئی ہو اور اس کا بیرونی حصہ دھوپ میں جل کر سیاہی مائل یعنی انسانی سر سے مشابہ
ہوگیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کسی بہت بڑے انسانی گڈے کا سر ہو۔ یا کسی mannequin کا۔ یا

پھر ہوسکتا ہے کہ ٹرالی والوں کو یہ سر واقعی تن سے جدا کہیں پڑا ملا ہو۔ یا وہیں ٹرالی میں ہی
انسان کا سر تن سے جدا کیا گیا ہو۔ اور آخر میں اس خاص متبادل منظرنامے سے خوف زدہ ہو کر
حسن نے سوچا کہ ہوسکتا ہے یہ سب کچھ میری نظر کا دھوکہ ہو۔
اب تو اسی طرح حسن رضا ظہیر کے ساتھ چلتے چلتے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے نہ صرف
ٹوٹے ہوئے آئینے اور خون کی لکیروں، ڈھانچہ گاڑی میں کتاب بلکہ برسوں پر محیط ایسے ہی
اکھٹے خوف کے ان گنت دوسرے لمحات کے خالی پن کو بھی کئی متبادل منظرناموں سے پُر کیا۔
مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ سب بیان نہیں ہوسکتیں۔ سڑک کے کنارے کھڑی برقع پوش خاتون
ایک لمحے کے لیے نقاب اٹھاتی ہے۔ اندر ایک چہرہ نظر آتا ہے جو نہ عورت کا ہے نہ مرد کا بلکہ
شاید انسان کا ہی نہیں۔ کسی اور مخلوق کا ہے۔ وہ مخلوق کون ہے؟ ایک دیہاتی بس سٹاپ پر ہر
روز ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو محبت کے اشارے کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک روز نظر نہیں
آتے۔ شام واپسی پر گاؤں کی اطراف میں دو مختلف جگہوں پر دو جنازے نظر آتے ہیں۔ لڑکا
اور لڑکی پھر کبھی نظر نہیں آتے۔ جنازے کن کے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ حسن رضا ظہیر نے کمپنی کی
گاڑی میں برسوں سفر کے دوران ایسے ان گنت سوالوں کے ایسے امکانی جواب تلاش کیے
جنھوں نے اسے ہر لحاظ سے مطمئن کر دیا اور اسے کبھی بھی کسی خوف کے لمحے کا پیچھا کرنے اور
دنیا میں "براہ راست مداخلت" جیسی سنگین خلاف ورزی کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔
ہم سمجھتے ہیں کہ "اُچٹتی منظر بینی" کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے خوف
لمحوں کے خالی پن کو متبادل منظرناموں سے پُر کرنا ہی حسن رضا ظہیر کی "حقیقی ذاتی زندگی" تھی
لیکن ہم اپنی اس رائے کی صحت پر بھی قطعاً اصرار نہیں کریں گے کیونکہ جیسا کہ پہلے بھی عرض
کیا گیا یہ جاننا ناممکن ہے کہ کسی بھی شخص کی ذاتی "حقیقی زندگی" اصل میں کیا ہوتی ہے۔
انسانوں کے بارے میں کچھ بھی جاننا محال ہے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ حسن نے
اپنے متبادل منظرناموں میں سے کسی ایک کی تصدیق بھی کبھی حقیقی ذرائع سے کرنے کی کوشش
نہ کی شاید ایسا کرنا صرف "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے" والوں کا شیوہ ہوتا ہے، حسن
رضا ظہیر جیسے سہمے ہوئے، اعتماد سے بالکل عاری شخص کا نہیں ـــــ "اعتماد سے بالکل
عاری" ـــــ حیرت ہے، اس لیے یہاں ہم اس دلچسپ صورت حال کا ذکر ضرور کریں گے اور

جو اصل میں ''حسن کی صورت حال'' کا ایک پہلو ہی ہے کہ اعتماد کی کمی ''عدم موجودگی'' کے باوجود حسن شادی کرنے، بچے پیدا کرنے ـــــ دولڑکے ایک لڑکی ـــــ اور دوسری کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مثلاً یہ کہ اس کے تینوں بچے انتہائی پراعتماد (Full of Confidence) بڑے ہوئے اور اُسی سکول میں داخل ہوئے جس کی عمارت دیکھ کر حسن اب بھی سہم جاتا تھا۔ اُس نے ایک رہائشی پلاٹ قسطوں پر حاصل کیا۔ درمیانی قسم کی ایک گاڑی حاصل کی۔ بڑا لڑکا انجینئر بن گیا۔ بیٹی کی بات اچھے گھرانے میں طے کرنے کی راہ نکلی وغیرہ وغیرہ۔ اعتماد سے عاری ایک شخص کی یہ کامیابیاں اپنی جگہ ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن قابل فہم کیونکہ ایک رائے کے مطابق اس صورت حال کی روح رواں اصل میں اس کی بیوی تھی جو کہ اتنی پراعتماد خاتون تھی کہ دن کو رات ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہرحال ہمیں اس متبادل منظرنامے سے کوئی سروکار نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ حسن کی ''اُچٹتی منظر بینی'' کی ماہیت پر برس ہا برس کی یہ سب متوازی پیش رفت قطعاً اثر انداز نہ ہو سکی اور حسن رضا ظہیر کی ''حقیقی ذاتی زندگی'' کا تسلسل ایک طویل عرصے تک کامیابی سے برقرار رہا اور پھر ایک روز وہ حیرت ناک واقعہ پیش آیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعے کے اسباب کے دو پہلو ہیں، ایک تو ایک اور واقعہ جو دراصل کئی چھوٹے چھوٹے واقعات پر مشتمل تھا اور دوسرا ایک مقام جو دراصل کئی چھوٹے چھوٹے مقامات کا مجموعہ تھا۔ تو پہلے واقعات کا مجموعہ ـــــ پچیس سال تک اکاؤنٹینٹ کی ملازمت کرنے اور مالکوں کو شکایت کا ایک بھی موقع نہ دینے پر کمپنی نے حسن رضا ظہیر کی ترقی بطور سینئر اکاؤنٹینٹ کر دی۔ یہ ترقی ٹرانسفر ہمراہ لائی اور حسن کی نئی تعیناتی شہر میں کمپنی کے ہیڈ آفس میں کر دی گئی۔ تنخواہ اور مراعات میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود حسن بالکل خوش نہیں تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنے ایم۔ڈی سے کہنے کی ٹھانی کہ وہ یہ ترقی اور ٹرانسفر نہیں چاہتا بلکہ اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن ایسے کسی اقدام سے پہلے ہی حسن کی پراعتماد فیملی کو اس کے ترقی دشمن فیصلے کی بھنک پڑ گئی اور پھر اسے بہت آسانی اور اعتماد سے ترقی قبول کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔

ہر صبح پندرہ کلومیٹر تک کھڑکی کی راہ سے دائیں اور پھر شام پندرہ کلومیٹر تک بائیں

کی ''اُچٹتی منظر بینی'' سے یک لخت محرومی حسن کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ لیکن کیسا صدمہ؟ ''حسن کی صورت حال'' کی وضاحت کے لیے ہم یہاں تھوڑی مداخلت کریں گے۔ حسن رضا ظہیر کا یہ صدمہ کیا تھا؟ جسمانی، ذہنی، جذباتی یا بصری ـــــ؟ آخر حسن اگر کسی دوسرے کو اپنے اس صدمے کے بارے میں بتاتا تو کیا بتاتا؟ یقیناً کچھ بھی بتانا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن پھر بھی اگر وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو کوئی کچھ بھی سمجھ نہ پاتا یا پھر ہنستا۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کا صدمہ ایک ''مثالی حقیقی صدمہ'' تھا کیونکہ ''مثالی حقیقی صدمہ'' ایسا صدمہ ہے جسے آپ اپنے سے ایک فرد بھی آگے نہ لے جا سکیں۔

اسی لیے ان دنوں جب حسن نے شدید پریشانی کے عالم میں زندگی میں پہلی بار اپنی کمپنی کے ڈاکٹر سے طبی مشورے کے لیے ملاقات کی تو وہ اُسے بے خوابی، گردن کے پٹھوں میں کھنچاؤ اور آنکھوں میں درد کی شکایات کے علاوہ کچھ بھی نہ بتا سکا۔ ڈاکٹر نے اُسے ادویات دیں کیونکہ اگلے ہی دن اُسے کمپنی کی آڈٹ ٹیم کے ساتھ کسی دور افتادہ مقام کی طرف جانا تھا۔ اسی سفر کے دوران حسن تین دن کے لیے ایک رپورٹ کے مطابق صرف چھتیس گھنٹے کے لیے کہیں لاپتہ ہو گیا لیکن پھر خود ہی ڈیوٹی پر واپس آ گیا۔ اُس سے اُس کی غیر معمولی گمشدگی کے بارے میں بہت سا انتظامی اور خاص طور پر طبی استفسار کیا گیا لیکن اُس نے صرف گزشتہ تین دن کی رخصت اتفاقیہ کے لیے اپلائی کرنے کے علاوہ کسی سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا، اُسے آئندہ تین دن کے لیے بھی ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا تا کہ وہ نئی تعیناتی کے سلسلے میں اپنے انتظامات کر لے۔

خیر زندگی نے تو آگے بڑھنا تھا، بڑھی۔ تین دن کی چھٹیوں کے بعد کمپنی کی نئی گاڑی ہر صبح حسن کو ہیڈ آفس لے جانے لگی۔ رستہ بدل گیا تھا، روٹ مختصر تھا لیکن ''اُچٹتی منظر بینی'' کا امکان ختم تو نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی سب کچھ درہم برہم تھا۔ ایک تو یہ کہ کوئی ایک مخصوص گاڑی نہیں بھیجی جاتی تھی کبھی کوئی تو کبھی کوئی۔ ہر روز کوئی ایک مخصوص سیٹ حاصل کرنا، دائیں یا بائیں تقریباً ناممکن تھا۔ نشست کی اونچ نیچ سے سب کچھ اتھل پتھل ہو جاتا تھا۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ مجبوری تھی۔ پینتیس چالیس منٹ تک سلسلۂ مناظر پر آزادانہ پھسلتے اُچکتے رہنے کے مقابلے میں یہ ایک افراتفری کی ''اُچٹتی منظر بینی'' تھی جو شروع بھی نہیں ہو پاتی تھی کہ ختم ہو

جاتی تھی اور اُس دس منزلہ پلازہ کی پارکنگ آجاتی تھی جس میں کمپنی کا ہیڈ آفس واقع تھا۔

اب ہم اُس حیرت ناک واقعہ کے اسباب کے دوسرے پہلو ـــــ مقام یعنی مجموعۂ مقامات کی طرف آتے ہیں۔ یہ مقام ایک عظیم الشان قبرستان تھا جو شہر کے مرکز میں اور ایک وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہونے کی وجہ سے کچھ ایسا شہر خموشاں نہ تھا بلکہ ایک دو خاصی چوڑی اور متعدد چھوٹی موٹی سڑکیں اس میں سے ہو کر گزرتی تھیں اور خصوصاً شہر میں شمال سے جنوب یا جنوب سے شمال کی طرف سفر کرنے والوں کو کئی اعتبار سے متبادل رستے فراہم کرتی تھیں۔ ان سڑکوں پر سفر کرنے والے مسافر اپنی اپنی سواریوں کی جسامت اور ساخت کی مجبوریوں کے تابع ہونے کے باوجود چند منٹوں کے لیے سفرِ آخرت، آخری آرام گاہ، قربتِ مرگ اور دارالفانی جیسی آفاقی تھیمز سے حسبِ توفیق ضرور متاثر ہوتے تھے۔ کچھ بھی ہو انسانی فطرت ہے کہ قبر کو دیکھ کر بالکل لاتعلق رہنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا، بیشک روزمرہ کے دھندے میں کسی کو اس احساس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص، ''اُچٹتی منظر بینی'' کا عادی رہا ہو تو یہ ''قبرستانی'' سڑکیں اسے انتہائی متنوع بصری مواقع فراہم کر سکتی ہیں اور جو بعض اوقات انتہائی پریشان کن بھی ثابت ہو سکتے ہیں جیسا کہ حسن رضا ظہیر کے ساتھ ہوا۔

ہم ایک بار پھر حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔ فرض کریں آپ کسی ویگن میں بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے ہیں جونہی آپ قبرستان میں سے گزرتی کسی سڑک پر آئیں گے آپ کو چند فٹ کے فاصلے پر قبرستان کی بیرونی حفاظتی دیوار کے ساتھ ساتھ ان گنت کتبے نظر آئیں گے جیسا کہ کسی بھی قبرستان میں نظر آنے چاہئیں اور اگر آپ کی بصارت میں کوئی بڑی خرابی نہیں تو آپ گزرتے گزرتے ان کتبوں پر کندہ اُن خواتین و حضرات کے نام پڑھ سکتے ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں۔ حاجی الیاس بٹ، مرقد والدہ، شہید کیپٹن نور الٰہی، ڈاکٹر الیاس احمد، رشیدہ بی بی، انوار الحق، نور فاطمہ، محمد طارق صدیقی، رحمان ملک، عالیہ بیگم، چوہدری قدرت اللہ...... اہلِ قبور کی مزید سوانحی تفصیلات یعنی ولدیت، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور پھر کہیں کہیں لواحقین کے جذبات کی عکاسی کرنے والے اشعار، آیات، طغرے وغیرہ پڑھنے کے لیے البتہ آپ کو یا تو اپنی سواری کی رفتار دھیمی کرانا پڑے گی یا پھر اپنی چند لمحوں کی ''اُچٹتی منظر بینی'' کو صرف کسی ایک کتبے پر مرکوز کرنا ہوگا۔ سڑک پر سے گزرتے گزرتے کتبوں کی خواندگی کے اس

عمل میں ایک دشواری اس وقت بھی پیش آسکتی ہے جب آپ کسی ایسے کتبے کو پڑھنا چاہیں جو بیرونی دیوار سے کچھ ہٹ کر واقع ہو اور دوسرے کتبے اس کی راہ میں حائل ہوں۔ اس طرح صرف کوئی ادھورا نام یا تاریخ پیدائش آپ کی نظروں کے سامنے آئے گی اور گزر جائے گی اور اس ادھورے پن کو دور کرنے کے لیے نہ صرف آپ کو گاڑی رکوانی پڑے گی بلکہ شاید اتر کر کہیں دائیں بائیں سے کسی مخصوص کتبے کے مندرجات پڑھنے کی کوشش کرنا ہوگی اور ظاہر ہے کوئی بھی شخص ہوش مندی کی حالت میں ایسی عجیب و غریب حرکت نہیں کرے گا۔

حسن رضا ظہیر بھی ایسی کوئی حرکت کرنے والا نہیں تھا کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ''اُچٹتی منظر بینی'' اور اکلتے تحیر اور خوف کے لمحات کی اپنی انتہائی ''حقیقی اور ذاتی'' زندگی جینے کے باوجود حسن کی بیرونی ہوش مندی پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ کمپنی کی نئی گاڑی کے ساتھ صبح و شام کے اس نئے سفر کی افراتفری کو نہ صرف اس نے قبول کر لیا بلکہ اس نئے رستے، جس میں قبرستان سے گزرتے راستے بھی شامل تھے، کی بے ترتیبی میں بھی بتدریج ایک نئی ترتیب اُس پر ظاہر ہونے لگی اور اُس کی آنکھوں اور ذہن کے درمیان تار تار رشتے پھر سے جڑنے لگے۔ شروع شروع میں وہ ہیڈ آفس تک اور واپس گھر تک اپنا سر جھکائے رکھتا تھا لیکن پھر دھیرے دھیرے موقع کے مطابق اس کی نظریں باہر کی دنیا کی طرف اُچٹنے لگیں۔

اوٹ پٹانگ چوکوں، اندھے کانے موڑوں، یک طرفہ دو طرفہ اور بے ہنگم ٹریفک میں سے اپنا شارٹ کٹ بناتی کمپنی کی گاڑی ایک نیا معمول وضع کر چکی تھی...... چوک میں ہر صبح روز کی دیہاڑی کمانے کے لیے اکٹھے ہونے والے مزدوروں میں سے ایک لاغر مفلوک الحال ادھیڑ عمر شخص دیکھتے ہی دیکھتے لڑکھڑا کر گر جاتا ہے۔ دوسرے اس کی طرف لپکتے ہیں اور گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ شخص محض بیہوش ہوا ہے یا مر چکا ہے؟ وہ کون ہے؟ یعنی اس کا نام کیا ہے۔ کتبے، سنگ مرمر کے کتبے، یاسین ڈوگر، عارفہ رانی، فوزیہ عمر، محمد رزاق، عبدالرزاق، ڈاکٹر عبادت علی، نیامت علی منہاس، تیر کا نشان۔ مزار بابا گلاب۔ چاہ پریاں والا، گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ قبرستان سے ملحقہ شہری عمارتیں، تیار کفن، غسل کا بہترین انتظام۔ مردے کے لیے بہترین غسل کیا ہو سکتا ہے؟ کفن دفن کا سامان بیچنے والی بہت سی دکانیں۔ تختوں پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں اور گیندے کے پھولوں کے ہار جن کے بیچوں بیچ ایک پھوا بیٹھا ہوا ہے!

تدفین کے لوازمات بیچنے والی دکان کے سامنے رکھے پھولوں اور ہاروں کے درمیان کچھوے کی موجودگی تحیر اور اٹکتے خوف کا خالی لمحہ ہے۔ ''یہ کچھوا یہاں کیا کر رہا ہے؟'' کس قدر عجیب بات ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ کچھوا نہ ہو اس کا ماڈل ہو۔ ہوسکتا ہے وہ عقبی قبرستان کے کسی برساتی گڑھے میں پیدا ہو گیا ہو...... بلکہ۔ ہاں۔ چاہ پریاں والا یعنی پریوں کا کنواں۔ یہ نام بھی عجیب ہے...... ہوسکتا ہے کچھوا ادھر ایسے ہی کسی کنویں میں۔ یا پاس بنے کسی جوہڑ میں پیدا ہو گیا ہو اور آج اچانک چلتا چلتا ادھر آ نکلا ہو جیسے حسن نے اپنے سابقہ پچیس سال کے روزانہ سفر کے دوران ایک دو بار دیکھا تھا کہ دیہاتی علاقوں میں کچھوے دائیں بائیں کے جوہڑوں میں سے نکل کر سڑکوں پر آ جاتے تھے۔ بچے انہیں پکڑ لیتے تھے یا پھر وہ بسوں کے نیچے کچلے جاتے تھے، ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے قبروں کے لیے پھول بیچنے والے کا کوئی بیٹا ترقی کر کے حیوانیات کا پروفیسر بن گیا ہو اور کچھوا اس نے اپنی کسی ریسرچ یا آپریشن کے لیے منگوایا ہو۔ ہوسکتا ہے کچھوا پالتو ہو اور اگر ایسا ہوا تو وہ کل بھی وہیں ہوگا۔ گاڑی سامنے سے گزرے گی تو وہ پھر نظر آ جائے گا۔ کل میں اسے غور سے دیکھوں گا۔

لیکن کمپنی کی گاڑی وہاں سے کل ہی نہیں کئی دنوں تک نہ گزری۔ کمپنی کے ڈرائیور ہیڈ آفس تک کے راستوں کے انتخاب میں اپنی مکمل خود مختاری کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔ قبرستان میں سے گزرتی چھوٹی موٹی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کے چناؤ میں بھی ان کی پسند ناپسند مختلف تھی۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ کمپنی کی گاڑی کے ساتھ صبح شام کے سفر کے نئے معمول نے حسن رضا ظہیر کی ''اچٹتی منظر بینی'' کو گنجلک اور شکستہ تو کر دیا لیکن اٹکتے خوف کے لمحات کے تسلسل میں کوئی فرق نہ آیا۔ حسن کی ''حقیقی ذاتی زندگی'' اگر پہلے ایک مسلسل لکیر تھی تو اب خط نقطی (Dotted Line) تھی۔ دوسری طرف اس کی پیشہ ورانہ اور خاندانی زندگی بھی ہمیشہ کی طرح ''اعتماد کے مکمل فقدان'' کے باوجود ایک اور کامیابی کی طرف بڑھنے لگی۔ کمپنی نے ہیڈ آفس میں اکاؤنٹس کے شعبے میں کمپیوٹرائزیشن شروع کرنے کے لیے نیا MBA سٹاف بھرتی کر لیا۔ حسن رضا ظہیر کو دو پیشکشیں کی گئیں کہ یا تو وہ زرِ خطیر قبول کر کے قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر چلا جائے، یا پھر کمپنی کی ایک پرانی ذیلی فیکٹری جہاں عرصے سے By-Products سے ادویات بنانے کا کام کیا جا رہا تھا، اپنے سابقہ معمول کے کام پر لیکن

زیادہ معقول مشاہرے پر چلا جائے۔ یہ فیکٹری سابقہ فیکٹری سے بھی دس کلومیٹر آگے تھی اور شہر سے کوئی ایک گھنٹے کا سفر تھا جو ظاہر ہے کمپنی کی گاڑی کے ذریعے طے کیا جاتا تھا۔ حسن نے انتہائی خوشی سے موخرالذکر پیشکش فوراً قبول کر لی لیکن چند دنوں بعد ہی اس نے پہلی پیشکش کو ترجیح دی کیونکہ اس کے سب اہلِ خانہ اپنی اس متفقہ رائے میں بہت پُراعتماد تھے کہ اچھی رقم اگر اکٹھی مل جائے تو قبل از وقت ریٹائرمنٹ میں کوئی حرج نہیں۔ پرانا مکان بیچ کر بھی کچھ مل جائے گا۔ پلاٹ آخر کب تک پڑا رہے گا۔ نئے مکان کی تعمیر شروع ہوسکتی ہے۔ بیٹی کی شادی کے اخراجات کے لیے بھی کچھ سہولت ہو جائے گی۔ بات معقول تھی اور حسن رضا ظہیر نے معقول باتوں کو رد کر دینے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ کمپنی کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا اسے بتایا گیا کہ رواں سال کے اختتام تک اسے فارغ کر دیا جائے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کفن دفن کا سامان بیچنے والوں کی دکان کے سامنے رکھے تختے پر گلاب کے پھولوں کی پتیوں اور گیندے کے ہاروں کے درمیان ایک کچھوے کو بیٹھا ہوا دیکھنا حسن کی ''اچٹتی منظر بینی'' کی تاریخ کا سب سے غیر احتمالی واقعہ تھا لیکن ظاہر ہے کہ ناممکن نہیں تھا اس لیے یہ رائے دینا نامناسب ہوگا کہ حسن نے ایسے مناظر دیکھنے شروع کر دیے تھے جو حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حسن تو خود ''ہوسکتا ہے یہ میری نظر کا دھوکہ ہو'' کو ہمیشہ خوف کے آخری ناقابلِ تردید متبادل کے طور پر قبول کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی انوکھی جبلی خودآگاہی کی سطح پر وہ جانتا تھا کہ اس کی ''حقیقی ذاتی زندگی'' غیر احتمالی (Improbable) اور ناممکن (Impossible) کے درمیانی پرخطر زمان و مکان میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے اور صرف ''حقیقی ذاتی زندگی'' ہی نہیں بلکہ اس کی ظاہری کامیاب ''آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھ سکنے'' والے شخص کی زندگی بھی غیر احتمالی اور ناممکن کی خطوطِ وحدانی میں بند تھی۔ لیکن شاید حسن کی یہ خودآگاہی بذاتِ خود غیر احتمالی اور ناممکن کے درمیان جھولتی تھی اسی لیے جب وہ حیرتناک واقعہ پیش آیا تو زندگی میں پہلی بار وہ ''اچٹتی منظر بینی'' کی بنیادی کڑی شرط یعنی اٹکتے خوف کے لمحات کا براہِ راست پیچھا نہ کرنے اور دنیا میں مداخلت نہ کرنے پر قائم نہ رہ سکا اور یہ دیکھنے نکل پڑا کہ جیسا نظر آتا ہے ویسا کیوں نظر آتا ہے۔ لیکن ہم اپنے اس تجزیے کی درستی پر ہرگز اصرار نہیں کریں گے۔ شاید حسن کے ذہن کی حقیقت کوئی نہیں جان سکتا

وہی بات کہ انسانوں کے بارے میں کچھ بھی جاننا شاید ناممکن ہے اور اس طرح کے نیم فلسفیانہ تجزیے بالآخر لغو ہی قرار پائیں گے۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔

وہ ایک روشن چمکیلی صبح تھی۔ کیوں روشن اور چمکیلی تھی حسن نہیں جانتا تھا لیکن گندے نالے کے پل پر سے گزرتے وقت ایک ہی اُچٹتی نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ نالے کے کنارے کے قریب کالے سیاہ کیچڑ میں ایک بڑا دیواری آئینہ دھنسا ہوا ہے اور کسی ضرب کے بعد پھوٹتے تارے کی طرح چمکتا ہے اور نیچے کو بہتی خون کی لکیریں سیاہ ہو چکی ہیں۔ ''اُچٹتی منظر بینی'' کے ایک ہی لمحے میں حسن نے پہچان لیا کہ یہ وہی آئینہ ہے جسے اس نے کسی اور جگہ کسی کھڑکی کی راہ برسوں تک دیکھا تھا۔ اب فرق یہ تھا کہ اُس ایک لمحے میں اس نے آئینے میں کسی عورت کا عکس دیکھا، عورت جو کہیں نہیں تھی۔ کمپنی کی گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔

...... لوہے کے ایک بڑے توے پر ایک شخص پراٹھوں کا ناشتہ بنانے میں مصروف ہے۔ گرم لوہا چھونے پر اس کی انگلیاں جلتی ہیں۔ تیزی سے انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے منہ میں ڈالتا ہے اور پھر انہی انگلیوں سے پراٹھے کو جلنے سے بچانے کے لیے پلٹتا ہے۔ بارہ تیرہ سال کی بچی سائیکل مرمت کی ایک دکان پر اپنے سائیکل کو پنکچر لگوا رہی ہے حالانکہ ایک زمانہ گزرا شہر میں عورتوں نے سائیکل چلانا چھوڑ دیا ہے۔ گنے کا رس نکالنے کی ریڑھی پر رس والے کا ہاتھ گنے کے ساتھ پیلا جاتا ہے ورنہ وہ چیخ کس کی ہو سکتی ہے کچھ پتہ نہیں چلتا، گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ گاڑی آگے بڑھ کر قبرستان سے گزرتی ایک ایسی سڑک پر آتی ہے جو حسن نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ سنگ مرمر کے ''نئے کتبے'' ایک کے بعد ایک نظر آتے ہیں۔ رشیدہ ظفر، میاں حیات محمد، آصف اقبال، پروفیسر شہزاد احمد، محمد عرفان، آہ لختِ جگر کاشف، شہباز احمد، سلمیٰ بیگم، عابدہ پرویز، مرزا اطہر بیگ، افتخار احمد چوہدری، حکیم وارث علی، حسن رضا ظہیر، قمر علی خان...... حسن کی اُچٹتی نظر نے بجلی کی تیزی سے واپس پلٹ کر اس کتبے پر جانے کی کوشش کی جہاں اس نے اپنا نام لکھا ہوا دیکھا تھا لیکن گاڑی آگے گزر چکی تھی۔

ایک لمحے کے لیے حسن نے بے اختیار ہو کر شور مچانا چاہا جیسے اس نے زندگی بھر کبھی کسی اکیلے خوف کے لمحے کا سامنا کرتے وقت نہ کیا تھا۔ ''روکو، روکو، گاڑی روکو اس کتبے پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔'' اس نے چیخ کر کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔ شور صرف اس کے اندر مچا، یہ کیسے

ممکن ہے؟ ظاہر ہے نام سے نام ملتے ہیں۔ ہم نام اگر زندگی میں ہو سکتے ہیں، اخباروں اور کتابوں میں لکھے نظر آ سکتے ہیں تو کتبوں پر کیوں نہیں۔ لیکن پھر بھی نام کے تینوں حصوں حسن، رضا، ظہیر کا ملنا کافی غیر احتمالی ہے۔ لیکن ناممکن نہیں اور جو ناممکن نہیں اسے کبھی نہ کبھی ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہیڈ آفس آ گیا۔

اگلی صبح اتفاق سے کمپنی کا وہی ڈرائیور وہی گاڑی لایا۔ گندا نالہ عبور کرتے ہی حسن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خونی شکستہ آئینہ غائب تھا۔ گنے کے رس کی مشین بند اور خالی پڑی تھی۔ وہ سنبھل کر اور اپنی آنکھوں کو بصارت کے بہترین مظاہرے کے لیے تیار کر کے کھڑکی کے ساتھ جڑ کر بیٹھا تاکہ ''اُچٹتی منظر بینی'' کی حدود کے باوجود اپنے ہم نام کتبے یعنی اپنے ہم نام کے کتبے کی باقی تفصیلات بھی جس قدر ہو سکے دیکھ لے۔ سڑک آئی، کتبے آئے، گزرنے لگے، آہ لختِ جگر کاشف، شہباز احمد، سلمیٰ بیگم، عابدہ پرویز، مرزا اطہر بیگ، افتخار احمد چوہدری، حکیم وارث علی، حسن رضا ظہیر ولد ظہیر احمد...... تیسرے چوتھے اور پانچویں روز بھی کمپنی کی وہی گاڑی اسی سڑک سے گزری۔ حسن رضا ظہیر ولد ظہیر احمد، حسن رضا ظہیر ولد ظہیر احمد۔

چھٹے روز راستہ بدل گیا اور کئی ہفتے بدلا رہا۔ قبرستان کے اندر سے گزرتی وہ گمنام سی سڑک مسلسل حسن کی نظروں سے اوجھل رہی۔ لیکن اپنا ہم نام کتبہ جیسے اُس کے تصور میں گہرا ثبت ہوتا چلا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی وہ وقت تھا جب حسن نے اپنی ''حقیقی ذاتی زندگی'' کو زیادہ حقیقی بنانے کا ہلاکت خیز فیصلہ کیا۔ غیر احتمالی اور ناممکن کے درمیانی پُرخطر مگر محفوظ زمان و مکان میں جیتے چلے جانے کی بجائے وہ حقیقی اور غیر حقیقی کے چکر میں پڑ گیا۔ سیدھے سیدھے ممکن اور ناممکن کے پھیر میں آ گیا اور یوں دنیا میں براہِ راست مداخلت کرنے کی فاش غلطی کا مرتکب ہوا۔ حالانکہ اب بھی وہ اپنے اندر قائم ہونے والے متبادل منظر ناموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے مطمئن ہو سکتا تھا۔ اب بھی ایسا ممکن تھا...... وہ سوچ سکتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ نام کے تینوں الفاظ میں کہیں نہ کہیں کوئی فرق ہو جو کتبے کے پرانے ہونے، فاصلے اور گاڑی کی رفتار زیادہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آتا ہو۔ مثلاً حسن، محسن ہو سکتا ہے، احسن ہو سکتا ہے۔ الف مٹ سکتا ہے۔ رضا ضیا، شفا، عطا ہو سکتا ہے اور ظہیر صغیر، سفیر، امیر، کبیر، دستگیر کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اگر کہیں آخری نام ظہیر ہی تھا تو پھر بھی ظاہر ہے آخری نام اکثر باپ کے نام پر رکھا جاتا ہے۔ یعنی ظہیر احمد، آخر ہم نام افراد کے ہم نام باپ بھی تو ہو سکتے ہیں۔ یہ بہت

کم ممکن ہے لیکن ناممکن تو نہیں اور جو ناممکن نہیں اسے کبھی نہ کبھی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا اور پھر حسن اپنے ہمیشہ کے آخری متبادل کے طور پر سب کچھ "ہوسکتا ہے میری نظر کا دھوکہ ہو" کے کھاتے میں بھی ڈال سکتا تھا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ نہیں اس کے ذہن کے کسی حصے نے پہلی دفعہ احتجاج کیا ہوگا۔ دھوکہ ایک بار ہوسکتا ہے۔ دو بار ہوسکتا ہے تین بار شاید...... لیکن یوں بار بار تو نہیں ہوسکتا، کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن "حسن کی صورت حال" پر ہماری یہ مداخلت محض خیال آرائی ہے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں اور اب آخری بار چلتے ہیں۔

وہ ایک ڈراونی شام تھی۔ لیکن اُس شام کی اس کیفیت کا حسن کے احساس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک اجتماعی سا احساس تھا جو شاید اس لیے قائم ہوا تھا کہ اکتوبر کی شام میں ایسے گہرے سرخی مائل سیاہ بادل گھر آئے تھے جو عموماً سال کے اس مہینے میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ مغربی افق پر خون رنگی سرخی تھی اور شاید پیچھے آندھی تھی۔ تاریکی یک دم اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوگوں نے بتیاں جلائی تھیں اور شاید کسی ایک بوڑھے نے کہا بھی تھا یا شاید محض سوچا تھا کہ ایسی لال کالی اندھیری آندھی اُس نے اُس وقت دیکھی تھی جب فلاں کا قتل ہوا تھا۔ لیکن یہ محض فرضی اور لایعنی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ حسن رضا ظہیر کے گھر کے اُس کمرے میں بتیاں پہلے ہی روشن تھیں جہاں اُس کے اہل خانہ، بیوی، بیٹے اور بیٹی انتہائی پر اعتماد انداز میں پرانے مکان کی فروخت کا سودا پراپرٹی ڈیلر اور ان دو افراد کے ساتھ کر رہے تھے جنھیں پراپرٹی ڈیلر نے "پارٹی" کہا تھا۔ سودا کامیابی سے طے پانے کے بعد "پارٹی" نے بھی گھر سے نکلتے وقت کہا تھا "کیسا خوفناک موسم ہے"۔ موسم کے خوفناک ہونے کے باوجود گھر میں سودے کی کامیابی پر بہت خوشی کا اظہار کیا گیا جس میں حسن بھی پوری طرح شامل تھا۔ چند ماہ میں اسے ریٹائرمنٹ کے بعد زر خطیر بھی ملنے والا تھا۔ سب کچھ کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

حسن اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نیچے اہل خانہ مستقبل کی تفصیلات طے کر رہے تھے اور انہیں بدل بدل کر دیکھتے تھے اور نت نئے متبادلات پر بحث کرتے تھے۔ ڈراونی شام ڈراونی رات میں بدل رہی تھی۔ اسی رات کے دس بجے حسن رضا ظہیر نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ اسے اسی وقت اپنے ہم نام کتبے یعنی اپنے ہم نام کے کتبے کو براہ راست اور باقاعدہ دیکھنے کے لیے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا

ہے۔ اس نے کوئی معقول بہانہ بنا کر گھر سے نکلنے کی کوشش بھی نہ کی بلکہ ایک چھوٹی جیبی ٹارچ جیب میں ڈال کر وہ ڈراونی رات میں نکل آیا جس کے ڈراونے پن میں ہم سمجھتے ہیں کہ اب حسن کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا، ایک ایسے شخص کا احساس جو زندگی میں پہلی بار کوئی خوفناک ممنوعہ کام کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

حسن رضا ظہیر ولد ظہیر احمد، تاریخ پیدائش..... یعنی وہی تاریخ جو حسن کی اپنی تاریخ پیدائش تھی۔ غیر احتمالی اور ناممکن کے درمیان زندہ رہنے والے شخص کے لیے "ناممکن" کا پہلا جھٹکا نا قابل برداشت تھا۔ لیکن وہ پھر سنبھلا۔ نہیں یہ ناممکن نہیں کہ کسی شخص کا نام ولدیت اور تاریخ پیدائش ایک ہی ہوں۔ یہ بے حد کم ممکن ہے انتہائی غیر احتمالی ہے لیکن ناممکن نہیں اور جو ناممکن نہیں اسے کبھی نہ کبھی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ تاریخ وفات ہے جو فیصلہ کرے گی، حسن نے سوچا، جو ہم سمجھتے ہیں سوچنا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کی جیبی تارچ کی لرزتی روشنی کتبے پر کندہ تاریخ وفات کی طرف بڑھی...... تاریخ وفات بھی وہی تھی جو تاریخ پیدائش تھی۔ اگلتے خوف کے لمحات کا براہ راست تعاقب کرنے والے شخص کے لیے "ناممکن" کا دوسرا جھٹکا ناممکن تھا اور ڈراونی رات حسن رضا ظہیر کو اپنے ہم نام کتبے یا اپنے ہم نام کے کتبے پر گرتا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حسن رضا ظہیر کی کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض کہانیاں ختم ہونے کے باوجود جاری رہتی ہیں اور بعض جاری رہنے کے باوجود ختم ہو جاتی ہیں۔ ہم اس کہانی کو جاری رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں، حسن ڈراونی رات سے واپس پلٹ سکتا تھا، لیکن اس سوال کا جواب دینا ناممکن ہے کہ اس نے اس بات کو قطعاً ناممکن کیوں سمجھ لیا کہ کسی شخص کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یہ تو بے حد امکانی ہے اگرچہ ایسے شخص کی عمر وقت کے مختصر ترین دورانیے سے لے کر سورج کے ایک دن تک محدود ہو گی۔ ہو سکتا ہے حسن کا ہم نام کتبہ پروف ریڈنگ میں غلطی کا پہلا کیس ہو اور اس لحاظ سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کا پہلا امیدوار بن سکتا ہو۔ ہو سکتا ہے سنگ مرمر پر گرنے والی تیزابی بارشوں نے کندہ تاریخوں کے اعداد کو اس طرح بدل دیا ہو کہ تاریخ پیدائش اور وفات پڑھنے میں ایک جیسی لگتی ہوں۔ ہو سکتا ہے قبرستان کے کسی شرارتی گورکن نے دونوں تاریخوں کو بگاڑ کر ایک جیسا کر دیا ہو۔ ہو سکتا ہے کمزور روشنی میں حسن کو دونوں تاریخیں ایک جیسی نظر آئی ہوں یعنی آخری متبادل

کہ ''یہ سب کچھ میری نظر کا دھوکہ ہے''۔ لیکن یہ سب متبادلات ایسے شخص کے لیے کھلتے ہیں جو ''اُچٹتی منظر بینی'' کے درمیان اٹکتے خوف کے لمحوں سے اچک کر آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی براہ راست ان کا خلا پُر کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

حسن کی کہانی اگر جاری ہے تو یہ ختم بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے، ہم سمجھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ حسن نے اس لمبے ڈراؤنی رات میں کھلے سورج مکھی کے پھولوں کو دیکھا ہو اور سنائے میں گونجتی سکول کی گھنٹیوں کی آواز سنی ہو۔ ہو سکتا ہے۔

....

(2)

حیرت کی ادارت

حسن کے حیرانیے

(مطالعہ اختیاری: پیچیدہ فکری مباحث سے نالاں قاری اس باب کو نظر انداز کر سکتے ہیں)

''ہو سکتا ہے''.................................. سمجھا جا سکتا ہے کہ ''اچٹتے خوف کی داستان'' نامی تحریر کے آخر میں مرکزی کردار ''حسن رضا ظہیر'' کی زندگی بھی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ آخری منظر نامہ واضح طور پر اُس کی موت کی طرف اشارہ کرتا نظر آتا ہے اگرچہ مصنف بوجوہ اس بارے میں کوئی آخری فیصلہ دینے سے بھی گریز کرتا ہے۔ وہ شخص جو ساری عمر ''اُچٹتی منظر بینی'' کی بظاہر ''حقیقی ذاتی زندگی'' جیتا رہا ــــ (یہاں ہم ''بظاہر'' پر اصرار کریں گے) ــــ اور جسے جینے کے مواقع اُسے صرف اپنے ملازمتی معمول میں ایک محدود دورانیے کے روزانہ سفر کے دوران ہی ملتے تھے۔ ڈراؤنی رات کے کسی پہر میں اپنی زندگی کے آخری تحیر انگیز اور ناقابل فہم لمحات کو قابل فہم بنانے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اپنے ایک ایسے ہم نام فرد کے کتبے پر گرتا نظر آتا ہے جس کی اس دنیا میں اپنی زندگی بھی شاید چند لمحوں سے زیادہ طویل نہیں رہی تھی۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ''حسن کی صورت حال'' کو سمجھنے کے لیے اُچٹتے خوف کی داستان کے انجام کی یہ تعبیر ناقص ہے۔ ہماری یہ رائے اُس ادارتی حیثیت میں ہے جسے ''حیرت کی ادارت'' کا قدرے انوکھا نام دیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ادارت بھی اتنی ہی حیران کن ہے جتنے حسن کے ''حیرانیے''۔ ''حیرانیہ'' یہ خودساختہ لفظ بھی بعض نازک طبائع

کے لیے حیرانی کا باعث بنے گا۔ لیکن چونکہ ''حیرت کی ادارت'' کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ بار بار ''اچٹتے خوف کے لمحات''، ''اُچٹتی منظر بنی'' اور ''خوف کے اکاؤ'' جیسے رکاوٹی الفاظ کی بجائے ایک ہی نسبتاً رواں دواں لفظ استعمال کیا جائے خواہ وہ لفظ پہلے سے لغت میں موجود ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کی صورت حال کے بیان کے لیے ''حیرانیہ'' ایک موزوں ترین لفظ ہے۔ حیرانیہ بنیادی طور پر حسن کے بصری میدان (Visual field) میں اچانک ظاہر ہونے والا وقوفی خلا (Cognitive void) ہے۔ ایک خالی جگہ جو ایک طرف تحیر کا نقطۂ آغاز ہے تو دوسری طرف ایک حیاتی، عصباتی، کیمیاوی مسودہ۔ اس کی وضاحت آگے کی جائے گی۔ چنانچہ حسن کی صورت حال جہاں ''خالی جگہیں پُر کرو'' کے حکم کی تعمیل کی صورتِ حال ہے وہاں تحیر کے جبر کی صورت حال بھی ہے۔

اس لیے ''حیرانیے'' کے جبر سے —— جبر جو کہ خوف، غصہ، بے بسی، نفرت، ذلت اور شاید موت کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے —— اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوششیں اُن سب ذہنی کیفیات کو جنم دیتی ہیں جن کا ادھورا ذکر اُچٹتے خوف کی داستان میں کیا گیا ہے۔ حسن کے ''حیرانیوں'' کی یہ سب کیفیات حیرت انگیز طور پر کہانیوں سے مشابہت رکھتی ہیں لیکن یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ بہرحال یہ کہانیاں نہیں ہیں۔ ''حیرانیہ'' حسن میں ایک انوکھا تحرک پیدا کرتا ہے جس کا ایک بڑا مقصد (ہم ''ایک'' پر اصرار کریں گے) ''حیرانیے'' سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اور اُس کی یہ کوشش، ممکن ناممکن، احتمالی غیر احتمالی، امکانی غیر امکانی، حقیقی غیر حقیقی کی روایتی پابندیوں سے کافی حد تک آزاد ہے اور حسن چونکہ کہانی نویس نہیں اس لیے وہ ایک حیرت سے نجات کے لیے کوئی دوسری حیرت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ایک انتشار کے خاتمے کے لیے کوئی دوسرا انتشار بھی اپنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ذہنی طور پر۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حسن کی صورت حال کو مکمل انتشار سے بچانے کے لیے اُس کے حیرانیے شناخت کیے جائیں اور پھر اُن کے تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ حیرت کی ادارت کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ کیسی ''ادارت'' ہے کہ جو کسی تحریر شدہ مسودے پر کام نہیں کرتی۔ فی الحال ہم صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ ''حیرت کی ادارت'' کا مسودہ ''حیرانیہ'' تحریر قبل از تحریر کا مسودہ ہے جو صرف حسن کے حسی، ہیجانی اور وقوفی نظام میں کیمیاوی تبدیلیوں کی

شکل میں رقم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حسن کے اعصابی نظام میں رونما ہونے والے بائیو کیمیکل اعمال کو کسی نہ کسی طرح (ہم ''کسی نہ کسی طرح'' پر اصرار کریں گے) لفظی اور بیانیہ واقعات کی ترتیب دینے کی کوشش کریں۔

یہاں اس ادارتی کوشش کا موازنہ ایک اور معروف ادارتی سرگرمی سے کرنا بھی اول الذکر کی تفہیم کے لیے سودمند رہے گا۔ ہماری مراد فلمی ادارت یا آسان زبان میں فلم ایڈیٹنگ سے ہے۔ آہ فلم۔ فلم اور خواب...... فلمی مدیر بصری اور صوتی مناظر کے لاتعداد ٹکڑوں میں ایک مخصوص ترتیب کو یقینی بنا کر اُس تجربے کی تخلیق کرتا ہے جسے کامیاب فلم کہا جاتا ہے۔ لیکن اُس کی یہ تخلیق ہر لمحے اُس تحریر کی تابع ہوتی ہے جسے سکرپٹ کہا جاتا ہے۔ ''حیرت کی ادارت'' بھی ''ایک سطح'' پر (ہم ''ایک سطح'' پر اصرار کریں گے) نہ صرف سمعی بصری بلکہ حیاتی اوراکی، ہیجانی اور تجربی ٹکڑوں کو مرتب اور مربوط کرنے کا ایک عمل ہے۔ لیکن فلم ایڈیٹنگ اور ''حیرانیوں'' کی ایڈیٹنگ میں مماثلت یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ فلم ایڈیٹنگ ایک سمعی بصری انتشار میں سے، ایک معلوم اور متعین مسودے کی رہنمائی میں اعلیٰ سطح کی سمعی و بصری تجسیم کرتی ہے جبکہ حیرانیے کا آغاز بھی گو حسی اوراکی اور وقوفی انتشار سے ہوتا ہے لیکن کسی رہنما لسانی مسودے کی عدم موجودگی کے سبب اس کا آخری مطمع نظر بذاتِ خود کسی نامعلوم یا شاید گمشدہ مسودے کی تلاش بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حیرت کی ادارت فلم کی ادارت سے مخالف سمت میں سفر ہے۔ گویا فلم کی تخلیق معلوم لفظی مسودے سے حیاتی تجربے کی طرف حرکت پر مبنی ہے جبکہ ''حیرانیہ'' حیاتی، اوراکی (وسیع ترین معنوں میں) تجربے سے نامعلوم لفظی مسودے کی طرف حرکت کرتا ہے۔

اس وضاحت یا شاید مزید الجھاؤ (طبائع کا لسانی رد عمل حیرت انگیز حد تک مختلف ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک حیرانیہ ہے۔ یا شاید نہیں ہے) کے بعد ہم دوبارہ اُس نکتے کی طرف آتے ہیں کہ حسن کی یہ کیفیات جنہیں ہم نے ''حیرانیوں'' کا نام دیا ہے کہانیاں نہیں ہیں۔ اب ہم اس دعویٰ کو ان الفاظ میں بھی پیش کر سکتے ہیں کہ ''حسن کی صورت حال'' کو سمجھنے کے بنیادی مقصد کے حصول کے لیے ہم ''حیرانیوں'' کے جن مسودوں کو تلاش یا دریافت کرنے میں کامیاب ہوں گے محال ہے کہ وہ ادبی زمرہ بندی کے معلومہ قوانین کے مطابق افسانہ کہانی

ناول ڈرامہ داستان یعنی فکشن کی کوئی بھی مستند شکل اختیار کر سکیں۔ اس عدم تشکیل کی متنوع وجوہ میں سے ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ (اور اس کا ذکر ایک سطح پر پہلے بھی کیا گیا) حیرانیہ فکشن کے اساسی تضادات۔ انتخابات اور تعمیمات یعنی حقیقت، غیر حقیقت، امکانی غیر امکانی، احتمالی غیر احتمالی، موضوعی معروضی سے مبرا و ماورا صورتِ حال ہے۔ اور اس لحاظ سے ایک غیر متعین مسودہ ہے۔ اور یہ عدم تعین صرف مضامینی (Disciplinary) ہی نہیں بلکہ زمانی اور مکانی بھی ہے۔ کہانی کے برعکس کہ آغاز اور انجام کے بغیر کہانی کا تصور بھی محال ہے حیرانیہ آغاز و انجام کی شرائط سے آزاد ہونے کی وجہ سے بظاہر اختتام کو پہنچنے کے باوجود جاری رہ سکتا ہے جیسا کہ ہم نے اُچھلتے خوف کی داستان نامی حیرانیے میں دیکھا۔ اور بظاہر جاری رہنے کے باوجود بھی دراصل ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

اس صورت حال کا ایک عمومی اور اضافی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ''حسن کی صورت حال'' درحقیقت حسن رضا ظہیر نامی شخص کی زندگی سے پہلے بھی جاری تھی اور اُس کی موت کے بعد بھی جاری رہے گی۔ (خالی...... پُر...... کا...... ازل سے ہے)(1)۔ حیرانیہ ایک عمومی صورت حال ہے گو اُس کا سفر یہاں ایک فرد کے ایک مخصوص سفر کے تحیر انگیز لمحات تک محدود ہے۔ لیکن حیرت کے قارئین جانتے ہیں کہ عمومی کی خصوصی میں تجسیم عمومی کی صداقت کو نہ صرف برقرار رکھتی ہے بلکہ اُسے زیادہ قابل فہم اور متاثر کُن بناتی ہے۔ اس نقطے کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسا کہ طب کے طالب علم جانتے ہیں کہ بعض امراض گو ہر مرض کی طرح اپنے آزار کے اعتبار سے عمومی انسانی ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات اپنے کسی دریافت کنندہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی طبیب John Lagdon Haydon Down نے ذہنی پسماندگی کی ایک قسم دریافت کی جو بعد میں Down Syndrom کہلائی۔ اب ظاہر ہے Down Syndrom طبیب J.L.H.Down سے پہلے بھی موجود تھا اور بعد بھی موجود ہے۔ جہاں تک ''حسن کی صورتِ حال'' کے بیان کا تعلق ہے۔ ہم بھی عمومی طور پر ''اُچھلتے خوف کی داستان'' کے مصنف کے آزمودہ استعارے پر ہی انحصار کریں گے یعنی سفر۔ ہم سفر۔ ہم حسن کے ساتھ اُس کے سفر پر نکلیں گے اور بہت دیر اور بہت دور تک اُس کے

(1) ہچکیں، کروہ، حیرانیہ۔

ساتھ چلیں گے۔ اب ''اُچھلتے خوف کی داستان'' تو جوں توں گزر گئی۔ لیکن آگے چل کر ممکن ہے کہ حسن کے نئے ہم سفر اس داستان میں حسن کی زندگی کے بعض حیران کن پہلوؤں پر کوئی سوالیہ بحث چھیڑنا چاہیں اور مدیر حیرت سے کچھ وضاحتیں طلب کریں۔

ان ممکنہ سوالات کے حوالے سے فی الحال ہم یہ وضاحت پیش کریں گے کہ اُچھلتے خوف کی داستان بھی درحقیقت ایک ''حیرانیہ'' ہے گو تمہیدی ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں کہانیہ ہونے کا ''خواندگی واہمہ'' پیدا کرتا ہے۔ ''حسن کی صورت حال'' میں ایک حیرت سے نجات کسی دوسری حیرت کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ جبکہ ''کہانیے'' میں اور خاص طور پر ''مضبوط کامیاب کہانی'' میں حیرت کے خاتمے کا جشن منایا جاتا ہے۔ اور ہم یہاں کہہ ڈالتے ہیں کہ ''کہانیے'' کے برعکس ''حیرانیے'' میں حیرت کے تسلسل کا ماتم منایا جاتا ہے اور اس طرح یہ ماتم بھی جشن کی ہی ایک صورت ہے۔ کہانیے کا مسودہ اور حیرانیے کا مسودہ دونوں حیرت کے خام مال کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ''کہانیہ'' حیرت کے خام پن کو برداشت نہیں کرتا جبکہ ''حیرانیہ'' حیرت کے خام پن کو نہ صرف دوام بخشنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کہیں کہیں تو اُس کے تقدس کی خوف زدگی کا شکار ہو کر اپنی قوت بیانیہ کو ہی مفلوج کر بیٹھتا ہے۔ اس لحاظ سے ''حیرت کی ادارت'' ایک جان جوکھوں کا کام ہے جو کبھی تو ہر قابل شناخت علامت کی موت پر منتج ہو سکتا ہے اور کبھی خالص حیرت کی قربان گاہ میں ناقابل واپسی داخلے کا پروانہ بن سکتا ہے ہمیں ان اختتامی حیرتوں پر بھی حیرت ہے۔ کیا ''حیرانیہ'' — کہانیہ قبل از کہانیہ ہے یا کہانیہ مابعد از کہانیہ ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ کیا واقعی؟ حیرت ہے۔

ہم سمجھتے ہیں وقت آ گیا ہے کہ نہ صرف ہم حسن کے ہم سفر بنیں بلکہ اس ہم سفری کی دعوت عام دیں۔ لیکن یہاں ہم ایک مزید ادارتی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ حسن کے سفر میں ہر ''حیرانیہ'' ایک منزل، مقامِ حیرت یا حیرت کے پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کی ترتیب ''حسن رضا ظہیر'' نامی شخص کی زندگی کی واقعاتی ترتیب کے تابع نہیں ہے۔ گویا ''حیرانیوں'' کی ترتیب ہماری اپنی ہوگی اور جیسا کہ ظاہر و باہر ہے وسیع ترین معنوں میں ترتیب کاری ہی ہر طرح کی ادارت کی اساس ہے یہاں ایک بار پھر یہ استفسار کیا جا سکتا ہے کہ آخر ہماری اس بظاہر انتہائی مشکوک ادارت کے رہنما اصول کیا ہوں گے۔ کیا ہم سچائی کا

بول بالا چاہتے ہیں؟ اعلیٰ انسانی اقدار کی سربلندی کے داعی ہیں؟ کیا ہم جمالیاتی تقاضوں کو فوقیت دیں گے؟ اور یہ کہ کہیں ہم کسی خفیہ سیاسی ایجنڈے یا ایجنسی کے لیے تو کام نہیں کر رہے۔ اس طرح کی تمام رجائی توقعات کا فی الفور خاتمہ کرتے ہوئے ہم یہ اعتراف کریں گے کہ سچ اور جھوٹ، خیر وشر، حسن و قبح، مذہبی لا مذہبی، سیاسی غیر سیاسی سرے سے ہمارا مسئلہ ہی نہیں۔ ہمارا مسئلہ محض حیرت ہے اور اس مسئلے کا حل بھی حیرت میں ہی ہے۔ کیونکہ حیرت ایک خالص وجدانی کیفیت ہے جو تضاد کے کسی جوڑے میں مقید نہیں۔ سچ جھوٹ، نیکی بدی، خوبصورتی بدصورتی، خوشی غمی، اپنی ضد کے غلام ہیں۔ سچ کی تفہیم جھوٹ کے بغیر ناممکن ہے حُسن...... وغیرہ وغیرہ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حیرت کی کوئی ضد نہیں۔ "غیر حیرت" یا "عدم حیرت" نام کی کوئی کیفیت نہیں۔ حیرت خوشگوار ہو سکتی ہے اور ناخوشگوار بھی لیکن حیرت دونوں صورتوں میں حیرت ہی رہتی ہے۔

مدیرِ حیرت کے بارے میں ایک اور خوش فہمی بھی جنم لے سکتی ہے جس کا فوری ازالہ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ لیکن ہم کچھ بات ضرور کریں گے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ گویا ہم حسن کے بھوت مصنف ہیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ہمیں نہ صرف حسن کا بھوت مصنف بلکہ حسن کا بھوت بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہمارے مدیر کے مداخلتی اختیارات تو برقرار رہیں گے ہی لیکن ساتھ ہی ایک عالمِ کُل قادرِ کُل مصنف کے لامحدود امکانات بھی ہم پر کُھل جائیں گے اور جو کچھ ہم جان لیں گے حسن نہیں جان سکتا صرف انسانوں کے بارے میں ہی نہیں بلکہ بظاہر بے جان چیزوں کے بارے میں بھی۔ چیزوں کو بہت نظر انداز کیا گیا ہے۔ لیکن "حسن کی صورت حال" چیزوں کی تاریخی صورت حال بھی ہے۔ آہ! صورت حال سے کوئی مفر نہیں!

آخر میں ہم دیکھیں گے کہ حسن کی "خالی جگہیں پُر کرو" کی کوششیں دنیا میں نکلنے یا براہِ راست مداخلت کرنے کا تقاضا کرتی ہیں یا نہیں۔ اور اول الذکر صورت میں حسن کو اُس کے عدم مداخلتی تحفظ کی حالت میں چھوڑ کر ہم نکلیں گے گو یہ حیرت کی ادارت کا سب سے پُرخطر مرحلہ ہوگا۔

آخری ادارتی وضاحت یہ ہے کہ یہ آخری ادارتی وضاحت نہیں ہے۔ اور حیرانیوں کے درمیان۔ حیرانیوں کے دوران۔ حسن کا بھوت یا بھوت مصنف بننے کے ساتھ ساتھ اس

طرح کی متعدد ادارتی مداخلتیں پیش آ سکتی ہیں۔ اور ایسی بھی جو پہلے پیش کی گئی تمام وضاحتوں اور بیانات کا قلع قمع بھی کر سکتی ہیں۔ اور نتیجہ پھر حیرت ہوگا جو اصل بات ہے۔ تو آیئے حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن آگے چلنے کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ بھی اوپر لکھا گیا ہے اُسے یکسر فراموش کر دیا جائے۔ جیسے یہ کوئی لاتحریر ہو۔ حذف شدہ عبارت ہو یا جیسے کوئی پریشان کن خواب ہو۔ آہ خواب۔ حسن کے حیرانیے۔ چیزوں کے خواب—

(3)

کباڑ خانہ

ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی

کباڑیے کی وہ دکان سڑک کے بہت قریب ہے اور پھر اُس نے اپنا کاٹھ کباڑ بھی اتنا پھیلا رکھا ہے کہ چند لمحوں کے لیے قریب سے رینگ کر گزرتی کسی سواری میں بیٹھا کوئی شخص اگر چاہے تو نہ صرف اُس کی دکان کے سامانِ تجارت کا ایک اُچٹتا سا جائزہ لے سکتا ہے بلکہ وہ کباڑیے اور اُس کے کسی گاہک کے درمیان ہونے والی کسی گفتگو کو بھی چند لمحوں کے لیے سُن سکتا ہے۔

حسن دیکھتا ہے کہ ایک منحنی سا آدمی پتلی سی رسی میں بندھے ریڈرز ڈائجسٹ رسالوں کا ایک بنڈل کباڑیے کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ٹریفک رُکی ہوئی ہے حسن کی وین تھوڑا سا آگے رینگتی ہے۔ کباڑیہ دس روپے کا نوٹ آدمی کی طرف بڑھاتا ہے۔ منحنی آدمی لڑکھڑا سا جاتا ہے۔ حسن سُنتا ہے۔

منحنی آدمی: ''صرف دس روپے اتنے سارے تو رسالے ہیں۔''

کباڑیا: ''دس پندرہ سال پرانے ہیں۔ اس سال کے نہ سہی اس دہائی کے تو ہوتے۔ پانچ تجھے اوپر دے دیتا۔ کون سی دہائی چل رہی ہے بھلا۔''

منحنی آدمی: ''اکائی دہائی سینکڑا ہزار......''

کباڑیا: (ہنستا ہے) ''شاباش......اسی کی دہائی چل رہی ہے چندا، پر تیرے لیے تو سب دہائیاں برابر ہیں۔ یہ لے اٹھنی اوپر لے۔ تین دن کا نشہ تیرا نکل آئے گا۔ چل پُھٹ۔''

منحنی آدمی مایوسی سے پیسے لیتا ہے اور جاتا ہے۔

وہ ایک غیر گرم دن ہے جو ابھی سرد نہیں ہوا۔ سہ پہر اور شام کے درمیان کا وہ وقت ہے جب انسانیت ''کام کا ایک اور دن'' گزر جانے کے بعد کسی نہ کسی جانب پلٹ جاتی ہے۔ یہ واپسی کا وقت ہے۔ حسن کے لیے بھی، مگر کباڑیے کے لیے نہیں، اور یہ بات حسن بھی دیکھ سکتا ہے۔ مگر حسن یہ نہیں جانتا کہ کباڑیے کے لیے واپسی کا وقت کوئی بھی نہیں۔

کباڑیا جس کا نام ارشاد ہے پینتالیس سالہ دُبلا پتلا شخص ہے۔ اُس کے لمبوترے چہرے پر سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں اور ناک بلکہ نتھنے ہیں جو نتھنے پھڑکنے کی قومی اوسط سے کہیں زیادہ پھڑکتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت دیکھنے اور سونگھنے کی حالت میں رہتا ہے لیکن دیکھنے والے کو جلد اندازہ ہوتا ہے کہ کباڑیے کی آنکھیں صرف دیکھتی نہیں بلکہ فیصلے دیتی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہ صرف ایسی چیزوں کا مالک ہے جنھیں ایک دنیا رد کرتی ہے اور دوسری قبول کرتی ہے۔ وہ رد و قبول کے درمیان سودے لگاتا ہے۔ وہ ڈرائنگ روموں اور کچرے کے ڈھیروں کے درمیان اس طرح براجمان ہے کہ چیزوں کو کچرا بننے سے ذرا پہلے اُچک لیتا ہے اور انہیں ایک نئی زندگی دیتا ہے۔

حسن شاید یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ کباڑیا حیرت انگیز سرعت سے رسالوں کی چھانٹی کر کے دو تین چھوٹی ڈھیریاں لگا چکا ہے اور اب شراب کی ایک خوبصورت صراحی نما خالی بوتل پر سے گرد صاف کر رہا ہے۔ پرتگالی شراب کی اس بوتل کے ارد گرد پھیلی ہوئی اور اُس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متعلق حقیقی انسانی دنیا کے بارے میں کباڑیا کچھ بھی نہیں جانتا۔ مثلاً وہ نہیں جانتا کہ سبز شیشے کی صراحی نما بوتل کے اوپر چپکا لیبل کسی خوبصورت وادی میں سفر کرتے گھڑ سوار کی جو تصویر دکھا رہا ہے اُس کا تعلق شراب بنانے والی اس پرتگالی فیملی کے ایک خاندانی Legend سے ہے۔ تیرھویں صدی میں اس خاندان کا ایک بہادر نوجوان صلیبی جنگ میں حصہ لینے کے لیے یروشلم کی طرف گیا۔ مُورز کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد اُس نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک مُور کو شراب پینے کے جرم میں کوڑے مارے جا رہے ہیں اور سزا کے بعد وہ مر جاتا ہے یا شاید محض ادھ موا ہوتا ہے لیکن الفانسو ڈیاز پیزارو کو یہ منظر اس قدر دہشت زدہ کرتا ہے کہ وہ صلیبی جنگ میں شرکت سے باز آ کر لزبن واپس چلا جاتا

ہے۔ اُس کی سوچ یہ ہے کہ جو دشمن اپنے ہی کسی آدمی کو بغیر کسی جرم کے یوں ہلاک کر سکتا ہے وہ اُس کا کیا حشر کرے گا۔ لیکن اُس کی ایک سوچ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنی بقیہ زندگی شراب سازی اور "محبت سازی" میں گزارے گا۔ الفانسو آئندہ پچاس برس یہی سب کچھ کرتا ہے اور اگلی پانچ صدیوں تک پیزارو خاندان کے سربراہ بھی اسی روایت پر دلجمعی سے عمل کرتے ہیں۔ انیسویں صدی میں جب پرتگال میں شراب سازی جدید صنعت بنتی ہے تو خاندان کا حالیہ سربراہ گاچو پیزارو اپنا خاندانی Legend ایک آرٹسٹ سے مصور کرا کے لیبل بنوا کر بوتلوں پر ثبت کرواتا ہے۔ پیزارو خاندان سے باہر بہت ہی کم لوگ اس Legend کے بارے میں جانتے ہیں لیکن ہم بہرحال جانتے ہیں۔

کباڑیا صرف اتنا جانتا ہے کہ غیر ملکی شرابوں کی طرح طرح کی خالی بوتلیں اُس کے پاس بیچنے والے شخص کا نام اشرف ہے جو اُس کا ہم عمر ہے اور کسی بڑی کوٹھی میں ڈرائیور ملازم ہے اور زیادہ امکان یہ ہے کہ اُس کا صاحب کوئی گورا ہے یا اُس کا گوروں کے ساتھ کوئی گہرا تعلق ہے۔ کباڑیا اشرف کے صاحب کے اس "گہرے تعلق" کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُس کا صاحب کئی یورپی ممالک میں سفیر رہنے کے بعد اب وزارت خارجہ میں ایک بہت اہم منصب پر فائز ہے۔ اور یوں کباڑیے کا شک درست ہے کہ اس کا گوروں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ وہ، گاہے بگاہے ملک و قوم کی تقدیر بدلنے والے خانوادوں میں سے ایک کا چشم و چراغ ہے۔ اشرف اُس کے علاقے کا ہے۔ مڈل پاس ہے۔ پندرہ سال پہلے اُس کے بھائی اکرم نے جب اپنی بہن کو گاؤں کے ایک نوجوان سے ہم آغوش دیکھ کر دونوں کو غیرت کے لیے قتل کیا تو دونوں بھائی پکڑے گئے۔ لیکن پھر اکرم جیل چلا گیا اور اشرف شہر میں اپنے صاحب کے گھر ملازم ہو گیا۔ اکرم تین سال کی جیل تربیت کے بعد رہا ہوا تو بین الاضلاعی ڈکیتیوں کا انتظام کرنے والے ایک گروپ میں اُسے معقول ملازمت مل گئی۔ جبکہ اشرف ڈرائیور بن گیا اور دن کو ڈرائیوری اور رات کو سرونٹ کوارٹر میں نئے نئے چلے کرائے کے وی سی آر پر ٹرپل ایکس فلمیں دیکھ کر زندگی گزارنے لگا۔ صاحب کے ہاں عشرے مہینے بعد ہونے والی بین الاقوامی پارٹیوں میں اتنا کچھ بچ جاتا تھا کہ وہ چاہتا تو اگلی کئی راتوں کے لیے دھت رہ سکتا تھا لیکن وہ اعتدال سے کام لیتا تھا البتہ خانسامے سے

خالی بوتلوں کا تقاضا ضرور کرتا تھا جو اُس کے ایک بڑے بورا نما بیگ میں چاکلیٹوں کے خوبصورت خالی ڈبوں، رنگین باتصویر انگریزی رسالوں وغیرہ کے ساتھ اکٹھی ہوتی رہتی تھیں۔ دو تین ماہ بعد جب صاحب اور بیگم صاحب جہاز میں ایک دوسرے شہر اپنے والدین سے ملنے جاتے تو وہ ایک بڑی گاڑی میں اُن کا کئی طرح کا سامان لے کر پیچھے پہنچتا تھا اور بین الاقوامی تحفے تحائف کے بنڈلوں کے ساتھ اُس کے بڑے بورا بیگ کو بھی آسانی سے جگہ مل جاتی تھی۔ جس کے اندر بند سامان کی قدر و قیمت جاننے والے دوسرے شہر کے کباڑیے ارشاد کو وہ اب بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

لیکن جو بات اشرف بھی نہیں جانتا تھا وہ یہ تھی کہ سبز شیشے کی وہ صراحی نما پرتگالی شراب کی بوتل خانسامے نے کسی پارٹی کے بعد اُسے اُٹھا کر نہیں دی تھی بلکہ صفائی کے شاف میں شامل ایک ملازم نے صاحب کی اسٹڈی میں خالی پڑی اٹھا کر اُسے دی تھی۔ اور گھر میں صرف صاحب ہی یہ جانتا تھا کہ وہ بوتل دراصل اُس کے ایک مصری دوست نے اُسے سالگرہ کے تحفے کے طور پر دی تھی مگر یہ بات صاحب اور اُس کا مصری دوست دونوں نہیں جانتے تھے گو ہم جانتے ہیں کہ لزبن کی winery کے تہہ خانے میں بیس سال تک aging کی مدت پوری کرنے کے بعد جب بوتلوں کی اس کھیپ کو فروخت کے لیے مہیا کیا گیا تو اگلے دن ہی وہ سو سو کے دو بڑے آرڈرز کی صورت میں پیک ہو کر الگ الگ منزلوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیک کرنے والے ملازم نے ان دو سو بالکل ایک جیسی بوتلوں میں سے اسی بوتل کو اُٹھا کر پہلے کی بجائے دوسرے آرڈر کے لیے کیوں پیک کر دیا اس کی وجہ کوئی نہیں جانتا وہ ملازم بھی نہیں حتیٰ کہ ہم بھی نہیں جانتے۔ لیکن اگر یہ پہلے آرڈر میں شامل ہو جاتی تو اتنا تو یقینی ہوتا کہ یہ بحر اوقیانوس عبور کر کے بالآخر Los Vegas کے ایک کاسینو کی Topless بار کی زینت بن جاتی اور جواریوں کی ہار جیت میں شامل ہو جاتی۔ اگر یہ بوتل ان دونوں کھیپوں میں شامل ہونے کی بجائے گودام میں ہی پڑی رہتی تو آیندہ برسوں میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انسانوں کے کئی نہایت معمولی دھندوں میں شامل ہونے سے لے کر غیر معمولی مقامات اور واقعات کے سنگین چکر میں جا پھنستی۔ ساتھ کی گلی کا پرانا شرابی ڈاکٹر بھی اسے خرید کر لے جا سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چند برس بعد یہ کسی اور کھیپ میں پیک ہو کر مشرقی جرمنی کے

شہر برلن میں دیوار برلن گرنے سے پہلے جا پہنچتی۔ اس کے بعد اِس بوتل کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ یہ سوویت ایمپائر کے زوال پر جشن منانے والوں کے کام آ جاتی اور مغربی سرمایہ داری کے ذریعے متوقع خوشیوں کی آمد کی خوشی کو دوبالا کرتی۔ اور پھر اُن میں سے کوئی اسے دیوار سے ٹکرا کر کرچی کرچی کر دیتا اور اس کے سبز شیشے کے جسم سے برآمد ہونے والا پہلا اور آخری چھناکا ہنگامہ خیز فتح مندی کے قہقہوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ مارکسزم اور کمیونزم پر پختہ یقین رکھنے والے کسی یونیورسٹی پروفیسر کے ہاں جا پہنچتی اور خالی ہونے سے پہلے اُس کی افسردگی اور فکری انتشار کو اُس کے لیے قابل برداشت بناتی اور اُسے یہ باور کرنے میں معاونت کرتی کہ ''قرونِ وسطیٰ'' میں رہنے والے قبائلیوں کے مذہبی جنون کو ہمارے خلاف استعمال کر کے فتح یاب ہونے والا مغرب ایک دن خود اُن کے جنون کی اندھی طاقت کا شکار بن جائے گا''۔ پروفیسر کے ذہن میں اتنا بڑا واہمہ پیدا کرنے تک بوتل کا خالی ہو جانا یقینی ہو جاتا۔ مستقبل میں اِس بوتل کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

مگر جو کچھ بھی محض ہو سکتا ہے ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا اور وہ بوتل حقیقتاً رونما ہونے والے واقعات کے ایک طویل سلسلے کے بعد بالآخر ارشاد کباڑیے کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جو بخوبی جانتا ہے کہ اس طرح کی خالی بوتلوں کے قدر دان اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ قصباتی عطار، شربت فروش۔ نچلی درمیانی آبادیوں میں سائیکل پر لاد کر انواع و اقسام کے اصلی نقلی تیل بیچنے والے۔ بوتلوں میں پانی بھر کر فریج مشین میں رکھنے والے متمول گھرانوں کے بعض غیر شادی شدہ نوجوان جو اپنے جیسے دوستوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس غیر ملکی نعمت غیر مترقبہ کے حصول پر قدرت رکھتے ہیں۔ پھر خاص طور پر اس سبز شیشے کی صراحی نما بوتلوں میں پانی ڈال کر اُس میں منی پلانٹ لگانے اور کمرے میں سجانے والے/والیاں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں کباڑیا محض شوقین لوگ سمجھتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ ایسی بوتلوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایسا ہی ایک نوجوان اکٹھی پچاس کے قریب بوتلیں اُس سے خرید کر لے گیا۔ کباڑیے کو آج تک علم نہیں ہو سکا کہ اُس نے ان بوتلوں کا کیا کیا۔ درحقیقت وہ نوجوان یونیورسٹی کے آرٹس ڈیپارٹمنٹ کا طالب علم تھا اور مجسمہ سازی کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اپنے فائنل امتحان کے کام جسے وہ تھیسس کہتا تھا ___ کے لیے اُس نے بوتلوں سے ایک مجسمہ بنانے کا فیصلہ کیا

تھا۔ اُس نے سفید سیمنٹ، پلاسٹر اور دوسرے جوڑنے والے کیمیکلز کی مدد سے بوتلوں کو ایک خاص ترتیب میں جوڑا پھر ان میں سے کچھ کو خالی چھوڑ دیا اور کچھ کو مختلف رنگوں کے پانیوں سے بھر دیا۔ اور دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ وہ جدید مجسمہ ایک ایسے باریش انسانی چہرے جیسا نظر آتا تھا جس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا اور منہ بھی خون اگل رہا تھا۔ مجسمہ ساز نے اپنے شاہکار کو ''برداشت کا کلچر'' کا عنوان دیا لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے تھیسس کو اپنی ڈگری کے امتحان کے لیے پیش نہ کر سکا۔ طلباء کے ایک گروہ نے راتوں رات ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو کر ''برداشت کا کلچر'' ہتھوڑوں سے چکنا چور کر دیا۔ اور ایک طرف دیوار پر لکھ دیا ''اس ڈیپارٹمنٹ کا بھی وہی حشر ہو گا جو سومنات کا ہوا تھا۔'' مجسمہ ساز طالب علم بے چارہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اُس کی خریدی ہوئی بوتلوں کے ساتھ یہ سب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ چیزوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے چیزوں کے مالکوں یا اُن کے قرب و جوار میں موجود انسانوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ چیزیں بول نہیں سکتیں اور چیزوں کے لیے بولنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ انسان بھی اکثر بول نہیں سکتے لیکن بعض اوقات انہیں کوئی نہ کوئی اُن کی جگہ بولنے والا مل جاتا ہے۔ یہاں مدیرِ حیرت کے طور پر ہمیں حیرت ہے کہ چیزوں کے لیے بولنے کی ایک اچھی خاصی تخلیقی روایت تھی جو ہم نے اپنے بچپن میں دیکھی لیکن پھر نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ پنپ نہ سکی۔ ہم نے خود ''کھوٹے سکے کی کہانی''۔ ''ایک ٹوٹی کرسی کی سرگزشت'' اور ''ایک ٹوپی کی داستان'' جیسے موضوعات پر جواب مضمون قلم بند کر کے امتحانات میں اچھے خاصے نمبر حاصل کیے ہیں۔ جیسے پہلے کہا گیا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ حسن کے حیرانیوں کے بیانیہ فرائض سرانجام دینے کے سلسلے میں جہاں بھی ممکن ہوا اور ضروری ہوا ہم چیزوں کے لیے بولیں گے۔ خواہ وہ کباڑیے کی دکان کی چیزیں ہوں یا کچھ اور ___ ہم جانتے ہیں کہ حسن مدتوں اس کباڑیے کی دکان کے سامنے سے گزرتا رہا لیکن...... فی الحال ہم سبز شیشے کی صراحی نما بوتل کے لیے مزید نہیں بولیں گے۔ کیونکہ حسن دیکھتا ہے کہ ارشاد کباڑیا بوتل کو گرد سے صاف کرنے کے بعد واپس رکھ چکا ہے۔ اور دو اور گاہکوں سے گفتگو میں مصروف ہو گیا ہے۔ یہ دونوں گاہک بے حد گھبرائے ہوئے لگتے ہیں جیسے کوئی آفت اُن کا پیچھا کر رہی ہو۔ اُن کی آوازیں کسی اضطراب اور تاسف

کی غمازی کرتی ہیں۔ حسن حیرت سے سوچتا ہے کہ ان پر کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ وہ سُننے کی کوشش کرتا ہے حسن جانتا ہے کہ اُس کے پاس یہی چند لمحے ہیں جن کے دوران وہ اُس گفتگو کو سُن سکتا ہے لیکن عمر بھر کے تجربے سے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ چند لمحوں میں گو بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہے لیکن اُس کے مقابلے میں بہت کم سُنا جا سکتا ہے اور اس لمحے سُننا دیکھنے سے زیادہ اہم ہے۔ اور ٹریفک رکی ہوئی ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ گفتگو کسی سنگین مسئلے کے بارے میں ہے لیکن پھر حسن طنزیہ انداز میں مسکراتا ہے...... کباڑیے کی دکان، ردی، کاٹھ کباڑ، فالتو، متروک، بے کار، پھینکنے کے لائق چیزوں کی اس کباڑ دنیا میں ایسا کیا سنگین مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن تین افراد کی باہمی گفتگو میں سے حسن کے لیے قابلِ سماعت بننے والا پہلا فقرہ ہی اُس کے سوالیہ تمسخر کا نہ صرف خاتمہ کر دیتا ہے بلکہ آئندہ صورتحال کا رُخ بھی ہمیشہ کے لیے متعین کر دیتا ہے۔ کباڑیے سے گفتگو کرنے والے دو افراد میں سے ایک تیس پینتیس سالہ درمیانے قد کا کلین شیوڈ مرد ہے جس کے ماتھے پر زخم کا لمبا نشان ہے وہ عینک استعمال کرتا ہے۔ پتلون قمیض میں ملبوس ہے اور گہرے بارعب لہجے میں ہاتھوں کو فیصلہ کن حرکت دے کر باتیں کر رہا ہے۔ دوسرا ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہے جو گیروے رنگ کے موٹے کھدر کا کُرتا شلوار پہنے ہوئے ہے۔ یہ شخص بھی عینک استعمال کرتا ہے اور اسی شخص کی بھرائی ہوئی آواز ہے جو حسن کے تمسخر کا خاتمہ کرتی ہے۔

ادھیڑ عمر: "دیکھو بھائی ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی۔"

کباڑیا: "عالی جاہ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے ادھر کچھ بھی ردی نہیں۔ میرے لیے ادھر کوئی مال فالتو نہیں۔ اچھا یہ بتائیں بیچنے کون لایا تھا آپ کا مال......؟

ادھیڑ عمر اور جوان عمر ایک دوسرے کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

ادھیڑ عمر: "......آ......وہ......چھوٹا بھائی......ہاں......چھوٹا بھائی لایا تھا۔ میرا داماد ساتھ تھا۔ کافی چیزیں تھیں۔ ہم نے رہائش بدلی تو کافی چیزیں فالتو نکلی تھیں۔ سوچا کباڑیے کو بیچ دیں۔"

جوان عمر: (آہ بھرتا ہے) "میں نے کہا بھی تھا سر۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔ ہو سکتا ہے میری نظر پڑ جاتی۔ بلکہ میں نے تو لے ہی جانا تھا کمپوزنگ کے لیے۔ میں فوٹو کاپی کرا لیتا

تو......تو یہ انجام......"

کباڑیا: "......اچھا......وہ......جو پک اپ میں لایا تھا۔ عینک اُس نے بھی لگائی ہوئی تھیں۔ کافی چیزیں تھیں......"

جوان عمر: "ہاں۔ ردی۔ اخبار۔ رسالے۔ کاپیاں۔ کتابیں۔ فائلیں...... گتے کے ڈبے۔ بوتلیں۔ ٹوٹے قلم دان...... کچھ ایسا ہی ہو گا سر؟"

ادھیڑ عمر: "ہاں ریڈیو ٹوٹے ہوئے پرانے۔ ٹیپ ریکارڈر۔ کیسٹیں......"

کباڑیا: "ہاں جی...... ہاں جی...... جی جی۔ بالکل۔ اچھا مال تھا۔ کافی کچھ نکل گیا۔"

جوان عمر: "نکل گیا...... اوہو...... سارا...... بتاؤ سب کچھ......"

کباڑیا: "نہیں کچھ ادھر پڑا ہے ابھی...... آپ کی چیز کیا تھی...... ویسے؟"

دونوں افراد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور حسن ان کی طرف دیکھتا ہے۔

ادھیڑ عمر: "ہم خود دیکھ لیں گے۔ ڈھونڈ لیں گے...... کدھر پڑا ہے...... باقی...... (خود کلامی۔ بڑبڑاتے ہوئے) میں نے کہا بھی تھا نہ کرو...... رہنے دو...... کیا ملا......"

جوان عمر: "کدھر پڑا ہے؟ جلدی کرو...... چلو......"

کباڑیا: "کوئی ایک جگہ تھوڑا پڑا ہے سر جی اخباروں کی ردی ادھر پڑی ہے۔ کاپیاں اُدھر (کئی اطراف میں مبہم اشارے کرتا ہے) رجسٹر۔ گتے۔ کتابیں۔ بجلی کی چیزیں...... آپ کی چیز کیا تھی......"

ادھیڑ عمر: "ہم دیکھ لیتے ہیں......"

جوان عمر: (کباڑیے سے) "لیکن اگر نہ ملا تو...... بتاؤ......"

کباڑیا: "تو پھر نکل گیا جو بھی مال تھا...... بک گیا...... آپ کی ردی دوسروں کا سودا۔ تھوک کا گاہک۔ چھوٹا گاہک۔ دوسروں کا کباڑ۔ سر ماتھے پر۔ لیا اور گیا۔ لیکن چیز کیا تھی......"

ادھیڑ عمر: "جو بھی تھی نہ ملی تو بڑی تباہی آئے گی......"

جوان عمر: "بڑا نقصان ہو گا...... مائی گاڈ...... سر یہ کیا ہو گیا......"

کباڑیے کی آنکھیں ناچتی ہیں اور نتھنے زور زور سے پھڑکتے ہیں۔ وہ دونوں افراد کو دکان کے اندر چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔

تینوں افراد کا مکالمہ حسن کی پہنچ سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر اگلے ہی لمحے ٹریفک چل پڑتی ہے اور کباڑیے کی دکان بھی اُس کی نظروں سے دور ہو جاتی ہے اور حسن سوچتا ہے کہ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جس کا ردی میں بک جانا ان لوگوں پر تباہی لا سکتا ہے۔ لیکن اُس شخص نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تباہی اُن پر آئے گی اُس نے تو چیز نہ ملنے کی صورت میں بڑی تباہی آنے کی خبر دی تھی۔ خبر دی تھی......؟ یا کسی خدشے یا خوف کا اظہار کیا تھا؟ یا کوئی دھمکی دی تھی؟ کیا کباڑیے کو؟ مگر کباڑیے کو کیوں؟ تو کیا اُس نے ساری دنیا کو دھمکی دی تھی کہ اگر انہیں اُن کی ردی میں بک جانے والی چیز واپس نہ ملی تو دنیا پر تباہی آئے گی۔ کیسا احمقانہ خیال ہے۔ بالکل احمقانہ۔ تو پھر کیا صرف چند نامعلوم افراد پر تباہی نازل ہو گی؟...... خدا کرے ان کو اُن کی وہ چیز واپس مل جائے جو اگرچہ ردی میں بک گئی ہے لیکن پھر بھی واپس مل سکتی ہے اور تباہی ٹل سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی بہت قیمتی چیز ہو گی۔ کیا زمین کے کاغذات۔ رجسٹریاں۔ مگر یہ چیزیں بہرحال دوسروں کے کس کام کی۔ تو کیا سیدھے سیدھے کرنسی نوٹ۔ یا پرائز بانڈ۔ او میرے خدا کل ہی پرائز بانڈوں کی قرعہ اندازی ہوئی ہے۔ یہ بات...... ان لوگوں کا کوئی ایسا پرائز بانڈ ردی میں بک گیا ہے یعنی نکل گیا ہے ردی کاغذوں میں چُھپا ہوا جس پر ان کا کوئی بہت بڑا انعام نکلا ہے۔ اور وہ رقم ان لوگوں کی—— کسی بھی طرح کے لوگوں کی زندگی بدل سکتی تھی۔ لیکن اب ان کے خواب چکنا چور ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ہو چکے ہیں کہ جس طرح بے بسی سے وہ ادھیڑ عمر شخص ہاتھ مل رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا اور گاہے بگاہے جوان عمر شخص کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کیا پرائز بانڈ انہیں واپس مل جائے گا؟ کبھی نہیں۔ کباڑیا ہی انہیں اُن کی ردی تک پہنچنے نہیں دے گا۔ وہ تاڑ گیا تھا۔ وہ انہیں اِدھر اُدھر گھما کر فارغ کر دے گا۔ اور بعد میں خود تلاش کر لے گا۔ کیونکہ اُس سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی۔

حسن کے لیے اتنا کافی ہے خالی جگہ پُر ہو چکی ہے۔ وہ مطمئن آگے بڑھتا ہے۔ ردی میں بک جانے والے انعام یافتہ پرائز بانڈ کی رقم اُس کے تصور میں پانچ لاکھ ٹھہرتی ہے

اور پھر یک دم غائب ہو جاتی ہے کیونکہ اچانک اُس کی نظر سڑک پر بکھرے بے شمار بینگنوں پر جا پڑتی ہے۔ گول گول جامنی رنگ کے بینگن جگہ جگہ گرے نظر آتے ہیں اور ٹریفک اُن کے اوپر سے گزرتی انہیں کچل رہی ہے۔ تھس تھس کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں عجیب منظر ہے۔ یہ کیا ہوا ہے کسی سبزی والے کی ریڑھی الٹ گئی ہے یا اس سبزی سے متنفر کسی شخص نے اس کے بعض ہم نسل افراد سے انتقام لینے کا یہ انوکھا طریقہ نکالا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے...... کہ......

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مناسب یہ ہو گا کہ ہم فی الحال حسن اور اُس کے بینگنوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں اور حیرت کی اُس صورت حال کی طرف پلٹیں جسے اُس نے کافی عجلت میں ایک احتمالی انجام تک پہنچا کر شاید اپنا ذاتی ''حیرانیاتی'' توازن بحال کر لیا ہے۔ ہو سکتا ہے حسن کی اس عجلت کی وجہ بینگن ہی رہے ہوں یا شاید وہ غیر گرم دن جو ابھی سرد نہیں ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو لیکن کسی قیمتی چیز کا فالتو شے کے دھوکے میں بک جانا کیسی تباہیاں لا سکتا ہے اس سوال نے ہمارا توازن جس طرح درہم برہم کیا ہے اُسے پھر سے بحال کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس ''حیرانیے'' کی بنیادی صورت حال جس طرح کے متنوع، گو بظاہر انتہائی غیر احتمالی المیوں یا تباہیوں کو جنم دے سکتی ہے بطور مدیر حیرت اُن کی طرف اشارہ کرنا ہمارا ادارتی فرض ہے۔ کیونکہ بقول مصنف ''اُچٹتے خوف کی داستان''، ''انتہائی غیر احتمالی بھی ناممکن نہیں ہوتا اور جو ناممکن نہیں اُسے کبھی نہ کبھی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا''۔

دیکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ کباڑیے سے مضطربانہ گفتگو کرنے والے دونوں افراد یعنی جوان عمر شخص اور ادھیڑ عمر شخص کی شناخت پر بھرپور توجہ نہیں دی گئی۔ چونکہ حسن کی طرف سے یہ جاننے، تصور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لیے ایسی کوشش بہر طور ہمیں کرنا ہو گی۔ ہم یہاں یہ واضح کر دیں کہ یہاں کوشش سے ہماری مراد ایسی کوشش ہے جس کوشش پر کامیاب کوشش یا ناکام کوشش کا حکم نہیں لگایا جا سکتا اور جو غیر احتمالی اور ناممکن کے درمیان پھیلے ''حیرانیوں'' کے پُرخطر زمان و مکان میں جنم لیتی ہے اور وہیں اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ چنانچہ اس کوشش کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے ہم ادھیڑ عمر شخص کو صفدر سلطان اور جوان عمر کو سعید کمال کا نام دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ان دونوں افراد کو جن مناصب اور مقامات پر موجود دیکھ سکتے ہیں اُن کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں یہی نام دینا مناسب ہے کیونکہ یہ معتدل نام

ہیں اور کرداروں اور احوال کی تبدیلی کے وقت اپنی کوئی ذاتی صوتی مصیبت کھڑی نہیں کرتے۔ مثلاً ہم ان دونوں افراد کو لہراسپ ضرغام اور ابتسام ذوالقرنین کے نام نہیں دے سکتے...... لیکن ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں کیونکہ یہ ہمیں غیر متعلقہ مسائل میں الجھا سکتی ہے۔ ہم یہ دیکھنے نکلتے ہیں کہ صفدر سلطان اور سعید کمال نامی یہ دونوں کردار کن کن زمانوں میں...... کیسے کیسے ادوار میں...... کیسے کیسے روپ میں اور کس کس موسم میں کباڑیے ارشاد کی دکان پر اُسے یہ بتانے کے لیے پہنچ سکتے ہیں کہ ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی۔

مسودہ جو دنیا کی تاریخ بدل سکتا تھا

غیر گرم دن ابھی سرد نہیں ہوا لیکن کیا کباڑیے کی دکان کے پچھلے کمرے میں فرش پر بچھے ایک عجیب و غریب بستر پر آڑا ترچھا پڑا پروفیسر صفدر سلطان کا جسم سرد ہو چکا ہے؟ پروفیسر کا سابقہ شاگرد عزیز سعید کمال اور دکان کا مالک ارشاد دونوں نہیں جانتے۔ کسی گاہک کے اس کی دکان میں غش کھا کر گر جانے کا یہ اُس کا پہلا تجربہ ہے۔ ارشاد سگریٹ کے ایک کارٹن سے پھاڑ کر الگ کیے گتے سے پروفیسر کے چہرے پر ہوا کر رہا ہے اور نہیں جانتا کہ آیا اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے یا کچھ اور۔ پنکھے کی ہوا سے بستر کے ایک اُدھڑے پھٹے ہوئے کونے میں سے مہین ملائم پروں کی روئیں اڑتی ہیں اور سعید کمال حیران ہوتا ہے کیونکہ کافی پڑھا لکھا اور ایک ہونہار بیوروکریٹ ہونے کے باوجود اُس نے کبھی سلیپنگ بیگ نہیں دیکھا اور خاص طور پر اس طرح کا اعلیٰ کوالٹی کا سلیپنگ بیگ جو کوہ پیما مہم جو استعمال کرتے ہیں اور جو صفر ڈگری سے بھی نیچے کے درجہ حرارت میں اُن کے جسموں کی حرارت کو ان کے لیے محفوظ رکھتا ہے۔ ارشاد کباڑیے کو نارنجی رنگ کے اس سلیپنگ بیگ کی ان خوبیوں کا کچھ اندازہ ہے۔ اُس کے اس علم کی بنیاد غنچہ گل ہے جو کوہ پیمائی کے علاقے میں واقع ایک باکفایت ہوٹل KK Heights میں ملازم ہے۔ غنچہ گل سیزن کے دوران غیر ملکی ٹورسٹوں کے کمروں میں پیچھے رہ جانے والی فالتو ردی چیزیں جو مکمل ردی نہیں ہوتیں اور اُن کے علاوہ واپس جاتے اپنا بوجھ ہلکا کرتے کوہ پیماؤں سے اونے پونے خریدی قیمتی چیزیں سب اکٹھی کر کے سال میں ایک بار گرم میدانوں میں واقع کباڑیے کے شہر میں لا کر اُس کے پاس بیچتا ہے۔ وہ اپنے جگری دوست

چنار گل کے کمرے میں قیام کرتا ہے جو ایک بیکری میں کام کرتا ہے۔ غنچہ گل اپنے اس قیام کے دوران ارشاد کباڑیے کے شہر کی گرم سردی اور چنار گل سے اپنے پرانے ہم جنسی تعلق کی پُر جوش تجدید سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ارشاد اُسے مال کی اتنی رقم ادا کرتا ہے کہ نہ صرف اُس کا آنے جانے کا کرایہ نکل آتا ہے بلکہ وہ شہر کی کچھ سوغاتیں بھی اپنے گھر والوں کے لیے خرید لیتا ہے۔ ارشاد کباڑیا اپنے اس گاہک کی قدر و قیمت خوب جانتا ہے اور وہ اُس کی لائی ہوئی بعض چیزیں مثلاً کیمرے۔ دوربینیں۔ ٹینٹ۔ فولادی چاقو وغیرہ اپنے بعض مخصوص گاہکوں کے لیے محفوظ کر لیتا ہے جو سارا سال اس کھیپ کا انتظار کرتے ہیں۔ اب اگرچہ وہ جانتا ہے کہ اُس کا یہ سلیپنگ بیگ آسانی سے بکنے والا نہیں۔ لیکن ایسا اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُس کی دکان میں غش کھانے یا دل کا دورہ پڑنے کے بعد گرنے والے پہلے گاہک کو بھی اس سلیپنگ بیگ پر لٹایا جائے گا جو غنچہ گل کے ہاتھوں کسی غیر ملکی کوہ پیما نے بیچا تھا یا ہو سکتا ہے اُس نے چرایا ہو یا ہوٹل چھوڑتے وقت کوہ پیما کے کمرے میں رہ گیا ہو...... اللہ بہتر جانتا ہے یا غنچہ گل جانتا ہے۔

لیکن جو بات غنچہ گل بھی نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ نارنجی رنگ کے اس سلیپنگ بیگ کا امریکن مالک پال رش مور سرے سے کوئی کوہ پیما نہیں تھا بلکہ وہ فلموں میں اسپیشل افیکٹس بنانے والی ایک کمپنی FX Wizard میں کام کرتا تھا اور دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں مہم جوئی پر مبنی ہالی وڈ کی ایک فلم کی ابتدائی تیاری کے سلسلے میں لوکیشنز دیکھنے کے لیے اپنی کمپنی کے ساتھ دنیا کے ان علاقوں میں آیا تھا۔ اور کام ختم ہونے کے بعد آسانی سے اپنا سلیپنگ بیگ اس تھرڈ کلاس پہاڑی ہوٹل کے کمرے میں بھول آیا تھا۔

بحیرہ اوقیانوس کے اوپر سان فرانسسکو کے لیے پرواز کرتے ہوئے اچانک اُسے اپنے سلیپنگ بیگ کا خیال آیا تھا اور پھر یہ خیال کہ وہ اُسے کہاں بھول آیا ہے لیکن وہ پھر بھی مطمئن تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب اُسے اس سلیپنگ بیگ اور دنیا کے ان علاقوں میں جا کر اس میں سونے کی کبھی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ اُس کا اسپیشل افیکٹس کا کام اسٹوڈیو تک محدود ہوگا اور پروڈکشن کے ساتھ ساتھ اُسے Chroma Key اور Blue Screen کے ذریعے حیرت انگیز مناظر بنانے والی ٹیم کے ساتھ بس اپنے حصے کا کام کرنا ہوگا۔ لیکن پال

رش مور یہ نہیں جانتا تھا کہ سان فرانسسکو کے FX Wizard اسٹوڈیو میں پہنچنے کے دوسرے دن ہی ایک انتظامی فیصلے کے تحت اُسے قراقرم کے فلک بوس پہاڑی سلسلوں میں مجوزہ کوہ پیمائی کے تھرلر کے لیے کام کرنے کی بجائے ایک دوسرے فلم پراجیکٹ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے گا جو اگرچہ فی الحال کاسٹنگ کی سطح پر تھا مگر جس کے بارے میں کئی افواہیں فلمی حلقوں میں گردش کر رہی تھیں جن میں سے تین خاص دلچسپی کی حامل تھیں۔ پہلی تو یہ کہ فلم کا بجٹ ایک ریکارڈ ہو گا۔ دوسری یہ کہ اگرچہ یہ فلم ایک ناول پر مبنی ہو گی لیکن فلمی روایت کے بالکل برعکس منتخب کیا گیا ناول مقبول عام ہونے کی بجائے ایک انتہائی غیر معروف ناول ہے اور تیسری افواہ یہ تھی کہ فلم اسپیشل ایفیکٹس والوں کے لیے ایک چیلنج ہو گی۔ پال رش مور ظاہر ہے کہ ابھی ایسے کسی چیلنج کی نوعیت سے قطعاً لاعلم تھا یوں بھی وہ اس فلم/ناول کی کہانی اور سکرپٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ابھی مسودہ ایک محفوظ دستاویز تھا۔

ہم بہرحال نہ صرف اس غیر معروف ناول، اُس کے مصنف اور اُسی کے تحریر شدہ فلمی مسودے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مصنف انتھونی گالاگر (Anthony Galager) کا ناول تصادم، The Clash جس سال طبع ہوا اُس سے کچھ برس پہلے پولیٹیکل سائنٹسٹ ہنٹنگٹن (Huntington) نے امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ میں اپنا وہ شہرہ آفاق خطبہ دیا جو بعد میں اُس کے آرٹیکل ''تہذیبوں کا تصادم'' The Clash of Civilizations کی بنیاد بنا۔ لیکن ہم یہاں اس شہرہ آفاق خطبے کی بات کرنے کی بجائے اس دلچسپ اتفاق کی بات کریں گے کہ گالاگر کے ناول The Clash کا موضوع بھی بنیادی طور پر تہذیبوں کا تصادم ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا ہنٹنگٹن خفیہ طور پر اس ناول کے بنیادی خیال سے متاثر ہوا تھا؟ ہم اس دلچسپ سوال پر کسی قسم کی کوئی رائے نہیں دیں گے کیونکہ اس طرح طے شدہ امور کے بارے میں تحقیقی تصادم پیدا ہو سکتا ہے۔ یوں بھی The Clash ایک سائنس فکشن ناول ہونے کے ناتے کہانی کو محض عمرانی علوم کی بجائے ٹھوس سائنسی علوم خاص طور پر جینیٹکس، بائیوٹیکنالوجی اور نانوٹیکنالوجی کے اپنے دور کے نظریات، تحقیق اور تخیلاتی توقعات کے سہارے آگے بڑھاتا ہے اور اسے ایک سانس روکنے والے ایکشن تھرلر کی شکل دیتا ہے۔ ناول کے مرکزی خیال کے مطابق ہر ثقافت اور پھر مجموعی طور پر

ہر تہذیب میں اپنے علاوہ باقی ہر ثقافت اور تہذیب پر غلبہ حاصل کرنے بلکہ بعض کے ہاں تو دوسروں کو سرے سے تہہ تیغ کر دینے کی جو شدید خواہش پائی جاتی ہے اُس کی حقیقی وجہ ثقافتی یا تہذیبی یا تاریخی نہیں بلکہ جینیاتی ہے۔

ناول کی کہانی کے مطابق—— لیکن ہم ناول کی بجائے اب فلم کی کہانی کو لیتے ہیں کیونکہ فلمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اکثر فلمی مسودہ ناول سے بہت زیادہ انحراف کر جاتا ہے اور پال رش مور کے اسپیشل ایفیکٹس کا تعلق بھی اسی مسودے سے تھا نہ کہ اصل ناول سے۔ تراجم اور اضافوں کے ساتھ سکرین پلے تحریر کرنے کے لیے جب اصل مصنف یعنی انتھونی گالاگر کی خدمات ہی حاصل کی گئیں تو اُس نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اگر اُس کے فراموش شدہ ناول کو ایک نئی زندگی نہ مل جاتی تو چند دنوں بعد ہی وہ اپنے بڑے بھائی جم گالاگر کے Real Estate کے کاروبار میں شامل ہو کر اور ناول نگاری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر ایک نئی زندگی اختیار کرنے والا تھا۔

The Clash نامی فلم کی کہانی کا آغاز سائنسدانوں کے ایک کثیر الثقافتی گروپ کی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا تعلق بھی دو مختلف تہذیبوں سے ہے۔ یہ سائنسدان انسانی Genome پر تحقیق کر رہے ہیں اور اسی تحقیق کے دوران وہ 'تہذیبی جین' دریافت کرتے ہیں جو انسانوں میں اپنے ہم نسل، ہم مذہب، ہم زبان، ہم تاریخ انسانوں کے لیے شدید وابستگی پیدا کرنے کے بعد دوسرے یعنی ''غیر'' کو مطیع کرنے پر اکساتا ہے۔ بات صرف یہیں نہیں رُکتی بلکہ ہیرو ہیروئن جو جینیٹک انجینئرنگ اور نانوٹیکنالوجی کے شعبوں میں عالمی شہرت کے سائنسدان ہیں، شب و روز کی محنت کے بعد ایک ایسی مشین بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کی جسامت ایک عام بیکٹیریا سے بھی کہیں کم ہے—— یعنی ایک سینٹی میٹر کے لاکھویں حصے سے بھی کم۔ یہ روبوٹ بیکٹیریا جسے رابرٹ ون کا نام دیا جاتا ہے انسانی جسم میں داخل ہو کر تہذیبی جین کی کارکردگی کو بے اثر بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

رابرٹ ون کے مؤثر ہونے کی تصدیق کے لیے ابتداً افریقہ کے دو متحارب قبیلوں میں سے جو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کی نسل کشی کے درپے ہیں، چار افراد کو دو دو کے جوڑوں کی شکل میں منتخب کیا جاتا ہے اور پھر دونوں قبائل کے ایک ایک فرد کے جسم میں رابرٹ ون

چھوڑا جاتا ہے۔ دونوں تجرباتی صورتوں میں روبوٹ بیکٹیریا دونوں قبیلوں کے ایک ایک فرد کو دوسرے غیر کا مکمل مطیع بنا دیتا ہے۔ ہیرو ہیروئن ان تجربات کو انتہائی خفیہ رکھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ اپنی دریافت اور ایجاد کے انتہائی تباہ کن مضمرات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ لیکن جیسا کہ فلمی طور پر ناگزیر ہے تہذیبی / ثقافتی جین اور رابرٹ ون کا راز راز نہیں رہتا اور سنسنی خیز واقعات کے ایک سلسلے کے بعد وِلن جوڑے کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ مرد و زن بھی اعلیٰ پائے کے سائنسدان ہیں اور در پردہ ایک ''عالمی تہذیب'' کے خفیہ اداروں کے ایک انتہائی خفیہ گروپ کے لیے کام کر رہے ہیں جو عالمی غلبہ حاصل کرنے کے لیے جدید ترین سائنسی نظریات اور ٹیکنالوجی کے استعمال پر تحقیق کر رہا ہے۔ تہذیبی جین کی دریافت اور رابرٹ ون کا اس گروپ کے ہاتھ لگ جانا اُن کے دیرینہ خواب کی تعبیر کے مترادف ہے۔ ہر غیر تہذیب کو ہمیشہ کے لیے اپنا مطیع بنا لینا دائمی امن قائم کرنے کا آخری کامیاب منظر نامہ بن سکتا ہے۔

لیکن صورت حال اُس وقت گھمبیر ہو جاتی ہے اور کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس منزل یعنی ''مشن دائمی امن'' کی راہ میں بہت سی پیچیدہ سائنسی اور بظاہر ناقابل حل ٹیکنیکل رکاوٹیں حائل ہیں۔ پہلی تو یہ کہ رابرٹ ون کا استعمال فی الحال صرف چند افراد پر کیے گئے تجربات تک محدود تھا اور اس نانو مشین کو ان کے جسموں میں ایک وقت طلب لیبارٹری پروسیجر کے ذریعے پہنچایا گیا تھا جبکہ ''مشن دائمی امن'' کا تقاضا یہ ہے کہ تمام غیر تہذیبوں کے افراد کے ثقافتی / تہذیبی جین کو بیک وقت غیر مؤثر بنا دیا جائے اس مقصد کے لیے لازم ہے کہ ایک تو روبوٹ بیکٹیریا زندہ بکٹیریوں کی طرح تیزی سے اپنی ''نسل'' بڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ دوسرے اُس کی ساخت یعنی رابرٹ ٹو کی ساخت میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ سانس یا منہ کے رستے براہ راست انسانی جسم میں داخل ہو سکے اور تیسرا مسئلہ ایسے میڈیم کی تلاش ہے جو ''امن کے اس پیامبر'' کو اپنے اندر سمیٹ کر دنیا کے وسیع و عریض علاقوں میں پھیلانے کے بھرپور مواقع فراہم کر سکے۔

''آپریشن دائمی امن'' کی راہ میں حائل سائنسی اور ٹیکنیکل مسائل کو حل کرنے کی صلاحیتیں اگر کسی کے پاس موجود ہیں تو وہ ''ہیرو ہیروئن'' ہی ہیں چنانچہ ان کا اغوا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور فلم ـــــ لیکن ہم رُکتے ہیں اور The Clash نامی فلم کی کہانی اختتام تک تفصیل

سے سُنانے کی بجائے ہم صرف پال رش مور کا مختصراً ذکر کرتے ہیں اور پھر زیادہ قریبی معاملات کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی پال رش مور کے سلیپنگ بیگ پر آڑا ترچھا پڑا پروفیسر صفدر سلطان کا جسم جس کے سرد گرم کے بارے میں ابھی کوئی آخری فیصلہ آنا باقی ہے۔

مختصر یہ کہ بالآخر مسودہ رش مور کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے جس میں ایڈیٹر کی طرف سے وہ تمام حصے نمایاں ظاہر کیے گئے ہیں جو اسپیشل ایفیکٹس والوں سے متعلق ہیں اور پھر خاص طور پر وہ جو صرف اُس کے خصوصی گروپ کو تفویض کیے گئے ہیں۔ رش مور جب رابرٹ ون اور رابرٹ ٹو کے انسانی جسم میں داخلے، شریانوں اور خلیوں میں اُن کے سفر اور جین اور ثقافتی جین پر حملے کی منظر کشی کے بارے میں سوچتا ہے تو اُسے ساٹھ کی دہائی میں بنی ایک فلم Fantastic Voyage یاد آ جاتی ہے جس میں انسانی دماغ کے اندر پہنچ کر ایک انتہائی نازک آپریشن کرنے کے لیے ایک آبدوز کو ڈاکٹروں اور نرسوں سمیت اس قدر مختصر کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک انجکشن کے مائع میں سمٹ آتی ہے۔ خورد بینی آبدوز شریانوں کے خون کے سمندر میں سفر کرتی ہے تو جراثیم دیو پیکر عفریتوں کی طرح اُس پر حملے کرتے ہیں اور ناظرین دنگ رہ جاتے ہیں۔ رش مور جانتا ہے کہ اُن کی ٹیم کے لیے چیلنج یہ ہے کہ وہ ساٹھ کی دہائی کے ایفیکٹس سے کہیں آگے نکلیں لیکن وہ ابھی یہ نہیں جانتا کہ اسپیشل ایفیکٹس بنانے میں حقیقی انقلاب اُس وقت آئے گا جب کمپیوٹر گرافکس کی جدید ترین ٹیکنالوجی اُس کے شعبے پر چھا جائے گی۔ پال رش مور مکمل سکرپٹ کا مطالعہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی رائیٹر نہیں لیکن فلم کی کہانی کے بارے میں اُس کا مجموعی تاثر یہی ہے کہ یہ بھی اُن 'قیامتی' کہانیوں میں سے ہے جن میں دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا خواہش مند کوئی عالمی مجرم یا گروپ کسی نہ کسی طرح کی قیامت برپا کر کے دنیا کی تقدیر بدل دینا چاہتا ہے۔ جیمز بانڈ فلموں کے عالمی مجرموں سے لے کر بعد کی ایسی فلموں کے کئی مناظر اُس کے ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن پھر وہ بڑی بڑی باتیں سوچنے کی بجائے اپنے حصے کے روزمرہ کے روٹین کے کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ انہی دنوں جب اُس کے کچھ ساتھی کوہ پیمائی کے تھرلر کی ٹیم کے ہمراہ قراقرم کی طرف جانے لگتے ہیں تو اُسے لمحاتی طور پر اپنے سلیپنگ بیگ کا خیال آتا ہے۔ لیکن پھر وہ ''دنیا کی تقدیر بدل دینے'' کی تھیم پر مبنی اُس فلمی کہانی کے مسودے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جو بات

پال ظاہر ہے خواب میں بھی نہیں جان سکتا لیکن ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ ٹھیک انہی دنوں دنیا کے ایک اور خطے میں ایک اور شخص نے بھی دنیا کی تقدیر بدل سکنے والا ایک اور مسودہ تحریر کرنا شروع کر دیا تھا جو کسی فلم کا نہیں بلکہ ایک کتاب کا مسودہ تھا اور جس کا چند ہی برس بعد ردی میں بک جانا اُس شخص کے لیے ایک عظیم سانحہ بننے والا تھا۔ اِس سانحے کے بعد اُس شخص پر کیا بیتنے والی تھی؟ یہ سب کچھ وہی شخص جان سکتا ہے جو انسانوں کی کہانیوں سے زیادہ ان کی ''صورتِ حال'' کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اور اس مقصد کے لیے دیگر کئی غیر معمولی بیانیہ اقدامات کے علاوہ چیزوں کی تاریخ نویسی کا حوصلہ رکھتا ہو اور دنیا پر ظاہر کر سکتا ہو کہ پال رش مور کے سلیپنگ بیگ پر آڑا ترچھا پڑا جسم دراصل اُسی شخص کا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدیر حیرت کے علاوہ ایسا حوصلہ کون کر سکتا ہے۔

ارشاد کباڑیا صرف اتنا جان پایا ہے کہ اُس کے پاس کسی گورے کے شاید ہی کبھی بک سکنے والے سلیپنگ بیگ پر بے ہوش ہونے پر لٹایا جانے والا شخص کوئی پروفیسر ہے جس کے لکھے ہوئے کاغذوں کی کچھ فائلیں جنہیں وہ مسودہ کہتا ہے اُس کے پاس ردی میں بک گئی ہیں لیکن ارشاد کباڑیا یہ نہیں جانتا کہ پروفیسر صفدر سلطان ماہر عمرانی علوم کی حیثیت سے اور ایک دردمند مفکر کے طور پر ان بین الاقوامی علمی حلقوں میں ایک کافی جانا پہچانا نام ہے جو پروفیسر موصوف کی اپنی تہذیب میں خرد افروزی کے زوال پر ملول ہوتے ہیں اور پھر تہذیبی انحطاط کے اس مظہر کے اسباب و علل پر تعقلاتی تعمیمات (Conceptual generalizations) وضع کرنے کی جد وجہد کرتے ہیں۔ پروفیسر صفدر سلطان نے بصیرت افروزی کی اُس جہد مسلسل میں اُسی وقت پُرجوش شمولیت اختیار کر لی تھی جب وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے نامور سکالرز کے زیرِ سایہ اپنی تہذیب و تاریخ پر اعلیٰ سطحی تحقیق میں مصروف تھا۔ یہاں ہم ایک خاص واقعے کا ذکر کریں گے جو پروفیسر کی فکری کایا کلپ کا سبب بنا۔ انہی دنوں اُس نے ایک کتاب پڑھی جس میں نیوٹن سے آئن سٹائن اور ہاروے سے لے کر ڈارون تک کے عظیم مغربی سائنسدانوں کے حالاتِ زندگی اور پھر عام فہم انداز میں اُن کے سائنسی نظریات اور پھر انسانی تاریخ پر اُن کے اثرات کا ذکر نہایت مدلل اور مؤثر انداز میں کیا گیا تھا۔ اس کتاب نے پروفیسر صفدر سلطان کے دل و دماغ میں آگ سی لگا دی۔ صاف ظاہر تھا کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد

مغربی تہذیب کے بتدریج اقوام عالم پر غالب آنے کی بنیادی وجہ وہ خرد افروزی (Enlightenment) تھی جو سائنسی علوم کی اساس ہے۔ اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ اگر پروفیسر کی اپنی تہذیب اپنی نشاۃ ثانیہ کے بعد دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی متمنی ہے اور چاہتی ہے کہ چہار دانگ عالم میں بس اُسی کا بول بالا ہو تو پھر اُسے بھی خرد افروزی کی اسی راہ پر چلنا ہوگا اور صرف چل کر نہیں بلکہ بھاگ کر آگے نکلنا ہوگا۔ البتہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے اولاً اُس کے ہم تہذیب مفکروں اور محققین کو خرد افروزی کے اس مخصوص فکر و عمل کے شجر کی جڑیں اپنی تہذیب کی زمین میں ہی تلاش کرنا ہوں گی اور پھر اُسے عقلیت اور تجربیت کی توانائی بخش کھاد مہیا کر کے اس قدر پروان چڑھانا ہوگا کہ اُس کا گھنا سایہ پوری دنیا پر محیط ہو جائے۔

ذہنی کایا کلپ کی وہ کیفیت اس قدر شدید تھی کہ کسی نہ کسی سطح پر فوری مگر دوررس نتائج کا ظہور ناگزیر تھا چنانچہ ایک تو عہد حاضر میں اپنے تہذیبی زوال کو پھر سے عروج کی راہ دکھانے والا، دنیا کی تقدیر بدل سکنے والا علمی و فکری منصوبہ ایک ہی لازوال لمحے میں پروفیسر صفدر سلطان کے جسم و جان میں راسخ ہو گیا، دوسرے ان لمحات کی بے انتہا فکری اور تہذیبی بے چینی نے اُسے اپنا جسم فوری طور پر متحرک کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ ارسطو کی روایت پر گامزن ہے بگا ہے عمل پیرا ہونے کی حاجت محسوس کرنے والے سکالرز کو یونیورسٹی کی طرف سے مہیا کی گئی روشِ فلاسفہ (Philosopher's Walk) کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے کی چہل قدمی کے دوران ہی معاملات مزید آگے بڑھ گئے اور اُس نے اپنی کتاب کے بنیادی خدوخال کے بارے میں کئی اہم فیصلے بھی کر لیے۔ یہ ایک بہت خوش کن آغاز تھا گو ابھی پروفیسر اپنی اس خوشی میں کسی کو شامل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس کا تجربہ تھا کہ اگر فکری و تحقیقی منصوبے قبل از وقت غیر تک پہنچ جائیں تو اکثر اوقات ایک نوع کے ذہنی اسقاطِ حمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاہم مئی کی اُس سہانی شام پروفیسر صفدر سلطان نے اپنی تالیفی، تجزیاتی اور شاید تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اپنے آپ کو انعام دینے اور کسی اچھی جگہ اپنی ضیافت کرنے کا فیصلہ ضرور کیا۔ اُس کے قدم دریائے نیکر کی جانب اٹھ گئے جہاں خوبصورت ماحول میں واقع عمدہ ریستورانوں کی کمی نہیں تھی۔ اچانک اُس کا گزر ایک ریسٹورنٹ کے سامنے سے ہوا جو کچھ عرصہ پہلے تک اُس کا بہت پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا اور صرف اُس کا ہی نہیں بلکہ اُس

کے بہت سے ہم تہذیب افراد کا بھی۔ وہ سب یہاں کی کافی اور گائے کے گوشت کے برگر بہت رغبت سے کھاتے تھے۔ پھر اچانک افواہ اڑی کہ ریسٹورنٹ کا ایک بدبخت شیف گائے کے گوشت میں لحم خنزیر کی آمیزش کرتا ہے۔ اس اندوہناک واقعے پر پروفیسر کی کمیونٹی سراپا احتجاج بن گئی۔ پروفیسر کے ہم تہذیب ساتھی اور طلبہ احتجاج میں سب سے پیش پیش تھے۔ ریسٹورنٹ بند کر دیا گیا ملعون شیف کو معطل کر دیا گیا اور تحقیقات شروع کر دی گئیں کیونکہ خردافروزی کا عمرانی تقاضا یہ تھا کہ تمام تہذیبوں، ثقافتوں اور قومیتوں کے اعتقادات کا احترام کیا جائے۔ لیکن پھر جب ریسٹورنٹ کے مالک نے الزام کی صداقت سے انکار کر دیا تو یونیورسٹی کے شعبہ مائیکروبائیولوجی اور جینیٹکس کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ DNA ٹیسٹنگ کے ذریعے حلال اور حرام میں امتیاز کر سکیں۔ اور نتیجہ جب سامنے آیا تو واقعی الزام غلط ثابت ہوا۔ ہنگامہ اور احتجاج فرو ہو گیا لیکن پروفیسر اور اس کے تہذیبی ساتھیوں کے شکوک و شبہات پھر بھی برقرار رہے اور ریسٹورنٹ سے اُن کا گریز جاری رہا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مذکورہ شیف باعزت بحالی کے موقع پر مبینہ طور پر احتجاج میں پیش پیش پروفیسر کے ایک ہم تہذیب ساتھی کو دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا اور پھر اُسے آنکھ بھی ماری تھی...... لیکن مئی کی اس سہانی شام جب کہ پروفیسر صفدر سلطان خردافروزی اور خردمندی کی ایک زبردست کایا کلپ کے زیر اثر تھا اُسے مذکورہ واقعہ پر اپنا، اپنے ساتھیوں اور اپنی کمیونٹی کا ردعمل بہت نامناسب لگا اور اُس کے خیالات کی رو دریائے نیکر کی لہروں کے ساتھ ساتھ منتشر ہوتی مگر آگے بڑھتی رہی۔

اُس نے سوچا دیکھو اس تہذیبی طور پر انتہائی نازک واقعے کو ان لوگوں نے کیسی خردمندی سے سلجھایا۔ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے فی الفور سب کو باور کرایا کہ وہ دوسروں کی ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی جب معاملہ اُلجھ گیا تو انہوں نے خردافروزی کے ثمرِ عظیم یعنی سائنسی منہاج کو بروئے کار لاتے ہوئے حالیہ برسوں میں سامنے آنے والی DNA ٹیسٹنگ کی جدید ترین سائنسی تکنیک کے ذریعے حلال اور حرام میں ناقابلِ تردید امتیاز قائم کر دیا۔ اس کے باوجود اگر ہمارے ساتھی اس صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں آنے سے گریزاں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سائنسی منہاج کی صداقت کو دل سے

تسلیم ہی نہیں کرتے۔ درحقیقت ہمارے تہذیبی زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے خردافروزی کے دو مسلمات یعنی عقلیت (Rationalism) اور تجربیت (Empiricism) کو کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا کیونکہ بعض اوقات دل سے تسلیم کرنے سے پہلے دماغ سے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور دماغ ہمارا در اصل کہیں اور ہے۔ لیکن ہمارا تہذیبی دماغ ہمیشہ کہیں اور نہیں رہا ایک دور آیا تھا جب ہماری تجربی روح بھی بہت پروان چڑھی تھی...... رازی، ابن سینا، ابن الہیثم اور اُن سے پہلے کے عقلیت پسند معتزلہ پروفیسر کے ذہن میں بار بار آئے اور وہ اپنے پسندیدہ برگر اور کافی کے ساتھ اُن کی یاد تازہ کرتا رہا۔ بل ادا کرنے تک اُس کا یہ یقین غیر متزلزل ہو چکا تھا کہ اگر ہمیں دنیا پر غلبہ حاصل کرنا ہے تو خردافروزی کی اپنی بھولی بسری تہذیبی روایتوں کو پھر سے زندہ کرنا ہوگا۔

اسی شام جواب زیادہ گہری ہو چکی تھی پروفیسر صفدر سلطان نے اپنے علمی وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر انہی الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ میں اپنے تحقیقی و تحریری عزائم کا ذکر پروفیسر ہنز بینڈر (Hans Bender) سے کر دیا جو قرونِ وسطیٰ کی تہذیبوں پر یونانی اثرات کے موضوع پر عالمی اتھارٹی تھا۔ وہ پروفیسر سلطان کی بات سن کر مسکرایا چند لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے کہا۔

''یہ بہت اچھا ہے مسٹر سلطان، لیکن غلبہ حاصل کرنا کیا ضروری ہے؟''

پروفیسر سلطان کو پروفیسر Bender کی مسکراہٹ پریشان کر رہی تھی، ایک لمحے کے لیے اُسے شک پڑا کہ پروفیسر نے اُسے آنکھ بھی ماری ہے۔ اُس کی ذہنی کیفیت عجیب سی ہو گئی لیکن پھر پروفیسر Bender نے بے حد ہمدردانہ انداز میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ بہت دلچسپ ہے اس پر ضرور کام کرو......''

اور پروفیسر سلطان نے اگلے روز ہی اپنے مسودے پر کام شروع کر دیا اور اپنی تہذیب کے ماضی، حال اور مستقبل میں خردافروزی کے سفر کی نئی سے نئی منزلیں دریافت کرنے لگا۔ اس کا یہ کام وطن واپس آنے کے بعد بھی کئی برس تک جاری رہا۔ لائبریریاں، کتابیں، رسائل، نادر مخطوطے، اتھارٹیز سے خصوصی انٹرویو، نوٹس...... محنت شاقہ، اور پھر آہستہ آہستہ مسودے کی تحریری شکل ہاتھ سے لکھے ہوئے یا کبھی کبھار ٹائپ کیے گئے کاغذات کے پلندے

کی شکل میں ظاہر ہونے گی۔ افسوس ہم سمجھتے ہیں کہ مسودے کے تحریری شکل میں ظاہر ہونے کے عمل میں یہی وہ مرحلہ تھا کہ جب ہمارے پروفیسر سے ایک غلطی ہوئی جو ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ سنگین غلطی تھی لیکن بہرحال ایک بڑی غلطی ضرور تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک لحاظ سے بلکہ کئی لحاظ سے اس غلطی کا تعلق بھی خرد افروزی سے ہی تھا۔ بات یہ تھی کہ جس زمانے میں پروفیسر سلطان نے اپنے مسودے پر کام شروع کیا اُس کے جلد بعد ہی خرد افروزی کے سائنسی منہاج پر عمل پیرا مغربی سائنسدانوں کی شاید سب سے عظیم ایجاد PC یعنی پرسنل کمپیوٹر یورپی زبانوں میں لکھنے والوں میں مقبول ہو چکی تھی۔ یہ ایجاد اپنی دیگر سینکڑوں حیرت انگیز کارکردگیوں کے علاوہ نہ صرف انتہائی کار آمد آلات تحریر مہیا کرتی تھی بلکہ تحریر کو انتہائی چابکدستی سے سافٹ کاپی کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنا بھی ممکن بناتی تھی اور اس طرح لکھنے والے کو ہارڈ کاپی کی گمشدگی، سرقہ یا بربادی بذریعہ آتش زدگی یا آب زدگی کی ہارڈ لک یعنی بدقسمتی سے بھی محفوظ کر دیتی تھی لیکن افسوس کہ پروفیسر نے اپنی تہذیبی خرد افروزی جیسے انتہائی اہم موضوع پر اپنے تحقیقی و تخلیقی کام کو تحریری شکل دینے کے لیے الفاظ کی صفحہ قرطاس پر دستی منتقلی جیسا ہزاروں سال پرانا طریقہ استعمال کرنے کو ہی ترجیح دی۔ بہرحال انگریزی زبان میں ہاتھ سے لکھا گیا بارہ ابواب اور چار سو اکاون صفحات پر مشتمل مسودہ ایک روز معرض وجود میں آ گیا اور پھر کسی دوسرے روز وہی مسودہ ردی میں بک گیا۔

ہم نہیں جانتے کہ کسی انتہائی قیمتی چیز کا ردی چیز کے دھوکے میں بک جانا بدقسمتی کی کونسی قسم ہے لیکن پروفیسر صفدر سلطان کی بدقسمتی اور اگر اُس کے اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے کہ اُس کا مسودہ ساری دنیا کی تقدیر بدل سکتا تھا تو ساری دنیا کی بدقسمتی تک پہنچانے والے ان خصوصی واقعات کے بارے میں ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں وہ بیان کیے دیتے ہیں۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے اپنی تعلیمی سرگرمی کو بطریق احسن مکمل کرنے اور ہاتھ سے لکھے خرد افروزی کے مسودے کے ابتدائی تیس صفحات مکمل کرنے کے بعد جب پروفیسر صفدر سلطان نے وطن واپس پہنچ کر اپنی یونیورسٹی میں از سر نو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو اپنے بعض رفقائے کار اور طلبا کے خرد دشمنی پر مبنی غیر عقلی اور غیر منطقی رویوں پر اس کا دل بہت زیادہ کڑھنے لگا۔ پھر اندر ہی اندر جلنے بھننے کی بجائے اُس نے دائیں بائیں

اپنے دل کا غبار نکالنا شروع کر دیا۔ اس نوع کی بحث و تمحیص یا کلاس روم سوال جواب کے سلسلوں میں وہ اپنی تہذیبی خرد افروزی کی تاریخ اور مستقبل کا حوالہ ضرور دیتا اور اپنی کتاب کا ذکر کرتا جو اُس کے کہنے کے مطابق "ہماری تہذیب کو دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی حقیقی راہ دکھلا کر دنیا کی تقدیر بدل دے گی"۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ ایک سردرات یونیورسٹی میں ہمیشہ سے غالب طلبا کے ایک نیک اور پرہیزگار گینگ نے پروفیسر پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ آئندہ چند روز ہسپتال کے پُر سکون ماحول میں گزارنے کے دوران پروفیسر اس نتیجے پر پہنچا کہ خرد افروزی کے بارے میں دائیں بائیں زبانی بک بک کرنا حماقت ہے۔ اُسے اپنا مسودہ مکمل کرنے پر بھر پور توجہ دینی چاہیے اور پھر اُس کی اشاعت بیرونِ ملک کروانے کی جدوجہد شروع کرنی چاہیے اور پروفیسر صفدر سلطان نے ایسا ہی کیا۔

مسودہ مکمل کرنے کے بعد پہلا مرحلہ ہاتھ سے لکھی اس تحریر کو جدید دنیا کے حیرت انگیز کمپیوٹر کمپوزنگ کے مراحل سے گزارنا تھا تاکہ وہ با آسانی قابلِ قبول انداز میں بیرونِ ملک پبلشرز کے پاس پہنچائی جا سکے۔ اس کام کے لیے اُس نے اپنے ایک ذہین و فطین سابقہ طالب علم اور حال ڈپٹی سکریٹری وزارت داخلہ سعید کمال کی پیش کش قبول کر لی۔ سعید کمال روز اول سے ہی پروفیسر سلطان کے خرد افروزی کے پراجیکٹ میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ پروفیسر نے ایام ہائیڈل برگ کے دوران ہی اپنے اس خرد دوست شاگرد کو اپنی فکری کایا کلپ اور آئندہ کے نصب العین کے ولولے میں شامل کر لیا تھا۔ وطن واپسی کے بعد تو دونوں میں علمی اور تحقیقی روابط اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ پروفیسر کے اس فیصلے میں بھی سعید کمال کا گہرا عمل دخل تھا کہ اُسے خرد افروزی پر دائیں بائیں Loose Talk کرنے کی بجائے خاموشی سے اپنا کام کرنا چاہیے۔ سعید کمال چاہتا تو خرد افروزی کے مسودے کی کمپوزنگ اپنے سٹاف میں شامل اس نئے فنی پیشے کے ماہر چند ایکسپرٹ کمپیوٹر آپریٹرز سے بھی کروا سکتا تھا لیکن استاد شاگرد میں طے یہ ہوا تھا کہ یہ کام سعید کمال خود کرے گا اس طرح نہ صرف کمپوزنگ مکمل ہو جائے گی بلکہ چھپنے سے پہلے سعید کمال کتاب کا ایک تنقیدی مطالعہ بھی کر لے گا اور جہاں کہیں ضروری ہوا اپنی آرا اور تجاویز سے پروفیسر کو مطلع بھی کرے گا۔ یاد رہے کہ پروفیسر اپنے اس شاگرد کی رائے کو بے انتہا اہمیت دیتا تھا۔

سب کچھ طے تھا چند دنوں کے بعد مسودے کی فوٹو کاپی سعید کمال کے حوالے کی جانے والی تھی کہ بدقسمتی نے خوش قسمتی کے روپ میں وار کیا۔ اور پروفیسر کی زندگی کا حاصل اُس کی برسوں کی شبانہ روز محنت کا ثمر شیریں ردی میں بک گیا۔

ہوا یوں کہ — اور اب ہم اس المیے کے اختتامی حصے کی طرف بڑھ رہے ہیں جو حسن کے پرائز بانڈ حیرانیے کا متبادل ہونے کے باوجود المیہ ہے — تو ہوا یوں کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے سرکاری رہائش کے لیے پروفیسر کی برسوں پرانی درخواست اچانک منظور کر لی اور اُسے نئی رہائش گاہ میں منتقل ہونے کا اجازت نامہ بھیج دیا گیا۔ اس طرح کی رہائش گاہوں پر جلد از جلد قابض ہونا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مبادا کوئی دوسرا آرڈر کینسل کروا لے یا خود قابض ہو جائے وغیرہ۔ چنانچہ جہاں ایک طرف پروفیسر اور اُس کے اہل خانہ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوئی کہ بقول بیگم پروفیسر "ساری عمر کرائے کے گھروں میں دھکے کھانے کے بعد اب کچھ عرصہ سکون سے رہنے کا موقع ملے گا" وہاں ہر کسی پر افراتفری کی وہ کیفیت بھی طاری ہو گئی جسے مکانات/رہائش گاہیں اکثر تبدیل کرتے رہنے والے افراد ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ ڈبوں اور پیکٹوں میں بند ہوتی ہے۔ لادی جاتی ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتی ہے۔ بند ڈبے پھر کھلتے ہیں اور چیزیں پھر برآمد ہوتی ہیں اور دنیا میں از سر نو اپنی جگہ پاتی ہیں۔ اتھل پتھل کے اس بڑے عمل کے دوران چیزوں کی حیثیت اور قدر و قیمت کا از خود تعین بھی ہوتا جاتا ہے اور بعض چیزیں باندھے جانے۔ لادے جانے، منتقل کیے جانے اور نئے مقام حاصل کرنے کی اہل نہیں سمجھی جاتیں اور ردی کے زمرے میں شامل ہو کر کسی کباڑیے کی دکان کی راہ پاتی ہیں۔ انخلا، منتقلی اور از سر نو آباد کاری کے اس ہمہ جہتی عمل کے دوران جسے اکثر محض شفٹنگ کے خطرے نام سے یاد کیا جاتا ہے چیزوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

"چیزوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے" ہم نے پیچھے بھی کہیں اس نازک موضوع پر کچھ خیالات کا اظہار کیا تھا لیکن موقع کی مناسبت سے ہم یہاں یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ وہ تمام انسانی سرگرمیاں جو چیزوں کے وجود، ان کی زمانی و مکانی حیثیت اور دیگر ہم عصر چیزوں میں اُن کی ترتیب اور مقام کے لیے شدید خطرے کا باعث بنتی ہیں، اُن میں شفٹنگ سرفہرست

ہے۔ اچھے خاصے باعزت محفوظ مقامات سے بے دخل ہو کر فالتو بے مصرف ناپسندیدہ چیزوں کے ڈھیر میں جا اُترنا موجودات کی تذلیل کا ایک دلخراش منظر نامہ ہے۔

رہائش گاہوں کی منتقلی کے دوران پروفیسر صفدر سلطان کے ہاں کاٹھ کباڑ کے اس طرح کے ڈھیر ضرور جنم لیتے تھے اور انہیں کسی نہ کسی کباڑیے کے ہاتھوں فروخت کر دینے کا مقصد کبھی بھی پیسہ کمانا نہیں بلکہ اُن رد شدہ اشیا سے معقول طریقے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی ہوتا تھا اور اس دفعہ بھی تبدیلی رہائش کی یہ بنیادی سچائیاں برقرار تھیں۔ پروفیسر صفدر سلطان کا وہ مسودہ جسے اب وہ اپنی تہذیب کے لیے خرد افروزی کا مینی فیسٹو بھی کہتا تھا کس طرح پچھلی پرانی کتابوں، رسالوں، اخباروں، کاپیوں، فائیلوں، فالتو ڈائیریوں، ناکارہ ٹیپ ریکارڈروں، شکستہ کیلکولیٹروں، زنگ آلود ٹائم پیسوں، ٹوٹی ہوئی کرسیوں، کپڑے لٹکانے کے ٹیڑھے میڑھے ہینگروں، عینکوں کے ٹوٹے فریموں، پرانے کیلنڈروں اور بوسیدہ قلم دانوں کے اُس انبار میں شامل ہو گیا؟ یہ سوال اُس نوعیت کا ہے کہ جسے جدید دنیا کی محاوراتی زبان میں دس لاکھ ڈالر کا سوال کہا جاتا ہے۔ ارشاد کباڑیے نے بھی پروفیسر اور اُس کے شاگرد سے یہ سوال پوچھا تھا گو اپنی زبان میں ...... اور یہ ایک موقع ہے کہ ہم "ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی" صورتِ حال کی محض ایک امکانی، احتمالی شکل بیان کرنے کے بعد کباڑیے کی دکان اور اس لمحے کی طرف پلٹ جائیں جہاں غیر گرم دن اب ایک سرد رات میں بدل رہا ہے اور تین افراد کے درمیان مکالمہ اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے۔

اس لمبی نیم تاریک دکان میں موجود ایک چوتھا فرد جس کی موجودگی سے صرف ارشاد کباڑیا آگاہ ہے، اس سارے ہنگامے سے قطعاً لاتعلق دوکان کے ایک دور افتادہ کونے میں ایک الماری کی اوٹ میں بیٹھا ایک موم بتی کی روشنی میں مشہور زمانہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے سامنے کاغذ کے پرزوں کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ وہ کتاب کو ایک طرف رکھ کر کاغذی پرزوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور انہیں ترتیب دینے لگتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ وہ کاغذ کے پرزے اصل میں سینما کی بظاہر بے کار استعمال شدہ ٹکٹیں ہیں۔ وہ ایک اسٹیپلر اٹھاتا ہے اور ٹکٹوں کو پچاس پچاس کی تعداد میں گن کر اسٹیپل کرنے لگتا ہے۔ کہیں باہر سے کسی پرانے مقبول عام فلمی گانے کی دھن سنائی دیتی ہے۔ پھر کباڑیے اور گاہکوں کے

درمیان مکالمے کی بھنبھناہٹ جیسی آواز اس کے کانوں تک پہنچتی ہے ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ وہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے نمائندے جان سے ہونے والی اپنی خط و کتابت کے بارے میں سوچتا ہے اور پھر مسکراتا ہے۔

اُدھر کباڑیا بظاہر بڑی دردمندی اور مایوسی کے انداز میں پروفیسر سے پوچھتا ہے۔

کباڑیا: ''لیکن سر جی۔ اتنی کوئی انمول چیز لکھی ہوئی آپ نے فالتو کتابوں کاپیوں میں نکال کیسے دی؟ دیکھیں جی کتاب کی تو دوسری کتاب مل جاتی ہے...... لیکن یہ سر جی چھپ...... میرا مطلب ہے کیا پکی کتاب بن گئی تھی چھپ کر......؟''

پروفیسر: ''نہیں''۔ (پروفیسر کی آواز بھرا جاتی ہے) ''دیکھو اور دیکھو...... ساری دکان میں پھر سے دیکھو...... پکی کتاب''۔ (آہ بھرتا ہے)

سعید کمال: ''تو تم کہتے ہو کہ کاغذوں سے بنی ہر چیز تم ادھر ہی رکھتے ہو؟ بتاؤ''

کباڑیا: ''جی سر جی۔ ادھر اخباریں، رسالے، کتابیں، کاپیاں، رجسٹر، ڈائریاں، فائلیں اور اسی ٹائپ کی چیزیں''۔

پروفیسر کا چہرہ تاریک ہو جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا ہے۔ سعید کمال کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ ارشاد کباڑیا سعید کمال کی مسکراہٹ پر بہت حیران ہوتا ہے۔

کباڑیا: ''ویسے انہوں نے بھی نہ دیکھا جی۔ جو دو صاحب لائے تھے مال ادھر......؟''

پروفیسر: ''میرا بھائی اور داماد......''

سعید کمال: (سخت لہجے میں کباڑیے سے) ''تم فضول باتیں مت کرو۔ آگے بتاؤ۔ وہ سب کچھ کہاں بیچا تم نے۔ کس کو۔ کس کے پاس...... بولو......''

کباڑیا: ''عالی جاہ۔ مجھ غریب کا کیا قصور۔ ساری دکان لے جائیں ہر جانے میں۔ پر مجھے کیا پتہ تھا۔ سو پرچون والے آئے۔ ادھر کانٹا ہے تول تول کر انہیں دیتا رہا روی۔''

پروفیسر: ''سو پرچون والے...... (اچانک پروفیسر پُرجوش انداز میں سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے) سعید تم وہ Chapter پوری توجہ سے پڑھنا جو میں نے اخوان الصفا پر لکھا...... معبد الجہانی۔ غیلان دمشقی۔ نثار شامی۔ جواد یالاوی۔ ابن الہیثم۔

جابر بن حیان۔ نظریہ اضافیت۔ ڈارون......''

پروفیسر لڑکھڑانے لگتا ہے۔

سعید کمال: ''سر...... سر...... سر آپ کی طبیعت......''

کباڑیا: ''سر جی...... سر جی......''

ارشاد تیزی سے پال رش مور کا سلیپنگ بیگ فرش پر کھول دیتا ہے۔ ''ادھر...... ادھر...... لٹا دیں...... یا اللہ خیر...... سر جی...... سر جی...... جوتے...... تسمے کھول دیں...... پنکھا...... ہوا کریں......''

''ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی''، ''حسن کی صورت حال'' کی اس خصوصی صورت حال اور اس خصوصی حیرایے کا یہ محض ایک امکانی منظر نامہ ہے۔ جسے ''مسودہ جو دنیا کی تقدیر بدل سکتا تھا'' کا عنوان دیا گیا۔ لیکن نہ تو یہ منظر نامہ ابھی اپنے اختتام کو پہنچا ہے اور نہ ہی حسن کے اس حیرایے کے دوسرے متبادل منظر ناموں کو تلاش کرنے کی فی الوقت کوئی کوشش کی گئی ہے۔ آخر ردی میں بک جانے والی گراں قدر چیز کسی مسودے کے علاوہ بھی تو کچھ ہو سکتی ہے۔ ہم کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کا اُچٹتا سا جائزہ بھی لیں تو کئی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تصویریں نایاب ہوں۔ ٹوٹی ہوئی آڈیو کیسٹ دراصل ٹوٹی ہوئی نہ ہو اور اس میں کچھ حیرت انگیز آوازیں ہوں۔ اُس فائل میں کوئی ایسی رپورٹ کوئی ایسی خبریں ہو سکتی ہیں جن کا سامنے آنا جاہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہو۔ چیزوں کے ساتھ اگر کچھ بھی ہو سکتا ہے تو وہ انسانوں اور دنیا کے ساتھ بھی کچھ بھی کر سکتی ہیں۔

اس حیرایے کی بات الگ ہے لیکن مدیر حیرت کی حیثیت سے اکثر اوقات احتمالی ہمارے لیے ممکن سے زیادہ اہم بن جاتا ہے۔ ردی میں بک جانے والی یہ دیگر قیمتی چیزیں سب ممکن صورتیں ہیں۔ لیکن ''حسن کی صورت حال'' میں یہ کس حد تک احتمالی بھی ہوں گی۔ اس طرح کے فیصلے حسن کے سفر حیرت کی ہم سفری کے دوران ہمارے کسی نہ کسی ادارتی پڑاؤ کے دوران ہی ممکن ہوں یا شاید تب بھی ممکن نہ ہوں گے۔ اس لیے ہم پروفیسر صفدر سلطان کو پال رش مور کے سلیپنگ بیگ پر بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر کباڑیے کی دکان سے نکلتے ہیں۔ اور یہ لمحہ ایسا ہے کہ اگلے ہی لمحے سعید کمال پروفیسر صفدر سلطان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والا

ہے اور ارشاد کباڑیا پروفیسر کے چہرے پر اب ایک پرانے لیکن اسی (1980) کی گزرتی دہائی میں ہی چھپے مشہور زمانہ ٹائم میگزین سے پنکھا کرتا ہے اور دنیا بھر کے سنگین واقعات کا متن ہل ہل کر پروفیسر کے چہرے کے سامنے ہوا کو متحرک کرتا ہے۔ ''تو کاغذوں کا وہ بنڈل کسی کتاب کا مسودہ تھا۔'' کباڑیا زیرِ لب مسکراتا ہے۔ وہ ''جمع کرنے والے'' سے ابھی بات کرے گا اور پھر وہ دونوں سوچیں گے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ ارشاد کباڑیا سوچتا ہے۔ اور ہم حسن کے ساتھ نکلتے ہیں۔

....

(4)

''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات۔ آؤ مٹھائی بانٹیں

شہر کے مرکزی حصے میں چوک خداداد، سڑک، اردگرد عمارتیں، بس سٹاپ کے پیچھے کھونی شکل کا وسیع گھاس کا پارک نما قطعہ جو پیچھے تک پھیل کر دوسری سڑک سے جا ملتا ہے۔ اردگرد لوہے کے جنگلے۔ دو تین مقامات پر داخلے کے دروازے۔ پارک نما چوک میں ایک انوکھی افراتفری کا سماں ہے۔

لیکن پھر بھی یہ منظر حسن کا بہت جانا پہچانا ہے۔ لوگ باگ ایک بار پھر خوشی سے دیوانے ہو رہے ہیں کیونکہ گزشتہ شب ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات دلانے والا ایک اور ''عظیم نجات دہندہ'' آ چکا ہے۔ وہ سب چوراہے میں کھڑے ہیں اور چوراہے سے گزرتے ہر شخص کا منہ مٹھائیوں کی مٹھاس سے بھر دینا چاہتے ہیں۔ یہ ایک میٹھا لمحہ ہے جو لوگوں کے کھلے مونہوں میں لڈووں، پیڑوں، برفیوں اور جلیبیوں کی شکل میں گہرا اتر رہا ہے۔ وہ ہر کسی کو نجات کی اس عظیم خوشی میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ حسن کی سواری سے باہر جھانکتے اس کے بعض متجسس ساتھی سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے کہ ان کے منہ میں گلاب جامنیں اور چم چمیں ٹھونس دی جاتی ہیں وہ چبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس ناگہانی مٹھاس کو اپنے حلق میں اتارتے ہیں اور حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن حسن حیران نہیں۔ اسے اب یاد بھی نہیں کہ وہ کتنی مرتبہ یہ منظر پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ وہ تیزی سے قریبی شیشہ بند کرتا ہے کہ کہیں خوشیاں بانٹنے والے کسی پرجوش ہاتھ کے لڈو کا شکار نہ ہو جائے۔

چوک خداداد کی میٹھی افراتفری لوگوں کے معمول کے کڑوے کسیلے مگر زیادہ تر بے ذائقہ

سفروں میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ حسن ایک لاتعلق اُچٹتی نگاہ باہر ڈالتا ہے اور اُسے شک سا ہوتا ہے کہ کچھ ایسا ضرور ہے جو "نازک دور" ختم ہونے اور "نیا نازک دور" شروع ہونے کے معمول کے منظر نامے کے مطابق نہیں۔ حسن پھر دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔

صبح کا درمیانی وقت ہے اور ایک سرد دن کا آغاز ہو چکا ہے۔ پچھلی رات کی بارش سے سڑکیں اور گھاس گیلی ہیں۔ ہوا ہے۔ کوئی نہ کوئی جھونکا آتا ہے تو منہ میٹھا کرانے والے اور کرنے والے اپنے اپنے گرم کپڑوں میں اپنے آپ کو محفوظ پا کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور ایک بار پھر 'عظیم نجات دہندہ' سے نجات پانے پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور ایک آدھ مزید لڈو منہ میں ڈلوا لیتے ہیں۔ لیکن وہ شخص اک دم سب سے مختلف ہے۔ وہ آدھے بازوؤں کی سرخ ٹی شرٹ اور سلیٹی رنگ کی پتلون پہنے ہوئے ہے۔ اُس کا لباس موسم کی مناسبت سے قدرے حیران کن ہے لیکن اتنا بھی نہیں، انسانوں کی سردی گرمی برداشت کرنے کی صلاحیت میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ زیادہ حیران کن باتیں دوسری ہیں۔ وہ شخص مٹھائی بانٹنے والوں سے مٹھائی لے ضرور رہا ہے مگر کھانے کی بجائے اُسے بائیں ہاتھ میں پکڑے ایک ڈبے میں احتیاط سے رکھتا جاتا ہے۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں ایک میگا فون ہے۔ وہ کوئی بات کر رہا ہے۔ کیا وہ کوئی اعلان کر رہا ہے۔ حسن تیزی سے شیشہ دوبارہ کھول لیتا ہے اگرچہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آواز اتنی بلند ہے کہ سواری کے اندر تک پہنچ رہی ہے۔ وہ کوئی درخواست کر رہا ہے۔

"حضرات۔ پلیز۔ پلیز۔ یہ مٹھائی ضائع نہ کریں۔ میں جانتا ہوں 'عظیم نجات دہندہ' سے نجات پانے کی خوشی میں بانٹی گئی مٹھائی کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن میری درخواست ہے اسے ضائع نہ کریں۔ یہ بہت قیمتی شیرینی ہے۔ پلیز۔ مجھے دیں۔ جی مجھے دے دیں۔ تھینک یو۔ برفی۔ پیڑہ۔ جی یہ بھی پلیز۔ جلیبی۔ قلاقند۔ شکریہ۔ بہت شکریہ۔ میسو......"

لوگ قہقہے لگاتے ہیں۔ چوک خداداد کے اس حصے کے مستقل مکین ٹی سٹال والا، اخبار بیچنے والا لڑکا، دال سویاں بیچنے والا اور انگوٹھیاں اور قیمتی پتھر بیچنے والا طلق تک مٹھائی ٹھسوانے کے بعد تو بہت ہی جوش میں آجاتے ہیں۔ اور دائیں بائیں سے بہت سی مٹھائی اکٹھی کر کے اُس شخص کے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔

"شکریہ۔ شکریہ۔ یہ قومی خدمت ہے مہربان۔" وہ کہتا ہے۔ اور لوگوں کے سوالات کے جواب دینا اور خطاب کرنا جاری رکھتا ہے۔

"نہیں سر۔ میں کھاتا نہیں ہوں۔ یہ بہت قیمتی مٹھائی ہے۔ ایسی مٹھائی روز روز نہیں ملتی۔ سر...... پلیز...... جی...... حاجی صاحب یہ لڈو کھانے کی مجھے لگتا ہے اب آپ کے پیٹ میں گنجائش نہیں۔ مجھے دے دیں پلیز۔ حیران نہ ہوں۔ ایسی مٹھائیاں جمع کرنا میرا مشغلہ ہے...... عظیم رہنماؤں کے اخراج اور استقبال اور پھر اخراج کے موقعوں پر...... تھینک یو...... کوئی بات نہیں آدھا کھایا ہوا بھی چلے گا۔"

حسن دیکھتا ہے کہ خوشی سے دیوانے لوگ اُس شخص کو سادہ دیوانہ جان کر اُس کے گرد اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے حسن صرف اُس کی آواز سُن سکتا ہے سواری کے رستے میں حائل ہجوم ایک طرف ہٹنے لگتا ہے میگا فون سے آواز آتی ہے۔

"جی سر آپ ہماری کولیکشن دیکھ سکتے ہیں۔ گینز بک آف ریکارڈز کے نمائندے جان سے ہماری بات ہو چکی ہے جناب۔ دیکھیں اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نہیں میں پاگل نہیں ہوں...... دیکھیں لوگوں کو...... آپ جانتے ہیں...... مختلف عجیب وغریب...... اور بعض اوقات تو بہت عام سی فضول سی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے...... ہوتا ہے نا جی...... تو بس...... ایک زمانے میں میں ماچس کی ڈبیاں اکٹھی کرتا تھا...... پھر ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے شروع کیے۔ لیکن وہ مہنگا شوق تھا...... آپ جانتے ہیں کہ بعض پرانے ٹکٹوں کی قیمت لاکھوں بلکہ کروڑوں ہو سکتی ہے...... سوچا کوئی ایسی چیزیں جمع کروں کہ کسی نے نہ کی ہوں۔ جان کا مشورہ بلکہ حکم بھی یہی تھا۔ خیر۔ بٹن جمع کرنے شروع کیے۔ پتہ چلا یہ تو لوگ کرتے ہیں۔ بوتلیں، بوتلوں کے ڈھکن، چاقو، بکسوے، درختوں کے بیج، تالے، چابیاں حتیٰ کہ میں نے استعمال شدہ جوتوں کے تسمے بھی اکٹھے کیے۔ لیکن سب کا پتہ چلا کہ مجھ سے پہلے ان کا کوئی نہ کوئی جمع کرنے والا موجود تھا۔ پھر ایک دفعہ میں جیل گیا......"

لوگوں کی تالیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ میگا فون کی آواز پھر ابھرتی ہے۔

"بچے یہ میسو کا ڈلا تجھ سے کھایا نہیں جا رہا مجھے دے دے چند تاریخ میں محفوظ ہو جائے گا۔ شاباش...... جی...... جی تو پھر میں نے عظیم رہنماؤں، محبوب رہنماؤں کی ذات

ے۔ جسم سے۔ دماغ سے۔ زندگی سے تعلق رکھنے والی کچھ ایسی چیزیں جمع کرنا شروع کیں جو آج تک کسی نے نہ کی ہوں گی......"

حسن حیرت سے خاموشی کے اُس وقفے کو سنتا ہے جو لگتا ہے پوری دنیا پر محیط ہو چکا ہے۔ آواز پھر آتی ہے۔

"آہ...... مثلاً کیا...... آپ پوچھتے ہیں کیا...... جی مثلاً ۔ مثلاً عظیم رہنما کا تھوک...... دیکھیں میرا نظریہ یہ ہے کہ عظیم رہنما کی ہر چیز عظیم ہوتی ہے۔ اُس کی کوئی بھی چیز عامیانہ اور گھٹیا نہیں ہو سکتی۔ اُس کا بول و براز...... اُس کا فضلہ بھی نہیں...... نہیں جناب میں پاگل نہیں ہوں...... کیا آپ نہیں جانتے عظیم رہنما وہی ہوتا ہے جو تاریخ پر دلیری سے تھوک سکتا ہے...... اور جو جب چاہے خود سے رہنمائی مانگنے والے ہجوم پر پلٹ کر اُسے اپنے پیشاب سے شرابور کر سکتا ہے اور اپنے فضلے سے لت پت کر سکتا ہے...... جی نہیں میں پاگل نہیں ہوں...... بھائی جان یہ چم چم...... میاں صاحب یہ چاکلیٹ والی برفی مل جائے گی...... پلیز...... پلیز...... تھینک یو...... میں......"

اچانک آواز آنا بند ہو جاتی ہے۔ حسن دیکھتا ہے کہ وہ شخص پریشانی کے عالم میں اپنے میگا فون کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ اُسے ٹھونک بجا رہا ہے لیکن شاید اُس کا وہ آلہ کام کرنا بند کر چکا ہے۔ لوگ قہقہے لگاتے منتشر ہو رہے ہیں۔ مٹھائیاں بانٹنے والوں کے ڈبے بھی خالی ہو چکے ہیں۔ حسن دیکھتا ہے کہ وہ شخص میگا فون سے الجھنے کے ساتھ ساتھ مٹھائی کے خالی ڈبے بھی لے رہا ہے اور لوگوں کو انہیں اِدھر اُدھر پھینکنے سے منع کر رہا ہے۔ اگرچہ اب اُس کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ حسن کی ویگن بھی اب آگے بڑھ سکتی ہے۔ حسن سوچتا ہے کہ آج اُسے دفتر پہنچنے میں کافی دیر ہو جائے گی لیکن یہ تو آج سب کے ساتھ ہی ہے۔ ویسے بھی آج ہر کوئی ہر کسی کو معاف کر دینے کے موڈ میں ہے۔ "عظیم نجات دہندہ" سے ایک بار پھر نجات مل چکی ہے۔ حسن کی حیرت ابھی تک برقرار ہے۔ وہ اُس شخص کی طرف آخری بار دیکھتا ہے۔ وہ کون ہے؟ ظاہر ہے پاگل ہے۔ لیکن عجیب قسم کا پاگل ہے۔ ہو سکتا ہے...... وہ کوئی...... حسن سوچتا ہے۔

لیکن ہم فی الحال حسن کو اُس کی سوچ کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں اور اُس شخص کی

طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اب سب کچھ سمیٹ کر چل پڑنے کے چکر میں ہے۔ وہ اپنے میگا فون سے چھیڑ چھاڑ بھی بند کر چکا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ وہی پرانی خرابی ہے۔ ایمپلی فائر کے اندر ایک جگہ وہ چھوٹا سا پیچ پھر ڈھیلا ہو گیا ہے جو میگا فون کچھ دیر استعمال کرنے پر گرم ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ اگرچہ میگا فون کے استعمال اور دیر تک استعمال کے مواقع اُسے بہت کم حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ جانتا ہے کہ آلہ قابل مرمت ہے اُسے بس ایک بار وہ پیچ ہی نہیں بلکہ وہ پورا پرزہ بدلوانا ہوگا جو مائیکروفون سے موصول شدہ عام انسانی آواز کے برقی ارتعاش کو میگا فون کی غیر انسانی طور پر بلند آواز میں تبدیل کرنے والے سرکٹ کی طرف بھیجتا ہے۔ لیکن جو بات وہ نہیں جانتا...... ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہم اس شخص کو کوئی نام اور پہچان دے سکتے ہیں۔ اُس کا نام عبدالجبار ہے۔ وہ ارشاد کباڑیے کا ساتھی ہے اور وہی "جمع کرنے والا" ہے۔ تو جبار یہ نہیں جانتا کہ اُس کے میگا فون میں یہ خرابی سب سے پہلے کب، کیوں اور کیسے پیدا ہوئی لیکن ہم بوجوہ اس چیز کے حوالے سے یا کہہ لیں اس آلے یعنی میگا فون کی نمائندگی کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔

قابل مرمت میگا فون کی کہانی

نیلے رنگ کے پلاسٹک کور، کریم رنگ کے ہارن اور سٹیل ہینڈل والا وہ جاپانی میگا فون چند برس پہلے ولسن اینڈ کیڈ نامی ایک امریکن فرم کی وساطت سے وطن پہنچا۔ ولسن اینڈ کیڈ والے قانون نافذ کرنے والی ٹیکنالوجی مہیا کرنے میں عالمی شہرت کے حامل تھے اور ہیں۔ ہمارا یہ میگا فون ایسے ہی ٹیکنیکل آلات کی ایک بڑی کھیپ میں شامل تھا۔ ایک برس تین ماہ تک وہ ایک قانون نافذ کرنے والے ادارے کے سٹور میں آنسو گیس کے گولوں، گولے داغنے والی بندوقوں، ہتھ کڑیوں، بیڑیوں، پتھراؤ سے بچانے والی شیلڈوں اور بلٹ پروف جیکٹوں کی سیل بند پیٹیوں میں خاموشی سے محفوظ پڑا رہا۔ پھر بوجوہ وطن عزیز میں اُس وقت کے "عظیم نجات دہندہ" سے نجات حاصل کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور جلد ہی اشتعال، احتجاج، مظاہرہ، ہنگامہ اور فساد کی شکل اختیار کر گیا۔

پیٹیاں کھولی گئیں اور چاق و چوبند محب الوطن محافظوں میں فساد کش سامان بانٹا

گیا۔ اس موقع پر جب ہنگامہ فرو کرنے والے ایک دستے کے سربراہ نے ہمارے میگافون کو پہلی بار استعمال کرنے کے لیے اُس میں آٹھ ڈرائی بیٹری سیل ڈالے تو اُس کی نظر میڈ ان جاپان پر پڑی اور وہ حیران ہوا کیونکہ بیٹیوں پر لکھا ہوا تھا اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ ولسن اینڈ کِڈ ایک مشہور امریکی فرم ہے۔ امریکی فرم جاپانی مال کیسے سپلائی کر سکتی ہے؟ وہ سوچتا رہا۔ اُدھر خود اس کو اور اُس کے دستے کو "ہنگامہ گاہ" تک لے جانے والی گاڑیاں آ چکی تھیں اور نجات چاہنے والوں کے حوالے سے بُری بُری خبریں آ رہی تھیں اور اُن کے ساتھ "نرمی کرنے" کا آرڈر تو گزشتہ شام ہی آ چکا تھا مگر پھر بھی یہ سوال اُس وقت بھی...... گو لمحاتی طور پر محافظ دستے کے سربراہ کے ذہن میں آیا جب اُس نے میگافون کا رُخ فسادیوں کی طرف کیا پہلی بار اُسے استعمال کرنے کے لیے بٹن دبایا اور مشینی طاقت سے بلند وہلانے والی پہلی انسانی آواز اُس کے کھلے منہ سے برآمد ہوئی۔

"خبردار......"

مگر جو بات محافظ دستے کا سربراہ نہیں جانتا تھا وہ یہ تھی کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے اختتام کے بعد جاپان نے اپنی خرد افروزی اور نفاست پسندی کا رُخ مائیکرو الیکٹرانکس کی طرف موڑ دیا تھا اور جلد ہی کم از کم اس ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اُس کی مشہور کمپنیوں کی بیک وقت با کفایت اور معیاری مصنوعات پوری دنیا پر چھا گئیں۔ ولسن اینڈ کِڈ نامی امریکی کمپنی نے بھی اپنے عالمی آرڈرز میں متعلقہ جاپانی آلات کو اپنی ملکی مصنوعات کے ساتھ گویا از سرِ نو درآمد کرنا زیادہ منفعت بخش جانا۔

یہ امر ہمارے لیے خوشگوار حیرت کا باعث ہے کہ یہاں پروفیسر صفدر سلطان کے خرد افروزی کے مسودے کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا خاص طور پر وہ حصہ جہاں پروفیسر موصوف نے جاپانی خرد افروزی اور جدیدیت پر کمال دردمندی سے اپنے خیالات بلکہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ باب نمبر 7 صفحہ نمبر 93 لائین نمبر 11۔

"اگر جاپان دوسری جنگ عظیم کی راکھ سے ایک ققنس کی طرح برآمد ہو سکتا ہے۔ اگر یہ عظیم ایشیائی تہذیب اپنی ثقافتی روایات، مثلاً پھول سجانے کے فن اکی بانا، چائے کی تقریب، بدھ مت اور شنتومت کو مکمل برقرار رکھتے ہوئے مگر ساتھ ساتھ مغربی خرد افروزی اور

سائنسی منہاج پر کاربند ہوتے ہوئے ٹیکنالوجی اور خاص طور پر برقیاتی ٹیکنالوجی کے میدان میں پوری دنیا سے آگے نکل سکتی ہے تو پھر ہماری تہذیب ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔ ہم جو دنیا کی کل آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ اور ہم جو اُس وقت خردمند تھے جب مغرب قرونِ ظلمت میں غرق تھا۔ اب آخر وہ کون سے عوامل ہیں جو ہمیں از سرِ نو خردمندی کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔"

پروفیسر صفدر سلطان نے اپنے اس مؤقف کو بیان کرتے وقت جاپانی ثقافتی روایات میں گیشا گرلز، کابو کی تھیٹر، سومو ریسلنگ اور ہاراکاری وغیرہ کا حوالہ کیوں نہیں دیا۔ ہم نہیں جانتے آخر بعض باتیں ہمیں بھی نہ جاننے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا سطور لکھتے وقت پروفیسر کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹوٹ کر جاپانی خرد افروزی کے بارے میں اُس کی تحریر کے اوپر گرے تھے اور فوراً ہی کاغذ میں جذب ہو گئے تھے لیکن بال پوائنٹ کی سیاہی برقرار رہی تھی۔ اتفاق سے وہ بال پوائنٹ بھی میڈ ان جاپان تھا اور پروفیسر کا پسندیدہ تھا۔

لیکن ہم حسن کے حیرانیے سے جنم لینے والی پہلی جاپانی چیز یعنی میگافون کی طرف واپس آتے ہیں۔ ہنگامہ فرو کرنے والے دستے کے سربراہ نے عظیم نجات دہندہ سے نجات مانگنے والے فسادیوں کو خبردار کیا کہ وہ فوراً منتشر ہو جائیں ورنہ سخت کارروائی کی جائے گی۔ لیکن پھر جب وہ میگافون کو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا تاکہ اوپر سے احکامات حاصل کرنے کے لیے وائرلیس تک رسائی حاصل کر سکے تو کارروائی فسادیوں کی طرف سے شروع ہو گئی۔ شاید وہ پہلا پتھر ہی تھا جو اُس کے بائیں ہاتھ کے اوپر گرا تھا۔ ضرب کی بیشتر شدت اُس کی انگلی اور انگوٹھی نے برداشت کی لیکن بقیہ قوت پھر بھی اتنی شدید ضرور تھی کہ میگافون کے اندرونی نظام کو ہلا کر رکھ دیتی لیکن قابلِ فہم طور پر اُس وقت اُسے میگافون کی بجائے اپنے جسمانی نظام کی فکر لاحق ہو گئی۔ پتھراؤ جاری تھا لیکن دو محافظ حفاظتی شیلڈیں استعمال کرتے ہوئے۔ تیزی سے اپنے انچارج کو اُس کے لہولہان ہاتھ سمیت ہسپتال لے گئے۔ ہاتھ کا ایکسرے ہونا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ انگوٹھی اتاری جائے لیکن انگلیاں اس قدر سُوج چکی تھیں کہ انگوٹھی کو عام طریقے سے اتارنا کسی طرح ممکن نہیں تھا اُدھر وہ دوران خون کو بھی بُری طرح روک رہی تھی۔ انگوٹھی کاٹ کر اتاری گئی۔

کاٹ کر اتاری گئی انگوٹھی کا پس منظر۔ شادی کے بعد محبت میں گرفتار ہونے کی انوکھی کوشش

دیکھو چیزوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو جاتا اور بعض اوقات اُن کے ساتھ ہونے والی کے نتیجے میں اُن کے مالکوں اور مالکوں کے تعلق داروں کے ساتھ بھی کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ بطور مدیر حیرت چونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ کاٹ کر اتاری گئی اُس انگوٹھی سے متعلق واقعات چیزوں کی اس حقیقت کو بہت عمدگی سے اور کافی دلچسپ طریقے سے واضح کرتے ہیں اس لیے میگا فون کی کہانی میں چلتے چلتے انہیں مختصراً سنا ڈالنے کی کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

محافظ دستے کے سربراہ...... لیکن اب ہم اُسے کسی انسانی نام سے یاد کریں گے۔ اے۔ایس۔پی۔ سعید کمال کے ہاتھ کی ڈریسنگ کے بعد جب اُسے فارغ کیا جا رہا تھا تو ایک نرس پٹری ڈش میں رکھی اُس کی کٹی ہوئی انگوٹھی اُس کے حوالے کرنے آئی۔ نسوانی تجسس کے زیر اثر نرس نے انگوٹھی اٹھا کر اُسے غور سے دیکھا۔ پہلے اُس کے ماتھے پر تعجب کے بل نمودار ہوئے اور پھر ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اور پھر اُس نے خاموشی سے انگوٹھی واپس رکھ دی۔ سعید کمال اُس کے تاثرات پر قدرے حیران اور بیزار ہوا لیکن اُس کے ذہن پر زیادہ حاوی سوال یہ تھا کہ وہ انیلا کو کیا بتائے گا۔ انیلا بلال جو اُس کی ہونے والی بیوی تھی بلکہ قانونی طور پر تو بیوی ہی تھی کیونکہ نکاح ہو چکا تھا لیکن رخصتی یعنی ازدواجی زندگی کا باقاعدہ جسمانی آغاز انہوں نے ابھی کرنا تھا۔ کئی مسائل اس آغاز کی راہ میں حائل تھے سعید کمال کو ابھی دو ستاروں والا اے۔ایس۔پی۔ بننا تھا اور پھر تقریبات اور رسوم کے لیے انیلا کے خاندان کی تیاری ابھی مکمل نہیں تھی۔ ایک دو سال بھی لگ سکتے تھے۔ یہ انگوٹھی اُسے انیلا کے خاندان کی طرف سے پہنائی گئی تھی۔ سعید کمال نے ہسپتال سے نکلتے وقت سوچا تھا کہ وہ اس کی مرمت کسی ہنر مند سُنار سے کروائے گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ سعید کمال نے ایسا ہی کیا لیکن اُس لمحے اُس کے ذہن پر بجلی سی گری جب ہنر مند سُنار نے اُسے بتایا کہ انگوٹھی خالص سونے کی نہیں ہے بلکہ پیتل کے اوپر سونے کی پتری چڑھائی گئی ہے۔ اُس وقت سعید کمال کو اُس نرس کے عجیب وغریب تاثرات بھی سمجھ میں آ گئے۔

انیلا سعید کمال کی بہت دور کی رشتے دار بھی تھی لیکن اُس کا باپ ایک سینئر کلرک تھا اور نچلے درمیانے طبقے میں بھی اُن لوگوں کی شمولیت بس زبردستی کی ہی تھی لیکن پھر انیلا کے ایک لیکچرار بن جانے کے بعد کچھ آسانی ہو گئی تھی۔ سعید کمال کا خاندان اُن سے بہت آگے اور بلند تھا لیکن مڈل کلاس میں شامل ہونے پر ان کا اصرار کیا جائز تھا؟...... اس پر کچھ لوگ شکوک وشبہات کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن پھر سعید کمال کے ایک پولیس آفیسر بن جانے کے بعد ایسے لوگوں کو منہ کی کھانی پڑی اور سعید کمال کی ماں کسی بہت اونچے گھرانے کی بہو کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ چنانچہ انیلا سے سعید کمال کی شادی پر وہ سخت ناخوش تھی لیکن بیٹے کی ضد کے آگے اُس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ سعید کمال اور انیلا بلال میں کوئی باقاعدہ محبت وغیرہ نہیں تھی۔ شادی سے پہلے کوئی خاص میل ملاپ بھی نہیں تھا لیکن دونوں میں دور دور سے ایک دوسرے کے لیے ایک احساس پیدا ہو رہا تھا کہ شاید آہستہ آہستہ انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو جائے گی۔ اگرچہ دونوں نے اپنی تعلیم کے دوران ہی یہ بات سمجھ لی تھی کہ یہ جو ہماری ثقافت میں کہا جاتا ہے کہ شادی کے بعد عورت مرد کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے تو یہ فضول بات ہے لیکن جب رخصتی تک کے طویل لمحات کے دوران انہوں نے قانونی طور پر میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی چوری چھپے ملنا شروع کر دیا تو انہوں نے ایک دوسرے کو بتائے بغیر اپنے اپنے طور پر خود دوسرے کی محبت میں گرفتار ہونے اور اُسے اپنی محبت میں گرفتار کرنے کے عجیب وغریب تجربے کا آغاز کر دیا۔ شاید نا آسودگی اور ممنوعات کا پہرہ اس کوشش میں اور بھی شدت پیدا کرتا تھا۔ وہ خط وکتابت کرتے تھے مہینے میں ایک آدھ بار کہیں مل بھی لیتے تھے اور ایک دوسرے کو چھوئے بغیر انہوں نے جان لیا تھا کہ یوں وہ دونوں کافی رومانی مزاج ہیں......

لیکن ہم یہیں رُکتے ہیں...... دراصل اچانک ہمیں احساس ہوا ہے کہ اوپر جو ہم نے یہ دعوی کیا تھا کہ ہم کٹی ہوئی انگوٹھی سے تعلق رکھنے والے دلچسپ واقعات میگا فون کی کہانی کے بیان کے دوران ہی سنا ڈالیں گے وہ غلط تھا۔ انیلا بلال اور سعید کمال کا ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش کرنا ایک ایسا انوکھا فیصلہ، ہم کہیں گے انوکھا تجزبہ تھا کہ اسے مختصراً بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم ''حسن کی صورتحال'' کے تقاضوں کے مطابق کہیں بعد میں موقع دیکھ کر اس انگوٹھی کی داستان کی طرف پلٹیں گے اور اپنے تہذیبی پس منظر میں

سعید کمال اور انیلا بلال کے گرفتار محن ہونے کی انوکھی تجرباتی کوشش کی روشنی میں عورت مرد کے تعلق کو سمجھنے کی مقدور بھر کوشش کریں گے۔ فی الحال چلتے چلتے ہم خرد افروزی کے پس منظر میں اسی موضوع پر پروفیسر صفدر سلطان کے کافی بعد میں لکھے جانے والے خیالات سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جو اور بھی کئی حوالوں سے ہماری رہنمائی کرے گا۔ باب نمبر 6 صفحہ نمبر 213 لائین نمبر 17۔

"یہ رائے کہ مغربی خرد افروزی کو قبول کرنا اور اُسے عملی طور پر ایک فکری اور سماجی طرز عمل کے طور پر اپنانا ہمیں لازماً عریانی، فحاشی اور بدکاری کی طرف لے جائے گا چنداں درست نہیں۔ بعض حلقوں میں جدیدیت کے ضمن میں اس خدشے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ سائنسی منہاج اور اُن پر مبنی علوم مثلاً سول انجینئرنگ، طبیعیات، حیاتیات، الیکٹرونکس، طب، کیمیا اور کان کنی وغیرہ کا اکتساب جب ہم اہل مغرب سے کریں گے تو لازم ہے کہ ان علوم کے جلو میں میڈونا اور مائیکل جیکسن بھی آئیں گے۔ ان افراد کا حوالہ ظاہر ہے کہ یہ حلقے مغربی بے راہ روی کی قابل مذمت علامتوں کے طور پر دیتے ہیں۔ اگرچہ اس خدشے کے پیچھے چھپی ہوئی تہذیبی دردمندی کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خردمندی سے دراصل ہماری مراد تسخیر کائنات ہے اور خاص طور پر کائناتی قوتوں کو اس طرح تابع کرنا کہ وہ ہماری تہذیبی قوت میں بے پناہ اضافہ کرسکیں۔ جیسا کہ اہل مغرب نے اپنے طور پر کیا۔ ہم بھی بطور تہذیب صرف اور صرف ایجادات اور ٹیکنالوجی مثلاً ایٹمی توانائی کے ذریعے ہی دنیا پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں تک انسانی علوم یا معاشرتی علوم کا تعلق ہے تو ان میدانوں میں ہم آفاقی سچائیوں سے پہلے ہی آگاہ ہیں چنانچہ یہاں ہمارا خردمندی کا اطلاق اہل مغرب سے بہرحال بہت مختلف ہوگا کیونکہ ہماری معاشرتی اقدار اور رہنما اصول ہمیشہ کے لیے متعین ہیں۔ البتہ یہ لازم ہوگا کہ ہمارے مفکر ہمارے تہذیبی نظریہ انسان کو جدید معاشرتی علوم کے وضع کردہ تعقلات و نظریات کی معتبر اصطلاحات یعنی terminology میں اس طرح سمو کر پیش کریں کہ ہمارے اوپر لگائے جانے والے دقیانوسیت کے الزامات کا مسکت جواب دیا جا سکے۔

اس پس منظر میں جہاں تک مرد و زن کے اختلاط کا تعلق ہے تو یہ بہرحال ہماری

تہذیبی اقدار کے تابع رہے گا اور ایسا نہیں ہے کہ ہماری یہ اقدار حکمت سے خالی ہیں۔ اب تو مغربی مفکرین بھی خصوصاً جن کا تعلق نفسیات اور سماجیات سے ہے بے محابہ جنسیت سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں اور گزشتہ چند برسوں سے ایڈز نامی جو موذی مرض آیا ہے تو جنسی اختلاط کی اخلاقیات کے حوالے سے ہی ہمارے طرز عمل کو اور بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اور ہمارے خردمند حلقوں کے لیے یہ بات قابل فخر ہونی چاہیے کہ سماجی طرز عمل کے حوالے سے ہماری آفاقی سچائیاں جن پر مغربی سائنسی فکر اب کہیں آکر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے وہ ہمیشہ سے ہمارے لیے مشعل راہ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے اور جیسا کہ باب نمبر چار میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی — یہ عجیب تہذیبی بوالعجبی ہے کہ خرد افروزی، استقرائی طریقہ کار اور سائنسی منہاج کی شمع تو ہم نے روشن کی لیکن اس کی روشنی میں کائنات کی قوتوں کو دریافت اور مسخر اہلِ مغرب نے کیا اور یوں دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کم از کم دنیاوی طاقت کا سرچشمہ خرد افروزی پر مبنی قدرتی سائنسی علوم (Natural Sciences) اور ٹیکنالوجی ہیں اور ہمیں بھی دیر آید درست آید اسی راہ پر چلنا ہوگا لیکن — اور یہ اٹل ہے کہ اپنی مقدس ثقافتی اقدار میں سے کسی ایک کی بھی قربانی دیے بغیر جیسا کہ جاپان نے کیا۔ مثال بہت واضح ہے۔"

اگرچہ بطور "بھوت مصنف" ہم جانتے ہیں کہ ہمیں فوری طور پر قابل مرمت میگافون کی کہانی کی طرف بلکہ اس سے بھی پہلے "عظیم نجات دہندہ" سے نجات ملنے پر بانٹی گئی شیرینی اکٹھی کرنے والے شخص کی طرف پلٹ جانا چاہیے کیونکہ زمانی تسلسل کا تقاضہ یہی ہے لیکن بطور مدیر حیرت ہمارے لیے جو تسلسل افضل ہے وہ "صورتِ حال" کا تسلسل ہے اور جو کرداروں پر گزرنے والی، بیتنے والی کی واقعاتی ترتیب کا سیدھا سیدھا تابع نہیں۔ اس لیے ہم واقعات کو ادھورے چھوڑنے یا یک دم بظاہر لاتعلق واقعات کے مداخلتی ظہور جیسی بظاہر ناقابل معافی بیانیہ خلاف ورزیوں کو "صورتِ حال" کی تشکیل کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ پروفیسر صفدر سلطان کا تصورِ تہذیبی خرد افروزی "حسن کی صورتِ حال" پر گہرے اور متنوع اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ پروفیسر صفدر سلطان کے گمشدہ مسودے سے مذکورہ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد اگر ہم پروفیسر موصوف اور ان کے شاگرد عزیز

سعید کمال کے درمیان اسی موضوع پر ہونے والے ایک مکالمے کا حال بیان کر دیں تو پروفیسر کے اس مخصوص تصور کی مزید وضاحت ہو گی اور نتیجتاً حسن کی صورتِ حال کے اس پہلو کے کچھ نئے پہلو بھی شاید سامنے آ ئیں گے۔

گمشدہ مسودوں سے اقتباس ڈھونڈ لانے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد اب ہم گمشدہ واقعات کو ازسرِ نو رونما ہونے پر مجبور کرنے کی قوت استعمال کریں گے۔ واقعہ جو بیشتر مکالمہ ہے پیش کریں گے اور روایت کے مطابق اُسے ایک یک سطری عنوان بھی دیں گے۔

کیا پروفیسر صفدر سلطان واقعی اپنے شاگردِ عزیز سعید کمال کو گھر سے نکال دیتا ہے؟

اپریل کی شام ہے۔ پروفیسر ان دنوں شہر کے مضافات میں ایک ایسے کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے جس کی چھت کھلی ہے اور چونکہ ایک آدھ کلو میٹر بعد ہی کھیت شروع ہو جاتے ہیں اس لیے اکثر ہوا باہر سے آجاتی ہے اور گرمیوں میں چھت پر پیڈسٹل فین لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس امر کو پروفیسر خرد افروزی کے مسودے پر کامیابی سے کام کرنے کے بعد دنیا میں اپنی دوسری بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے۔ پروفیسر کا خاص الخاص شاگرد سعید کمال مسودے کی گزشتہ قسط کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس کے گھر آیا ہوا ہے اور توقع کر رہا ہے کہ اگلی تحریر ہمراہ لے جائے گا۔ پچھلے دنوں وہ سرکاری دورے پر جاپان گیا تھا اور وہاں سے پروفیسر کے لیے دو تین عمدہ جاپانی قلموں پر مشتمل ایک سیٹ لایا ہے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے جس میں مضافات کے آخری کناروں پر ڈھیر کی گئی روڑیوں اور اُن سے پرے شہر کے گٹروں اور گندے پانی کو صاف کرنے والے پلانٹ اور اُس سے بھی پرے پلانٹ سے مہیا کیے جانے والے آب پاشی کے پانی پر پلنے والی تازہ سبزیوں کی مہک شامل ہے۔ پلاسٹک کی فولڈ ہو جانے والی میز کے گرد لکڑی کی تین کرسیاں پڑی ہیں ایک کرسی خالی ہے جس میں پڑی گدی پر پروفیسر کی بیوی نے کشیدہ کاری کا کام کیا ہوا ہے جو شام کی نیم تاریکی میں نظر نہیں آتا لیکن اُس کے اوپر دھرا جاپانی قلموں کا تحفہ صاف نظر آ رہا ہے۔ ہوا کا جھونکا پھر آتا ہے۔

پروفیسر: ''یہاں ہمیں گرمیوں میں پیڈسٹل فین کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہوا آتی ہے۔''

سعید کمال: ''جی......سر......اچھا ہے......ہوا......سر......آتی ہے۔''

پروفیسر: ''جب میں ہائیڈل برگ میں تھا تو دریائے نیکر کے کنارے ہوا آتی تھی مگر وہ ہوا اور تھی......''

سعید کمال: ''جرمن ہوا۔'' (نتھنے سکیڑتا ہے)

پروفیسر: (نوٹ کرتے ہوئے) ''ہاں۔ یہاں گرمیوں میں ذرا پلانٹ کی بُو...... ہوا...... ذرا...... لیکن یار کمال مشینری لگائی ہوئی ہے انہوں نے گندا پانی صاف کرنے کی۔ کبھی تم نے دیکھا ہے۔ میرے ایک بہت پرانے شاگرد کا بیٹا اندر پلانٹ میں آپریٹر لگا ہوا ہے۔ کمال ٹیکنالوجی ہے۔ جاپانی ہے۔''

سعید کمال: ''میں تو سر تین ماہ ٹیکنالوجی کے دیس میں گزار کر آیا ہوں۔''

پروفیسر: ''ہاں۔ ہاں۔ ہاں...... جاپان...... ظاہر ہے...... بتاؤ کچھ...... حیرت انگیز ترقی کی ہے ان لوگوں نے...... دنیا پر چھا گئے ہیں۔''

سعید کمال: ''آپ نے بھی اِس Chapter کے اِس حصے میں جاپان پر کچھ بات کی ہے۔''

پروفیسر: (جوش سے) ''ہاں۔ بالکل...... کچھ...... کچھ کی بات...... کیسا...... کیسی لگی تمہیں یہ بات......''

سعید کمال کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوتے ہیں جنہیں پروفیسر دیکھ نہیں پاتا لیکن اس کی خاموشی سے بھانپ جاتا ہے۔

پروفیسر: ''بتاؤ۔ بے لاگ...... تبصرہ کیا کرو...... تم جانتے ہو تمہاری رائے میرے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔''

سعید کمال: ''آ......۔ میں...... وہ...... وہ جو آپ نے مائیکل جیکسن اور میڈونا کا حوالہ دیا...... آج کل کے مشہور فنکار ہیں۔''

پروفیسر: (تنفر سے) ''فنکار۔ گانے والے ہیں۔ ہاں...... بالکل......''

سعید کمال: ''تو میرا خیال ہے سر جاپان کے حوالے سے...... تو وہاں تو یہ ہستیاں چھا چکی ہیں بلکہ آج کل کی جاپانی موسیقی...... بیشتر...... راک این رول، ہارڈ راک۔ جیز......

اور رگے میں رنگ چکی ہے۔"

پروفیسر: "کیا ہو چکی ہے؟...... بہرحال جو بھی ہے...... ہمیں اس سے غرض نہیں...... موسیقی جہنم میں جائے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا مسئلہ سائنس اور جاپانی ٹیکنالوجی کا ہے موسیقی ہمارا مسئلہ نہیں۔"

سعید کمال: "اگر موسیقی ہمارا مسئلہ نہیں سر تو سائنس بھی ہمارا مسئلہ نہیں۔"

پروفیسر کے منہ سے کچھ حیرت زدہ سی آوازیں نکلتی ہیں۔ گندے پانی کے پلانٹ کی بُو سے لبریز ہوا کا جھونکا دنیا پر غالب آ جاتا ہے۔

پروفیسر: "یہ...... یہ تم کیا بات کر رہے ہو...... اچھا ہوں...... سمجھ گیا...... میں نے بھی سنا ہوا ہے یار۔ ایسی کوئی بات نہیں...... وہ جو کہتے ہیں موسیقی روح کی غذا ہے۔"

سعید کمال: "اور سائنس ذہن کی غذا ہے۔ اور روح اور ذہن اور دل اکٹھے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ بائی دا وے سر۔ آپ نے حکمت بہزاد صاحب کے آرٹیکل کبھی پڑھے ہیں۔"

پروفیسر: "حکمت بہزاد یہ کون ہے؟"

سعید کمال: "یہ سر بہت پڑھی لکھی شخصیت ہیں۔ کلچر، آرٹ، فلم، موسیقی، رقص پر ان کا بہت کام ہے۔ انہیں مقامی ثقافت کی تخلیقی ترقی پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔"

پروفیسر حقارت سے ہنستا ہے۔

پروفیسر: "ناچ گانے پر کام کیا ہے۔ مقامی ثقافت کی تخلیقی ترقی...... کیا ترکیب بنائی ہے۔"

سعید کمال چند لمحے خاموش رہتا ہے۔

سعید کمال: "جی...... اُن کا خیال ہے کہ ناچ گانے میں ترقی کیے بغیر سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی حقیقی ترقی ممکن نہیں۔"

پروفیسر: "کیسا بیہودہ خیال ہے۔ کیا نام بتایا...... حکمت......؟"

سعید کمال: "حکمت بہزاد...... سر۔"

پروفیسر: "نام میں تو حکمت ہے لیکن ویسے کمی ہی لگتی ہے۔ کیا کرتا ہے۔ Academics میں ہے؟"

سعید کمال: "نہیں سر پہلے بیوروکریسی میں تھے۔ لیکن بہت سی بیرونی یونیورسٹیوں میں پڑھا ہے۔"

پروفیسر: (ایک طرح کی کبیدگی لہجے سے ظاہر ہوتی ہے) "تو تمہارے قبیلے سے ہوئے نا۔ تو مسئلہ کیا ہے اس شخص کا......"

سعید کمال ہنس پڑتا ہے۔

سعید کمال: "مسئلہ کوئی نہیں سر۔ اُن کا کہنا ہے کہ تخلیق کے سوتے اپنی زمین سے ہی پھوٹتے ہیں خواہ وہ سائنس ہو یا آرٹ۔ ورنہ سب کچھ نقالی ہی رہتا ہے۔ وہ طوطے اور بندر کی مثال دیتے ہیں۔"

سعید کمال پھر ہنستا ہے۔ پروفیسر بُرا سا منہ بناتا ہے۔

پروفیسر: "نان سینس۔ نقالی کیا بھائی...... پہلے جو کچھ سامنے آیا ہے وہ تو سیکھو پھر اُس سے آگے کی بات کرو۔"

سعید کمال: "جی۔ سر...... وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن بہزاد صاحب کی تھیوری یہ ہے کہ تہذیبی قحط سالی میں روح اور ذہن اکٹھے ہی فاقہ کشی کا شکار ہوتے ہیں۔"

پروفیسر: (عجیب سے انداز سے ہنستا ہے) "تہذیبی قحط سالی کیا بات کر رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کچھ تمہارے ذہن پر اثر ہوا ہے جاپان جا کر یا شاید اس بندے کے نظریات پڑھ کر...... کہاں لکھتا ہے، یہ اخبار میں؟"

سعید کمال: "جی سر۔ اخبارات میں بھی لکھتے ہیں۔ لیکن اب ان کی ایک نئی کتاب بھی آنے والی ہے۔ "فلم میں تخلیقی عمل کی ثقافتی بنیادیں" اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ "موسیقی اور ریاضیاتی سائنس"، "فلم تھیٹر اور معاشرہ۔ تخلیق کے تین دھارے۔"

پروفیسر: "ہوں۔ تخلیقی عمل کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ سمجھ رہا ہوں طریقۂ واردات......"

سعید کمال: "نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں۔ عملی طور پر بھی کافی سرگرم رہتے ہیں۔ بڑے عرصے سے ایک نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فلم اینڈ پرفارمنگ آرٹس بنانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔"

پروفیسر: (قہقہہ) "جدوجہد۔ ہنہ۔ کروڑوں Involve ہوں گے اس طرح کے پراجیکٹ میں۔ چھوڑو...... بہرحال اس کی کوئی کتاب آئے تو دکھانا ضرور...... دیکھیں ذرا......"

سعید کمال: "جی سر ضرور۔ جو چھپ چکی ہیں۔ وہ بھی پیش کروں گا۔"

پروفیسر: "ہوں۔ دکھانا۔ لیکن تم آج کچھ عجیب سی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو لیکن میں سمجھ رہا ہوں جو تم کہنا چاہتے ہو۔ گیارہویں باب میں میں اس موضوع کی طرف آ رہا ہوں......"

سعید کمال: "چھٹا مکمل ہو گیا سر...... میں چاہتا تھا باقی ساتھ لیتا جاؤں۔"

پروفیسر: "آ...... ہاں...... مکمل...... تو...... ایک طرح سے مکمل ہی ہے...... تھا...... میں تو اب ساتواں ختم کرنے والا ہوں...... تھا...... لیکن یہ جو نئے شکوک و شبہات تم نے پیدا کیے ہیں۔ پہلے ان کا ازالہ کرنا ہوگا...... میں سمجھ رہا ہوں جو تم کہنا چاہتے ہو...... تہذیبی قحط سالی...... ایسا نہیں ہے کہ میں سمجھ نہیں رہا...... میں نے اس طرح کی حکمت سنی ہوئی ہے۔"

سعید کمال: "جی سر......"

سولہویں رات کا چاند آسمان میں طلوع ہو چکا ہے پروفیسر چاندنی میں کافی ڈسٹربڈ نظر آتا ہے۔

پروفیسر: (بے ساختہ) "دراصل سچی بات یہ ہے کہ بے حیائی اور بے راہ روی مغرب کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ موسیقی، ناچ گانے...... اور آرٹ...... اور پتہ نہیں کیا کیا...... ہنہ......"

سعید کمال: "جی سر...... لیکن خرد افروزی کے ساتھ یہ تو پھر ہے ہی سر۔ سائنس، ہارڈ راک، ٹیکنالوجی، ایکس ریٹڈ آرٹ فلم...... اکٹھا Package ہے۔"

پروفیسر (چیخ کر) "کیا...... کیا کہہ رہے ہو۔ لیکن نہیں میں سمجھ رہا ہوں تم اس...... کون ہے...... حکمت بہزاد کے الفاظ بول رہے ہو۔ میں اپنی خرد افروزی۔ ہماری اپنی ہماری تہذیب کی...... خرد افروزی کا مسودہ دے رہا ہوں...... میرا خیال ہے۔ تم میرا بنیادی تھیسس ہی نہیں سمجھ پائے۔ میں...... تم...... پھر بات ہوگی...... ہم پھر بات کریں گے...... پھر پہ رکھتے ہیں۔ ابھی تو مجھے چھٹا اور ساتواں دونوں Revise کرنے ہوں گے پھر پہ رکھتے ہیں۔ تمہاری اس پریشان خیالی کا علاج بھی تو کرنا ہوگا...... تم...... میرا مطلب ہے۔ میں...... میں دیکھ رہا ہوں کہ پلانٹ کی بدبو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے ابھی یہ ٹیکنالوجی اتنی کامیاب نہیں آخر

بدبو کیوں نہیں جاتی؟"

سعید کمال: "نہیں سر۔ ٹیکنالوجی کا کوئی قصور نہیں۔ اصل مجرم سائنس ہے۔"

پروفیسر: "سائنس مجرم...... تم...... ہوش میں تو ہو...... ہم نے دنیا کو سائنس دی۔ ہم نے...... لیکن میں سمجھ رہا ہوں جو تم کہنا چاہتے ہو...... ہم پھر بات کریں گے پھر پہ رکھتے ہیں...... تم اب...... اور۔ ہاں یہ کتاب اس حکمت صاحب کی جب چھپے مجھے ضرور دینا۔"

سعید کمال: (آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے) "میرا خیال ہے سر میں نے آج آپ کا کافی وقت برباد کیا اگلا باب پھر کب تک......"

پروفیسر: (چونک کر) "باب...... کون سا باب...... ہاں۔ اچھا...... کب تک...... جب تک...... دیکھتے ہیں...... شکریہ ان پپنوں کا...... جاپانی پپنوں کا......"

پروفیسر بے چین سا قہقہہ لگاتا ہے اور سوالیہ نظروں سے سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: "میں تو سر آپ کے لیے لیپ ٹاپ لانے لگا تھا مگر پھر سوچا آپ تو کمپیوٹر پر کام نہیں کرتے۔"

پروفیسر: "یہ کیا چیز ہے؟"

سعید کمال: "یہ سر آپ پورٹیبل کمپیوٹر سمجھ لیں...... مہنگا ہے۔ بالکل نئی چیز ہے...... لیکن اب تو کافی مقبول ہو رہا ہے۔"

پروفیسر: "واہ...... بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں یہ لوگ...... حیرت ہوتی ہے...... اور ہاں...... یہ سارا مسودہ تم نے ہی کمپیوٹر سے نکالنا ہے...... جب میری طرف سے مکمل ہو جائے گا...... مجھے تو اب شک ہوتا ہے کب ہوگا......؟ خیر...... بعد میں اگلی کتاب کے لیے میں بھی کمپیوٹر سیکھ لوں گا...... ٹائپنگ تو واجبی سی آتی ہے مجھے...... اچھا اللہ حافظ...... ہاں۔ آؤ پھر تمہیں...... گلی تک پہنچا دوں...... گاڑی کدھر کھڑی کی ہے...... سرکاری گاڑی ملی ہوئی ہے ناں تمہیں......"

سعید کمال: "جی سر...... خدا حافظ سر......"

پروفیسر: "اللہ حافظ......"

اس لمحے سعید کمال محسوس کرتا ہے کہ پروفیسر اُسے جلد از جلد گھر سے نکالنا چاہتا ہے اور اُس کی موجودگی اُسے پریشان کر رہی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟

ہم دلوں کا حال نہیں جانتے اگرچہ کبھی کبھی بلکہ اکثر جان بھی لیتے ہیں اسی لیے ہم اس سوال اور اس سے ملتے جلتے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے اگر ممکن ہوا اور سودمند ہوا تو پروفیسر اور اُس کے (نا) پسندیدہ سابقہ شاگرد کے درمیان ہونے والی کسی نہ کسی گفتگو کے سلسلے کی طرف پلٹتے رہیں گے۔ ہم حسن کی صورت حال کو سمجھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن فی الحال تو ہم پلٹتے ہیں اور جتنی بھی تیزی سے ممکن ہو سکتا ہے پلٹتے ہیں، بہت پیچھے کے واقعات کی طرف برسوں پہلے کے۔ یعنی میگا فون میں خرابی کی پیدائش کے لمحات کی طرف۔ کٹی ہوئی انگوٹھی کے زمانے میں۔

قابل مرمت میگا فون کو واپسی۔ سر عام پھانسیوں کے قابل لوگ اور بے شرمی کے پیپر ویٹ

زخمی آپریشن انچارج اے۔ ایس۔ پی۔ سعید کمال کو فوری طور پر ہسپتال بھجوانے کے ساتھ ہی ڈپٹی انچارج نے ڈیوٹی سنبھالی اور ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کی خاطر پتھر برسانے والوں کو خبردار کرنے کے لیے کہ اگر وہ منتشر نہ ہوئے تو ان کے پتھروں کے جواب میں گولیاں بھی برسائی جا سکتی ہیں، اُس نے سڑک پر گرا ہوا میگا فون اٹھایا اور بٹن دبا کر آلے کے مائیکروفون کے سامنے اپنا پیغام پوری قوت سے بول دیا لیکن آواز اُس کے دائیں بائیں موجود نفری سے آگے نہ بڑھ سکی۔ میگا فون پتھر کی کاری ضرب سے بیکار ہو چکا تھا۔ یہ ایک خطرناک صورتحال تھی۔ فسادیوں کو خبردار کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ ڈپٹی نے افراتفری کے عالم میں حوالدار صفدر سلطان کو میگا فون پکڑایا اور اُسے حکم دیا کہ وہ بھاگتا ہوا جائے اور سپلائی کی بس میں سے دوسرا لائے اور اگر دوسرا نہ ہو تو ہیڈ کوارٹر وائرلیس کر کے دوسرا فوراً منگوائے۔ حوالدار صفدر سلطان نے میگا فون پکڑ کر جوں ہی سپلائی بس کی طرف بھاگنا شروع کیا ایک پتھر اُس کی کمر پر آ کر لگا ضرب معمولی تھی لیکن اُس نے پھر بھی گھوم کر اپنے پتھر پر ایک نظر ڈال لینا ضروری سمجھا اور وہ حیران رہ گیا۔ وہ پتھر نہ تھا بلکہ سنگ مرمر کا ترشا ترشایا ایک پیپر ویٹ تھا

اچٹتی نظر سے اُسے لگا کہ پیپر ویٹ پر کئی چھوٹی چھوٹی مورتیاں سی بنی ہیں۔ وقت نہیں تھا لیکن اُس نے جان لیا کہ قیمتی شے ہے جلدی سے اُس نے نیچے جھک کر اُسے اُٹھایا اور جیب میں ڈال ہی رہا تھا کہ ڈپٹی کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ ''نیچے تیری ماں پڑی ہے جسے اٹھاتا ہے۔ اِدھر جیب میں کیا ہے...... ہاتھ ڈالا ہے...... اپنا...... پکڑتا ہے۔ او گروی چود جلدی جا...... دفع ہو میگا نہیں تو تیری ماں کے یار اُدھر سے آ جائیں گے۔''

حوالدار صفدر سلطان بس کی طرف بھاگا مگر اس ارادے کے ساتھ کہ میگا یعنی میگا فون ملا بھی تو وہ نہیں لائے گا بلکہ بس میں ہی رُکے گا اور راشن کے بسکٹوں میں سے ایک آدھ ڈبہ اڑائے گا۔ وہ فسادیوں کے تیور دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ میگا فون کیا وہ میگا فون کے باپ کی بھی آواز نہیں سنیں گے۔ اتنے میں اُسے ڈز ڈز کی آوازیں سنائی دیں اور پھر ایک تھاہ...... ڈپٹی نے ہوائی فائر کر دیا ہے پاگل کے پتر نے...... بس اب یہ آنسو گیس کے گولے چلوائے گا اور پھر ساری نفری پیچھے بھاگے گی۔ بُرا ہوا سعید کمال صاحب زخمی ہو گیا وہ ٹکا ہوتا اِدھر تو سنبھال لیتا۔ جی دار آدمی ہے۔ اس ڈپٹی کو سوائے ماں بہن کی گالیاں دینے اور حرام کمانے کے اور آتا کیا ہے۔ سیدھے سیدھے قتل اور زنا بالجبر کے مجرم بھگانے والا ہے۔ آپ خود بڑا زانی ہے۔ بہن چود...... حوالدار صفدر سلطان کو وہ واقعہ یاد آ گیا جب ڈپٹی نے ایک گینگ ریپ کیس کے بااثر ملزموں کو لمبی رشوت لے کر نہ صرف چھوڑ دیا تھا بلکہ دو ہفتے تک مغویہ کو خود ریپ کرتا رہا تھا پھر الٹا اُسی پر حدود کا مقدمہ بنوانے کی دھمکی دے کر اُس کے خاندان سے پچیس ہزار مزید رشوت لی تھی۔ ایسے ہی کتوں نے پولیس کو بدنام کیا ہوا ہے۔ حوالدار صفدر سلطان کے پاس پولیس ہی نہیں بلکہ پورے ملک اور معاشرے کی مکمل اصلاح کا منصوبہ موجود تھا۔ یعنی سر عام پھانسیاں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ملک و قوم کو راہ راست پر لانے کا اس سے زیادہ موثر حل اور کوئی ہے نہیں۔ سب جانتے ہیں۔ وہ کہتا کہ ہر جگہ اصل مردود کون ہیں۔ پکڑو ان دلّوں کو، دو چوراہے میں پھانسیاں۔ ایسی سوچ آنے پر یا ایسی بات پورے جوش سے کرتے وقت صفدر سلطان کو البتہ ایک پریشان کن خیال ضرور آتا کہ اتنی بڑی تعداد میں—— جو اُس کے خیال میں لاکھوں سے کم نہیں ہو سکتی تھی—— سر عام پھانسیاں دینے کے لیے اتنے رسے اور سولیاں کہاں سے لائی جائیں گی اور پھر کیا ہماری ڈیوٹیاں لگیں گی۔ سر عام

پھانسیوں کا پرجوش چیمپیئن ہونے کے باوجود صفدر سلطان نرم دل حوالدار تھا۔ زندہ بندے کو خود اپنے ہاتھوں سے پھانسی لگانے کا تصور اُسے بالکل اپیل نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی صرف مردودوں کی نشاندہی تک محدود رکھنا چاہتا تھا...... کہ ہم سے پوچھیں کس بہن چود کو لگائی ہے پھانسی سرعام۔

صفدر سلطان سپلائی کی بس سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ پیچھے سے ٹھاہ ٹھاہ کی آوازیں مسلسل آنے لگیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا، اُس نے سوچا۔ صبح آتے ہی اُس نے فسادیوں میں بہت سی ڈاڑھیاں دیکھی تھیں تو اُس نے سوچا تھا کہ بس اب خیر نہیں۔ اب اس کی سوچ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ پھر وہ بس میں پہنچ کر بسکٹ کا ڈبہ کھولنے کا تصور کر ہی رہا تھا کہ پہلے ایک ٹیں کی آواز آئی جیسے کوئی بھونڈی تیزی سے کان کے پاس سے گزرتی ہے اور پھر دوسرے لمبے ٹھاہ کی آواز آئی اور پھر جب اُس کے ذہن نے دونوں آوازوں کو ملایا تو اُس کے منہ سے بے ساختہ آواز نکلی ''اوہ تیرے...... دی...... یا اللہ خیر...... یہ تو......'' اور وہ سمجھ گیا کہ وہ گولی تھی جو اُس کے کان کے قریب سے یعنی مکمل حوالدار صفدر سلطان سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی۔ اس انکشاف نے اُسے باقاعدہ جذباتی کر دیا اور وہ پولیس ٹریننگ مینوئل کے سبق نمبر 47 کے مطابق تیزی سے زمین پر لیٹ جانے کی بجائے سیدھا تیزی سے بھاگتا ہوا بس کے اندر گھس گیا۔ جہاں ارشاد ڈرائیور پورے سکون سے بگلے کے سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ دھواں اتنی شدت سے اندر کھینچتا تھا کہ اس کے دُبلے پتلے چہرے کے نیچے گردن پر ابھرا ہوا نرخرہ کسی بگلے کی پوٹ کی طرح ہی ابھر آتا تھا۔ اُس نے اطمینان سے پوچھا۔

''گولی چل رہی ہے صفدر؟''

لیکن صفدر سلطان جو اطمینان کی دولت سے بالکل محروم ہو چکا تھا بلند آواز میں تیزی سے بولنے لگا جیسے کسی مجمعے سے خطاب کر رہا ہو۔

''کہتا تھا میں...... کہا تھا میں نے...... بہت کہا...... باز آ جاؤ...... باز آ جاؤ نہیں تو ڈاڑھیاں آ جائیں گی...... اور ایسی آئیں گی کہ نکالے نہیں نکلیں گی...... تمہاری...... میں کہتا تھا سنبھل جاؤ۔ ات خدا کا دیر ہوتا ہے۔ لو اب آ گئی ہیں۔ کر لو جو کرنا ہے...... گول...... گولی بھونڈی۔''

''پاگل ہو گیا ہے'' ارشاد کا بگلا بولا اور صفدر سلطان پھر پھٹ پڑا۔

''پاگل میں نہیں ہوا۔ پاگل وہ ہوئے ہیں جنہوں نے ہمیشہ سے ادھر غدر مچایا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے جب سے دیکھ رہے ہیں...... ایک ہی علاج ہے...... سرعام پھانسیاں...... دو ان بہن چودوں کو...... چوراہے میں پھانسیاں...... دیکھتا ہوں باقی سیدھے ہوتے ہیں کہ نہیں...... سیدھے تک...... گولی تو چلے گی...... ابھی تو چلے گی...... کوئی نئی بات نہیں ہے...... ہر دوسرے۔ تیسرے۔ چوتھے۔ پانچویں سال چلتی ہے۔ ابھی تو اُس نے چلوائی ہے...... ڈپٹی نے...... ظالم کے بچے نے...... اوہ کوئی ایک آدھ گولی یہ خود بھی ٹھنڈی کرے کہیں...... او۔ او۔ کسی ایک آدھ پر...... اس کی بھی لکھی ہوئی ہو...... گولی پر...... ٹھنڈی کرے یہ بھی...... کوئی...... یہ ولا......''

پھر عجیب ہوا کہ تھوڑی دیر بعد کسی ''گھناؤنی سازش کے تحت بلا اشتعال پولیس پر فائرنگ'' کرنے والے کسی شرپسند کی گولی کو ڈپٹی نے واقعی ٹھنڈا کر دیا۔ جب اس کی لاش سپلائی بس کے ساتھ ہی کھڑی پولیس ایمبولینس کے قریب لائی گئی تو بسکٹ کے ڈبے سے چن چن کر بسکٹ کھاتا حوالدار صفدر سلطان سکتے میں آ گیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر تیزی سے ایسا بیٹھا جیسے گر گیا ہو۔ ارشاد ڈرائیور نے اُس کی طرف ایسی حیرت اور خوف سے دیکھا جیسے کوئی نامی گرامی قاتل اچانک سامنے آ گیا ہو۔ صفدر سلطان ساری رات اپنے کوارٹر میں روتا رہا۔ اگلے دن اُس نے جب ڈپٹی کی بیوی اور بچوں کو لاش سے لپٹ کر روتے دیکھا اور پولیس اعزاز کے ساتھ تدفین پر گولیاں چلتی سُنیں تو اُس نے نوکری سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا اور پھر اگلے ہی دن اس فیصلے پر عمل کر کے وہ اپنے گاؤں بدومرادے چلا گیا، اس ارادے کے ساتھ کہ اپنے حصے کی چھ سات بیگھے زمین پر سبزیاں کاشت کرے گا اور ساری توجہ اپنے بچوں کی تعلیم پر دے گا۔ بیٹے کو ڈاکٹر اور بیٹی کو بھی ڈاکٹر ہی بنائے گا۔

تعلیم سے اُسے تعلیمی اخراجات اور تعلیمی سامان اور دفتری چیزوں کا خیال آیا۔ پھر اچانک اُسے اُس پیپر ویٹ کا خیال آیا جو ڈپٹی کی موت سے کچھ پہلے کسی پتھر کی طرح اس کی کمر پر لگا تھا۔ اور پھر کوارٹر میں اپنا سامان باندھتے وقت بھی بغیر غور سے دیکھے اُس نے اُسے اپنے بیگ میں ڈال لیا تھا کہ اپنے بیٹے کو دے دے گا۔ اب گاؤں پہنچنے کے تین دن بعد اچانک یاد آنے پر اُس نے بیگ کھولا۔ ویسے بھی میلے کپڑے بیوی کو دھونے کے لیے دینے

تھے، پیپر ویٹ کپڑوں کے نیچے پڑا تھا۔ اُس نے اُسے اٹھایا اور اپنے بیٹے وحید کو آواز دینے ہی والا تھا کہ پہلی دفعہ اُس نے سنگ مرمر کے اُس تراشے ہوئے ٹکڑے کو غور سے دیکھا اور سابق حوالدار صفدر سلطان سُن ہو گیا۔ وہ بے شرمی کا پیپر ویٹ تھا۔ سفید سنگ مرمر کے چوکور مکعب ٹکڑے کی ایک طرف تو ہموار کاغذوں پر دھرنے کے لائق بنی تھی مگر باقی تو ہر طرف چھوٹی چھوٹی مورتیاں تھیں۔ اور بڑی عجیب مورتیاں تھیں ایک دو بکرے کی ٹانگوں والے ننگ منگے مرد الف ننگی عورتوں سے بغل گیر ہو رہے تھے بلکہ سیدھا سیدھا بُرا کام کر رہے تھے۔ صفدر سلطان اس طرح کی بے حیائی کا بُت اپنے بیٹے کو دینا تو کُجا دکھانے کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ وحید کو آواز دینے کی بجائے وہ دیر تک پیپر ویٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سوچا کہ وہ کبھی اسے بیچنے کی کوشش کرے گا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چیز قیمتی ہے اور امیر شوقین لوگ اس طرح کی ننگی مورتیاں اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔

لیکن جو بات حوالدار صفدر سلطان نہیں جانتا تھا اور ہم جانتے ہیں وہ یہ تھی کہ آخر وہ بے شرمی کا پیپر ویٹ اُس زمانے کے ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کے لیے فساد ڈالنے والوں کے ہاتھ کیسے لگا اور پھر پتھراؤ کے عمل کے دوران اُسے ایک عام پتھر کی طرح پھینک کیسے دیا گیا۔ بات بہت آسان تھی لیکن ظاہر ہے کہ صفدر سلطان حوالدار کیسے جان سکتا تھا۔ دراصل اس زمانے کے ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کے لیے فساد اُس مقام پر کئی روز سے ہو رہے تھے۔ اور ایک روز پہلے ہی فسادیوں نے اس مقام کے دائیں بائیں بڑی سڑک پر واقع کئی دکانوں اور دفاتر میں خوب لوٹ مار مچائی تھی اور چند ایک میں آگ بھی لگا دی تھی۔ انہی دفاتر میں ایک ملٹی نیشنل فرم زارگو انٹرنیشنل کا دفتر بھی تھا جو دنیا میں کرین، بلڈوزر، کیٹر پلر جیسی کھدائی کرنے والی ہیوی مشینری مہیا کرنے والی چند بڑی فرموں میں سے ایک تھی۔ جب مظاہرین شیشے کی بڑی کھڑکیاں توڑ کر اندر داخل ہوئے تو نوجوان زونل منیجر سعید کمال پہلے ہی اپنا ضروری ریکارڈ محفوظ مقام کی طرف منتقل کرا چکا تھا اور خود بھی اُس وقت وہاں نہ ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ صرف اُس کے چند ملازمین تھے جو نعروں کی آوازیں سنتے ہی عقبی دروازے کی راہ سے فرار ہو چکے تھے یا پھر اُس کی بڑی آفس ٹیبل تھی جس پر بہرحال قیمتی لوازمات موجود تھے اور وہی فسادیوں کے قابو میں آئے۔ جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا اُس نے قابو کیا۔ اتنے

میں اچانک پولیس نمودار ہو گئی اور زارگو انٹرنیشنل کے زونل منیجر کا وہ کمرہ چھ سات فسادیوں کے لیے چوہے دان بن گیا۔ پہلے تو انہوں نے میز پر سے چیزیں اٹھا اٹھا کر پولیس پر پھینکیں لیکن زیادہ تر چیزیں باہر فٹ پاتھ پر یا سڑک پر گریں پھر پولیس نے آسانی سے انہیں قابو کر کے گزشتہ کئی دنوں کا غصہ ان فسادیوں پر اتارا اور مار مار کر انہیں ادھ موا کر دیا۔

اگلے دن جب پھر اُسی مقام پر ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات مانگنے والے اکٹھے ہوئے۔ قانون سے آمنا سامنا ہوا اور پتھراؤ شروع ہوا تو یوں تو اُن کے پاس ٹوٹی ہوئی اینٹوں اور کنکریٹ کے مناسب ٹکڑوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن پھر جب وہ لمحہ آتا ہے کہ پتھر پھینکتے وقت نظریں نشانے کی طرف اٹھی ہوتی ہیں اور دایاں ہاتھ بس اپنے طور پر اِدھر اُدھر پتھر ڈھونڈتا ہے...... ایسے میں جبار نامی ایک نوجوان فسادی کے ہاتھ میں سنگ مرمر کا وہ نرم و ملائم ٹکڑا آیا۔ وہ اُس کے لمس میں کافی فرق پر حیران ہو کر اُس پر ایک دوسری نظر ڈالنے ہی والا تھا کہ اس کے پاس اچھلتے نعرے لگاتے نوجوان مولوی نے کچھ دیکھے بغیر اُس کے ہاتھ سے 'پتھر' کا وہ ٹکڑا اُچک کر دور کھڑی پلس نفری کی طرف پھینک دیا اور اس طرح آخرکار وہ ناکارہ میگافون اٹھا کر جاتے حوالدار صفدر سلطان کی کمر پر لگا۔

بہرحال سنگ مرمر کا ٹکڑا اٹھاتے ہی فسادی جبار جان گیا تھا کہ یہ کل کے فساد میں کسی زارگو کمپنی کے دفتر کی لوٹ مار کرتے گرا ہوگا۔ مگر جو بات جبار نہیں جانتا تھا وہ یہ تھی کہ یہ پیپر ویٹ نوجوان زونل منیجر سعید کمال کی منگیتر انیلا بلال نے اُسے تحفے کے طور پر دیا تھا جب وہ اٹلی سے چھٹیوں پر واپس آئی تھی اور جہاں وہ میلان کی مشہور زمانہ آرٹ اکیڈمی —— Academia Di Belle Art Di Bera میں سنگ تراشی اور خاص طور پر Ceramics میں ایڈوانس ڈگری کے لیے کام کر رہی تھی۔

دیکھو اُس زمانے کے ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات مانگنے والوں کے فساد نے کس طرح کم از کم تین چیزوں یعنی میگافون، کٹی ہوئی انگوٹھی اور بے شرمی کے پیپر ویٹ کو نئی ہستی دی۔ اور کس طرح اب بطور مدیرِ حیرت ان چیزوں کے زمان و مکان میں ارادی غیر ارادی مداخلت کرنے والوں کو یعنی سعید کمال، انیلا بلال، حوالدار صفدر سلطان بلکہ فسادی نوجوان جبار اور فسادی نوجوان مولوی کو بھی ہمارے لیے مکمل طور پر نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس لیے ہم

حسن کی صورتحال کا جائزہ لیتے وقت جہاں بھی ضروری ہوا اُن کی طرف رجوع کریں گے۔

لکی سٹار تھیٹر: میلہ شاہ جیون جوگا میں

ڈپٹی کی موت اور حوالدار صفدر سلطان کے استعفیٰ کے دو دن بعد ہی میگافون پولیس کے کنڈم مال کے گودام میں پہنچا دیا گیا۔ اور ساڑھے تین سال تک وہیں پڑا رہا۔ پھر ایک بڑی نیلامی ہوئی جس سے پولیس کے دو افسروں کے کچھ مالی مفادات وابستہ تھے۔ اشتہار میں "جہاں ہے جیسا ہے" کی بنیاد پر نیلامی کے لیے پیش کیے جانے والے سامان کی فہرست میں 17 نمبر پر "میگافون تعداد ــــ ایک" لکھا تھا......

اور اسی لکھے ہوئے پر لکی سٹار تھیٹر کے مالک شمشاد ایرانی کی نظر اُس وقت پڑ گئی جب وہ بھاگاں والا کے تین روزہ میلے کے بعد سب کچھ سمیٹ کر دو ٹرکوں اور ایک ویگن پر مشتمل اپنے قافلے کو شاہ جیون جوگا کے مشہور میلے کی طرف لے جا رہا تھا جو ایک ہفتہ چلتا تھا۔ میلہ شروع ہونے میں ابھی آٹھ روز باقی تھے۔ لیکن لکی سٹار والے کسی بھی جگہ شو شروع کرنے سے ہفتہ پہلے ہی وہاں پڑاؤ ڈال لیتے تھے اور فائدے میں رہتے تھے۔ مرضی کا اڈہ مل جاتا تھا بعض جگہوں پر اسٹیج بنانے کے لیے مٹی کھود کر جمع کرنے میں آسانی رہتی تھی پرجوش مقامی دیہاتی نوجوان مدد کے لیے تیار مل جاتے تھے۔ سارے سال کی منزلیں، بدلتے موسموں اور گھٹتے بڑھتے چاندوں کے ساتھ میلے، عرس، تہوار، موسمی جشن، صنعتی غیر صنعتی نمائشیں تھیٹر کے ہر کارندے کے دل پر لکھی تاریخیں تھیں پھر بھی پڑاؤ اور کوچ کے منتظمین ماسٹر یاسین اور گلزار پیارا آخری شو کی رات تھکی ماندی ایکٹرسوں اور اُن سے زیادہ تھکے ہارے ایکٹروں کو مالک کے فیصلے سے ضرور آگاہ کرتے کہ اگلی منزل وہی ہوگی جو اُن کے دل میں ہے یا کچھ اور۔ "یا کچھ اور" کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ لیکن کبھی سال دو سال میں ایک آدھ بار کہیں نہ کہیں لکی سٹار کے آخری شو کے بعد جو عموماً سلطانہ ڈاکو ہوتا تھا اچانک سب کو پتہ چلتا کہ "وچھوڑے" کا حکم آ گیا ہے یعنی لکی سٹار اگلے میلے یا عرس کی طرف سفر نہیں کرے گا۔ مالک شمشاد ایرانی ایک دو ماہ کے لیے غائب ہو جائے گا۔ تنبو قناتوں اور باقی سب ساز و سامان کو ٹرکوں سمیت ایک مستقل محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے گا اور باقی پچیس تیس مرد و زن بھی

مدتوں سے بچھڑے اپنے پیاروں سے ملنے کہیں نہ کہیں چلے جائیں گے۔

"وچھوڑے" کی اطلاع تھیٹر کی روایت کے مطابق ہر کسی کو گلزار پیارا دیتا تھا جو ایک بونا تھا اور ایسے موقعوں پر وہ کافی جذباتی ہو جاتا تھا خاص طور پر بے بی کنار کو بتاتے وقت کیونکہ وہ اُس کی گھوڑی تھی اور وہ اُس کا البیلا ٹانگے والا۔ ہر شو کے دوران ان دونوں کے آئیٹم "میں ہوں البیلا ٹانگے والا" کا لوگ بے چینی سے انتظار کرتے تھے جس میں "پیارا" بے بی کنار کی کمر کے گرد ایک لمبا رنگین دوپٹہ باندھ کر دونوں سرے ہاتھ میں تھام لیتا تھا۔ اور پھر ریکارڈ پر گانا چل پڑتا تھا ـــــ گھوڑا پشوری میرا ٹانگہ لہوری میرا۔

بیٹھو میاں جی بیٹھو لالہ
میں ہوں البیلا ٹانگے والا

اور ساتھ ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے بھاگنا شروع کر دیتے تھے۔ تک تک ایک ہی جگہ بھاگتے ہوئے پیارا ریکارڈ کے ساتھ منہ سے کوچوانوں کی مخصوص ٹک ٹک کی آوازیں نکالتا اور چابک لہراتا تو بے بی کنار اپنی بھاری چھاتیاں آگے کو جھکاتی، چوڑیوں سے بھرے گورے بازو آگے کو پھیلاتی، کولہے لہراتی اور پھر سر تماشائیوں کی طرف گھما کر مسکراتی تو تالیاں اپنے آپ بج اٹھتیں اور نوجوانوں کے دلوں سے آہیں ہوک جیسی آوازوں کی صورت پنڈال میں گونج جاتیں۔ سرخ ہونٹوں، گورے گالوں، بھوری آنکھوں اور کالے بالوں والی گھوڑی کا چہرہ مدتوں ایک میٹھے درد کی طرح اُن کے دلوں سے نکالے نہیں نکلتا تھا۔ انہی نوجوانوں میں ایک خُوشیا تھا......

وہی ہو رہا ہے وہی سب کچھ پھر ہو رہا ہے چیزیں جب اپنی کہانی سنانے پر زور مارتی ہیں تو شاید ہم اپنے ادارتی فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ شاید...... لیکن دیکھا جائے تو یہ بھی ہمارے ادارتی فرائض میں ہی شامل ہے۔ چیزیں حیران کرتی ہیں۔ مگر لکی سٹار تھیٹر کو شاید کچھ لوگ "چیز" سمجھنے میں پس و پیش کریں لیکن ہم سمجھتے ہیں ایک سطح پر...... ہم "ایک سطح" پر اصرار کریں گے...... لکی سٹار تھیٹر تنبو قناتوں، میزوں، کرسیوں، دریوں، خیموں، بانس کی سیڑھیوں، رسوں، پیٹرومیکس لیمپوں، لاؤڈ سپیکروں، ہارمونیم کی پیٹیوں، طبلوں، ڈھولکیوں، ٹکٹوں کی بکوں اور درجنوں دوسری چھوٹی بڑی چیزوں پر مشتمل ایک بڑی چیز تھی جو پچیس تیس

انسانوں کے اُس گروپ کو اپنے ساتھ اور اُس کے ہر ممبر کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے ہوئے تھی۔ ہمارے اس موقف کو بھی ممکن ہے رد کیا جائے لیکن فی الحال ہم اس رد کو رد کرتے ہیں اور ''حسن کی صورتحال'' کے حوالے سے فی الوقت زیادہ اہم چیز یعنی میگافون کی طرف پلٹتے ہیں دیکھا جائے تو کئی سٹار تھیٹرز کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہم میگافون سے اتنا دور نہیں بٹے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ میگافون کئی سٹار تھیٹرز کے مالک شمشاد ایرانی کی توجہ حاصل کر چکا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اُس کی یہ توجہ اس چیز کی تاریخ پر کیا اثر ڈالتی ہے۔

بھاگاں والا کے میلے کے بعد شاہ جیون جوگا کے آٹھ روزہ میلے میں شو کرنے کے لیے انہیں ایک نیم صحرائی علاقے تک پہنچنا تھا۔ سفر کے پہلے روز دوپہر کے وقت قافلہ شمشاد ایرانی کے خاص پسندیدہ ڈرائیور ہوٹل پہنچا جو سڑک کنارے نیم ویرانے میں مگر درختوں کی گھنی چھاؤں تلے واقع تھا۔ ایکٹرا یکٹرسیں، خوبصورت عورتیں مرد، طاقتور جسموں کے مالک گیٹ کیپر، عقابی آنکھوں والے ٹکٹ فروش ــــ ٹیکنیکل سٹاف، صفائی والے سب گھنی دھریکوں کی چھاؤں تلے بچھی بڑی بڑی چارپائیوں پر بڑی بے تکلفی سے براجمان ہو گئے۔ ہوٹل کے مالک جبار کے لیے بھی یہ سال کا ایک نادر موقع ہوتا تھا۔ سوہنے لوگوں کے آتے ہی ــــ جبار انہیں سوہنے لوگ ہی کہتا تھا ــــ ہر طرف جنگل میں منگل ہو گیا۔ پہلے سے موجود گاہکوں کے لیے ان عجیب و غریب عورتوں مردوں کی یک لخت آمد ایک دل دہلانے والی حیرت کا باعث بنی۔ انہی میں ایک طرف جھلنگا چارپائی پہ بیٹھے قریبی گاؤں کے ادھیڑ عمر امام مسجد مولوی کمال دین اور اُس کا بیٹا سعید بھی تھے وہ قریبی قصبے کے لیے بس پکڑنے آئے تھے اور انتظار کے لیے جبار کے ڈرائیور ہوٹل سے چائے پینے بیٹھ گئے تھے۔ سعید کمال جو دسویں جماعت کا طالب علم تھا پھٹی پھٹی نظروں سے اُن رنگ برنگے مردوں اور بے پردہ بے باک عورتوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو بات بات پر قہقہے لگاتی اور کسی نہ کسی ساتھی مرد کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی تھیں۔ اُن کی طرف سے آتی ہوا کے جھونکے میں ہنسی کی ایسی آوازیں اور خوشبوئیں آ رہی تھیں جو مولوی کمالے کے بیٹے نے نہ پہلے کبھی سُنی تھیں نہ سونگھی تھیں۔ بیٹے کا اشتیاق دیکھ کر مولوی کمال دین پریشان سا ہو کر بولا۔

''یہ کنجر لوگ ہیں بیٹا۔ ان کی طرف زیادہ دیکھنا ٹھیک نہیں۔''

''نہیں۔ ابا جی...... یہ لوگ...... یہ عورتیں...... تو تھیٹر میں کام کرتی ہیں۔''

''ایک ہی بات ہے۔ کنجریاں ہیں بیٹا۔''

''ابا جی۔ یہ جو...... ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، لیلیٰ مجنوں تھیں...... یہ بھی کنجریاں تھیں؟''

مولوی کمال دین نے بیٹے کے سوال کا جواب دینے میں کچھ وقت لیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بالکل۔ کنجریاں تھیں۔ چل اٹھ چلیں سڑک پر انتظار کرتے ہیں۔ جا جا کر جبارے کو چائے کے پیسے دے آ۔ لیکن ٹھہر جا میں خود جاتا ہوں......''

مولوی کمال دین نے سوچا کہ سعید پیسے دینے جائے گا تو جبارے تک پہنچنے کے لیے اُسے ان کنجروں کے بہت قریب سے گزرنا پڑے گا مناسب یہی ہے کہ وہ خود پیسے دے آئے اور اگر ممکن ہو تو دبے لفظوں میں جبار کو تنبیہہ بھی کرے کہ وہ ایسے لوگوں کو مہمان نہ بنایا کرے۔

جبار کے ڈرائیور ہوٹل پر ڈنبے کا دیسی گھی میں پکا گوشت اور دیسی مرغے کی کڑاہی کھانے کے دوران شمشاد ایرانی نے چارپائی پر پڑے دو دن پرانے اخبار میں پولیس کے مال کی نیلامی کا وہ اشتہار دیکھا جس میں ایک میگافون بھی شامل تھا۔ اُسے یاد آیا کہ بونے پیارا نے بھی کئی بار اس چیز کی فرمائش کی تھی جو لاؤڈ اسپیکر بھی ہوتی ہے اور ہر طرف گھوم پھر بھی سکتی ہے جدھر چاہے لے جاؤ۔ پیارا ٹکٹیں کھلنے سے پہلے تماشائیوں کا مجمع اکٹھا کرنے کے لیے گیٹ کے ساتھ بنے اونچے پلیٹ فارم پر جانی ہیجڑے اور فیروز گویے کے ساتھ ڈیوٹی دیتا تھا۔ جب جانی ناچتا/ناچتی اور فیروز علاقے کی مناسبت سے کسی عشقیہ داستان کے بول سناتا تو پیارے کو مجمع کنٹرول کرنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنا پڑتا تھا۔ اُس کی یہ مصیبت صرف میگافون ہی دور کر سکتا تھا جو مد مقابل تھیٹر کے عملے کے پاس پہلے ہی موجود تھا۔ ارشاد نے اشارے سے پیارے کو بلایا جو دوسری جہازی چارپائی پر کئی سٹار کی سسی انیلا بلال اور دُبلے بدن اور اُداس آنکھوں والی پروین بیگم عرف چنو دُلاری کی پلیٹوں سے اُن کی ادھ کھائی مرغ کی ٹانگیں اٹھا رہا تھا اور جہاں آرا سوہنی اور فرخندہ ہیر ہنس رہی تھیں۔ پیارا مگن تھا لیکن فرخندہ نے شمشاد کو اشارہ کرتے دیکھ لیا۔

"پیارے مالک بلا رہا ہے تجھے......" اُس نے بونے سے کہا۔

"مالک نے...... لینا ہے میرا" پیارے نے پینو دلاری کی جوٹھی مرغے کی ٹانگ پر دانت جماتے ہوئے کہا۔

"دینے جوگا ہے بھی تو......" جہاں آرا نے قہقہہ لگایا۔

"آزمائش شرط ہے" پیارے نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"تیری بے بی جو ہے" فرخندہ نے کہا۔

"پیارے ایک بات تو بتا۔ سچی بتانا۔ بے بی کٹار نے کبھی تجھے پاس آنے دیا ہے؟" جہاں آرا نے پوچھا اور پیارے کی پُرعزم سنجیدگی اداسی میں بدل گئی۔ اُس نے پرتشویش نظروں سے دور ایک چارپائی کی طرف دیکھا جہاں بے بی کٹار غیاث طبلچی سے چرس کے سگریٹ کا کش مانگ رہی تھی اور وہ انکار کر رہا تھا

"وہ تو گھوڑی ہے۔" پیارے نے کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" اچانک پینو دُلاری نے ٹکڑا لگایا جو اس طرح کی گفتگو میں کم ہی شامل ہوتی تھی اور عظیم عشقیہ داستانوں کی ہیروئنیں عشق کی کسی بنیادی حقیقت پر خوب ہنسیں۔ جبکہ پیارے کی اُداسی غصے میں بدلنے لگی۔ اتنے میں شمشاد ایرانی کی گرج سنائی دی۔

"پیارے۔"

"آیا مالک" بونے نے بھی اُسی طرح ہی گرج کر کہا اور مرغے کی ٹانگ اُسی طرح ہی ہاتھ میں پکڑے اُس کی طرف چلا گیا۔ شمشاد نے پہلے تو اُسے مصنوعی خفگی سے ڈانٹا۔

"اُدھر کیا بہنوں کو جگتیں سنا رہا تھا؟"

"میں نے کیا جگتیں سنانی ہیں مالک۔ میں تو آپ بنی بنائی جگت ہوں۔ اللہ میاں کی جگت......"

شمشاد ہنسا "اچھا ہے...... اللہ میاں کی جگت......"

پیارا اُس کے قہقہے میں شامل نہ ہوا وہ کسی سوچ میں تھا۔

"مالک ایک بات بتاؤ۔ چاقو انگل برابر ہو یا بازو برابر۔ ہیں تو دونوں چاقو؟ وار تو دونوں کر سکتے ہیں......؟"

"پتہ نہیں کیا بکواس کر رہے ہو!" شمشاد نے الجھ کر کہا اور پیارے کے ہاتھ میں مرغے کی ٹانگ دیکھ کر کہنے لگا "اپنا قد بت دیکھ کر کھا۔ پچھلے سال بھی اِدھر ہی تم نے زیادتی کی تھی اور پھر ساری راہ ٹرک رکوار کوا کر کھیتوں کو بھاگتا رہا تھا۔"

پیارا ہنسا "یہ پینو دُلاری کی کھائی ہوئی ٹانگ ہے مالک۔ اُس کا جوٹھا کھانے سے تو ویسے ہی قبض ہو جائے۔"

اس پر شمشاد ہنسا اور پیارے کو پسندیدگی سے دیکھ کر اصل بات کی طرف آ گیا

"اچھا یہ دیکھ۔ یہ اشتہار نظر پڑا ہے۔ اِدھر اخبار پڑا تھا۔ نیلامی کا مال۔ میگا فون بھی ہے۔ یہی تو مانگتا تھا ناں۔ کل نیلامی ہے میں سوچتا ہوں رات ہمیں شہر ٹھہرنا تو ہے ہی۔ اگلے دن بولی میں اٹھا لیں گے۔ سستا مل جائے گا پلس نیلامی میں۔"

"دیکھ لو آقا...... پلس کی کوئی بھی چیز اچھی نہیں۔"

اور اگلے دن جب قافلہ پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا تو پیارے کی بات درست ثابت ہو گئی۔ ماسٹر یاسین جو لکی سٹار کا چیف مکینک۔ الیکٹریشن۔ ساؤنڈ انجینئر تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ دنیا میں کوئی مشین ابھی اس طرح خراب نہیں ہوئی کہ اُسے ماسٹر یاسین ٹھیک نہ کر سکے۔ لیکن خود ماسٹر یاسین ہر خراب مشین کو دیکھ کر پہلے یہی کہتا تھا۔

"یہ میرے بس سے بھی باہر ہے۔"

چنانچہ "جہاں ہے جیسے ہے" کی بنیاد پر بولی میں خریدا گیا ولسن اینڈ کنڈ کا سپلائی کردہ جاپانی میگا فون چیک کر کے اُس نے کہا "یہ میرے بس سے بھی باہر ہے۔"

لیکن پھر اُس نے نہ صرف اُسے چالو کر لیا بلکہ شاہ جیون جوگا کے میلے میں پہلے شو سے پہلے پیارا اپنے قد کا تیسرا حصہ برابر وہ میگا فون اٹھائے جب زور شور سے اعلان کر رہا تھا تو اُسے خود ذرا زور نہیں لگانا پڑ رہا تھا۔

"صاحبان قدردان۔ جو دنگا کرے گا حوالہ پلس ہو گا۔ تھانے کی سیٹیں اندر تک ہیں۔ نفری پہنچ چکی ہے۔ ٹکٹ سب کو ملیں گے۔ شو دیکھے بغیر کوئی نہیں جائے گا۔ جو نہ دیکھنا چاہے اُسے باندھ کر دکھایا جائے گا۔ انیلا اسی۔ پرویز کمار پُتوں...... دھکے نہ دیں مہربان۔ باری باری آئیں مہربان......" اور پھر فیروز گویا یک دم میگا فون اُس کے ہاتھ سے نکال کر منہ

کے سامنے لے آیا اور قصہ سسی پنوں میں اُس مقام سے گانا شروع کر دیا جہاں صحرا کی ریتلی آندھی موت بنی سسی کو نگلنے بڑھتی ہے۔ ہجوم میں اُس کی گونجتی آواز ایک برقی لہر کی طرح دوڑ گئی اور ٹکٹوں کی لائین لمبی ہونے لگی۔

لیکن ماسٹر یاسین کا مرمت کردہ میگافون بھی میلے کی آخری رات آخری شو میں جواب دے گیا ماسٹر یاسین نے بتایا "اب یہ بالکل...... میرے بس سے بھی بالکل باہر ہے۔ اندر ایک پورا نیا پرزہ ڈالنا ہوگا۔"

اسی شو میں "جبار جمع کرنے والے" نے میگافون کو جواب دیتے دیکھا تھا۔ وہ ان دنوں ڈاک کی ٹکٹیں جمع کرنا ترک کر کے ہر طرح کے شو، سینما، تھیٹر، سرکس، نمائش غرض ہر قسم کے تماشے کی ٹکٹیں جمع کر رہا تھا۔ وہ شہری، بندھے ٹکے تماشوں کے علاوہ میلوں ٹھیلوں میں لگنے والے کھیل تماشوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرتا۔ گیٹ کیپروں سے دوستی لگانے کی کوشش کرتا کہ وہ اُسے شو دیکھ کر باہر آنے والے تماشائیوں سے اُن کی استعمال شدہ ٹکٹیں مانگنے دیں۔ اپنے اس عجیب وغریب جنون کی تکمیل کے لیے اُسے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ کبھی تو وہ کامیاب رہتا لیکن اکثر تماشوں کے کرتا دھرتا اُسے پُلس یا انکم ٹیکس والوں کا مخبر سمجھ کر دور بھگانے کی کوشش کرتے۔ کبھی تو فالتو ردی ٹکٹیں اکٹھی کرنے کے چکر میں اس کی جان تک خطرے میں پڑ جاتی۔ ایک دفعہ ایک سرکس کا مالک ٹکٹ بوتھ کے پاس مسلسل منڈلاتے اُس نیم پاگل شخص سے اتنا عاجز آیا کہ اُسے پکڑوا کر شیروں کے پنجرے میں لے گیا۔ اگرچہ وہ خود ساتھ تھا اور رنگ ماسٹر کوڑے سمیت موجود تھا لیکن اُس کا خیال تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے درندوں کو سامنے دیکھ کر دہشت زدہ ہو کر بھاگ جائے گا۔ لیکن وہ نہ صرف اطمینان سے کھڑا رہا بلکہ جب رنگ ماسٹر کے مخصوص انداز میں کوڑا لہرانے پر شیر منہ کھول کر دھاڑنے لگے تو وہ ایک شیر کے قریب جا کر اُس کے دانتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جناب ان شیروں کے دانت جب گرتے ہیں انہیں پھینک دیتے ہیں آپ؟"

سرکس کا مالک حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"دانت......؟" صرف اتنا ہی اُس کے منہ سے نکلا۔

"جی...... مجھے خیال آیا ہے۔" جبار نے رازدارانہ لہجے میں اُس سے کہا "جانوروں

کے دانت بھی آج تک کسی نے جمع نہیں کیے ہوں گے۔ شیر کے دانت، چوہے کے دانت، ریچھ کے دانت، کتے کے دانت، بلی کے دانت، بھیڑیے کے دانت، بکری کے دانت، ہاتھی کے دانت...... گینز بک میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے ایسا۔"

"ہاتھی کے دانت......" سرکس مالک نے قہقہہ لگایا اور سمجھ گیا کہ واقعی وہ کوئی کریک ہے لیکن بے ضرر۔ اور پھر اُس نے نہ صرف اُسے اُس کے شوق کی تکمیل کی اجازت دے دی بلکہ اپنے ایک ملازم کو بھی کہا کہ وہ اس ڈھیلے سکرو والے کو جو کرتا ہے کرنے دے۔

کچھ ایسا ہی رویہ لکی سٹار تھیٹر کے بونے پیارا کا تھا۔ ہیر رانجھا کا شو ٹوٹا تھا۔ گیٹ جو ایک قنات کا ٹکڑا ہی تھا۔ ہٹایا گیا تو خواب زدہ تماشائی باہر نکلنے لگے ان میں بہت سوں کے دل ہیر رانجھا کے انجام پر دکھی تھے لیکن اُن میں ایسے بھی تھے جو پیارا کو دیکھ کر گھوڑی اور سواری کے حوالے سے گندے گندے فقرے کستے تھے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا اور ہمیشہ ہی پیارے کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایسے گندے لوگوں کے سر پھاڑ دے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا سب کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا جیسا ہمیشہ ہوتا آ رہا تھا۔ لیکن پھر اُس روز کچھ ایسا ہوا جو ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک شخص آیا اور پیارے نے اُسے باہر نکلتے تماشائیوں سے مخاطب ہوتے سُنا۔

"ایک منٹ بھائی جان...... یہ ٹکٹ مجھے دے دیں...... جی یہ جو آدھی آپ کے پاس ہے اور آدھی مالکوں کے پاس۔ آپ کے لیے ردی ہے اُن کے لیے رسید ہے۔ کھیل ختم پیسہ ہضم...... لیکن صاحبان...... شو دیکھنے والے کا پیسہ ہضم ہوتا ہو تو ہو...... لیکن ٹکٹ ختم نہیں ہوتا...... یہ ثبوت ہے کہ آپ نے یہ تماشہ دیکھا ہے...... پھینکیں نہیں۔ مان جاؤ یار...... آپ کے لیے ردی ہے...... میرے لیے انمول ہے...... دے دیں...... آپ بھی پلیز...... شکریہ۔ شکریہ...... لکی سٹار تھیٹر کا شو...... ہیر رانجھا۔ آج کی تاریخ...... نو سے بارہ کا شو...... یہ ردی کاغذ کا ٹکڑا نہیں...... دوستو آپ کی زندگی کے تین گھنٹے ہیں...... آپ کو نہیں چاہئیں...... نہ سہی...... مجھے دیں...... بھائی جان...... اس کی بتی نہ بنائیں...... مجھے دیں...... جی۔ جی...... جو بھی آپ کہیں...... ایسے ہی سہی۔ مجھے دیں...... شکریہ۔ شکریہ۔ اپنی زندگی کے تین گھنٹوں کا تماشا...... مجھے دیں...... آپ کے لیے ردی ہے...... میرے لیے قیمتی ہے...... شکریہ۔ شکریہ...... یہ ردی کاغذ کے ٹکڑے نہیں...... آپ کی زندگیوں کے "تماشا ٹکڑے" ہیں۔ کون

جھٹلا سکتا ہے۔ لالہ یہ دے دیں۔ بھائی جان۔ مولوی صاحب...... آپ کو ہیر کا واسطہ یہ دے دیں...... شکریہ۔ شکریہ......''

تھوڑی دیر بعد شمشاد ایرانی کے دو گرگے آئے اور بظاہر بڑے ادب سے جبار کو مالک کے ٹینٹ میں لے گئے۔ پیارا بے چین ہو گیا کہ خدا جانے وہ اُس انوکھے مجمع باز کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ چنانچہ جوں ہی آخری تماش بین بھی تھیٹر سے نکل گیا وہ اپنا میگافون اٹھائے سیدھا مالک کے ٹینٹ میں پہنچا جہاں اُس کے پہنچنے تک جبار شمشاد ایرانی کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ وہ ٹیکس والوں کا مخبر ہے اور مال کھانا چاہتا ہے اُسے اپنے حقیقی مقصد سے آگاہ کر رہا تھا۔

''میں عالی جاہ ایسی چیزیں اکٹھی کرتا ہوں جو دنیا میں آج تک کسی نے اکٹھی نہیں کی ہوں گی۔ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ جو کچھ میں جمع کر رہا ہوں وہ پہلے بھی کوئی کر چکا ہے تو میں پھر اُس چیز کو چھوڑ دیتا ہوں یا تھوڑا فرق ڈال دیتا ہوں اور کولیکشن اپنے کباڑ خانے کے لمبے چوڑے تہہ خانے میں پہنچا دیتا ہوں۔ ابھی ادھر میں...... کچھ عرصے سے عالی جاہ...... اپنے ملک کے ہر سرکس، سینما، تھیٹر، نمائش، موت کے کنوئیں، موت کے گولے، میجک شو، سفری چڑیا گھر کے ٹکٹ اکٹھے کر رہا ہوں......''

''اور پھر اُن کا کرو گے کیا؟'' شمشاد ایرانی نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا اور سوچا کیسے کیسے پاگل دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

جبار اپنے مخصوص رازدارانہ انداز میں آ گیا ''یہ ٹکٹ نہیں سرکار یہ تو اصل میں ''تماشا وقت'' کے ٹکڑے ہیں۔ جو میں...... جمع کر رہا ہوں۔'' پھر قہقہہ لگا کر بولا ''ویسے ارشاد بھائی کہتے ہیں ہم ایک دن اپنے جمع خانے پر اپنی کولیکشنز پر بھی ٹکٹ لگا دیں گے...... اپنی ٹکٹوں پر بھی ٹکٹ...... ارشاد کباڑیا کمال کا بندہ......۔ ہمارا خواب یہ ہے کہ ایک دن ہم نے گینز بک آف ریکارڈز میں آنا ہے۔''

شمشاد ایرانی بالکل اُکتا گیا تھا جیسے وہ اس نیم دیوانے کی باتیں سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اب کچھ دنوں سے...... بلکہ شاہ جیون جوگا کے میلے پر آنے کے تیسرے دن سے نہ کچھ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی آ گئی ہے۔ جو اُسے اپنے ساتھ اڑا کر

لے جاتی ہے۔ سال دو سال بعد۔ وہ پہچان گیا تھا۔ بس چند دنوں کی بات ہے آخری شو آ جائے گا۔ آخری رات۔ پھر جانا ہوگا۔ اُس نے گرگوں کو اشارہ کیا کہ وہ اُس بندے کو جانے دیں۔ مگر گرگوں کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب جبکہ مالک مطمئن ہو گیا ہے اور ثابت ہو گیا ہے کہ وہ کوئی خطرناک بندہ نہیں تو اُس کے ساتھ تھوڑا شغل کرنے میں کیا حرج ہے۔ اُن کے یہ انداز دیکھ کر ہی پیارا تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ شخص بھی کوئی اللہ میاں کی جگت قسم کی چیز ہے۔

''مالک...... اسے میں...... میں اس سے بات کر لیتا ہوں...... کوئی مسئلہ نہیں۔''

اُس نے شمشاد سے کہا جواباً اُس نے سر کو ایسے جنبش دی اور ہاتھ ہلایا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مسئلہ دراصل کچھ بھی نہیں ہے۔

اور جبار پیارے کے ساتھ اُس کے ٹینٹ میں چلا آیا۔ پیارے نے محسوس کیا کہ وہ اُسے ایسی حسرت سے دیکھ رہا ہے جیسے شاید ہی کبھی کسی نے اُس کی طرف دیکھا ہوگا۔ حالانکہ بونا ہونے کے ناتے وہ اپنے لیے دوسروں کی بس ایک ہی نظر دیکھنے کا عادی تھا۔ حیرت کی نظر مگر اس شخص کی نظر اُس حیرت سے بھی بڑھ کر تھی کچھ اور تھی۔

''بھائی جی ایک بات پوچھوں بُرا تو نہیں مانو گے؟'' فالتو کچرا ٹکٹیں جمع کرنے والے نے پوچھا۔

''پوچھو'' پیارے نے میگافون ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''اپنے جیسے بھائی کافی ہیں...... میرا مطلب ہے کافی مل جاتے ہیں......؟''

کچھ دیر تو پیارا سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''تمہارا مطلب ہے...... مجھ جیسے......''

''ج۔ جی...... ہاں جی...... بونے...... بُرا نہ منانا۔ بونے ہی بونے...... اکٹھے۔''

پھر پیارے کو کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''تم...... تمہارا...... مطلب ہے...... تم...... جمع...... یعنی......''

''ہاں۔ میرا خیال ہے بونے بھی آج تک کسی نے جمع نہیں کیے ہوں گے۔ اگر

ایک...... بڑی بلڈنگ......"

پیارے کے ذہن میں جو ہرگز بونا نہیں تھا اپنے جیسے ہزاروں بہن بھائیوں کی ایک بستی کا خیال آیا جس میں وہ خود اور اُس جیسے وہ سب زقندیں بھرتے پھرتے تھے۔ وہ ہنسا اور پھر ہنس ہنس کر اس کا برا حال ہو گیا۔

"یار تم بڑی شے ہو کوئی...... اچھا ادھر تین دن رہ گئے ہیں اس میلے کے...... رات کی روٹی تم ادھر میرے ساتھ کھاؤ گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" جبار نے کسی تشکر کے بغیر کہا۔

"باقی ادھر یہاں سب کھیل تماشے کے روی ٹکٹ تمہیں مل گئے ہیں؟"

"نہیں وہ قدرت کے عجوبے سفری عجائب چڑیا گھر والا پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔"

"کون۔"

"وہ جو دکھاتا ہے...... میرا خیال ہے آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتا۔ پانچ روپے کی ٹکٹ میں...... دو سروں والا کھوتا، چھ ٹانگوں والا بچھڑا، تین دُموں والے سانپ، سفید کوا، جل پری سر عورت کا دھڑ مچھلی کا...... بندہ جس کے دونوں بازو نہیں ہیں پاؤں سے روٹی کھاتا ہے پانی پیتا ہے، لڑکی ایک آنکھ نیلی ایک بھوری، کٹا ہوا سر تھال پر...... پٹرول پی کر آگ کا شو کرتی عورت۔"

"میڈم پونم۔ بس۔ بس۔ سمجھ گیا۔ ولدارا...... کئی بار مجھے کہہ چکا ہے۔ پیارے تیری...... اصل جگہ ادھر بنتی ہے...... اُس بہن چود کو کیا تکلیف ہے؟"

"پتہ نہیں...... مجھے دیکھتے ہی اس کا کوئی نہ کوئی بندہ مجھے مارنے آ جاتا ہے۔"

"اُس کی ماں کی...... تم تماش بینوں سے شو کے خرچ ہوئے ٹکٹ مانگتے ہو۔ اس کی...... تو نہیں مانگتے۔ تم فکر نہ کرو۔"

اگلے تین دن شاہ جیون جوگا کے میلے میں جبار نے پیارے کے ساتھ ہی گزارے۔ اُس نے پیارے اور بے بی کنار کا "البیلا ٹانگے والا" کا آئٹم کئی بار دیکھا اور اُسے

میلے سے حاصل کی ہوئی اپنی ٹکٹوں کی کولیکشن دکھائی۔ پیارا لکھنا پڑھنا جانتا تھا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جبار نے ہر تماشے کے ہر شو کی تاریخ، وقت اور تماشے کا مختصر بیان لکھا ہوا تھا اور بھی کئی طرح کے ضربوں تقسیموں کے حساب کتاب کیے ہوئے تھے۔

اور پھر آخری شو کی آخری رات جبار پلیٹ فارم کے اوپر ہی فیروز گویے اور پیارا بونے کے ساتھ ہی کھڑا تماشائیوں کو "سلطانہ ڈاکو" کی ٹکٹیں خریدتے دیکھ رہا تھا ــــ ٹکٹیں جو آخر میں اُس کے ہاتھ آنے والی تھیں۔ فیروز ایک بہت پرانا چنچل گانا "لارالپہ لارالپہ لائی رکھدا۔ اڈی ٹپہ اڈی ٹپہ لائی رکھدا" گا رہا تھا کہ اچانک اُس کی آواز بالکل بیٹھ گئی اُس نے پہلے تو تشویش سے اپنے گلے کو ہاتھ لگایا پھر حیرت سے میگا فون کو دیکھا اور اُسے واپس پیارے کو تھما دیا۔ پیارے نے میگا فون کو کافی تھپ تھپایا۔ ہلایا جلایا الٹا سیدھا کیا لیکن پھر یہ دیکھنے پر کہ اُس کی سب کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں اُس نے اُسے ماسٹر یاسین کے پاس بھجوا دیا۔

آخری شو ٹوٹا تو جبار نے اپنی ٹکٹیں جمع کیں۔ اُس کی نظریں پیارے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ پیارا آیا تو اُس کے ہاتھ میں میگا فون تھا اور آنکھوں میں آنسو۔

"ماسٹر یاسین نے کہا ہے یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کوئی پورا پرزہ بدلنا پڑے گا۔"

"تو کوئی بات نہیں یار۔ یہ کوئی ایسی رونے کی بات تو نہیں۔"

"وہ دوسری بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"وچھوڑا آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

پھر پیارا اُسے اپنے ٹینٹ میں لے گیا۔ اداسی سے کھانا کھاتے اُس نے جبار کو بتایا کہ کئی سال تھیٹر میں 'وچھوڑا' کیا ہوتا ہے۔

پیارے نے سب کو اطلاع دینی تھی وہ بے چین سی نظروں سے جبار کی طرف دیکھ

رہا تھا جو پاس پڑے میگا فون پر ایسے ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے اُسے تسلی دے رہا ہو۔

''کبھی مجھے بھی اس طرح کی مشین کی ضرورت پڑے گی۔''

''یہی لے جاؤ۔ ٹھیک کروالینا۔''

''یہی...... مگر تم......؟'' جبار نے حیرانی سے کہا۔

''ہمارا اب کچھ پتہ نہیں پیارے...... تمہیں بتایا ہے نا۔''

''مگر مالک تمہارا...... واپس کب تک آ جاتا ہے؟''

''جب چاہے...... ایک دو ماہ۔ تین ماہ...... بعد''

پیارے کی آواز بھرا گئی۔

''اچھا پیارے......'' جبار نے دزدیدہ نظروں سے میگا فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ ہاں...... لے جاؤ...... پکی...... اور ہاں سنو...... وہ بونے جمع کرنے والی بات...... میں خود کوئی تیس بونوں، بونیوں کو جانتا ہوں۔ آگے ان میں سے ہر کوئی پانچ دس کو جانتا ہی ہوگا...... لمبی لسٹ بنے گی...... لیکن سب کے سب تو جمع کرنے بڑے مشکل ہیں۔''

جبار کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''تصویریں چلیں گی۔ میں اپنا کیمرہ لاؤں گا۔ ہم نکلیں گے۔'' دُکھی دل کے باوجود پیارا ہنس پڑا۔

''بڑی شے ہو۔ ٹھیک ہے پیارے پھر ملیں گے۔ اور یہ اٹھا لو......'' اور پھر پیارے نے خود ہی میگا فون اٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اور اس طرح ولسن اینڈ کیڈ کا فراہم کردہ وہ جاپانی میگا فون جبار ''جمع کرنے والے'' کے ہاتھ لگا۔

....

(5)

سوانگ پروڈکشنز

''جبار جمع کرنے والا'' اور ارشاد کباڑیا ایک فلم گروپ کی نظروں میں آ جاتے ہیں

چیزیں۔ چیزیں۔ آہ۔ چیزیں...... انسان۔ انسان...... آہ انسان...... حسن کی صورت حال میں چیزوں کی سوانح سے انسانوں کی تاریخ کو راہ نکلتی ہے۔ مگر اس راہ میں رگری پڑی کئی نئی چیزیں ملتی ہیں۔ اور پھر اُن کی دنیا میں موجود کتنے ہی دوسرے۔ انوکھے غیر تاریخی انسانوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے اور واقعات کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔

دنیا کی عجیب ترین چیزیں جمع کرنے کے خبط میں مبتلا جبار نامی شخص حالیہ ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات پانے کی خوشی میں بانٹی گئی تاریخی مٹھائیاں جمع کرنے کے چکر میں ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ ہر ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کے موقع پر اسی مقصد کے لیے نکلتا ہے۔ اپنے اس بظاہر ناقابل یقین عمل کو آسان بنانے کے لیے اور مضحکہ اڑاتے مجمعے سے وضاحتی خطاب کرنے کے لیے وہ وقتاً فوقتاً میگا فون استعمال کرتا ہے۔ اُس کی یہ معاون مشین خراب ہو جاتی ہے اور پھر اُس کی خرابی کا سبب ڈھونڈنے کے لیے ہم اُس چیز کی تاریخ میں جاتے ہیں اور اس طرح اُس کے مالک کی اپنی تاریخ کا ایک اہم حصہ بھی اُس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ یہی نہیں ہمیں اسی تاریخ میں بکھری کئی اور چیزیں۔ مثلاً کٹی ہوئی انگوٹھی، بے شرمی کا ہیر وِیٹ اور لکی سٹار تھیٹر جیسی چیزوں کے اپنے اپنے الگ حیرت انگیز سوالات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور ہم اُن کے جوابی اثرات قبول کرنے والے انسانوں کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ حوالدار صفدر سلطان، مشینوں کا آخری ماہر ماسٹر یاسین، انیلا جو لکی سٹار تھیٹر کی سسی اور لیلیٰ ہے

انیلا جو اے ایس پی سعید کمال کی منکوحہ تجرباتی محبوبہ ہے، انیلا جو اٹلی میں مجسمہ سازی سیکھ
ہے اور زارگو کمپنی کے زونل منیجر کی منگیتر ہے، سعید کمال جو پروفیسر صفدر سلطان کا شاگرد
ہے، سعید کمال جو مولوی کمالے کا بیٹا سعید ہے، سعید کمال جو کئی سٹار تھیٹر کا رانجھا اور مرزا ہے۔
یہ سب لوگ ہم نامی کے علاوہ بھی کسی نہ کسی حیرانیے کے تحیر میں محبوس ہیں۔ لیکن ہم سب سے
پہلے حسن کے حیرانیوں سے فوری طور پر جنم لیتے تحیر کی طرف پلٹتے ہیں۔

''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات ملنے کے بعد کی پہلی صبح چوک خداداد میں جبار جمع کرنے والے کا انوکھا مظاہرہ دیکھ کر متحیر ہونے والوں میں حسن کے علاوہ ایک اور شخص سیفی بھی ہے۔ جو ایک فلم گروپ سوانگ پروڈکشنز میں شامل ہے۔ اس صبح سیفی نے بھی وہ سب کچھ دیکھا جو حسن نے دیکھا۔ بلکہ اُس سے بھی بہت بڑھ کر دیکھا۔ سوچا اور گھسیٹا اس لیے کہ وہ اُچھتے خوف کے 'حیرانیے' سے محض تخیل میں معاملہ کر لینے سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ براہِ راست مداخلت کر ڈالتا ہے۔ سیفی پیچھا کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ روک لیتا ہے۔ گھیر لیتا ہے۔ ساتھ لے جاتا ہے۔ ساتھ چلا جاتا ہے۔ سیفی...... جبار جمع کرنے والے کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔

چوک خداداد میں وہی ہجوم۔ ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات پانے کی خوشی میں مٹھائیاں بانٹنے ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرانے والا ہجوم جو کوئی بہت بڑا ہجوم بھی نہیں آہستہ آہستہ منتشر ہو رہا ہے۔ اپنے اپنے معمول کو جانے والے لوگ 'معمول کا ایک اور دن' کی فضا پھر سے بنا لیتے ہیں۔ خداداد چوک کے اس کونے کے معمول کے کردار۔ اخبار بیچنے والا لڑکا، دال سیویوں والا، انگوٹھیوں اور قیمتی پتھروں کا ڈبہ اُٹھائے پھرتا ایک شخص۔ سب ٹی سٹال والے سے گرم گرم چائے پی رہے ہیں۔ تاکہ حلق تک ٹھنسی شیرینی کا بوجھ کسی طرح نیچے اُتر جائے اور وہ ہر روز کے اپنے اپنے معمول کے دھندے شروع کر سکیں۔

لیکن جبار جمع کرنے والا ابھی تک غیر معمولی نظر آ رہا ہے۔ اس کی جمع کی ہوئی چیزیں بے ڈھنگی ہیں اور اُس سے سمیٹے نہیں سمٹتیں۔ مٹھائیوں کے کچھ ڈبے، کچھ خالی کچھ بھرے ہوئے، شاپر بیگ جن میں مزید مٹھائی ہے، جبار کا اپنا تھیلا اور میگا فون، جبار کے تھیلے میں کچھ اور چیزیں لیکن جنہیں ہم سامنے لانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ مبادا اُن میں سے کوئی چیز

ہمیں اپنے پیچھے لگا لے۔ یوں بھی ہر چیز اور ہر شخص کے سامنے آنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور یہ وقت اس شخص کے سامنے آنے کا ہے، جس کا نام سیفی ہے۔

یوں سیفی کا سوانگ پروڈکشنز فلم گروپ بھی ایک حیران کن مقصد کے حصول کے لیے سرگرم ہے۔ ان کا ڈائریکٹر سعید کمال، سکرپٹ رائیٹر انیلا بلال اور خود سیفی جو یوں تو ایک فری لانس فلم آرٹ کلچر رپورٹر ہے لیکن گروپ میں اس کی حیثیت ایک طرح کے معاون کی ہے۔ یہ تینوں اب پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسی فلم بنا سکتے ہیں جو عالمی سطح پر اپنی پہچان کروا سکے۔ گروپ کو قائم ہوئے ابھی چند ہفتوں سے زیادہ وقت نہیں گزرا اور یہ لوگ کسی بھی فلم کی بنیاد یعنی کہانی، سکرپٹ، آئیڈیا، تھیم کچھ بھی کہہ لیں کی تلاش میں ہیں۔

''سب کچھ یہیں اسی دنیا میں ہی ہے۔ انیلا، سیفی بس ہمیں آنکھیں، کان کھلے رکھنے ہیں۔ پٹے ہوئے موضوعات سے تخیلاتی جمع خرچ کرنے کو بھول جاؤ۔ 'سماجی حقیقت نگاری' بائی فٹ۔ میں نے پروفیسر جولیس ملینسکی اور لیونا کاپلان سے وعدہ کیا تھا کہ میری پہلی فلم ریلیٹ ہو گی۔ کچھ بھی لاؤ۔ انوکھا۔ جو سیدھا دل پر ضرب لگائے۔ کوئی کردار۔ کوئی سچویشن۔ کوئی تھیم۔ کوئی conflict یا......'' سعید کمال جذباتی انداز میں اُن سے کہتا ہے۔

اور پھر ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کا واقعہ ایک رات ایک بار پھر پیش آ جاتا ہے۔ اور سیفی بے چین ہو کر اگلی صبح سڑکوں پر نکلتا ہے۔ یہ ایک انوکھی صورت حال نہ سہی لیکن پھر بھی گہرے امکانات سے بھرپور ہے۔ اور پھر چوک خداداد میں اُسے وہ شخص نظر آتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ اس کے دل ہی نہیں دماغ پر بھی گہری ضرب لگانے کے لیے کافی ہے۔ سیفی اخبارات رسائل کے پرانے سٹال والے سے فون کرنے کی اجازت مانگتا ہے۔ اُسے کال کے پیشگی پیسے دیتا ہے اور سعید کمال کو فون کرتا ہے۔ دوسری طرف اُسے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

''آہ...... ثریا جانو۔ ساری۔ ہم آج رات نہیں مل سکتے......'' ''سیفی بول رہا ہوں......'' ''اوہو...... اوہو۔ ساری۔ سیفی...... خیریت۔'' ''ہاں سعید...... میں ادھر چوک خداداد میں ہوں...... تمہیں اتنا تو پتہ ہے ناں رات تختہ اُلٹ گیا۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ تو یہاں لوگ لڈو بانٹ رہے ہیں۔ اور یہاں میں نے ایک آدمی دیکھا ہے۔ جو مجھے یقین ہے کہ سیدھا

تمہاری کسی سرئیلسٹ فلم سے نکلا ہے۔ میں اس کے پیچھے یا ہو سکا تو اُس کے ساتھ جا رہا ہوں۔'' (سعید کی پرجوش آواز سنائی دیتی ہے) ''ہاں۔ ہاں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ پلیز...... تم لوگ مری آنکھیں اور کان بنو......'' ''بن گئے۔'' سیفی بُرا سا منہ بنا کر کہتا ہے اور ریسیور واپس رکھ دیتا ہے۔ ''چُوتیا'' وہ بڑبڑاتا ہے اور تیزی سے دوسرے ہاتھ میں تھامی ایک چھٹی پرانی کاپی پر تیزی سے لکھنے لگتا ہے۔ ...... اس شخص کو behave کرنا سکھانا پڑے گا۔ سعید کمال کو۔ انیلا سے ڈسکس ہوگا۔ یہ اس کا کمانڈر ان چیف کا انداز اُسے واپس اپنے اندر لینا ہوگا۔ ہو جائے گا ٹھیک آہستہ آہستہ۔ فلم کی کہانی اور سکرین پلے لکھنے کے ساتھ ساتھ ڈائریکٹر صاحب کی طبیعت کا ڈرامہ بھی ساتھ ساتھ چلے گا۔ اور ادھر سیٹھ صفدر سلطان پر ڈورے ڈالنے کا مشکل کام انیلا کو اپنے بل بوتے پر کرنا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا...... یہ مزیدار ہے۔

سیفی کاپی پر لکھنا جسے وہ گھسیٹنا کہتا ہے بند کرتا ہے۔ اور تھوڑی سی افراتفری کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ شخص اب اپنا بے ہنگم جمع جتھا کافی حد تک سمیٹ چکا ہے اور کسی طرف نکل جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ سیفی تیزی سے اُس کی طرف بڑھتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کی خوشی میں بانٹی گئی مٹھائی جمع کرنے والے عجیب و غریب کردار ''جبار جمع کرنے والا'' کی کہانیاں آگے چل کر سوانگ پروڈکشنز کے سکرپٹ رائٹر، ڈائریکٹر، کیمرہ مین اور فائنانسر کے لیے کیا اہمیت اختیار کر جائیں گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے لیے لازم ہے کہ ہم اس فلم گروپ کے بنیادی ارکان کا بنیادی تعارف کرا دیں۔ یہ بنیادی تعارف کرداروں کے داخلی اور خارجی تعصبات اور تضادات کا مختصر بیان ہوگا مگر اس کی روشنی میں ہمارے لیے اس گروپ کی زندگی میں جنم لینے والے مختلف نوعیت کے فلمی اور غیر فلمی واقعات کو سمجھنا شاید قدرے آسان ہو جائے گا۔

سعید کمال

ایشیائی نسلوں کا گورا رنگ قد پانچ فٹ دس انچ جسے موٹی ایڑیوں کے جوتے پہن کر مزید بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ چہرہ گولائی مائل جسے لبوترا کرنے کے چکر میں اکثر جبڑے ڈھیلے چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ بوجوہ ذہن میں بیٹھا ہوا ہے کہ انٹیلکچولز کے

چہرے لبوترے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار فرنچ کٹ داڑھی بھی رکھ لیتا ہے۔ لیکن پھر اچانک کسی سچ 'یکا' مصیبت ہے کے جذبے سے مغلوب ہو کر صاف کر دیتا ہے۔ گھسی ہوئی جینز ٹی شرٹ اور سردیوں میں بے شمار جیبوں والی جیکٹیں پہننا پسند کرتا ہے۔ آنکھیں معمولی ہیں لیکن انہیں سوچ میں ڈبوئے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فوری تاثر ایک خوبرو مرد کا ہے۔ اس لیے خواتین میں عبوری قبولیت کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ گفتگو کے دوران بعض اوقات گہری نظروں سے اُن کی آنکھوں میں دیکھتا ہے اور پھر اچانک حیرانی کا تاثر پیدا کر کے نظریں ہٹا لیتا ہے۔ اس سے خواتین بے چین سی ہو جاتی ہیں اور انتظار کرتی ہیں کہ دیکھو اگلی ملاقات میں وہ کیا کہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ غیر ضروری تفصیلات ہم چھوڑتے ہیں اور اہم امور کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

سابقہ ''عظیم نجات دہندہ'' کا دور جب شروع ہوا تو سعید کمال ایک بتیس سالہ ٹیلی ویژن پروڈیوسر تھا۔ ایک مشہور کروڑ پتی مارکسی اشتراکی خانوادے سے تعلق رکھنے کے ناتے 'انقلابیت' ورثے میں ملی لیکن پرولتاریہ کے غم میں ہلکان ہونے کی بجائے ڈرامہ اور خاص طور پر فلم کے میدان میں کوئی انقلابی کارنامہ سرانجام دے کر امر ہو جانا چاہتا ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے کچھ ریڈیکل نوعیت کی بدنامیوں کو غیر محسوس طور پر خود ہوا دینا پسند کرتا ہے۔ بیشتر مقامی ٹی وی ڈراموں تمام مقامی فلموں اور ہمسایہ ملک کی اکثر فلموں پر وحشیانہ تنقید کر کے انہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینکنے کا مشورہ دیتا رہتا ہے۔ بات بات پر ہالی وڈ کے چند ڈائریکٹرز لیکن خاص طور پر مشرقی یورپ اور چیکوسلواکیہ کے سرئیلسٹ سینما کی عظمت کے گُن گاتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ مقامی سطح پر سعید کمال فلم آرٹ، موسیقی پر سنجیدہ مباحث سامنے لانے والے صرف ایک شخص حکمت بہزاد سے انتہائی متاثر ہے۔ اُسے ذاتی طور پر جانتا ہے اور عقیدت کے اظہار کے لیے اُسے ہمیشہ سر کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ وہ حکمت بہزاد کی فلم اور تھیٹر کے حوالے سے سامنے آئی تنقیدی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے بھی کوشاں رہتا ہے۔ اپنے ٹی وی کارپوریشن کے ایام کے دوران وہ حکمت بہزاد کی نیشنل فلم انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے لیے کی گئی کوششوں کی بھرپور حمایت کرتا رہا اور اس طرح دونوں میں ایک نظریاتی اور پیشہ وارانہ ہم آہنگی بھی پیدا ہوئی۔ لیکن پھر یہ معاملہ سعید کمال کے ٹی وی کارپوریشن سے

اخراج کی وجہ سے ادھورا ہی رہا۔

خواتین کے حوالے سے ایک 'قاتلِ مستورات' (Lady Killer) ہونے اور اُن کے لیے مسلسل ''انکاری پیغامات'' بذریعہ فون...... دینے کی شہرت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دبی دبی شہرت جو صرف چند مخصوص خواتین کے اندرونی حلقے تک محدود ہے، یہ بھی ہے کہ سعید کمال خواتین سے انتہائی قربت کے لمحات تک جانے سے ذرا پہلے واپس لوٹ آتا ہے۔ اس افواہ کو بنیاد بنا کر سعید کمال کے ایک بدترین دشمن کولیگ صفدر سلطان جس نے Freud made easy نامی کتاب کا مطالعہ کر رکھا تھا، سعید کمال کے ایام ملازمت کے دوران ٹی وی اسٹیشن پر دائیں بائیں اس خیال کا اظہار متواتر کیا کہ سعید کمال جو اپنی زندگی سے بڑی تصویر (Larger than life image) بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، تو اصل میں اس کی وجہ کسی اور چیز کا چھوٹا پن ہے۔ لیکن ہم اس بحث میں بالکل نہیں پڑیں گے۔ کیونکہ بحیثیت ایک ٹی وی ڈرامہ پروڈیوسر اُس کی اعلیٰ صلاحیتوں میں کسی شک وشبے کی گنجائش بہرحال نہیں۔ اور یہی بات اُسے ایک ڈرامہ رائیٹر کم ایکٹرس انیلا بلال اور ایک فلمی نقاد اور رپورٹر سیفی کے بہت قریب لے آئی ہے۔ سعید کمال اِن دونوں کی صلاحیتوں کا دل سے معترف ہے لیکن منہ سے نہیں اور انہیں اپنے کسی بڑے فلمی منصوبے کا حصہ بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ مجموعی طور پر کافی ناپسندیدہ لیکن باصلاحیت شخصیت ہے۔ جب سابقہ ''عظیم نجات دہندہ'' کا دور شروع ہوا جو اپنی مخصوص سمجھ بوجھ کے مطابق ریڈیکل رجحانات سے بدکتا تھا تو اداروں کو بھی ایسے عناصر سے پاک کرنے کا اہم قومی کام شروع ہوا اور اربابِ بست وکشاد نے سعید کمال کو بھی ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا۔

ریڈیکل شناخت رکھنے کے باوجود چونکہ تعلق انتہائی دولت مند گھرانے سے تھا، اس لیے بیروزگاری نے معاشی طور پر قطعاً متاثر نہ کیا بلکہ فراغت کے اس دور میں اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی چیکوسلواکیہ کے اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس کے فلم اور ٹی۔وی سکول سے بھرپور وابستگی کا موقع مل گیا اور وہاں خاص طور پر عظیم مشرقی یورپی فلم ڈائریکٹروں کے کام اور اسلوب کا براہ راست مطالعہ کرتا رہا۔ اس تربیت کے دوران سینما کی تاریخ کے پروفیسر جولیس ملیفسکی سے بے حد متاثر ہوا۔ اور اپنی ایک ہم جماعت لیونا کاپلان سے بھی

گہری علمی فنی اور جذباتی وابستگی حاصل ہوئی جو بہرحال 'انتہائی قربت کے لمحات' تک نہ پہنچ سکی۔ اس چیک دور میں 'حقیقی معنوں میں اعلیٰ فلم...... ''اصل بڑی فلم...... ''فلم...... سرئیلسٹ فلم زرجیا'...... جو عالمی سطح پر کوئی ایوارڈ حاصل کر سکے......'' بنانے کی دیرینہ خواہش کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور کورس ختم ہونے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے فلمی مرکز ہالی وڈ جانے کا ارادہ ترک کر کے فی الفور وطن واپسی کا فیصلہ کیا اور انیلا اور سیفی کو اپنی آمد کی اطلاع ان الفاظ میں دی۔

''میں آ رہا ہوں سیفی اور انیلا کہ جہاں میری جڑیں ہیں۔ جس جگہ...... جہاں کے لوگوں کو ابھی تک کسی نے ایسے دیکھا ہی نہیں جیسے ایک creative ڈائریکٹر دیکھتا ہے۔ جہاں میرے مزدور کا پسینہ بہتا ہے اور انیلا قربانیاں دے رہی ہے۔ مجھے ایک چونکانے والا، شاک کرنے والا Fucking subject ڈھونڈ کر دو۔''

جواباً سیفی نے صرف اتنا لکھا۔

''بس اب آ جاؤ۔ دفتر کے لیے جگہ ڈھونڈ لی ہے۔ دُرانی بلڈنگ میں۔ یہ عمارت شہر کے سب سے بڑے مرکزی قبرستان کے قریب ہے اور عقب میں چاہ پریاں والا کا مزار ہے۔ جہاں کہتے ہیں اب تک رات کو پریاں آتی ہیں۔ لیکن فکر نہ کرو۔ پریاں ہمارے کام میں مداخلت نہیں کریں گی۔''

سعید کمال کا خیال تھا کہ وطن واپسی پر اُسے ائیر پورٹ پر ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اور دو روزہ روپوشی کے دوران بھی کہیں اس کی تلاش میں چھاپے وغیرہ مارنے کی کوئی اطلاع نہ ملی تو دُرانی بلڈنگ میں حاصل کیے گئے دفتر میں سیفی انیلا بلال اور کیمرہ مین ماسٹر یاسین کی مدد سے سوانگ پروڈکشنز کے نام سے ایک فلم گروپ قائم کیا۔ ڈائریکٹر کی ذمہ داری خود سنبھالی اور پھر یک دم منہ سے 'ہا' کی ایک بلند آواز نکالتے ہوئے انیلا بلال کو مخاطب کیا۔

''کہانی کہاں ہے انیلا...... تم لوگ تو میری آنکھیں اور کان ہو...... میرا اسکرپٹ۔ میرا اسکرین پلے...... یہ سب کہاں ہیں انیلا...... سیفی۔''

انیلا بلال

خواتین کے قد کی اوسط سے قدرے دراز، گندمی رنگت، انیلا بلال باقاعدہ خوبصورتی اور محض قبول صورتی کے درمیان جھولتی ہے۔ بیک وقت ایک سکرپٹ رائٹر اور ایکٹرس ہونے کے ناتے اُسے اپنی یہ کیفیت بہت بھاتی ہے۔ خاص طور پر جب کسی ڈرامے کی ریکارڈنگ کے وقت باقاعدہ پیشہ ور اداکارائیں اُسے ایک حیرت بھرے تنفر سے دیکھتی ہیں تو وہ نہال ہو جاتی ہے۔ ویسے وہ اپنے باب کٹ بالوں، مذاق اڑاتی آنکھوں، حساس ہونٹوں اور کتابی چہرے کے ساتھ رُلی کھلی رہنا پسند کرتی ہے۔ لباس کے معاملے میں بظاہر انتہائی لاپروائی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ لیکن تاڑنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بہت ہی سوچی سمجھی بدلباسی ہے۔ ایسے ہی بعض 'عورت فہم' تعلیم یافتہ پروڈیوسر اُسے ایک سیکسی انٹلیکچول کی مہلک کیٹگری میں رکھتے ہیں۔ جو اپنے بے باکانہ انداز کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کو دہلاتی ہے۔ ایسے مردوں میں ایک سعید کمال بھی ہے۔

محکمہ ماہی گیری کے ڈپٹی ڈائریکٹر بلال احمد کی بیٹی انیلا بلال جب چار بہنوں کو بیاہنے اور بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوششوں میں 'بیٹا' بن کر باپ کا ساتھ دے چکی تو اُس نے باپ سے کہا کہ اب وہ اُسے 'بیٹا' ہی بنا رہنے دیں۔ ڈپٹی ڈائریکٹر بلال احمد دہل گیا کیونکہ ریڈیو سٹیشن پر اسسٹنٹ پروگرام پروڈیوسر کی نوکری ملنے کے بعد (پہلے وہ پرائیویٹ ٹیوشن پڑھاتی تھی) انیلا سگریٹ پینے لگی تھی اُس نے ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھنے حتیٰ کہ ڈراموں میں اداکاری بھی شروع کر دی تھی۔ بیٹی کے مستقبل کے بارے میں ایسے ہی ایک پدرانہ تشویش سے بھرپور سوال جواب کے موقع پر انیلا کے جوابات سُن کر بلال احمد چپ کا چپ رہ گیا لیکن اُس نے انیلا سے اتنا ضرور پوچھا کہ کل ہیڈ مرالہ کے دورے سے واپسی پر زبردستی جو دس بیس کلو رہو مچھلی اُس کی کار کی ڈگی میں رکھوا دی گئی تھی اس کا کیا کرنا ہے۔ انیلا نے اس سوال کا کیا جواب دیا، ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن اُسی دور میں کسی اور شخص بلکہ شخصیت کی طرف سے انیلا بلال سے کیے گئے ایک اور سوال اور انیلا کے جواب کو نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں۔ انیلا سعید کمال کے لیے پانچ ڈرامے لکھ چکی تھی اور اُس کے تین ڈراموں

میں مرکزی کردار کے لیے اداکاری بھی کر چکی تھی کہ انہی دنوں ایک دوسرے بہت بڑے ڈرامہ پروڈیوسر نے جس کا نام ہی ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ ایک زبردست ڈرامہ سیریل کے لیے کاسٹنگ کا اعلان کیا۔ انیلا کو ایک نہایت اہم رول کی پیشکش کی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اُس بہت بڑے ڈرامہ پروڈیوسر کی ایک اور پیشکش بھی شامل تھی جو دراصل ایک مختصر سا سوال تھا کیا انیلا اُس کے ساتھ سونا پسند کرے گی؟ اس سوال کا جواب بہرحال انیلا نے اتنا مختصر نہ دیا...... "اگر سونا ہی ہوا تو میں سعید کمال کے ساتھ سونا پسند کروں گی اور وہ بھی ظاہر ہے ٹیلی ویژن پر کام حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ سونا ہر مرد و زن کا بنیادی انسانی حق ہے"۔ انیلا کے اس جواب کا ٹی وی برادری میں بہت چرچا ہوا اور جگہ جگہ یہ فقرہ دہرایا جاتا رہا۔ خیال کیا جاتا ہے اور خود ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ سعید کمال کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دیئے جانے اور ملازمت سے برطرفی میں اس کے ریڈیکل نظریات کے علاوہ انیلا کے اس جواب کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ اُدھر انیلا کا بھی ٹی وی اسٹیشنوں پر داخلہ بین کر دیا گیا۔

سعید کمال کی چیکوسلواکیہ یاترا کے دوران بھی دونوں میں رابطہ برقرار رہا۔ اُن کے خطوط کا بنیادی موضوع اکثر و بیشتر ایک ہی ہوتا...... "ایک ایسی فلم بنانا جو عالمی سطح پر اپنا نام پیدا کر سکے"۔ اس کے علاوہ وہ پیراگ سے انیلا کے لیے دو فقرے ہمیشہ بھیجتا۔ "تم لوگ میری آنکھیں اور کان بنو۔" اس فقرے کے ساتھ یہ ہدایت شامل ہوتی۔ "تم ایسے لوگ ڈھونڈو۔ سیفی اور تم...... جو میری واپسی پر پروڈکشن ٹیم میں شامل ہو سکیں۔" دوسرا فقرہ یہ ہوتا تھا۔ "انیلا تم بہت قربانیاں دے رہی ہو۔" اس سے غالباً سعید کمال کی مراد یہ تھی کہ انیلا اُس کے انتظار میں ہنوز "سونے" کی کسی جائز ناجائز سرگرمی کا شکار نہیں ہوئی۔ مرد و زن کے مخصوص معاشرتی تعلق کے پس منظر میں انیلا اپنی جنسی کشش کو سلیقے سے غیر جنسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتی بشرطیکہ مقصد واقعی اعلیٰ پائے کا ہو۔ اپنے اسی طرز فکر کی بنا پر سعید کمال اور سیفی کے لیے اُسے ادھیڑ عمر جنس زدہ سرمایہ کار صفدر سلطان کو رجھائے رکھنے کے بقول سعید کمال "بنیادی طور پر گندے کام" کے لیے آمادہ کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

انیلا بلال کا ہم قد لیکن پھر بھی کوتاہ قامتی کا تاثر نہیں دیتا۔ رنگت صاف۔ چہرہ گول اور قدرے لمبوترا۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ لیکن پُرسکون۔ جن سے دیکھنے والوں پر قدرے جھنجھلاہٹ طاری ہوتی ہے۔ لگتا ہے اس شخص کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ پھر وہ فوراً ہی بھول جاتے ہیں۔ اپنے جسمانی غلبے کی حد تک کسی کے لیے بھی کوئی دشواری پیدا نہیں کرتا۔ اُن افراد میں سے ہے جو متصادم ہجوم میں سے بھی پھسل کر نکل جاتے ہیں۔ کان البتہ غیر معمولی طور پر بڑے ہیں۔ جنہیں گھنے بالوں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ بال ترشواتے وقت نائی کو خصوصی ہدایت دیتا ہے کہ وہ اطراف کے بال نہ چھیڑے۔ باقی جو چاہے کرلے۔ اس عمل کے بعد چند دن کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔

اصل نام سیف اللہ لیکن سیفی کے نام سے جانا اور پکارا جانا پسند کرتا ہے۔ اور یوں اُس کی اس خواہش کی تکمیل پر کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں۔ یوں تو سیفی کے کچھ نہ کچھ کرنے کا دائرہ کافی وسیع ہے لیکن ایک فری لانسر کے طور پر فلمی دنیا بلکہ وسیع تر معنوں میں شوبز کی دنیا کی خبر لانا اُس کی خصوصی مہارت سمجھی جاتی ہے۔ خبر کے علاوہ ہالی وڈ کی اور اُس کی نقالی میں بنے دوسرے کئی وُڈز سے آنے والی تخلیقات پر اُس کے تجزیے وتبصرے اخبارات (خصوصاً انگریزی اخبارات) میں نمایاں جگہ پاتے ہیں اور سنجیدہ فلم بین طبقے کی فلمی آرا کو ہر جائز ناجائز طریقے سے متاثر کرتے ہیں۔ سعید کمال کے ایک لانگ پلے پر بھرپور تبصرہ لکھنے کے بعد دونوں میں ایک طرح کی دوستی ہوگئی۔ خاص طور پر جب دونوں نے باہم مشترک یہ بات دریافت کی کہ ''اصل فلم بن سکتی ہے''۔

فلم، آرٹ، تھیٹر، موسیقی وغیرہ سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود بلکہ شاید اسی تعلق کی وجہ سے وہ ان فنی سرگرمیوں کے بارے میں بعض اوقات عجیب وغریب بظاہر جارحانہ باتیں کرتا ہے۔ مثلاً اُس کا یہ کہنا ہے کہ ''یہ سب کام اصل میں ہم شریفوں کے کام نہیں، کنجروں کے کام ہیں۔ جس طرح کنجروں سے براہ راست مزے لینے کی ہم نے گنجائش رکھی ہوئی ہے اسی طرح اُن کے اس کام سے بھی ہم مزے لیتے ہیں''۔ ایک ثقافتی محفل میں جہاں انیلا بھی

موجود تھی سیفی اپنے کچھ اسی قسم کے ''خیالاتِ عالیہ'' کا اظہار کر رہا تھا کہ دونوں میں جھڑپ ہو گئی۔ جو بعد میں ایک متحارب دوستی میں بدل گئی۔ سعید کمال اور فلم پروڈکشن گروپ دونوں میں مشترک تھا۔

''ویسے تو ہم اُس کی آنکھیں اور کان ہیں بلکہ خاص طور پر کان بنے پھرتے ہیں۔ اور میں تو بہت ہی بڑا کان...... لیکن یہ بنا نہیں سکے گا ''اصل فلم۔ اعلیٰ فلم'' یہ سعید کمال تمہارا''۔

''کیوں؟'' انیلا نے بیک وقت ہنسی اور غصے سے پوچھا۔

''ایک تو اس لیے کہ اُس کا تعلق گھٹیا گروپ سے ہے......''

''یہ کیا بکواس ہے گھٹیا گروپ......'' انیلا نے شدت سے اُس کی بات کاٹی۔

''یہ وہ لوگ ہیں جو اس معاشرے میں آرٹ کلچر، لوک موسیقی وغیرہ کے مامے بنے پھرتے ہیں حالانکہ اصل مقصد صرف اور صرف پیسہ ہے......''

''سعید کمال کا مقصد تو خیر پیسہ نہیں۔'' انیلا نے کہا۔

''ہاں۔ یہ تو ہے لیکن اس کا مقصد ایک عظیم...... خالی جگہ بنتا ہے۔ لیکن چھوڑو...... یہ تو ہوتا ہی ہے...... کسی بھی بڑے کام کی کوئی انتہائی گھٹیا وجہ بھی ہو سکتی ہے...... یہ کوئی بُری کوئی عجیب بات نہیں...... لیکن ہم بات کر رہے تھے کہ یہ سب کام، آرٹ، فلم، موسیقی، حرام کام ہیں۔ اور اب میں دوسری وجہ بتا رہا ہوں۔''

''حرام کیسے؟'' انیلا نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔

''حرام ایسے کہ...... موسیقی، تصویر اور وہ بھی چلتی پھرتی...... توبہ توبہ...... نامحرم عورتوں، مردوں کا بغل گیر ہونا...... اس طرح...... اصل میں سب دل سے اسے حرام سمجھتے ہیں۔ ہے نا......''

''لیکن بن تو رہی ہیں سب...... فلمیں بھی...... اور سب کچھ......'' انیلا نے بے چینی سے کہا۔

''وہ تو ہے۔ حرام کام ہو رہے ہیں...... اور پھر...... حرام باتیں ہو رہی ہیں۔ بڑی بڑی حرام بات کہہ جاتے ہیں لوگ'' سیفی نے شرارت سے انیلا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' انیلا نے سمجھتے ہوئے بھی کہ اُس کا اشارہ کس بات کی طرف

سے پوچھا۔

"جیسے وہ تمہاری بات جو تم نے اپنے عظیم ڈرامہ پروڈیوسر صاحب سے کی۔ جو آج بھی ٹی وی اسٹیشنوں پر جگہ جگہ Quote ہوتی ہے"۔

"وہی تمہاری بات...... "لوگ مزے لیتے ہیں۔ میرا مقصد کچھ اور تھا"۔ انیلا نے ہنس کر کہا۔

"دنیا میں چوری چھپے مزے لینے والی یہ سب سے بڑی قوم ہے۔ دل میں اللہ کا خوف۔ اللہ اللہ۔ لیکن آنکھوں میں نیچے کہیں ٹانگوں کے درمیان سے اٹھتی ہوئی ہوس اور کھوپڑی میں یہ سب کچھ ساتھ ساتھ لے کر چلتے رہنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب۔ صدیوں سے ان کی کھوپڑی بس یہی کام کر رہی ہے...... ترکیبیں ڈھونڈ رہی ہے لیکن مزا بھی ضرور لینا ہے۔ گناہ سے بھی بچنا ہے...... اصل میں ان کے پاس اس مسئلے کے جو روایتی حل تھے وہی صحیح تھے لیکن یہ ظالم جدید دنیا لے ڈوبی۔ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ پتہ نہیں کیا بکواس کر رہا ہوں؟ آئی۔ ایم۔ ساری...... لیکن تمہاری وہ بات شوبز کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ اور اس قابل ہے کہ تمہارے ہاتھ چوم لیے جائیں اگر چہ ہاتھ چومنا بے تکی حرکت ہے، بات تو منہ سے نکلتی ہے......"

اس مکالمے کے دوران جب انیلا اور سیفی خوب ہنس رہے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ سعید کمال اس وقت کیا کر رہا تھا لیکن ہم جانتے ہیں۔ سعید کمال اس وقت پراگ کے سکول آف پرفارمنگ آرٹس کے پروجیکشن ہال نمبر 2 کی سیٹ نمبر M-17 میں بیٹھا سینماٹوگرافی کی ایک کلاس فیلو کے ہمراہ شہرہ آفاق چیک فلم ڈائریکٹر Elan Klaas کی فلم The Shop on Main Street (Obchod na korze) (بڑی سڑک پر دکان) دیکھ رہا تھا۔ اس فلم نے فارن فلم کیٹیگری میں اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ پروجیکشن کے دوران فلم روک روک کر پروفیسر پروڈکشن، ڈائریکشن، ایڈیٹنگ کے نازک نکتے سمجھا رہا تھا۔ فلم کی زبان چیک ہونے کی وجہ سے سعید کمال کی سمجھ سے باہر تھی لیکن اُسے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ اُسے علم تھا کہ اُس کے ہمراہ M-18 میں بیٹھی اس کی دوست کلاس فیلو Leona Kaplan نوٹس لے رہی ہے اور چونکہ وہ انگریزی بہت اچھی جانتی ہے وہ اسے سب کچھ سمجھا دے گی۔ کیونکہ ابھی اُسے Elmar Klos, Jiri Menzel اور Sasa Gedeon کے کام پر بھی

نچوڑ لینے تھے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وطن واپس جا کر اپنی "حقیقی معنوں میں اعلیٰ فلم" بنانے کے لیے اُسے واقعات کو گرفت میں لانے کی Jan Kadar کی اپروچ اختیار کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ لیونا کے ہم بستری کے کافی غیر مبہم اشاروں کو وہ کیسے کامیابی سے ٹالے گا کہ وہ بُرا نہ مانے۔ اور وہ سوچتا تھا کہ آج شام کیفے میں کافی پینے کے بعد وہ لیونا سے اپنی گفتگو کو پروفیسر جولیس ملیسنکی کے سینما کی تاریخ اور خاص طور پر سرئیلسٹ سینما کے متوقع لیکچر میں ہی اُلجھائے رکھے گا اور خاص طور پر لوئی بیونل کی پہلی سرئیلسٹ فلم سگِ اُندلس (Un Chein Andalou) اور پولش فلم ڈائریکٹر ہاس واؤچیک کی فلم ریت گھڑی کا سینی ٹوریم پر بات کرے گا۔ سعید کمال یہ بھی سوچتا تھا کہ اُسے آج ہی انیلا کے خط کا جواب دینا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انیلا بڑی قربانی دے رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے وہ یہ کیسے جان سکتا تھا کہ سیفی کے 'ہاتھ چومنے' والے فقرے کے بعد ان دونوں میں ایک دوسرے کو زیادہ قریب سے جاننے کا گہرا احساس پیدا ہو چکا تھا۔

سیفی ہر معاملے کے مضحک پہلوؤں کے بارے میں ایک خاص حساسیت رکھتا ہے اور بعض اوقات 'مضحکہ خیز' سے شدید ذہنی لگاؤ کی وجہ سے دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ اپنی اس کمزوری سے آگاہ بھی ہے لیکن عام طور پر یہ بات سامنے لانے میں کامیاب رہتا ہے کہ اس کے اس ردعمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی سنجیدہ بات ضرور چھپی ہوتی ہے۔ انیلا اُس کی شخصیت کے اس پہلو کو خاص طور پر پسند کرتی ہے اور دونوں کی اکثر گفتگو اس مسخرکہ طرزِ احساس سے جنم لیتی ہے۔ انیلا نے ایک روز اُس سے پوچھا کہ کیا اُس نے سعید کمال کے آنے سے پہلے فلم کے لیے کوئی سبجیکٹ ڈھونڈا ہے۔ تو جواباً سیفی نے کہا۔

"سبجیکٹ تو قدم قدم پر بکھرے ہیں اور کئی سبجیکٹ تو ہر وقت میری جیب میں رکھے رہتے ہیں۔"

یہ ڈینگ سُن کر انیلا نے کہا۔ "تم جیب والے جیب میں ہی رہنے دو۔ کسی جیب کترے کے کام آئیں گے۔ ہمارے لیے کوئی اور ڈھونڈو...... ہماری آنکھیں اور کان ہو......" اس پر دونوں ہنس پڑے اور اُن کی ہنسی عجیب معنی خیز تھی۔

فری لانس فلم، آرٹ، کلچر، رپورٹر، تجزیہ نگار سیف اللہ عرف سیفی کی بعض عادات

البتہ انتہائی عجیب وغریب ہیں۔ مثلاً اُس کا بے ساختہ تحریری ابال جس کا شکار ہو کر وہ کبھی کبھی کہیں بھی حتیٰ کہ دوسروں سے گفتگو کے دوران بھی اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے بھی یک دم اپنی سفید کاغذوں کی تہوی مُڑی کاپی کھینچ کر اُس پر بغیر نیچے دیکھے اپنا قلم دوڑانے لگتا ہے اور دیکھنے والوں کو حیران اور بعض اوقات کافی پریشان کر دیتا ہے۔ سیفی اپنے اس مخصوص تحریری عمل کو گھسیٹا کاری کا نام دیتا ہے اور اس کے کہنے کے مطابق اُس نے اسے ایک اداکارہ کے انٹرویو کے دوران دریافت کیا تھا۔ کہانی کے مطابق انٹرویو چل رہا تھا۔ سیفی کے سوالات اور حسین وجمیل اداکارہ کے جوابات دونوں ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ ہو رہے تھے، اچانک سیفی نے محسوس کیا کہ اُس روزمرہ کے معمولی پیشہ ورانہ کام کے دوران خود اُس کا اپنا ذہن بار بار غیر معمولی طور پر متحرک ہو جاتا ہے لیکن ذہن میں بلند ہونے والی اُن مداخلتی آوازوں اور چیخ و پکار کا بعد میں کوئی ریکارڈ باقی نہیں رہتا۔ حالانکہ عین موقع پر پیدا ہونے والی اُس کی اپنی سوچوں کا براہ راست تعلق انٹرویوئی شخصیت کی آوازوں یعنی باتوں سے ہی ہوتا ہے اور اس میٹریل کو بعد میں کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے، امکانات لامحدود ہیں۔ اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ سیفی نے تیزی سے اپنی نوٹ بک پر جو کچھ بھی ذہن میں آ رہا تھا ویسا کا ویسا اتارنا شروع کر دیا اور اداکارہ کو ایک طرح سے مکمل طور پر مشین کے سپرد کر دیا۔ سیفی کا کہنا ہے کہ چند ہی لمحوں بعد اُسے اداکارہ کی غصیلی آواز سنائی دی۔ ''آپ میری بات سُن رہے ہیں، انٹرویو لے رہے ہیں یا اپنا ہی کچھ لکھتے جا رہے ہیں؟'' سیفی کو جھٹکا سا لگا۔ اوہو۔ وہ شخصیت سے آنکھوں کا رابطہ منقطع نہیں کر سکتا۔ ''سوری میڈم آپ فرمائیں، وہ کچھ نوٹس ساتھ ساتھ لینے ہوتے ہیں۔'' سیفی نے کہا اور اداکارہ سے اگلا سوال کیا اور گھسیٹا کاری کی تکنیک کو اُسی لمحے زیادہ فعال اور قابل عمل بنا لیا۔ اب اُس نے اداکارہ کی حسین آنکھوں میں تاک جھانک جاری رکھی۔ مناسب موقعوں پر چہرے کے تاثرات بھی مہیا کیے لیکن ہمراہ اپنی ذہنی واردات کو مکمل طور پر اپنے دائیں ہاتھ کے سپرد کر دیا اور یوں سب کچھ گھسیٹ لینے کے اپنے ارادے میں کامیاب رہا۔ بعد میں گھسیٹا کاری کا دائرہ کار انٹرویوز سے کہیں آگے تک وسیع ہو گیا اور سیفی کی یہ بقول اُس کے 'غیر مداخلتی مداخلتی' حرکت موقع پر موجود ہر طرح کے افراد کو متاثر کرنے لگی۔ دوستوں کی محفل میں، سنجیدہ مجالس میں، میٹنگز میں، سفر کے دوران، ہوٹل میں کھانا کھاتے،

کہیں بھی کبھی بھی۔ اور چونکہ لکھتے وقت نہ وہ قلم کی طرف دیکھتا ہے نہ کاغذ کی طرف اس لیے اس کا دعویٰ ہے کہ گھسیٹا کاری کی تخلیق کو دنیا میں اُس کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا پھر شدید ترین بدخطی کے علاوہ گھسیٹا کاری سیفی کی بالکل ذاتی شارٹ ہینڈ بن گئی۔ ورنہ روزمرہ کی بھاگ دوڑ کے دوران ذہن جسے وہ عرش کہتا ہے فرش یعنی کاغذ پر اُتارنا ممکن ہی نہ ہو پاتا۔

ماسٹر یاسین:

سیفی کے توسط سے گروپ میں شامل ہوا تھا۔ عمر تقریباً پچاس سال۔ کافی حد تک گنجا، سردیوں گرمیوں ایک پی کیپ پہنتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں کیبل پُلر کے طور پر انڈسٹری میں داخل ہوا۔ بوم آپریٹر۔ کیمرہ لوڈر۔ سیکنڈ کیمرہ اسسٹنٹ۔ گرپ اسسٹنٹ۔ فائیٹ ماسٹر سے ہوتا ہوا بالآخر کیمرہ آپریٹر تک جا پہنچا۔ ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انڈسٹری کے کیڑے ہیں۔ اپنی کچھ عادات کی وجہ سے کہیں ٹکتا نہیں۔ اگرچہ اپنے کام میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتا ہے۔ اپنی ذاتی رائے کو باقی ہر چیز پر فوقیت دیتا ہے۔ فلمی صنعت کی بتدریج بدحالی کی وجہ سے خود بھی بدحالی کا شکار ہو رہا ہے۔ سوانگ پروڈکشنز کی پہلی لو بجٹ فلم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کرنے والے بزنس مین صفدر سلطان کو گھیر کر لانے میں مرکزی کردار ادا کرنے کی وجہ سے گروپ میں کافی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ بنیادی طور پر صاف گو اور قدرے منہ پھٹ ہے۔ لیکن بدنیت نہیں۔

صفدر سلطان:

پینتالیس سالہ بزنس مین درمیانہ قد اور فربہ جسم۔ بیضوی چہرہ۔ موٹا ناک جس کے کھلے نتھنوں سے کچھ بال اکثر باہر نکلے نظر آتے ہیں۔ گول گول شکی سخت گیر آنکھیں جن کے اثر کو زائل کرنے کے لیے چہرے پر ایک نرماہٹ لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوتی۔ اپنی فرم کے دفتر میں شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہنتا ہے۔ لیکن سوانگ پروڈکشنز کی میٹنگز میں آتے وقت موسم کی مناسبت سے پتلون اور بڑی بڑی کھلی شوخ رنگوں کی ٹی شرٹیں پہننا پسند کرتا ہے یا گول گلے کی رنگ دار جرسیاں پہنتا ہے۔ کوریا سے مشینری امپورٹ کرنے کا کاروبار ہے۔ روایتی ازدواجی زندگی کی شدید جنسی اکتاہٹ کا شکار ہے۔

ماسٹر یاسین اُس کی اس کمزوری سے اچھی طرح آگاہ ہے اور گروپ کے مجموعی مفاد کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

صفدر سلطان کی اس بے راہ روی پر اس کے مخلص کاروباری دوست میاں ارشاد کو بہت تشویش ہے۔ لیکن وہ اس کے احتجاجی فقروں "سنبھل جا صفدر۔ باز آ جا۔ یہ منڈو والے لکھوں لکھ کر دیتے ہیں" کے جواب میں ہمیشہ ہنستا اور ایک ہی بات کرتا ہے "دیکھ ارشاد بندے بندے میں فرق ہوتا ہے۔ میں اُن میں سے نہیں ہوں جن کی آنکھیں فلمی دنیا کی چکاچوند سے اندھی ہو جاتی ہیں۔ میں بڑے حساب سے اُن لوگوں میں جاتا ہوں۔ کچھ لے کر ہی آؤں گا دے کر نہیں۔" "رہنے دے کچھ دے گا نہیں تو تجھے قریب کون لگنے دے گا۔" ارشاد کہتا۔ "وہ تو پھر ہے۔ لیکن مجھے پتہ ہے کہاں رُک جانا ہے۔" "رہنے دے کس کو ہوش رہتی ہے۔ کہاں رُکنا ہے۔ کب رُکنا ہے۔" وہ قہقہے لگاتے اور فحش مذاق سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر میاں ارشاد ہمیشہ کی طرح اپنے مرحوم دادا کے دوست جبار کی دردناک داستان کی طرف صرف اشارہ کرتا، کیونکہ صفدر سلطان یہ داستان اُس سے پہلے بھی کئی بار سُن چکا ہے کہ کس طرح اُس نے پچاس سال پہلے فلمی لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا اور اداکاراؤں وڈیرا، مہ پارہ اور چاندنی، جو اصل میں معمولی ڈانسر تھیں کے چکر میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ جبار کا چمڑا رنگنے کا وسیع کاروبار تھا۔ لیکن فلمی دنیا والے اُس کی چمڑی بیچ کر کھا گئے اور ایک دن اُس نے بمبئی ٹاکیز کے سامنے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اس کئی بار سُنے عبرتناک واقعے کو پھر سُننے کے بعد صفدر سلطان بس یہی کہتا "بندے بندے میں فرق ہوتا ہے ارشاد" لیکن پھر اُس کی آواز میں تھوڑی سی لرزش ضرور آ جاتی جسے ارشاد بھانپ لیتا اور سوچتا، بس اتنا ہی کافی ہے۔ یوں میاں ارشاد کو پکا یقین ہے کہ اُس کی طرح صفدر سلطان بھی پکا کاروباری ہے اور پیسہ نکالتے وقت دس بار سوچتا ہے۔ کیا ہو گا کچھ فلمی رنڈی بازی کر کرا کے واپس آ جائے گا۔ بس کسی رنڈی سے شادی کرنے کے چکر میں نہ پڑ جائے۔ جیسا جبار کے ساتھ ہوا تھا اور ارشاد کو اپنے دوست کی پھر فکر لاحق ہو جاتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ صفدر سلطان اپنی موجودہ ازدواجی زندگی سے بالکل مطمئن نہیں اور یہ کہ پینتالیس سے پچاس کی عمر خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ اس عمر میں مرد اپنے سے کم عمر عورت کے لیے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ ان سوچوں کے بعد

میاں ارشاد کہتا "اللہ خیر کرے۔" اور پھر دونوں کوریا سے پلاسٹک مولڈنگ کی مشینری امپورٹ کرنے کے مسائل پر بات شروع کر دیتے۔

بابا خُوشیا:

ستر سالہ طویل قامت بابا خُوشیا اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی سرمہ زدہ آنکھوں لیے سفید بالوں اور ہلکی سی خمیدہ کمر کے ساتھ دیکھنے والوں کی نظر ایک لمحے کے لیے روکتا ضرور ہے۔ گلے میں موتیوں کی مالا پہنتا ہے اور گیروے رنگ کے کُرتے کے ساتھ کالی شلوار پہننا پسند کرتا ہے۔

انیس سال کی عمر میں تھیٹر کی ایک ڈانسر بے بی کنار کے عشق میں گرفتار ہو کر تقریباً نیم پاگل ہو گیا اور کئی برس تک مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر فلمی دنیا میں داخل ہوا چھوٹے موٹے سائیں، ملنگ، پیر، سنیاسی وغیرہ کے رول کرتا رہا اور کبھی واپس نہ جا سکا۔ بابے خُوشیے کی یک طرفہ عشق کی اس لازوال داستان کو بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن ہم بہرحال جانتے ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہوا "حسن کی صورتحال" کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں گے۔ بابا خُوشیا ماسٹر یاسین کے ہمراہ آیا اور سوانگ فلم پروڈکشنز گروپ کے لوگ اُسے اتنے پیارے لگے کہ اُن کی خدمت کرنے اور رات آفس میں ہی پڑے رہنے کی اجازت مانگی۔ اجازت دے دی گئی۔

سیفی اپنی موٹر سائیکل ایک محفوظ سائیکل سٹینڈ پر پارک کرتا ہے اور پھر وہ دونوں ایک رکشے میں بیٹھتے ہیں مٹھائی کے ڈبے اور شاپر بیگ جبار کی گود سے پھسل کر سیفی پر آتے ہیں۔ سیفی ایک ڈبہ سنبھال لیتا ہے۔ دونوں میں بات میگافون کی خرابی پر چل نکلتی ہے اور جبار سیفی کو کسی تھیٹر کے بونے اور اپنے ٹکٹیں جمع کرنے کے شوق کے بارے میں عجیب سی باتیں بتاتا ہے۔ پھر سیفی تیزی سے اپنی کاپی ڈبے کے اوپر رکھ کر گھسیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ جبار مشکوک نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ سیفی معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتا ہے۔

"رپورٹنگ میں بعض اوقات موقع پر ہی بات لکھ لی جائے تو بہتر ہوتا ہے بعد میں بھول جاتی ہے۔ اس لیے۔"

جبار معنی خیز انداز میں مسکراتا ہے۔ ''ہوں۔ ریکارڈ بن سکتا ہے۔ رکشے میں بیٹھ کر
دنیا کی سب سے لمبی اخباری رپورٹ لکھنے کا ریکارڈ۔ گینز بک میں ابھی ہے نہیں ایسا کوئی
ریکارڈ۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے۔ لیکن سیفی کوئی جواب نہیں دیتا اور یہی بات گھسیٹ لیتی
ہے اور جبار پھر اپنے میگافون پر توجہ دینے لگتا ہے۔

......وہ گینز بک کا حوالہ حیرت انگیز انداز میں دیتا ہے۔ کیا یہ بھی ویسی ہی بے سروپا
بات ہے جیسی اُس نے کسی بونے کی بات کی۔ پیارا بونا۔ ریکارڈ۔ کیسا ریکارڈ۔ کیا یہ شخص پاگل
ہے اور اگر پاگل ہے تو کس قسم کا۔ قسم کوئی بھی رہی ہو۔ لیکن ایسا عجیب وغریب کردار اور اُس
کی یہ حرکت۔ مٹھائی کا ایک ڈبہ میری گود میں ہے جس میں سے گلاب جامنوں کی خوشبو آ رہی
ہے۔ خیر۔ تو اس میں سے بہت کچھ نکلتا نظر آتا ہے۔ وہ فلم جو سعید کمال جو میں اور انیلا بھی بنانا
چاہتے ہیں وہ ایسے ہی کسی حیرت انگیز کردار کی زندگی پر مبنی ہونی چاہیے۔ لیکن ابھی تو وہ مجھے
کہیں لے جا رہا ہے۔ پتہ نہیں ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے میگافون سے
پنگا لے رہا ہے جو اس کے پیارے بونے نے اُسے دیا۔ آہاہا۔ ابھی اُس کا میگافون اچانک
کام کرنے لگ گیا اور ایک فلک شگاف آواز رکشے کی مختصر سی جگہ پر بلند ہوئی۔ رکشے والا بری
طرح دہشت زدہ ہو گیا اور اُس کا رکشہ ایک گدھا گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ یہ واقعہ بھی
آگے کہیں سکرین پلے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ سکرین پلے...... کیا اس کی نوبت آئے گی۔
انیلا۔ ہاں وہ لکھے گی۔ میری گھسیٹا کاری تو اُسے ایک خام مواد فراہم کر سکتی ہے۔ مگر سعید کمال
کا ردعمل کیا ہوگا۔ عجیب وغریب مساوات بن رہی ہے یا شاید ورکنگ کنڈیشنز۔ کیا کہنا
چاہیے۔ کسی ایک مقصد کے لیے مل کر کام کرنے والے گروپ کے افراد کے آپس کے تعلقات
اُن کے کام پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں؟ سعید کمال، انیلا، سیفی، صفدر سلطان میں دیکھ رہا ہوں
کہ اجتماعی مقصد کے حصول کے لیے صفدر سلطان کو پھنسائے رکھنے کا ''گندا کام'' کتنی آسانی
سے سعید کمال اور میں نے انیلا کو سونپ دیا ہے۔ حد ہے۔ مگر کیا وہ انیلا کے لیے بھی ''گندا کام''
ہے؟ مجھے لگتا ہے وہ اِس سے لطف اندوز بھی ہوتی ہے اور اُس نے بھی سب کچھ اختیار کیا ہوا
ہے۔ وہ ان معاملات کو بہت مختلف طریقے سے لیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اِس فلم فلم
کھیل میں کیوں شامل ہوتا جا رہا ہوں؟ انیلا بلال رائٹر، سعید کمال ڈائریکٹر اور وہ چوتیا

صفدر سلطان سیٹھ پروڈیوسر، میں بیچ میں کیا ہوں؟ مجھے جلد از جلد اس فراڈ سے نکل جانا
چاہیے۔ لیکن اندر سے دل یہ بھی نہیں مانتا کہ یہ فراڈ ہے۔ تو پھر کیا ہے؟ انیلا سیٹھ سے پیسے
اینٹھنے میں مدد کرے گی۔ کیا واہیات خیال ہے۔ لیکن انیلا کا خیال تو رکھنا ہوگا۔ کیا مطلب؟
مجھے کیا۔ لیکن ایسا پیسہ، فلم تو پیسے سے بنتی ہے۔ اگرچہ پیسہ سعید کمال کے دولت مند کمیونسٹ
گھرانے کے پاس بھی بہت ہے۔ بہرحال اب یہ 'عظیم نجات دہندہ سے نجات' کا معاملہ۔ یہ
تو ظاہر ہے کہ یہ آئیڈیا اگر کسی فلم کے لیے ڈویلپ کیا جائے تو کوئی سیدھی سیدھی کہانی نہیں بن
سکتی۔ تو پھر...... اب یہ رکشہ تو شہر سے کافی باہر آ گیا ہے۔ ''گلزار نرسری'' وہ رکشے والے سے
کہہ رہا ہے۔ اب یہی ہوگا کہ اُس نے بونے تھیٹر اور ٹکٹ جمع کرنے کی جو بات کی ہے اس
سے اس کی کیا مراد ہے۔ یہ سب آگے چل کر اُس سے پوچھنا ہوگا۔ بہرحال جہاں بھی یہ مجھے
لے جائے گا جو کچھ بھی پیش آئے گا اور میرے ساتھ ہوگا اُسے بنیاد بنا کر یہ سبجیکٹ جو بنتا ہے
اسے کل سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں سب کے سامنے پیش کر دوں گا اور بس۔ کیا انیلا سے
پہلے ڈسکس کر لیا جائے۔ نہیں، اُس کے لیے بھی surprise ہی چلنے دیتے ہیں۔ ابھی تو یہ
ایک طرح سے Brain Storming کا سیشن ہوگا۔ (نوٹ بہت ضروری) ویسے اگر میں ان
لوگوں میں شامل رہتا ہوں تو سعید کمال کو اُس کی جسامت کے مطابق تراشنا پڑے گا......

- Cut to size

....

(6)

انگمار برگ مین اور بلی وائیلڈر سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں

عام دفاتر کے برعکس کمرے کے پچھلے نصف حصے میں کسی مستطیل میز کی بجائے ایک گول میز پڑی نظر آتی ہے۔ میز کے گرد رکھی آٹھ کرسیوں میں پانچ افراد بیٹھے ہیں تین کرسیاں خالی ہیں۔ اگر ہم سعید کمال کی دائیں جانب سے گننا شروع کریں تو اُن کی ترتیب یوں ہوگی۔ انیلا بلال۔ سیفی۔ خالی۔ ماسٹر یاسین۔ خالی۔ صفدر سلطان۔ خالی۔ دائرہ چونکہ کسی بھی نقطہ آغاز کی فضیلت کو دھندلا دیتا ہے۔ اس لیے سعید کمال ہر دفعہ پوری کوشش کرتا ہے کہ بارہ فٹ چوڑی عقبی دیوار کے وسطی نقطے کو ایک انتظامی مرکز قرار دے کر سامنے رکھی کرسی کو استعمال کرے اور آہستہ آہستہ گروپ ممبران اُس کا اس سربراہی جگہ پر حق تسلیم کر لیں۔ اس عقبی دیوار پر دنیا کے عظیم فلم ڈائریکٹروں کی تصویریں آویزاں ہیں (یعنی جو میسر ہو سکی ہیں) عظیم ڈائریکٹروں کے زیر سایہ بیٹھنا بھی سعید کمال اپنا حق سمجھتا ہے اس لیے گول میز کی وہ مخصوص کرسی ڈائریکٹر کی کرسی بن جانی چاہیے لیکن افسوس ایسا ہو نہیں پاتا اکثر کوئی نہ کوئی اس کی جگہ بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے آنے والے کو انگمار برگ مین، ڈی۔ ڈبلیو گرفتھ، بلی وائیلڈر کی تصویروں کے سامنے بیٹھا ماسٹر یاسین بھی فرانسس کپولا لگتا ہے۔ سعید کمال کے لیے یہ صورتحال مسلسل جھنجھلاہٹ کا باعث بنتی رہتی ہے لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر پاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے پر اُس کی خوب بھد اڑے گی۔ خاص طور پر سیفی جو فلم گروپ میں حفظ مراتب کے قائم ہونے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بلکہ ایک موقع پر وہ کہہ بھی چکا ہے کہ ''گول میز کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ یہ انسانوں میں رہنما بن کر اٹھ کھڑے

ہونے بلکہ بیٹھ جانے والوں کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔''

لیکن آج صورتحال سعید کمال کے لیے کم از کم نشست کے حوالے سے پرسکون ہے۔ وہ مسلسل اس احساس میں ہے کہ انگمار برگ مین اور بلی وائیلڈر اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اور یہ احساس موقع کی مناسبت سے اُس کے لیے بہت مفید بھی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سیفی آج جو سبجیکٹ لایا ہے، اس سے کسی فلمی تخلیق کا امکان پیدا کرنے کے لیے اُسے دنیا کے عظیم ترین فلم ڈائریکٹروں کے تجربے سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ''جبار جمع کرنے والا'' کی کہانی سیفی نے ابھی اُسی لمحے تک سنائی ہے جہاں ہم نے اسے کیمرہ لیے جبار کی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ابھی تک انہوں نے سُنا ہے سعید کمال کو بے حد Excite کر چکا ہے۔

سعید کمال: (بے اختیار ہو کر گول میز پر ہاتھ مارتا ہے۔ دھاڑ کی آواز آتی ہے۔ صفدر سلطان دہل جاتا ہے)...... ''یہ سبجیکٹ...... مائی گاڈ یہ سبجیکٹ۔ عظیم نجات...... سیفی۔ سیفی...... ابھی کیا فقرہ تم نے بولا تھا؟''

سیفی: ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کی خوشی میں بانٹی گئی مٹھائی کا ذائقہ ہی کچھ اور ہے''۔

سعید کمال: ''That's it سیفی یہ فقرہ اُس نے کہا تھا مٹھائیاں اکٹھی کرنے والے نے......؟''

سیفی: ''کافی حد تک''۔

انیلا: (معنی خیز شرارت بھرے انداز میں سیفی کی طرف دیکھتے ہوئے) ''کیا مطلب ہے تمہارا...... ''کافی حد تک''...... یا تو...... اُس نے کہا ہوگا یا نہیں۔''

ماسٹر یاسین: (بات کاٹتے ہوئے) ''کل ویسے پبلک نے خوشیاں واقعی حد سے بڑھ کر منائیں۔ مٹھائی بانٹی۔ دیگیں پکائیں لوگوں نے...... لعنتی دفع ہوا۔''

انیلا: (جلے بھنے لہجے میں) ''رہنے دیں ماسٹر یاسین۔ بہت آئے ایسے خوشی کے موقعے۔ ابھی ذرا سال ڈیڑھ گزرنے دیں۔ لوگ دعائیں مانگیں گے یہ لعنتی بھی دفع ہو......''

ماسٹر یاسین: ''جی۔ جی۔ بالکل...... اس کو کسی کی موت آئے...... اور ہم مٹھیائی بانٹیں۔ پھر یہ کہیں گے۔''

سعید کمال: ''ہا۔ یہ ویسے ادھر ہی...... ہمارے ہاں ہی ہے...... پبلک خوشی کے...... Event پر مٹھائی بانٹنا...... باہر لوگ شیمپین پیتے ہیں۔''

سیفی: ''مہذب اور غیر مہذب معاشروں میں شیمپین اور گلاب جامن کا فرق ہے''۔

انیلا: (ہنس پڑتی ہے) ''واقعی سیفی...... تم میرے ساتھ سکرپٹ پر آ جاؤ''۔

سیفی: ''آ...... میں ایک طرح سے تمہارے ساتھ...... بلکہ سب کے ساتھ...... سکرپٹ پر ہی ہوں۔ تمہارے لیے سبجیکٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ Hard Hitting سبجیکٹ کی تلاش میں شہر کی خاک چھانتا پھرتا ہوں کوچہ کوچہ گلی گلی...... لیکن تم لوگ ابھی مجھے آگے بات کرنے دو گے یا نہیں۔ ابھی تو...... جو آگے آ رہا ہے...... وہ تو دیکھو''۔

(سعید کمال جو بہت مضطرب ہے پھر بھڑک کر ماسٹر یاسین سے مخاطب ہوتا ہے)

سعید کمال: ''Hold It ایک منٹ سیفی پلیز...... ماسٹر۔ ماسٹر مجھے یہ سب شاٹ چاہئیں۔ کیمرہ...... میں ایک گلاب جامن پر چارج کرتا ہوں۔ بگ کلوز۔ رائیٹ۔ OK میں Pull Out کرتا ہوں...... گلاب جامن ایک غیر ملکی گورے رپورٹر کے ہاتھ میں ہے...... دوسرے ہاتھ میں کیمرہ ہے...... وہ...... ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کے Event کو Cover کرنے آیا ہے۔ You know, street reaction میں گورے کے چہرے پر جاتا ہوں...... Stay کرتا ہوں...... Dissolve نہیں Super Impose۔ ماسٹر Images ماسٹر مجھے Images چاہئیں...... قدیم یونان...... قتل کیا ہے...... Yes ظالم۔ انہوں نے بدمعاش رومن بادشاہ کلاڈیس قتل کیا ہے...... نیا بادشاہ آ گیا ہے...... روم آزاد ہو گیا ہے...... گلیاں...... Mob خوشیاں منا رہا ہے...... شراب پی جا رہی ہے...... لوگ ایک دوسرے پر شراب انڈیل رہے ہیں......''

سیفی: (شور مچانے کے انداز میں) ''Fade out fade in O.K. Dissolve لوگ ایک دوسرے پر گلاب جامن پھینک رہے ہیں۔ گلاب جامن کا شیرہ ایک دوسرے پر انڈیل رہے ہیں۔ اُن کے کپڑے چپچپا رہے ہیں۔ مکھیاں بھن بھنا رہی

ہیں۔ ایک مولوی کی داڑھی شیرے سے تر ہو جاتی ہے۔ ملٹری کا ایک نوجوان اُس کی داڑھی چوس رہا ہے''۔

انیلا، ماسٹر یاسین اور صفدر سلطان جو ابھی تک خاموش تھے سب ہنسنے لگتے ہیں۔ سعید کمال کے مخصوص جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ حیرت سے سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: ''But that's wonderful یہ بات...... سیفی Excellent یہ امیج...... بالکل...... یہ ٹیم ورک ہے...... یہ مجھے چاہیے۔ ماسٹر یہ مجھے چاہیے بالکل یہ......''

ماسٹر یاسین: ''Boss یہ تو کوئی مشکل نہیں۔ کچھ سٹاک شاٹ چاہئیں۔ کچھ شوٹ کر لیں گے۔ لیکن ایڈیٹنگ میں بنے گا''۔

سعید کمال: ''Exactly ایڈیٹنگ میں بنے گا...... ایڈیٹر...... ابھی تک ہم نے ایڈیٹر کو شامل نہیں کیا ٹیم میں...... صفدر سلطان صاحب......''

صفدر سلطان: (چوری چوری انیلا کی طرف دیکھتا ہے) ''میڈم نے کبھی مجھے حکم نہیں کیا......''

انیلا: ''کم آن...... کمال...... ایڈیٹنگ کی باری تو کہیں آخر میں آتی ہے...... ابھی تو کچھ شروع ہی نہیں ہوا''۔

سعید کمال: ''یہ شروع ہوا ہے...... یہ...... یہ سبجیکٹ...... جو سیفی لایا ہے۔ ''عظیم نجات دہندہ سے نجات......'' چارلی چپلن کی فلم دیکھی ہے تم نے سیفی...... The Great Dictator''

صفدر سلطان: ''میرا خیال ہے سیفی صاحب کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی......''

سیفی: ''میری نہیں...... جبار جمع کرنے والے کی...... اور ارشاد کباڑیے کی......''

سعید کمال: ''ارشاد کباڑیا...... یہ تم کوئی نیا کیریکٹر Introduce کر رہے ہو''۔

(انیلا دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ خاموش رہنے کا حکمیہ اشارہ کرتے ہوئے)

انیلا: ''بس۔ اب...... پلیز...... سیفی...... آگے چلو پلیز''۔

(سب خاموش ہو کر متوقع نظروں سے سیفی کی طرف دیکھتے ہیں)

سیفی: ''تو میں اُس شخص کے قریب چلا گیا۔ مٹھائیاں بانٹنے والے جا چکے تھے۔ میں نے

اپنا مخصوص...... اپنا تعارف کرایا۔ پریس رپورٹر۔ کیمرہ ہاتھ میں تھا اُسے کوئی فکر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن پھر بھی وہ مشکوک انداز میں ہنسا اور کہنے لگا" وہ بھی ایسے ہی تعارف کراتے ہیں پہلے" "وہ کون جناب؟" میں نے پوچھا۔" وہی جو بندے غائب کرتے ہیں......"

انیلا: "اوہو۔ آئی سی......"

صفدر سلطان: (اک دم گھبرا اٹھتا ہے) "آ...... آوو...... آم...... دیکھیں۔ میں پلیز...... میں ایسی خطرناک باتیں۔ سر میں۔ لو بجٹ سہی...... لیکن بجٹ تو ہے...... پیسہ تو لگے گا۔ میں نہیں چاہتا۔ پہلے پریس شو پر ہی چھاپا پڑ گیا تو...... ڈبے اُٹھا کر لے گئے؟"

سعید کمال: "صفدر سلطان صاحب۔ ہم جانتے ہیں ہم نے کیا بات کرنی ہے کیا نہیں کرنی۔ ممنوعہ ٹیکنکس پر...... ہم نے...... جنہیں ہم نے نہیں چھیڑنا۔ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ اتنا عرصہ ٹی وی میں پالیسی کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔ آخر۔ لیکن یہاں فلم...... اب بالکل ویسا بھی نہیں...... بات کرنی ہے ہمیں لیکن...... لیکن ایسے طریقے سے کہ پتہ ہی نہ چلے اور بات کر بھی جائیں۔ صفدر صاحب آپ فکر نہ کریں...... یہ میری ذمہ داری ہے۔"

انیلا: (جلے بھنے لہجے میں) "یہی ہو رہا ہے یہاں...... ایسے بات کرو کہ پتہ ہی نہ چلے اور خاک بھی پتہ نہیں چلتا۔"

(سعید کمال صفدر سلطان سے نظر بچا کر انیلا اور سیفی کو آنکھ مارتا ہے اور سیفی ساتھ رکھی تڑی مڑی کاپی پر تیزی سے گھسیٹنے لگتا ہے۔)

...... یہ بات۔ سیٹھ بدکے گا کہ Establishment کے خلاف فلم میں کوئی بات نہ ہو۔ کہیں فلم بین نہ ہو جائے اور اس کا سارا پیسہ ڈوب نہ جائے۔ لیکن یہ بھی کیا ضروری ہے کہ فلم ہماری کسی اجتماعی مصیبت کے بارے میں ہی ہو۔ ملک وقوم کے درد پر لعنت بھیج کر اپنے درد کی بات کیوں نہ کی جائے۔ لیکن جو سبجیکٹ میں پکڑ کر لایا ہوں یہ تو بہرحال سیدھا اُدھر ہی جاتا ہے۔ انیلا سے یہ بات بھی ڈسکس کرنا ہو گی۔ لگتا ہے سیٹھ پر ابھی اُسے مزید کام کرنا ہو گا۔ بطور...... کیا کہتے ہیں۔ عشوہ گر۔

اُس کی صلاحیتیں ابھی کھل کر سامنے نہیں آ رہیں۔ میرا زیادہ دیر یہاں چلنا مشکل لگتا ہے۔

سعید کمال: "میں نے فلم بنانی ہے جو Cannes میں ایوارڈ حاصل کر سکے۔ میں نے کوئی Fucking ریفارمر کوئی انقلابی نہیں بننا۔ صفدر سلطان صاحب آپ فکر نہ کریں...... یہ میری ذمہ داری ہے۔ یہ سب نہیں آئے گا...... غائب کرنے والوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوگا۔ Forget it"۔

انیلا: (بے اختیار ہو کر) "تو یہ...... کیا ہے...... "عظیم نجات دہندہ......" نجات مٹھائیاں...... (پھر اچانک لہجہ بدل کر)...... لیکن صفدر سلطان صاحب آپ فکر نہ کریں۔ ہم بات بہت مختلف انداز میں کریں گے۔" مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر ایک دم سیفی پر غصے سے پلٹ پڑتی ہے۔

"یہ کیا؟ تم پر سب کے ساتھ بیٹھے بیٹھے لکھنے کا ابال آتا ہے۔ بدتمیزی نہیں یہ کیا۔"

(سیفی کوئی جواب نہیں دیتا اور کچھ لکھتا رہتا ہے۔)

(اس دوران صفدر سلطان ریشہ خطمی انداز میں انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔)

صفدر سلطان: (ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں) "جی...... جی...... بالکل...... بالکل...... میرا خیال ہے میڈم کی بات میں بہت وزن ہے۔ واقعی اگر کوئی نئی بات نہیں ہوگی تو فلم آگے بکے گی کیسے۔ عالمی فلمی منڈی میں۔"

انیلا: (ہنس پڑتی ہے) "عالمی فلمی منڈی...... تھینک یو صفدر صاحب...... ساری...... سیفی...... ساری۔ آگے۔ پلیز آگے چلو۔ اور یہ چھوڑو قلم چلانا۔ جا کر ڈائری لکھ لینا اگر کوئی ہے۔"

سیفی: "ڈائری لکھنا گھسیٹا کاری کا نعم البدل نہیں ہے۔ ابھی تم نے ٹھیک کہا تھا فوری ابال...... کا ریکارڈ ہے یہ میری گھسیٹا کاری۔ اس کے بغیر میں چل نہیں سکتا۔ مجھے اپنے دماغ پر اعتماد نہیں۔ نازک نقطے بھول جاتا ہوں۔ چیف...... میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ بات کو ساتھ ساتھ آنے دو۔ جیسے کسی کے ذہن میں یا کہیں اور آئے۔ یہ ٹیم ورک ہے"۔

سعید کمال: ''آئی لو یو سیفی...... پلیز...... آگے......''

سیفی: ''ہاں...... چلتے...... ہیں۔ خیر...... تو اُس نے وہ سوال کیا...... یا بات کی۔ جو شاید یہاں ممنوعہ بات۔ سبجیکٹ کہا گیا۔ تو میں نے بھی جناب اُس کی بات کو بالکل نظر انداز کیا اور پوچھا...... ''جناب...... میں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو پوچھنا چاہتا ہوں۔ جو آپ نے یہاں کیا...... میں نے اصل میں سب کچھ دیکھا اور سُنا ہے۔ جو آپ نے کہا میگافون پر...... ظاہر ہے ایک ایک لفظ صاف سمجھ آ رہا تھا...... پھر شاید یہ خراب ہو گیا...... وہ ہوں کہہ کر ہنسا اور بولا رپورٹر صاحب آپ نے بڑی دنیا دیکھی ہو گی لیکن پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیں......''

(سیفی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور باقی چاروں ایک تجسس کے عالم میں خاموش ہیں)

سیفی: ''یار یہ بابا خُوشیا نظر نہیں آ رہا۔ چائے کا کچھ کرے۔''

ماسٹر یاسین: (اک دم بلند آوازیں دینے لگتا ہے) ''بابا...... بابا...... بابا جی...... چاء...... چاء...... (سیفی سے مخاطب ہو کر) تو اُس نے سوال پوچھا آپ سے سیفی صاحب......''

سیفی: ''ہاں...... اور جو سوال اُس نے پوچھا میرا شک اور بھی پختہ ہوا...... کہ یہ شخص غیر معمولی ہے...... اسپیشل پرسن ہے۔''

صفدر سلطان: ''یعنی پاگل ہے۔''...

سیفی: ''آپ کہہ سکتے ہیں۔ آپ پروڈیوسر ہیں۔ آپ نے پیسہ لگانا ہے۔ خیر...... اس نے پوچھا'' پیارے بونے نے میگافون مجھے تحفے کے طور پر دیا تھا مگر یہ خراب نکلا۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں۔ پیارے بونے نے مجھے دھوکہ دیا؟'' میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ یہ کیا پوچھ رہا ہے مجھ سے......''

انیلا: ''عجیب سوال ہے۔ اور پھر اگر بونا پیارا نہ ہوتا تو...... پیارا بونا۔''

سعید کمال: (کچھ یاد آنے پر ماتھے پر سلوٹیں نمودار ہوتی ہیں) ''بونا۔ او مائی گاڈ۔ Tin Drum۔ سیفی تم نے Tin Drum دیکھی ہے...... جرمن فلم ہے۔ گنٹر گراس کے ناول پر...... ایک چھوٹا سا بونا مسلسل ڈھول بجاتا رہتا ہے۔''

سیفی: ''میں نے اس کے مقابلے کی ایک فرنچ فلم دیکھی تھی جس میں ایک بڑا سا بونا مسلسل بنسری بجاتا رہتا ہے۔''

سعید کمال: (ماسٹر یاسین سے) ''ماسٹر اُدھر تمہارے...... اُدھر انڈسٹری میں بھی ایک بونا ہوتا تھا...... تمہاری ہر دوسری فلم میں نظر آتا تھا۔''

ماسٹر یاسین: ''ہاں...... وہ...... استاد موچھا...... وہ بے چارہ فوت ہو گیا۔''

سعید کمال: ''اوہو Sad لیکن عجیب بات ہے مجھے افسوس سے زیادہ حیرت ہوئی ہے۔ جیسے میں بونوں کو لافانی سمجھے بیٹھا تھا۔''

انیلا: ''پیارے بونے...... پیارا بونا...... سیفی...... تو تم نے کیا جواب دیا اُسے...... پیارے بونے کا میگافون۔''

سیفی: ''میں ابھی کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہنس پڑا۔ مٹھائی والا...... جبار...... اس کا نام جبار ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا...... تو......''

سعید کمال: (بات کاٹتے ہوئے) ''جبار...... ہوں...... نام بدلنا پڑے گا۔''

سیفی: ''میں نے محسوس کیا کہ وہ کہیں کھو سا گیا ہے۔ کہنے لگا'' پیارے نے یہ تحفہ مجھے اُس رات دیا جب...... سلطانہ ڈاکو کا آخری شو تھا...... میں ان دنوں ملک میں ہونے والے ہر اُس تماشے کا رُخ کرتا تھا جس پر ٹکٹ لگتا ہے...... میں ایسے تماشوں کی استعمال شدہ ٹکٹیں جمع کرتا تھا...... سینے۔ تھیٹر۔ سرکس۔ موت کے کنویں۔ موت کے گولے۔ نمائش۔ چڑیا گھر۔ عجائب گھر...... میں نے ہم نے اس اپنے عجائب خانے پر ٹکٹ نہیں لگائی۔ بولیں آج تک کسی نے اکٹھی کی ہوں گی ایسی ٹکٹیں...... ڈاک کی تو سب ہی کرتے ہیں جمع...... ویسے دنیا میں بڑے بڑے جمع کرنے والے پڑے ہیں۔ ارشاد آپ کو بتائے گا۔ میں نے کہا...... واقعی یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ پھر میں اُسے اُس طرف لایا جو کچھ جمع کرنے کی عجیب و غریب حرکت وہ اُس وقت کر رہا تھا......''

انیلا: ''یعنی وہ مٹھائی......''

ادارتی نوٹ

ہم سمجھتے ہیں بیانیے کی کچھ دشواریوں کو دور کرنے کے لیے یہاں ہم سیفی کی سنائی ہوئی کہانی کو اُس طرح پیش کر سکتے ہیں جیسے فلموں میں کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ بات ایک عمر گروپ کے درمیان چل رہی ہے اور معاملہ یقیناً بتدریج ایک سکرین پلے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ بتدریج فلمی انداز اپنانے میں کوئی حرج نہیں اور ہم سیفی اور جبار کے درمیان ہونے والی گفتگو کے منظر پر براہ راست چلے جائیں گے۔ لیکن سیفی کا اس دوران اپنے رفقائے کار سے براہِ راست مکالمہ بھی جاری رہے گا۔

سیفی: ''لیکن جناب میں حیران ہوں۔ آپ یہ سب کچھ کیسے جمع رکھتے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے محفوظ کرتے ہوں گے۔ جمع کرنے والوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ اپنی Collection کو محفوظ رکھنا بھی تو ہوتا ہے۔''

جبار سیفی کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہے اور بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔

جبار: ''جناب میں ایک پاگل جمع کرنے والا ضرور ہوں لیکن سادہ اور خالص پاگل نہیں ہوں۔ احمق بھی نہیں ہوں۔ اس طرح کی چیزیں یعنی بہت جلد خراب ہو جانے والی چیزیں لیکن اپنی حیثیت میں نایاب۔ میں نے جمع کرنے کے لیے محفوظ کرنے کے لیے ایک قدرتی نظام رکھا ہوا ہے۔ کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے؟''

(سیفی ''میں بھلا اور کیا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کے 'قدرتی نظام' سے میں کچھ نہ سمجھا'')

سیفی: ''جی۔ جی۔ میں اسی لیے تو آپ کے ساتھ جا رہا ہوں۔ لیکن ''قدرتی نظام'' میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

جبار: ''سمجھ جائیں گے۔ لیکن دکھانا پڑے گا۔ ویسے مجھے یقین ہے آپ غائب کرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ ہم لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ہمیشہ تو نہیں۔ کبھی کبھی......''

سیفی: ''ہم لوگوں؟''

''میں اور بھائی ارشاد کباڑیا۔''

جبار: (سیفی ''وہ پھر ہنسا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب شرارت تھی۔ اور ایک قسم کا چیلنج تھا۔ مجھے ایک Disturbing سا احساس ہوا کہ میں کسی انتہائی انوکھی صورتحال کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ وہ مجھے کسی نامعلوم چیز کو دیکھنے کے لیے ساتھ چلنے کی دعوت دے چکا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اپنے میگا فون سے پھر چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اچانک میگافون سے ایک فلک شگاف آواز بلند ہوئی'')

آواز: ''ٹھیک ہو گیا...... ون۔ ٹو۔ تھری۔ ٹیسٹنگ...... (آواز پھر بیٹھ گئی)۔ پھر خراب ہو گیا۔ (پھر بلند آواز) پیارا بونا ٹھیک کہتا تھا...... البیلا تانگے والا......''

سیفی: ''او...... میں تو دہل گیا تھا......''

جبار: ''چلیں پھر...... دیکھیں گے؟ سب دیکھیں گے؟''

(سیفی ''اس نے پھر اسی چیلنج کے انداز میں پوچھا اور قہقہے لگانے لگا۔ اب ذرا سوچو۔ اس کا میگافون بار بار ٹھیک اور بار بار خراب ہو رہا ہے اور اُس کے قہقہوں کا کوئی حصہ یک دم کان پھاڑنے والا بن جاتا ہے تو کوئی بالکل بیٹھ جاتا ہے۔ عجیب و غریب فضا بن رہی تھی......'')

(سعید کمال بہت زیادہ جوش میں آچکا ہے۔)

سعید کمال: ''سیفی...... سیفی...... تم...... تم...... یہ کمال کر رہے ہو...... Surrealist یہ سب Surrealist بن رہا ہے۔ پروفیسر جولیس ملیلنسکی سے میرا وعدہ تھا کہ میری پہلی فلم 'سریلسٹ ہوگی۔''

انیلا: ''اُدھر پراگ میں......''

سعید کمال: ''ہاں...... (زیرِلب) لیوناسے بھی۔''

سعید کمال انیلا کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ جیسے متوقع ہو کہ وہ اُس سے کچھ پوچھے گی لیکن انیلا لاپروائی سے کندھے اچکاتی ہے۔

سیفی: ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ قدرت بھی کچھ ایسا ہی تماشا کر رہی تھی۔ آگے سنو ذرا...... وہ کل جو طوفان آیا تھا...... اس کا پہلا زناٹے دار جھونکا اُسی وقت آیا جب

وہ میگافون میں قہقہے توڑ رہا تھا۔"

انیلا: "قہقہے توڑ رہا تھا...... یہ اچھا ہے...... سیفی تمہیں سکرپٹ میں میرے ساتھ آنا ہوگا۔ تمہاری یہ گھسیٹا کاری بھی کسی کام آجائے گی۔"

(بے ساختہ سیفی انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ دونوں کی نظروں میں ایک گہرا احساس اچانک ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بے حد مختصر سا لمحہ ہے لیکن سعید کمال اور صفدر سلطان دونوں ایک نامعلوم سی کیفیت سے گزرتے ہیں اور بات آگے بڑھ جاتی ہے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔)

سیفی: "فی الحال تو میں جبار جمع کرنے والے کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اور پھر ارشد کباڑیے کی دکان کے نیچے بنے تہہ خانے میں...... لیکن میں بتا رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ آناً فاناً سیاہ بادل آگئے اور اندھیرا چھا گیا۔"

(سعید کمال پھر پرجوش انداز میں گول میز پر ہاتھ مارتا ہے لیکن جوش کے ساتھ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی الجھن بھی ہے۔)

سعید کمال: "او...... مائی گاڈ...... انیلا...... انیلا...... سیفی...... یہ Surrealism کا ماسٹر پیس بننے والا ہے۔ "A fucking surrealist master piece"۔"

(ماسٹر یاسین کے چہرے پر کچھ نہ سمجھنے کی الجھن اور بیزاری بڑھتی جاتی ہے)

ماسٹر یاسین: "یہ ہے کیا...... جو بار بار کہہ رہے ہو۔ سُر لا...... ازم...... سر یلی۔ یہ کیا ہے۔ میوزک ہے۔ کوئی...... سُر...... ساؤنڈ کا کام ہے یا کیمرے کا۔ کہ ایڈیٹنگ میں بنے گی؟ یہ ہے کیا بلا...... سُر زالم؟"

سعید کمال: "ماسٹر اس وقت ڈسٹرب نہ کرو پھر بتا دیں گے۔"

ماسٹر یاسین کو پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ سریلزم کیا بلا ہے

ماسٹر یاسین: "نہ کیمرے کی...... میں سُر تو میں نے دینا ہے ناں۔ فیتہ رول میں نے کرنا ہے۔ مجھے پتہ تو چلے بات کیا ہو رہی ہے یہ چکر کیا ہے؟ سُر لا......"

سیفی: (شرارت آمیز مسکراہٹ) "ماسٹر یاسین کو پوچھنے کا پورا حق حاصل ہے کہ یہ سریلزم ہے کیا بلا...... سمجھاؤ ڈائریکٹر صاحب...... میں ذرا دیکھوں بابے نُشیے نے چائے بنائی ہے کہ نہیں۔"

(سیفی اٹھ جاتا ہے۔ سعید کمال جھنجھلا کر بتانے لگتا ہے۔)

سعید کمال: "دیکھو ماسٹر سریلزم بنیادی طور پر ایک کلچرل موومنٹ تھی اس کا بانی آندرے بریتاں تھا۔ اس موومنٹ کی جڑیں پہلی جنگ عظیم کے بعد ڈویلپ ہونے والی Dadaism اور فرائیڈ کے سائیکو انیلیسز میں تھیں۔ یہ لوگ So Called حقیقی دنیا کے روایتی ترتیب و توازن کو توڑ پھوڑ کر نئے سرے سے Arrange اور Juxtapose کر کے ایک Sense of Shock پیدا کرتے ہیں جو اصل میں حقیقت پر ہی ایک Comment ہوتا ہے۔ 1920ء کے بعد یہ موومنٹ پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اور نہ صرف Visual Arts بلکہ میوزک اور سب سے بڑھ کر (پھر زور سے میز پر ہاتھ مارتا ہے) ہمارے لیے...... اس کے اثرات فلم پر ہوئے۔ او مائی گاڈ...... مجھے چیکوسلواکیہ کے سریلسٹ گروپ کا خیال آتا ہے Nizeved, Jan Saunkmajer, Vitezslar اور دوسرے......"

ماسٹر یاسین: "جی...... جی...... مگر یہ ہے کیا باس......؟"

(اب انیلا ہنس پڑتی ہے۔ سیفی بابے نُشیے کو ساتھ لیے آ جاتا ہے۔ جس نے ایک ٹرے میں چائے کے کپ اور بسکٹ اٹھائے ہوئے ہیں۔ محبت بھری سرمہ بھری آنکھوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔ چائے کے مگ سب کے سامنے رکھتا ہے۔ اور پھر ماسٹر یاسین کے ساتھ خالی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ سیفی چائے کی چسکی لیتے ہوئے ماسٹر یاسین کی طرف دیکھتا ہے پھر سعید کمال کی طرف ایک شرارت بھری نظر ڈالتا ہے)

سیفی: "چیف تم نے سمجھایا ماسٹر کو...... سریلزم کیا بلا ہے؟"

انیلا: (تیزی سے مداخلت کرتے ہوئے) "دیکھیں ماسٹر صاحب۔ یہ کچھ ایسا ہے...... آ...... (چاروں طرف دیکھتی ہے)...... مثلاً فرض کریں کوئی بندہ...... نہیں بندہ

نہیں...... کوئی آرٹسٹ بلکہ کوئی پینٹر اس کمرے کی پینٹنگ بناتا ہے۔"
ماسٹر یاسین: "جی بنا لی۔"
انیلا: "نہیں ابھی بنائی نہیں...... بنانی ہے...... وہی بتانے لگی ہوں۔ دیکھیں کوئی ماہر
پینٹر ہو گا تو کیا کرے گا ہم پانچوں کو اس گول میز کے گرد بیٹھا ہوا دکھا دے گا۔ اور
پیچھے یہ دنیا کے چھوٹے بڑے...... نہیں بہت بڑے بڑے...... فلم ڈائریکٹروں کی
تصویریں ہیں دیوار پر...... وہ کوشش کرے گا کہ ہماری شکلیں اور کمرے کے رنگ
ہر چیز ویسی ہی تصویر میں نظر آئے جیسی دیکھنے میں ہے۔"
ماسٹر یاسین: "بالکل...... جی میڈم اور اُس کا کام ہی کیا ہے پینٹر کا......"
(انیلا گڑبڑا سی جاتی ہے۔ سیفی ہنستا ہے۔ سعید کمال بے چینی سے دونوں ہاتھ ہوا
میں اچھالتا ہے۔ بابے خُوشیے کے چہرے پر ایسے تاثرات ہیں جیسے بات سمجھنے کی
کوشش میں اُسے باقاعدہ جسمانی زور لگانا پڑ رہا ہے۔)
انیلا: "آ...... نہیں۔ ضروری نہیں۔ کچھ پینٹر سمجھ سکتے ہیں کہ...... وہ ایسا نہیں کریں گے۔
مثلاً اب فرض کریں کہ ایسا ہی ایک پینٹر دکھاتا ہے کہ پینٹنگ میں ہماری تصویریں
تو دیواروں پر لگی ہیں اور عظیم فلم ڈائریکٹر یہاں بیٹھے ہیں...... افوہ۔ نہیں...... اس
سے تو...... کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں...... نہیں سُنیں وہ ایسا کرتا ہے کہ دکھاتا ہے کہ
ہم یوں تو کرسیاں دائرے کی شکل میں رکھے بیٹھے ہیں...... ہمارے ہاتھوں میں
کیمرے ہیں۔ لیکن سب کے پاؤں زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں...... اور
میز......"
سیفی: (مداخلت کرتا ہے) "گول میز۔"
(صفدر سلطان کے چہرے پر حماقت کے ڈونگرے برس رہے ہیں۔ زیرِ لب بڑبڑاتا ہے۔)
صفدر سلطان: "گول میز۔ کانفرنس۔"
(محسوس ہوتا ہے کہ انیلا بتدریج اپنی بنائی ہوئی فینٹسی میں زیادہ مگن ہوتی جا رہی ہے۔)
انیلا: "ہاں...... گول میز جو ہے وہ ہمارے سروں سے اوپر ہوا میں معلق ہے۔ میز کے
اوپر ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے۔ اور ہم نے کیمروں کے علاوہ دوسرے ہاتھوں میں

گھڑیاں پکڑی ہوئی ہیں۔ ہم گھڑیاں دیکھ رہے ہیں۔ میرے خدا...... دیواروں پر
لگی تصویروں میں عظیم فلم ڈائریکٹر ہماری طرف دیکھ کر قہقہے لگا رہے ہیں۔ تو یہ
پینٹر......"
ماسٹر یاسین: "اللہ معافی...... ایسے پینٹر کو تو پکڑ کر جوتے لگانے چاہئیں۔ جیل بھیجنا چاہیے۔"
سعید کمال: (الجھن۔ بے چینی) "او...... میرا خیال ہے ہم وقت برباد کر رہے ہیں......
گھڑیاں...... اوہو۔ انیلا تم نے کہا گھڑیاں...... That's it میرا خیال ہے مسئلہ
حل ہو گیا...... میں ماسٹر کو سیلوئے ڈار ڈالی کی مشہور پینٹنگ Persistance of
Memory دکھا دوں گا...... گھڑیاں پگھل کر سوکھے درخت کی شاخ سے لٹک رہی
ہیں۔ جل پری کی کمر...... پر...... ایک گھڑی...... پیچھے سمندر ہے۔"
سیفی: (ماسٹر یاسین کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے) "یہ ایک ایسا ہی پینٹر تھا۔ جیل
جانے کے لائق......"
انیلا: (چیخ کر) "ٹھہرو...... میں ڈالی سے آگے جا رہی ہوں۔ ہماری گھڑیاں......
ہاں...... ہماری گھڑیاں...... ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہی لٹک نہیں رہیں......
ہمارے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پھانسی کے پھندے ہیں جن میں وہ گھڑیاں
لٹک رہی ہیں۔"
سیفی: (ایک دم مضطرب ہو کر نعرہ لگاتا ہے) "واہ...... انیلا اچھی جا رہی ہو۔ (ایک عجیب
سی کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نظم سنانے کا انداز۔) "وقت کو پھانسی دو اس سے
پہلے کے وقت تمہیں پھانسی دے دے۔ باقی جھوٹی شاعری میں پھر کبھی کروں گا۔"
سعید کمال: "ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ سیفی فار گاڈز سیک......"
صفدر سلطان: (بھرائی ہوئی آواز) "یہ فلم نہیں بن سکتی۔"
انیلا: (صفدر سلطان کو براہ راست دیکھتے ہوئے گہری پھنسی پھنسی سی Husky آواز
میں مسکراتے ہوئے) "نہیں صفدر سلطان صاحب...... بنے گی۔ یہ فلم ضرور بنے
گی...... اور آپ ہی اس کے پروڈیوسر ہوں گے...... تھوڑے سے بجٹ کی تو بات
ہے پلیز۔"

تو...... ہمارے سامنے بیٹھا ہے......"

سیفی: "لیکن چیف یہ تو مجھے ڈوکیومینٹری کا سبجیکٹ نظر آرہا ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی
کسی طرح پھندے کی موت سے بچ نکلے۔ رسہ ٹوٹ گیا۔ کسی نے رسہ کاٹ دیا
پاؤں زمین پر جا لگے، تخمینے میں غلطی...... You know پھانسی کے بعد کی زندگی
Life after failed hanging ایسے لوگوں سے انٹرویو کیے جائیں......
جائیں...... اور...... کوئی ریکارڈ قائم کیا جائے......"
(اچانک کسی خیال پر ہنسنے لگتا ہے)

انیلا: "کیا...... کیا ہوا......؟"

سیفی: "حیرت ہے میں ابھی سے ویسے ہی سوچنے لگا ہوں جیسے "جبار جمع کرنے والا"
سوچتا ہے۔ بلکہ شاید اس کا گرو ارشاد کباڑیا سوچتا ہے۔ پھانسی سے بچ جانے
والے...... سزا میں معافی کی بات نہیں کر رہا وہ تو بہت ہوں گے۔ بلکہ جو اپنی
طرف سے...... لگ گئے تھے...... لیکن قدرت آڑے آئی...... ایسے لوگوں کے
انٹرویو آج تک کسی نے اکٹھے نہیں کیے ہوں گے...... جبار بھی ایسی ہی چیزیں جمع
کرتا رہا جو آج تک کسی نے جمع نہ کی ہوں گی......"
سیفی گھسیٹتا ہے...... یہ جمع کرنے کا Collector کا Metaphor اس پر حاوی
ہو گا۔

سعید کمال: "آجاؤ...... اُسی پر آجاؤ...... جمع کرنے والے پر آجاؤ...... میں کہتا ہوں اسی
Fucking collector پر آجاؤ......"

سیفی: "لیکن سرئیلزم...... سرئیلزم کا کیا بنے گا......؟ (ماسٹر یاسین کی طرف دیکھتے
ہوئے) اچھا ماسٹر...... ایسا کرتے ہیں...... دیکھو میں جو کچھ آگے بتانے والا
ہوں۔ ارشاد کباڑیے کی دکان اور نیچے اس کے عجائب گھر میں جو کچھ میں نے
دیکھا۔ بلکہ گلزار نرسری اور تان سین میوزیکل بینڈ کا بھی جو کچھ بتاؤں گا...... وہ کوئی
ایک تماشا ہے۔ اور ایک خواب ہے بلکہ خواب تماشا ہے۔ سرئیلزم خواب تماشا
ہے...... تو سمجھو تم اُس پر فیتہ رول کر رہے ہو۔ شاٹ بنا رہے ہو...... سکرین پلے

تمہارے سامنے ہے...... ٹھیک...... تو اس طرح تمہیں چیف کی بات سمجھ آجائے
گی۔ اور چیف تم ہر وقت Conceive ہی کرتے رہتے ہو...... یا۔"
(تھکے ہوئے لہجے میں) "چلو رول کراؤ۔ سکرین پلے پر...... فیتہ رول کراؤ۔"

ماسٹر یاسین: "اجازت چیف؟"

سیفی: (بُرا سا منہ بنا کر) "یہ تم نے مجھے اچانک چیف کیوں کہنا شروع کر دیا ہے؟"

سعید کمال: "جی چاہتا ہے۔ ماحول ہی ایسا ہے چیف یہ سرئیلسٹ بنے گا......"

سیفی: (پریشانی کا تاثر) "پتہ نہیں...... کیا بنے گا...... (کہیں کھو سا جاتا ہے)...... لیونا

سعید کمال: کے پاس تو موت کی چہل قدمی ہے...... وہ ایک بڑی فلم بنا سکتی ہے اس پر......
لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں ابھی......"

سیفی: "کیا چیف...... موت کی کیا...... موت کی چہل قدمی۔ کیا مطلب......"

سعید کمال: "کچھ نہیں......"

سیفی: "تو آگے چلتے ہیں...... میں بتا رہا تھا گھنے بادل آگئے تھے اور تاریکی چھا گئی
تھی...... اچانک جبار نے رکشے والے کو رکنے کا حکم دیا۔"

منور سلطان: (گہرا سانس لیتے ہوئے۔ شکر ادا کرنے کا انداز) "اچھا...... تو اب آگے کا حال بتانے
لگے ہیں۔ شکر ہے۔"

ادارتی نوٹ

ہم سمجھتے ہیں کہ وقت آگیا ہے کہ ہم 'آگے کا حال' یعنی واقعات کو یا شاید اُن کے بیان کو کسی اور سطح پر لے جائیں۔ یوں بطور مدیر حیرت ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسے پہلے کہا گیا ہم بتدریج فلمی انداز اپناتے چلے جائیں گے...... تو ہم سیفی اور جبار کے رکشے کے سفر کو حذف کرتے ہیں۔ بلکہ ہم سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں ہونے والی اس میٹنگ اس گول میز کانفرنس کے حال کو بھی حذف کرتے ہیں۔ البتہ اس گول میز کی "سوانح حیات" کو ہم حذف نہیں کریں گے اور اس کا حال آگے کہیں ضرور آئے گا۔ اور یہ ایک انتہائی خوفناک حال ہوگا۔

گول میز کی کہانی دہشت ناک ہوگی۔ بہر حال۔ فی الحال......ہم ''آگے کا حال'' ایک ایوبلی
'مفروضہ' Hypothetical سکرین پلے سے پکڑتے ہیں جسے انیلا اور سیفی مل کر لکھ سکتے ہیں
گو سعید کمال ابھی تک نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ دونوں جن مختلف ذہنی اور جذباتی
سطحوں پر ایک دوسرے کو جان چکے ہیں اور جان رہے ہیں اس کا بھی تقاضا ہے کہ ان کی
مشترکہ متخیلہ یعنی سیفی کی گھسیٹا کاری اور انیلا کی ڈرامہ نگاری باہم مربوط ہو کر ارشاد کباڑیے
جبار جمع کرنے والے، پروفیسر صفدر سلطان اور دوسرے کئی بے حد مشکل کرداروں کے لیے
ایک انوکھی (کیا سرئیلسٹک؟ ہم اس بارے میں فی الحال کوئی رائے نہیں دینا چاہتے) افسانوی
دنیا تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ کیا یہ سکرین پلے عالمی فلمی میلے میں شامل ہونے
والی کسی فلم کی شکل اختیار کر سکے گا یا نہیں؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن پہلے ہم اپنے اختیاری
سکرین پلے کو دیکھتے ہیں یعنی اسکرین پلے جو لکھا جا سکتا ہے۔ جس میں سیفی کے اپنے فری
لانس رپورٹر کے کردار کی نمائندگی کرنے والا ایک کردار اگرچہ کسی دوسرے نام سے موجود ہے
اور اسی طرح ارشاد کباڑیے اور جبار کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ لیکن ہم ''حسن کی ہم
نامی صورت حال'' کے تقاضوں کے مطابق سب نام اپنی اصل حالت میں برقرار رکھیں گے۔
اسی طرح کباڑیے کی دکان بھی وہی ہے جو حسن نے دیکھی۔ لیکن فلمی تقاضوں کے مطابق اس
میں بھی کئی تبدیلیاں آچکی ہیں۔

....

(7)

کباڑ کمپلیکس

پہلے تیس منٹ کی خواندگی

انیلا۔ سیفی سکرین پلے:

لیڈ ان: شہر کے مضافاتی علاقے کی ایک سڑک۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو اُمرا کے
دو پوش رہائشی علاقوں کے درمیان واقع ہے ایک بہت بڑے سینڈوچ کی طرح۔
اس سڑک پر نچلے درمیانے طبقے کی رہائش گاہیں اکا دُکا ہی نظر آتی ہیں لیکن عقب
میں ایسی پوری بستیاں موجود ہیں

اپ شاٹ: (اپریل) (پروڈیوسر صاحب کے مشورے کے بعد۔ اگر ہیلی کاپٹر کے اخراجات
زیادہ ہوں تو ترک کیا جا سکتا ہے)
سڑک کے ارد گرد زیادہ تر کھلی احاطہ نما جگہیں ہیں جن میں ورکشاپیں، نرسریاں،
...ل، چکیں بنانے والوں، واٹر کولر بنانے والوں اور اس طرح کے کام کرنے والوں کے اڈے
...ہیں جن کے کام کے لیے نسبتاً کھلی جگہ درکار ہوتی ہے۔

لانگ شاٹ: اسی سیٹ اپ میں ارشاد کباڑیے کی دکان کے قریب ویگنوں، بسوں کا شاپ۔
پیچھے دکان کا کھلا دروازہ نظر آتا ہے۔

...شاٹ: (دکان کا بیرونی حصہ) کباڑیے کا ساز و سامان باہر سڑک تک بکھرا ہوا ہے۔ لیکن غور
سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ بظاہر بکھری ہوئی چیزیں بھی کسی ترتیب میں رکھی گئی
ہیں۔ اندر نیم تاریکی میں دکان غیر واضح مبہم ہیولوں جیسی اشیا سے بھری نظر آتی

ہے۔ اندر کہیں ایک مدہم روشنی کی الیکٹرک ٹیوب بار بار جل بجھ رہی ہے۔ دکان کا سامنے کا حصہ احاطے کی چھ سات فٹ اونچی دیوار سے منسلک ہے۔ یہ احاطہ کباڑیے کے پورے مستطیل شکل کے اڈے میں دائیں طرف بنی بنیادی دکان کی چھوٹی مستطیل کی وجہ سے انگریزی کے حرف ایل کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ دکان کی پچھلی دیوار میں سے ایک دروازہ احاطے کو کھلتا ہے۔ ایل شکل کے اس احاطے کے اوپر بھی چھ ستونوں کی مدد سے ٹین کی چھت ڈالی گئی ہے۔ ویگن شاپ کے قریب سے گزرنے والوں کو اس احاطے میں اچٹتی سی نظر ڈالنے پر کئی قسم کے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر نظر آ سکتے ہیں گو فاصلے کی وجہ سے اُن کی شناخت آسان نہیں۔ دکان کے دائیں طرف ایک وسیع و عریض نرسری ہے جو رقبے میں ارشاد کباڑیے کے اڈے سے پچاس گنا بڑی ہے۔ گلزار نرسری شہر کی مشہور ترین نرسریوں میں سے ایک ہے۔ کیمرہ دائیں طرف پین کرتا ہے تو نرسری اور کباڑیے کی دکان کے درمیان ایک بے حد تنگ گلی نظر آتی ہے جو ایک چارپائی کی چوڑائی سے زیادہ چوڑی نہیں۔ نرسری کی بائیں دیوار سے باہر کی طرف جھکے ہوئے درختوں اور آرائشی جھاڑیوں کی شاخیں اس تنگ گلی کو نظروں سے تقریباً اوجھل کر رہی ہیں۔ صرف علاقے کے لوگ جانتے ہیں کہ یہ گلی اس سڑک سے پچھلی اور متوازی سڑک کی طرف پیدل جانے والوں کے لیے ایک ''خفیہ'' راستہ ہے۔ اسی لیے بہت کم لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ (پین)
گلزار نرسری کا بیرونی منظر بتدریج سامنے آتا ہے۔ انواع و اقسام کے آرائشی پودے۔ جھاڑیاں۔ موسمی پھولوں کے لاتعداد قطار اندر قطار گملے، پنیریاں، کھاد کے ڈھیر اور نرسری کے سامنے گاہکوں کی کاریں کھڑی نظر آتی ہیں۔ کیمرہ نرسری کے سامنے حصے کے مرکز میں بنے اندر کو جاتے راستے پر Stay کرتا ہے۔ بانس کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے گئے اس دروازے پر خوبصورت سدا بہار بیلیں اس انداز میں چڑھی ہیں کہ دروازہ زمین سے اُگا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کیمرہ نرسری کے اندر کھلتے دروازے پر Zoom in کرتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اندر جانے پر نرسری بتدریج گھنی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور آخر میں تو بالکل ایک گھنے جنگل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

نرسری اور کباڑیے کی دکان کے درمیانی تنگ رستے پر کٹ کرتے ہیں۔

ٹریکنگ شاٹ: تنگ گلی نما رستے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ جھکی ہوئی شاخیں۔ ایک بیل کی لمبی شاخ جس پر گہرے سرخ رنگ کے پھول۔ نرسری کی بیرونی دیوار پانچ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں لیکن مضبوط بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف کباڑیے کی دکان کے کھلے احاطے کی بیرونی دیوار نسبتاً اونچی ہے لیکن بوسیدہ ہے۔ نمی اور روشنی کی کمی کی وجہ سے دونوں طرف کی دیواروں پر سبز کائی جمی ہے۔ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ راستہ پختہ ہے یا کچا کیونکہ زمین پر جگہ جگہ ٹوٹے ہوئے گملوں کے ٹکڑے اور خشک پتے ٹہنیاں۔ کٹے پھٹے کاغذ اور گتے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس تنگ گلی میں بائیں طرف کباڑیے کے احاطے کی دیوار میں ایک جگہ زمین سے چھ سات انچ اوپر ایک مستطیل خلا ہے جس کے بارے میں فوری طور پر اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ کوئی دروازہ ہے یا کھڑکی۔

کلوز شاٹ: دیوار میں کسی ٹیلی ویژن کے لکڑی کے خول کا پچھلا کھلا حصہ نظر آتا ہے جسے دیوار میں نصب کیا گیا ہے۔

Zoom in: ٹیلی ویژن کا خول دوسری طرف سے بند ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ ٹیلی ویژن کے فریم کو ایک چھوٹے سے دروازے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

(اچانک کسی کتے کے غرانے اور پھر بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں)

ٹریکنگ شاٹ: کباڑ خانے کے احاطے کی دیوار سے آگے بڑھنے پر بلند دیوار شروع ہوتی ہے جو دوسری سڑک پر کباڑیے کے احاطے کے متوازی بالکل دوسری طرف واقع تان سین بینڈ میوزک سینٹر کا عقبی حصہ ہے۔ تنگ گلی اس دوسری سڑک پر کھلتی ہے جو کافی ٹوٹی پھوٹی ہے اور عین اسی جگہ بائیں طرف مڑ جاتی ہے۔ بائیں طرف رہائشی آبادیاں ہیں لیکن دائیں طرف نرسری کی دیوار حد نگاہ تک اس سڑک کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے اور دور کہیں گندا نالا ہے۔ تنگ گلی سے باہر آنے پر ساتھ ہی بائیں طرف مڑ کر تان سین بینڈ والوں کا ڈیرہ اور اس سے ملحقہ جم جم دونوں کے مشترکہ عقبی حصے کباڑیے کے احاطے کے عقبی حصے سے جا ملتے ہیں۔
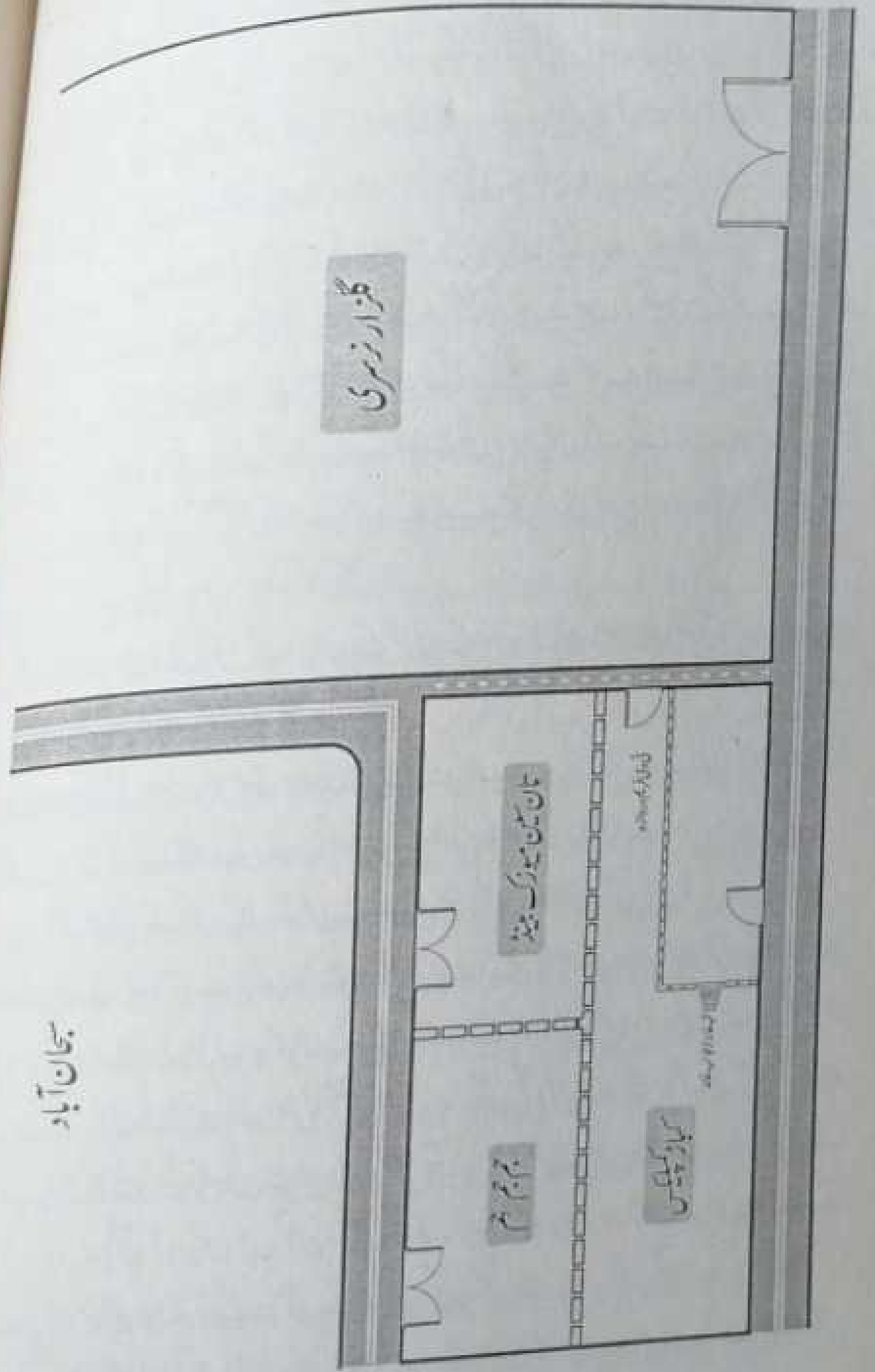
تان سین بینڈ والوں کے ڈیرے کے باہر ایک سائن بورڈ پر کلارنٹ بجاتے ایک
شخص کی تصویر بنی ہے اور نیچے لکھا ہے تان سین بینڈ میوزک سینٹر۔ میوزک بینڈ شادی بیاہ اور
دیگر خوشی کی تقریبات کے لیے خدمات حاصل کریں۔ بکنگ جاری ہے۔ بینڈ والوں کے
ڈیرے سے ملحق ایک آسمانی رنگ کے لوہے کے گیٹ کے اوپر ایک اور سائن بورڈ موجود ہے
جس پر موٹے لفظوں میں ''جم جم باڈی بلڈنگ جم'' لکھا ہے اور نیچے باڈی بلڈروں کے مخصوص
پوز میں ایک شخص سر کو دائیں گھما کر اپنے دونوں بازوؤں اور کمر کے ابھرے ہوئے مسلز دکھا رہا
ہے۔

کلوز شاٹ: کلارنٹ بجاتے شخص کی تصویر باڈی بلڈر کی تصویر کے اوپر Super-impose
ہوتی ہے پتہ چلتا ہے کہ دونوں ہم شکل ہیں۔

لانگ شاٹ: ٹوٹی پھوٹی سڑک ایک بازار سے گزرتی ہے۔ مختلف دکانیں۔ پیچھے سبحان آباد کا
علاقہ ہے۔

پین شاٹ: بازار کے بائیں طرف کی چند دکانیں۔ کریانہ فروش۔ سائیکل پنکچر والا۔ سچلوں کی
ریڑھی۔ فلتھ ڈپو...... ہیپی برتھ ڈے گفٹ شاپ۔ چائے والے کا کھوکھا۔ جم جم
جم۔ تان سین بینڈ میوزک سینٹر۔

(اچانک ایک جھنجھلائی ہوئی موسیقی کی دھن بلند ہوتی ہے۔ اور یک دم ڈرم بج اُٹھتا
ہے۔ دھن پہچانی جاتی ہے۔ (آئے موسم رنگیلے سہانے......تو چھٹی لے کے آجا بالما)
تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ جم جم جم کا سائن بورڈ کھٹ کھٹ دیوار سے ٹکرانے لگتا
ہے۔ بازار میں بکھرے تنکے، کاغذ وغیرہ اڑتے ہیں۔ ایک کالے رنگ کے شاپنگ بیگ میں
ہوا بھرتی ہے اور وہ ہوا میں بلند ہو کر آسمان کی طرف اٹھنے لگتا ہے۔ کیمرہ بیگ کو Follow
کرتا ہے۔ کالا بیگ ایک کالے بادل کے ٹکڑے کے سامنے آتا ہے اور جیسے غائب ہو جاتا
ہے۔ بجلی کی کڑک سنائی دیتی ہے۔ تان سین بینڈ کی ریہرسل کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔
''پیارے پکارلو کہاں ہو تم جھومتی بہار ہے کہاں ہو تم۔'' بجلی کا زوردار کڑاکا۔ کیمرہ گھنے
بادلوں پر پین کرتا ہے جو چاروں طرف سے اُمڈ کر آسمان پر چھا رہے ہیں۔

ادارتی نوٹ

ہم جانتے ہیں یہ ادارتی مداخلتیں irritating ہیں لیکن ضروری ہیں مثلاً اب یہاں
پھر یہ ذکر ضروری ہے کہ ایپلا۔ سیفی سکرین پلے میں کرداروں کے نام مختلف ہیں لیکن ہم نے
اُن کرداروں کے ناموں کو برقرار رکھا ہے جن سے ان دوسرے کرداروں نے جنم لیا ہے۔ اس
لیے یہ سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ سیفی، جبار اور ارشاد اصل (کون جانتا ہے اصل کیا
ہے؟) میں سیفی، جبار اور ارشاد سے کسی حد تک مختلف ہیں ہم 'کسی حد تک' پر اصرار کریں گے
مزید برآں ''حسن کی صورت حال'' کا تقاضا ہے کہ گنتی کے چند ناموں سے ہی کام چلایا
جائے۔ اور اس میں بھی ایک حکمت ہے جسے ہم عام نہیں کرنا چاہتے اور اس میں بھی ایک
حکمت ہے۔

سیفی کی آواز: ''لگتا ہے موسم خراب ہو رہا ہے۔''

جبار کی آواز: ''بس اب پہنچنے ہی والے ہیں۔ آپ کو جلدی تو نہیں؟''

سیفی: (ہنسی کی آواز) ''نہیں میرے پاس بہت وقت ہے۔''

جبار کی عجیب سی ہنسی: ''یہ اچھا ہے۔ بہت وقت چاہیے۔ واقعی...... ہمارا عجائب گھر دیکھنے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ بہت وقت چاہیے۔''

(جبار کا آخری فقرہ حیرت انگیز طور پر بلند آواز میں سنائی دیتا ہے)

کٹ ٹو۔ مڈ شاٹ: جبار اور سیفی گلزار نرسری کے سامنے چلتے ہوئے آ رہے ہیں اور ہنستے ہوئے میگا فون کو دیکھ رہے ہیں۔

سیفی: ''لگتا ہے پھر کام کرنے لگ پڑا ہے۔''

جبار: ''شاید...... بس پہنچ گئے...... یہ سامنے ہی ہے۔''

سیفی: ''یہ تو کوئی کباڑ خانہ لگتا ہے۔''

جبار: ''اوپر کباڑ خانہ...... نیچے عجائب خانہ۔''

سیفی: ''اور پاگل خانہ بھی کہیں قریب ہی ہوگا؟''

(بجلی کی کڑک پھر سنائی دیتی ہے اور تاریکی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بینڈ کی موسیقی اچانک شروع ہو کر اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جبار انتہائی حیرت سے سیفی کی طرف دیکھ رہا ہے)

جبار: ''کیا کہا آپ نے پاگل خانہ......؟''

سیفی: (ہلکی سی خفت) ''آہ...... وہ۔ کباڑ خانہ۔ عجائب خانہ سے خیال آ گیا۔ آپ بُرا مان گئے؟''

جبار: ''نہیں۔ نہیں...... بُرا ماننے کی بات ہی کوئی نہیں۔ دراصل پہلے بھی ہم پر یہ الزام لگ چکا ہے۔ (سرگوشی کے لہجے میں رازدارانہ بات کرتا ہے لیکن اچانک میگا فون پھر کام کرنے لگتا ہے اور سرگوشی بلند آواز میں نشر ہو جاتی ہے)۔ ویسے آپس کی بات ہے ارشاد صاحب کی حد تک یہ الزام کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔''

سیفی: ''اور کسی پر یہ الزام لگے یا نہ لگے لیکن آپ کے اس میگا فون پر ضرور لگے گا۔ پاگل میگا فون ہے۔''

جبار: (اُداسی سے) ''اس کا سابقہ مالک بھی پاگل تھا۔ پیارا بونا۔ ارشاد صاحب کہتے ہیں چیزوں پر مالکوں کا اثر ہوتا ہے جبکہ میں کہتا ہوں چیزوں کا بھی مالکوں پر اثر ہوتا ہے...... ویسے آپ کا کیا خیال ہے بونوں کو جمع کیا جا سکتا ہے......؟''

سیفی: ''کہاں؟ کباڑ خانے میں؟ یا عجائب خانے میں......؟''

جبار: ''چھوڑیں۔ ویسے ہم نے سارے سیٹ اپ کا نام کباڑ کمپلیکس رکھ دیا ہے۔''

سیفی: ''کباڑ کمپلیکس یہ تو کمال نام ہے۔''

جبار: ''جی شاید۔ رجسٹرڈ کردار ہے ہیں۔ آخر گینز بک آف ریکارڈز والوں کو بھی تو متاثر کرنا ہے۔''

سیفی: (حیرت سے) ''گینز بک آف ریکارڈز...... کیا مطلب......؟''

جبار: ''ارشاد بھائی کہتے ہیں اگر ہم پاگل ہیں تو گینز بک آف ریکارڈز والے ہم سے بڑے پاگل ہیں۔ جو پاگلوں کو سند دیتے ہیں۔ اب ایک بندہ ہے جو کئی برسوں سے

لوگوں کی ناف کی میلیں جمع کر رہا ہے۔ ایک دوسرا ہوائی جہازوں میں استعمال ہونے والے الٹیوں کے بیگ جمع کر رہا ہے......"

(سیفی گہری سوچ میں جیسے کسی معاملے کی تہہ تک پہنچ رہا ہو)

سیفی: "ہوں...... میرا خیال ہے میں سمجھ رہا ہوں......"

جبار: (قہقہہ) "باقی آپ کو ارشاد صاحب سمجھا دیں گے...... یہ گلزار نرسری دیکھ رہے ہیں آپ؟"

سیفی: "جی۔"

جبار: "یہ بہت بڑی نرسری ہے۔ یہاں سے گندے نالے تک پھیلی ہوئی ہے۔"

سیفی: "گندے نالے تک......! کمال ہے۔ گندا نالا تو یہاں سے بہت فاصلے پر ہے۔"

جبار: "بالکل...... اسی سے اندازہ لگائیں۔ ارشاد صاحب نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ گینز بک کے ریکارڈ کے لیے اپلائی کریں۔ یہ دنیا کی سب سے لمبی نرسری ہے۔"

سیفی: "اوہو۔ اور...... چوڑی......؟"

جبار: "وہ دوسری ہے انڈونیشیا میں جو رقبے میں سب سے بڑی ہے۔ لیکن میاں گلزار...... مالک ہے...... کہتا ہے پہلے میرے دوسرے ریکارڈ لگوا دو......"

سیفی: "وہ کیا؟"

جبار: "ریکارڈز مشکوک ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہو گا گینز بک والے کتنی سخت چھان پھٹک کرتے ہیں۔"

سیفی: (گہری دلچسپی) "جی۔ جی۔ بالکل۔ ریکارڈز ہیں کیا؟...... پودوں کے بارے میں ہیں؟"

جبار: "جی بالکل۔ ایک تو میاں گلزار کہتا ہے کہ پوری دنیا میں صرف اُس کے پاس توے جیسا کالا گلاب ہے۔ اور دوسرا یہ کہ دنیا میں صرف اُس کے پاس گوشت خور پودوں کی پنیریاں ہیں۔ (راز دارانہ)...... ویسے کبھی وہ بتاتا ہے...... اُس کے ایسے دو پودے اصل میں آدم خور ہو چکے ہیں۔ ویسے یہ ریکارڈ کے لیے نہیں۔ آگے بات نہیں کرنی۔ یا کہ آپ ضرور کرنا چاہیں گے؟"

سیفی: "آ۔ نہیں۔ بالکل۔ نہیں...... نہیں۔"

ڈ کلوز شاٹ: گلزار نرسری میں۔ میاں گلزار پیلے رنگ کے پھولوں کے ایک پودے کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہا ہے۔ میاں گلزار کی عمر چالیس کے قریب ہے۔ نرسریوں کے عام مالکوں سے بہت مختلف گٹ اپ۔ پتلون۔ بش کوٹ۔ ہاتھوں میں شاخیں تراشنے کی ایک جدید قسم کی قینچی۔ نظر کی عینک لگاتا ہے۔ (کٹ بیک)۔

سیفی قہقہے لگا رہا ہے۔

ڈ شاٹ: "آدم خور پودوں کی پنیریاں...... What an idea"

سیفی: دونوں تنگ گلی کے سامنے پہنچ کر رک جاتے ہیں۔

"اندر جانا ہو گا۔"

جبار: "کدھر؟ یہ تو جھاڑیاں ہیں۔"

سیفی: "یہ جھاڑیاں نہیں جناب خفیہ...... خیر اتنا خفیہ بھی نہیں...... راستہ ہے۔ پچھلی سڑک

جبار: کو نکلتا ہے۔ اور اسی گلی میں تھوڑا آگے ایک چھوٹا سا دروازہ ہمارے کمپلیکس کے احاطے میں کھلتا ہے۔ ہوپ ہمیشہ اور میں کبھی کبھی اسے استعمال کرتا ہوں۔ اور آج آپ بھی کریں گے۔ میں دوکان کے سامنے دروازے سے اندر جانا نہیں چاہتا۔ خوامخواہ ارشاد صاحب لمبی انکوائری شروع کر دیں گے۔ ہوپ کو اُس کی خوشی فوراً ملنی چاہیے۔"

(سیفی کے چہرے پر ہچکچاہٹ لیکن پھر جبار کے پیچھے تنگ گلی میں گھس جاتا ہے)

دونوں پودوں کی شاخیں ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ عجیب عجیب رنگوں کے پھول اور کانٹے دار شاخیں۔ جبار ایک جگہ رک جاتا ہے اور احاطے کی دیوار میں ٹیلی ویژن فریم سے بنے دروازے کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔

جبار: (مسکراتے ہوئے) "چھوٹا سا دروازہ۔"

سیفی: (گھبراہٹ، حیرت) "آپ کا مطلب ہے...... اس میں سے...... یہ دروازہ ہے......؟"

جبار: "جی بالکل۔"

فریم کے اندر ہاتھ ڈال کر دوسری طرف کے دروازے کو کھولتا ہے۔ پھر اپنے

سارے لفافے، ڈبے۔ اور میگافون اندر ہاتھ ڈال کر دوسری طرف رکھتا ہے اور پھر زمین پر لیٹ کر سیفی کو اشارہ کرتا اور پہلے خود آسانی سے اندر رینگ جاتا ہے۔ سیفی کے چہرے پر بے چینی اور حیرت کے تاثرات۔ اچانک بینڈ پر ایک گانے کی دھن بلند ہوتی ہے۔ ''میرے سامنے والی کھڑکی میں اک چاند سا ٹکڑا رہتا ہے۔''

کلوز شاٹ: ایک بے تحاشا موٹے کتے کا چہرہ جو کسی آوٹ آف فریم شے کو دیکھ کر غرا رہا ہے۔ لیکن غرانے میں اپنائیت کا احساس ہے۔

Zoom in: جبار کا کتا ہوپ ایک موٹی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ جبار کچھ فاصلے پر کھڑا ٹیلی ویژن فریم دروازے کو منتظر نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مٹھائی کے ڈبے لفافے وغیرہ نیچے فرش پر رکھے ہیں۔ ہوپ مسلسل بے چینی سے بھونکتا ہے۔

جبار: ''Behave...... ہوپ...... بس...... خاموش۔ مہمان ہیں''۔

جبار شگاف کی طرف دیکھتا ہے۔ سیفی کا سر اندر جھانکتا نظر آتا ہے۔ چاروں طرف جائزہ لیتا ہے۔

پین شاٹ: سیفی کے POV سے احاطے کا پین شاٹ۔ مختلف کاٹھ کباڑ قسم کی چیزوں کے ڈھیر احاطے میں جا بجا پڑے نظر آتے ہیں۔ ان ڈھیروں کے بارے میں ایک عجیب بات جلد ہی سامنے آتی ہے کہ ایک ہی جیسی چیزوں کے چھوٹے بڑے کئی ڈھیر الگ الگ لگائے گئے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے ٹیلی ویژن سیٹوں کے مختلف جسامت کے چار ڈھیر نظر آتے ہیں۔ شراب کی خالی بوتلوں کے پانچ۔ ٹوٹے پھوٹے گیس ہیٹروں کے تین۔ اسی طرح ٹرانسسٹر ریڈیو۔ ٹیلی فون سیٹ۔ ٹین کے ڈبے، ٹرافیاں، فیکس مشینیں وغیرہ اسی طرح ڈھیروں کی صورت موجود ہیں۔

سیفی کو ''دروازے'' سے سر نکالتے دیکھ کر ہوپ بُری طرح مضطرب ہو کر بھونکنے لگتا ہے۔

جبار: ''ہوپ۔ ہوپ...... نہ کر۔ بس۔ بس مہمان ہیں...... ہوپ میں کہتا ہوں انسان بن...... بس...... تجھے ملنے آئے ہیں چندا۔ تیری خوشیوں میں شریک ہونے آئے ہیں۔''

ہوپ کے غیظ و غضب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جبار مایوسی سے سر ہلاتا ہے۔ پھر کس کر ایک تھپڑ اُس کے سر پر مارتا ہے۔ ہوپ چاؤں کی آواز نکال کر نیچے بیٹھ جاتا ہے اور

بے بھری نظروں سے جبار کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے دم ہلانے لگتا ہے۔

اسی دوران سیفی رینگتا ہوا احاطے میں نکل کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کپڑے جھاڑتا ہے اور حیرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔

پینا شاٹ: کباڑ کمپلیکس کی پچھلی لمبی دیوار سامنے آتی ہے جو تان سین بینڈ اور جم جم جم کے عقبی صحن نما حصوں کے درمیان مشترک ہے۔ کباڑ کمپلیکس کے احاطے میں کھڑے ہو کر بینڈ والوں کے ڈیرے اور جم کے پچھلے برآمدے —— کافی اونچے ہونے کی وجہ سے صاف نظر آتے ہیں۔ اور وہاں کھڑا کوئی شخص ان دونوں جگہوں میں ہونے والی کسی بھی سرگرمی کا بھرپور جائزہ لے سکتا ہے۔ احاطے کے کونے میں بنی دکان کے عقبی عرضی رُخ میں ایک دروازہ باہر احاطے میں کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ادھ کھلا ہے۔

ٹ شاٹ: سیفی کے POV سے بینڈ والوں کا برآمدہ۔ اندر کسی بڑے کمرے میں بینڈ کے بیشتر سازندے موجود ہیں لیکن شاید جگہ کی کمی کی وجہ سے ایک بہت بڑے پیتل کے باجے والے کو باہر برآمدے میں دروازے کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ دھن جاری ہے۔ میرے سامنے والی کھڑکی میں......

کٹ بیک ٹو سیفی۔ سیفی کی نظر مشترکہ دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتی بائیں طرف جاتی ہے۔

کلوز شاٹ: جم جم جم کے عقبی برآمدے میں ایک ویٹ اٹھانے کا بینچ پڑا ہے جس پر سعید کمال نامی ایک نوجوان باڈی بلڈر لیٹا بینچ پریس کی ورزش کر رہا ہے۔ کھڑا ہو کر مخصوص انداز میں اپنے بازوؤں کے مسلز کا جائزہ لینے لگتا ہے۔

ز شاٹ: کٹ بیک ٹو سیفی۔ اب جبار بھی سیفی کے قریب کھڑا ہے اور جم کے برآمدے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

جبار: ''بہت محنت کر رہا ہے یہ نوجوان لیکن اس کے Biceps نہیں بن رہے۔ (اونچی آواز میں ہانک لگاتے ہوئے) Biceps کا کیا حال ہے سعید کمال صاحب۔''

سعید کمال: (اونچی آواز) ''آ...... جبار صاحب۔ آج میرا Triceps۔ چھاتی کا دن ہے۔''

جبار: ''اہو۔ اچھا۔ اچھا...... کیسی چل رہی ہے ایکسر سائز؟''

سعید کمال: "بس جی بینچ پریس کے چار سیٹ کر لیے ہیں۔ اب ڈمبل فلائیز کے دو [illegible]
کرنے لگا ہوں۔"

جبار: "اچھا بیٹا۔ اللہ تمہاری آرزو پوری کرے۔"

سعید کمال ڈمبل اٹھاتا ہے۔ کٹ بیک ٹو جبار اینڈ سیفی۔

ادارتی نوٹ:

ممکن ہے باڈی بلڈر نوجوان کا نام واقعی سعید کمال رہا ہو یا بالکل مختلف ہو مگر انیلا۔ سیفی سکرین پلے میں اس کا نام سعید کمال ہی رکھا گیا۔ اور یہاں ہم بتاتے چلیں کہ اس سکرین پلے کے پہلے تیس منٹ کی خواندگی کے موقع پر سوانگ پروڈکشنز کی پہلی دھواں دھار میٹنگ میں جہاں دوسرے کئی معاملات وجہ تنازع (فساد) بنے وہاں اس نام کے استعمال پر بھی کافی ہنگامہ ہوا۔

جبار: (سیفی سے رازدارانہ انداز میں) "لیکن اللہ آرزو پوری کرے گا نہیں!"

سیفی: "وہ کیوں؟"

جبار: "خوراک۔ باڈی بلڈروں کے لیے امپورٹڈ خوراک آتی ہے۔ بیسیوں روپے کی روزانہ کھانی پڑتی ہے۔ یہ بے چارہ غریب بچہ ہے۔ افورڈ نہیں کر سکتا۔ یہ پیچھے ساری بستیاں غریبوں کی ہیں۔"

سیفی: "غریب ہے تو اتنا مہنگا شوق کیوں پالا ہوا ہے۔"

جبار: "سر اب شوق تو شوق ہے...... ایک دن بے چارہ میرے ساتھ رونا رو رہا تھا۔ جبار انکل امپورٹڈ پروٹین پاؤڈر بڑا مہنگا ہے۔ ارشاد صاحب سے کہو اپنے سائنسدانوں کی توجہ اس طرف دلائیں۔ غریب باڈی بلڈروں کے لیے لوکل سستی خوراک ایجاد کریں۔ کل ہم بھی مسٹر ورلڈ بن کر ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ کہتا ہے کہ باڈی بلڈنگ اب ایک سائنس بن چکی ہے۔"

سیفی: "جی۔ اور جیسے ہی کوئی چیز سائنس بنی ہمارے بس سے باہر ہوگئی...... لیکن یہ آپ کے ارشاد صاحب۔ ان کا سائنس دانوں سے بھی کوئی تعلق ہے۔"

جبار: "ارشاد صاحب کہتے ہیں کباڑ کمپلیکس کا تعلق کس شخص سے نہیں ہے؟ دنیا کے کس شخص، گھر، ادارے، ثقافت بلکہ وہ تو کہتے ہیں تہذیب کا روی سے کباڑ سے تعلق نہیں۔ تو جناب سائنس کے پروفیسر بھی کچھ نہ کچھ کباڑ بیچنے لے ہی آتے ہیں۔ ہم کسی کو انکار نہیں کرتے۔ لیکن ہم کن باتوں میں پڑ گئے۔ اصل بات تو رہ ہی گئی۔"

سیفی: "جی۔ بالکل۔ آپ...... میرا آپ سے سوال تھا...... آپ...... وہ...... "عظیم نجات دہندوں" سے نجات کی خوشی میں بانٹی گئی مٹھائیاں...... جو اس دفعہ کی نجات کی آپ اکٹھی کر رہے تھے...... میرا یہ سوال تھا آپ اُسے محفوظ کیسے کرتے ہیں۔ آپ تو Collector ہیں۔"

جبار: (چہرے پر شرارت) "اور میرا جواب اُس وقت بھلا کیا تھا...... یاد ہے؟"

سیفی: "جی...... آپ نے کہا تھا...... آپ نے نایاب خوردنی اشیا محفوظ کرنے کے لیے ایک قدرتی نظام بنا رکھا ہے۔ کچھ اس قسم کی بات کی تھی آپ نے......"

جبار ڈرامائی انداز میں ہوپ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

جبار: "یہ ہے وہ قدرتی نظام۔"

ہوپ اپنے لیے اشارہ سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بے چینی سے مٹھائی کے لفافوں اور ڈبوں پر جھپٹنا چاہتا ہے۔ سیفی پہلی بار کتے کا ڈیل ڈول دیکھتا ہے۔ حیرت سے اس کا منہ کھل جاتا ہے۔ ایک نظر کتے پر اور پھر مٹھائی کے لفافوں پر اور پھر جیسے بات اُس کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ چہرے پر حیرت کی بجائے مسکراہٹ پھیلتی ہے۔

سیفی: "آپ کا مطلب ہے یہ سب کچھ اِدھر......"

جبار: "جی...... بالکل......"

(سیفی قہقہے لگانے لگتا ہے۔ اچانک بینڈ والوں کی دھن بدلتی ہے......)

"اس لیے تجھ سے میں پیار کروں...... کہ تو اک بادل آوارہ۔"

مٹھائی کے ڈبوں کو دیکھ کر اور شدید مضطرب ہو کر ہوپ پھر بھونکنے لگتا ہے۔

جبار: "صبر۔ ہوپ۔ صبر۔ مہمان سے بات کر رہا ہوں۔ بے صبرا نہ بن، یہ چار پانچ کلو تو نے ہی ہڑپ کرنی ہے...... میں کہتا ہوں انسان بن......"

سیفی: "چار پانچ کلو...... اسی لیے...... اور...... میں نے اتنا بے تحاشہ موٹا یہ جانور نہیں دیکھا...... یہ صحت اسی لیے ہے...... کمال ہے۔"

(پھر قہقہے لگاتا ہے)

جبار: "اس کا نام ہوپ ہے یہ ابھی بچہ ہی تھا کہ میں نے اِسے انسانوں کی ہر ممکن خوشی میں شریک کرنا شروع کر دیا۔ اب میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے جسم کا ہر ریشہ کسی نہ کسی انسانی خوشی سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی ہر ایسی انسانی خوشی جس کے نتیجے میں خوراک تباہ ہوتی ہے۔"

سیفی: (مٹھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "لیکن یہ خوشی تو برسوں بعد ملتی ہے۔"

جبار: "جی بالکل۔ لیکن میں نے عرض کیا نا کہ خوشیاں بے تحاشہ ہیں جن میں اعلیٰ خوراک کباڑ میں بدلتی ہے اور جس کے لیے کباڑ کمپلیکس بالکل حاضر ہے۔ شادیاں، سالگرہیں، ختنے، تقریبات، پارٹیاں وغیرہ وغیرہ...... شہر کے Caterers سے جان پہچان ہے۔ اس کے علاوہ اپنی فطری، وحشیانہ خوراک، کچا گوشت بھی گاہے بگاہے کھاتا ہے اور پھر اس بے چارے کی ضرورت ہی کتنی ہے۔"

سیفی: "نہیں ضرورت تو خیر کافی لگتی ہے۔ آپ اسے جم جم جم کیوں جائن نہیں کروا دیتے۔"

(دونوں ہنستے ہیں۔ گرج چمک شدت اختیار کر جاتی ہے اور موٹی موٹی بوندیں ٹین کی چھت پر تڑ تڑ گرنے لگتی ہیں)

ٹو شاٹ: جم جم جم کا برآمدہ۔ سعید کمال ڈمبل کر رہا ہے۔ بارش کی آواز سن کر ڈمبل ایک طرف رکھتا ہے برآمدے سے باہر کی طرف بڑھتا ہے۔ بارش کی بوندیں اس کے جسم پر پڑتی ہیں۔ وہیں ٹھٹھک کر رُک جاتا ہے۔

کلوز شاٹ: سعید کمال باڈی بلڈرز کے مخصوص انداز میں اپنے Biceps دیکھ رہا ہے۔ بارش کے قطرے مسلز کے ابھار پر گرتے نظر آتے ہیں۔

ٹو شاٹ کٹ بیک ٹو احاطہ۔ ہوپ پھر شدید بے چینی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

جبار: "میرا خیال ہے مجھے اب اُسے آج کی قیمتی تاریخی خوراک ڈال دینی چاہیے ورنہ یہ بالکل ہوپ لیس ہو جائے گا۔ بس...... بس...... ہوپ...... بس۔ بس چندا۔ بس......"

کلوز شاٹ: سعید کمال بازو کے ابھرے ہوئے مسلز پر گرے بارش کے قطروں کو دیکھ رہا ہے پھر زبان نکال کر ایک قطرہ چکھتا ہے اور پھر اُسے چاٹ لیتا ہے۔ ہنستا ہے۔ پھر زبان دوسرے قطروں کی طرف بڑھاتا ہے۔

سلوموشن شاٹ: زبان سلوموشن میں منہ سے نکل کر قطروں کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ٹو شاٹ کٹ بیک ٹو احاطہ

جبار: "میں اندر سے کچھ ردی اخبار لاؤں۔ مٹھائی ڈالنے کے لیے...... ارشاد صاحب سے نظر بچا کر...... ابھی آیا......"

جبار دکان کے عقبی ادھ کُھلے دروازے کی طرف جاتا ہے۔

سلوموشن شاٹ: Biceps پر سے بارش کے قطروں کو چاٹنے کا کلوز۔ سعید کمال کے چہرے پر اور آنکھوں میں لذت کی ایسی کیفیت جو جنسی لذت سے مشابہت رکھتی ہے۔

ٹو شاٹ کٹ بیک ٹو احاطہ۔

فرش پر ایک جگہ اخباروں کی ردی بچھی ہے جس پر مٹھائی کا ایک ڈھیر لگا ہے۔ ہوپ تیزی سے ہڑپ کر رہا ہے۔ کھاتے وقت اُس کے منہ سے غُوں غُوں کی آوازیں نکل رہی ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس خوراک سے بے حد لطف اندوز ہو رہا ہے۔

جبار اور سیفی اس کی طرف بھرپور توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔

سیفی: "مجھے لگتا ہے "عظیم نجات دہندہ" سے نجات کی جتنی خوشی اسے ہو رہی ہے شاید ہی کسی کو ہوئی ہو گی۔"

یک دم دکان کا عقبی دروازہ جو اب تک بند تھا دھڑاک کی آواز سے کھلتا ہے اور ارشاد کباڑیا دروازے میں کھڑا نظر آتا ہے۔ احاطے کے منظر کا جائزہ لیتا ہے۔

ادارتی نوٹ

اتیلا۔ سیفی سکرین پلے میں ارشاد کباڑیے کا جسمانی حلیہ تقریباً وہی ہے جو سکرین پلے
دیکھا لیکن انہوں نے اُسے ایک گول شیشوں والی عینک لگوا دی ہے اور اُس کی ڈھیلی ڈھالی نیلی
پتلون اور براؤن ٹی شرٹ کے اوپر ایک سفید ایپرن پہنا دیا ہے۔ پہلے تیس منٹ کے اس
سکرین پلے کی پہلی خواندگی کے موقع پر ڈائریکٹر سعید کمال نے ارشاد کے اس حلیے پر بھی
اعتراض کیا تھا کہ کباڑیے ایسے نہیں ہوتے۔ اس کی تفصیل بھی آگے آئے گی۔

ارشاد یک دم تیزی سے اُس طرف بڑھتا ہے جہاں ہوپ مٹھائی ہڑپ کر رہا ہے
اور جبار اور سیفی قریب کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ سیفی متوجہ ہوتا ہے ارشاد کو متجسس اور پھر جبار کو
سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ جبار کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات ابھرتے ہیں۔

سیفی: (سرگوشی میں) "ارشاد صاحب......؟"

جبار: "وہی ہیں۔ (بڑبڑاتا ہے)......اب پتہ نہیں کیا افتاد پڑی ہے۔"

سیفی کے چہرے پر کچھ نہ سمجھ پانے کے تاثرات۔ لیکن ایک طرح کی Excitement۔

جبار: (ارشاد سے مخاطب) "جی......ارشاد صاحب؟"

ارشاد کچھ کہے بغیر تیزی سے آگے بڑھ کر ہوپ کے قریب اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور
زمین پر بچھے اخبارات کے کونے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے جیسے کچھ چیک کر رہا ہو۔ ہوپ اس
مداخلت پر ناخوش نظر آتا ہے۔

جبار: (زیادہ ناخوشگوار لہجے میں) "جی......ارشاد بھائی......؟"

ارشاد قدرے مطمئن نظر آتا ہے۔ اور اٹھ جاتا ہے۔

ارشاد: "نہیں یہ دوسرے ہیں۔ مجھے شک پڑا تھا تو لپ کے دنوں کے اٹھا لایا ہے۔"

جبار: (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) "ارشاد صاحب آپ آخر مجھے کیا سمجھتے ہیں؟"

ارشاد: "جبار جمع کار۔ سفری نمائندہ کباڑ کمپلیکس (یک دم سیفی سے مخاطب ہو کر) آپ
جناب "جمع کار" پر چونکیں نہیں۔ ہمیں Collector کا ترجمہ نہیں ملا تھا ہم نے اپنا
بنا لیا۔ اور اب اس بات پر بھی نہ چونکیں کہ کباڑیے تو اس طرح کی باتیں نہیں

کرتے۔ جبار کی باتیں تو اب تک آپ کافی سن ہی چکے ہوں گے۔ کہاں سے لگتا
ہے یہ کسی کباڑیے کا اسسٹنٹ۔"

جبار: (احتجاج) "میں اسسٹنٹ نہیں ہوں۔ میں برابر کا حصے دار ہوں۔ برابر کا کارکن
ہوں۔"

ارشاد: "چلو ہم دونوں ایک دوسرے کے اسسٹنٹ ہیں۔ اب خوش ہے؟"

جبار: "کوئی خاص نہیں۔"

ارشاد: "دراصل ہم اپنے ہم پیشہ بھائی بندوں سے تھوڑا سا زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ پھر
کہوں گا "تھوڑا سا۔" پندرہ سال پہلے ہم ایک دفتر میں کام کرتے تھے وہاں بھی
ہمارا شعبہ ردی اور کباڑ ہی تھا۔ ایک پرانے تاریخی ریکارڈز جیسا محکمہ تھا۔
Archives بولتے ہیں جسے۔ اصل نام نہیں بتاؤں گا۔ یا کہ آپ ضرور پوچھنا
چاہتے ہیں؟"

سیفی: "نہیں۔ نہیں......نہیں......کوئی نہیں......کوئی ضرورت نہیں۔"

پینڈ والوں کی دھن بدلتی ہے۔

"اے دل مجھے بتا دے تو کس پہ آ گیا ہے
وہ کون ہے جو آ کر خوابوں پہ چھا گیا ہے"

ارشاد: (قہقہہ) "ایک دن سوچا کیوں نہ اپنا ہی کھول لیں۔ کھول لیا۔"

سیفی: "بہت دلچسپ جگہ ہے۔"

ارشاد: "خیر ابھی تو آپ نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کباڑ
کمپلیکس کم از کم دلچسپ ضرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ کیا ہے۔ یہ پہچاننا اپنی اپنی
سمجھ کی بات ہے۔"

جبار: (ابھی تک پیچ و تاب کھا رہا ہے) "یعنی میں یہ بھی نہیں پہچان سکتا کہ یہ اخبار 29
فروریوں کے ہیں یا بالکل ردی ہیں۔"

ارشاد: "اب یہیں پر تیری پکڑ ہو جاتی ہے۔ "بالکل ردی ہیں" کباڑ کمپلیکس میں یہ بول
بولنا کفر ہے۔ (اک دم گھوم جاتا ہے) یہ ٹوٹے پھوٹے TV جنہیں مالکوں نے خود

توڑ دیا اس لیے کہ جو مناظر یہ دکھا رہے تھے وہ مناظر وہ مزید دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کہو یہ ردی ہیں۔ یہ گیس کے چولہے جن کے ساتھ تین عورتوں کو جلا کر قتل کیا گیا۔ کہو یہ ردی ہیں کباڑ ہیں۔ یہ ٹوٹی عینکیں جنہیں پہننے والے اب مکمل اندھے ہو چکے ہیں۔ انہیں تو کیا ردی کہے گا۔ اور یہ شیونگ برش جن کے سب مالک شاعر تھے لیکن پھر انہوں نے داڑھیاں رکھ لیں۔ کہو یہ کباڑ ہیں۔ ردی ہیں۔ کہو۔ کہو۔۔۔''

جبار: ''نہیں کہتا۔ نہیں کہوں گا۔ جاؤ نہیں کہتا۔''

ارشاد: ''شاباش۔ کہنا بھی نہ...... لیکن آج...... اصل میں قصور تیرا بھی نہیں۔ آج تیرا دن ہے۔ تو جذباتی ہو رہا ہے۔ (یک دم موڈ بدل کر سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔ قہقہہ لگاتا ہے)...... ہمارا چلتا رہتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔''

سیفی: ''جج۔ جی۔ جی......''

ارشاد: ''جناب ہمارا ماٹو یہ ہے کہ ''ردی میں بک جانے والی ہر چیز ردی نہیں ہوتی'' اور اسی سے نکلتا ہے دوسرا نتیجہ ''دنیا کی کوئی بھی چیز بالکل ردی نہیں ہوتی۔''

سیفی: (حیرت سے چاروں طرف مختلف کاٹھ کباڑ کے ڈھیر دیکھتے ہوئے) ''یہ سب واقعی...... جو آپ نے......''

ارشاد: ''جی بالکل جو میں نے کہا...... ''ردی چیز'' (دونوں ہاتھ کی انگلیوں سے Quotes کے اشارے کرتا ہے۔) ''جب کسی Category میں شامل ہو جاتی ہے تو ردی نہیں رہتی۔ اور Categories لامحدود ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں گے نیچے تہہ خانے میں...... (جبار سے مخاطب ہوتا ہے) اور اس معصوم سے کہہ اب بس کرے۔ اتنی زیادہ انسانی خوشیاں اور وہ بھی اس قسم کی یہ یک دم ہڑپ کر گیا تو اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔''

جبار: ''ہوپ۔ بچے اب بس کر۔ یہ تیرا ہی ہے۔ ایسا ہی پڑا رہے گا۔ میں ویسے شام کو بھی نکلوں گا۔ سنا ہے دیگیں پک رہی ہیں۔ خوشیاں ہی خوشیاں ہیں چندا۔''

(ہوپ کی زنجیر گلے سے کھول دیتا ہے۔ ہوپ سست رفتاری سے چلتا ہوا ایک طرف جا کر بیٹھ جاتا ہے)

جبار: (تختی سے) ''نہ۔ نہ۔ نہ...... میں نے تمہیں اس لیے نہیں کھولا تو جا کر پس کر کے ادھر بیٹھ جائے۔ اتنا کولیسٹرول اندر ڈالا ہے تو نے۔ باہر نکل۔ ہضم کر۔ گلزار زسری جا۔ اُدھر کہیں مناسب جگہ دیکھ کر جو تو نے کرنا ہے کر۔ گھوم پھر۔ اپنے دوستوں سے ل۔ وہ جو کالے کانوں والا ہے۔ پھر وہ بھورے رنگ کا شکو جو تجھ پر رشک کرتا ہے۔ اور پھر وہ چوکھیا جو ہر وقت نشے میں غرق رہتا ہے۔''

ارشاد: (سرگوشی سیفی سے) ''جبار کا خیال ہے کتے بھی نشہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا ثابت کر دے حیوانی سائنس میں انقلاب آجائے گا۔''

سیفی: ''پھر۔''

ارشاد: ''کہنے لگا مجھے انقلاب پسند نہیں۔ ویسے بات ٹھیک ہی ہے۔ ہمارے ہاں انقلاب بس ایسے ہی آتے ہیں جیسا کل رات آیا......''

سیفی: ''نہیں وہ تو خیر ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات'' (ہنستا ہے۔ ارشاد بھی قہقہے لگاتا ہے)

ارشاد: ''ہاں یہ ایسے موقعوں پر اس کا خاص فقرہ ہے۔''

سیفی: ''تو کیا ہم سمجھیں جبار صاحب کسی اعتبار سے Status Quo کے بندے ہیں۔''

اسی دوران جبار ہوپ کو کان سے پکڑ کر کھینچتا دھکیلتا TV فریم کے دروازے کی راہ سے باہر جانے پر مجبور کر چکا ہے۔

جبار: ''چل۔ چل...... آؤٹ...... باہر...... چلو......''

سیفی اور ارشاد کی گفتگو کے دوران یہ صورتحال Inter cutting میں سامنے آتی ہے۔

ارشاد: (پراسرار لہجے میں) ''جبار دراصل Establishment کا بندہ ہے۔''

سیفی: (آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں) ''واقعی؟......''

ارشاد سیفی کی حیرت دیکھ کر قہقہے لگانے لگتا ہے۔

ارشاد: ''یہ بڑے بڑے خوفناک لفظ بڑے لوگوں کے کھیل ہیں جناب Establishment, Status quo ہم تو صرف اپنے زندگی بھر کے خواب کی تکمیل، تعبیر چاہتے ہیں۔''

(جبار واپس قریب آچکا ہے۔ اور ارشاد کی بات سن لیتا ہے)

جبار: ''زندگی بھر کے خواب تماشے کی تکمیل۔ اور خواب تماشے کی تعبیر بھی خواب تماشا

ہوتی ہے۔"

ارشاد: (سیفی سے رازدارانہ لہجہ) "ایم۔اے اردو کیا ہوا ہے......اس کا قصور نہیں۔"

سیفی: (مسکراتا ہے۔ پھر حیرت سے) "واہ......"

ارشاد: "ہاں...... آپ پھر حیران ہو رہے ہیں۔ کباڑیے کے لیے جاہل ہونا ضروری ہے۔ آپ دراصل اس پاپولر Belief کو مانتے ہیں۔"

سیفی: (شرمندگی) "ن۔ نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... آ...... آپ بھی......"

ارشاد: (ہنستا ہے) "چھوڑیں...... "There are more things in heaven and earth, Horatio, than are dreamt of in your philosophy."

جبار: "ہیملٹ ایکٹ ون۔ سین فائیو"...... آگے آپ یہ بھی تو کہا کرتے ہیں ارشاد صاحب۔ لیکن میرا خیال ہے (سیفی کو آنکھ مارتے ہوئے) یہ صاحب آپ کے ان شعبدوں سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔"

ادارتی نوٹ

انیلا۔ سیفی سکرین پلے کی خواندگی (انیلا پڑھ کر سنا رہی تھی) کے اس مرحلے پر ڈائریکٹر سوانگ پروڈکشنز سعید کمال نے یک دم منہ سے ایک زوردار "ہا" کی آواز نکالی (یہ آواز سعید کمال کبھی کبھی اپنے ...F لفظ کی بجائے تنفر آمیز حیرت کے اظہار کے لیے استعمال کرتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ سعید کمال اس آواز کی پرفارمنس میں شرلاک ہومز کا کردار ادا کرنے والے برطانوی ایکٹر جیرمی بریٹ کے سٹائل کی نقل کرتا تھا لیکن ہر بار ناکام رہتا تھا۔ ظاہر ہے اُس کی ان ننھی مُنی ذاتی ناکامیوں کے بارے میں ہمارے علاوہ کوئی نہیں جانتا)...... اور بُری طرح شور مچا دیا۔

"یہ آؤٹ آف کریکٹر ہے۔ او مائی گاڈ یہ بالکل آؤٹ آف کریکٹر ہے۔ کباڑیا اور اُس کا نمبر تو دونوں آؤٹ آف کریکٹر ہیں۔"

خواندگی کے بعد ہونے والی دھواں دھار میٹنگ میں کسی کریکٹر کے آؤٹ آف

کریکٹر ہونے پر بھی زبردست بحث ہوئی۔ انیلا اور سیفی نے اپنے دفاع میں کیا موقف اختیار کیا۔ یہ ساری صورتحال آگے چل کر واضح ہوگی۔

سیفی: "نہیں جناب میں ویسے ہی بے حد متاثر ہوں۔ مجھے یقین ہے یہاں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو ہوریشیو کے فلسفے میں نہیں آ سکتیں۔ آپ...... آپ اپنے خواب کی بات کر رہے تھے......"

(بارش یک دم رک جاتی ہے۔ اور ٹین کی چھت سے آنے والا شور بند ہونے سے اچانک خاموشی چھا جاتی ہے)

ارشاد: جم میں سعید کمال کپڑے بدل چکا ہے اور جانے والا ہے۔ احاطے کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: (بلند آواز میں ہانک لگاتے ہوئے) "ارشاد صاحب...... میں نے پہلے جبار انکل سے بھی Request کی تھی۔ اپنے سائنسدانوں سے کہیں ملک کے غریب باڈی بلڈرز کے لیے سستا پروٹین پاؤڈر ایجاد کریں۔ Whey, Glautamine اور باقی سب...... میرا Bicep نہیں بن رہا......"

ارشاد: (ویسی ہی بلند آواز) "ضرور بات کریں گے۔ لیکن تیرا Bicep ابھی کتنا بنا ہے؟"

سعید کمال: "تیرہ اعشاریہ دو انچ...... سر......"

ارشاد: "ہاں تو گینز بک کا ریکارڈ اٹھائیس انچ ہے...... تو ایسا کر تو جوان دنیا کا سب سے چھوٹا Bicep بنا لے......"

(سیفی ہنستا ہے)

(اچانک بینڈ پر دھن شروع ہو جاتی ہے۔)

بمبئی سے آیا میرا دوست

دوست کو سالام کرو

رات کو کھاؤ پیو

دن کو آرام کرو

ارشاد: ''نہیں۔ نہیں۔ یہ تو مذاق تھا۔ بات کریں گے۔ ضرور بات کریں گے سائنسدانوں سے۔ غریب باڈی بلڈروں کے لیے سستا پروٹین پاؤڈر ایجاد کریں۔ تو فکر نہ کرو سعید کمال۔ بس ورزش میں کوتاہی نہ کرنا......''

جبار: (کسی سوچ میں۔ پھر فکرمندی سے بڑبڑاتا ہے) ''مجھے ہوپ کی فکر لگ گئی ہے۔ اتنی بارش میں اُسے باہر نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ ہر طرف پانی پھیلا ہوا ہے اور نیچے گڑھے نظر نہیں آتے......''

سیفی: ''خیر چھوٹے موٹے گڑھے میں گرنے والی تو وہ چیز ہے نہیں۔''

جبار: (غمناک لہجے میں) ''سیفی صاحب تقدیر کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ تقدیر بڑی ظالم چیز ہے۔'' (ارشاد سعید کمال کو جاتے دیکھتا ہے۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر واپس جبار اور سیفی کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

ارشاد: ''ہاں...... واقعی تقدیر بڑی ظالم چیز ہے۔ ہمیں دیکھو معاشرے میں باعزت مقامات کو لاتیں مار کر ساری عمر کباڑ خانے سے عجائب خانہ برآمد کرنے میں گزار دی۔ لیکن جیسا بننا چاہیے ویسا بنا نہیں اب تک۔ جیسے سعید کمال کا Bicep نہیں بن رہا۔ کہتا ہے سائنسدانوں سے بات کریں......''

سیفی: ''تو آپ کریں نا، بات۔ بے چارے کا مسئلہ حل ہو جائے......''

ارشاد: ''میرے پاس آج کل کوئی فوڈ ٹیکنالوجسٹ۔ کوئی بائیو کیمسٹ کوئی Geniticist آ نہیں رہا۔ ایک پروفیسر آ تو رہا ہے بلکہ اب ہمارے پاس ہی ہے۔ لیکن وہ بے چارہ کوئی سوشل سائنٹسٹ ہے اور مسلسل ایک ہی بات کرتا ہے کہ اگر ہم نے دنیا میں غلبہ حاصل کرنا ہے تو ہمیں دن رات محنت کر کے سائنس اور ٹیکنالوجی میں سب سے آگے نکلنا ہو گا۔ ایجادات اور دریافتیں کرنا ہوں گی۔ ہر وقت اسی قسم کی باتیں کرتا پھرتا ہے بے چارہ...... پروفیسر صفدر سلطان......''

ادارتی نوٹ

یہاں پھر سعید کمال نے 'ہا' کہہ کر نہ صرف کباڑیا بڑی طرح آؤٹ آف کریکٹر ہے کا شور مچایا بلکہ یہ بھی کہا کہ یہ Sequence اس قدر طویل ہو گیا ہے کہ ناظرین (اگر کوئی ناظرین ہوئے تو) گندے انڈے اور ٹماٹر پھینکنے لگیں گے۔ اُس نے انیلا کو سکرین پلے کی خواندگی فوری طور پر ختم کرنے کا حکم بھی دیا لیکن صفدر سلطان کی عاشقانہ مداخلت اور خود انیلا کی شدید مزاحمت کی وجہ سے خواندگی جاری رہی۔

سیفی: ''تو ٹھیک تو کہتے ہیں یہ کوئی پروفیسر صاحب۔ اس میں بے چارہ ہونے کی کیا بات ہے۔''

ارشاد: ''نہیں وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب اُن کی بات کوئی سُنتا نہیں۔ دوسرے پروفیسر بھی سُننے کو تیار نہیں۔ لیکن ہم نے انہیں اپنے عجائب خانے میں جاب دے دی ہے۔ ہمارے لیے کام کر رہے ہیں۔''

سیفی: ''اوہو۔ واقعی کیا کام؟''

ارشاد: ''انہوں نے خود ایک مشین ایجاد کرنی شروع کر دی ہے۔''

سیفی: ''او...... کیسی مشین؟''

جبار: (یک دم ڈرامائی لہجے میں مداخلت کرتے ہوئے) ''جنات کی طاقت سے بجلی پیدا کرنے کی مشین...... ہو۔ ہو۔ ہا...... ہا......''

ارشاد: ''اور وہ کہتے ہیں پروفیسر صفدر سلطان...... جبار کیا لفظ بولتے ہیں...... ٹرمیں......'' (جبار لاتعلقی سے کندھے اچکاتا ہے پھر اپنی پریشانی میں)

جبار: (بڑبڑانے کے انداز میں) ''مجھے خطرہ ہے وہ کالے کانوں والا اُسے گندے نالے کی طرف نہ لے جائے...... میں کتوں میں ہم جنسیت کے امکان کو بالکل رد نہیں کرتا۔''

ارشاد: (یاد آتا ہے) ''ہاں...... وہ کہتے ہیں یہ مشین خالصتاً ہماری اپنی ٹیکنالوجی ہو گی۔ دیسی بلکہ تہذیبی خرد افروزی ہو گی......''

سیفی: (افسوس سے) ''اوہو سمجھا...... آپ کا مطلب ہے......'' (کانوں کے گرد انگلی

گھماتا ہے)

ارشاد: ''آ......نہیں...... یہ کہنا میرے لیے ناممکن ہے......لوگ ہماری باتیں سن کر بھی۔ کباڑ کمپلیکس کا حال سن کر بھی......سر کے قریب اپنی انگلی گھمانے لگتے ہیں۔''

مڈ شاٹ: ایک پرشکوہ ڈرائنگ ڈائننگ روم۔ لمبی ڈائننگ ٹیبل پر انواع واقسام کے کھانے۔ خاص طور پر گوشت سے بنی ڈشیں۔ تین چار مرغ مسلم۔ چانپیں۔ بکرے کی ران وغیرہ۔ ایک دروازے میں سعید کمال نظر آتا ہے ٹی شرٹ پتلون پہنے ہوئے ہے۔ بازوؤں اور سینے کے مسلز نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ فاتحانہ انداز میں میز کی طرف بڑھتا ہے۔ کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ مسکراتا ہے اور مرغے کی ٹانگ اٹھا کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ اچانک چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات نمودار ہوتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے تھوک دے گا۔ Dissolve۔

مڈ شاٹ: سعید کمال اپنے گھر میں۔ نچلے طبقے کے گھر کا باورچی خانہ۔ فرش پر دری بچھی ہے۔ سعید کمال۔ اُس کا چھوٹا بھائی۔ بڑی بہن۔ ماں اور باپ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ سعید بُرا سا منہ بنائے ہاتھ میں پکڑے نوالے کو دیکھ رہا ہے۔ باپ کڑی نظروں سے دیکھتا ہے۔

باپ: ''کیوں کیا ہوا؟''

سعید کمال: ''کچھ نہیں......''

کٹ

کلوز شاٹ: ایک پیلے رنگ کا گھنٹی کی شکل کا پھول جس پر سرخ دھبے ہیں۔ Zoom out پورا پودا سامنے آتا ہے جس کی شاخوں پر ایسے ہی کئی پھول لگے ہوئے ہیں۔ چار کتے قریب پھر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہوپ ہے ایک کالے کانوں والا تیسرا ایک ڈانواں ڈول سا۔ اور چوتھا بھورے رنگ کا منخنی سا۔

پین شاٹ: گلزار نرسری کا اندرونی منظر سامنے آتا ہے۔ بلاشبہ ایک زبردست نرسری ہے۔ پھول دار، موسمی، سدا بہار، بیل دار، آرائشی، آبی، صحرائی، غرض ہر قسم کے پودے بہترین انداز میں ترتیب سے رکھے ہیں۔ لیکن پیلے رنگ کے وہ پھول دار پودے

ایک دور افتادہ گوشے میں اُگے ہوئے ہیں۔ پودوں کے گرد خاردار تاریں لگائی گئی ہیں۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے۔ ایک طرف کھاد کا گڑھا ہے اور قریب ہی ایک بیرونی دیوار ہے جس کے ساتھ پانی کے موٹے پائپ کہیں نیچے ڈھلوان کی طرف اترتے نظر آتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ ڈھلوان کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ میاں گلزار اور ایک ملازم۔ میاں گلزار ملازم کو ایک شاپر تھما رہا ہے۔ جس میں گوشت کے ٹکڑے ہیں۔

میاں گلزار: ''ہر پودے کے پھول میں ایک ایک ٹکڑا گوشت۔ سائز ٹھیک ہے نا......''

ملازم: ''جی میاں صاحب......''

میاں گلزار: ''اور اُن دو پودوں سے ذرا بچ بچا کر احتیاط سے۔''

ملازم: ''جی سر۔ احتیاط سے۔''

کٹ

پیلے رنگ کے پھول۔ ہوپ قریب ہی پھر رہا ہے۔

کٹ

ملازم شاپنگ بیگ ہاتھ میں لٹکائے آ رہا ہے۔

کٹ

ٹریکنگ شاٹ: ملازم کے POV سے آگے بڑھتے ہوئے۔ ٹیڑھے میڑھے رستے پر سے گزرتے ہوئے۔ کنول کے پھولوں کا ایک تالاب نظر آتا ہے۔ جس کے درمیان ایک مجسمہ...... ایک نیم برہنہ عورت غسل کر رہی ہے۔ پھر کیکٹس کا باغ۔ عجیب و غریب قسموں کے کیکٹس۔ ملازم خاردار تاروں کو ایک طرف سے ہٹا کر اُس گوشے کی طرف بڑھتا ہے جہاں ہوپ اور اُس کے ساتھی پھر رہے ہیں۔ ملازم قریب پہنچتا ہے تو کتوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔

دور کہیں سے بینڈ کی موسیقی انتہائی مدہم سنائی دیتی ہے۔ لیکن دھن پہچانی جاتی ہے بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔

کتے ملازم کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ سے گوشت کی بُو پا کر بتدریج جارحانہ انداز

اختیار کرنے لگتے ہیں۔ صرف ہوپ سُست روی اور لاتعلقی کا انداز اختیار کرتا ہے۔ کالے کانوں والا بہت وحشی ہونے لگتا ہے۔

ملازم پیلے پھولوں والے پودے کی طرف بڑھتا ہے تو یہ کتا دانت نکال کر غراتا ہوا اُس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی اثنا میں ہوپ پیلے پھولوں والے پودے کے نیچے جا کر لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ملازم الٹے قدم واپس جاتا ہے جیسے واپس جا کر کوئی ڈنڈا وغیرہ لانا چاہتا ہو۔

ملازم پلٹ جاتا ہے۔ ہوپ کی آنکھیں بدستور بند ہیں۔ اچانک ایک حیرت انگیز منظر سامنے آتا ہے۔ پودے سے پھولوں کی کئی ٹہنیاں آہستہ آہستہ ہوپ کے جسم پر اترنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور پھول جیسے اُس کے جسم کی کھال سے چپکنے لگتے ہیں۔

یک دم تینوں کتے واپس جاتے ملازم کی طرف بھاگتے ہیں اور پیچھے سے اُس کے ہاتھ میں لٹکتے شاپنگ بیگ پر حملہ کر دیتے ہیں...... چیخم دھاڑ۔ ملازم کی چیخیں۔ لفافہ گر جاتا ہے۔ کالے کانوں والا کتا ملازم کی ٹانگ پر کاٹتا ہے۔ باقی لفافہ پھاڑ دیتے ہیں۔ اور گوشت کھانے لگتے ہیں۔ ملازم بھاگ جاتا ہے۔

کلوز شاٹ۔ ہوپ کی آنکھیں بدستور بند ہیں۔ بے شمار پھول اس کے جسم سے چپک چکے ہیں۔ پھولوں کے رنگ سرخ ہو رہے ہیں۔ بعض جگہوں سے خون کی پتلی لکیریں بہہ رہی ہیں۔

بہارو پھول برساؤ کی دھن پھر سنائی دیتی ہے۔

کٹ

مڈ شاٹ: کباڑ کمپلیکس کے احاطے میں۔ بینڈ کی یہی دھن یک دم بلند ہو جاتی ہے۔ ارشاد۔ سیفی اور جبار اُس جگہ کھڑے ہیں جہاں سے سیڑھیاں نیچے تہہ خانے میں اترتی ہیں۔ کیمرہ کباڑ کمپلیکس کے بورڈ پر چارج کرتا ہے۔

ارشاد اور سیفی کی گفتگو جاری ہے۔

ٹو شاٹ: سیفی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات۔ جبکہ ارشادِ مضحکہ اڑانے والے انداز میں اُسے دیکھ رہا ہے۔

"حیرت انگیز کہانی ہے پروفیسر صاحب کی۔"

سیفی: "ہاں جی...... اور اب پروفیسر صفدر سلطان صاحب نے یہ مشین ڈیزائن کرنی شروع کر دی ہے جو جنات کی طاقت سے بجلی پیدا کرے گی۔ ادھر سے ہی پرزے لے رہے ہیں۔ اور پرزے ہمارے پاس وافر ہیں۔"

ارشاد: "تو یہ حالت ان کی ہوئی۔ وہ مسودہ ردی میں بک جانے کے بعد۔"

سیفی: "جی۔ بالکل۔ لیکن بتدریج...... اب یاد آیا...... ایک دفعہ شروع میں جب ابھی حواس قائم تھے...... انہوں نے کہا تھا یہ مسودہ دنیا کی تاریخ بدل سکتا ہے۔"

ارشاد: "تو اب کہاں ہے یہ مسودہ......؟"

سیفی: "نیچے ہمارے عجائب گھر کے ردی میں بک جانے والے قیمتی مسودوں کے سیکشن میں۔"

جبار: "اب آ جائیں...... جب تک ٹکٹ نہیں لگتا کباڑ کمپلیکس مفت دیکھ لیں۔ کباڑ خانے سے پیدا ہونے والا عجائب خانہ......"

ارشاد: "ٹکٹ کب لگے گا؟"

سیفی: "جب گینز بک آف ریکارڈز والے ہماری حیثیت تسلیم کر لیں گے۔"

ارشاد: "Negotiations چل رہی ہیں...... یہ کہاں رہ گیا...... ہوپ......"

جبار: "آؤ...... آ جائے گا...... آؤ......"

(تینوں سیڑھیاں اتر جاتے ہیں)

پین شاٹ: احاطہ خالی پڑا ہے۔ کیمرہ مختلف چیزوں پر پین کرتا ہوا چند لمحوں کے لیے زمین پر بچھے اخبارات اور ابھی تک بکھرے مٹھائی کے ٹکڑوں پر چند لمحوں کے لے Stay کرتا ہے۔ پھر ٹیلی ویژن فریم کا دروازہ سامنے آتا ہے۔

اچانک دروازہ دائیں بائیں کھل جاتا ہے اور ہوپ اندر داخل ہوتا ہے۔ لہولہان گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہے۔ فرش پر خون آلود پنجوں کے نشان نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

....

(8)

جولیفانٹو بمبالا اوفالی بمبالا

انیلا۔سیفی ادھورے سکرین پلے پر ہارس پلے

انیلا۔سیفی سکرین پلے جو ابھی اندازاً صرف پچیس تیس منٹ کے سکرین ٹائم کے لیے لکھا گیا ہے، سعید کمال کی جا بجا جارحانہ مداخلتوں کے باوجود انیلا باآواز بلند سنا ڈالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہ ہوپ کے لہولہان حالت میں لکڑی کے ٹی وی فریم سے بنے دروازے کی راہ سے احاطے میں داخل ہونے کے آخری منظر کا آخری فقرہ سنا چکی ہے۔

ماسٹر یاسین: (بے ساختہ) ''اوئے کُتے کے ساتھ تو بُری ہوئی''۔

انیلا کا غذات سمیٹتی ہے تو سب جان جاتے ہیں کہ سکرین پلے کم از کم وقتی طور پر ختم ہو چکا ہے گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ وہ سیفی کی طرف دیکھتی ہے جو اس کے پڑھنے کے دوران اپنی گھسیٹا کاری میں مصروف رہا تھا۔ لیکن پھر وہ بھی قلم اُٹھا لیتا ہے اور اپنی ترچی ترچی کاپی بند کر دیتا ہے اور گہری سانس لیتا ہے۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں اور پھر سعید کمال کی طرف جو آج اپنی پسندیدہ نشست پر بیٹھ سکنے کی بجائے بالکل سامنے بیٹھا ہے۔ پسندیدہ نشست میں یعنی ڈیوڈ لین۔ انگمار برگمین کی تصویروں کے عین نیچے صفدر سلطان بیٹھا ہے۔ اُس کے دائیں بائیں ماسٹر یاسین۔ بابا خوشیا پھر خالی کرسیاں پھر انیلا اور سیفی آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ سعید کمال کے چہرے پر شدید بے زاری کے تاثرات۔

انیلا: (خاموشی توڑتے ہوئے) ''تو...... یہ ہے فی الحال......''

سعید کمال: (زہر آلود لہجہ) ''فی الحال...... ہا...... اتنا ہی نمونہ کافی ہے میرے لیے...... دراصل میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ...... یہ...... اتنے اچھے سبجیکٹ کا بیڑہ غرق تم نے کیا یا سیفی نے......''

سیفی: ''تو تم مانتے ہو چیف کہ سبجیکٹ اچھا ہے۔'' سیفی کہتا ہے اور اپنا قلم پھر گھسیٹا کاپی کی طرف لے جاتا ہے۔

سعید کمال: (زہر خندہ) ''سبجیکٹ سب ہی اچھے ہوتے ہیں سیفی۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم اُسے Treat کس طرح کرتے ہو۔ لیکن پہلے تم یہ قلم گھسا لو پھر میں بات کرتا ہوں۔''

انیلا: (برہمی سے) ''سبجیکٹ سب ہی اچھے ہوتے ہیں...... کیا بات کر رہے ہو تم...... اور وہ جو ہارڈ ہٹنگ سبجیکٹ کی رٹ لگا رکھی تھی تم نے اتنے عرصے سے...... اگر سب ہی سبجیکٹ اچھے ہیں تو......''

سعید کمال: (غصہ) ''ہاں...... یہ ہارڈ ہٹنگ ہے۔ بے شک لیکن ابھی اس نے صرف مجھے Hit کیا ہے۔ میرے اعتماد کو Hit کیا ہے...... کہیں گڑبڑ ہے انیلا۔ بہت سخت گڑبڑ ہے''۔

سیفی گھسیٹتا ہے...... اور میرا جی چاہتا ہے سیدھا تمہارے جبڑے پر ہِٹ کروں اور کرتا جاؤں۔ عجیب بات ہے ایسے پُرتشدد خیال مجھے پہلے تو کبھی نہیں آئے۔ یہ کہاں سے آیا۔ خیر...... تو کھیل شروع ہو گیا ہے۔ اور لگتا ہے یہ اندر باہر سرئیلسٹ ہوگا۔ یہ سکرین پلے...... میرے اس شک کو دُور کرنے لگا تھا کہ اس پاگل تماشے میں میرا کوئی مقام نہیں۔ پھر انیلا جیسی عورت کے ساتھ مل کر ایک فینٹسی۔ چلو سرئیلزم کہہ لو۔ خیر اُس عورت سے مل کر تحریر کرنا۔ فلم۔ شاید۔ خیر۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں...... جیسے ہم مل کر ایک بچہ بنا رہے ہیں...... لیکن چیف کو موت پڑنے لگی ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔ مگر۔ ٹھہرو سیفی۔ ٹھہرو...... اُس کا بھی تو مسئلہ ہے۔ جب انیلا پڑھ رہی تھی تو نظر آ رہا تھا کہ وہ کس قدر متاثر ہو رہا ہے۔ لیکن اب کہتا ہے سبجیکٹ کا بیڑا غرق کس نے کیا۔ وہ تو کہے گا۔ وہ کیسے آسانی سے تسلیم کر لے کہ انیلا...... وہ عورت جس کے ساتھ وہ سونا چاہتا تھا ابھی ہے بھی اور نہیں بھی مجھ جیسے لوفر سے مل کر ایسا کام کرنا شروع کر دے گی۔ مسئلہ ہے۔ مسئلہ ہے اور سیٹھ کو پھنسائے رکھنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یہ ایک پاگل

پچوایشن ہے مگر مزیدار۔ I Love It۔ چلنے دو۔ بلکہ اور بھی پاگل ہونے دو۔ سب کچھ۔ آؤٹ
آف کریکٹر ہو جاؤ مزہ آ رہا ہے۔ اندر باہر سرئیلزم پھیلنا...... اور سیٹھ کو دیکھو نظروں سے ہی انیلا
کے کپڑے اُتار رہا ہے۔ بھن چود۔ مگر فلم تو پیسے سے ہی بنتی ہے...... Bull Shit

سعید کمال: (برہمی سے) ''تم میری بات سُن رہے ہو سیفی......''

سیفی گھسیٹنا بند کر دیتا ہے۔

سیفی: (خود کلامی کے انداز میں) ''میں نے سُن لیا ہے چیف۔ بہت سخت گڑبڑ ہے۔ لیکن اس گڑبڑ کی نشاندہی بھی تو تم نے ہی کرنی ہے۔ بابے خُوشیے نے تو نہیں کرنی۔ لیکن نہیں...... ایک منٹ ٹھہرو...... ہاں۔ بابا خُوشیا ہر معاملے میں مداخلت کر سکتا ہے۔ جو شخص پھانسی کے پھندے سے واپس آ سکتا ہے اُسے زندگی کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی اجازت ہونی چاہیے''۔

سیفی اپنی کاپی ایک طرف کرتا ہے۔ انیلا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے۔ صفدر سلطان کا موڈ بھی کافی خراب لگتا ہے۔ کینہ پرور نظروں سے سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔

صفدر سلطان: ''میں...... میرا مطلب ہے...... یہ آپ کیا بات کر رہے ہیں سیفی صاحب۔ یہی...... اسی طرح کی بے سروپا باتیں سکرین پلے میں بھی ہیں''۔ (ڈرے ڈرے انداز میں انیلا کی طرف دیکھتا ہے)

سیفی: (سعید کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ''چیف کا حکم تھا کہ سرئیلزم ڈالنا ہے۔ بات ساری اصل میں اُسی سوال سے چلی تھی کہ ماسٹر یاسین کو جاننے کا حق حاصل ہے یا نہیں کہ سرئیلزم کیا بلا ہے؟ اور اب اندر باہر سرئیلسٹ ہو رہا ہے۔ ہونے جا رہا ہے۔''

ماسٹر یاسین: ''ویسے باس وہ باڈی بلڈر سینڈو کا کریکٹر کمال ہے بارش میں ڈولے نکال نکال کر دکھا رہا ہے۔ مجھے تو مزہ آیا۔ جو بھی تمہارا سرئیلزم ہے یہ اور وہ جو سین ہے پھول وحشی ہو کر کتے کا لہو پی رہے ہیں۔ (ہنستا ہے) اسٹیکٹ ڈالنے پڑیں گے۔ وہ ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ جادو کی۔ ایک درخت بندے کھانے لگتا ہے۔''

سیفی: (ہنستا ہے) ''بات آگے پہنچے گی چیف۔ درخت بندے کھانے لگتا ہے یعنی یہ کام پہلے بھی ہو چکا ہے Excellent وہ کیا کہتے ہیں ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا...... رائٹ چیف......؟''

سعید کمال: ''پلیز مجھے چیف نہ کہو۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا۔ Request کی تھی......''

سیفی: ''ساری چیف...... ا...... ام...... مم۔ میرا مطلب ہے سعید......''

ماسٹر یاسین: (سیفی کو مشورہ دینے کا انداز) ''باس کہہ لو۔ (سعید کمال سے) کیوں باس؟ باس چلے گا؟''۔

سعید کمال بے زاری سے کندھے اُچکاتا ہے۔ انیلا مسکراتی ہے۔

سیفی: ''دراصل باس میں رہنمائی کا وہ مزہ نہیں جو چیف میں ہے۔ میرا مطلب ہے فلم ڈائریکٹر کی رہنمائی......۔ لیکن میرا خیال ہے ہمیں اصل معاملات کی طرف آنا چاہیے کیوں انیلا......؟''

انیلا: (عجیب لاتعلقی اور بے زاری سے ہاتھ اچھالتی ہے) ''پتہ نہیں''۔

سیفی: ''اب صورتِ حال یہ ہے کہ سوانگ پروڈکشنز کی دونوں اہم ترین شخصیات بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار کر رہی ہیں۔ اب باقی بچتے ہیں صفدر سلطان صاحب جنہوں نے پیسہ لگانا ہے۔ اور ''پیسہ بولتا ہے''۔ مگر پیسے والا نہیں بولتا۔ ماسٹر یاسین جنہوں نے بقول ان کے کیمرے کی گان...... مطلب پشت...... میں سر دینا ہے۔ بابا خُوشیا ہیں جنہوں نے ابھی اٹھ کر ہمارے لیے چائے بنانی ہے۔ اور...... یہ خادم ہے۔ جس نے ڈائریکٹر صاحب کے ہر حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہے اور بس......''

انیلا: (صورتِ حال میں واپس آنے کی کوشش کرتے ہوئے) ''ہوں...... خیر...... دیکھتے ہیں...... اچھا تو کمال تمہارا خیال ہے کہ یہ پجیکٹ ہم نے برباد کر دیا......''

(سعید کمال فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیتا جیسے کوئی ذہنی فیصلہ کر رہا ہو)

سیفی: (لاپرواہ سا لہجہ) ''ویسے بربادی چیف ہماری ہو رہی ہے۔ میری اور انیلا کی۔ سرئیلزم نے ہمیں برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔''

انیلا اور سیفی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایک بے چین سی خاموشی چند لمحوں

کے لیے گہری چھائی رہتی ہے۔ پھر سعید کمال عجیب وحشیانہ سی نظروں سے بلی والیلڈر کی تصویر کے نیچے بیٹھے صفدر سلطان کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: ''صفدر صاحب اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اِس جگہ آ جائیں۔ مجھے دراصل اُس جگہ سے دروازے پر نظر رکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ (اک دم بابے خُوشیے سے) بابا جی چائے شائے...... کچھ کھانے کے لیے بھی منگوالیں......''

بابا خُوشیا اور صفدر سلطان دونوں اُٹھتے ہیں۔

صفدر سلطان: ''جناب آپ نے مجھے پہلے کہا ہوتا۔ پلیز آئیں......''

سعید کمال بھی اُٹھتا ہے۔ صفدر اُس کی جگہ بیٹھ جاتا ہے لیکن سعید کمال فوراً اپنی پسندیدہ نشست سنبھالنے کی بجائے گہری سوچ کے عالم میں چند قدم اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے پھر اک دم سیفی کے سامنے رُک کر اُس سے مخاطب ہوتا ہے۔

سعید کمال: ''وہ جو کیریکٹرز تم نے پچھلی دفعہ...... وہ جو مٹھائیوں والا...... اور اس کا کُر، کباڑیا...... اُن کے ساتھ یہ...... تم نے کیا کیا......؟ اس آ...... سکرین پلے...... میں...... جسے تم سکرین پلے کہتے ہو......''

سیفی: ''ہم اسے سکرین پلے نہیں کہتے۔ کچھ اور کہہ لیتے ہیں...... مثلاً ہارس پلے کہہ لیتے ہیں۔ اودھم تماشہ۔ کیوں انیلا......؟''

انیلا: (بات کاٹتے ہوئے) ''تم نے خود کہا تھا ہم سب متفق ہوئے تھے کہ سکرپٹ اگر سرئیلسٹک انداز میں آگے بڑھانا ضروری ہوا تو بڑھنے دیا جائے گا......''

سعید کمال: ''آ...... میں۔ میں نے...... شاید......''

سیفی: (مداخلت کرتے ہوئے) ''آ...... نہیں۔ میرا خیال ہے سب متفق نہیں ہوئے تھے۔ میں اور انیلا Yes...... لیکن ماسٹر یاسین سمجھے بغیر متفق ہونے پر تیار نہیں تھے حالانکہ سمجھانے کی کافی کوشش کی گئی تھی کہ سرئیلزم کیا ہے اور بابا خُوشیا تو بالکل بھی متفق نہیں تھے۔ بابا جی کا خیال تھا کہ آندرے بریتاں ایک ذہنی طور پر مریض آدمی تھا...... بابا خُوشیا سرئیلزم سے زیادہ ڈاڈاازم (Dadaism) کو اور بچگانہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے سرئیلسٹ تو فرائیڈ کو لے کر پکھنڈ بازی کر رہے تھے جبکہ ڈاڈا

پورے خلوص سے ہر قسم کے آرٹ کی مکمل تباہی چاہتے تھے۔ کیوں بابا جی...... ہم انہی سے مزید پوچھ لیتے ہیں۔ بابا جی......؟''

بابا خُشیا معصومیت سے ہنستا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا دیتا ہے۔

بابا خُوشیا: ''حق مولا۔ حق مولا۔ حق۔ حق......''

سیفی: ''Exactly...... باقی ماسٹر......''

ماسٹر یاسین: ''نہیں جی...... مجھے تو سُن کر مزہ آیا ہے......''

سیفی: ''بات ختم ہو گئی...... مزہ آنا ہی اصل چیز ہے۔ مزہ نہیں آیا تو کچھ بھی نہیں آیا...... مطلب...... کچھ بھی نہیں ہوا۔'' (کاپی اپنی طرف کھینچتا ہے گھسیٹتا ہے)...... اندر باہر سرئیلسٹ ہو رہا ہے۔

سعید کمال: ''پتہ نہیں ہر بات میں...... یہ کیا مسخرہ پن ہے تمہارا۔ اور یہ جو تم بار بار لکھنے گھسیٹنے لگتے ہو یہ کیا بکواس ہے؟ It is highly irritating۔''

سیفی: ''یہ وہی بکواس ہے تمہارے کہے ہوئے پوائنٹس نوٹ کرتا ہوں دماغ اور حافظے پر اعتماد نہیں کر سکتا چیف...... ساری سعید کمال جسے تم آؤٹ آف کیریکٹر ہونا کہتے ہو۔ وہ ہمارے خیال میں بذات خود ایک زبردست سرئیلسٹ Move ہے۔ اور فلم میں خاص طور پر اسے Exploit کرنا چاہیے......''

سعید کمال: (طنزیہ لہجہ) ''ہمارے خیال میں؟ ہا...... کس کے خیال میں؟ تمہارے خیال میں یا انیلا کے خیال میں......؟''

انیلا: ''نہیں یہ اچھی مثال ہے...... بابا خُوشیا آندرے بریتاں کے سرئیلسٹ مَینی فیسٹو پر بات کرنے لگتا ہے۔ ہمیں نئے سرئیلسٹ امکانات نہیں ڈھونڈنے چاہئیں کیا سعید......؟''

بابا خُشیا لہر میں آ کر مرزا صاحباں پڑھنے لگتا ہے۔

بابا خُوشیا: ''اوہ اسیں کاں ساں کالی باردے۔ ساڈھے......''

سعید کمال: (ڈانٹ کر) ''بابا......''

(بابا خُوشیا کو وہیں بریک لگ جاتی ہے۔ اُٹھ کر چائے بنانے چلا جاتا ہے۔ سعید

کمال پھر انیلا اور سیفی کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

سعید کمال: ''آؤٹ آف کیریکٹر...... جیسے تمہارا وہ کباڑیا شیکسپیر کے ڈائیلاگ بولنے لگتا ہے

سیفی: ''کسی حد تک Yes ہم سریلزم کو آگے لے جا رہے ہیں...... سینما میں......''

سعید کمال: (یک دم دھماکہ دار آواز) ''ہا۔ سینما میں...... کس سینما کی بات کر رہے ہو''

(سعید کمال یک دم اپنی اصل نشست سنبھال لیتا ہے اور کسی نامعلوم تبدیلی
سے گزرتا ہے۔ باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لیتا ہے۔ صفدر سلطان جو کافی دیر
خاموش ہے۔ ایک زوردار جمائی لیتا ہے۔ اس کی جمائی سے ماسٹر یاسین بھی متاثر ہوتا ہے
دو تین جمائیاں لیتا ہے۔ آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے۔ رومال سے صاف کرتا ہے
صفدر سلطان سے مخاطب ہو کر ہنستا ہے۔)

ماسٹر یاسین: ''فلمیں ایسے ہی نہیں بن جاتیں سرکار......''

سعید کمال: (پوری طرح فارم میں آ چکا ہے۔ نقل اُتارنے کے انداز میں) ''سریلزم کو آ
لے جا رہے ہیں سینما میں...... Ha تمہیں کچھ پتہ بھی ہے سینما میں سریلزم ک
چڑیا کا نام ہے۔ تم نے Man Ray یا Luis Bunuel کی کوئی فلم دیکھی؟
خیر یہ چھوڑو یہ تو 1930ء کی باتیں ہیں...... کہاں تمہیں ملیں گی یہ فلمیں......
کے چیک Jan Svankmajer یا پولش Wojciech Has کا کوئی کام
ہے؟...... تم سمجھتے ہو گئے کا خون پینے والے پھول دکھا کر تم اپنی فلم میں سریلزم لے
آؤ گے......''

سیفی: ''نہیں چیف ابھی آگے بہت کچھ آنا ہے...... مثلاً پروفیسر صفدر سلطان جو گوروں کی
نقالی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی خرد افروزی کے ذریعے اپنی قوم کو دنیا پر غلبہ
چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ جڑیں بہرحال اپنی تہذیب میں ہیں اس لیے جنات کی
طاقت سے بجلی پیدا کرنے کی مشین ایجاد کر رہا ہے......'' (تیزی سے کھینچ
ہے...... (1) پروفیسر صفدر سلطان کا المیہ۔ (نام نہاد اکیڈیمیا، یہ علماء کون ہیں
(2) جناتی سائنس/سائنسی جنات۔ (3) الہ دین کا محفوظ جن...... ایک سیکولر جن
ہے؟ (4) کباڑ خانہ/عجائب خانہ۔ اکیڈمی؟؟؟ کسی عظیم درسگاہ کا شاک شاٹ؟

اب یہ جو بنتا نظر آ رہا ہے۔ یہ کسی نام نہاد حقیقت پسند کہانی یا فلم کے بس کی بات تو
ہے نہیں۔ جو کچھ سکرین پلے میں چل رہا ہے۔ چلے گا۔ اور جو باہر چل رہا ہے۔
ابھی چلے گا۔ دونوں میں حقیقت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر گنجائش ہے ڈاڈا کی۔ ڈا۔
ڈا۔ ڈا۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ انیلا سے ڈسکس ہوگا)

انیلا: ''پروفیسر صفدر سلطان کے علاوہ...... اُن کباڑیوں کا تہہ خانہ۔ عجائب خانہ...... مائی
گاڈ......''

(صفدر سلطان کی آنکھیں اس گفتگو سے پہلے ہی نیند کی شدت سے بند ہو رہی
تھیں۔ اپنا نام سن کر بُری طرح چونکتا ہے تو بیٹھے بیٹھے لڑھک کر گرنے لگتا ہے۔ ماسٹر یاسین
ہنستا ہے اور اُسے سنبھالتا ہے)

صفدر سلطان: ''یہ پھر میرا نام آیا...... پروفیسر...... صفدر...... سلطان...... ہیں......''

ماسٹر یاسین: ''سر جی...... فلمیں ایسے ہی نہیں بن جاتیں...... کبھی کبھی پروفیسر بھی بننا پڑتا ہے''۔

سعید کمال: (جلے بھنے لہجے میں) ''ایک تو لگتا ہے تمہیں ناموں کا قحط پڑا ہوا ہے۔ یہاں کے
ہمارے اپنے چند ناموں کے علاوہ اور کوئی نام سوجھتا ہی نہیں تمہیں...... اسے بھی
کوئی سریلسٹ ایفیکٹ سمجھ رہے ہو......''

سیفی: ''نہیں۔ یہ ڈاڈا ایفیکٹ ہے۔ یہ میں سمجھتا ہوں۔ انیلا ہو سکتا ہے کچھ مختلف رائے
رکھتی ہو۔ حالانکہ پچھلے دنوں تمہارے ساتھ اپنے آپ کو بات کرنے کے قابل
بنانے کے لیے ہم نے ایک ہی کتابیں پڑھی ہیں...... میں سمجھتا ہوں (صفدر
سلطان پر نظر پڑتی ہے جو پھر اونگھنے لگا ہے) صفدر سلطان صاحب لگتا ہے پھر سو
جائیں گے...... میں سمجھتا ہوں...... بابا جی اگر ہو سکے تو سیٹھ صاحب کو پیار سے اٹھا
کر صوفے پر ڈال دیں۔''

ماسٹر یاسین: ''بابا چائے بنا رہا ہے۔''

سیفی: ''میں سمجھتا ہوں۔''

سعید کمال: ''اب بتا بھی دو...... کیا سمجھتے ہو......؟''

سیفی: ''میں سمجھتا ہوں ہمیں بابے خوشیے کے موقف کو تسلیم کرنا ہوگا ہمیں پہلے ڈاڈا ازم کی

بات کرنا ہوگی۔ جس سے سریلزم نے جنم لیا...... ماسٹر یاسین کو سریلزم سے بھی
پہلے ڈاڈا ازم سمجھانا ہوگا۔ اصل چیز تو ہمارے لیے اُن کی ڈاڈا ازم ہے یعنی
پروفیسر صدر سلطان مارکہ...... (صفدر سلطان پھر بُری طرح چونکتا ہے)
خرد افروزی کا مکمل قلع قمع، آرٹ، فن، ادب، موسیقی، منطق، عقل ہر چیز کی مکمل
تباہی...... لیکن ٹھیک ہے یہ کام ہم اپنے طریقے سے کریں گے۔ اور پھر مزے کی
بات یہ ہے کہ گورے بے چارے تو پہلی جنگ عظیم کی وحشت سے گھبرا کر ڈاڈا ہو
گئے جبکہ ہم تو عرصے سے ڈاڈا ہیں...... لیکن نہیں...... ان کا ڈاڈا الگ ہے۔ ہمارا
ڈاڈا الگ ہے۔ ڈا۔ ڈا۔ ڈا۔ ڈا۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ...... ہا۔ ہا...... ہا......"

(صفدر سلطان کی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ خوف زدہ سی حیرت سے سیفی کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

صفدر سلطان: "لگتا ہے......"

سیفی: "دماغ چل گیا ہے...... بس اسی فقرے کا منتظر تھا میں...... دماغ چلنا بہت ضروری ہے۔ اور اس طرح کہ دماغ چل بھی جائے لیکن چلتا بھی رہے۔ ویسے سعید۔۔۔ تمہارے سریلزم کے ایک بہت بڑے مصور نے اس نازک نقطے پر آخری بات کر دی ہے۔ سیلوے ڈار ڈالی فرماتے ہیں "مجھ میں اور ایک پاگل میں بس اتنا فرق ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ ہائے۔ ہائے۔ ہائے......"

انیلا: (ہنسنے لگتی ہے) "دراصل سیفی نے جو کچھ تازہ تازہ پڑھا ہے اُس نے اِسے بہت زیادہ متاثر کیا ہے"۔

سعید کمال: (تنفر سے) "تازہ...... تازہ...... ہنھ...... میں نے دیکھا ہوا ہے یہ سارا...... Bull Shit میں فلم کی بات کرتا ہوں...... Fucking Surrealist فلم کی بات کرتا ہوں...... اور...... اور کچھ نہیں...... تو کم از کم...... Luis Bunuel کی...... Un Chien Andalous (جذباتی کیفیت) اور...... اور...... کم از کم Wojciech Has کی...... وہ...... وہ...... ایک...... ریت گھڑی...... ہاں۔ وہ...... The Hourglass Sanatorium اور کچھ نہیں تو اتنا کچھ تو تم نے دیکھ

رکھا ہو۔ پھر تم سریلسٹ فلم کی بات کرو...... ان دو فلموں کو بنیاد بنا کر پروفیسر جولیس نے سریلسٹ سینما پر لیکچر دیا تھا ہمیں؟...... کام کیا تھا...... میں نے اور لیونا۔"

سیفی: "ہاں۔ کمال لوگ تھے یہ ڈاڈا...... ان کے ایک بڑے ہیوگو بال کی ایک نظم سنو۔ جو دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔ یعنی مکمل اور خالص ترین بکواس......"

(سامنے پڑے کاغذوں میں سے ایک کاغذ الٹ پلٹ کر نکالتا ہے۔ بابا خوشیا ایک بڑی ٹرے میں چائے کے کپ اور کھانے کی چیزیں لاتا ہے اور سب کے سامنے بھاپ دیتی گرم چائے کے کپ رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ غیر محسوس طور پر سب کے موڈ بہتر ہونے لگتے ہیں)

سیفی: "پیش کروں؟"

سعید کمال کندھے اُچکا کر انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: "انیلا...... یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ شخص آپے سے باہر کیوں ہو رہا ہے؟"

سیفی: "واہ چیف۔ یہ تم نے بہت پتے کی بات کی۔ آپے سے باہر ہونا۔ جب حقیقت آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ Realism آپے سے باہر ہو جاتی ہے تو سریلسٹ ہو جاتی ہے۔ خطرہ بہت شدید ہے کہ سریلسٹ فلم بنانے والوں کی اپنی دنیا بھی آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ سکرین پلے آپے سے باہر ہو جائے......"

سعید کمال زور زور سے میز پر ہاتھ مارنے لگتا ہے اور چیخ کر کہتا ہے۔ "پلیز۔ پلیز...... انیلا۔" ماسٹر یاسین قدرے حیرت سے سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ سعید کمال خود بھی اپنے اِس اچانک اشتعال پر متعجب ہے۔ پھر پُرسکون ہو جانے کی کوشش کرتا ہے۔

سیفی: (گہری نظروں سے سعید کمال کو دیکھتے ہوئے) "میں نے کہا تھا نا خطرہ بہت شدید ہے۔"

سعید کمال: "بہرحال۔ بہرحال...... پہلے یہ فلمیں تمہیں...... ہم سب کو دیکھنی ہوں گی۔ پھر سکرین پلے پر بات ہوگی۔"

انیلا: (زیرلب) "ہارس پلے۔" پھر سگریٹ سلگاتی ہے۔ سیفی

سیفی: ''نظم کا عنوان ہے۔ کاراوانے۔ ہیوگو بال۔ 1917،

جولیفانتو بمبالا اوفالی بمبالا

گروسیگا میفا بابلا ہورم

اے گریگا گورامن

ہیگو بولائے کواوسو یولا ہیو جو

ہولا کا ہولالا

افلوگو بنگ

بلاگو بنگ

بلوگو بنگ

لوسوفا کا

آئی آئی آئی آئی آئی

شامیا ویولا ویوسا لویو

تج تاتا گورم

الیجیگ زنباڈا

ولو یوہو یوڈیو رولیو ہو یوڈیو

لُمبا بالمف

کیوسا گوما

ہا......اف

سیفی اس کلام کو پڑھنے میں ایک خاص قسم کا ردہم استعمال کرتا ہے جس سے سب سے زیادہ بابا خوشیا متاثر ہوتا ہے۔ اچانک ایک بازو ہوا میں بلند کر کے انگشت شہادت باہر نکالے گھوم گھوم کر ناچنے لگتا ہے جبکہ سعید کمال کا منہ بگڑ جاتا ہے۔

سیفی: ''میں نے کہا تھا ناں بابا خوشیا Is absolutely for Dadaism تی ادہاہا۔

ہا۔ہا۔ہا۔ہا۔ہا۔ہاڈاڈاڈا......''

سعید کمال: (کڑک کر) ''بند کرو...... یہ...... ہاں...... خوشی محمد...... باب۔ باب۔ ب

ب۔بس۔''

(بابا خوشیا سہم کر ایک طرف چلا جاتا ہے۔ سیفی نظم ختم کرتا ہے)

صفدر سلطان: (شدید بے چینی) ''یہ...... نظما...... نظمی...... نظم جو...... تھا...... تھی...... یہ بھی سکرین پلے میں پڑھا جائے گا......؟'' اس میں حقیقت تو کہیں دکھائی ہی نہیں گئی۔ معاشرے کی برائیاں جو ہوتی ہیں وہ شامل کریں گے آپ؟ جو حقیقت ہوتی ہے وہ فلم میں کہاں ہے جی؟''

انیلا: (لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے) ''ارے نہیں۔ صفدر صاحب...... میں جو ہوں...... حقیقت کی آپ فکر نہ کریں۔''

(صفدر قربان ہونے کے انداز میں دیکھتا ہے۔ بابا خوشیا بسکٹ کی ایک اور پلیٹ رکھتا ہے)

سیفی: ''انیلا ایک حقیقت ہے......''

بابا خوشیا: ''یا اللہ تیرا فضل......''

سیفی: ''ویسے صفدر صاحب...... ہماری اپنی نظم ہوگی...... ڈا...... ڈا...... ڈا...... ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔''

صفدر سلطان پر تشویش نظروں سے پہلے سیفی اور پھر شکایتی سے انداز میں انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ انیلا جواباً مسکراتی ہے اور کندھے اچکاتی ہے۔ جیسے یہ تاثر دینا چاہتی ہو کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ سعید کمال ایک بسکٹ اٹھاتا ہے۔ بسکٹ والا ہاتھ کچھ دیر تک کپ کے اوپر معلق رہتا ہے۔ جیسے بسکٹ کو چائے میں ڈبونے یا نہ ڈبونے کے بارے میں فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔ چہرے پر گہرے استغراق کے تاثرات۔ پھر بسکٹ ڈبوتا ہے لیکن چائے میں ڈوبنے پر بسکٹ غیر معمولی تیزی سے گل کر چائے میں ہی رہ جاتا ہے۔ بیزاری کے تاثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ پھر تیزی سے بقیہ حصہ منہ میں ڈال کر چائے کا گھونٹ لیتا ہے تو منہ جل جاتا ہے۔ قہر آلود نظروں سے سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: ''اگر تم نارمل ہو چکے ہو تو ہم بات آگے بڑھائیں؟ ہم یہ فلمیں دیکھیں گے۔''

انیلا: ''ہو گیا سعید۔ لوئی بیونل اور واؤ چیک۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آگے بولو۔''

صفدر سلطان کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات جیسے کہ وہ تیزی سے کوئی مداخلت

کرنے کی جرأت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے۔ پھر چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے ایک ہی گھونٹ میں آدھا کپ خالی کر دیتا ہے۔ سیفی مسلسل اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ صفدر سلطان اُس کے گھورنے پر اور بھی گھبرا جاتا ہے۔ کپ نیچے رکھتا ہے۔

صفدر سلطان: ''بس۔مم......آس...... وہ...... میں......اصل۔''

سیفی: (تیزی سے) ''لگتا ہے صفدر صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

سعید کمال اور انیلا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ انیلا فوری طور پر صفدر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

انیلا: ''آ۔ ہاں جی۔ صفدر...... صاحب......'' (حوصلہ بڑھانے کے انداز میں اُس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتی ہے۔ صفدر مسکرانے کی کوشش میں مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے)

صفدر: ''آ۔ وہ جی...... میں اصل میں پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ فلمیں جو ہم دیکھیں گے۔ یہ کیا ہٹ ہوئی ہیں؟ کوئی بڑا بزنس کیا ہے ان فلموں نے......؟''

سعید، سیفی اور انیلا تینوں بیک وقت گہری سانس لیتے ہیں ایسا کہ جیسے ایک ہی سانس باقاعدہ سنائی دیتا ہے۔ ماسٹر یاسین ہنس پڑتا ہے لیکن پھر فوراً ہی انتہائی سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ سعید کمال کی طرف دیکھ کر نامعلوم سا سر جھکاتا ہے ایک بے چینی طاری ہوتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یک دم اپنی کسی ذمے داری کو محسوس کر کے اپنا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔

ماسٹر یاسین: ''میں...... (پھر صفدر سلطان کی طرف بھرپور متوجہ ہوتا ہے)...... سر جی...... میں جناب کو بتاتا ہوں۔ آپ کو میں یہاں لایا ہوں پروڈکشن میں۔ میں ذمہ دار ہوں۔ آپ کو...... میرا مطلب ہے جو فلم ہم بنائیں گے اس میں آپ کو نقصان نہیں ہوگا۔ اتنا بڑا بزنس تو نہیں ہوگا شاید جتنا...... سمجھ لیں...... (سوچتا ہے)...... آ...... مثال ہے...... جٹ دی غیرت کا ہوا لیکن پھر بھی...... آ...... اِس...... غیرت کا سودا۔ جتنا تو ہو ہی جائے گا...... کیوں باس۔''

صفدر سلطان: (کھسیانے احتجاج کا انداز) ''نہیں ماسٹر میرا یہ مطلب نہیں۔ نفع نقصان کی تو بات ہی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔''

سعید کمال فیصلہ کن سامنہ بناتا ہے۔ اور سیفی تیزی سے گھسیٹنے لگتا ہے...... لگتا ہے۔ سیٹھ بھاگ رہا ہے۔ انیلا کے ادھورے سے غیر متاثر کن ناز و غمزے اس پر اثر نہیں کر رہے۔ بات سیدھی ہے (انیلا کے ساتھ آج رات ڈسکس ہوگا) سیٹھ انیلا کے ساتھ سونا چاہتا ہے۔ ادھر چیف بھی اُس کے ساتھ ایسی ہی کچھ حرکت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نہیں بھی کرنا چاہتا۔ اگرچہ اب وہ انیلا کے تاریخی فقرے کو For granted نہیں لیتا۔ تو پیسہ بولتا ہے اور لیڈی کلر کے درمیان میں ہوں۔ اچانک میرا جی چاہتا ہے مار مار کر سیٹھ کا بھرکس نکال دوں۔ عجیب بات ہے ایسے خوفناک امیج کیوں میرے ذہن میں آتے ہیں۔

سعید کمال: بلند غصیلی آواز۔ ''سیفی...... میرا خیال ہے آج کا سیشن ختم کر دیں پھر۔''

سیفی چونک کر گھسیٹنا بند کر دیتا ہے۔

سیفی: ''یس چیف...... سوری...... نو سوری......۔ جی؟''

سعید کمال: (یک دم سیفی کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے بھرپور طریقے سے صفدر سلطان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے) ''آ...... آ...... صفدر سلطان صاحب...... میرا خیال ہے اس مسئلے کو میرا خیال ہے ایک ہی دفعہ سیٹل کر لیا جائے۔''

صفدر سلطان: ''سٹ...... سٹال...... سٹیل...... نہیں...... مسئلہ تو کوئی نہیں۔''

سعید کمال: ''نہیں سر مسئلہ ہے۔ دیکھیں۔ ماسٹر نے جیسے ابھی بات کی۔ ہم کوئی کمرشل ہٹ فلم بنانے نہیں جا رہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کے پیسے ڈوبیں گے، نہیں۔ ویسے بھی لو بجٹ فلم ہے۔''

صفدر سلطان: ''جی۔ جی...... لو...... بالکل لو...... لیکن سر۔ آپ بنائیں بڑے بجٹ سے بنائیں۔ کیوں نہیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔''

سعید کمال: ''نہیں۔ صفدر صاحب...... ابھی نہیں۔ وہ پھر کبھی دیکھیں گے۔ ویسے آپ کو بتادوں یہ جو نیا سیٹ اپ آیا...... ہم یہاں سینما کی نئی تاریخ بنا رہے ہیں۔ اور بار

بار میں یہ بات دہراتا اچھا نہیں لگتا کہ اس پراجیکٹ میں صفدر سلطان صاحب آپ کا رول بطور پروڈیوسر بہر حال ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

سیفی: "نیا سیٹ اپ یعنی نیا "عظیم نجات دہندہ"......"

سعید کمال: (سیفی کی بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا) "Anyway۔ تو یہ لوگ کلچر، آرٹ، سینما کے بارے میں بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اطلاعیں مل رہی ہیں۔"

سیفی: "کرنا چاہتے ہیں۔ مائی فٹ۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ہلا کر quote کا اشارہ کرتا ہے۔ "عظیم رہنما وہ ہوتا ہے جو تاریخ پر تھوک سکے۔ رہنمائی مانگنے والے کو اپنے پیشاب سے شرابور کر سکے اور اپنے فضلے سے لت پت کر سکے۔ quote unquote "جبار جمع کرنے والا"......"

سعید کمال: (بے چینی سے ایک نظر سیفی اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے) "خیر...... خیر۔ یہ۔ یہ۔ کردار۔ سیفی...... یہ ہم لائیں گے۔"

سیفی: (سنجیدگی سے) "چیف...... جب بہترین فلم کا ایوارڈ ملتا ہے تو ساری ٹیم کو ہی اسٹیج پر بلاتے ہیں نا...... ہالی وُڈ میں تو میں نے ایسا ہی دیکھا ہے۔ تو کیا Cannes میں بھی......"

سعید کمال: "ہا۔ آئی۔ ڈونٹ نو...... یہ...... بعد کی باتیں ہیں۔ اور نہ ہی ایوارڈ کوئی ہمارا اصل گول ہے۔"

صفدر سلطان: (اچانک سیفی سے) "آپ ہالی وُڈ گئے ہیں؟"

انیلا: (ہنس پڑتی ہے) "ہاں۔ خوابوں میں......"

سیفی: "نہیں سر۔ ٹی وی شوز دیکھے ہیں آسکر ایوارڈ......"

انیلا: "بے چارے۔ ویسے سیفی اتنا تم فلم، آرٹ، کلچر کور کرتے ہو میڈیا میں۔ کسی نہ کسی کو تو تمہیں ترس کھا کر کبھی ہالی وُڈ بھیجنا چاہیے تھا۔ آسکر دیکھنے، کور کرنے کے لیے۔"

سعید کمال بے چینی سے دیکھتا ہے۔

سیفی: "چیف ایک اہم مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ دانت نہ نکالو پلیز۔" گھسیٹتا ہے۔

بلکہ ایسے ہی دانت نکالتی رہو۔ یہاں جو بکواس چل رہی ہے۔ اِس میں سب سے زیادہ حقیقی یہی ہے۔ تمہارا دانت نکالنا۔ ہنستی رہو۔ یہ عورت میرے حواس پر قبضہ کر رہی ہے...... انیلا سے ڈسکس ہوگا...... گھسیٹنا بند کر کے انیلا کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔ انیلا کی ہنسی رُک جاتی ہے اور وہ گھبرا سی جاتی ہے۔ بابا خُوشیا بلا وجہ حق حق کرنے لگتا ہے۔

ماسٹر یاسین: (ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے) "شی...... بابا جی۔ وقت دیکھا لیا کریں......"

بابا خُوشیا محبت بھری نظروں سے سیفی اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال: "لیکن صفدر سلطان صاحب...... ابھی بھی آپ دیکھ لیں...... اس فلم کے لیے فنڈنگ ہمارے لیے مسئلہ ہے۔ لیکن کوئی بہت بڑا مسئلہ بھی نہیں۔ جو حل ہی نہ ہو سکتا ہو۔ کئی Fucking این جی اوز مل جائیں گی۔ اگر آپ اس پراجیکٹ سے الگ ہونا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیں۔ نو پرابلم......"

(صفدر سلطان پر شدید گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ امداد طلب نظروں سے ماسٹر یاسین اور پھر انیلا کی طرف دیکھتا ہے)۔

صفدر سلطان: "نن۔ نہیں...... جی۔ سعید کمال۔ ڈائریکٹر صاحب مطلب سر۔ ہرگز نہیں۔ کیا بات کر رہے ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ بھول جائیں۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ فلم بنائیں آپ۔ ضرور بنے گی۔ یہ فلم۔ بلکہ میں تو پھر کہتا ہوں لو بجٹ نہیں فل بجٹ بنائیں۔"

صفدر سلطان پھر انیلا کی طرف دیکھتا ہے اور اُسی لمحے سیفی گھسیٹتا ہے...... چیف نے سیٹھ کی طبیعت خوب صاف کی۔ ویل ڈن...... پھر صفدر سلطان کی نظریں بچا کر دائیں ہاتھ سے سعید کمال کو اس طرح اشارہ کرتا ہے کہ انگوٹھا اور انگشت شہادت ملے ہوئے ہیں۔ پھر بدمعاشی سے مسکرا کر اُسے آنکھ مارتا ہے۔ لیکن عین اُسی لمحے صفدر سلطان سیفی کو یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا ہے۔ اک دم سیفی کا رنگ اُتر جاتا ہے۔ اور باقی سب بھی دیکھ لیتے ہیں کہ ایک ہی لمحے میں کیا ہوا ہے۔ لیکن سیفی گھبرانے کی بجائے تیزی سے اپنی دائیں آنکھ جھپکانا شروع کر دیتا ہے۔ اور پھر

تکلیف کے تاثرات کے ساتھ ہاتھ سے بند آنکھ ملنا شروع کر دیتا ہے۔

سیفی: ''لگتا ہے آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ یہ میرے ساتھ اکثر ہو جاتا ہے۔ جھپکنے لگتی ہے۔ بلکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آنکھ مار رہا ہے۔ انیلا ذرا دیکھنا۔''

(انیلا آگے کو جھک کر سیفی کی دائیں آنکھ کی پلکیں انگلی اور انگوٹھے سے کھول کر دیکھتی ہے۔ اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کر رہی ہے۔)

انیلا: ''کچھ ہے۔ لگتا ہے بال ہے۔ جا کر پانی کا چھینٹا مارو۔''

(سیفی بادل نخواستہ اُٹھنے لگتا ہے۔ بابا خوشیا شور مچا دیتا ہے۔

بابا خوشیا: ''نہ۔ نہ۔ پانی نہ۔ آنکھ گرم سرد ہو جائے گی۔ ابھی چاء پی ہے۔ اوپر کا پردہ ہٹا کر اندر رکھو۔ ملو۔ بال سے بال چمٹ کر نکل جائے گا...... پر نہ بچ...... یہ نہ کرو ایسا کرو......''

انیلا: ''بابا جی۔ کوئی ایک طریقہ بتائیں۔ بیچارے کی آنکھ مسلسل پھڑک رہی ہے۔''

بابا خوشیا: ''کوئی کپڑا آنکھ پر رکھ کر۔ بند آنکھ پر رکھ کر گرم ساہ دو۔''

سیفی: (انیلا پر ایک معنی خیز نظر ڈالتا ہے پھر تیزی سے نظر ہٹا لیتا ہے۔) ''میرا خیال ہے یہ طریقہ کام کرے گا۔''

انیلا: ''بابا جی آئیں......''

بابا خشیا دانت نکالتے ہوئے اُٹھنے لگتا ہے۔ سیفی شور مچا دیتا ہے۔

سیفی: ''نہیں۔ نہیں...... بابا جی کا گرم ساہ تو مجھے ویسے ہی بے ہوش کر دے گا۔ انیلا پلیز۔''

ماسٹر یاسین قہقہے لگانے لگتا ہے۔ سیفی اپنا رومال انیلا کی طرف بڑھاتا ہے۔ انیلا رومال دیکھ کر بناوٹی سے تنفر سے رومال چٹکی میں اُٹھا کر پرے پھینک دیتی ہے۔

انیلا: ''پتہ نہیں کیا کیا گند لگایا ہوا ہے۔''

پرس سے اپنا رومال نکالتی ہے۔ اور آہستگی سے اُسے تہہ کرنے لگتی ہے۔ ماسٹر یاسین اور بابا خشیا دونوں صورتِ حال سے بہت لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لیکن سعید کمال اور صفدر سلطان اپنی اپنی بے زاری کی کیفیت میں ہیں۔

سعید کمال: ''سیفی یہ ڈرامہ جلد ختم کرو پلیز......''

سیفی: ''چیف یہ ڈرامہ نہیں ہے۔ جس کو تکلیف ہوتی ہے وہی جانتا ہے۔ انیلا جلدی کرو۔ گرم سانس دو۔''

صفدر سلطان: (مشکوک لہجہ) ''آنکھ کی ایسی تکلیف ویسے آج تک دیکھی نہیں۔''

سعید کمال: (ٹھنڈے لہجے میں) ''اس کی آنکھ کا کوئی مسئلہ ہے سر۔ میں نے دیکھا ہے...... ایسا اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔''

سیفی: ''سیٹھ صاحب۔ بس دیکھ لیں۔ پتہ نہیں ابھی اس فلم کی خاطر اور کیا کچھ دیکھنا پڑے آپ کو...... ویسے چیف اس فلم کا نام میں نے رکھ لیا ہے۔ نام ہوگا...... ''یہ فلم نہیں بن سکتی''۔ انیلا......''

انیلا: ''آگے جھکو۔''

سیفی کرسی میں بیٹھے بیٹھے دائیں مُڑ کر اور انیلا بائیں مُڑ کر آمنے سامنے آ جاتے ہیں۔ دونوں کے چہرے قریب ہیں۔

انیلا: ''دائیں آنکھ بند کرو۔''

سیفی دائیں آنکھ بند کرتا ہے۔ انیلا تہہ کیا ہوا رومال اس کی بند آنکھ پر رکھتی ہے۔ اور پھر اپنے ہونٹ رومال پر رکھ کر گرم سانس دینے لگتی ہے۔ دونوں کے چہرے چھونے لگتے ہیں۔ انیلا کی ٹھوڑی سیفی کے آدھے ہونٹوں پر جم جاتی ہے اور بایاں رخسار سیفی کے نتھنوں کو بند کر دیتا ہے۔

سیفی: ''یہ گرم سانس نہیں۔ یہ تو گرم بھاپ ہے۔ انیلا لگتا ہے تمہارے اندر کوئی دیگچی اُبل رہی ہے۔''

انیلا اُسی حالت میں ہنسنے لگتی ہے اس طرح کہ اس کے ہونٹ رومال پر ہی ہیں۔ یہ سارے جسم کی ہنسی ہے جو منہ کی بجائے اُس کے جسم کے سب ریشوں سے پھوٹ کر سیفی کے جسم میں اُتر رہی ہے۔ سب ان کی طرف دیکھ رہے ہیں اس لیے سعید کمال اور صفدر سلطان کے چہروں کو کوئی نہیں دیکھتا جو بھاپ سے دھندلا جاتے ہیں۔

سیفی: "چیف اس sequence کو کہیں ڈال دیں سکرین پلے میں جیسے وہ عشقیہ ناولوں میں لکھتے ہیں...... اور...... اور وہ اور قریب آ جاتے ہیں...... اور قریب...... اور قریب...... اور اُن کی سانسیں ملنے لگتی ہیں۔ نہیں بکواس۔ ملنے لگتی ہیں ٹھیک...... اور نہیں۔ آنچ ہاں آنچ۔ ان کی سانسوں میں آنچ ہے۔ تپش۔ تپش۔ تپش بڑھتی جاتی ہے۔ بڑھتی جاتی ہے...... اور...... اور...... بھک۔ بلکہ بھک۔ دونوں شعلوں کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ چیف۔ چیف۔ سرئیلسٹ میں تو سب چھٹی ہے نا۔ انیلا بس کرو۔ میری آنکھ تمہاری بھاپ سے سٹیم روسٹ ہو جائے گی۔ تمہاری بھاپ کس قدر گرم ہے۔"

انیلا پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

انیلا: "اب۔ آنکھ کھول کر دیکھو۔"

سیفی آنکھ کھولتا ہے۔ اور احمقانہ انداز میں تیزی سے پلکیں جھپکاتا ہے۔

سیفی: "میرا خیال ہے آرام آ گیا ہے۔ جی او بابیا۔"

بابا خوشیا والہانہ انداز میں اُٹھ کر حق۔ حق۔ کی آوازیں نکالتا، بازو ہوا میں بلند کر کے انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کرتا اور ناچنے لگتا ہے۔

سعید کمال: (ڈانٹتے ہوئے) "باباجی۔ بابا...... بس بابیا۔"

لیکن بابا خوشیا کچھ پرواہ نہیں کرتا اور ناچنا جاری رکھتا ہے۔ سیفی تیزی سے کاپی پر گھسیٹنے لگتا ہے...... ہمارے لوکل کلچر میں صوفی یا جو بھی اسے کہیں والہانہ رقص کی روایت کو کسی طرح ہم سکرین پلے یا کہہ لو Narrative میں شامل کر سکتے ہیں۔ سرئیلسٹ انداز/Metaphor۔ اس میں کافی رنگ لگائے گا۔ پروفیسر صفدر سلطان کی تہذیبی خردافروزی (خردافروزی یا خردسوزی) کے ساتھ ساتھ اگر یہ کسی طرح چلایا جائے۔ حق۔ حق۔ (اور وہ کہیں اناالحق بھی تو ہے) خیر انیلا سے ڈسکس ہوگا۔ ایک معاشرے میں جہاں رقص و موسیقی دونوں شیطان کے کام ہیں۔ یہ ایک اچھا چور دروازہ ہے۔ ایک دروازہ دکھایا جائے جس کے اوپر لکھا ہو چور دروازہ۔ خیر کوئی حل نکل آئے گا۔ لیکن یہ تو صرف ہماری زبان کا محاورہ ہے۔ عالمی فلمی میلے والے

کیسے سمجھیں گے چور دروازہ۔ ایک بندہ جا رہا ہے۔ سامنے وہی چور دروازہ آتا ہے۔ آواز آتی ہے۔ 'روکو۔ مت جانے دو' بندے کو روک لیتے ہیں اور مارنے لگتے ہیں۔ بندہ چیختا ہوا کہتا ہے۔ تمہیں گرائمر نہیں آتی۔ وہ کہہ رہا ہے۔ 'روکو مت۔ جانے دو' مارنے والے یک دم معافیاں مانگنے لگتے ہیں۔ ہاتھ جوڑنے لگتے ہیں۔ بندہ جاتا ہے اور مختلف لباس میں پھر آتا ہے۔ آواز آتی ہے۔ 'روکو مت۔ جانے دو' چور دروازے والے بندے کو جانے دیتے ہیں۔ بندہ اندر جاتے ہی شور مچا دیتا ہے۔ بند کرو۔ بند کرو۔ چور دروازہ بند کرو۔ دربان بھی شور مچاتے ہیں۔ روکو۔ روکو۔ اِسے روکو۔ پھر ایک شور مچ جاتا ہے۔ بند کرو۔ بند کرو۔ روکو۔ روکو۔ مارو۔ مارو۔ مارو۔ سب ایک دوسرے کو مارنے لگتے ہیں۔ مارنا رقص کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ Choreographer سے ڈسکس کرنا ہوگا۔ اچانک طبلے اور ستار کی Beat سنائی دیتی ہے۔ پھر یہ Beat جاز موسیقی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بند کرو۔ روکو۔ مارو۔ بند کرو)

یک دم سعید کمال غصے سے چیختا ہے۔

سعید کمال: "تم یہ بند کرو گے یا نہیں۔ بند کرو۔"

(سیفی یک دم گھسیٹنا بند کر دیتا ہے۔ اور ایک چونکنے جیسی کیفیت میں سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے)۔

سیفی: "بند کرو۔ روکو۔ مارو۔ مارو۔ مارو......"

انیلا: "یہ شخص سب کو پاگل کر دے گا......"

سعید کمال: "سوائے تمہارے۔"

سیفی: "اس لیے کہ یہ پہلے ہی پاگل ہے...... ساری چیف۔ گھسیٹا کاری ختم۔ ساری۔ جاری۔ کاری......"

سعید کمال: "صفدر سلطان صاحب سے انتہائی اہم مسئلے پر بات ہو رہی ہے۔ اور تمہاری گھسیٹا بازی ہی ختم نہیں ہوتی......"

سیفی: "گھسیٹا کاری چیف۔ گھسیٹا بازی کچھ اور چیز ہو جاتی ہے۔ (صفدر سلطان کی طرف

دیکھ کر پھر آنکھ مارتا ہے اور پھر گھبرا کر آنکھ مسلتا ہے) لیکن سیٹھ صاحب نے کہہ تو دیا
ہے کہ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ سر میں آپ کو سیٹھ صاحب کہہ لوں تو آپ برا تو نہیں
مانیں گے۔''

صفدر سلطان پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہوتی ہے۔

صفدر سلطان: ''نن۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔''

سیفی: ''چیف تمہاری قیادت پر سب کو اعتماد ہے۔ لیکن بات اب تمہاری وہ فلمیں دیکھنے
کے بعد ہی آگے بڑھے گی۔ باقی (دھاڑ سے کاغذوں پر ہاتھ مارتا ہے۔) کام ہو
رہا ہے۔ انیلا کئی باتیں ڈسکس کرنے والی آ گئی ہیں۔''

انیلا کندھے اُچکاتی ہے اور کوئی جواب نہیں دیتی پھر پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ
اور دیا سلائی نکالتی ہے۔

سیفی: ''چیف۔ سکرین پلے میں ایک نظم فٹ کرنی ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''بند کرو۔''

بند کرو۔ بند کرو۔ سب بند کرو۔
بند کرو۔
روکو۔ روکو۔ روکو۔
سب روک دو۔
بند کرو۔
مارو۔ مارو۔ مارو۔
سب ماردو ماردو۔
بند کرو۔
میز پر تھاپ دینے لگتا ہے۔
بند کرو۔ بند کرو۔ سب بند کرو۔
بند کرو۔''

بابا خوشیا پھر ترنگ میں آ کر ناچنے کے لیے اُٹھنے لگتا ہے تو ماسٹر یاسین اُسے زبردستی
کھینچ کر بٹھا لیتا ہے۔

صبر کریں......''

ماسٹر یاسین: ''بابا جی......

سیفی: (اسی طرح تھاپ دیتا رہتا ہے۔) ''بند کرو۔ بند کرو۔ سب بند کرو۔ نہیں بابا جی
کو چلنے دیں۔ بابا جی ہیوگو بال کا 'کاروانے' تو ختم ہو گیا اب ہم خود بناتے ہیں ڈا۔
ڈا۔ ڈا...... ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ نظم کا عنوان ہے۔

گر باشی کلورا
منگرا پراماہابراہو
ہوہو مالا یاراہو
ہش ہش ہش ٹھگرا
سدا کرا کھبرا انیشام آمبا
آر باشامبا ککرو مگولا ڈش
ڈش۔ ڈش۔ ڈش۔
سیدگا پگرا منوما شمبل

سعید کمال اور صفدر سلطان کے علاوہ باقی چاروں بھرپور قہقہے لگاتے ہیں۔

سعید کمال: ''انیلا پلیز۔ اسے روکو۔''

انیلا: ''بند کرو سیفی پلیز...... یہ ہارس پلے۔'' (پھر ہنس پڑتی ہے۔)

بابا خوشیا ماسٹر یاسین کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے پھر انیلا اور سیفی کی طرف فدا
ہونے کے انداز میں دیکھتا ہے۔

بابا خوشیا: ''لاڈ کر رہے ہیں۔ صدقے واری...... بڑے سوہنے لگ رہے ہیں۔'' اُٹھ کر
ناچنے لگتا ہے۔

بابے خوشیے کے الفاظ سن کر سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایک بے چین سی خاموشی
کے ان لمحوں میں انیلا سگریٹ کا پیکٹ کھولتی ہے اور سگریٹ صفدر سلطان کو پیش
کرتی ہے۔ صفدر لرزتی انگلیوں میں سگریٹ تھامتا ہے، انیلا دیا سلائی جلا کر پہلے
اپنا اور پھر صفدر سلطان کا سگریٹ سلگواتی ہے۔ پھر گہرے دھوئیں کا ایک بادل اس
کے منہ سے نکلتا ہے۔ اور گول میز سے ذرا اوپر کی فضا میں پھیل کر سب کو اپنی لپیٹ

میں لے لیتا ہے۔

سیفی: ''انیلا ابھی تم دیکھتی تھیں اب چمنی بن گئی ہو۔ لیکن اس دھویں میں بھی تمہاری بھاپ کی تپش ہے...... تپش۔ تپش۔ آنچ۔ آنچ...... چیف وہ پھر چلے گا مرد عورت کا جوڑا جو آنچ آنچ ہوتا۔ یک دم خود شعلوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ چیف۔ Bursts into flames۔''

سعید کمال کا انداز ایسا ہے کہ جیسے ذہنی طور پر بالکل غیر حاضر ہو چکا ہو۔ سیفی کی بات پر چونکتا ہے۔

سعید کمال: ''ہاں۔ وہ۔ ہاں۔ آئی ڈونٹ نو...... ابھی۔ ہاں ابھی رہنے دو۔''

سیفی: ''لیونا کیپلان...... کچھ بتاؤ چیف......''

سعید کمال: ''نہیں...... وہ...... کچھ نہیں...... ابھی رہنے دو۔''

سیفی: ''رہنے دو۔ رہنے دو۔ ابھی رہنے دو۔

رہنے دو۔

سب رہنے دو۔''

سیفی میز پر تھاپ دینے لگتا ہے اور اُس میں ایک وحشیانہ سی شدت آ جاتی ہے۔ میز لرزنے لگتا ہے۔ پھر بابے کا ساتھ دینے کے لیے دونوں ہاتھوں سے میز کے کنارے پر بوجھ ڈال کر اُٹھنے لگتا ہے تو کھٹاک جیسی ایک آواز آتی ہے۔ میز کا گول تختہ دوسری طرف سے اوپر کو اُٹھ جاتا ہے۔ چائے کے برتن نیچے گرتے ہیں۔ سب لوگ بوکھلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سعید کمال کا ہاتھ بلند ہو کر پیچھے دیوار پر لگی بلی وائیلڈر کی تصویر پر لگتا ہے۔ تصویر بھی نیچے گر جاتی ہے۔ اضطراری آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ انیلا گرنے لگتی ہے تو سیفی اُسے سنبھالتا ہے۔ اور اس کوشش میں انیلا کا جلتا ہوا سگریٹ سیفی سے چھو جاتا ہے۔ سیفی بلبلا اُٹھتا ہے۔ انیلا ہنس پڑتی ہے۔

سعید کمال: ''...What the hell''

انیلا: ''ساری۔ ساری۔ لیکن تمہیں میز توڑنے کی کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔''

''اب تم مجھے سگریٹ سے بھی داغنے لگی ہو۔''

سیفی: ''کیا مطلب پہلے کس چیز سے داغتی ہوں؟''

انیلا: ماسٹر یاسین اور بابا خوشیا زمین پر گری چیزیں اُٹھانے لگتے ہیں۔ سیفی انیلا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا اور صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔

''آہ...... بلی وائیلڈر بھی لٹک گیا۔ چیف تم نے محسوس کیا۔ کچھ عجیب بات اس

سیفی: کمرے میں کچھ مسئلہ ہے۔ اچانک دورہ پڑنے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔''

ماسٹر یاسین: ''باس وہ میں کل شام پروجیکشن ہال بک کرالوں گا جان عالم سٹوڈیو میں بالی سے کہہ کر...... پروجیکشنسٹ ہے۔ اُسے کچھ خرچہ دینا ہوگا۔''

صفدر سلطان: (اِس اچانک وحشیانہ سی توڑ پھوڑ پر ہل سا گیا ہے۔ لرزتے ہوئے لہجے میں ماسٹر یاسین سے) ''ماسٹر ک۔ کک۔ کہا نا یہ خرچے ورچے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا۔ (سعید کمال سے) سر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ (چور نظروں سے انیلا کی طرف دیکھتا ہے)۔

سعید کمال: (انیلا اور سیفی کی طرف مشکوک سی نظروں سے دیکھتا ہے) ''گریٹ۔ ونڈرفل۔ صفدر سلطان صاحب فلم فائنانس کرنے کا Committ کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ باقی میں ابھی نہیں جاننا تم لوگوں کی آپس کی ورکنگ کیسے چل رہی ہے۔''

انیلا: ''تم اسے چھوڑو ورکنگ کیسے چل رہی ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ اور صاف صاف بتاؤ جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے۔ اُس پر آگے کام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہاں یا نہ میں جواب دینا۔ گھمانے پھرانے کی کوشش نہ کرنا۔''

سعید کمال: (گہری نظروں سے انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ غیر متوقع طور پر خفیف سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے) ''ہاں۔''

انیلا: ''یعنی تمہیں پسند ہے۔''

سعید کمال: ''آ۔ آ۔ I don't know۔ امکانات نظر آتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں۔''

سیفی: ''انیلا زیادہ خوش نہ ہونا۔ چیف نے صرف کہا ہے کہ کہہ سکتے ہیں۔ کہا نہیں۔''

انیلا: ''کہہ سکتے ہیں۔ بکواس۔ کہہ سکتے ہو تو کہہ دو۔''

سیفی: (رودھم میں) ''کہہ دو۔ کہہ دو......

ابھی کہہ دو۔

سب کہہ دو۔

سب کچھ کہہ دو۔''

سعید کمال: ''تم نے کیا بکواس شروع کی ہوئی ہے۔''

انیلا: ''سیفی پلیز نہ کرو۔''

سیفی: ''نہ کرو۔ نہ کرو۔ نہ کرو۔

نہ نہ کرو۔

نہ کرو۔''

صفدر سلطان ہنس پڑتا ہے۔

سیفی: ''سیٹھ صاحب۔ آپ نے ہماری ان لڑائیوں سے گھبرانا نہیں۔ یہ شریک جرم لوگوں کی آپس کی لڑائیاں ہیں۔''

انیلا: (عجیب بناوٹی ادا سے) ''اب تو صفدر بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ بلکہ زیادہ شریک ہیں۔ کیوں صفدر......''

صفدر سلطان: (گھبراہٹ سے) ''ج۔ ج۔ جی۔ جی۔ بالکل...... لیکن یہ کوئی جرم نہیں۔ بلکہ یہ تو ملک و قوم کی خدمت ہے جی۔ ہم انشاء اللہ یہ فلم بنانے میں کامیاب ہوں گے۔''

ماسٹر یاسین: (صفدر سلطان کی طرف عجیب مضحکہ خیز سے رازدارانہ انداز میں دیکھتا ہے) ''کامیاب سر جی۔ بالکل کامیاب۔ مُٹھ رکھیں۔ (صفدر سلطان کو ایک طرف ہٹا لے جاتا ہے) سر جی اب آپ نے اس لین میں پیر ڈال دیا ہے۔ تو خالی شوق نہیں۔ بزنس بھی بڑا کرنا ہے آپ نے آگے......''

صفدر سلطان کے چہرے پر ایک بوجھل سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔

صفدر سلطان: ''شوق...... (ٹھنڈی سانس لیتا ہے...... آواز اور بھی دھیمی کر لیتا ہے) تم نے بات کی ماسٹر پھر......؟''

ماسٹر یاسین کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ کے تاثرات نمودار ہوتے ہیں۔ پھر

(ماسٹر اسی انداز میں ایک نظر انیلا کی طرف ڈالتا ہے۔ جو سیفی کے سامنے پڑے کاغذات

دیکھنا چاہتی ہے)

انیلا: ''دیکھوں کیا تم نے گھسیٹا ہے۔ کیا ڈسکس کرنا ہے۔'' (پڑھنے لگتی ہے۔ سیفی کاغذات اُس سے جھپٹ لیتا ہے)

سیفی: ''ابھی نہیں۔ مناسب وقت پر۔''

ماسٹر یاسین: (سرگوشی) ''ابھی نہیں سر...... مناسب وقت پر...... وقت جب بات کرنے کا ہو گا۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ ادھر نہ سہی۔ آپ کو کہیں اور سکون کرائیں گے۔ بہت اعلیٰ کام۔''

صفدر سلطان: (صفدر سلطان کے چہرے پر عجیب سی الجھن کے تاثرات) ''کیا مطلب؟''

سعید کمال پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کچھ فاصلے پر کھڑا جیسے پورے منظر کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی طاری ہے۔ اس کی نظریں سرگوشیوں میں مصروف صفدر سلطان اور ماسٹر یاسین اور بچوں کی طرح چھینا جھپٹی کرتے انیلا اور سیفی کے درمیان حرکت کرتی ہیں پھر وہ فرش پر گری بلی وائیلڈر کی تصویر دیکھتا ہے۔ تصویر کا شیشہ چکنا چُور ہو چکا ہے۔

سعید کمال: (چلاتا ہے) ''Damn it ۔ بابا جی یہ تصویر فکس کرائیں ذرا۔ اوہ۔ اچھا رہنے دیں۔ یہ میری گاڑی میں رکھ آئیں۔ میں خود فکس کرا لوں گا۔ ہم لوگ نکل ہی رہے ہیں۔''

(سعید کمال گاڑی کی چابیاں بابے خوشیے کی طرف بڑھاتا ہے۔ بابے کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہوتی ہے۔ کلاک کی طرف دیکھتا ہے جو رات کا ایک بجا رہا ہے۔)

بابا خوشیا: ''ایس میم...... (ماسٹر یاسین کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھتا ہے) ماسٹر آ میرے ساتھ......''

ماسٹر یاسین: ''مجھے کیوں ساتھ بلاتا ہے...... (اک دم کوئی خیال آتا ہے۔ ہنس پڑتا ہے)......

باس بابا ڈر رہا ہے۔ باہر پارکنگ میں اکیلا جانے سے۔"

صفدر سلطان: (مشکوک انداز) "کیوں......؟ پارکنگ میں کیا ہے؟"

سیفی کے چہرے پر ایک چمک سی آتی ہے۔ جیسے وہ اس معاملے کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔

سیفی: "پارکنگ میں تو کچھ نہیں سیٹھ صاحب۔ لیکن چاہ پریاں والا بالکل ساتھ ہے اور آدھی رات کے بعد وہ جگہ بھاری ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر مردوں کے لیے۔ کیوں بابا جی؟"

بابا خوش ہو جاتا ہے اور۔ آ۔ آ۔ کی آوازیں منہ سے نکالتا ہے۔

بابا خوشیا: "بالکل۔ بالکل۔ پری کسی کو بھی ساتھ اُڑا کر لے جا سکتی ہے۔"

سیفی: "انیلا تم نے چاہ پریاں والے کی Myth سُنی ہے۔"

انیلا: "آ۔ ایسے ہی شاید۔ اُڑتی اُڑتی۔ کوئی خاص نہیں......"

سیفی: "فرض کرو۔ تم ایک پری ہو۔ اُڑتی اُڑتی......"

سعید کمال: "وٹ نان سینس......"

سیفی: "چیف کا خیال ہے تم پری نہیں ہو۔ لیکن میں تمہیں پری سمجھ رہا ہوں۔ چاہ پریاں والا کی غیر حقیقی یا ماورائے حقیقی مطلب سریلسٹ تاریخ تمہیں سمجھانے کے لیے۔ فرض کرو۔ ایک پری کسی انسان پر عاشق ہو جاتی ہے۔"

انیلا: "ہو گئی پھر......"

سیفی: (صفدر سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ مارتا ہے۔ اور پھر آنکھیں جھپکنے اور ملنے لگتا ہے۔) "اوہ خدایا پھر شروع ہو گئی آنکھ پھڑکنا...... پری۔ آؤ۔ مجھے بھاپ دو۔ ساری انیلا دیگچی دو۔ آنچ۔ آنچ...... چیف چلیں...... ویسے چاہ پریاں والا کا اتنا قریب ہونا خطرناک ہے۔ چیف یہ جگہ بدل دو۔ سوانگ پروڈکشن کے دفتر میں جو مجھے اور بابا خوشیا کو دورے سے پڑنے لگتے ہیں تو شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ عمارت خطرناک حد تک رات کو آسیبی تاریخ کے نرغے میں آ جاتی ہے۔ آؤ چلیں۔ بابا جی...... چاہ پریاں والا۔ چلو۔ چلو۔ چاہ پریاں والا چلو۔

....

"گر باشی کلورا
منگرا پراما ہابرا ہو
ہو ہو مالا یارا ہو
ہش ہش ہش ٹھگرا
سدا کرا کھمبر انیشام آمبا
آر باشامبا گکرو مگولا ڈش
ڈش۔ ڈش۔ ڈش۔
سیدگا پگرا منوما شمبل۔"

....

(9)

چاہ پریاں والا سے سگِ اندلس تک

''انیلا مجھے بھاپ دو''

ادارتی نوٹ: کچھ ناگزیر اسلوبی تبدیلیاں

ایک نام حسن رضا ظہیر ہے جو اسم معرفہ ہے ایک شخص جو زمانی و مکانی تاریخی، معاشرتی پہچان رکھتا ہے۔ دوسرا نام حسن ہے جو اسم نکرہ ہے اور ایک عمومی صورتِ حال کی تعقلاتی حسی اور ادراکی تعین کرتا ہے۔ اور یہ صورتِ حال ایسی ہے کہ تاریخ اور معاشرتی حدود و قیود کی پابند بھی ہے اور ماورا بھی۔ ہم اول الذکر سے موخر الذکر کی راہ نکالنے میں سرگرداں رہتے ہیں اور اس کوشش میں بیانیہ جا بجا ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنی چال بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں اور اس مجبوری کا اعلان کرنے کی مداخلت بھی کرتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صورتِ حال بھی چونکہ عمومی صورتِ حال کا حصہ ہے اس لیے اس کی طرف جا بجا اشارہ کرنا عبث ہے۔ واقعہ بیان کا جواز فراہم کرتا ہے اور بیان واقعے کا تعین کرتا ہے۔ جواز اور تعین کا یہ لمحہ کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتا ہے جیسا کہ سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں رات کے ایک بجے چاہ پریاں والا نامی کسی مقام کے ذکر پر بابے خوشیے کی خوفزدگی سے ظاہر ہوا۔ بلی وایلڈر کی چکنا چور تصویر سے شیشے کی کرچیاں اتار کر جب بابا خوشیا، سعید کمال، سیفی، انیلا اور ماسٹر یاسین کے پیچھے پیچھے سر جھکائے باہر کو چلا تو اُن میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت اُن پر کیسے تحیر کے دروازے کھولنے والا ہے۔ لیکن مدیر حیرت کی حیثیت سے ہم چونکہ ان افراد کے مستقبل کے حالات جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے قریب سے

بعید تک کے اُن کے سفر کا حال بیان کرنے کا قرینہ بھی جانتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں واقعات کے تین سیٹوں سے نپٹنا ہے/ کو کھولنا ہے اس طرح کہ وہ آخر میں کسی اسلوب سے ایک ہی سیٹ کے سب سیٹ بن جائیں۔ یہ دلچسپ ہے لیکن ہم کسی پیچیدہ ریاضیاتی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ (i) سوانگ پروڈکشنز کے دفتر سے رات ایک بجے نکل کر دُرانی بلڈنگ کے عقب میں چاہ پریاں والا سے ملحقہ پارکنگ میں پہنچنے کے بعد گروپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات۔ (کیا آسیبی؟ روحانی؟ یا محض اتفاقی؟) (ii) اس حیرتناک وقت کے گزر جانے کے بعد بالا آخر اپنی اپنی نیند تک پہنچنے سے پہلے ان کے اپنے اپنے ذہنی واقعات (کیا شعوری، نیم شعوری یا لاشعوری)۔ (iii) اگلے کسی روز دیکھی گئیں سگِ اندلس اور ریت گھڑی کا سینی ڈریم نامی سرئیلسٹ فلموں کے اندر رونما ہونے والے واقعات۔

ہم ان تینوں اقسام کے واقعات کو ایک ہی انداز میں بیان کریں گے گویا چاہ پریاں والا کا آسیبی ہلا گُلا سعید کمال اور صفدر سلطان کا قبل از نیند بھاپی شعور اور بالی پروجیکشنٹ کی چلائی فلمیں ایک ہی سطح پر کھڑی ہیں۔ بعد میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ ''یہ فلم نہیں بن سکتی'' نامی فلم کے بقیہ انیلا۔ سیفی سکرین پلے میں بھی اسی اسلوب کی پیروی کرنے کی کوشش کریں۔ کوشش۔ کوشش۔ کوشش......

گہری رات کے سیاہ آسمان میں چمکتا چاند۔ ویران سڑک جو آگے جا کر بائیں طرف مُڑ جاتی ہے۔ چھوٹی بڑی عمارتیں۔ اکثر عمارتوں کی کھڑکیاں تاریک ہیں۔ دُرانی بلڈنگ کا نیم تاریک آہنی جالی دار گیٹ۔ کمبل میں لپٹا چوکیدار دروازہ کھولتا ہے کہ اندر کسی دفتر سے باہر جانے کے لیے کوئی آیا ہے اور وہ جانتا ہے فلم پارٹی ہوگی۔ سعید کمال، صفدر سلطان، انیلا، سیفی اور آخر میں بابا خوشیا، بلی وایلڈر کی ٹوٹی ہوئی تصویر ہاتھ میں لٹکائے سب باہر نکلتے ہیں۔ سعید کمال اپنی نئی ڈیجیٹل گھڑی کا بٹن دباتا ہے اور روشن سکرین پر وقت دیکھتا ہے رات کے 1:25 کے ہندسے سامنے آتے ہیں پھر وہ بلی وایلڈر کی تصویر دیکھتا ہے جس میں سے شیشے کا ایک اور ٹکڑا نیچے گرتا ہے۔ نیچے گرے ٹکڑے میں چاند نظر آتا ہے۔ سیفی انیلا سے کہتا ہے کہ انیلا بھی ویسی ہی ایک گھڑی لے لے کیونکہ یہ بالکل نئی آئی ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز

ایجادات ہیں۔ انیلا کہتی ہے کہ وہ اتنی مہنگی گھڑی نہیں لے سکتی۔ صفدر سلطان کا چہرہ، آنکھیں انیلا پر۔ گہری سوچ۔ ایک بہت بڑے فیشن ایبل سٹور میں صفدر سلطان اور انیلا نظر آتے ہیں۔ انیلا ایک ڈیجیٹل گھڑی دیکھ رہی ہے اور مسکرا رہی ہے۔ صفدر سلطان کی طرف دیکھ کر خفیف سا سر ہلاتی ہے۔ صفدر سلطان جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دکاندار کو دینے لگتا ہے۔ تاریکی میں دونوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔ صفدر سلطان انیلا کو چوم رہا ہے۔ چماک چماک کی آوازیں آتی ہیں پھر ایک آواز بلند ہوتی ہے۔ "سگریٹ صفدر"۔ انیلا کے منہ میں سگریٹ اور صفدر کو سگریٹ پیش کر رہی ہے۔ صفدر سر جھٹکتے ہوئے اپنے خیالات سے واپس آتا ہے۔ تیزی سے سگریٹ لیتا ہے۔ انیلا دیا سلائی جلاتی ہے۔ سگریٹ سلگواتی ہے۔ صفدر سلطان کھانسنے لگتا ہے۔ سعید کمال، سیفی اور پیچھے باقی سب ایک تنگ سے گلی نما راستے میں داخل ہوتے ہیں جو ڈرائی بلڈنگ کے ساتھ ہی ہے۔ سیفی سعید کے کانوں میں سرگوشیاں کر کے کہتا ہے کہ صفدر سلطان پہلے سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن انیلا اُسے سگریٹ لگوا کر کہیں پھیپھڑوں کا سرطان ہی نہ کرا دے اور سیٹھ فلم میں پیسہ لگانے سے پہلے ہی خرچ ہو جائے۔ سعید کمال کہتا ہے کہ انیلا جانتی ہے کہ فائنانسر کو قابو میں رکھنا کتنا ضروری ہے۔ وہ اپنا گندہ کام جانتی ہے۔

اُلو بولنے کی آواز آتی ہے۔ اُلو ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا اپنا موٹا سر گھما رہا ہے۔ یکدم پھڑ پھڑاتا اُڑتا ہے اور اُس کی اُڑان کا سایہ چاندنی میں اُس پوری کھلی جگہ میں حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ یہ ایک وسیع احاطہ نما جگہ ہے جو عمارتوں کے عقب میں ہے۔ گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں ایک پرانی عمارت نظر آتی ہے جو کسی مزار سے مشابہت رکھتی ہے۔ یک دم ڈھول بجنے کی آواز بلند ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ سعید، صفدر، سیفی، انیلا، ماسٹر یاسین اور بابا خُوشیا احاطے میں داخل ہوتے ہیں۔ عمارتوں کے پیچھے دو گاڑیاں اور دو موٹر سائیکلیں کھڑی ہیں۔ جبکہ کھلی جگہ آگے بڑھ کر سائیں پریاں والا کے مزار اور درختوں کے نیچے دوسری قبروں سے جا ملتی ہے۔ بابا خُوشیا چاند کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ آج چاند کی بارویں تاریخ ہے اور بدھ ہے۔ آج سائیں پریاں والا کے مزار پر بڑی قوالی ہوگی۔ ڈھول کی آواز پھر سنائی دیتی ہے اور انیلا سیفی سے کہتی ہے کہ چاندنی میں وہ جگہ کتنی پراسرار دکھائی دے رہی ہے۔ سیفی کہتا ہے کہ اصل جگہ تو اُدھر آگے ہے جو پراسرار ہی نہیں آسیبی بھی ہو سکتی ہے۔

اُلو یک دم پھڑ پھڑاتا گزرتا ہے اور چاند کے سامنے جیسے سٹل ہو جاتا ہے۔ سیفی شور مچا دیتا ہے۔ "ماسٹر ماسٹر مجھے یہ شاٹ چاہیے۔ چیف دیکھو دیکھو چاند کے سامنے اُلو۔ لاکھ روپے کا شاٹ ہے۔ نہیں دس لاکھ کا۔ ہمیں فلم میں ایسا ہی میٹریل چاہیے۔ سرئیلزم تو ہمارے پچھواڑے میں موجود ہے۔ چلو سب قوالی دیکھنے چلتے ہیں"۔

بابا خُوشیا سعید کمال کی گاڑی میں بلی وائیلڈر کی ٹوٹی ہوئی تصویر رکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ دور جھاڑیوں کے پیچھے قبرستان میں کچھ سائے حرکت کر رہے ہیں۔ خوفزدہ سا ہو کر تیزی سے باقی سب کے قریب چلا جاتا ہے۔ جھاڑیوں کے پیچھے تاریکی میں چار پانچ لوگ ہیں جو قبروں میں چھوٹی چھوٹی ٹارچوں سے کچھ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

سائیں پریاں والا جسے لوگ سائیں گلاب بھی کہتے ہیں کے مزار کے صحن میں برقی قمقمے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ایک شخص ڈھول بجا رہا ہے۔ روشنی ڈھول بجانے والے شخص کے مہیب سائے کو دور تک پھیلا رہی ہے۔ لیکن اُس کا سایہ اردگرد کے درختوں اور جھاڑیوں کی تاریکی میں مدغم ہو رہا ہے۔ ایک کنواں نمایاں ہے۔ ڈھول بجاتا شخص ڈھول ایک طرف رکھ کر کنویں سے پانی نکالنے کے لیے چرخی گھمانے لگتا ہے۔ سیفی، سعید، صفدر، انیلا، بابا اور ماسٹر مزار کی طرف چل پڑتے ہیں۔ سعید کہہ رہا ہے۔ ہاں کیا حرج ہے۔ لیکن سرئیلسٹ فلم میں بھی تسلسل کا کوئی منطق تو ہوتا ہے۔ سیدھی صاف کہانی کی کوئی چھپی ہوئی لائن بھی ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ جو چاہے گھسیڑ دو۔ پروفیسر جولیس نے واضح کیا تھا یہ سب کچھ۔ لیکن یہ جگہ ہے دلچسپ۔ سعید کمال چاروں طرف دیکھتا ہے۔ سیفی کہتا ہے کہ سب سے دلچسپ تو چاہ پریاں والا کی کہانی ہے۔ سیفی کی آواز بھاری ہو جاتی ہے اور اس میں عجیب سی گونج آ جاتی ہے......

سائیں گلاب ہمارا ایک اہم بزرگ تھا۔ سائیں ایک قدیم کھنڈر نما عمارت میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ ہر طرف گلاب ہی گلاب ہیں۔ پھر سیفی کی آواز۔ انسان، جنات حتیٰ کہ جانور بھی اپنے دکھ درد کے ازالے کے لیے اُس کے پاس آتے تھے۔ سائیں کے سامنے ایک مرغا کھڑا ہے سائیں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ پھر ایک جن غصے کے عالم میں آتا ہے۔ پھر ایک روتی ہوئی عورت۔ کنویں میں سے کوئی شخص مسلسل پانی کے ڈول نکال رہا ہے۔ مرغا، عورت اور جن مسکراتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ایک دفعہ کیا ہوا ایک پری......ہم پری کا کوئی نام

رکھ لیتے ہیں۔ ہاں رشیدہ پری۔ انیلا ہنستی ہے۔ کہتی ہے کس قدر غیر رومانٹک نام ہے۔ اچھا...... انیلا پری۔ سیفی کا چہرہ۔ سعید کمال اور صفدر سلطان کے چہرے۔ آنکھیں۔ انیلا پری ایک آدم زاد قطب دین پر عاشق ہو گئی۔ انیلا کا ہنستا چہرہ۔ دانت چاند کی روشنی میں سفید۔ صفدر سلطان کی آنکھیں۔ سگریٹ کا گہرا کش اندر کھینچتا ہے۔ سگریٹ کا گل تاریکی میں دہکتا سرخ ہو جاتا ہے۔ اچھا یہ نام بھی غیر رومانٹک ہے یا اللہ ایسے ناموں والے کدھر جائیں۔ اچھا انیلا پری سعید کمال نامی آدم زاد پر عاشق ہو جاتی ہے۔ لیکن پری اور آدم زاد کا ملاپ نہیں ہو سکتا۔ انیلا پری سائیں گلاب کے سامنے کھڑی آہستہ آہستہ پر ہلا رہی ہے۔ جیسے ابھی اُڑ جائے گی اور اُتنی ہی حسین و جمیل لگ رہی ہے جتنی کہ پریاں ہوتی ہیں۔ پاس ہی آدم زاد سعید کمال ملیشیے کی شلوار قمیص اور لال ٹوپی پہنے کھڑا ہے۔ سائیں گلاب دونوں کو ایک ایک گلاب کا پھول دیتا ہے اور گھمبیر لہجے میں کہتا ہے کہ ان دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور دونوں کی جُون ایک ہی ہو جائے گی لیکن انہیں سامنے اس کنویں میں سے صرف ایک ڈول پانی نکال کر غسل کرنا ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ غسل کے دوران کسی کے ہاتھ سے گلاب کا پھول نیچے نہ گرے اور نہ ہی کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اپنی اصل جُون بھی کھو بیٹھو گے۔ بولو تیار ہو۔ تاریکی میں انیلا پری اور سعید کمال آدم زاد کے ڈول نکالتے اور اُس کے پانی سے غسل کرتے ہوئے ہیولے نظر آتے ہیں۔ لیکن اچانک گلاب کا پھول انیلا پری کے ہاتھ سے گرنے لگتا ہے اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ جیسی آواز نکلتی ہے۔ اور آدم زاد سعید کمال گھبرا کر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ بس پھر کیا ہے۔ ایک نیلگوں روشنی کا جھپاکا سا دکھائی دیتا ہے اور وہ دونوں دو مختلف نسلوں کے پرندے بن جاتے ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک جو الو ہے افسوس افسوس کہتا اُڑ جاتا ہے۔ اور دوسرا جو کسی نامعلوم نسل سے ہے وہیں اِدھر اُدھر دانا دُنکا چگنے لگتا ہے۔ سیفی کا چہرہ۔ وہ سعید کمال سے پوچھ رہا ہے۔ "چیف اب سوال یہ کہ وہ اُلو پری زاد تھا یا آدم زاد؟ اگر پری زاد تھا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ اُلو کی مادہ کو کیا کہتے ہیں۔ الواہ۔ الوی۔ الوہی۔ اولائی۔ الوائی یا صرف اُلی۔" بابا خوشیا حق۔ حق۔ حق۔ کی آوازیں منہ سے نکالتا ناچنے لگتا ہے۔ اچانک اُلو پھڑ پھڑاتا ہوا پھر قریب سے گزر جاتا ہے۔ سیفی کہتا ہے شاید یہ وہی اُلو ہے جو صدیوں سے اپنے کیے پر پچھتا رہا ہے۔ وہ سعید کمال کی

طرف دیکھ کر آنکھ مارتا ہے۔ ویسے انیلا یہ کافی 'بھاپی کہانی' ہے۔ کیوں چیف۔ وہ کہتا ہے اور پھر آنکھ مارتا ہے۔ چاندنی میں اُس کا آنکھ مارتا چہرہ صفدر سلطان صاف دیکھ لیتا ہے۔ اور سیفی پھر چیخنے لگتا ہے اور آنکھ ملنے لگتا ہے۔ آنکھ میں پھر کچھ پڑ گیا ہے۔ آنکھ پھر پھڑکنے لگی ہے۔ انیلا مجھے بھاپ دو۔ یہیں ذرا قریب آ جاؤ۔ مجھے بھاپ دو انیلا۔ بھاپ دو۔ سعید کمال اور صفدر سلطان کے بڑے بڑے دشمنانہ چہرے نظر آتے ہیں۔ انیلا سیفی کو نظر انداز کر کے صفدر سلطان کے قریب جاتی ہے اور بہت لگاوٹ سے پوچھتی ہے۔ "تمہیں قوالی پسند ہے صفدر؟"

مزار کے ٹوٹے ہوئے احاطے میں برقی قمقمے جگہ جگہ ہوا میں لہرا رہے ہیں اور وہیں قوال بیٹھے گا رہے ہیں۔ بھاپ دو۔ بھاپ دو...... سب بھاپ دو...... تب بھاپ دو...... اب بھاپ دو۔ جب بھاپ دو۔ سائیں بھاپ دو۔ بھاپ۔ بھاپ۔ بھاپ دو...... ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے سے سب دیکھ رہے ہیں۔ سعید کمال، سیفی، انیلا، صفدر سلطان، بابا خوشیا اور ماسٹر یاسین کے چہرے ایک ایک کر کے نظر آتے ہیں۔ وہ مزار کے احاطے میں جھانک رہے ہیں۔ بابا خوشیا قوالوں کے ساتھ تالیاں بجانے لگتا ہے۔ سعید کمال ماسٹر یاسین سے پوچھتا ہے کہ اگر یہ سب شُوٹ کرنا ہو تو کیسے کرے گا۔ ماسٹر یاسین دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے جوڑ کر اور دونوں انگشت شہادت کھڑی کر کے منظر کے فریم بنانے لگتا ہے۔ مزار کا اندرونی حصہ ایک قبر پر پڑی سبز چادر اور گلاب کے پھول۔ قوال کا کھلا منہ۔ سونے کا دانت۔ ایک قوال۔ دو قوال۔ تین قوال۔ چار قوال...... دس قوال۔ جھاڑیاں۔ دیوار۔ کنوئیں سے کوئی شخص مسلسل پانی کے ڈول نکال رہا ہے۔ آسمان میں چاند۔ ماسٹر یاسین کا فریم نیچے اترتا اترتا پھر قوالوں پر آ جاتا ہے۔ "باس یہ ہو جائے گا۔ لائیٹنگ ہمیں خود کرنی ہوگی۔ باقی انفیکٹ ڈالنے پڑیں گے۔" وہ ہنس کر کہتا ہے۔ "کون سے انفیکٹ۔" سعید کمال بُرا سا منہ بنا کر پوچھتا ہے۔ ماسٹر یاسین شرارت بھری نظروں سے سیفی اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "وہ جو اُلو، طوطا، چڑی پرندے بن جاتے ہیں۔ سائیں گلاب کی کہانی باس۔"

سیفی انیلا کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے۔ پھر اُس پر افراتفری سی طاری ہو جاتی ہے۔ تیزی سے جیب میں سے پنسل نکالتا ہے لیکن گھیسلا کاپی کہیں نہیں۔ بیگ موٹر سائیکل کے

ساتھ لٹکا چکا ہے۔ انیلا۔ انیلا۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں اپنی کاپی کے پاس مجھے بہت عرق گھسیٹا کاری آئی ہوئی ہے۔ ''ٹھہرو۔ تماشے نہ بناؤ۔'' انیلا کہتی ہے۔ ''یہ سب تماشہ ہی تو ہے خواب تماشہ۔'' سیفی کہتا ہے۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس پر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ انیلا جیسے گدگدی سے ہنسنے لگتی ہے اور ہاتھ چھڑانا چاہتی ہے۔ لیکن سیفی اس کا ہاتھ جکڑ کر لکھتا رہتا ہے۔ انیلا بُری طرح بل کھاتے ہوئے کہتی ہے۔ ''چھوڑو مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔'' ''تمہیں نہیں تمہارے ہاتھ کو گدگدی ہو رہی ہے۔'' قوالوں کی آواز اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ بھاپ دو۔ سائیں بھاپ دو...... سیفی اپنی آواز قوالوں سے بھی بلند کر کے سعید کمال کو مخاطب کرتا ہے۔ ''چیف۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔'' ''ہر لکھائی ایک گدگدی ہے لیکن ہر گدگدی ایک لکھائی نہیں۔ تم بہت پڑھے لکھے آدمی ہو کہیں میں نے کوئی بہت بڑی پتے کی بات تو نہیں کہہ دی۔ اگر ایسا ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' اُلو بولنے کی آواز آتی ہے اور پھر ڈھول بجتا ہے تو اُلو پھڑ پھڑاتا ہوا آسمان کو بلند ہو کر پھر چاند کے سامنے آ جاتا ہے۔ سعید کمال اُلو کو دیکھ کر کہتا ہے۔ ''یہ چیز ماسٹر۔ مجھے یہ شاٹ چاہیے۔'' پھر وہ انیلا اور سیفی دونوں کو نظر انداز کر کے صفدر سلطان کے قریب آ جاتا ہے ''سر یہ سب ضروری نہیں ہم شوٹ کریں یہ ہم اُس فلم کی بات نہیں کر رہے۔'' ''بالکل نہیں کر رہے''۔ سیفی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''میرا خیال ہے واپس چلنا چاہیے'' صفدر سلطان کا چہرہ تھکا اور اکتایا ہوا ہے۔ آنکھیں انیلا کے ہاتھ کی طرف ہیں جو سیفی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اب بھی اس پر کچھ لکھ رہا ہے۔ انیلا صفدر کی طرف دیکھ کر دلربائی سے مسکراتی ہے۔ صفدر سلطان منہ سے کچھ لایعنی سی آوازیں نکالتا ہے۔ اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ انیلا اپنا فارغ ہاتھ ہلاتی ہے۔ اور چہک کر پوچھتی ہے۔ ''چلیں صفدر؟'' اچانک بابے خُوشیے کے منہ سے خوفزدہ سی آوازیں نکلتی ہیں اور وہ دُور قبروں میں پھرتے سایوں کی طرف اشارے کرتا ہے۔ سیفی انیلا کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ انیلا ہاتھ پر لکھا پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن پڑھ نہیں پاتی۔

قبرستان میں ٹارچوں سے کچھ ڈھونڈتے پانچوں ہیولے اب قبروں اور جھاڑیوں کے علاقے سے نکل کر احاطے میں آ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک باقی چاروں کو بظاہر کوئی ہدایات دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور احاطے میں دور ایک جگہ کھڑی صفدر سلطان، سعید کمال کی

گاڑیوں اور سیفی اور ماسٹر یاسین کی موٹر سائیکلوں کی طرف اشارے کرتا ہے۔ پھر پانچوں ہیولے اُدھر ہی بڑھ جاتے ہیں۔ اور سوانگ گروپ کے سب افراد کی نظر سامنے گاڑیوں کے دائیں بائیں تاریکی میں ٹارچوں سے کچھ ڈھونڈتے ہیولوں پر پڑتی ہے۔ ''آ گئے'' بابے خُوشیے کے منہ سے ڈری ہوئی آواز نکلتی ہے۔ ''یہ کیا ہے؟'' سعید کمال بھی بوکھلا کر کہتا ہے۔ ''یہ بھی کوئی سپیشل ایفیکٹ لگتا ہے چیف۔'' سیفی کہتا ہے۔ اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے جس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ''یہ کوئی جرائم پیشہ افراد بھی ہو سکتے ہیں۔'' ماسٹر یاسین کہتا ہے۔ ''میں صاحب انہیں کئی دنوں سے...... اوپر دفتر کی کھڑکی سے...... رات ساری دیکھتا ہوں۔ بابا خُوشیا انکشاف کرتا ہے۔ ''آدھی آدھی رات قبروں میں کچھ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ کوئی ہوائی چیزیں ہیں۔'' ''میرا خیال ہے واپس ہو جانا چاہیے''۔ صفدر سلطان پریشانی سے کہتا ہے۔ ''آگے مجرم پیچھے قوال۔ دیکھو ذرا ہمارا حال۔ سیٹھ صاحب اگر یہ مجرم ہیں اور ہم سے ملاقات کے خواہشمند ہیں تو ہمیں بھاگنے نہیں دیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم پہل کریں بابا خُوشیا ہمارے نمائندے کے طور پر جائے گا......'' سیفی کہتا ہے۔ بابا خُوشیا چیخ پڑتا ہے۔ ''نہیں۔ میں نہیں جی۔ نہ جی'' ''اچھا تو میں پھر...... بابا خُوشیا کی طرح میری بھی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ میں ہی جاتا ہوں۔'' سیفی کہتا ہے۔ اور آگے بڑھتا ہے۔ انیلا گھبراہٹ میں اُسے پیچھے کھینچتی ہے۔ ''ٹھہرو ہم سب جائیں گے'' ''انیلا تم سیٹھ صاحب کا ہاتھ پکڑ لو ہو سکتا ہے میں مارا جاؤں'' ''کسی وقت تم بکواس سے باز نہیں آتے'' سعید کمال جھنجھلا کر کہتا ہے۔ سب آگے بڑھتے ہیں ماسٹر یاسین بلند آواز میں للکارنے کے انداز میں پوچھتا ہے۔ ''کون ہو بھئی تم؟'' ہیولے اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قوالوں کی قوالی جاری ہے۔ بھاپ دو۔ سائیں بھاپ دو...... سائیں سائیں۔ بھاپ بھاپ...... لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اب قوالوں پر نیند اور تھکن غالب آ رہی ہے۔ فضا میں خنکی بڑھنے کی وجہ سے اُن کے منہ سے بھی بھاپ نکلتی نظر آتی ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ اُنہیں منہ کھولنے اور خاص طور پر پھر بند کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔

سوانگ گروپ اور پانچوں ہیولوں کا گروپ اب آمنے سامنے آ چکا ہے۔ اچانک معتبر ہیولا ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے۔ ''معاف کیجیے گا جناب۔ ہماری وجہ سے آپ

پریشان ہوئے۔ دراصل ہم یہ قبرستان کر رہے ہیں۔ میں نے یہ گاڑیاں کھڑی دیکھیں تو ذہن میں خیال آیا کہ ہمارے اس قبرستان کے اردگرد جگہ جگہ پارکنگ دیکھنے میں آتی ہے۔ تو ہوسکتا ہے یہ کوئی ریکارڈ بنتا ہو۔'' سیفی کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ جو پھیلتی جارہی ہے۔ ''گنتی شروع ہوگی تو پتہ چلے گا۔ سب سے زیادہ ملحقہ پارکنگز والا قبرستان۔ گینز بک میں۔ ابھی تو خیر ہم قبریں اور کتبے کر رہے ہیں۔'' ''کون ہو تم؟'' سعید کمال دھاڑ کر پوچھتا ہے۔ معتبر ہوا اپنی چھوٹی سی جیبی ٹارچ ٹھوڑی سے نیچے رکھ کر اوپر کی طرف روشنی ڈالتا ہے ایک خوفناک سا چہرہ سامنے نظر آتا ہے۔ سیفی ہنسنے لگتا ہے اور کہتا ہے۔

''جبار صاحب میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ لگتا ہے اب آپ شاید کباڑ کمپلیکس میں مُردوں کو بھی شامل کر رہے ہیں۔''

جبار سیفی کو اچانک وہاں موجود پا کر قطعاً کسی حیرت کا اظہار نہیں کرتا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سیفی سے اس کی گفتگو کب کی جاری ہو۔ سب حیرت سے اُن کے درمیان مکالمے کو سُنتے ہیں۔

''جی سیفی صاحب ہم آج کل یہ قبرستان کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا سب سے قدیمی تو یہی ہے نا شہر میں؟''

''جی بالکل یہی ہے۔''

''بات اصل میں گلزار نرسری سے شروع ہوئی۔ آپ جانتے ہیں نا۔ ایشیا کی سب سے لمبی نرسری۔''

''جی۔ بالکل۔ گوشت خور پودوں کی پنیری والی......''

''تو وہ ریکارڈ چیلنج ہوگیا ہے۔ جان کہتا ہے۔ ویتنام میں ایک نرسری گلزار نرسری سے پانچ فٹ زیادہ لمبی ہے۔''

''جان یعنی گینز......''

''جی جی۔ بالکل۔ گینز بک آف ریکارڈز کا نمائندہ......''

''اوہو۔''

''بات لمبی ہے۔ ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟ اب ہم نے آپ کی فلم کے لیے مٹیریل

دینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تازہ تازہ مٹیریل آپ کو ملتا رہے تو اچھا ہے۔''

''اوہو۔ یہ ہمارے گروپ کے لوگ ہی ہیں۔ صفدر سلطان صاحب۔ ہمارے پروڈیوسر۔ سعید کمال صاحب ڈائریکٹر......'' جبار آگے بڑھ کر غور سے صفدر سلطان کی طرف دیکھتا ہے۔

''صفدر سلطان فلم پروڈیوسر...... صفدر سلطان ہمارے پروفیسر...... زندہ شکلیں تو بڑی فرق ہیں۔ مریں گے تو دیکھیں کیا بنتا ہے۔'' صفدر سلطان بڑبڑاتا ہے۔ ''عجیب بدتمیز......'' لیکن جبار کچھ پرواہ کیے بغیر سیفی سے مخاطب رہتا ہے۔ ''سیفی صاحب اب وہ کباڑ کمپلیکس کا باقاعدہ حصہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بھی ریسرچ پر لگا دیا ہے۔ پروفیسر صفدر سلطان۔ پروڈیوسر صفدر سلطان۔'' ہنستا ہے۔ ''سیفی صاحب عجیب بات ہے پچھلے دنوں میں نے کتبوں کا ڈیٹا کرتے ہوئے دیکھا کہ پانچ ہزار قبروں کے کتبوں میں ایک بھی صفدر سلطان نہیں۔ پروفیسر صفدر سلطان کو بتایا اُن کا خیال ہے کہ ریسرچ کرنی پڑے گی کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نام والے بہت کم مرتے ہوں۔ خود پروفیسر ابھی ہٹے کٹے ہیں یعنی جسمانی طور پر۔ اور یہ صاحب بھی......'' صفدر سلطان کی طرف پھر غور سے دیکھتا ہے۔ انیلا بے ساختہ ہنس پڑتی ہے۔ پھر ہنسی کو بریک لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ جبار ناپسندیدگی سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

''یہ خاتون بہت غیر سنجیدہ لگتی ہیں۔ ایکٹرس ہیں تمہاری؟'' سیفی کہتا ہے ''شاید آگے چل کر لیکن ابھی تو سکرپٹ رائٹر ہیں۔'' جبار چونکتا ہے۔ ''سکرپٹ رائٹر اور ایکٹرس یہ تو کوئی ریکارڈ...... خیر تو سیفی صاحب۔ گلزار نرسری...... ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟'' انیلا سامنے ڈرائی بلڈنگ کی طرف دیکھتی ہے۔ وہاں چند کھڑکیاں روشن ہیں۔ ''سیفی میرا خیال ہے ہم اوپر ہی دفتر میں بیٹھ سکتے ہیں۔'' سیفی بابے خُوشیے کو پاس بلاتا ہے۔ ''بابا جی'' ...... بابا خُوشیا آتا ہے۔ ''اوپر کوئی سونے کا انتظام ہے؟'' بابا دانت نکالتا ہے۔ ''جی۔ کرلیں گے۔ سب ہو جائے گا۔'' سیفی سعید کمال کی طرف مُڑتا ہے۔ ''چیف...... چلیں پھر'' سعید کمال کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ غراہٹ جیسی آواز نکالتا ہے اور کہتا ہے۔ ''نہیں میں جا رہا ہوں۔ انیلا میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں؟'' ''نہیں میں تو ابھی

ادھر رکوں گی۔" وہ کہتی ہے۔ "ہم شاید رات ادھر ہی رکیں گے چیف۔ جبار صاحب کہتے ہیں لمبی بات ہے۔" سیفی کہتا ہے۔ ماسٹر یاسین بظاہر سعید کمال کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ "ہاں، پھر کل میں پروجیکشن کا انتظام کراتا ہوں۔" اور پھر سعید کمال کچھ کہے بغیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ صفدر سلطان بھی کچھ کہے بغیر سر جھکائے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتا ہے۔ ماسٹر یاسین بابے خوشیے کے پاس سے گزرتے ہوئے کہتا ہے۔ "بابا جی۔ سیفی کی موٹر سائیکل اُدھر گیٹ پر ہی لے جاؤ۔ اُدھر" پھر وہ چاروں دوسرے افراد کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور جبار کہتا ہے۔ "نہیں ابھی ان بے روزگار نوجوانوں نے موٹر سائیکلیں چوری کرنے کا کاروبار شروع نہیں کیا۔ یہ میرے ورکرز ہیں۔"

چاہ پریاں والا کے مزار کے احاطے میں قوال اب اپنی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سو کر دائیں بائیں لڑھک چکے ہیں، طبلے، ہارمونیم، سارنگیاں اور دیگر ساز ویسے ہی جگہ جگہ پڑے ہیں۔ اچانک الو پھڑ پھڑاتا ہوا آتا ہے اور ایک ترچھے پڑے طبلے کی چمڑے کی سطح پر بیٹھنے کی کوشش میں پھسل کر ایک سوئے ہوئے قوال کے منہ پر گرتا ہے۔ الو کے پنجے گڑنے سے قوال ہڑبڑا کر جاگتا ہے اور اُس کے منہ سے الاپ جیسی کراہ نکلتی ہے۔ "بھاپ دو۔ سائیں بھاپ دو......"

جبار اپنے ورکرز میں بیس بیس کے روپے بانٹ رہا ہے اور کہتا ہے "میں محنت کا معاوضہ روز کا روز دینے کا قائل ہوں سیفی صاحب۔ یہ نوجوان بے روزگار تھے اب اللہ کے فضل سے کتبوں کے نام اکٹھے کر کے ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ پوچھیں گے، کیسے۔ میں آپ کو مکمل رپورٹ دوں گا۔ کیونکہ غالباً کباڑ خانے پر بننے والی آپ کی دنیا کی پہلی فلم ہوگی۔ اور یہ بھی ایک ریکارڈ ہوگا۔ جان آرہا ہے۔ ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟" "جی۔ جی۔" سیفی ایک طرف اشارہ کرتا ہے اور سیفی، انیلا، بابا خوشیا اور جبار ایک طرف جانے لگتے ہیں جبکہ چاروں ورکرز ایک قطار بنائے قبروں اور جھاڑیوں کا رُخ کرتے ہیں اور جلد ہی قبرستان میں غائب ہو جاتے ہیں۔ انیلا حیرت اور بابا خوشیا خوف سے اُنہیں جاتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ جبار ہنستا ہے۔ اور کہتا ہے "اگر آپ یہ ماننا چاہتے ہیں کہ اصل میں وہ مر چکے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ سیفی صاحب آپ کو نیند تو نہیں آرہی؟" سب عمارت کی طرف جا رہے ہیں۔ "نہیں نیند کوئی نہیں" سیفی کہتا ہے اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ انیلا کی آنکھوں میں چمک ہے۔

ایک پرتعیش ڈرائنگ روم۔ صفدر سلطان تیز تیز قدم اٹھاتا آتا ہے اور سیدھا ٹیلی فون کی طرف بڑھتا ہے۔ نمبر ڈائل کرتا ہے۔ ریسور کان سے لگائے انتظار کر رہا ہے۔ "ہاں۔ ہیلو۔ ماسٹر یاسین سے بات کرائیں۔ نہیں آئے۔ جیسے ہی آئیں اُنہیں کہیں بات کریں۔ صفدر سلطان بول رہا ہوں۔" بے زاری سے ریسور رکھتا ہے۔

سعید کمال کا بیڈ روم کمرے کی ایک دیوار پر ایڈورڈ مانے (Edourd Manet) کی مشہور پینٹنگ "گھاس پر دوپہر کا کھانا" یا "پکنک" اور سیلوڈار ڈالی (Salvador Dali) کی شہرہ آفاق پینٹنگ 'بیداری سے ایک سیکنڈ پہلے شہد کی مکھی کی انار کے گرد اُڑان کی وجہ سے پیدا ہونے والا خواب' کی عمدہ نقول لگی ہیں۔ اور اپنی عریاں تفصیلات کی وجہ سے فوری توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں۔ ایک سائیڈ کی دیوار پر سعید کمال کے اپنے پروڈیوس کیے ڈراموں کا چھوٹا سا فوٹو سیٹ لگا ہے...... جس میں انیلا بلال کی مختلف رولز میں تصاویر نمایاں ہیں۔ بیڈ روم کی آرائش اعلیٰ ذوق کی فوری عکاسی کرتی ہے۔ جو پہلے تو متاثر کرتی ہے۔ لیکن پھر بہت متعین اور بہت سوچی سمجھی ہونے کی وجہ سے مصنوعی لگتی ہے۔ سعید کمال ہاتھ میں بلی وایلڈر کی ٹوٹی ہوئی تصویر لٹکائے بوجھل قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ تصویر کو ایک کونے میں رکھتا ہے تو منہ سے سی کی آواز نکلتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کا کنارہ بائیں ہاتھ کی انگلی کو زخمی کر دیتا ہے۔ انگلی سے خون نکل رہا ہے۔ باتھ روم جاتا ہے۔ واش بیسن میں پانی کھولتا ہے۔ انگلی پانی کی دھار کی طرف بڑھاتا ہے۔ پھر رُک جاتا ہے۔ خون کا قطرہ نیچے گر چکا ہے۔ اور بیسن کی شفاف سفید سطح پر خون کی سرخی آہستہ آہستہ باہر کو رینگ رہی ہے۔ پانی بند کر دیتا ہے۔ پھر ایک اور قطرہ گرتا ہے۔ دونوں قطروں کی پھیلتی ہوئی سرخی ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگتی ہے۔ انگلی دبا کر پھر ایک تیسرا قطرہ نیچے گراتا ہے۔ کچھ دیر یہ منظر دیکھتا رہتا ہے۔ پھر پانی کھولتا ہے۔ انگلی دھوتا ہے۔ تولیے سے خشک کرتا ہے۔ انگلی پر روئی لپیٹ کر دباتا ہے۔ پانی بند کرتا ہے۔ بیڈ روم میں واپس آجاتا ہے۔ روئی لپٹی انگلی آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ اور پھر دوسرے ہاتھ سے روئی اٹھا کر اندر دیکھتا ہے۔ خون رک چکا ہے۔ کسی گہری سوچ میں بستر پر بیٹھتا ہے۔ پھر اُٹھتا ہے۔ سامنے رکھے ٹیلی فون کا ریسور اُٹھاتا ہے۔ اور پھر واپس رکھ دیتا ہے۔

سوانگ پروڈکشنز کا دفتر۔ گول میز کے گرد سیفی۔ انیلا آمنے سامنے جبکہ سعید کمال کی پسندیدہ جگہ پر جبار بیٹھا ہے۔ بابا خوشیا چائے کے کپ تینوں کے سامنے رکھ رہا ہے۔

ادارتی نوٹ

ہمیں یہاں پھر ایک استعمال شدہ لیکن ذرا سا مختلف بیانیہ انداز اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔ دراصل ہمیں بیان۔ اسلوب۔ کردار۔ واقعہ وغیرہ کے بارے میں کوئی دعویٰ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ لیکن ہم باز نہیں آتے۔ تو اب ہم بس چلنے دیں گے۔ جیسے چلتا ہے۔ خدا حافظ۔ لیکن نہیں، ہوسکتا ہے ہمیں پھر واپس آنا پڑے۔ بہر حال ہم ادھر ہی ہیں۔ اپنا خیال رکھیں۔

انیلا: (جبار سے مخاطب) ''ہوں۔ آپ کا خیال ہے کہ ارفشد نام چونکہ بیس ہزار کتبوں میں ایک دفعہ ملتا ہے...... اس لیے...... اس نام کے لوگ بہت کم مر......''

جبار: (بات کاٹتے ہوئے) ''...... جی نہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبریں جن پر کتبے نہیں لگے۔ ان میں زیادہ تر ارفشد ہوں...... ڈیٹا مکمل نہیں۔''

سیفی: ''یہ کافی منطقی بات ہے۔''

جبار: ''لیکن یہ ہمارا خیال نہیں میرا اور ارشاد صاحب کا نہیں بلکہ پروفیسر صفدر سلطان کا مفروضہ ہے۔ وہ بہت گہری ریسرچ میں ہیں۔ اور مفروضے بہت بناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنی خرد افروزی حاصل کرنے کے لیے سائنسی منہاس بہر حال اختیار کرنا ہوگا۔''

سیفی: ''منہاج......''

انیلا: (ہنس پڑتی ہے) ''بہت دلچسپ۔''

سعید کمال کے ہاتھ میں ریسیور ویسے ہی تھاما ہوا ہے۔ ہچکچاہٹ چہرے پر نمایاں ہے۔ ریسیور پھر واپس رکھ دیتا ہے۔

صفدر سلطان بستر پر لیٹا وزدیدہ نظروں سے ٹیلی فون کی طرف دیکھ رہا ہے۔

جبار: ''لیکن ہم تو جمع کرنے والے ہیں۔ گنائی کر رہے ہیں قبروں کی۔ کتبوں والی نجو

کتبوں والی۔ سنگ مرمر کے کتبوں والی۔ چپس والی۔ سیمنٹ کی بنی۔ کچی مٹی کی ناموں کی فائلیں بن رہی ہیں۔ حروف تہجی کے حساب سے۔ کہیں بھی۔ کوئی بھی۔ نیا ریکارڈ اچانک سامنے آسکتا ہے...... جان آرہا ہے۔''

سیفی: ''جی۔ جی۔ آپ نے بتایا۔ جان۔ جان...... کیا؟ پورا نام کیا ہے؟''

جبار: ''جان شیکسپیئر......''

سیفی: ''اوہو۔ یہ تو اچھا ہے۔''

جبار: (ہنستا ہے۔) ''یہ تو ہے۔ اور شیکسپیئر ارشاد صاحب کا مسئلہ بھی ہے۔''

سیفی: ''جی۔ جی...... مجھے کچھ اندازہ ہے۔''

جبار: (انیلا سے مخاطب) ''تو میڈم...... یہ ہے۔ کتبوں کے ناموں کو ریکارڈ کرنے سے عجیب عجیب مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً تین دن پہلے میرا ایک ورکر حسن کر رہا تھا۔''

انیلا: (حیران) ''حسن کر رہا تھا؟'' (سمجھ جاتی ہے) ''اوہو...... اچھا...... جی...... جی...... کتبوں پر یہ نام ڈھونڈ رہا تھا۔''

جبار: ''جی...... تو...... پھر وہی مسئلہ پیدا ہوا...... اب لوگ خالی نذیر، سلیمان، رمضان، فریدہ، شمیم تو نہیں ہوتے ساتھ کوئی اور نام ہوتا ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔''

انیلا: ''جی۔ جیسے۔ ولیم۔ نہیں آپ نے کہا۔ جان شیکسپیئر۔''

جبار: ''بالکل...... تو ہم کسے ریکارڈ میں رکھیں...... پہلا نام، دوسرا یا تیسرا، اب یہ جو بندہ تھا۔ اس کے نام میں تین نام تھے۔ حسن رضا ظہیر...... تو کس کھاتے میں ڈالیں۔ حسن میں، رضا میں، یا ظہیر میں......؟''

سیفی: (غیر معمولی سنجیدگی ظاہر کرتے ہوئے) ''واقعی...... بہت عجیب بات ہے۔''

جبار: (آہ بھرتے ہوئے) ''عجیب باتیں تو چپے چپے پر ہیں سیفی صاحب! بس دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے۔ اب آج شام ہی میں نے ایک عجیب چیز دیکھی۔ (چائے کا گھونٹ لیتا ہے) آپ کا یہ بابا ویسے چائے اچھی بناتا ہے۔ حالانکہ اس عمر کے بابے عام طور پر چائے اچھی نہیں بناتے...... بابا جی آپ کی عمر کیا ہے؟''

بابا خوشیا دانت نکالتا ہے اور آسمان کی طرف لایعنی سے اشارے کرتا ہے۔

بابا خوشیا: "جس...... دن...... بڑی لام لگی تھی...... اس دن میرا دادا بہشتی فوت ہوا تھا۔ اس سے حساب لگا لو......"

سیفی: "ہوں...... اس حساب سے تو بہتر سال بنتی ہے۔"

(ایلا کے تاثرات ایسے جیسے سانس روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔)

جبار: (رازدارانہ لہجہ) "دراصل۔ اسے اپنی عمر یاد نہیں۔ بلکہ سرے سے کبھی معلوم ہی نہیں رہی۔ آپ کے خیال میں شہر میں کتنے بابے ہوں گے جنہیں اپنی عمریں معلوم ہوں گی؟"

سیفی: "آپ کا شعبہ ہے جناب۔ کبھی ایسے بابے جمع کریں......"

ایلا: (بے چینی سے) "آپ کوئی عجیب بات بتانے لگے تھے۔"

سیفی: "ہاں جو آج شام آپ نے دیکھی......"

جبار: "جی...... وہ...... آج شام جب ہم قبرستان میں کام کرنے کے لیے آرہے تھے تو وہ سڑک نہیں جس پر تدفین کا ساز و سامان بیچنے والوں کی دکانیں ہیں۔"

ایلا: (اشتیاق سے) "جی...... جی......"

جبار: "کفن، کافور، چٹائیاں، اگربتیاں، پھول......"

سیفی: "جی۔ پھول...... بالکل پھول۔"

جبار: "تو ایک دکاندار نے سامنے ایک بڑے تختے پر یہ بڑے ڈھیر پھولوں، ہاروں، پتیوں کے لگائے ہوئے تھے۔ اور ان کے درمیان...... پھولوں کی پتیوں کے درمیان وہ بیٹھا تھا......"

ایلا: "کون؟ کون بیٹھا تھا......؟"

جبار: "ایک کچھوا!"

سعید کمال بستر پر کروٹ کے بل لیٹا ہے۔ بایاں ہاتھ آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ انگلی کے گرد لپٹی روئی میں خون کا دھبہ نمایاں ہو چکا ہے۔ چند لمحے دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر رک جاتا ہے۔

ایلا: "پھولوں، ہاروں، پتیوں میں بیٹھا کچھوا۔ حیرت انگیز...... سیفی کیسا امیج ہے؟"

سیفی: "آہ...... میں۔ میرا خیال ہے...... ہوسکتا ہے جبار صاحب کی نظر نے دھوکہ کھایا ہو۔ اور وہ کچھوا نہیں پھولوں میں آدھا دبا فٹ بال ہو......"

جبار کی بھنویں سکڑ جاتی ہیں اور ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔

جبار: "آپ نے تو مجھے شک میں ڈال دیا سیفی صاحب۔ واقعی ہوسکتا ہے۔ پھولوں میں آدھا دبا فٹ بال۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ ایشیا کا واحد پھول بیچنے والا ہوتا جو اپنے پھولوں میں کچھوا پالتا ہے۔"

ٹیلی فون کی پرشور گھنٹی بجتی ہے۔ سب بُری طرح چونک جاتے ہیں۔

سیفی: "یہ کون ہوسکتا ہے۔ اس وقت......؟"

ایلا: "شاید سعید ہو...... دیکھوں......"

ایلا اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف جاتی ہے۔ رسیور اُٹھاتی ہے۔

ایلا: "ہیلو......"

سعید کمال ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سُن رہا ہے۔ گہری سانس لیتا ہے۔

ایلا: "ہیلو۔ ہیلو...... ہیلو...... کوئی بول ہی نہیں رہا......"

سعید کمال سن رہا ہے اور اس کی نظریں دیواروں پر لگی پینٹنگز پر رینگتی آگے بڑھ رہی ہیں۔

ایلا: "کون ہے بھئی...... بولیں...... ہیلو......؟"

بابا خوشیا: "ایسے آجاتے ہیں جی۔ گم سُم ٹیلی فون۔ میں مرزا صاحباں سناتا ہوں۔ یا پھر...... حق۔ حق کرتا ہوں...... بند کر جاتے ہیں۔"

ایلا رسیور بابے کو دے دیتی ہے۔

سعید کمال رسیور دور ہٹاتا ہے۔ چہرہ بے تاثر ہے لیکن آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں۔

(سعید کمال کی آواز) Fucking Bitch دونوں حرامزادے بجھتے ہیں۔ میں مر رہا ہوں۔ اُس کی ٹانگوں میں گھسنے کے لیے۔ Shit مجھے تمہارا کام چاہیے۔ Bloody Well کام Fucking...... کام...... And you know it is real

"fucking good work. Damn it"

بھنویں سکیڑتا ہے۔ جیسے رسیور میں سے کوئی آواز سُنی ہو۔ رسیور کان سے ہٹا
ہے۔ بابا خُوشیا ماؤتھ پیس کو منہ کے بالکل ساتھ رکھ کر حق۔ حق۔ حق کی آواز
نکال رہا ہے۔ انیلا۔ سیفی۔ جبار اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ سعید کمال کا چہرہ
بگڑ جاتا ہے۔ رسیور پٹخ دیتا ہے۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا ہے۔ بیٹھ جاتا ہے۔
تصورات میں گُم چہرہ۔ جم جم جم کے عقبی حصے میں سعید کمال کھڑا ہے۔ باڈی بلڈر
کے لباس میں۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل۔ اپنے بائی سپز مسل دیکھتا ہے۔
بوندیں گرنے لگتی ہیں۔ دو تین بوندیں مسل کے اوپر گرتی ہیں۔ زبان نکال کر
بوندیں چاٹ لیتا ہے۔

سعید کمال بیڈ روم میں۔ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ! What a shot یہ اُس
Bitch کی Imagination ہے...... یا اُس کے Pimp کی...... پھر کھو جاتا ہے۔

جبار ہوپ نامی کُتے کے سامنے ایک اخبار بچھا رہا ہے۔ ارشاد آتا ہے۔ پوچھتا ہے
یہ لیپ کے سال کے اخبار تو نہیں۔ اُنتیس فروری کے اخبار تو نہیں۔ جبار کچھ پرواہ
کیے بغیر اخبارات پر مٹھائی ڈالنے لگتا ہے۔ ہوپ بے قرار ہو کر بھونکنے لگتا ہے۔
جبار اُس کے سر پر ایک تھپڑ رسید کرتا ہے۔ صبر کر۔ انسان بن...... کتا چاؤں کر کے
خاموش ہو جاتا ہے۔

سعید کمال قہقہے لگاتا ہے۔ That's one big fucking absurdity یہ بنے
گی۔ لیونا یہ فلم بنے گی۔ جانتا ہوں تمہارے پاس موت کی چہل قدمی کی بہت پاور
فل تھیم ہے۔ تمہاری فلم بنی بنائی ہے۔ لیکن یہ بن رہی...... یس بن رہی ہے—

جبار اچٹتی سی نظر سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں لگے کلاک پر ڈالتا ہے۔ ساڑھے
تین بج رہے ہیں۔ "یہ کلاک ٹھیک ہے؟" وہ پوچھتا ہے۔ "میرا خیال ہے ٹھیک ہی
ہے۔" سیفی کہتا ہے۔ اور ایک لمبی جمائی لیتا ہے۔ "تمہیں نیند آ رہی ہے؟" انیلا
پوچھتی ہے۔ "نہیں۔ ابھی تو تمہارے ساتھ بہت کچھ ڈسکس کرنا ہے۔" انیلا کو کچھ
یاد آتا ہے چونک کر اپنے ہاتھ پر سیفی کا لکھا دیکھتی ہے۔ اور حیران رہ جاتی ہے۔

پھر سیفی کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہے۔ وہ جبار کی باتیں توجہ سے سُن رہا
ہے۔ "سیفی صاحب ایک دفعہ میں نے پرانے کلاک جمع کرنے شروع کیے۔ ابھی
ایک سو بیالیس جمع کیے تھے۔ گینز والوں سے پوچھا۔ پتہ چلا سویڈن میں ایک بندہ
ہے جس نے بیالیس سو جمع کیے ہوئے ہیں اور ریکارڈ ہے۔ لعنت۔ میرا دل ٹوٹ
گیا۔ گینز بک بالکل بھر چکی ہے۔ جمع کرنے والوں کے لیے بڑا بُرا وقت آ گیا
ہے۔ تو پھر آپ کیا کہتے ہیں؟ ہمارا یہ نیا کام آپ کے کام آئے گا۔ فلم میں۔"
سیفی انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ انیلا مسکراتی ہے لیکن حیرت اب بھی اُس پر طاری
ہے اُچٹتی سی نظر سے پھر ہاتھ پر لکھا دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ "قبرستان۔ کتبوں ہم
نام کتبوں والا؟ نہیں۔ میرا نہیں خیال جبار صاحب۔ اس سکرپٹ میں تو ہم آپ
کے کباڑ کمپلیکس کو کسی اور طرح لے رہے ہیں۔ لیکن سیفی کیا پتہ ہم کبھی کباڑ
کمپلیکس 2 بنائیں اور اس میں قبرستان، کتبوں بلکہ پھول، پھوا اور چاہ پریاں والا
کی کہانی سب مل جائے۔" انیلا کہتی ہے اور پھر خاموش ہو کر حیرت سے سیفی کو
دیکھتی ہے۔ "ہماری اس فلم کا نام 'یہ فلم نہیں بن سکتی' ہو گا' تو کباڑ کمپلیکس 2
کہاں سے بنے گی؟ یا تو اس کا نام کباڑ کمپلیکس ہی رکھیں۔" سیفی کہتا ہے۔ بابا
خُوشیا ایک طرف صوفوں کے ساتھ ایک گدا بچھانے لگتا ہے۔ اور جبار سے پوچھتا
ہے۔ "صاحب آپ نے بھی اِدھر ہی سونا ہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔ باورچی خانے
میں بوری ڈال دیتا ہوں۔" "ہرگز نہیں۔" جبار ہڑبڑا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ "میرا
خیال ہے۔ مجھے نکلنا چاہیے۔ ہوپ کے لیے راتب بھی لینا ہے ایک جگہ سے۔"
"راتب۔" انیلا ہنستی ہے۔ "راتب تو ہاتھیوں کے لیے نہیں ہوتا؟" "ہوپ بھی کسی
ہاتھی سے کم نہیں۔ تم دیکھو تو۔" سیفی کہتا ہے۔ "جبار صاحب۔ ہوپ کا خاص خیال
رکھیں۔ اس فلم میں کاسٹ ہے وہ۔ اس کے آپ کو الگ پیسے ملیں گے ہمارے سیٹھ
سے۔ ایسا نہ ہو کہ جب کبھی اگلے "عظیم نجات دہندہ" سے نجات کی خوشی آئے اور
مٹھائی کھانے کھلانے کے دن آئیں تو ہوپ اس سے پہلے ہی ہارٹ اٹیک سے
فوت ہو چکا ہو۔" "نہیں فکر کی کوئی بات نہیں سیفی صاحب۔ ایک سلوتری ہر ماہ

ہوپ کا طبی معائنہ کرتا ہے۔'' ''سلوتری کیا؟'' انیلا پوچھتی ہے۔'' جانوروں کے
روایتی معالج کو کہتے ہیں۔'' سیفی بتاتا ہے۔ ''ویسے یہ نیا ''عظیم نجات دہندہ'' جو
آیا ہے۔ یہ بھی زیادہ دیر نکلتا نظر نہیں آتا۔ ارشاد صاحب کا خیال ہے۔'' جبار جانے
ہے۔ اور جانے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔'' ارشاد صاحب کا تعلق Establishment
سے ہے۔'' سیفی رازدارانہ لہجے میں انیلا کو بتاتا ہے۔ ''Oh Really!'' انیلا
حیرانی کا اظہار کرتی ہے۔ ''پھر تو سیفی ہمیں یہ فلم جلد بنا لینی چاہیے۔ کچھ پتہ نہیں
کب کیا ہو جائے۔'' ''میرا خیال ہے میڈم ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہمیں کئی بار اطلاع
ملتی ہے کہ کباڑ کمپلیکس پر چھاپہ پڑنے ہی والا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ ہوپ کے
لیے راتب تو لینا ہے۔ مجھے خود بھی ناشتہ کرنا ہے۔'' سیفی اور انیلا حیرت سے ایک
دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ ''تو کیا آپ خود بھی اُسی راتب سے؟'' ''نہیں
جی۔ میں تو شہر کے ایک مشہور سری پائے کی دوکان پر جاؤں گا۔'' ''فیقا سری پائے
والا؟'' بابا خوشیا ہنس کر پوچھتا ہے۔ ''جی بابا جی۔'' جبار قدرے ناپسندیدگی سے کہتا
ہے ''واہ۔ رات ناشتوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔'' سیفی کہتا ہے۔ ''انیلا ناشتہ تو ہم
نے بھی کرنا ہے۔ فیقا سری پائے والا۔'' ''آپ ادھر ہی ٹھہرو آرام کرو۔ میں
تمہارے لیے لاتا ہوں۔ فیقے کا سودا۔ صاحب کے ساتھ ہی جاتا ہوں۔'' بابا خوشیا
کہتا ہے۔ جبار کی ناپسندیدگی مزید بڑھ جاتی ہے۔ ''یہ بابا خود واپس آ جائے گا!؟
کافی دور جگہ ہے۔'' وہ مبہم سا سوال اٹھاتا ہے۔ ''جی۔ جی۔ بابا ہمارا بہت چوکا
ہے جبار صاحب۔'' سیفی بتاتا ہے۔ ''یہ پھاہے لگ گیا تھا۔ خودکشی کے چکر میں۔
لیکن بچ گیا۔'' جبار کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی ہیں۔ ''کیا واقعی۔'' بیٹھنے لگتا ہے۔
''کیسے بابا جی؟ بتاؤ۔ بتاؤ۔'' ''صاحب چلو راستے میں تمہیں ساری کہانی سناؤں
گا۔'' جبار کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے اور وہ بخوشی بابے خوشیے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں گہری خاموشی اُتر آتی ہے۔ گول میز کے
گرد آمنے سامنے بیٹھے انیلا اور سیفی چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں
دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک نامعلوم سا اضطراب اُن کے چہروں کے تاثرات سے

ظاہر ہوتا ہے۔ پھر سیفی جس کے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں اپنے سامنے میز کے
تختے پر بے چینی سے حرکت کر رہی ہیں۔ غور سے میز کے اُس حصے کو دیکھنے لگتا ہے
اور پھر اُنگلیوں سے چُھو کر مہاگنی کی لکڑی پر کچھ دیکھنے لگتا ہے۔

''میں نے پہلے بھی اِن نشانوں کو محسوس کیا ہے۔ اگرچہ یہ رگڑائی پالش وغیرہ سے
خوب چُھپائے گئے ہیں۔ لگتا ہے یہ کسی تیز دھار آلے کے نشان ہیں۔ تم نے انہیں
دیکھا ہے انیلا......'' انیلا گہری سانس لیتی ہے۔ ''نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔ میں
نے یہ دیکھا ہے۔'' وہ کہتی ہے اور اپنا بایاں ہاتھ میز کے اوپر سیفی کے سامنے لے
آتی ہے۔ ''میں نے پڑھا ہے۔''

سیفی آہستگی سے انیلا کا ہاتھ تھامتا ہے۔ تھامے رکھتا ہے۔ اور پھر بوجھل آواز میں
انیلا کی ہتھیلی پر اپنا لکھا پڑھتا ہے۔ ''چاہ پریاں والا اور کباڑ کمپلیکس دو الگ الگ
دنیائیں ہیں......'' وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

''آگے......'' انیلا بے چینی سے کہتی ہے۔ سیفی اُس کا ہاتھ چُومتا ہے۔

صفدر سلطان شب خوابی کے لباس میں ہے۔ اور زیادہ بھدا اور منحوس لگ رہا ہے۔
رسیور ہاتھ میں ماسٹر یاسین سے جو ایک بوسیدہ اور گندے سے مکان کے برآمدے
میں بیٹھا ہے۔ فون پر بات کر رہا ہے۔ سامنے صحن میں ایک بکرا بندھا ہے۔ ''میری
بات سن رہے ہو ماسٹر؟'' ۔ ''جی سر جی'' اچانک ڈرائنگ روم میں سے ایک عورت
بوجھل قدم اٹھاتی گزرتی ہے۔ عورت نے چمکیلا نائٹ سوٹ پہنا ہوا ہے وہ
صفدر سلطان سے بھی زیادہ بھدی اور بدشکل ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف
مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ عورت کہتی ہے۔ ''آپ اتنی رات باہر رہے
ہیں۔ اتنی دیر سے آئے ہیں۔ اب یہ چُپکے چُپکے کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ سونا
نہیں؟'' ۔ ''میں آ رہا ہوں تم چلو۔'' عورت جاتی ہے۔ (دھیمی آواز) ''دیکھو ماسٹر
میں تمہیں اپنا مسئلہ سمجھا چکا ہوں۔ دیکھو میں تمہیں جو اصل بات کہنے لگا ہوں۔''
''جی سر جی۔'' صحن میں بکرا پیشاب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پیشاب کرنے کے
بعد اُس کا جسم زور سے تھرتھراتا ہے۔ پھر فرش پر بیٹھ کر پیشاب کو سونگھتا ہے۔ اور

اوپری ہونٹ اور نتھنے اس طرح سکیڑتا ہے کہ دانت نظر آنے لگتے ہیں۔" ہاں ماسٹر
تم بے شک اُسے میری طرف سے شادی کا پیغام دے دو۔" صفدر سلطان کہتا
ہے۔ ماسٹر یاسین کی آنکھیں پھیلتی ہیں اور چہرے پر ایک خبیثانہ مسکراہٹ نمودار
ہوتی ہے۔ "اتنی جلدی نہ کریں سر جی۔ اپنے حساب سے بات آگے بڑھنے دیں۔
ابھی پیغام دینا ٹھیک نہیں۔ کہیں ہتھے سے ہی نہ اُکھڑ جائے۔" بکرا پھر بے بے
کی آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ صفدر سلطان غور سے سُننے کی کوشش کرتا ہے۔ "یہ
آوازیں کیا آ رہی ہیں؟" "بکرا ہے سر جی۔ بکرعید آگے آ رہی ہے۔ بڑا خرچہ ہو
گیا ہے۔ پوری ہی نہیں پڑتی بہن چود۔ کام کوئی خاص ہے نہیں۔ سٹوڈیو بند ہو
رہے ہیں۔ سوچا تھا یہ کام شروع ہو گا تو...... اُدھر بہن چود سکرپٹ ہی نہیں بن رہا،
پاس ہو رہا ہے۔" تھوڑی دیر بعد عورت خاموشی سے آ کر ایک طرف چھپ کر
ڈرائنگ روم میں کھڑی ہو جاتی ہے اور صفدر سلطان کی باتیں سُننے کی کوشش کرتی
ہے۔ لیکن آواز دھیمی ہونے کی وجہ سے اُسے سمجھ نہیں آ رہی۔ چہرے پر غصے کے
تاثرات۔ "ماسٹر تم بتاؤ۔ کتنے تمہیں چاہئیں۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بول دیا
کرو۔" "نہیں۔ نہیں۔ سر جی۔ اوئے چھری کے نیچے دم لے۔" "کیا...... یہ کیا
بکواس کر رہے ہو؟" "نہیں سر بکرے کو کہا ہے۔ میری بات سُنیں سر جی۔ شادی کا
بھی کر لیں گے لیکن اس بی بی کا کوئی اعتبار نہیں۔ دیکھا جائے گا۔ ابھی یہ کرتے
ہیں آپ کا ایک ٹھکانہ بناتے ہیں۔ ایک کوٹھی ہے میری نظر میں۔ ایکسٹرا
ڈانسریں، بڑی سوہنی مل جاتی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ بلی سے آپ کی بات
کراتے ہیں۔ مردوں کی سیانی بولتی ہے اپنے آپ کو۔ بالی کو اُس کا بڑا پتہ ہے۔
اُس سے بات کرائے گا وہ۔ شادی کا بھی کر لیں گے...... پر ابھی اُس بی بی کو نہیں
کہنا۔ کام خراب ہی نہ ہو جائے نا۔ ابھی سکون تو کرائیں آپ کو۔ آپ سکون تو
کریں۔" صفدر سلطان کی آنکھوں میں چمک اور مسکراہٹ چہرے پر پھیلتی ہے۔
"سکون۔ ہاں۔ ہوں۔ اچھا...... ہاں۔ مجھے سکون۔ ایکسٹرا۔ سکون۔ اچھا ہے۔"
ہنستا ہے۔ عورت کچھ سُنتی ہے۔ سر ہلاتی ہے۔ بکرا پھر پیشاب سونگھتا ہے۔ پھر

خوفناک سا منہ بناتا ہے۔ "اور سر جی آپ ٹھیک طرح سے آ جائیں فلم لائن میں۔
یہ ٹھیک نہیں ہے آدھا اندر۔ آدھا باہر۔" صفدر سلطان قہقہہ لگاتا ہے اور آواز پر قابو
نہیں رہتا۔ "آدھا اندر۔ آدھا باہر کا اپنا ہی مزا ہے۔" ماسٹر یاسین بھی ہنستا ہے۔
عورت یک دم سامنے آ جاتی ہے۔ "یہ آپ کس سے گندی باتیں کر رہے ہیں؟"
صفدر سلطان گھبرانے کی بجائے غصے سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ "ماسٹر یہ تجویز
تمہاری اچھی ہے۔ بات کریں گے۔ دیکھتے ہیں" "کیسی سیانی ہے مردوں کی" ہنستا
ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ یہ کر لیتے ہیں۔ مردوں کی سیانی۔ پر شادی پر لاؤ اُسے بھی
کسی طرح انیلا رانی کو۔ اشارہ دو ماسٹر۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ الگ کوٹھی لے
دوں گا۔ عیش کرے گی۔ کار کرولا 85 ماڈل کی لے دوں گا۔ ماسٹر بُرا سا منہ بناتا
ہے "دیکھتے ہیں سر جی۔ یہ بھی دیکھتے ہیں۔" صفدر سلطان ریسیور رکھتا ہے۔ "کون
کنجری تھی؟" عورت پوچھتی ہے۔ صفدر سلطان غصے سے لڑکھڑا کر عورت کی طرف
بڑھتا ہے۔ اور ایک تھپڑ اُس کے منہ پر مارتا ہے۔ "مارو۔ مارو۔ اور مارو۔" عورت
کی آواز بھرائی ہوئی ہے۔ صفدر سلطان تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دیتا ہے۔
عورت کی آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ "مارو۔ مارو۔ اور مارو۔" صفدر سلطان اُسے
کھینچتا ہوا بیڈ روم کی طرف لے جاتا ہے۔ دھکا دے کر اُسے ایک پلنگ پر گرا دیتا
ہے اور پھر خود اُس کے اوپر گر جاتا ہے۔ دونوں کی گہری سانسوں کی آوازیں
کمرے میں پھیل جاتی ہیں۔

ماسٹر یاسین جیسے بکرے سے باتیں کر رہا ہے۔ "کہتا ہے شادی پر لاؤ اُسے کسی
طرح۔" "زہر آلود ہنسی۔" "پاگل کا پتر......"

بکرا پیشاب سونگھتا ہے اور دانت نکالتا ہے۔ "اسے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تھوکتی
ہے تیرے پیسے۔ کوٹھی پر...... پر پیسہ تو اسی سے نکلوانا ہے۔ فلم بنے۔ روزی آئے۔
کیا کہتا ہے۔"

بکرا بے بے کی آوازیں نکالتا ہے۔ بکرے کے سامنے کچھ چارہ ڈالتا ہے۔ بکرا
کھڑا ہو کر کھانے لگتا ہے۔ ماسٹر یاسین کی بڑبڑاہٹ جاری رہتی ہے۔ "تیرا پکا

علاج وہی کرے گی...... ببلی۔ ٹھنڈ پڑ جائے گی تجھے۔'' بکرا پھر پیشاب کرنے لگتا
ہے۔ ''ستیاناس۔ اوئے دو ٹینکیاں اندر فِٹ کرائی ہوئی ہیں تو نے۔ چل کر لے
لے پُتر۔ پھر تجھے باندھتا ہوں...... اب دن تیرے تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔
ہو خو...... کہتا ہے نئی کرولا لے کر دوں گا...... چوتیا...... آگ لگاتی ہے تیری کرولا
کو...... شادی کرادو...... شکل دیکھ اپنے۔ اوئے وہ دونوں تو جان دیتے ہیں ایک
دوسرے پر۔ ہنسوں کی جوڑی ہے۔ ابھی دفتر میں......'' عجیب سے انداز میں
مسکراتے ہوئے کھونٹے سے بکرے کی رسی کھولنے لگتا ہے۔ اچانک بکرا پیچھے کو ہٹ
کر اگلی ٹانگیں اُٹھا کر سر جُھکا کر ماسٹر یاسین کی پشت پر ٹکر مارتا ہے۔ ماسٹر اُچھل کر
دُور جا گرتا ہے۔ غضبناک ہو کر بولتا ہے۔ ''اوئے کیوں تیری موت آئی ہے۔''

انیلا اور سیفی سوانگ پروڈکشنز کے دفتر کے دائیں حصے میں پڑی
نشستوں میں قریب قریب بیٹھے ہیں۔ بائیں حصے کی بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔ اور
روشنی کی تبدیل شدہ صورتِ حال کی وجہ سے عظیم فلم ڈائریکٹروں کی تصاویر کے فریم
دیوار سے اُکھڑے ہوئے سے لگتے ہیں۔ جبکہ گول میز کمرے میں بننے والے نئے
سایوں میں رکھی ایک مہیب وجود نظر آتی ہے۔

انیلا اپنا بایاں ہاتھ آہستگی سے سامنے لاتی ہے اور پھر پڑھتی ہے۔ ''چاہ پریاں والا
اور کباڑ کمپلیکس دو الگ الگ دُنیائیں ہیں۔ آؤ انیلا آؤ۔ پانی کا ایک ڈول اپنے
اوپر ڈالیں اور بھاگ جائیں۔ بھاگو انیلا بھاگو۔ ان دونوں دنیاؤں کے درمیان
ایک خالی جگہ ہے۔ جو کبھی پُر نہیں ہو سکتی۔ چلو انیلا میرے ساتھ بھاگ چلو۔''

انیلا گہری سانس لیتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے۔ لمحے گزر جاتے ہیں۔ ''میں
تمہارے ساتھ بھاگ چلوں۔ تم میرے ساتھ کیوں نہیں بھاگ چلتے۔'' وہ کہتی
ہے۔ سیفی حیرت سے انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ ''ایک ہی بات نہیں کیا۔'' وہ
بے یقینی سے پوچھتا ہے۔

''نہیں ایک ہی بات نہیں۔ میں جانتی ہوں تم مجھے کس طرف بھگا لے جانے
والے ہو۔''

''تو تم مجھے دوسری طرف لے جانا چاہتی ہو۔''

''نہیں۔ میں دونوں طرف نہیں چھوڑ سکتی سیفی۔ تم نے جو کہا ان دونوں دنیاؤں کے
درمیان جو خالی جگہ ہے۔''

''ہوں۔'' سیفی کندھے اُچکاتا ہے۔

''وہ ایک خالی دنیا ہے۔ جسے صرف ہم پُر کر سکتے ہیں۔''

سیفی بے چین سا ہو کر اُٹھنے لگتا ہے۔ انیلا اُسے بازو سے پکڑ کر واپس کھینچ لیتی ہے۔

''کہاں بھاگ رہے ہو؟''

''اپنے آپ سے شاید۔'' سیفی کہتا ہے اور انیلا اپنا لکھا ہوا ہاتھ سیفی کے لکھنے والے
ہاتھ پر رکھ دیتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور گہری خاموشی
میں ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز سنتے ہیں۔ اُلو چاند کے سامنے آتا ہے اور
ڈھول بجنے کی آواز آتی ہے۔

سعید کمال بستر میں لیٹا ہے۔ آنکھیں بند بظاہر سویا ہوا لگتا ہے۔ پھر آنکھیں کھول
لیتا ہے۔ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے۔ پھر آنکھیں بند کرتا ہے۔ کمرے میں دھیمی
روشنی۔ (سیفی...... لوگ ایک دوسرے پر گلاب جامن پھینک رہے ہیں۔
گلاب جامن کا شیرہ ایک دوسرے پر انڈیل رہے ہیں...... ایک مولوی کی داڑھی
شیرے سے تر ہو جاتی ہے۔ ملٹری کا ایک نوجوان اُس کی داڑھی چُوس رہا ہے۔
میگا فون...... پیارے بونے نے مجھے دھوکہ دیا...... (انیلا)...... گول میز جو ہے وہ
ہمارے سروں سے اوپر ہوا میں معلق ہے۔ میز کے اوپر ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے......
(سیفی) وقت کو پھانسی دو...... بند کرو...... بند کرو...... سب بند کرو...... تان سین
بینڈ والوں کے ڈیرے سے باہر ایک سائن بورڈ پر کلارنٹ بجاتے ایک شخص کی
تصویر بنی ہے...... ویسے ہم نے سارے سیٹ اپ کا نام کباڑ کمپلیکس رکھ دیا
ہے...... آخر گنیز بک آف ریکارڈ والوں کو بھی تو متاثر کرتا ہے...... (ارشاد)
There are more things in heaven and earth, Horatio
than are dreamt of in your philosophy ۔ہا۔ آؤٹ آف کیریکٹر۔

Fucking۔ آؤٹ آف کیریکٹر......"

سیفی اپنا بازو انیلا کے کندھوں کے گرد پھیلاتا ہے اور کہتا ہے۔

"میری آج کی سب واہی تباہی اصل میں اسی شک۔ بے یقینی کی ڈرامے بازی تھی...... "یہ فلم نہیں بن سکتی انیلا۔"

"جب ہم...... جس طرح ہم یہ تیس منٹ کا سکرین پلے لکھ رہے تھے۔ ہمارے تھے۔ اُس وقت تو تمہیں ایسی کوئی بے یقینی نہیں تھی......"

سیفی اور بھی انیلا کی طرف جھک جاتا ہے۔ "نہیں۔ اس...... لکھنے کی حد تک لیکن فلم کے ساتھ مسئلہ یہی ہے کہ صرف اپنے اوپر یقین کافی نہیں......"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ دیکھو جہاں تک سعید کا تعلق ہے۔ اُسے ایک واپسی چاہیے۔ اتنی بڑی کہ اِدھر اُدھر چُھپ کر اُس پر ہنسنے والوں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔ ایک عظیم فلم ڈائریکٹر۔ سعید کمال۔ اور یہ اُسے اِس فلم میں صاف نظر آرہا ہے۔ وہ کیسی بھی بکواس کرے۔ اور پھر بہرحال اس کی صلاحیتوں اور مقصد سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہوں...... اور سیٹھ......"

انیلا ہنستی ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارت بھر جاتی ہے۔

"آ۔ مائی ڈیئر صفدر۔ میں اس سے آگے بھی جا سکتی ہوں۔ سیفی...... لیکن...... سوال یہ ہے تمہیں کیسا لگے گا۔"

"عظیم مقصد کی خاطر کچھ بھی برداشت کیا جا سکتا ہے۔" سیفی لاپروائی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"جھوٹ نہ بولو...... تمہیں تو...... میرا اُسے سگریٹ پیش کرنا بھی بُرا لگتا ہے۔"

"مارو خبیث کو۔ پلا پلا کر سگریٹ......"

"یہ بات......" انیلا بے ساختہ کہتی ہے۔ اور دونوں ہنستے ہیں۔

"ویسے۔ سیفی۔ وہ جو۔ ویسے کافی پٹی ہوئی بات ہے۔ ہر عورت میں ایک ننھی مُنی طوائف چھپی ہوتی ہے۔ وہ ہے صحیح بات......"

"ہوں...... میرا خیال ہے۔ ماسٹر یاسین بھی سیٹھ کے لیے اسی لائن پر سوچ رہا ہے۔ لیکن ننھی مُنی نہیں۔"

"یعنی میرے مقابلے میں کوئی پروفیشنل لاؤ گے......"

"تم کسی سے کم تو نہیں ہو میری جان......" سیفی کہتا ہے۔ انیلا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ پھر وہ اپنی مخصوص Husky آواز میں کہتی ہے۔ "دیکھو گھسیٹے۔ میں نے یہ فلم لکھنی ہے۔ ہر قیمت پر اور تمہاری گھسیٹا کاری کے ساتھ لکھنی ہے۔ "یہ فلم نہیں بن سکتی۔" ضرور......"

"بنے گی......" سیفی انیلا کی بات مکمل کرتا ہے۔

"ہاں۔ سیٹھ Or نو سیٹھ۔ بلکہ سعید Or نو سعید۔ "یہ فلم نہیں بن سکتی" بنے گی۔ اُس خالی دنیا میں جو چاہ پریاں والا اور کباڑ کمپلیکس کے درمیان ہے۔"

سیفی اپنا بازو انیلا کے کندھے سے ہٹا کر اُس کا لکھا ہوا ہاتھ پکڑتا ہے اور سامنے لاتا ہے۔ "میرا خیال ہے۔ جب میں نے یہ لکھا۔ اُس وقت میں آؤٹ آف کریکٹر ہو رہا تھا۔"

"آؤٹ آف کریکٹر ہو کر تو بندہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"کیا کچھ؟"

جبار اور بابا خُوشیا فیقا سری پائے والے کی دکان کے سامنے بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں۔ بابا خُوشیا کافی بیزار نظر آتا ہے۔

جبار: "اچھا بابا جی پھانسی لیتے وقت درد ہوتی ہے؟"

بابا: "بڑی درد ہوتی ہے۔"

جبار: "کتنی درد ہوتی ہے؟"

یک دم بابا خُوشیا جبار کے گلے کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر دبانے لگتا ہے۔ جبار کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ دکان کا ملازم بھاگ کر آتا ہے۔

ملازم: "اوئے۔ اوئے۔ چھوڑو۔ چھوڑو بابا جی۔"

بابا خُوشیا جبار کا گلا چھوڑ دیتا ہے۔

بابا خوشیا: ''پوچھتا جاتا ہے۔ پوچھتا جاتا ہے۔''
جبار: (ملازموں سے) شکریہ۔ شکریہ۔ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔
ملازم: ''بڑا نازک معاملہ ہے بھئی۔''

سیفی اور انیلا کمرے کے بائیں نیم تاریک حصے میں آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ سیفی کا ایک ہاتھ میز کی سطح پر رکھا ہے۔
انیلا کی آواز تیز سرگوشی جیسی کمرے میں پھیلتی ہے۔ ''سیفی مجھے لگتا ہے۔ مجھے تم سے شدید محبت ہو چلی ہے۔ آؤٹ آف کریکٹر بول رہی ہوں۔''
سیفی ہنستا ہے اور اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں میز پر ایسے پھرنے لگتی ہیں۔ جیسے ٹٹول کر کچھ تلاش کر رہی ہوں۔
''مجھے بھی...... محبت ایک خالی جگہ ہے جان۔ ذہن میں بھی اور جسم میں بھی۔ خالی جگہیں پُر کرو......''
''خالی جگہ۔ خالی دنیا۔ چاہ پریاں والا اور کباڑ کمپلیکس کے درمیان......''
''ویسے یہ بڑی عجیب بات ہے۔ نیلی۔ ہم سے پہلے ہی یہ ایک خالی دنیا کسی نے پُر کر دی۔''
''کیا مطلب؟''
''جبار کی آمد حیرت انگیز تھی۔ تم نے دیکھا نہیں۔ چارہ پریاں والا اور کباڑ کمپلیکس کے درمیان مُردوں کی مردم شماری شروع ہو چکی ہے۔''
''ایسی باتیں نہ کرو۔''
''موت کی باتیں نہ کرو......'' سیفی کہتا ہے اور میز کی سطح پر ایک جگہ مسلسل چھوتی اُس کی اُنگلیاں رُکتی ہیں۔ اور وہ بہت بدلے ہوئے لہجے میں کہتا ہے۔
''یہ انیلا یہ میز پر نشان......'' لائٹ آن کر دیتا ہے۔ انیلا بُری طرح گڑبڑا سی جاتی ہے۔
''لعنت بھیجو۔ یہ اس وقت کیا سُوجھی ہے تمہیں سیفی......''
سیفی کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہیں اور ایک عجیب سی کرختگی نظر آتی ہے۔
''دیکھو۔ میں کہتا ہوں دیکھو۔ میز کو چُھو کر دیکھو......'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

پھر انیلا پر بھی ایک وحشت سی طاری ہوتی ہے۔ تیزی سے لائٹ کا سوئچ آف کرتی ہے۔ اور سیفی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے کی دوسری طرف لے جاتی ہے۔ دھکا دے کر صوفے پر گرا دیتی ہے۔ اور پھر خود بھی اُس کے اوپر گرتے گرتے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔
''یہ تمہیں کیا ہوتا ہے؟ نشان۔ میز۔ لعنت بھیجو اس منحوس میز پر۔''
سیفی سر جھٹکتا ہے۔ دونوں گہری گہری سانسیں لیتے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔
اچانک سیفی گھبرا کر زور زور سے اپنی آنکھ مسلنے لگتا ہے۔
''کیا ہوا؟''
''لگتا ہے آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ انیلا مجھے بھاپ دو۔ مجھے بھاپ دو نیلی......''
انیلا ہنستی ہے۔ اُس کی ہنسی میں ایک بوجھل گونج ہے۔ وہ اپنے دوپٹے کے کونے کو تہہ کر کے سیفی کی آنکھ کی طرف لے جانے لگتی ہے۔ سیفی جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اُن کے ہونٹ چُھوتے ہیں اور خواہش کی شدت میں لرزتے۔ ایک دوسرے سے لپٹتے ہیں۔ نگلتے ہیں۔ یک دم سیفی اپنا چہرہ ہٹاتا ہے۔ پھولی سانسوں میں اُس کے لفظ سنائی دیتے ہیں۔
''محبت ایک آدم خوری بھی ہے۔ مجھے گھسیٹ لینے دو انیلا پری۔''
''تم پاگل ہو۔'' انیلا کہتی ہے اور اُس کو سر کے بالوں سے جکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ سوانگ پروڈکشنز کے کمرے میں بھاپ بھرنے لگتی ہے۔ جیسے سب کچھ غائب ہونے لگتا ہے۔ کمرہ خالی ہو چکا ہے۔
سائیں پریاں والا کے مزار سے قوالوں کا طائفہ گلاب کے پھولوں ہاروں میں لدا پھندا واپس جا رہا ہے۔ کنوئیں میں سے ایک مرد اور عورت مسلسل پانی کے ڈول نکال رہے ہیں۔ کمرے میں سب کچھ غائب ہو چکا ہے اور گہری دھند جیسی گرم بھاپ میں سے اُن کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔
''دیکھا آؤٹ آف کیریکٹر ہونا کتنا خطرناک ہے...... ان جگہوں سے شاید

تمہارے پر اُترے ہیں پری...... تم چپ نہیں رہ سکتے...... میری زبان کو تم صرف
اپنی زبان سے بند کر سکتی ہو...... تمہارے کان کتنے بڑے بڑے ہیں۔ دیکھنے سے
اندازہ نہیں ہوتا تھا آدم زاد۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا...... مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ
تمہارے جسم پر ایسا برتھ مارک ہوگا...... ہو بھی کیسے سکتا تھا...... لیکن تم پری نہیں
شاید جادوگرنی ہو۔ یا جادوگر پری۔ جادوگرنیوں کے جسم پر ایسے مارک ہوتے
ہیں۔ انہیں زندہ جلانے سے پہلے وہ انہیں اُن کے جسموں پر ڈھونڈتے تھے...... تم
مجھے جلا رہی ہو ڈیئی...... چپ کرو...... باہر کھڑکی کے قریب سے
اُلو کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سُنائی دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ اُن کی
آوازیں بھی غائب ہو جاتی ہیں۔ خاموشی میں زندگی کی تپش اُنہیں اپنی لپیٹ میں
لیتی ہے تو وہ ایک دوسرے کو جسموں کی آنچ لگاتے ہیں۔ گہری اُترتی دھڑکنوں کی
شدت میں قربت کی آخری منزل کی طرف بڑھتے ہیں تو اُن کی تیز سانسیں
بے ترتیب ہونے لگتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے منہ سے زندگی کی وہ زبان سنتے
ہیں جو زبان سے پہلے ہے اور زبان کے بعد میں ہے۔ وہ ایک دوسرے میں کئی بار
زندہ ہوتے ہیں۔

صفدر سلطان سو رہا ہے۔ عورت کا بھاری ہاتھ اُس کے سینے پر۔ صفدر سلطان کی
آنکھیں ہل رہی ہیں۔ خواب دیکھ رہا ہے۔

صفدر سلطان خواب دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک سفید گھوڑے پر سوار دولہا بنا ہے۔ گھر جا
رہا ہے۔ بارات...... کی ڈولی لے کر گھر جا رہا ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ بینڈ دھن بجا رہا
ہے...... دیساں دا راجہ...... اچانک ایک انتہائی بلند آواز پورے میدان میں گونجتی ہے۔

''کٹ۔''

بارات رُک جاتی ہے۔

اچانک انیلا رانی چھلانگ لگا کر ڈولی سے باہر آ جاتی ہے۔ وہ پتلون اور ٹی شرٹ
پہنے ہوئے ہے اور سگریٹ پی رہی ہے۔ آسمان سے آواز آتی ہے۔

''کٹ۔ کٹ۔ اس عورت کی Entry کس نے کرائی...... یہ سین سنسر ہو جائے

گی۔ عورت کو واپس ڈولی میں ڈالو...... ڈولی ڈالو...... ڈولی ڈالو...... ڈولی ڈالو...... اس کا
سگریٹ بجھا دو......''

انیلا بلند آواز لیکن لاتعلق انداز میں بولتی ہے'' میرا نام انیلا نہیں بلی ہے۔ میں اپنی
ڈولی واپس لے جا رہی ہوں۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

انیلا ڈولی کو ایسے تہہ کرنا شروع کر دیتی ہے جیسے وہ کاغذ کی بنی ہے۔ ڈولی چھوٹی سی
ڈبی بن جاتی ہے۔ انیلا اس ڈبی سے ماچس کی تیلی نکالتی ہے اور تیلی سگریٹ کی ڈبی سے رگڑ
کر جلاتی ہے۔ شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔

ہر طرف سے کٹ۔ کٹ۔ کٹ کی آوازیں آتی ہیں۔

اب رات ہے اور صفدر سلطان کو ٹکٹکی پر باندھ کر کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔ ارد گرد
ایک بڑے دائرے میں لوگ بیٹھے گیس لیمپ کی روشنی میں کوڑے لگنے کا دلچسپ منظر دیکھ رہے
ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پاپ کارن اور چپس کے لفافے ہیں۔ صفدر سلطان مسلسل چیخ رہا
ہے۔ کوڑے برسانے والا ستر پوشی کے کم از کم تقاضے پورے کرنے کے علاوہ مکمل برہنہ ہے۔
اس کے ہاتھ میں کوڑا ہے اور اُس نے پورے جسم پر تیل مل رکھا ہے۔ گیس کی روشنی اس کے جسم
پر چمکتی ہے اور صفدر سلطان کی آنکھوں میں پڑتی ہے وہ چیخ کر بولتا ہے۔

''میں نہیں جانتا بلی کون ہے۔ میں نے انیلا سے شادی کی ہے۔ بلی نہیں انیلا۔''

''یہ فلم نہیں بن سکتی۔''

کوڑے مارنے والا اگلا کوڑا مارنے کے لیے کچھ فاصلے پر چلا جاتا ہے۔ اس کا ستر
پوشی کے تقاضے پورے کرنے کا کم از کم لنگوٹی نما اہتمام اُس کے ستر کو اور بھی نمایاں کر رہا
ہے۔ لوگوں کے پاپ کارن اور چپس کھانے کی چر چر کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ کوڑے والا
کسی ماہر رقاص کی طرح نپے تلے قدم اٹھاتا کوڑا لہراتا جیسے ہوا میں اڑتا ہوا صفدر سلطان کی
طرف بڑھتا ہے۔ یک دم دائرے میں بیٹھے لوگوں میں سے ایک شخص چیختا ہوا اچھل کر کھڑا ہو
جاتا ہے وہ بُری طرح کھجا رہا ہے۔ گردن پر، ماتھے پر، داڑھی میں...... وہ چیخ کر اپنا ہاتھ شلوار
کے اندر ڈالتا ہے اور وحشیانہ انداز میں کُھجاتا ہے۔

''روکو۔ روکو...... تم نے میرے سارے چپس ضائع کرا دیے۔ روکو...... روکو...... کوکا

کولا لاؤ...... چھرا۔ چھرا۔ چھری۔ کاٹو۔ کاٹا...... واجب سزا...... دو...... واجب سزا دو......
واجب...... کوکا کولا......"

کوڑے والے کا رقص اُنہی قدموں پر رُک جاتا ہے۔ کوڑے کو ہوا میں بلند کر لہراتا ہے اور اُس کا کوڑا ایک لمبے چھرے میں بدل جاتا ہے۔

"آ...... ہا...... س...... س......"

مجمع میں سے دنگ رہ جانے کی آواز آتی ہے۔ کوڑے والا یک دم ایک لمبے چوغے میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ چھرا لیے صفدر سلطان کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ سر جھکائے ہوئے ہے اور بے حد مغموم دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بندھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوتا ہے۔

"آئی۔ ایم۔ ساری"۔

وہ چھرے کو صفدر سلطان کے گلے کی طرف بڑھاتا ہے۔ خارش والے کی خارش میں بے حد شدت آ جاتی ہے۔ وہ نعرہ لگاتا ہے اور اُس کی پیروی میں مجمع نعرے لگاتا ہے۔

صفدر سلطان بھیانک آواز میں چیختا ہے "بھورا گھوڑا لاؤ۔ انیلا بیلی ڈولی لاؤ۔ بھورا گھوڑا لاؤ...... بیلی ڈولی لاؤ......"

اور باہر ہر سُو رات پھیکی پڑ رہی ہے۔ رات اپنے اگلے دن اپنی صبح کو بڑھ رہی ہے۔

....

(10)

حکمت بہزاد

اگلا دن اگلی صبح

سعید کمال کے بیڈ روم میں دن کی روشنی۔ کلاک صبح کے سات بجا رہا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ جاگتا ہے۔ رسیور اُٹھاتا ہے۔

سعید کمال: "ہیلو۔" (دوسری طرف سے آواز سُن کر چونکتا ہے) "سر آپ اس وقت۔"
(قہقہے کی آواز آتی ہے۔)

ایک وسیع و عریض کمرہ سامنے آتا ہے۔ جو اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ اسے بیک وقت ایک بیڈ روم، ڈرائینگ روم، سٹڈی اور سٹور کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔ اونچی چھت اور لمبی دیوار میں پانچ فرنچ ونڈوز کے سامنے آویزاں بھاری پردے۔ فرش پر موٹا ایرانی قالین۔ اگر کمرے کے دائیں نصف کے درمیان میں رکھے بیڈ کو مرکز مان کر ہر سمت دیکھا جائے تو بے ترتیبی۔ بدنظمی اور انتشار کی ایک وسیع دنیا نظروں کے سامنے آتی ہے۔ بیڈ کے بائیں طرف دیوار کے ساتھ کتابوں کی بڑی الماریاں جو دیوار کے نصف تک بلند ہیں۔ ایک بھاری اور وسیع رائٹنگ ٹیبل اور کرسی میز پر کتابیں، جرائد، فائلیں، کاغذ، قلم دان، کئی قسم کے ٹیبل لیمپ، کمرے کے بائیں نصف میں دو صوفہ سیٹ، سامنے میزیں، تپائیاں سب اپنی جگہوں سے ہلی ہوئیں مختلف زاویوں پر پڑی ہیں۔ قالین پر کئی جگہ فلور کشن۔ کتابیں اور غیر ملکی جرائد بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دیواروں پر بے شمار پینٹنگز جن میں بیشتر

مقامی نامور مصوروں کے شاہکار ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مجسمے بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑی شیلف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیڈ کے سامنے دیوار پر ایک بڑے لکڑی کے فریم میں رکھا ایک بڑا ٹیلی ویژن سیٹ اور نیچے پرانے نوادرات کی حیثیت رکھتی دو قدیم کندہ کاری کی شاہکار کھڑکیاں جو دیوار کے سہارے رکھی ہیں۔ خطاطی کے نمونے اور پھر مزید متعجب کرنے والے مختلف رنگوں کے بہت سے ٹیلی فون سیٹس ہیں جو کمرے میں مختلف جگہوں پر رکھے ہیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں فلور کشن پر بیٹھا ایک شخص جو شب خوابی کے لباس میں ہے اور جس کی آنکھیں راکھ جیسی رنگت کی ہیں۔ چہرہ لمبوترا، رنگت ایشیائی سفید، مستطیل شکل کی سیاہ فریم کی عینک، بال گھنے، سیاہ و سفید کا مرکب۔ عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے جو پچاس اور ساٹھ کے درمیان کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ ہونٹوں پر ایک تمسخر کی کیفیت بار بار نمودار ہوتی ہے۔ لیکن اِس میں مخاطب کے لیے حقارت کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ بلکہ معاملہ فہمی اور معاف کر دینے کا ارادہ کہیں اندر چھپا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک سرخ رنگ کے ٹیلی فون کا رسیور کان سے لگائے ہوئے ہے۔ ارد گرد کچھ کاغذات، فائلیں وغیرہ بکھری ہوئی ہیں۔

سر: ''ہاں اِس وقت۔ مجھے یقین تھا تمہیں صرف اسی وقت پکڑا جا سکتا ہے۔ صبح کے سات ابھی تمہارے لیے گزشتہ دن کی رات ہے۔ شوبز کے سب لوگوں کی طرح۔ میں نے تمہارے اس نمبر پر پہلے دوسرے اوقات میں رنگ کیا، تم نہیں تھے۔ مگر کے تمہارے دوسرے نمبروں پر میں فون کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

سعید کمال: ''پلیز سر...... شرمندہ نہ کریں۔''

سر: ''اکیلے ہو یا کوئی پرندہ ساتھ ہے؟''

سعید کمال: (چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ) ''نن۔ نہیں سر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔''

سر: ''کم آن یار۔ تم تو لیڈی کلر مشہور ہو۔''

سعید کمال: (تلخ سی ہنسی) نہیں سر۔ وہ ایسے ہی لوگوں نے فضول مشہور کر دیا ہے۔''

سر: ''مشہور کیا...... It is a fact مجھے وہ...... کیا تھا سکینڈل۔ ابھی تک یاد ہے...... وہ جو کہتی تھی...... سوؤں گی تو سعید کمال کے ساتھ...... ہا۔ ہا۔ ہا...... بائی داوے کدھر ہے وہ خاتون آج کل......؟''

سعید کمال: (بے ساختہ) ''دفتر میں۔ (گڑبڑا سا جاتا ہے) مم۔ مطلب اِدھر ہی ہے سر۔''

سر: ''Any way تمہاری Love Life پھر کبھی ڈسکس کریں گے۔ اس وقت میں نے فون تمہاری پروفیشنل لائف ڈسکس کرنے کے لیے کیا ہے۔ سُن رہے ہو؟''

سعید کمال: (الرٹ ہو جاتا ہے۔ نیند بالکل غائب ہو جاتی ہے۔) ''جی...... سر...... بالکل میں...... بالکل......''

سر: ''دراصل تمہارے ساتھ رابطہ بہت ہی ضروری تھا۔ میں لوگوں سے پوچھتا رہا تمہارے بارے میں۔''

سعید کمال: ''تھینک یو سر۔ مجھے کچھ اطلاع ملی تھی۔''

سر: ''ایک آدھ دن میں میٹنگ ہو رہی ہے...... یو نو...... اس نئے سیٹ اپ میں بھی انہیں حکمت بہزاد یاد آ گیا ہے۔ تو یہ لوگ کچھ کرنا کچھ بدلنا تو چاہتے ہیں لیکن سب کچھ تو ظاہر ہے نہیں بدل سکتا لیکن کچھ نہ کچھ...... بدل بھی رہا ہے......''

سعید کمال: (بے ساختہ) ''جی...... ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات......''

سر: '' What۔ یہ کیا ہے؟...... شاعری شروع کر دی ہے تم نے......''

سعید کمال: ''نن۔ نہیں سر...... وہ کچھ اور بات تھی......''

سر: ''اچھا تو ایسا ہے کہ تمہیں ایک بڑی ذمہ داری دی جا سکتی ہے...... پہلے یہ بتاؤ کہ کر کیا رہے ہو آج کل؟''

سعید کمال: ''ایک فلم پر کام شروع ہے۔ سر...... سکرپٹ پر کام ہو رہا ہے۔''

سر: ''گڈ...... گڈ...... کیسی فلم......''

سعید کمال: '' Basically سر...... یہ ایک سرئیلسٹک فلم ہو گی......''

سر: ''آہ۔ سرئیلسٹ۔ یہ دلچسپ ہے سعید۔ بہت دلچسپ۔ سرئیلسٹ سینما۔''

سعید کمال: ''جی...... سر...... میں نے پیراگ میں چیک اور پولش ڈائریکٹر کا بہت کام دیکھا ہے سرئیلزم میں۔''

سر: ''ہوں۔ دیکھا ہے میں نے بھی کچھ۔ لوئی بیونل کے پیانو پر لدے گدھوں سے لے کر...... بہت آگے تک...... لیکن سعید کیا اس کی ہمیں ضرورت ہے ابھی۔ کیا ابھی سیدھا سیدھا Social realism بہتر نہیں ہوگا؟ لیکن یہ بہت اچھا ہے کہ تم Process میں ہو۔''

سعید کمال: (الجھن اور بے چینی) ''جی...... جی سر...... وہ تو ہے......''

سر: ''اچھا تو...... اب یہ ہے کہ...... تفصیل سے بات پھر ہوگی۔ لیکن مجھے تمہاری فوری Consent چاہیے۔ تم جانتے ہو میں مدتوں سے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف فلم اینڈ پرفارمنگ آرٹس کے لیے کام کر رہا ہوں۔ تو اب شاید یہ آئیڈیا میری تحریروں سے نکل کر حقیقت میں آ جائے۔ کوشش یہ ہوگی کہ یہ انسٹیٹیوٹ ہر سال ایک فلم بھی پروڈیوس کرے۔ فیچر فلم، ڈوکیومینٹری۔ میں تمہیں اس ادارے کا ڈائریکٹر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ پراگ وغیرہ تمہارا بھی بہت Relevant ہو گیا ہے۔ باقی میں جانتا ہوں تم ٹی وی کارپوریشن واپس نہیں جانا چاہتے۔ لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم واپس جاؤ۔ جائن کر لو۔ تمہیں پچھلے برسوں کے arrears مل جائیں۔ پھر وہاں سے وہ تمہیں اس نئے ادارے میں لے لیں گے۔ بولو...... کیسا ہے......؟''

سعید کمال کے چہرے پر شدید حیرت اور بے یقینی کے تاثرات۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو جاتا ہے۔

سر: ''کیا ہوا...... سو تو نہیں گئے؟''

سعید کمال: (ایک عجیب سی بے چینی طاری ہو جاتی ہے) ''نن۔ نہیں...... نہیں سر۔ بالکل نہیں۔ لیکن یہ تو بہت بڑی...... بڑا...... مطلب ذمہ داری ہے سر۔''

سر: ''وہ تو ہے۔''

سعید کمال: ''لیکن سر میں۔ ابھی...... اس پراجیکٹ کو شروع کر...... میرا مطلب...... لوگ کام شروع کر چکے ہیں۔ ہم نے ایک فائنانسر بھی ڈھونڈ لیا ہے۔''

سر: ''فائنانسر Excellent یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ دیکھو...... تفصیل سے پھر بات ہو گی...... لیکن آگے چل کر ہمارا نیشنل فلم انسٹی ٹیوٹ...... پالیسی یہ ہوگی کہ ہم پیسہ لگانے والے سے مل کر کام کریں 60/40 لیکن کام ہمارا ہوگا۔ Strictly تو یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس کو بھی لاؤ۔ اپنے لوگوں کو بھی لاؤ۔

سعید کمال کے چہرے پر پریشانی اور شدید تذبذب کے تاثرات۔

سعید کمال: ''لیکن سر...... یہ...... میرا مطلب ہے...... بہت مشکل ہوگا...... وقت لگے گا......''

سر: ''بالکل۔ بالکل۔ Take your time my boy تمہاری رضامندی بہت ضروری تھی۔ کئی معاملات بیک وقت چل رہے ہیں۔ ایک گروپ میری شدید مخالفت کر رہا ہے۔ خیر میں تو اس کا عادی ہوں۔ لیکن اس دفعہ اُن کا لہجہ زیادہ جارحانہ ہے۔'' ہنستا ہے۔

سعید کمال: ''وہی لوگ سر۔ تصویر ناچ گانے کے دشمن؟''

سر: ''ہاں۔ لیکن اب لگتا ہے اُن کی دشمنی صرف الفاظ تک محدود نہیں رہے گی۔ سب کچھ کافی۔ وہی تمہارا...... سرئیلسٹک ہو رہا ہے۔'' ہنستا ہے۔

سعید کمال: ''کوئی سیریس معاملہ ہے سر؟''

سر: ''او۔ چھوڑو...... میں وہی کچھ کر رہا ہوں جو میری کتابوں میں پہلے ہی موجود ہے۔

سعید کمال: ''وہ کتاب کب آ رہی ہے سر آپ کی۔ فلم۔ تھیٹر پر......؟''

سر: ''ایک آدھ ماہ تک۔'' تو پھر ایسا ہے...... اگر کسی طرح...... یہ فلم انسٹی ٹیوٹ شروع ہو جاتا ہے تو میں چاہتا ہوں۔ پہلی فلم کے لیے تم...... ذرا...... عام حقیقت پسند بن جاؤ......؟ باقی I love surrealism too لیکن ابھی نہیں۔''

سعید کمال: ''تو آپ سر باقاعدہ ان لوگوں کے لیے کام کریں گے؟''

سر: ''میرا یار قاعدہ بے قاعدہ بس ایسا ہی ہے۔ تم اپنے معاملات نپٹا لو۔ Right۔''

سعید کمال: ''جی۔ جی سر۔ میں۔ میں...... دیکھتا ہوں...... لیکن یہ بہت مشکل ہوگا میرے لیے۔ وہ دونوں...... تو مجھے......'' چہرہ اُتر جاتا ہے۔

سر: ''اور کمال...... کیسا ہے......''

سعید کمال: ''ڈیڈ...... میرا خیال ہے ٹھیک ہیں۔''

سر: ''اُس سے کہو...... اب مارکسی، کمیونسٹ تھیٹر تو بند ہونے والا ہے۔ تو یہ سب لوگ Out of job ہونے والے ہیں۔ کیا کریں گے اب یہ۔ دنیا بدل رہی ہے۔''

سعید کمال: ''جی سر...... جب میں پراگ میں تھا...... اندازہ ہو رہا تھا۔''

سر: ''تو میں پرسوں میٹنگ میں تمہارا نام Sound کر رہا ہوں...... تم جلد اپنے معاملات دیکھ لو...... رائٹ؟''

سعید کمال: ''رائٹ سر...... تھینک یو...... Thank you so much Sir''

سر: ''او۔کے۔ سعید۔ Have a Good Day۔''

سعید کمال کے چہرے پر بے یقینی اور حیرت کے تاثرات برقرار ہیں۔ ریسیور کی طرف دیکھتا ہوا اُسے واپس کریڈل پر رکھتا ہے۔ بتدریج ایک پرمسرت فتحمندانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ پھر اچانک ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور شدید پریشان اور الجھن کے تاثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ (انیلا کی آواز) یک دم تینوں کتے واپس جاتے ملازم کی طرف بھاگتے ہیں اور پیچھے سے اُس کے ہاتھ میں لٹکتے ہوئے شاپنگ بیگ پر حملہ کر دیتے ہیں...... چیخم دھاڑ، ملازم کی چیخیں، لفافہ گر جاتا ہے۔ کالے کانوں والا کتا ملازم کی ٹانگ پر کاٹتا ہے۔ باقی دو لفافہ پھاڑ دیتے ہیں اور گوشت کھانے لگتے ہیں۔ کلوز شاٹ۔ ہوپ کی آنکھیں بدستور بند ہیں۔ بے شمار پھول ہوپ کے جسم سے چپک چکے ہیں۔ پھولوں کے رنگ سرخ ہو رہے ہیں۔ بعض جگہوں سے خون کی پتلی لکیریں بہہ رہی ہیں...... بہارو پھول برساؤ کی دھن پھر سنائی دیتی ہے۔

سعید کمال کے چہرے پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ جو اگلے ہی لمحے غائب ہو جاتی ہے اور پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ چہرے پر پہلے جیسی الجھن۔ اپنے بائیں ہاتھ کی زخمی انگلی اٹھا کر دیکھتا ہے۔ روئی میں خون جم چکا ہے۔ بستر چھوڑ دیتا ہے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹاتا ہے۔ روشنی اندر آتی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ دوسری طرف ماسٹر یاسین ہے۔ برآمدے میں بکرا بے بے کی آوازیں نکال رہا ہے۔

ماسٹر یاسین: ''سلام علیکم باس۔''

سعید کمال: ''ہاں بولو۔ کیا ہوا ماسٹر۔''

بکرا پھر پیشاب سونگھ رہا ہے۔

ماسٹر یاسین: ''باس میں نے بتانا تھا۔ بالی کو فلموں کی پروجیکشن کا میں نے بول دیا ہے۔ آج شام۔'' سعید کمال کے چہرے پر الجھن کے تاثرات گہرے ہو جاتے ہیں۔

سعید کمال: ''آ۔ ہا۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں......''

جان عالم سٹوڈیو میں بالی اور گالی

بالی سوچتا ہے کہ یہ ماسٹر یاسین چوتیا کن لوگوں کے ساتھ لگا ہوا ہے آج کل اور کون سی فلمیں انہوں نے چلوانی ہیں۔ کیا ٹوٹے؟ پر نہیں وہ رائیٹر ڈائریکٹر ہیں بہن چود۔ ساتھ کوئی کنجری لا رہے ہیں۔ وہ بھی رائٹر ہے گشتی۔ مجھے کیا۔ جائیں اپنی ماں کی......

بالی ایک انتہائی غصیلا نوجوان ہے جو بات بات پر گالی سوچتا اور گالی دیتا ہے۔ بالی کی ایک ٹانگ کٹ چکی ہے اور لکڑی کی ٹانگ اور بیساکھی استعمال کرتا ہے۔ لیکن وہ دل کا بُرا نہیں بلکہ یاروں کا یار ہے۔ اور اُن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے۔ اُس کی ایک ٹانگ بھی ایسی ہی ایک قربانی کی وجہ سے ضائع ہوئی۔ ایک دوست کی خاطر اُس کے دشمن سے ٹانگ میں گولی کھا بیٹھا۔ ٹانگ میں گینگرین ہوئی اور کاٹ دی گئی لیکن اس کہانی کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ جان عالم سٹوڈیو کے پروجیکشن روم میں موجود بالی 35 ایم ایم کا پندرہ سال پرانا فلپس پروجیکٹر پروجیکشن ٹیبل پر رکھتا ہے۔ سپول اسمبلی سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ لیپ اسمبلی چیک کرتا ہے۔ اور پھر دل ہی دل میں اسٹوڈیو انتظامیہ کے آٹھ دس افراد کو مشترکہ گالیاں دیتا ہے۔ بہن چود پندرہ سال پرانی مشین کو چودتے چلے جا رہے ہیں۔ Douser بیٹھ گیا ہے۔ Shutter کی چیں بول گئی ہے۔ ساؤنڈ ہیڈ خراب ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر سپر ماڈل آ رہا ہے مارکیٹ میں۔ پر نہیں جی۔ پیسہ نہیں خرچنا۔ نوٹوں کی بتی بنا کر اپنی گانڈ میں لے لو...... بالی سماج میں معاشی عدم مساوات پر اپنے جذبات کا اظہار اپنے آپ سے کرتا ہے۔ اور پاور آن کرتا ہے۔ گوں اُوں اُوں کی آواز آنی شروع ہوتی ہے۔ اس آواز کو بالی مشین میں جان

پڑنے کی آواز کہتا ہے۔ اور یہ آواز نہ صرف اُسے اچھی لگتی ہے۔ بلکہ اُس کے غصے کو بھی ٹھنڈا
کر دیتی ہے۔ چار بجے کا ٹائم دیا تھا ماسٹر یاسین نے۔ تین تو بج گئے میری طرف سے تو
ریڈی ہو جائے گا۔ وہ 35 ایم ایم کی ایک سپول ایک طرف سے اٹھاتا ہے۔ اور Douser کی
کارکردگی چیک کرنے کے لیے سپول لگاتا ہے۔ اس سپول میں ایک سائنس فکشن فلم The
Clash کا کوئی درمیانی حصہ ہے۔ جس میں کچھ گورے سائنسدان کالوں اور دوسری نسلوں کے
لوگوں پر پتہ نہیں کیا اُلٹے سیدھے تجربے کرتے دکھائے گئے ہیں۔ آگے پیچھے پتہ نہیں کیا ہو
ہے۔ بالی کا اِس سپول کو ہاتھ لگانے کا کچھ بھی اور مقصد نہیں سوائے اس کے کہ اس وقت 35
ایم ایم کی فالتوں ریلوں میں سے وہی اُس کے ہاتھ آئی ہے۔ اگر وہ ذرا بائیں طرف سے
اُٹھاتا تو معاشرے میں غیرت اور بے غیرتی کے نازک موضوع پر بنی سپر ہٹ فلم غیرت ا
کھڑاک کا آخری حصہ اُس کے ہاتھ لگتا۔ اور اگر اُس کا ہاتھ تھوڑا دائیں طرف بڑھ جاتا تو
اُس وقت یعنی سہ پہر کے تین بج کر دس منٹ پر وہ جان عالم اسٹوڈیو کے پروجیکشن روم نمبر 2
میں دیسی سماجی حقیقت نگاری پر مبنی ڈبہ فلم شمع اور شامہ کا پہلا حصہ سپول پر چڑھا رہا ہوتا۔
فارمولے کے تمام اجزا مکمل ہونے کے باوجود یہ فلم فلاپ کیوں ہوگئی تھی۔ اس پر کسی کو بھی کوئی
حیرت نہیں تھی۔ کیونکہ کوئی فلم ہٹ کیوں ہوتی ہے۔ اور کوئی ڈبہ کیوں ہو جاتی ہے۔ ایک بہت
بڑا راز ہے جو سینما کی پوری تاریخ میں کسی رائٹر ڈائریکٹر پروڈیوسر پر آج تک منکشف نہیں ہو
سکا...... شمع اور شامہ دو ہم شکل بہنیں بچپن میں ہی بچھڑ جاتی ہیں پھر نیرنگیٔ زمانہ سے شامہ کی
پرورش ایک انتہائی دولت مند گھرانے میں ہوتی ہے۔ جبکہ شدید غربت اور افلاس شمع کا مقدر
بنتی ہے۔ اس حد تک کہ جب اس کا درزی باپ شبانہ روز کی عرق ریزی کے بعد بالآخر نابینا
ہو جاتا ہے تو ٹی۔بی کی مریضہ بیوی/ماں کے علاج اور ڈاکٹر بننے کے لیے نویں جماعت کی
تعلیم حاصل کرتے بھائی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے دونوں باپ بیٹی کو ماچس
اور پاپ کارن کے پیکٹ بیچنے کے لیے خود گلیوں بازاروں میں نکلنا پڑتا ہے۔ بہنوں کے ان
حالاتِ زندگی کے دوران سعید کمال اور برکت نامی دو بچھڑے ہوئے بھائی بھی جو اتفاق سے
ہم شکل نہیں ہیں میدان میں آ چکے ہیں۔ سعید کمال سیٹھ صفدر سلطان کا بیٹا ہے۔ جبکہ برکت
ایک پلمبر ہے۔ پھر واقعات تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ انہیں دنوں اتفاق سے شامہ کے گھر

کا نلکا خراب ہونے کا واقعہ پیش آتا ہے اور مرمت کے لیے برکت کو طلب کیا جاتا ہے۔ اُدھر
ایک روز سعید کمال اپنی گاڑی کے پاس ماچس بیچتی لڑکی سے ایک ماچس خریدتا ہے۔ سگریٹ
سلگاتا ہے اور دھواں اُس کے منہ پر چھوڑتا ہے تو دھوئیں میں اُسے شمع کی غلافی آنکھیں دکھائی
دیتی ہیں۔ ان حالات میں انتہائی غیر متوقع طور پر امیر کبیر شامہ اور سعید کمال علی الترتیب
مفلس اور نادار برکت اور شمع کو دل دے بیٹھتے ہیں۔ اُدھر ولن سیفی پہلے ہی سرگرم ہو چکا ہے۔
سیفی شامہ کی سہیلی انیلا کا بھائی ہے اور ایک نچلے درمیانے درجے کا زیرِ تربیت غنڈہ ہے جس کا
ایک دانت سونے کا ہے اور مشہور ہے کہ یہ پیدائشی ہے۔ فلم میں سسپنس اُس وقت حد سے
بڑھ جاتا ہے جب سیفی کو علم ہو جاتا ہے کہ شامہ کی ایک ہم شکل جڑواں بہن نہ صرف موجود ہے
بلکہ سڑکوں پر پاپ کارن بیچ رہی ہے۔ چنانچہ وہ شمع کو اغوا کرنے کے لیے اُس سے پاپ کارن
کے تمام پیکٹ خرید لیتا ہے اور اُس کی حیرانی پر ہنستا ہے...... اور کہانی آگے بڑھتی ہے۔

شمع اور شامہ کے ریلیز ہونے کے بعد بالی کے دوست جبار نے جو اُس وقت ڈریم
لینڈ سینما کے سٹال گیٹ نمبر 2 کا گیٹ کیپر تھا اور اب بھی ہے بالی کو بتایا کہ سٹال میں بیٹھی
عورتیں اُس وقت سسکیاں لے کر روتی رہیں جب شمع اپنے نابینا درزی باپ کے ساتھ ماچس
اور پاپ کارن بیچنے کے لیے بازاروں میں نکلتی ہے اور اُس وقت تو اُن کی چیخیں نکل جاتی ہیں
جب ایک روز بھوک سے بے تاب ہو کر شمع خود پاپ کارن کھانے لگتی ہے اور نابینا باپ گو دیکھ
نہیں سکتا لیکن کچر کچر کی آوازیں سن کر کہتا ہے۔ ''بٹیا اگر ہم اپنا سودا خود ہی کھانے لگے تو
دوسروں کو کیا بیچیں گے؟'' کہا جاتا ہے کہ فلم کے رائٹر کو امید تھی کہ اُس کا یہ ڈائیلاگ زبان زدِ
عام ہو جائے گا لیکن بوجوہ نہ ہو سکا۔ دوسرے روز بہرحال میٹنی شو پر ہال میں بس اکا دکا لوگ
دیکھ کر جبار یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کل شاید عورتیں ٹکٹوں کے پیسے ضائع ہونے کے دکھ سے
رو رہی تھیں۔

لیکن سوا تین بجے بالی شمع اور شامہ کی بجائے The Clash کی کوئی ریل سپول پر
چڑھا رہا ہے اور بٹن دبا تا ہے۔ فیتہ رول ہوتا ہے اور انتھونی گالاگر کے ناول The Clash پر
بنی فلم میں سائنسدان ہیرو ہیروئن کے جوڑے کو اغوا کرنے کے لیے Chase کا سنسنی خیز
Sequence چل پڑتا ہے۔ بالی پروجیکشن کوالٹی کو OK کرتا ہے لیکن پھر بھی ہمیشہ کی طرح

اس Chase میں Involve ہو جاتا ہے۔ آخر ہیرو ہیروئن کو عالمی غلبے کے لیے مشن 'وائی
امن' پر کام کرنے والے انتہائی خفیہ گروپ کے سربراہ پال کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔
ہیروئن کا سانس پھول رہا ہے۔ بالی اُس کے سینے کے ابھاروں اور کولہوں پر غور کرتا ہے۔
پال ہیرو ہیروئن کو اِس تکلیف دہ حالت میں وہاں لانے پر بہت معذرت کرتا ہے۔ اور
سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اُن کا تعاون حاصل کرنا اِس لیے ضروری تھا کہ چونکہ وہ دونوں
روبوٹ بیکٹیر یا رابرٹ 1 کے موجد ہیں اور صرف وہی رابرٹ 2 بنا سکتے ہیں جو نہ صرف زندہ
بیکٹیریوں کی طرح اپنی نسل بڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہو بلکہ ہوا یا پانی کے ذریعے تمام غیر
تہذیبوں کے افراد کے جسموں میں داخل ہو کر اُن کے تہذیبی جین کو بیک وقت غیر مؤثر بنا
دے اور اُنہیں ہمیشہ کے لیے تابع فرمان کر دے۔

بالی لیپ اسمبلی کا بٹن بند کرتا ہے اور بدمعاشوں کے باس یعنی پال کی ہاؤ ہاؤ سے
تنگ آ کر The Clash کا فیتہ واپس رول کر کے رِیل اُتار کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ لیکن
پروجیکٹر کو Running ہی رکھتا ہے تا کہ...... آ جائے اب وہ شورا ماسٹر یاسین اور چلوا لے اپنے
ٹوٹے۔ وہ گھڑی دیکھتا ہے تین بج کر پچیس منٹ ہو رہے ہیں۔

سعید کمال کیبنٹ میں سے لوہے کے مخصوص ڈبوں میں بند فلموں کی ریلیں نکالتا
ہے۔ وال کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ چہرے پر عجیب سی بیزاری اور پریشانی کے ملے جلے
تاثرات ہیں۔ ٹیلی فون کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر ایک نمبر ڈائل کرتا ہے۔
''آ۔ ہاں۔ ماریہ میں سعید...... ساری یار آج ہم نہیں مل سکیں گے۔ وہ۔ دراصل انیلا بلال کے
ساتھ کچھ کام چل رہا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ وہی رائٹر۔ نہیں جانی...... وہ سب بکواس ہے۔ ایک فلم
پر کام ہو رہا ہے۔ ہم پھر ملیں گے...... کبھی بُرا نہ ماننا...... نہیں۔ ڈیئر۔ ضرور...... Bye'' ریسیور
رکھتا ہے۔ چہرے پر ایک طمانیت کا تاثر نظر آتا ہے۔

صفدر سلطان اور اس کا دوست ارشاد صفدر کی فرم کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔

صفدر سلطان: (پریشانی کا لہجہ) ''ہاں یار۔ بہت برا خواب تھا۔ بہت ہی بُرا۔ اُس نے تو چُھری چلا دی تھی میرے گلے پر''۔

ارشاد: ''صفدر مجھے تیری بڑی فکر ہے۔ تُو جس لین میں جا رہا ہے......''

صفدر سلطان: (بات کاٹتے ہوئے) ''بس اب مجھے وہ کہانی پھر نہ سُنانا۔ اُس چوتیے کاروباری بندے کی...... بمبئے ٹاکیز کی کشتیاں جس کا چم بیچ کر کھا گئی تھیں...... میں ایسا ویسا نہیں ہوں۔ ویسے ارشاد ایک بات ہے۔''

ارشاد: ''کیا؟''

صفدر سلطان: ''پیسہ بڑی چیز ہے۔ پر کیا فائدہ۔ اگر بندے کو سکون ہی نہ آئے۔''

سعید کمال: ''......اوہ تو...... صائمہ مائی لو...... یہ تم نے سوچا بھی کیسے...... ڈارلنگ وہ...... انیلا...... ایک ایکٹرس تھی میرے ڈراموں میں...... پرانی بات ہے...... بس...... دوست ہے ایک طرح سے۔''......

صفدر سلطان: (قہقہہ) ''لیکن اِس میں سے بھی دیکھ لینا کچھ لے ہی مروں گا۔ فلم بڑا بزنس ہے جناب۔ سیفی کہتا ہے فلم پیسے کا کھیل ہے۔''

ارشاد: ''سیفی کون؟''

صفدر سلطان: ''ہے ایک......'' (چہرے کے اعصاب تن جاتے ہیں۔ آنکھیں جیسے کہیں دور دیکھ رہی ہیں۔ آنکھیں دھندلا جاتی ہیں۔)

انیلا اور سیفی سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ بابا خُوشیا اپنے
کمرے میں سو رہا ہے۔ انیلا اور سیفی برہنہ حالت میں نظر آتے ہیں۔ یک دم ٹیلی فون
کی پُرشور آواز...... صفدر سلطان چونک کر اپنے تصور سے واپس آ جاتا ہے۔ ریسیور
اُٹھاتا ہے۔

صفدر سلطان: ''ہیلو۔ ہاں ماسٹر۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی پہنچو۔''

ارشاد: ''کون تھا؟''

صفدر سلطان: (فخریہ لہجہ) ''کیمرہ مین ماسٹر یاسین تھا۔ کیا سمجھے؟ میں فلم لائن میں ہوں ارشاد صاحب۔ ماسٹر کہتا ہے۔ مجھے ایسی عورت کی ضرورت ہے۔ جو مردوں کی سیانی ہو۔'' (قہقہے لگاتا ہے۔ ارشاد ہونقوں کی طرح اُس کا منہ دیکھتا ہے)

سعید کمال کا مُوڈ پہلے سے بہتر لگتا ہے۔ آئینے میں دیکھتا ہے۔ بال درست کرتا
ہے۔ پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھتا ہے۔ ریسیور اُٹھاتا ہے۔ ڈائل کرتا ہے۔

سعید کمال: ''ہیلو۔ انکل میں سعید کمال بول رہا ہوں...... انیلا سے بات کرا دیں پلیز۔ [illegible]
چلی گئی...... جی۔ جی...... جی میں بھی وہیں جا رہا تھا...... سوچا رستے میں پک [illegible]
لوں...... تھینک یو۔''

ریسور رکھتا ہے۔ چہرے پر پھر کبیدگی کے تاثرات فلموں کے ڈبے اُٹھاتا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ریسور اُٹھاتا ہے۔ سُنتا ہے۔ چہرے کا تناؤ یک دم کم ہو جاتا ہے۔

سعید کمال: ''ہاں۔ زری...... نہیں یار آج ممکن نہیں۔ وہ انیلا کے ساتھ کچھ فلم پر کام کر رہے
ہیں۔ ہاں۔ میں۔ میں بنا رہا ہوں ایک فلم۔ اوہو۔ نہیں۔ کم آن۔ ہاں یہ وہی [illegible]
ہے۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ بکواس ہے سب...... لمبی بات ہے۔ [illegible]
بات کریں گے۔ O.K۔ پلیز...... بائی......''

ریسور رکھتا ہے۔ عجیب سی مسکراہٹ۔ دونوں ہاتھ اُچکاتا ہے فلموں کے ڈبوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ بُرا سا منہ بناتا ہے اور پھر بے یقینی سے کندھے اُچکاتا ہے۔

نیلم۔ زمرد اور بادل کا ٹکڑا

چوک خداداد۔ روشن چمکیلی دھوپ اور نیلا آسمان۔ چوک نما پارک میں ادھر اُدھر بکھرے کے بینچوں پر لوگ۔ عورتیں۔ مرد۔ بچے۔ بوڑھے۔ بے فکرے۔ سنگین مسائل کے شکار نوجوان۔ ہنستے کھیلتے بچے۔ گھاس پر چادر اوڑھ کر سوئے نشئی، دال سیویاں بیچنے والے کی [illegible] جیسی ٹوکریاں۔ وہی چائے کا چھوٹا سا سٹال۔ لکڑی کے دو سٹولوں پر بیٹھے گاہک۔ اُبلتی چائے سے اُٹھتی بھاپ۔ سبز گھاس میں پھولوں کی کیاریاں۔ پھولوں میں سورج مکھی۔ اخبار بیچنے والا لڑکا لاپروائی سے دن کے باقی ماندہ اخبار اکٹھے کرتا ہے۔

''آج کا باسی اخبار'' ٹی سٹال والا رزاق اُسے مذاق کرتا ہے اور پھر پوچھتا ہے۔ ''گُلے کوئی نئی خبر سُنا اخبار کی یہ نئے حاکم جو آئے ہوئے ہیں۔'' ''اسے پڑھنا آتا بھی ہے اخبار...... جو تو پوچھتا ہے۔'' شوکی دال والا کہتا ہے۔ ''میں شام کے سکول میں پڑھتا ہوں۔ ایک کانے ماسٹر سے۔ باتیں کرتا ہے۔ جا جا کر دال بیچ۔'' گُلا کہتا ہے۔ ''تو سُنا پھر خبر۔'' اور گُلا انتہائی فحش زبان میں نئے حاکموں کے بارے میں اپنے خیالات بلکہ خواہشات کا اظہار کرتا

''اوئے کچھ حیا کر لیا کرو۔ گندی زبان۔ اُدھر بیبیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔'' انگوٹھیاں بیچنے والا مستان علی بلند آواز میں کہتا ہے۔ ''نہ چاچا مستان تیرا دھیان ہر وقت بیبیوں میں ہی رہتا ہے۔'' سٹال والا کہتا ہے۔ ''چاچا مستان ہیرا بھی ہوتا ہے تیرے پاس؟'' دال سیویوں والا شوکی پوچھتا ہے۔ ''نہ تو نے اپنی اُدھر لینا ہے۔ پوچھتا ہے ہیرا ہے۔'' اخبار والا لڑکا قہقہے لگاتا ہے۔ ''لو چاچے مستان کی اپنی زبان سنو ذرا۔'' مستان انگوٹھیوں اور قیمتی پتھروں کے ڈبے کا شیشہ کپڑے سے پونچھتا ہے۔ اور پھر شوکی کی طرف دیکھتا ہے۔ ''پتر میرے پاس بس عقیق، یاقوت، زمرد اور نیلم ہوتے ہیں۔ رکھتا تھا کبھی ہیرا بھی پر اب وہ شوقین لوگ ہی نہیں رہے۔'' ''ہاں اخبار میں بھی آیا ہے۔ شوقین لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں۔'' گُلا کہتا ہے۔ مستان دائیں طرف جھک کر اپنا بازو دال والے کی ٹوکری کی طرف پھیلاتا ہے۔ ''شوکی پتر یہ پھکا دال کا تو دکھا۔'' اور اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر مٹھی بھر کر دال اُٹھا لیتا ہے۔ شوکی غور سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ ''نہ ویسے چاچا۔ جس حساب سے تُو روز میرا سودا مفت کھاتا ہے۔ اُس حساب سے تو ایک آدھ عقیق میرا نکلتا ہی ہے تیری طرف۔'' ''نہ۔ نہ نہ۔'' لڑکا چیخ کر کہتا ہے۔ ''بڑا قیمتی ہوتا ہے شوکی عقیق۔'' ''عقیق نہیں عقیق۔'' مستان کہتا ہے۔ ''ایک عقیق میں تو شوکی تیری دو تین من دال نکل جائے گی۔ ہے نا۔ چاچا مستان؟'' گُلا کہتا ہے۔ مستان دال کا پھکا لگاتا ہے اور اندر ہی اندر کچھ حساب لگانے والا منہ بنا کر کہتا ہے۔ ''آ...... نہیں اتنی تو خیر نہیں۔ پر من ڈیڑھ تو کہیں نہیں گئی...... پر شوکی تو ہے بڑا اُتھرو ولا۔ جتا ہی دیا تُو نے آخر دال کا...... ہمارا کیا ہے۔ ایسے ہی پیار محبت میں پھکا لگا لیتے ہیں۔ اوئے جا اوئے دل توڑ دیا تو نے۔'' دال والا شوکی یک دم جوش میں آ جاتا ہے۔ ''او۔ نہ۔ نہ۔ نہ۔ چاچا نہ۔'' شوکی جذباتی انداز میں کہتا ہے۔ ''کھاؤ ہزاروں من دال کھاؤ۔ قسم اللہ کی تیرے اوپر سے وار کر پھینک دوں سودا سارا چاچا مستان ایسی کوئی بات نہیں یہ سویاں بھی چکھو۔'' شوکی مٹھی بھر سویاں مستان کو دیتا ہے۔ ''اللہ تجھے بہت دے۔'' مستان سویاں لے کر اُسے دعا دیتا ہے۔ سٹال والا اُبلتی چائے کے دو کپ گاہکوں کو دیتا ہے۔ اور بلند آواز میں مستان کو مخاطب کرتا ہے۔ ''چاچا میں نے ایک بات پوچھنی تھی۔ میں نے سُنا ہے یاقوت......'' ''او۔ ادھر آ کر پوچھ۔'' مستان علی بھی اتنی ہی بلند آواز میں کہتا ہے۔ ''اور ایک کپ چائے کا بھی لیتا آ۔'' رزاق چین میں موجود چائے کو

کپ میں ڈالتا ہے اور مستان کے قریب آ جاتا ہے۔ کپ اُسے دیتا ہے۔ ''ہاں۔ اب پوچھ۔''

''چاچا میں نے سُنا ہے یاقوت کو پالش کرنے کے لیے اُسے دیسی ککڑ کو کھلا دیتے ہیں۔ پوٹے میں جا کر لشک جاتا ہے۔'' مستان دال سویاں کھاتا ہے اور چائے کا گھونٹ لیتا ہے۔ چائے بہت گرم ہے۔ تیزی سے منہ کھول کر آہ۔ آہ کی آواز سے ہوا نکلتا ہے۔ منہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بات کرتا ہے۔ ''بالکل تُو نے ٹھیک سنا ہے رزاق۔ یاقوت ہی نہیں عقیق، زمرد، نیلم کسی بھی پتھر کی پوٹہ گھسائی کرا لو۔ مشین بھی کیا پالش کرے گی پر یہ ایسے ہی نہیں ہو جاتا۔ اس میں بڑی سَینس ہے سوہنیا۔ ککڑ کے پوٹے میں کنکر ہی کنکر ہوتے ہیں۔ پتھر ہی پتھر۔ اوپر والے پوٹے میں نہیں۔ نیچے والے میں۔ آ...... تو...... ادھر ہمارا یاقوت پہنچا نہیں۔ اُدھر جس کے انہوں نے اُس کی رگڑائی کی نہیں۔'' ''ٹھیک۔ ٹھیک۔'' رزاق سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتا ہے۔ ''پر چاچا......'' وہ کوئی اور سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ لیکن مستان ہاتھ اُٹھا دیتا ہے۔ ''بس اب اپنے اپنے دھندے پر جاؤ۔ پھر پوچھنا۔ وہ ایک باؤ اُدھر موٹر سائیکل کھڑی کر رہا ہے۔ چار چوفیرے تاڑ رہا ہے۔ شکل سے بھی مجھے شوقین لگتا ہے۔ کیا عجب کوئی مُندری تھیوا لینے ادھر آ ہی جائے۔'' رزاق بادل نخواستہ واپس اپنے ٹی سٹال پر چلا جاتا ہے۔

سیفی چوک خداداد کے بس سٹاپ پر بنی لوہے کی ریلنگ کے قریب اپنی موٹر سائیکل کھڑی کرتا ہے اور ریلنگ میں بنے لوہے کے چھوٹے سے دروازے کی راہ سے اُس پارک نما چوک میں داخل ہو جاتا ہے۔ گہری سانس لیتا ہے اور اُس کی نظریں ساری دنیا میں صرف اُسے ڈھونڈتی ہیں۔ دنیا جو سبز گھاس، نیلے آسمان، بھوری گلابی قرمزی عمارتوں، پیلے لال پھولوں، کھیلتے بچوں کی کلکاریوں، خریداریوں کی محنت کے بعد ستاتی عورتوں کی آسودہ آوازوں، بوڑھیوں کی سرگوشیوں، بوڑھوں کی کھانسیوں، خوانچہ فروشوں کی صداؤں اور نوجوانوں کے قہقہوں کی دنیا ہے...... اور پھر وہ اُسے دیکھ لیتا ہے۔ وہ چوک کی دوسری طرف سے پارک میں داخل ہوتی ہے۔ اُس کے لباس کے ارغوانی گلابی پیلے رنگ دنیا کے ساتھ ہیں۔ اُس کا پرس جو کندھے پر لٹکا بیگ ہے۔ اُس کے ہر قدم اُٹھنے کے ساتھ جھولتا ہے اور اُس کے بال دھوپ میں بہتی ہوا میں لحہ بھر کے لیے اوپر اُٹھتے ہیں اور پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

''میں تمہیں سلوموشن میں آتا دیکھ رہا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے تم ابھی تک آؤٹ آف کیریکٹر ہو۔''

وہ اُس کے ہونٹوں پر شوخ رنگ لپ سٹک دیکھتا ہے۔ اور حیرت سے کہتا ہے۔

''تمہارے ہونٹوں کو کیا ہوا ہے نیلی۔ بلکہ لالی۔''

''وہی جو تمہیں ہوا ہے۔ آؤٹ آف کیریکٹر۔ میں نے شاید ہی کبھی لپ سٹک لگائی ہو۔ لیکن آج نکلی تو میں نے لگا لی۔'' وہ ہنستی ہے۔

''ہوں۔ بعض اوقات بندہ ہمیشہ کے لیے بھی آؤٹ آف کیریکٹر ہو جاتا ہے۔''

''او۔ کیا ایسا کوئی خطرہ ہے۔''

''خطرہ بہت قریب ہے۔''

''واقعی؟''

''ہاں۔ اور یہ خطرہ خواب جیسا ہے۔ خوابوں میں تم نے دیکھا ہے لالی۔ ہر خواب میں خطرہ۔ ہر لمحے منڈلاتا رہتا ہے۔ ہم خواب دیکھتے ہیں۔ خطرہ محسوس کرتے ہیں۔''

''ہر خواب ایک خطرہ ہے۔'' انیلا مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔

وہ ایک دوسرے میں ایک دوسرے کی لگائی خوشبو پہچانتے ہیں اور گہری سانس لیتے ہیں۔

سیفی بے ساختہ ہنس پڑتا ہے۔

''کیا ہوا؟''

''ایک بات یاد آ گئی۔ کہیں پڑھی تھی۔''

''کیا؟''

"We can't kiss in public but we can piss in public."

دونوں ہنستے ہیں۔

مستان علی ٹکٹکی باندھے انیلا اور سیفی کو دیکھ رہا ہے۔ کُھلا اخبار سمیٹے اُس کے قریب آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں تجسس سے چمک رہی ہیں۔

''بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔ ہیں نا چاچا مستان......؟''

''مجھے یہ جگہ بہت اچھی لگتی ہے۔'' انیلا کہتی ہے۔

"مجھے بھیؔ۔ کیسے وقت بدلنے سے جگہ بدل جاتی ہے۔ اُس دن جب ٹھنڈ اور بارش تھی اور جبار یہاں مٹھائی اکٹھی کر رہا تھا۔ کتنی مختلف تھی یہ جگہ۔"

"عظیم نجات دہندہ" سے نجات کی خوشی میں بانٹی گئی مٹھائی۔" وہ قہقہہ لگاتی ہے۔

"چلو تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"پندرہ منٹ رہتے ہیں چار بجنے میں۔ چیف جان عالم سٹوڈیو پہنچ چکا ہوگا۔" وہ کہتا ہے۔

"چلے جائیں گے یار۔ انتظار کر لے گا چیف۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ تم بھی۔ باز ہی نہیں آتے۔ اُسے چیف کہنے سے۔ اُدھر بیٹھتے ہیں۔" وہ ایک خالی بینچ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"چاچا یہ تو بیٹھ گئے ہیں۔ کوئی مندری تھیوا تیرا لینے نہیں آئے۔" شوکی ہنس کر مستان سے کہتا ہے۔

"دیکھتا جا پتر۔ کُڑی بھی مجھے شوقین لگتی ہے۔" مستان کہتا ہے۔

یک دم لڑکا ہڑبڑا کر بول اُٹھتا ہے۔ "اوئے۔ ہوئے ہوئے۔ یہ تو سگریٹ پینے لگی ہے۔ چاچا یہ تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔"

"ہاں جی......" مستان 'جی' کو لمبا کھینچتا ہے۔ "یہ عاشقی معشوقی کا چکر لگتا ہے پُتر جی۔ اور بہت بُرا......"

"ہیں۔ بہت بُرا...... وہ کیسے؟" شوکی پوچھتا ہے۔

"ہاں۔ چاچا بُرا کیسے؟" لڑکا بھی بہت اشتیاق سے پوچھتا ہے۔

رزاق دو اور گاہکوں کو چائے اور کیک رس دیتا ہے اور اُس کی نظریں بھی اُس نوجوان جوڑے کی طرف بار بار اُٹھتی ہیں۔ لڑکی جو سگریٹ پی رہی ہے۔ وہ جلد از جلد مستان اور شوکی کے پاس جانا چاہتا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ وہ انہیں کی باتیں کر رہے ہیں۔

سیفی انیلا کے ہاتھ میں دبے سگریٹ پر اُس کے ہونٹوں کی لپ سٹک کا نشان دیکھتا ہے۔

"کسی زمانے میں ہالی وُڈ کی فلموں میں سگریٹ پیتی حسینہ کی لپ سٹک کا سگریٹ پر نشان بڑا سیکسی Gesture ہوتا تھا......"

"اب نہیں...... رہا...... کیا......؟" وہ مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھتی ہے۔

"یہ تم آج اپنے سیٹھ سے پوچھنا......"

دونوں قہقہے لگاتے ہیں۔

"چاچا بتا ناں۔ بُرا چکر کیسے ہے؟" لڑکا پھر پوچھتا ہے۔

"اوئے تو پہلے زمین سے نکل تو لے۔ تیری عمر ہے ایسی باتیں پوچھنے کی۔" مستان مصنوعی غصے سے پوچھتا ہے۔

"چل چاچا بتا دے۔ آگے اس کے کام آئے گا۔ اوئے گُلّے کسی دن چیک کرا مجھے۔ دیکھوں جوان ہوا ہے تُو کہ نہیں ابھی۔ ہاں چاچا......" شوکی کہتا ہے۔

"دیکھو بُری عاشقی معشوقی وہ ہوتی ہے جس میں پتہ ہی نہ چلے۔ عاشق کون ہے اور معشوق کون۔ آئی سمجھ؟"

"کس چیز کی سمجھ چاچا......؟" رزاق بالآخر قریب آ کر بے چینی سے پوچھتا ہے۔

"اب بتاؤ اسے آگا پیچھا سارا......" مستان کہتا ہے پھر شوکی کو سنجیدگی سے مخاطب کرتا ہے۔

"تو پتر جب ایسی عاشقی معشوقی ہو۔ تو میری صلاح اُن کو یہ ہے کہ ایک زمرد پہنے۔ دوسرا نیلم۔ ٹھنڈ پڑ جائے گی دونوں کو۔"

"تو چاچا تھوڑی ہمت کر نا! آگے ہو ذرا۔ مال دکھا اپنا۔ کیا پتہ تیرا کوئی پتھر گیٹہ نکل ہی جائے۔" شوکی کہتا ہے۔

"نہیں ہیں ویسے شوقین دونوں۔" لڑکا فیصلہ کُن انداز میں کہتا ہے۔

"تم ناک سے دھواں نکالتی ہو چمنی۔ مردوں کی طرح۔"

انیلا قہقہہ لگاتی ہے۔ "دیکھ لو۔ عورت مرد کی مساوات کتنی آسان ہے۔"

"لوگ گھور رہے ہیں ہر طرف سے۔"

"تمہیں پریشانی ہو رہی ہے......؟ کبھی مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ جب لوگ۔ مرد لوگ مطلب مجھے گھورتے تھے۔ پھر میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔ کہ جیسے ہم ہیں...... اس میں بھائی لوگ' بہن جی لوگ' کو گھوریں بھی نہ تو کیا کریں...... تو اب میں بالکل بُرا نہیں مانتی۔"

سیفی حیرت سے انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ "نیلی۔ میری لالی۔ میری چمنی۔ یہ

تمہاری بڑی ریڈیکل سوچ ہے۔ بہت اچھے۔ بڑی بات ہے۔ میرا خیال ہے۔ مجھے [illegible]
گھسیٹ لینا چاہیے۔ بڑا کیریکٹر بنتا ہے۔ میری کاپی۔ اوہ۔ موٹر سائیکل پہ بیگ۔ [illegible]
ہے۔'' اُٹھنے لگتا ہے۔ انیلا اُسے بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیتی ہے۔

''یہ جو تمہاری گھسیٹا کاری ہے نا۔ یہ محض پکھنڈ ہے۔ مجھے یقین ہے تم سب [illegible]
سکتے ہو بعد میں بھی...... تمہیں صرف ڈرامہ بازی کا شوق ہے۔''

''فلم بازی۔ میری جان......'' گھڑی دیکھتا ہے۔ ''چار بج کر دس منٹ — [illegible]

''تو فلم بازی پر یقین آ گیا تمہیں گھسیٹے؟''

''تم نے ہی تو کہا تھا۔ چاہ پریاں والا اور کباڑ کمپلیکس کے درمیان ایک دنیا [illegible]
کے لیے خالی ہے۔''

دونوں ہنستے ہیں۔

''یہ اتنا ہنس کیوں رہے ہیں؟'' لڑکا بے چینی سے پوچھتا ہے۔

''یہ بھی پکی نشانی ہے۔'' مستان کہتا ہے اور ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ ''ہونہہ۔ [illegible]
ہمارے اوپر بھی یہ وقت تھا۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔ بیٹھو...... سورج مکھی دیکھو......''

سیفی سورج مکھی کے پھولوں کی طرف دیکھتا ہے۔

''سورج مکھی۔ سورج مکھی۔ تیرا منکھ کدھر ہے سورج مکھی؟''

''سورج کو۔ سورج کو۔ سورج کو...... ہا۔ ہا۔ ہا۔ واقعی سیفی یہ تو سورج کی طرف [illegible]
دیکھ رہے ہیں۔'' انیلا ہنستی ہے۔

انیلا آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ نیلے آسمان میں ایک تنہا بادل کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔

جان عالم سٹوڈیو کے پروجیکشن روم نمبر 2 میں بالی سولہ ایم ایم کا ایک [illegible]
پروجیکٹر میز پر سیٹ کر رہا ہے۔ اُس کے چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات ہیں۔ سعید کمال
کے چہرے پر بھی اپنے انداز کی اُتنی ہی ناگواری ہے۔ وہ ٹہل رہا ہے۔

''دیکھو ماسٹر۔ اگر دس منٹ میں وہ نہ آئے تو میں چلا جاؤں گا۔'' وہ کہتا ہے۔

ماسٹر بھی جیسے تھوڑا بُرا مناتا ہے۔

''دیکھو باس میں کوئی ان کا ابا میاں تو ہوں نہیں۔ جو مجھے پتہ ہو کب آئیں گے۔''

سعید کمال کے غصے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خوانخواہ صفدر سلطان کے سامنے جا
کھڑا ہوتا ہے۔ جو ایک ٹوٹے ہوئے صوفے میں بُرا سا منہ بنائے بیٹھا ہے۔

''ساری سر ان لوگوں کی وجہ سے آپ کو بھی پریشانی ہو رہی ہے۔ ویسے میں سوچتا
ہوں۔ آپ کو یہاں زحمت دینا اب کچھ ایسا ضروری بھی نہ تھا۔''

''باس۔ وہ کیوں۔ پہلے تو تم نے کہا تھا......'' ماسٹر یاسین پوچھتا ہے۔

سعید کمال کندھے اُچکاتا ہے۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔

اچانک بالی کافی بدتمیزی سے بول اُٹھتا ہے۔ ''او۔ دیکھو جناب۔ پچیس تیس منٹ تو
ویسے بھی لگ جانے ہیں اب یہ 16 کا بھی فٹ کرنے میں۔ ماسٹر نے بتایا ہی نہیں تھا دو
چاہئیں 16 اور 35۔ بیٹھو آرام سے ابھی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی شو چالو ہوگا۔''

''او۔ او۔ میاں پیسے تو لو اپنے چائے کے۔'' ایک سخت گیر باریش شکل وصورت کا
ادھیڑ عمر گاہک رزاق کو آواز دیتا ہے۔ پھر پیسے دینے کے لیے بوجھل قدم اٹھاتا ہوا اُن کے
قریب آ جاتا ہے۔ نظریں بینچ پر بیٹھے جوان مرد اور عورت پر جمی ہیں۔

''کیسی بے حیائی ہے۔ یا اللہ قیامت کیوں نہیں آ جاتی۔'' وہ کہتا ہے اور رزاق کو
پیسے دیتا ہے۔

''کیسی بے حیائی میاں صاحب؟'' شوکی پوچھتا ہے۔

''اُدھر دیکھو۔'' سب اُدھر دیکھتے ہیں۔ حالانکہ پہلے بھی اُدھر ہی دیکھ رہے ہیں۔
انیلا سگریٹ بجھا رہی ہے۔

''ایسی کھلے عام دعوت گناہ دینے والیوں کو تو زندہ درگور کر دینا چاہیے۔ کیسے یار
کے ساتھ بیٹھی ہے۔''

''میاں صاحب غصہ کیوں کرتے ہیں۔ موج کرنے دیں آپنے۔ آپ کا کیا لیتے
ہیں؟'' مستان کہتا ہے۔

''لعنت مردود۔'' گاہک زیرِ لب کہہ کر چلا جاتا ہے۔

''کیا کہا اُس نے؟'' مستان پوچھتا ہے۔

لڑکا ہنستا ہے۔ ”چاچا تجھے لعنتی مردار کہہ گیا ہے۔“

مستان پہلے تو کوئی اثر نہیں لیتا۔ لیکن پھر جب لڑکے، شوکی اور رزاق کے تمتم بھرے چہرے دیکھتا ہے تو زبردست طیش کا اظہار کرتا ہے اور کچھ دور گئے گاہک کو آواز دیتا ہے۔ ”اوئے...... مستان کو گالی دے گیا ہے۔ چُوہے...... ادھر آ۔ آ۔ آ۔ ادھر...... کس کو لعنتی کہا ہے۔ مردار ہوگا تو مردار ہوگا تیرا...... آ۔ ٹھہر جا ذرا۔“

گاہک ایک نظر مُڑ کر دیکھتا ہے۔ مستان نیم دلانہ جھپٹ کر اُس کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے تو شوکی پکڑ لیتا ہے۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا گاہک بھاگ کر ریلنگ پار کر جاتا ہے۔ شوکی، لڑکا اور رزاق قہقہے لگاتے ہیں۔

مستان اپنا صفائی کرنے کا کپڑا جھٹکتا ہے۔

”بھاگ گیا دلا۔ بڑا نیک پاک بنا پھرتا ہے...... بات ساری اتنی ہے...... یہ خود کیوں نہیں یار بنا ساتھ بیٹھا...... اور سُن لو...... شرط لگاتا ہوں...... اسی گوری منڈے کا فرمایا کر...... آج کہیں غسل خانے میں جان پر کھیل جائے گا......“

”چاچا۔ جان پر کیسے کھیل جائے گا۔ ہیں......؟“ لڑکا پوچھتا ہے۔

”او یار...... او یار...... اس منڈے کا کچھ کرو۔ جا۔ جا بلو۔ بڑوں کی باتوں میں نہ آیا کر۔“

شوکی ہنس کر لڑکے کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہے۔ ”چاچا اس نے بھی تو سیکھنا ہے آخر۔ چل گُلّے میں تمہیں سمجھا دوں گا۔“

سیفی گھڑی دیکھتا ہے۔ مستان بے چین ہو جاتا ہے۔

”یار یہ تو لگتا ہے اُٹھنے لگے ہیں۔ اچھا یار ایک ٹرائی تو میں کروں گا۔“

پروجیکشن روم میں بالی 16 ایم ایم کا پروجیکٹر فِٹ کر کے چالو کر چکا ہے۔ ایک عجیب سی آواز آتی ہے۔ جلدی سے مشین بند کر دیتا ہے۔ سعید کمال، صفدر سلطان اب نسبتاً پرسکون ہیں اور گفتگو میں ان کی کسی نئی باہمی دلچسپی کا تاثر ملتا ہے۔

”اب یہ ہماری فلم تو خیر، صفدر صاحب ہم اس پر کام کر ہی رہے ہیں۔ لیکن Investment کے آگے بڑے چانسز پیدا ہو رہے ہیں۔“ سعید کمال رواروی میں کہتا ہے۔

”اچھا۔ وہ کیسے سر......؟“ صفدر اشتیاق سے پوچھتا ہے۔

”آ۔ وہ۔ پھر بات کریں گے...... معاملات بدل رہے ہیں سر۔ حالات بدل رہے ہیں۔ نئے لوگ۔ اپنے لوگ آ رہے ہیں۔“

ماسٹر یاسین کچھ بھانپ کر ہوں۔ ہوں کرتا ہے۔

”ابھی پندرہ منٹ اور لگیں گے۔ پھر جس نے شو دیکھنے آنا ہے آ جائے۔ یہ شٹر ذرا ڈھیلا ہے۔ کسنا پڑے گا۔“ بالی کہتا ہے۔

”باس کوئی نیا کام......؟“ ماسٹر یاسین پوچھتا ہے۔ سعید کمال کوئی جواب نہیں دیتا۔ پھر گھڑی دیکھتا ہے۔

مستان اپنا انگوٹھیوں کا بکسا اُٹھائے عجیب ٹیڑھے میڑھے سے مودبانہ انداز میں سیفی اور انیلا کے سامنے سے گزرتا ہے۔ پھر یک دم ایک نظر دونوں پر ڈال کر فلمی انداز میں مسکراتا ہے۔ پھر ویسے ہی چلتے چلتے بظاہر لاپروائی سے کہتا ہے۔

”سر جی۔ کوئی پتھر موتی کا شوق ہو تو دکھاؤں۔ عقیق، یاقوت، نیلم، پکھراج، سچے موتی سب کچھ ہے۔“

انیلا اور سیفی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں چمک سی لہرا جاتی ہے۔ جو اصل میں بے ساختہ ہنسی روکنے کی وجہ سے ہے۔

”ہیرا ہے؟“ انیلا خوامخواہ چہک کر پوچھ لیتی ہے۔ اور مستان انہی قدموں پر نیچے گھاس پر بیٹھ جاتا ہے۔ بکسا احتیاط سے ایک طرف رکھتا ہے اور تھیلا دوسری طرف۔ سیفی کڑی نظروں سے انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ انیلا کندھے اُچکاتی ہے مسکراتی ہے۔ مستان بہت بے چاری سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھتا ہے اور خفت میں سر ہلاتا ہے۔

”نہیں ہیرا نہیں ہے میم صاحب۔ ہیرا میں نہیں رکھتا۔ ایسے ہی جھوٹ بولوں۔ بہت مہنگا کنکر ہے۔ اور تاثیر میں کوئی ایسا خاص نہیں......“

”کنکر ہے؟“ انیلا ہنس پڑتی ہے۔

”جی میڈم جی۔ قدرت کے لیے تو سب کنکر ہی ہیں وہ تو ہم انگلیوں، گلوں میں سجائے پھرتے ہیں...... ویسے پتھروں کے علاوہ اور عجائب بھی ہیں فقیر کے پاس۔“

سیفی گہری سانس لیتا ہے اور تاثرات ایسے کہ جیسے اس خوامخواہ کی مداخلت کو قبول کرنے کے بعد اب اُس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو۔

''عجائب...... کیسے عجائب......؟'' وہ پوچھتا ہے۔

مستان کے چہرے پر ہچکچاہٹ نظر آتی ہے۔ اور پھر پریشانی جیسے کسی غلط بات کا ذکر کر بیٹھا ہو۔ اور اب اُس سے بچنا چاہتا ہو۔ ''آ۔ وہ نہیں۔ سر جی۔ مطلب ہے کوئی آپ کے مطلب کی چیزیں نہیں۔ آپ پتھر پسند کریں۔ نیلم۔ یاقوت۔''

''نہیں یار۔ عجائب تو سب کے مطلب کی چیزیں ہیں۔''

''ہے کیا؟ دکھاؤ۔ دکھاؤ......''

انیلا آگے جھک کر مستان کے بکس میں جھانکنے کی کوشش کرتی ہے۔ مستان کے چہرے کے تاثرات ایسے کہ جیسے کسی پیشہ ورانہ غلطی کا ازالہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہو۔ گلا صاف کرتے ہوئے لاپرواہی سے کہتا ہے۔ ''سر جی۔ کچھ نہیں۔ ایسے ہی۔ وہ ایک تو بس کستوری والے ہرن کا نافہ ہے نیپال سے۔ کشمیر کا زعفران ہے اور گِدڑ سنگی ہے بس۔ چھوڑیں......''

''گِدڑ سنگھی ......'' سیفی قہقہے لگانے لگتا ہے۔ ''نہیں یار وہ تو خیالی۔ فرضی چیز نہیں ہوتی؟''

''سیفی یہ وہی ہوتی ہے نا۔ جو مل جائے تو قسمت بدل جاتی ہے۔ دکھاؤ۔ دکھاؤ۔ یہ دکھاؤ پہلے۔ گدڑ سنگھی'' انیلا شور مچاتی ہے۔

مستان علی لمحہ بہ لمحہ صورت حال کا جائزہ لے رہا ہے کہ بات آخر کدھر بڑھے گی۔

''میں کہتا ہوں۔ سر جی۔ پہلے پتھر دیکھ لیتے۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں کہتا ہے۔

''نہیں۔ پہلے گدڑ سنگھی۔'' سیفی اور انیلا دونوں کے منہ سے نکلتا ہے۔ مستان ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور بادل نخواستہ بکسے کی بجائے ساتھ رکھے اپنے بڑے سے کپڑے کے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

لڑکا اخباروں کا بنڈل ساتھ رکھے شوکی کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اُس کی نظریں مستان اور مرد عورت پر گڑی ہیں۔ شوکی دال کی ایک کون پارک میں کھیلتے ایک بچے کو دیتا ہے۔ لاپروائی سے پیسے لیتا ہے اور پھر وہ بھی لڑکے کی نظروں کی سمت میں دیکھنے لگتا ہے۔

''لگتا ہے چاچے مستان نے کوئی کہانی ڈال ہی دی ہے۔'' شوکی کہتا ہے۔

''جاؤں؟'' لڑکا بے قراری سے پوچھتا ہے۔

''خبردار جو گیا تو۔ کام خراب کرنا ہے تُو نے۔'' شوکی گھُرکتا ہے۔

پروجیکشن روم نمبر 2 میں بالی اب ایک اونچی کرسی میں بیٹھا 16 ایم ایم کے پروجیکٹر کو ٹھیک طرح سے چالو کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ماسٹر یاسین اُس کے قریب کھڑا پرتشویش نظروں سے کبھی بالی کو اور کبھی پروجیکشن کی کھڑکی کی راہ سے سعید کمال اور صفدر سلطان کی طرف دیکھتا ہے۔ جو چھوٹے سے سینما ہال جیسے اُس پروجیکشن روم کی سب سے دُور افتادہ کونے کی سیٹوں میں جا بیٹھے ہیں۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اُن کی مدھم آوازیں ماسٹر تک نہیں پہنچ پا رہیں۔ لیکن اُس کے چہرے پر حیرت ظاہر ہو رہی ہے۔ ماسٹر بالی کی اونچی کرسی کو ہلکا سا ہلاتا ہے اور کہتا ہے۔

''بالی یہ کرسی تیری عجیب ہے۔'' بالی قہر آلود نظریں پروجیکٹر سے ہٹا کر ماسٹر یاسین پر ڈالتا ہے۔ ''میرا یہ لکڑی سٹیل کا کھڑا امباد دیکھ رہا ہے یہ بھن چود بھی بڑا عجیب ہے۔'' بالی اپنی پتلون کے نیچے مصنوعی ٹانگ کو تھپتھپا کر کہتا ہے۔ ''چھوٹی کرسی پر بیٹھوں تو باقی ٹانگ کی ماں چُد جاتی ہے...... کہتا ہے عجیب کرسی ہے۔ یہ بیساکھی کچھ کم عجیب ہے۔ پورا ہتھیار ہے۔''

''یار بالی ناراض نہ ہوا کر...... ایسے ہی پوچھ لیا۔ اچھا جلدی کر۔ اب کتنی دیر ہے؟''

''یہ آخری پیچ لگانے لگا ہوں۔ Shutter بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا۔ نہیں تو دوسرا چلا لو اپنا 35 کا ٹوٹا۔ یہ پھر کسی دن دیکھ لینا۔''

''چل تُو کر تو سہی۔ دیکھتے ہیں۔ اب وہ آ تو لیں۔ جنہیں اصل میں فلمیں دکھانی ہیں باس نے۔''

بالی ایک ترچھی نظر 'باس' پر ڈالتا ہے۔ ''یہ شوخا تیرا باس پہلے تو بڑا ٹھوک رہا تھا۔ اب تیرے اُس گانڈے سیٹھ کو ساتھ لے کر بیٹھ گیا ہے۔ کیسے یہ بکرا پھنسا لیا ہے؟''

''بکرا؟ ہاں لیا ہے۔ ایک قربانی کے لیے۔ موٹر تا بہت ہے۔''

بالی خوب ہنستا ہے۔ اور لگتا ہے اس کا مزاج خوشگوار ہو گیا ہے۔ ''دیکھ ماسٹر مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کر۔ تجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ کس بکرے کی بات کر رہا ہوں میں۔ کہانی

کیا ہے فلم کی۔ بتا۔ یار تُو بالی کو یار نہیں سمجھتا۔"
ماسٹر پر اُلجھن طاری ہوتی ہے۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں یار بالی۔ اصل میں مجھے خود کچھ پتہ نہیں کہانی کیا ہے۔ عجیب کام ہو رہا ہے۔ ابھی رائٹر...... رائٹروں پر کام چل رہا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
ہر طرف مت مارنے والے کام ہو رہے ہیں۔ باس باہر سے کہیں سے۔ حد ہے باہر...... پاگل خانہ فلمیں بنانا سیکھ کر آیا ہے۔"
"پاگل خانہ۔ فلم کی کہانی پاگل خانے میں چلتی ہے؟" میں نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ ایک بندہ جھوٹ موٹ کا پاگل بن کر پاگل خانے میں جا گھستا ہے۔ توبہ توبہ بہت بُری ہوتی ہے اُس کے ساتھ۔" بالی ماسٹر کو بتاتا ہے۔
"نہیں یار۔ یہ وہ نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ پاگل خانہ کہ کباڑ خانہ کہ عجائب خانہ۔"
"رنڈی خانہ......" بالی کہتا ہے اور دونوں ہنستے ہیں۔
ماسٹر چونک کر بہت سنجیدہ سوالیہ انداز میں بالی کی طرف دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے۔
"یہ تو بالی تُو نے بات کہہ دی۔ بہت ضروری جو میں نے تجھ سے کرنی تھی۔ یہ بتا۔ وہ ببلی اور سینڈو کا اڈہ اب کیسا چل رہا ہے؟ مردوں کی سیانی ببلی۔"
"کیوں۔ اب بڈھا ہونے لگا ہے تو اس شوقینی کا خیال آ رہا ہے تجھے ماسٹر شرم کر۔"
"او نہیں یار۔ سیٹھ کو اپنے ذرا سکون کرانا ہے۔ وہ فلم لین میں آیا ہی اس کام کے لیے ہے۔"
"سکون کرانا ہے۔ اچھا ہے۔ ایک بار کہ بار بار؟" بالی ہنستا ہے۔
"ہاں وہی۔ مستقل ببلی......"
بالی اور بھی ہنستا ہے۔ "ہوں۔ تو...... یہ کہو ناں...... سیٹھ کا پتہ کاٹنا ہے۔"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ تجھے پتہ ہے میں ٹھگی نہیں کرتا۔ سیٹھ کو خوش تو کرنا ہے نا۔ اس کا پیسہ نہ ملا تو فلم نہیں بنے گی۔ جو دوسری بات وہ کہتا ہے وہ بڑی مشکل ہے۔ لیکن کاروبار تو کرنا ہے نا۔ میں کہتا ہوں اس کو ٹھنڈا کرا دے ایک بار۔ ببلی علاج کر سکتی ہے اس کا...... وہ دونوں اپنی جگہ سیٹ ہیں۔ اگر نہیں تھے تو پچھلی رات ہو گئے ہوں گے۔ سیٹھ کو لڑ بھی

نہیں مارے گی وہ تھوکے گی بھی نہیں اُس پر۔ ویسے اکھ مٹکا تو...... مطلب ہے...... سیٹھ کو پھنسائے رکھنا ہے۔"
"پتہ نہیں کیا بکواس کر رہا ہے تو۔" بالی بغیر گالی دیے کہتا ہے اور پھر 16 ایم ایم کی ٹیسٹ ریلوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔
"16 کی میرے پاس کوئی ہے نہیں۔ آج کل یہ ہوتی نہیں۔ باس لے اپنے پوچھو جو ساتھ لایا ہے۔ وہی چلا کر دیکھنی پڑے گی۔"
ماسٹر پھر شگاف میں سے سعید کمال اور صفدر سلطان کی طرف دیکھتا ہے۔ جواب بھی کوئی بات کر رہے ہیں۔ اور ماسٹر اور بھی حیران ہو جاتا ہے۔
"آج کوئی چکر ہے ضرور، کوئی ایسی بات جو نئی ہوئی ہے، باس ورنہ سیٹھ کو کبھی اتنی لفٹ نہیں کراتا۔ بالی میں تمہیں بتا دوں...... کوئی چکر ضرور ہے۔"
"او جائے تیرا سیٹھ اور......" بالی اپنے قدرتی محاورے کو روکتا ہے اور پھر کہتا ہے۔
"میں نے کہا جا کر پوچھ 16 کا فیتہ یہی چلا لیں پھر ٹیسٹ کے لیے......؟"
ماسٹر سر ہلاتا ہوا دبے پاؤں ہچکچاہٹ ظاہر کرتا پروجیکشن روم سے باہر نکلتا ہے اور ہال کے اُس کونے کی طرف بڑھتا ہے، جہاں سعید کمال اور صفدر سلطان بیٹھے ہوئے ہیں۔ بالی پھر پروجیکٹر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اُسی لمحے بجلی چلی جاتی ہے اور پروجیکشن روم میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ "ستیاناس" بالی کے منہ سے نکلتا ہے۔
چوک خداداد میں سبز گھاس، نیلا آسمان، سورج مکھی کے گہرے پیلے پھول، بھوری عمارتیں، سرمئی سڑک اور بادل کا ٹکڑا ایک چونکا دینے والا منظر بنا رہے ہیں۔ سیفی اور انیلا بینچ پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں۔ سیفی کے ہاتھوں میں ایک پاؤڈر کا گول ڈبہ ہے اور وہ دونوں تحیر کے عالم میں اس ڈبے کے اندر دیکھ رہے ہیں۔
"یہ تو کوئی...... کسی جانور کے بالوں کا چھوٹا سا گچھا لگتا ہے۔" انیلا بے یقینی سے کہتی ہے۔
ڈبے میں انسانی انگوٹھے کے برابر جمے ہوئے بھورے بالوں جیسی کوئی گول سی چیز گہرے سرخ پاؤڈر جیسے سفوف میں پڑی نظر آتی ہے۔

"یہ سرخ پاؤڈر سا کیا ہے؟" وہ پوچھتی ہے۔

مستان علی جو اب دوزانو بیٹھا ہے مسکراتا ہے۔ "سرکار یہ سیندور ہے۔ یہ الّو کی خوراک ہے۔"

سیفی اور انیلا کے منہ بچوں کی طرح حیرت سے کھل جاتے ہیں۔

"خوراک ہے۔" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلتا ہے۔

"کیا یہ زندہ ہے؟" انیلا پوچھتی ہے۔

"اب میڈم جی...... کہنے والے...... سیانے کہتے تو یہی ہیں کہ گِدڑ سنگھی زندہ ہوتی ہے"

"اور سینڈور کھاتی ہے۔" سیفی کہتا ہے۔

دونوں خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ مستان موقع دیکھ کر ڈبہ سیفی کے ہاتھ سے واپس لے لیتا ہے اور جلدی سے بند کر کے واپس تھیلے میں ڈال دیتا ہے۔ پھر اتنی ہی سرعت سے ایک پلاسٹک کی ڈبی سے نیلم اور زمرد اپنی ہتھیلی پر ڈالتا ہے۔ نیلے اور سبز پتھر ایک دم نمایاں ہو جاتے ہیں اور فوراً ہی انیلا اور سیفی اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

"یہ ہے میڈم جی۔ سر جی۔ آپ کے مطلب کی چیزیں۔ گِدڑ سنگھی کو دفع ماریں۔" مستان ہنس کر کہتا ہے۔

"چاچے مستان نے کوئی لمبی کہانی ہی ڈال دی ہے۔" لڑکا پُر جوش انداز میں کہتا ہے۔

"کچھ سودا اپنا بیچے گا تو مانیں گے۔" رزاق کہتا ہے اور ٹی سٹال کی طرف دیکھتا ہے جہاں ایک اور گاہک چائے کے لیے آیا ہے۔

پروجیکشن روم میں بتی آ جاتی ہے۔ سعید کمال اور صفدر سلطان بدستور اُسی کونے میں بیٹھے ہیں۔ ماسٹر بالی کے پاس کھڑا ہے۔ بالی پھر پروجیکٹر کا پاور بٹن آن کرتا ہے۔ "تو پھر ماسٹر میں یہی 16 کا ٹوٹا چلا کر چیک کرنے لگا ہوں۔" بالی پروجیکشن کی کھڑکی سے اُس کونے کی طرف دیکھتا ہے۔ جہاں سعید کمال اب کھڑا ہو کر صفدر سلطان کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے اور صفدر زور زور سے اثبات میں سر ہلا رہا ہے۔ یک دم بالی کی بھوئیں سکڑتی ہیں۔ ماتھے پر بل پڑتے ہیں۔ جیسے پہچان رہا ہو پھر ایک خبیثانہ سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ پھر بے ساختہ ہنس پڑتا ہے۔

"ماسٹر بات سُن۔"

"ہاں۔"

"یہ۔ وہی ہے نہ جو TV میں ہے۔ ڈرامہ...... ڈرامے...... پروڈیوسر......؟"

"تھا...... اب نہیں ہے...... اب فلم بنائے گا......"

"جو بھی بنائے گا چوتیا......۔ ہا۔ ہاہا۔ ایک بات بڑے مزے کی ہے......"

"کیا بات؟"

"اوئے یہی تو خود بِلّی سے...... سکون کراتا ہے۔"

ماسٹر کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے۔ "ہیں...... پھر اپنے اوپر قابو پاتا ہے۔ لاپروائی سے کہتا ہے۔ "ہو گا...... ہمیں کیا۔"

"نہیں اصل بات کچھ اور ہے۔ جو مجھے بِلّی نے بتائی۔"

ماسٹر مشکوک انداز میں اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ "کیا......؟"

بالی ہنستا ہے۔

"کیسی کنجری ہے بِلّی...... میری تو اُس سے خیر پیار محبت ہے...... کہتی ہے بالی تُو تو میرا یار ہے۔ جب سے تیری ٹانگ کٹی ہے، تو زیادہ مرد ہو گیا ہے......"

ماسٹر مسکراتا ہے۔ "اچھا یہ بھی کوئی حساب ہو گا بھئی...... تو یہ بات بتانی تھی تو نے مجھے۔"

"اوہو...... نہیں یار...... وہ تو تیرے باس...... یار اب تو مجھے اس پر ترس آنے لگا ہے۔ مجھے ایسے مردوں پر ترس آتا ہے۔"

"پتہ نہیں کیا بکواس کر رہا ہے۔ ویسے کوئی ٹائم نہیں ہے تیرے پاس اور اب یہ پتہ نہیں کیا کہانی شروع کرنے لگا ہے۔"

"بتاتا ہوں...... ماسٹر...... وہ بِلّی جو ہے۔ اُس نے بتایا مجھے۔ تیرے اس باس کا...... وہ کہیں رات کے لیے اس کے پاس گئی...... کسی ڈرامے میں کام ملا تھا اُسے...... تو پتہ نہیں کیا بات ہم کر رہے تھے...... اُس نے بتایا اس بیچارے کا۔"

"کیا؟"

بالی اپنا انگوٹھا انگشتِ شہادت کے پہلے پَور کے نیچے رکھ کر انگلی کو عجیب فحش سی

حرکت دیتا ہے اور ہنستا ہے۔ انگشتِ شہادت ماسٹر کے سامنے ہلاتا ہے۔

''...... ایسی حرامزادی ہے یہ ببلی۔ آ کر ہر کہانی سناتی ہے۔ پر صرف مجھے۔ بڑے مردوں کی سیانی ہے۔ تمہیں بتا دوں سیٹھ تیرے کا کوئی کچرہ پھنسا ہوا تو نکال دے گی۔''

ماسٹر یاسین کا چہرہ عجیب سی خفت حیرانی اور ہنسنے کی کوشش میں مضحکہ خیز ہو رہا ہے۔ بالی زور سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہے۔

''کیا سمجھے ماسٹر...... باقی ہر چیز قدرت کی بنائی ہے...... اس بچارے کا کیا قصور...... پر ببلی...... اُس کے پاس ہر کسی کا حل ہے۔ بڑی دبنگ عورت ہے۔ مردوں کی سیانی ببلی۔''

ماسٹر کھسیانہ سا ہو کر پھر بات شروع کرتا ہے۔ ''وہی تو کہتا ہوں سیٹھ کا کیس لگوا دے۔''

بالی پھر قہقہہ لگاتا ہے۔ ''کیس لگوا دے۔ اُس نے کوئی عدالت کھولی ہوئی ہے نے۔ مردوں کی سیانی نے۔''

''سیٹھ کو ہاتھ پر ڈالنا ہے یار بالی۔ فلم انڈسٹری...... مطلب پیسہ آئے گا تو فلم بنے گی۔''

''ہاں ڈائریکٹر پروڈیوسر دونوں...... ہا۔ ہا۔ ہا۔ لگ جائے گا کیس۔'' بالی کہتا ہے۔ اور ماسٹر کو آنکھ مارتا ہے۔

''ویسے میں کھیل میں شامل ہوں نا! ماسٹر؟''

''ہاں۔ ہاں...... تم تو جگر ہو یار...... اسسٹنٹ کیمرہ مین۔''

ادارتی نوٹ

دنیا کے قدیم ترین پیشے سے تعلق رکھنے والی بلقیس خانم عرف ببلی نے ''مردوں کی سیانی'' ہونے کی غیر معمولی شہرت کیسے حاصل کی۔ یہ ایک حیرت انگیز کہانی ہے۔ جو حسن کی مجموعی صورتِ حال کا ایک حصہ ہونے کے باوجود ''ببلی کی صورتِ حال'' یا اس سے ملتے جلتے کسی عنوان کے تحت ایک جداگانہ بیانیے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور یوں ہمارے دائرہ کار سے خارج ٹھہرتی ہے۔ ہم صرف ببلی کی دنیا سے متاثر ہو کر ہمارے واقعاتی تانے بانے پر واضح اثر ڈالنے والے بعض کرداروں کے ناگزیر معاملات کا انتہائی مختصر ذکر کریں گے۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا گیا ہم ایک ''صورتِ حال'' بیان کر رہے ہیں افسانہ نویسی نہیں کر رہے۔ کوئی کہانی نہیں سنا رہے۔ ورنہ ہم ببلی کی کہانی اُس کے بھیانک بچپن سے لے کر فلمی دنیا میں اس کی آمد اور آخر سٹنٹ وومن بننے تک سناتے۔ ہم یہ بھی بتاتے کہ اُس نے ایکسٹرا لڑکیوں اور بعض دوسرے نسوانی ذرائع کے ذریعے ''پیشے'' میں روایتی لونڈی، کنیز، غلام کے ناموں اور کاموں کو استعمال کرتے ہوئے ایک انوکھا انسانی ادارہ کیسے قائم کیا۔ اُس نے اپنے اس بنیادی مسلکے کہ ''آقاؤں'' ''مالکوں'' یعنی گاہکوں کو اُن کے احساس گناہ سے زیادہ سے زیادہ نجات کیسے دلائی جا سکتی ہے اور اس کے لیے اُس نے ایک سے زائد عملی اور انتہائی کامیاب حل کیسے دریافت کیے اور پھر اس مقصد کے لیے عارضی شادیوں اور طلاقوں کے امکانات سے کیسے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور پھر بعض مخصوص مردوں کے انتہائی مخصوص مسائل کے حل کے لیے نایاب خدمات کیسے فراہم کیں اور اس طرح اُس کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لحاظ سے سٹنٹ وومن ببلی کے نازک ہیروئن کی جگہ خود آگ میں کود جانے یا چلتی ریل سے چھلانگ لگا دینے کا تسلسل ہی تھا۔ جو کام ''شریف عورت'' نہیں کر سکتی۔ وہ ببلی یا اُس کی لونڈیاں کرتی ہیں۔ ببلی کی زندگی کی سب سے بڑی حسرت اپنی سٹنٹ وومن کی زندگی پر فلم بنانا ہے۔ ہم اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

بالی کرسی پر اوپر کو اٹھ کر پھر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ ساتھ رکھی بیساکھی کو سیدھا نیچے جما کر اوپر کو اُٹھتا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ کا زاویہ درست کرتا ہے اور پھر سنبھل سمٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ''ماسٹر یار سُنا ہے امریکہ میں بالکل اصلی ٹانگوں جیسی ٹانگیں بننے لگی ہیں۔''

ماسٹر یاسین بالی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے گہری نظروں سے شگاف کی راہ سے دور کونے میں بیٹھے دو افراد کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ ''بس اب اُن دونوں کا انتظار ہے۔ پتہ نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔''

انیلا کی ہتھیلی پر رکھا نیلم سورج کی روشنی میں چمکتا ہے اور سیفی کی ہتھیلی میں اُس کے

دل کی لکیر کے عین اوپر رکھے زمرد...... جو شفاف پتھر نہیں...... کی سبزی بڑھ جاتی ہے۔

مستان علی کی باچھیں اب کھلی ہوئی ہیں اور لہجے میں پیشہ ورانہ جوش کی جھلک نمایاں ہے۔

''ان کو سرکار ہم مور پتھر بھی بولتے ہیں۔'' وہ کہتا ہے۔

''مور پتھر...... وہ کیسے؟'' انیلا اشتیاق سے پوچھتی ہے۔

''میڈم جی۔ نیلم مور کی گردن کا رنگ ہے اور زمرد اُس کے پنکھ کا۔''

''واہ......'' سیفی داد دیتا ہے۔

رزاق۔ اخبار والا لڑکا اور شوکی اب نسبتاً قریب آ چکے ہیں، کنگھیاں اور ازار بند بیچنے والا، کچھ بے فکرے لوگ اُن کے گرد اکٹھے ہو رہے ہیں۔ کچھ دور گھاس پر بیٹھی دو عورتیں اُن کی طرف متوجہ ہیں۔ پھر بس سٹاپ پر جاتے کچھ لوگ بھی قیمتی پتھر بیچنے والے شخص کا کاروباری مظاہرہ دیکھ کر رُک جاتے ہیں۔ مستان علی ناپسندیدگی سے اُن کی طرف دیکھتا ہے۔

''جاؤ۔ بھائی جاؤ۔ کام کرو اپنا...... ادھر کوئی تماشہ نہیں لگا۔ بھائی جان۔ ماں جی۔ حاجی صاحب۔ میاں جی...... اللہ بھلا کرے۔ اوئے۔ چل اوئے۔ بھائی کنگھی۔''

سیفی اور انیلا ہنستے ہیں۔ مستان پھر جیسے سب کچھ بھول کر اپنی مکمل توجہ اُن پر مرکوز کرتا ہے۔ ''نیلا اور سبز کا عشق ہے۔ اور نہ عاشق کا پتہ ہے کون ہے۔ نہ معشوق کا پتہ ہے کون ہے۔ میرے حساب سے سرکار آپ دونوں بدل بدل کر پہنیں۔ نیلم اور زمرد۔ تین کے حساب سے نیلم اپنا پتہ دیتا ہے۔ تین سیکنڈ۔ تین منٹ۔ تین گھنٹے۔ یا تین دن میں۔''

ایک ادھیڑ عمر سڑیل سا آدمی مستان کے قریب آتا ہے۔ ''یاقوت دکھا۔ ہے تیرے پاس۔ دکھا۔'' ''نہیں ہے۔'' مستان مکھی اُڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلاتا ہے۔ ''دِکھا۔ دِکھا۔'' ''او نہیں ہے لالہ۔ نہیں ہے۔ جاؤ کام کرو اپنا۔'' مستان سخت بدمزاجی سے کہتا ہے۔ اور سڑیل آدمی بڑبڑاتے ہوئے چلا جاتا ہے۔

''آ جاتے ہیں منہ اُٹھا کر۔ یاقوت دکھا۔ شکل دیکھ اپنی۔...... یہ سرکار شوقین لوگوں کے کام ہیں۔ ہرا ایرا غیرا پتھر نہیں پہن سکتا۔ نہ ہی میں ہر کسی کو پتھر دکھاتا ہوں۔''

سیفی انیلا کے کان میں سرگوشی سے کہتا ہے۔ ''یاد رکھنا اب ہم شوقین لوگ ہیں۔''

انیلا اپنے نیلم کو دو انگلیوں میں دبا کر اُس میں سے آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔

بادل کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔

''نیلا۔ نیلا۔ آسمان۔ آسمان۔ سبز۔ سبز۔ گھاس۔ گھاس...... سیفی مجھے یہ لے دو۔''

انیلا نیلم کو انگلی اور انگوٹھے میں گھماتی ہے۔ اور پھر اسے آنکھوں کے سامنے لا کر اُس کی چھوٹی سی نیلی کھڑکی کی راہ سے پھر نیلے آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ بادل کا ٹکڑا عجیب سی شکلیں بنا رہا ہے۔

''بادل کا وہ ٹکڑا دیکھو سیفی۔ جیسے سیٹھ سائیکل چلا رہا ہو۔'' انیلا آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتی ہے۔

سیفی بھی آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور اُس کی دیکھا دیکھی کم از کم دو اور لوگوں کی نظریں بھی آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں۔ ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔ ''کیا ہے اوپر آسمان میں؟''

''مجھے تو لگتا ہے سیٹھ کوڑے کھا رہا ہے۔'' سیفی کہتا ہے۔ دونوں ہنستے ہیں۔ ''کتنے پیسے جناب؟'' سیفی زمرد اور نیلم دونوں مستان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھتا ہے اور اب لوگوں کے اردگرد اکٹھے ہونے کی وجہ سے کافی بے چین لگتا ہے۔

سہ پہر اب دھیمی روشن ہو رہی ہے۔ شاہراہ پر سے گزرتی سواریوں سے باہر جھانکتے لوگ اکتا دینے والے معمولی منظر کے ٹکڑے دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ جنہیں وہ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ کھلی آنکھوں کے سامنے گزرتے انسانوں، گاڑیوں، سائیکلوں، ریڑھیوں، ذیلی سڑکوں، گلیوں، عمارتوں، سائن بورڈوں، گاہکوں، دوکانداروں، گھاس کے ٹکڑوں، بس سٹاپوں، پھولوں کی کیاریوں، درختوں کو وہ نہ دیکھتے دیکھتے ہیں۔

مگر حسن دیکھتا ہے کہ چوک خداداد کے قریب شہر کے سب سے پرانے فوٹو گرافر بھوریا جی کی دکان جس سب سے پرانی عمارت میں بنی ہے اس کی دیوار میں پانچ فٹ کی بلندی پر موٹے پائپ اور بند کھڑکی کے ساتھ اُگا پیپل کا درخت دیوار میں ایک نمایاں شگاف کھول چکا ہے اور اگر اس پیپل کو وہاں سے نکال کر شگاف کی مرمت نہ کی گئی تو دیوار کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پیپل کے درخت کے ساتھ کیا مسئلہ ہے کہ یہ دیوار میں اُگنا پسند کرتا ہے۔ حسن آج تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ چوک خداداد آ گیا ہے۔ جہاں وہ ہفتے کے اس روز اترتا ہے اور وہ ڈرائیور سے کہتا ہے۔ ''نور خان اسی چوک میں......'' ''جی

صاحب جانتا ہے۔ آج کا روز آپ ادھر اترتا ہے۔ ہم اُتارے گا۔'' نور خان اس کا خرچ پورا
ہونے سے پہلے بول اُٹھتا ہے۔ گاڑی آگے بڑھتی ہے۔

مستان علی اپنے سودے کی منہ مانگی اور بھاری قیمت وصول کر کے وہاں سے نکلنے
کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ حیرانی سے اُن شوقین مرد عورت کو دیکھتا ہے جو اب بھی آسمان پر
شاید بادل کے ٹکڑے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جبکہ نیلم اور زمرد مرد نے لاپروائی سے جیب
میں ڈال لیے ہیں۔

''مجھے تو یہ اب نظر آتا ہے کہ سعید اور سیٹھ بغل گیر ہو رہے ہیں۔'' سیفی کہتا ہے۔

''مجھے تو ایسا دکھتا ہے کہ چاہ پریاں والا کے کنویں سے رشیدہ پری ڈول نکال رہی ہے۔''
سیفی بھی غور سے دیکھتا ہے۔ ''ہوں۔ اب مجھے بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے سوائے اس
کے کہ یہ رشیدہ پری نہیں حمیدہ پری ہے۔'' انیلا ہنستی ہے۔

مستان علی دور دیکھتا ہے تو شوکی، اخبار والا لڑکا گُلا اور رزاق ہاتھ کے بے چین
اشاروں سے اُسے پاس بلا رہے ہیں۔ اور وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ کچھ اور
لوگ بھی رُک جاتے ہیں۔ ''بھائی جان کیا ہے؟ اوپر کیا دیکھ رہے ہیں۔'' وہ اوپر دیکھتے ہوئے
پوچھتے ہیں۔ ''شاید کوئی پتنگ جیسا جہاز ہے شاید۔'' ''اچھا کدھر؟'' ''اُدھر بادل کے ساتھ۔''

بینچ پر وہیں بیٹھے بیٹھے انیلا اور سیفی کو اچانک احساس ہوتا ہے کہ اُن کے ارد گرد
بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں اور سب آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

''او مائی گاڈ۔ دیکھ رہے ہو سیفی۔ سیفی دیکھ رہے ہو۔ ارد گرد دیکھ رہے ہو۔''
انیلا سرگوشی میں کہتی ہے۔

''ہاں۔ ہاں...... بس۔ کھسکیں۔'' سیفی کہتا ہے۔ اور پھر آوازیں اُن تک پہنچتی ہیں۔

''فرشتہ۔ اچھا۔ فرشتہ ہے...... نہیں یار۔ اُدھر دیکھو بادل کے ساتھ......''

پھر ایک آدمی ہمت کر کے سیفی سے پوچھ لیتا ہے۔ ''سر اُدھر کیا دیکھا ہے آپ نے
اوپر؟'' ''ہم نے تو کچھ نہیں دیکھا سب ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید اُڑن طشتری ہے۔''
''اُڑن طشتری ہے۔'' سرگوشی پیچھے تک مجمعے میں پھیل جاتی ہے۔ ''وہ کیا ہوتی ہے۔'' ''کیا
تھالی جیسا جہاز۔ کیا کہا کالی۔ مالی۔ کنالی۔ عالی۔ عالی نہیں ال۔ چیل اُڑ رہی ہے۔ اچھا

چیز۔ اُڑنا۔ اڑنا پ ہے۔ ہیں۔ اچھا۔ وہ دیکھ۔ بادل کا ٹوٹا نہیں۔ ساتھ اڑن طشتری۔ فرشتہ
ہے۔'' ''اب لگتا ہے سائیں گلاب کے مزار پر قوال بیٹھے ڈھول بجا رہے ہیں۔'' سیفی کہتا
ہے۔ ''سیفی نکلو پلیز۔'' ''قیامت سے پہلے چیل آئے گی۔'' ''مجھے تو لگتا ہے کچھ بھی نہیں۔''
''انیلا۔ اُٹھو۔ بس نکلو۔ کھسکو جلدی۔''

حسن چوک خداداد کے آہنی جنگلے میں بنے چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھتا
ہے اور اُس کی نظریں بیس پچیس افراد کے چھوٹے سے ہجوم پر رکتی ہیں۔ جو ایک بینچ پر بیٹھے
جوان عورت مرد کے گرد کھڑے ہیں اور سب ہی آسمان کی طرف منہ اٹھائے کچھ دیکھ رہے ہیں
اور ہاتھوں سے اشارے کر کے ایک دوسرے کو کچھ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حسن کی
نظریں بھی اُسی جانب اٹھتی ہیں۔ آسمان میں بس ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا ہے۔ اور کچھ نہیں۔
اُس کی نظریں مرد عورت پر واپس آتی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب سے الگ سرگوشیوں میں
باتیں کر رہے ہیں۔ پھر تیزی سے اُٹھ کر ہجوم میں سے راستہ بناتے باہر نکل آتے ہیں اور اُس
پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر اُس کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ اور حسن اُن کی لمحوں بھر کی پاس
سے گزرتے کی آوازیں سُن پاتا ہے۔ اُن کے لہجے میں ایک عجیب سی گونج ہے ''تم نیلم پہنو گی
کہ زمرد؟ میں شوقین لوگ ہوں۔ میں نیلم پہنوں گی۔ ہوں۔ تو دوسرا شوقین لوگ زمرد پہنے گا۔
نیلے کو سبز ٹھنڈا کرتا ہے۔ بدل بدل کر...... ہا۔ ہا۔ ہا...... آخری بار تم نے اوپر بادل میں کیا
دیکھا۔ جبار کا کتا ہوپ جس کا خون آدم خور پھول چوس رہے ہیں۔ اور تم نے کیا دیکھا؟''
عورت پوچھتی ہے۔ ''میں گردن جھکائے چیف کے سامنے بیٹھا ہوں اور چیف تلوار سے میرا
سر قلم کرنے کو ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔'' حسن اُن کے قہقہوں کی آوازیں غائب ہوتے سنتا ہے وہ
بیس پچیس افراد کے قریب سے گزرتا ہے۔ جن میں سے بیشتر اب آسمان کی طرف دیکھنا بند کر
چکے ہیں۔ ''وہ کوئی جہاز تھا۔ نہیں پُتر جی میں بتاتا ہوں۔ دونوں فلم لائن کے تھے۔ لگتا ہے
شرط۔ تیری گا بکی اعلیٰ ہو گئی چاچا مستان۔ اب کسی فلم میں آئے گا سودا تیرا...... فلم بن رہی
تھی۔ ہاں جی۔ اچھا جی۔ ہاں جی فلم بن رہی تھی جی فلم بن رہی تھی۔ اچھا شوٹنگ ہو رہی تھی۔
ہیں۔ شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اوخو۔ خو۔ اچھا شوٹنگ ہو رہی تھی۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ شوٹنگ ہو رہی تھی
جناب۔ اُدھر ہوا سے فلم بنا رہے تھے۔ پر آواز تو کوئی آئی نہیں جہاز کی۔ ہیلی کاپٹر کی۔ بغیر آواز

کے جہاز بن گئے ہیں جناب۔ اچھا...... ایسے ویسے...... بڑی سَینس ہے بھئی۔ ہاں نظر
ہے...... پر یہ کہتا ہے فرشتہ اترا ہے آسمان سے کبوتر کی شکل کا۔ نہیں ال تھی
مطلب...... اب چیل کی شکل کا فرشتہ تو ہو نہیں سکتا۔ اچھا۔ اچھا...... ویسے چاچا مستان
تیرا مال کبھی گیا ہے فلم لَین میں...... ہاں کیوں نہیں...... وہ فلم 'پکار' میں ہیرو کی چھوٹی
مندری پہنتی ہے۔ وہ ادھر سے گئی تھی اسی پیٹی سے......'' حسن گزر جاتا ہے۔ حسن کچھ
کہ وہ دونوں فلمی اداکار لوگ تھے۔ اور فلم بن رہی تھی۔ کیمرے تو کہیں نظر نہیں آ رہے
اُس کے ذہن میں بھی وہی سوال سر اُٹھاتا ہے۔ اوہ تو ہوائی منظر تھا وہ دونوں اُس کے
سے گزرے تھے تو کہیں وہ بھی کسی کیمرے کی زد میں آ گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا
سب کچھ ہو سکتا ہے۔ حسن پارک کے دوسرے دروازے کی راہ سے دوسری سڑک پار کرنے
کے لیے رُک جاتا ہے۔ لیکن اُن کا وہ ڈائیلاگ کیسا عجیب تھا۔ کتے کا خون۔ آدم خور
خون چوس رہے ہیں۔ یہ کیا۔ کیا مطلب...... کیا مطلب...... کیا مطلب...... کیا اُس کے
نے اُسے دھوکہ دیا۔ حسن سوچتا ہے۔ اور سڑک پار کر جاتا ہے۔

ادارتی نوٹ

اور اس طرح 'حسن کی عمومی صورتِ حال' اور 'حسن کی فلمی صورتِ حال' چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کے قریب آ جاتی ہیں اور پھر جدا ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ پھر بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوں گی۔ اور اگر ایسا ہوگا تو کب اور کیسے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم انہیں سوالات کے جوابات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور نامعلوم لیکن ہمارے لیے معلوم کا تحیر اور خوف ابھی سے ہمارے اوپر طاری ہو رہا ہے۔ ہم فی الحال فلمی کی طرف ہی رجوع کریں گے اور فلم پروجیکشن بالی کے پاس جائیں گے۔

---

(11)

اندر دیکھو۔ باہر دیکھو۔ فلم دیکھو......

سر (Sir)۔ سرئیلیزم اور موت کی چہل قدمی

بالی 16 ایم ایم کے پروجیکٹر پر لگی چھوٹی سی سپول کی ایڈجسٹمنٹ کو ایک بار پھر چیک کرتا ہے اور پھر شگاف کی راہ سے اُن دونوں کی طرف دیکھتا ہے جو آگے نشستوں کے قریب کھڑے ہیں اور جو اُسے پہلی نظر میں ہی پسند آ گئے تھے۔ بالی کے ساتھ یہی تھا۔ لوگ یا تو پہلی نظر میں ہی اُسے پسند آ جاتے تھے یا پھر ناپسند ٹھہرتے تھے۔ بالی کی دنیا میں دو طرح کے لوگوں کی اہمیت تھی۔ دوست یا دشمن باقی سب ایویں ہی تھے۔ اُس کا کہنا تھا اصل لوگ یا تو نظروں میں کھب جاتے ہیں یا پھر چُب جاتے ہیں۔ باقی سب کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

اور وہ دونوں بھی پروجیکشن روم میں، اُس کے علاقے میں آتے ہی اُس کی نظروں میں کھب گئے تھے۔ اور پھر اُن کے اتنی دیر سے آنے پر جب ماٹھے ڈائریکٹر نے بَکل بَکلیان شروع کی تھی تو جس طرح انہوں نے اُس کی طبیعت صاف کی تھی اُس سے تو وہ بالکل ہی اُن کا عاشق ہو گیا تھا اور مکمل فیصلہ ہو گیا تھا کہ اُن چاروں میں جب پھوٹ پڑے گی تو وہ اُن کا ساتھ دے گا اور پھوٹ پڑنی ہی پڑنی تھی اُس کا دل کہتا تھا۔ اوپر سے جب انیلا نے سگریٹ سلگایا تو فیصلے پر مہر لگ گئی اور اُس کے دل سے آواز آئی۔ ''جی او شیر دی اے بچیے۔''

بالی جوسیفی اور انیلا سے ابھی کوئی ایک بات بھی کیے بغیر ان کے لیے اپنی دوسری ٹانگ بھی کٹوا دینے پر تیار ہو چکا ہے، دیکھتا ہے کہ شیر دی بچی کے لیے گِدڑ ڈائریکٹر اور بچو سیٹھ کی نظریں کافی گندی ہیں۔ اپنا آپ نہیں دیکھتے یہ دلے۔ بالی عورت مرد کے تعلق پر اپنے

خیالات کی وہ دونوں مثالیں پہچانتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ بالی کا خیال ہے کہ ہر مرد کی نظر
عورت کے لیے ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن گندی نظر صرف چور مرد کی ہوتی ہے۔ اور چور مرد وہ
ہوتا ہے جو عورت کو کچھ دے تو سکتا نہیں بس اُس سے کچھ لے کر بھاگنے کے چکر میں رہتا
ہے۔ جیسے یہ ڈائریکٹر اور سیٹھ۔ بالی اپنی لکڑی کی ٹانگ میں شدید خارش محسوس کرتا ہے۔ اُس
کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ پہلے جب اُس کی ٹانگ نئی نئی بنی تھی تو اُس وقت تو بہت ہوتا تھا لیکن
اب جب کبھی اُسے زیادہ ہی غصہ آتا ہے۔ تو اُسے لکڑی اور سٹیل کے بنے گھٹنے میں سخت خارش
محسوس ہوتی ہے۔ جب پہلی دفعہ اُس کے ساتھ ایسا ہوا اور اُس نے یاروں دوستوں کو بتایا تو وہ
ہنس ہنس کر پاگل ہو گئے۔ اس پر اسے اور بھی غصہ چڑھا اور بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ لیکن
پھر اُس نے کبھی کسی کو نہ بتایا کہ لکڑی کی ٹانگ میں بھی خارش ہی نہیں درد بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن
چودوں کی اپنی کٹے تو پتہ چلے۔ بالی سوچتا ہے اور اُن کے اشارے کا انتظار کرتا ہے کہ وہ بتیاں
بجھائے اور شو چالو کرے۔

''بالی چل یار فیتہ رول کر۔'' آخر ماسٹر یاسین کہتا ہے جو اب جا کر آگے سب کے
ساتھ بیٹھ گیا ہے۔ بالی کمرے کی بتیاں بجھاتا ہے اور 16 ایم ایم کا فیتہ رول کرتا ہے۔ سکرین
روشن ہو جاتی ہے اور فوراً ہی بلیک اینڈ وائٹ خاموش فلم کا گھسا ہوا پرنٹ سکرین پر روشن پنچھی
سے اُڑاتا ہے۔ پھر فرانسیسی زبان میں ٹائٹل چلنے شروع ہو جاتے ہیں۔

Mise en scene

de louis Bunel

چیف یہ فرنچ ہے نا؟'' سیفی پوچھتا ہے۔
''ظاہر ہے۔'' سعید کمال کی خشک سی آواز آتی ہے۔
سیفی اگلا ٹائٹل پڑھتا ہے۔

d'apres un scenrio

de Salvador Dali

et Louis Bunel

''چیف میں فرنچ نہیں جانتا لیکن اس کا مطلب، یہی ہے نا کہ سناریو سیلوے ڈار

ڈالی اور لوئی بیونل۔''
''تم اپنی چونچ بند کرو گے کہ نہیں؟'' انیلا ڈانٹ کر سیفی سے کہتی ہے۔ اور بالی
اندھیرے میں مسکراتا ہے۔ اُسے اُس کا فقرہ اس کا انداز پسند آتا ہے۔ ٹائٹل آگے بڑھتے ہیں۔

avcc

Simonne Marevil

et

Pierre Batchef

''یہ ایکٹر ہیں۔'' سیفی کہتا ہے۔
''سیفی...... میں نے۔ تمہیں۔'' انیلا پھر بولتی ہے۔
''یار۔ کیا ہوا...... یہ خاموش فلم ہے۔ اور ایسی فلموں کا ایک مزہ یہ بھی ہوا کرتا تھا کہ فلم
دیکھو اور ساتھ جتنی مرضی گپ شپ لگاؤ۔ ڈائیلاگ تو ہے نہیں کہ سننے پڑیں۔'' سیفی کہتا ہے۔
بالی پھر مسکراتا ہے۔ اور سمجھ جاتا ہے کہ دونوں کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے۔
''میرا خیال ہے۔ مجھے پروجیکشن بند کرانی پڑے گی اگر یہ تمہارا جاری رہا۔'' سعید
کمال تنبیہ کرنے کے انداز میں کہتا ہے۔
''بند کرا کے تو دیکھ گانڈے......'' بالی بڑبڑاتا ہے۔

Prise de vues Puverger

Un Chien Andalou

سیفی فلم کا ٹائٹل پڑھتا ہے اور شور مچا دیتا ہے۔ ''ایک منٹ۔ ایک منٹ...... ایک
منٹ...... روکنا یار روکنا......''
بالی پروجیکٹر کی موٹر فوراً بند کر دیتا ہے۔ بتیاں پھر آن کر دیتا ہے اور کافی آگے
بیٹھے سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔ ''کیا ہوا سر جی۔'' وہ بغیر کسی غصے کے کہتا ہے۔ اور جانتا ہے کہ
کوئی دوسرا اسے ایسے مشین چالو کرتے ہی پھر بند کرنے کو کہتا تو وہ اُسے اور کچھ نہیں تو گالیوں
سے تو نب کر تو ضرور رکھ دیتا۔ لیکن یہ بندہ اپنا ہے۔
''ساری یار۔ یار ساری۔ معاف کرنا...... تمہارا نام بالی ہے ناں۔''

"جی سرکار۔ بالی...... نوکر آپ کا۔" وہ کہتا ہے اور ماسٹر یاسین بے ساختہ مسکرا [illegible]
"یہ کیا کیا تم نے......" سعید کمال پوچھتا ہے۔
"انیلا پلیز جلدی وہ تمہاری سیٹ کے ساتھ نیچے میرا بیگ رکھا ہے۔ [illegible] میری گھسیٹا کاپی۔ سوچا ہے ساتھ ساتھ جیسے بھی ہو۔ ان فلموں کے گھسیٹا سکرین پلے [illegible] لوں۔ آخر ہم نے انہی سے سیکھ کر آگے سکرپٹ لکھنا ہے۔ تمہارا ہی فائدہ ہے۔ کلاس کی [illegible] ہے یہ۔ کیوں چیف۔ انیلا جلدی کرو پلیز۔"

"آئندہ یہ بورا اپنا ساتھ ہی رکھا کرو۔" انیلا اٹھ کر دور ایک سیٹ کے ساتھ رکھے سیفی کے بیگ کو اُٹھا کر اُس کی سیٹ کی طرف پھینکتی ہے۔ سیفی بیگ اُچک کر تیزی سے [illegible] کاپی پنسل نکالتا ہے۔

"سیفی صاحب...... اندھیرے میں لکھیں گے کیسے؟" اچانک صفدر سلطان پوچھتا ہے۔ اُس کا لہجہ معمول سے کچھ مختلف ہے۔ انیلا اور سیفی الجھن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"لکھنا نہیں گھسیٹنا ہے سیٹھ صاحب اور یہ اندھیرے میں اور بھی بہتر ہوتا ہے۔"

"جی۔ جی۔ سمجھ گیا۔" صفدر سلطان کہتا ہے اور ہنستا ہے۔ انیلا اور سیفی پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں۔ یہ سیٹھ کچھ تھوڑا بدل نہیں گیا؟

"میں نے کہیں جانا بھی ہے۔" سعید کمال کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال کر سرد لہجے میں کہتا ہے۔

سیفی کاپی پنسل سنبھال کر بیگ کے نیچے رکھتا ہے۔ اور سر گھما کر پیچھے پروجیکشن کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر آواز بلند کرتا ہے۔ "بالی آنے دو یار۔"

بالی پھر بتیاں بجھاتا ہے اور ویسی ہی آواز لگاتا ہے۔ "آ گئی سر۔" پروجیکٹر چلنے کی آواز آتی ہے۔ فلم پھر شروع سے چلتی ہے۔ لیکن اگلے ہی لمے پھڑ...... پھڑ...... اس۔ پھڑس...... کی آواز آتی ہے اور سکرین پر روشنی اور سایوں کے چھپاکے نظر آنے لگتے ہیں۔ What the hell۔ سعید کمال کے منہ سے نکلتا ہے اور سیفی "کیا ہوا

بالی؟" کی آواز لگاتا ہے۔ "سر جی فیتہ ٹوٹ گیا ہے۔ پانچ منٹ میں لگ جائے گا۔" بالی بیزل اُتارتا ہے۔ بتیاں پھر روشن کر دیتا ہے۔ سیفی سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے۔ جس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔ صفدر سلطان کافی مطمئن ہے اور سیفی کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔ سیفی بھنویں اُچکاتا ہے اور انیلا کی طرف دیکھ کر آنکھ مارتا ہے۔ پھر یک دم اونچی آواز میں سعید کمال سے بات کرنے لگتا ہے۔ "چیف یہ سکرین پر فلم جو چلتی ہے۔ وہ اصل میں سٹل فریم 1/16 سیکنڈ کے لیے آتے ہیں اور درمیان میں اتنا ہی تاریکی کا وقفہ ہوتا ہے۔"

"مجھے فلم کی Optics پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ تمہارا خیال ہے میں جاہل ہوں۔" سعید کمال تضحیک آمیز مسکراہٹ سے کہتا ہے۔ "میرا خیال ہے تمہیں سعید سے گالیاں کھانے میں کوئی خاص مزہ آتا ہے۔" انیلا ایسے کہتی ہے جیسے بُرا مان گئی ہو۔ سعید کمال چونکتا ہے۔ اور پھر ہنس کر کہتا ہے۔ "نہیں یار۔ نہیں یار میں تو مذاق میں کہہ رہا ہوں۔" انیلا سگریٹ نکالتی ہے اور کھلا پیکٹ صفدر سلطان کی طرف بڑھاتی ہے۔ "صفدر سگریٹ۔" "آہ...... نہیں...... میڈم شکریہ۔" صفدر ایک لمحے کے لیے ہچکچاتا ہے۔ "اچھا دے دیں پلیز۔" اور سگریٹ لے لیتا ہے۔ اور سیفی سیٹی مارنے کے انداز میں ہونٹ سکیڑتا ہے اور پھر تیزی سے اپنی کاپی پر گھسیٹنے لگتا ہے...... یہ سیٹھ کیسے Behave کر رہا ہے۔ انیلا سے ڈسکس ہوگا...... انسانی ذہن/دماغ ذرا ذرا سے بدلے ہوئے سٹل مناظر کے درمیان تاریکی کے وقفوں۔ خالی جگہوں کو خود پُر کر لیتا ہے۔ اور سکرین پر ہمیں حرکت نظر آتی ہے۔ جو دراصل ہوتی نہیں۔ واہمہ ہوتی ہے۔ کیا خالی جگہیں پُر کرنا حرکت کے واہمے کو پیدا کرتا ہے...... ایک بندہ کسی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ پُراسرار بیماری۔ ایسی کہ اُس کے ذہن کی —— فلم میں خالی جگہیں پُر کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور بیچارے کی سینما بینی کی تفریح غارت ہو جاتی ہے۔ وہ سٹل...... خالی۔ سٹل۔ خالی۔ سٹل۔ خالی...... کا تسلسل دیکھتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن باہر...... سینما سے باہر نکلتا ہے تو اُسے دنیا بھی ایسی ہی دکھائی دینے لگتی ہے...... ہا۔ ہا۔ ہا۔ کیا یہ کہیں لگتا ہے ٹوٹا۔ انیلا سے ڈسکس ہوگا۔" سیفی گھسیٹتا ہے اور سرگوشی میں انیلا سے کہتا ہے۔ "انیلا سے ڈسکس ہوگا۔" پھر سر گھما کر سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے اور آنکھ مارتا ہے اور مسلسل آنکھ جھپکنے لگتا ہے۔ "لگتا ہے پھر آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ اور بہت بُرے وقت پڑا ہے۔ عین فلمیں دیکھنے سے پہلے پڑا ہے۔"

صفدر سلطان سگریٹ سلگاتا ہے اور کھانسنے لگتا ہے۔ سیفی ہنستا ہے۔ ''سیٹھ صاحب نہ پئیں۔ اگر دل نہیں چاہتا تو نہ پئیں...... یہ تو چمنی ہے۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے۔ چیف، لگتا ہے دنیا کہیں سے مختلف ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کیسے؟ پتہ نہیں سیٹھ صاحب آؤٹ آف کریکٹر ہو رہے ہیں یا تم ہو رہے ہو؟'' سعید کمال پر ہلکی سی گھبراہٹ طاری ہوتی ہے۔ ''میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ''آئے سر جی؟'' بالی کی آواز آتی ہے۔ ''آئے بالکل آئے۔'' سیفی کہتا ہے اور ماسٹر یاسین کی طرف دیکھتا ہے جو دیر سے خاموش ہے اور کسی سوچ میں ہے۔ اگلے ہی لمحے تاریکی چھا جاتی ہے۔ ماسٹر یاسین کا چہرہ یک دم غائب ہو جاتا ہے۔ ٹائٹل پھر چلتے ہیں۔ سیفی تیزی سے تاریکی میں تاریک کاغذ پر قلم دوڑاتا ہے۔ ایکٹروں کے نام۔ ڈائریکٹر۔

فرانسیسی زبان میں لکھے فلم کے ٹائٹل پھر سکرین پر ظاہر ہوتے ہیں۔ سیفی گود میں رکھی کاپی پر قلم چلاتا ہے...... یہ ایک مشکل گھسیٹا کاری ہوگی۔ بلکہ ان فلموں کا گھسیٹا پلے ہوگا اور کیا یہ ضروری بھی ہے...... یہ تو بعد میں ہی پتہ چلے گا۔ لیکن کیا ہرج ہے۔ یوں بھی ہر کام کا ایک پہلا موقع ہوتا ہے۔ ''انیلا یہ ان فلموں کا گھسیٹا پلے ہوگا۔'' سیفی کہتا ہے۔

ادارتی نوٹ

حسن کی صورتِ حال اور اُس کے بیان میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے ہم مسلسل مختلف نوعیت کی ادارتی اور اسلوبی کارروائیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حالیہ معاملات کو ہم سکرین پلے کے 'باہر دیکھو' اور سیفی کی گھسیٹا کاری کے 'اندر دیکھو' کے ذریعے نپٹا رہے تھے (اور نپٹاتے رہیں گے) اور یہ اندازِ بیاں اگر بہت کامیاب نہیں تو ایسا ناکام بھی نہیں رہا۔ اور یوں حسن کی صورتِ حال کا دوجہتی اظہار تشکیل پاتا رہا۔ لیکن اب ہم سمجھتے ہیں کہ جان عالم سٹوڈیو کے پروجیکشن روم نمبر 2 میں معاملات بے حد پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اور اندر باہر کے سمعی، بصری اور وقوفی، ہیجانی جھولے پر منظر بینی اور جذباتی آگاہی کی متصادم قوتیں اثر انداز ہو رہی ہیں۔ یعنی 'فلم دیکھو' کا بصری واہمہ اور سر (Sir) یا سرئیلیزم کا تازہ نفسی بحران۔ جو حکمت بہزاد کی ٹیلی فون کال کے بعد سعید کمال پر وارد ہوا ہے۔ اس سنگین بحرانی صورتِ حال کو گرفت میں لانے کے لیے ہمیں مجبوراً دلوں کا حال جاننے کی اپنی خداداد صلاحیت استعمال کرنا پڑے گی۔ اور یوں اندر دیکھو۔ باہر دیکھو۔ فلم دیکھو۔ سر یا سرئیلزم کے مظہراتی نظلوں میں جنم لینے والے واقعات کا ایک بظاہر بے ہنگم انتخاب سامنے آئے گا۔ جو سب کے لیے لایعنی ہوگا سوائے ان کے جو حسن کی صورتِ حال کو جاننے سمجھنے کے جنون میں مبتلا ہیں۔

''تم ساتھ ساتھ ان فلموں کا خلاصہ لکھو گے کیا؟'' انیلا پوچھتی ہے۔ اور اندھیرے میں دائیں طرف ہاتھ بڑھا کر سیفی کی گود میں رکھی کاپی پر چلتے اُس کے قلم کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ ''نہ کرو۔'' سیفی چیختا ہے۔ ''نہ پکڑو...... نہ ڈسٹرب کرو۔ سب پیچھے بیٹھے ہیں۔ ہم کوئی سینما کے باکس میں بیٹھے مکیناز گولڈ نہیں دیکھ رہے۔ یہ سیریس کام ہے۔ چیف اگرچہ کچھ بدلا بدلا لگتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ہماری فلم سٹڈیز کی کلاس ہی ہو رہی ہے۔ ہماری تربیت کے لیے اُدھر دیکھو سکرین پر۔'' ''اندھیرے میں تیز چلتے تو دیکھے ہیں لیکن قلم چلتے نہیں دیکھے۔'' انیلا کہتی ہے۔

il etais une fois...... سیفی سکرین پر دیکھتا ہے اور گھسیٹتا ہے اور پوچھتا ہے۔ ''چیف اس کا مطلب ایک دفعہ کا ذکر ہے نا؟ میں نے کہیں پڑھا تھا۔'' ''تم نے ٹھیک پڑھا تھا۔'' سعید کمال کی بھرائی ہوئی آواز آتی ہے۔ ''لیکن خاموش فلم بھی اگر ہو سکے تو خاموش رہ کر ہی دیکھو۔'' ''بس اب میرا منہ بند رہے گا چیف۔'' سیفی کہتا ہے اور سکرین کی طرف دیکھتا اور کچھ سوچتا ہے۔ گھسیٹتا ہے۔ سکرین پر دیکھے کو گھسیٹنا۔ کیا یہ بے مقصد نہیں ہے جو میں کر رہا ہوں۔ کچھ بھی ہو۔ جو کچھ بھی ہاتھ آ جائے۔ ضروری نوٹس شاید...... موسیقی کی آواز خاموش فلم سے الگ تھلگ سنائی دیتی ہے۔ مناظر شروع ہوتے ہیں...... رات ہے۔ سیفی گھسیٹتا ہے...... کسی بلند عمارت کی تیسری منزل ہے شاید...... بالکونی میں کھڑا ایک شخص منہ میں سگریٹ دبائے مسلسل کش لے رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں اُسترا ہے۔ جسے وہ زور زور سے ایک چمڑے کی پٹی پر تیز کر رہا ہے۔ اُسترے کی دھار کی تیزی اپنے انگوٹھے پر چیک کرتا ہے۔ پورا چاند۔ بالکونی میں بیٹھی بڑی بڑی کھلی آنکھوں والی عورت۔ بادل کی ایک پتلی سی لکیر چاند کے قریب۔ آدمی اُسترا پکڑے عورت کے قریب آتا ہے۔ بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے

عورت کی آنکھ کے پپوٹے کھولتا ہے۔ چاند کے سامنے سے بادل کی بالکل پتلی سی لکیر گزرتی ہے اور آدمی اُسترے سے عورت کی آنکھ چیر دیتا ہے۔

''اوہو'' انیلا کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔ ''یہ تو بہت خوفناک ہے۔'' انیلا کہتی ہے۔ 'آٹھ سال بعد' سکرین پر لکھا ہوا آتا ہے۔ سعید کمال مسکراتا ہے۔ ''یہی اس منظر کا خاصہ ہے۔'' پراگ سکول آف پرفارمنگ آرٹس کا سینما کی تاریخ کا پروفیسر جولیس میلنسکی رول کی ساخت کے پروجیکٹر کو وہیں روک کر کلاس سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''یہ منظر ہر کسی کو دہلا دیتا ہے۔ اور یہی لوئی بیونل اور ڈالی کا بنیادی مقصد...... ایک بنیادی مقصد تھا۔ یہ فلم جو سریلسٹ سینما کی پہلی فلم سمجھی جاتی ہے۔ تو اس کے بنانے والوں کے کہنے کی حد تک۔ اس میں۔ اس کے ذریعے وہ بورژوا سوسائٹی کی جھوٹی اقدار کی دھجیاں بکھیر دینا چاہتے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم کو زبردست پذیرائی کس نے دی......؟'' پروفیسر ملینسکی تھیٹریکل خاموشی کا وقفہ بناتا ہے اور پھر بلند آواز میں کہتا ہے۔ ''بورژوازی نے...... ہا۔ہا۔ہا۔ فلم آٹھ مہینے چلی 1929ء میں پیرس میں'' کلاس قہقہے لگاتی ہے اور پروفیسر یکدم خاموش ہو جاتا ہے۔ ''یہ ایک سنجیدہ بات ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ اور کلاس خاموش ہو جاتی ہے۔

''پرفیسر جولیس زبردست مسخرا ہے۔'' سعید کمال کے ساتھ بیٹھی اس کی کلاس فیلو لیونا کا پلان اُس کے کان میں سرگوشی کرتی ہے اور ماسٹر یاسین ہنس پڑتا ہے۔ ''باس یہ کھوتے ہیں؟'' وہ پوچھتا ہے۔ اگرچہ جانتا ہے کہ باس اس کا بولنا پسند نہیں کرے گا۔ ''ہاں بالکل کھوتے ہیں۔'' سعید کمال کی بجائے سیفی جواب دیتا ہے اور گھسیتا ہے...... شاید وہی مرد ہے۔ جس کی کھلی ہتھیلی کے سوراخ میں سے سیاہ مکوڑے نکل رہے تھے...... بہر حال...... مرد پر ایک عجیب سا جنسی جنون طاری ہوتا ہے۔ اور وہ عورت کے پستان مسلنے لگتا ہے۔ عورت نے اُسے دھکا دیا۔ یہ دور ہٹی...... اسے ہٹا دیا...... مرد...... ہاں مرد اب ایک رسہ سینے کے گرد باندھے کوئی بہت بڑا بوجھ پوری قوت سے آگے کھینچ لانے کی کوشش کر رہا ہے...... کمال ہے۔ رسے سے دو بڑے بڑے پیانو بندھے ہیں۔ ان کے ساتھ بندھے تختوں پر...... کیا۔۔۔ دو پادری۔۔۔ ہاں دو پادری لیٹے ہیں۔ اور پیانو کے اوپر دو گدھوں کی گلی سڑی لاشیں پڑی ہیں۔۔۔ انیلا کا پھر جی چاہتا ہے کہ سیفی کے گھسر گھسر کرتے قلم کو اچک لے اور اس کے سر پر

ایک چپت لگائے۔ پتہ نہیں کیا کر رہا ہے پاگل۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس خواہش کی تکمیل سے باز رکھتی ہے اور سوچتی ہے کہ یہ پیانو سے بندھے ہوئے پادری اور گدھے یہ سب آخر کس بات کی علامت ہے...... کیا مذہب...... ''آہ۔ علامتیت۔ سرئیلزم میں علامتیت ڈھونڈنے کی بے پناہ ترغیب ملتی ہے۔ اب یہ منظر بھی کافی quote ہوتا ہے۔ پادری۔ پیانو۔ گدھے۔ ان میں سے پہلے کون ہے اور بعد میں کون ہے۔ یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ ہا۔ہا۔ہا۔ ہا۔'' کلاس قہقہے لگاتی ہے۔ ''یہ ایک سنجیدہ بات ہے۔'' جولیس کہتا ہے۔ ''دیکھا'' لیونا سعید کمال کے کان میں سرگوشی کرتی ہے۔ ''کلاس کے بعد تم کیا کر رہے ہو کمال؟'' ''ابھی تو پتہ نہیں۔'' ''ایک بات بتاؤ۔ پیچھے تمہارے ملک میں تمہارا کوئی انتظار کر رہا ہے؟'' ''ہاں...... وہ بے چاری لڑکی بڑی قربانی دے رہی ہے۔ میرا انتظار کر رہی ہے۔'' ''اور وہ اصل میں اس باسٹرڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ جہنم میں جائیں۔ بس میرے لیے لکھیں۔'' سہ پہر کے دو بجے۔ حکمت بہزادی کی کال پھر آتی ہے۔ ''نہیں سر میں اس لڑکی کے چکر میں نہیں ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ اب نہیں۔ لیکن وہ اور اس کا دوست میرے لیے لکھ رہے ہیں۔ میں کسی اور رائٹر کے ساتھ چل نہیں سکتا۔ ذاتی مسئلے الگ۔ میں True Professional ہوں سر...... سر میں نے تو خود انہیں سرئیلزم کی راہ پر لگایا ہے۔ اب میں کیسے انہیں کہوں۔ یہ چھوڑ دو اور اب سوشل ریلزم کی لائن لو...... لیکن میں manage کروں گا سر۔ میں manage کروں گا۔ وقت لگے گا۔ بہت tactfully مجھے handle کرنا ہوگا۔ دونوں ہی الٹے دماغ کے ہیں۔ جی سر۔ میں خود رنگ کروں گا سر...... رپورٹ دوں گا سر۔ یس سر شام کے چھ بجے...... ابھی تو میں انہیں دو فلمیں دکھانے جا رہا ہوں۔ سرئیلسٹ فلمز سر...... ایک تو وہی سر......'' ......اور اب یہ فلمیں انہیں دکھانے کے بعد انہیں واپس لانا اور فلم۔ سیدھی سیدھی Bull Shit فلم رئیلسٹ فلم لکھنے پر آمادہ کرنا...... اور بھی مشکل ہوگا۔ مشکل کیا۔ فساد ہوگا۔ چاہیے تھا یہ فلمیں انہیں نہ ہی دکھائی جاتیں۔ جیسے اتنی دیر یہاں آنے میں انہوں نے لگا دی تھی۔ پتہ نہیں کیا Fucking ان میں چل رہا تھا...... کیا۔ کیا؟ ظاہر...... بڑی مصیبت بن گئی ہے...... لیکن فلم انسٹیٹیوٹ کا ڈائریکٹر۔ A Chance of Life او گاڈ۔ بڑا فساد بنے گا یہ تو......''

''صبح کے تین بجے۔'' سکرین پر لکھا ہوا آتا ہے۔ سیفی دیکھتا ہے۔ سیفی گھسیٹا

ہے......"یہ وقت کے حوالے شاید وقت سے مذاق ہیں۔" گھنٹی بجتی ہے۔ اور ایک اور شخص
آتا ہے۔ جو بستر پر لیٹے شخص کو اُٹھاتا ہے اور اُس کا...... یہ...... کیا...... اُس شخص کا
لباس کھینچ کر اُتارتا ہے۔ اور لکیروں والے بکس سمیت اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔

"سولہ سال پہلے......" سکرین پر پھر وقت کا حوالہ لکھا ہوا آتا ہے۔ اور پروجیکٹر
جولیس ملینسکی پروجیکٹر بند کر کے پھر کلاس کی طرف مُڑتا ہے۔ "آٹھ سال بعد۔ تمہارے
اور اب یہ سولہ سال پہلے۔ وقت کے یہ اعلانات...... ناظر کو گمراہ کرنے کے لیے ہیں۔
میں لوئی بیونل وقت کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اور صرف وقت ہی نہیں بلکہ مقام کے ساتھ بھی
Time and space دونوں کے ساتھ۔ چنانچہ سریلسٹ سینما میں جہاں ماضی۔ حال
مستقبل ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ وہاں مقامات بھی تمہارے ایک جگہ سے دوسری
جگہ حرکت کیے بغیر باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ یہ ابھی آگے آپ سین دیکھیں گے کہ ایک آدمی
بیڈ روم میں گولی کھاتا ہے لیکن اس کی لاش پارک میں جا گرتی ہے۔ پھر آگے آئے گا۔ بیڈروم
کے ساتھ ہی ساحل سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن زمان و مکاں کی حدود کا یوں درہم برہم ہو
جانا بظاہر بہت انوکھا ہے۔ لیکن در حقیقت بالکل انوکھا نہیں۔ ہم ہر روز اس کا تجربہ کرتے ہیں
دیکھتے ہیں۔ بولو کہاں۔ کہاں؟؟؟"

"خواب میں پروفیسر۔" سعید کمال کہتا ہے۔ پروفیسر تعریفی نظروں سے اس کی
طرف دیکھتا ہے۔ "گڈ۔ ہمارا جنوبی ایشین ٹی۔وی ڈائریکٹر، پروڈیوسر جانتا ہے۔ یہ
تمہیں مشورہ ہے۔ جب تم فلم بناؤ۔ تو پہلی فلم سریلسٹ بناؤ۔ بولو۔ کیا ارادہ ہے؟" سعید کمال
ایک نظر لیونا کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "بالکل پروفیسر۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں
میری فلم ہماری پہلی سریلسٹ فلم ہو گی۔ اب یہ بزنس کرے گی یا نہیں۔ میں نہیں جانتا۔"
پروفیسر ہنستا ہے۔ کلاس ہنستی ہے۔ "یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں۔ آہ۔ لیکن جلد ہی۔ چند برسوں
میں ہی شاید۔ یا سال میں یقیناً یہاں بھی سرمایہ دارانہ بزنس شروع ہو جائے گا۔ تم اپنی فلم
یہاں لے آنا۔ ہم اُس کے چیک ٹائٹل لگا کر چلائیں گے۔ ملینسکی ہنستا ہے۔ حکمت بھرا لہجہ
ہے......"" میرا سریلزم سے کوئی جھگڑا نہیں کمال۔ I Love it میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم
پہلی فلم Realist بناؤ۔ اگر ممکن ہو۔ لیکن۔ میں تمہیں مجبور بھی نہیں کرنا چاہتا......you

know بہر...... میں نے خود انہیں سریلزم کی راہ پر لگایا ہے......"" It is ok۔ بہرحال وہ تمہیں
بطور ڈائریکٹر لینا چاہتے ہیں سعید کمال...... تمہارا کوئی سوشلسٹ hang over تو ہے
نہیں...... تمہارے باپ سے بھی کل بات ہوئی۔ کمیونزم کا باجا تو سمجھو بج گیا ہے۔ لیکن وہ ابھی
بھی نہیں مانتا۔ کہتا ہے۔ "خواب ابھی چل رہا ہے۔""""

"تو سریلسٹ سینما بلکہ کسی بھی قسم کا سریلزم۔ ادب۔ مصوری۔ سنگ تراشی سب کا
ماڈل خواب ہے۔ آؤ اس بات کو مان لو۔ تو خواب دیکھو...... لیکن سونا گھر جا کر......" پروفیسر قہقہے
لگاتا ہے۔ کلاس بھی قہقہے لگاتی ہے۔ "یہ ایک سنجیدہ بات ہے۔" پروفیسر یکدم کہتا ہے۔ "نہیں
پروفیسر۔ اتنی بھی سنجیدہ نہیں۔" لیونا کاپلان کہتی ہے۔ اس پر کلاس پھر غیر سنجیدہ ہو جاتی ہے۔

"یار یہ کب ختم ہو گی۔ مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔" صفدر سلطان ماسٹر یاسین کے
کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ اور سوچتا ہے۔ ...... یہ ڈائریکٹر اب کس چکر میں ہے۔ اگر فلم کوئی
دوسری بنی ہے۔ بزنس کرنے والی بنی ہے تو یہ۔ واہیاتی...... دیکھنے کا کیا فائدہ...... پر کوئی ہو گا
فائدہ...... ماسٹر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص دیوار کے ساتھ
مصلوب ہونے کے انداز میں کھڑے شخص کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں تھما دیتا ہے۔ اگلے
ہی لمحے کتابیں پستول بن جاتی ہیں۔ ماسٹر سوچتا ہے یہ چھوٹے موٹے ایفیکٹ تو یہ اس زمانے
میں بھی بنا لیتے تھے۔ پھر اُسے خیال آتا ہے کہ سیٹھ صفدر نے اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ وہ
فیصلہ کرتا ہے کہ وہ فلموں کے بعد اس سے پوچھے گا کہ باس اور اُس میں کیا کھچڑی پکنی شروع
ہو گئی ہے اچانک۔

en printemp کے فرانسیسی الفاظ سکرین پر نمودار ہوتے ہیں۔ انیلا سیفی سے
پوچھتی ہے۔ "یہ کیا لکھا تھا؟" پھر نیچے لکھا انگریزی میں دیکھ لیتی ہے۔ in spring۔ "موسم
بہار میں" سعید کمال اُسے بتاتا ہے۔ انیلا دیکھتی ہے اور سیفی گھسیٹتا ہے۔ موسم بہار میں...... ایک
صحرا نما جگہ...... جہاں عورت اور مرد کمر تک ریت میں دبے ہیں۔ وہ شاید بلکہ یقیناً مر چکے
ہیں...... سورج کی تیز روشنی میں ان کے لباس تار تار نظر آتے ہیں۔ ہر طرف کیڑے مکوڑے
اُڑتے پھرتے ہیں۔

Fin۔ فلم ختم ہو جاتی ہے۔ "کیسی خوفناک بہار ہے۔" پروفیسر جولیس ملینسکی کہتا

ہے اور بالی سولہ ایم ایم کا پروجیکٹر بند کر دیتا ہے۔

"اگلی فلم ہماری Hour Glass Sanatorium ہو گی۔" پروفیسر کلاس میں اعلان کرتا ہے۔ "اور یہ ہم اگلی جمعرات کو دیکھیں گے۔ یہ ایک لمبی فلم ہے۔ میں نے پروجیکشن کا اہتمام اپنے سینما ہال میں کیا ہے۔ کلاس تین گھنٹے کی ہو گی۔ اور وہیں ہو گی۔ میں نے ڈائریکٹر کو requisition دے دی ہے۔ کافی کیک کا اہتمام بھی ہوگا۔" چند لڑکے لڑکیاں منہ سے ڈوڈو کی آوازیں نکالتے ہیں اور کلاس اُٹھ جاتی ہے۔

بالی پروجیکشن کی کھڑکی کی راہ سے دیکھتا ہے۔ وہ دونوں سر گھما کر پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ڈائریکٹر کی طرف دیکھ رہے ہیں جس کے ساتھ ایک سیٹ چھوڑ کر ماسٹر اور سیٹھ بیٹھے ہیں۔ سیفی اور انیلا کی شکلیں دیکھتے ہی بالی پھر خوش ہو جاتا ہے۔ سیفی ہاتھ کا انگوٹھا اور انگشتِ شہادت ملا کر چھوٹا سا دائرہ بناتا ہے اور تین انگلیاں اُٹھا کر ہاتھ کو دائیں بائیں حرکت دیتا ہے اور سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے۔ "چیف اب سمجھ آ رہی ہے کہ تم یہ فلم ہمیں کیوں دکھانا چاہتے ہو۔ اگلی میٹنگ میں بات ہو گی۔" "ابھی بڑی فلم تو اگلی ہو گی۔ سینی ٹوریم...... ریت گھڑی۔" انیلا کہتی ہے۔ "ہاں وہ تقریباً دو گھنٹے کی ہو گی۔" سعید کمال بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔ "اوہو...... پھر تو...... ماسٹر...... چائے کا کوئی......" پھر یک دم بلند آواز میں نعرہ لگاتا ہے۔ "بالی۔ یار کوئی۔ اِدھر چائے بسکٹ کا...... کچھ ہو سکتا ہے......" "جی سر جی...... میں ذرا یہ 35 کی مشین کو پاور دے دوں۔ پھر ہزاروں من چائے۔" "نہیں یار۔ یہ بہت زیادہ ہے۔ تم دو تین کلو لے آؤ۔ آدھا آدھا کلو پی لیں گے۔" سیفی کہتا ہے۔ ماسٹر اور انیلا ہنستے ہیں۔ پھر بالی کے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ انیلا غور سے سعید کی طرف دیکھتی ہے۔ "میں نے حقیقتاً بہت enjoy کیا...... لیکن تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو سعید۔" "آ...... آ......" سعید کمال اُچٹتی سی نظر سیٹھ پر ڈالتا ہے۔ "دراصل یہ کافی لمبی فلم ہے۔ مجھے کہیں جانا بھی تھا...... اگر تم دیکھ لو تو...... میں......" "چیف نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا...... نہیں...... ابھی تو مزہ آنے لگا ہے۔" سیفی زور زور سے انکار میں سر ہلاتا ہے۔ "دراصل...... ویسے...... یار...... میں یہ فلم۔ infact یہ فلم پہلے بھی دیکھ چکا ہوں...... ہمارے کورس میں تھی......" "تو پرانی یادیں ہی تازہ کر لو۔" انیلا مسکرا کر کہتی ہے۔ "نہیں سر...... میں اس لڑکی کے ساتھ سونا نہیں چاہتا۔ کم از کم اب نہیں۔

لیکن میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ As a Script Writer۔ میرے ان لوگوں سے بہت جھگڑے چلتے ہیں۔ لیکن ہم اب ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں۔ I mean۔ اب یہ جس پراجیکٹ پر ہم کام کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ اہم ہے۔" "وہ سرکلسف...... لا کمپنی تمہاری۔" "جی سر......" "میں کہتا ہوں تم اپنا وقت لو۔ تم اگر انہی کے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ تو انہیں واپس لاؤ کسی طرح۔ حقیقت کی طرف۔ اور حقیقت سامنے کی ہے کمال۔ اگر تم اس انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر بننا چاہتے ہو تو۔ لیکن میں...... سکرپٹ جو تم لکھوا رہے ہو سرکلسف یا جیسا بھی ہے۔ وہ بھی دیکھنا ضرور چاہوں گا۔" "آف کورس سر۔"

سعید کمال گہرے اطمینان سے سانس لیتا ہے۔ پولش فلم پر انگریزی سب ٹائٹل دیکھ کر۔ وہ ایک تعریفی نظر پروفیسر جولیس ملینسکی پر بھی ڈالنا چاہتا ہے۔ جو سو سیٹوں کے اس چھوٹے سے سینما ہال میں آگے کہیں بیٹھا ہے۔ پھر سب ٹائٹلز کے بارے میں ایک اور بات اسے یاد آتی ہے۔ پروفیسر انہیں بتا چکا ہے کہ ریت گھڑی کا سینی ٹوریم جب ہاس واوچیک نے بنائی تو اپنے تمام تر سرکلزم کے باوجود بلکہ شاید اسی کی وجہ سے پولش کمیونسٹ اتھارٹی نے اس کی نمائش پر پابندی لگا دی اور ہاس کو فلم Cannes فرانس کے فلمی میلے میں بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ لیکن فلم سمگل ہو کر وہاں پہنچ گئی۔ اور اس نے جیوری ایوارڈ حاصل کیا۔ اب ظاہر ہے Cannes میں پیش ہونے کے لیے انگلش یا فرنچ Subs تو لگائے گئے ہوں گے...... "ساتھ ساتھ انگریزی پڑھنی پڑے گی۔" ماسٹر یاسین تکلیف زدہ آواز میں کراہ کر کہتا ہے۔ "نہ ویسے ماسٹر انگریزی تم نے کبھی پڑھی بھی ہے جو اب پڑھو گے۔" پیچھے دور سے بالی کی ہنسی اور آواز آتی ہے۔ "ماسٹر فکر نہ کرو۔ میں ساتھ ساتھ گھسیٹ رہا ہوں۔ بعد میں تمہیں کہانی سمجھا دوں گا۔" "کہانی ویسے ہوتی ہے سر ان فلموں میں؟" اچانک سیٹھ کی آواز پہلی دفعہ اُبھرتی ہے۔ سیفی اور انیلا بے چینی سے اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیفی انیلا کے کان میں سرگوشی کرتا ہے۔ "تمہارا عاشق سیٹھ اتنا احمق بھی نہیں ہے۔" انیلا سر گھماتی ہے۔ اور پھر سیفی کے کان اپنے ہونٹوں کے قریب لانے کے لیے اس کے سر کے اوپر پانچوں انگلیاں گاڈزِلا کی طرح اپنی طرف گھماتی ہے۔ "پکا میواڑ ہے۔ جانتی ہوں۔ لیکن واقعی کچھ بدلا بدلا نہیں لگتا آج۔" "اس کو ایک سگریٹ تو لگاؤ۔ ذرا کھلی آواز

میں۔" "ہوں۔ صفدر اور ...... سگریٹ۔ ٹ۔ٹ......ہاں۔ں۔ں۔ں۔ں۔ال
ناں......لوگے......" انیلا اگلے ہی لمحے پھنسی پھنسی آواز میں کہتی ہے۔ "پلیز۔ پلیز۔
صفدر کی تھرتھراتی آواز آتی ہے۔ "نہیں۔ ابھی نہیں بدلا۔" سیفی سرگوشی کرتا ہے۔ "
کانڈے سیٹھ کو ہی کیوں سگریٹ پلاتی ہے؟" بالی سوچتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ
کے اپنے سگریٹ ختم ہو چکے ہیں۔ تو میڈم سے ہی مانگ لوں۔ کہیں برا ہی نہ مان جائے
...... مانتی ہے تو مانے۔ اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی آواز سنتا ہے۔ "میڈم ایک سگریٹ ذرا ادھر
چاہیے۔ ماسٹر کو دے دیں۔ اور ماسٹر ادھر ہی آ جاؤ۔ تجھے فلم تو کبھی بھی سمجھ نہیں آئی۔
میرے پاس ہی آ جا۔" انیلا ہنسی روک کر ایک سگریٹ پیچھے ماسٹر کی طرف بڑھاتی ہے۔
سگریٹ لیتا ہے۔ اور غصے سے کہتا ہے۔ "میں نے کیمرے کا کام دیکھنا ہوتا ہے۔ شاٹ کیسے
ہوتے ہیں لائٹنگ کا حساب لگانا ہوتا ہے۔ فالتو باتیں نہ کیا کر۔" "اچھا تو ادھر آ کر حساب
لے نا یار......" بالی کہتا ہے۔ ماسٹر بڑبڑاتا ہوا اُٹھتا ہے اور سیٹوں کے پیچھے کہیں پروجیکشن روم
کے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ سعید کمال۔ انیلا اور سیفی کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنتا ہے۔
سکرین پر برف پوش زمین اور سرمئی آسمان کے پس منظر میں اڑتا سیاہ پرندہ دیکھتا ہے۔
ریت گھڑی کا سینی ٹوریم شروع ہو چکی ہے۔

بالی سگریٹ سلگاتا ہے پھر ماسٹر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر اس کی نظروں کی
سمت میں پروجیکشن کی کھڑکی کی راہ سے سکرین کو دیکھتا ہے۔ اور اس کے منہ سے۔ "ہیں"
آواز نکلتی ہے۔ "یہ تو ٹرین کا ڈبہ ہے۔ لگتا ہی نہیں تھا ٹرین کا ڈبہ ہوگا۔" وہ کہتا ہے اور
گھسیٹتا ہے...... سیاہ پرندہ درخت کی شاخیں باہر کا منظر شیشے کی کھڑکیوں کی راہ سے نظر آتا
ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب ٹرین کا ڈبہ ہے۔ تباہ حال مسافر۔ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ
رہے ہیں یا مر چکے ہیں۔ ایک نیم برہنہ عورت۔ ایک اندھا...... (اوہو...... کمال ہے ایک
بالکل اندھا ٹکٹ چیکر آتا ہے اور ٹٹولتا ہوا ڈبے میں پھرتا ہے۔ ایک جوان عمر مسافر کو بتاتا ہے
کہ اس کی منزل آ گئی ہے۔ مسافر ٹرین سے باہر اور برف سے ڈھکے کسی قبرستان میں سے
گزرتا سامنے ایک پر ہیبت عمارت کی طرف بڑھتا ہے۔ غالباً یہی ریت گھڑی کا سینی ٹوریم
ہے۔ سامنے ایک بلند و بالا بند دروازہ ہے۔ مسافر جس کا نام جوزف ہے دروازہ کھولنے

سامنے ایک دیوار ہے جو دروازے کو مکمل طور پر مسدود کر رہی ہے۔ جوزف پلٹتا ہے اور
دروازے کی بجائے کچھ دُور ایک کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہوتا ہے۔ سینی ٹوریم میں ہر
طرف ویرانی اور بربادی کا منظر ہے۔ جوزف ویران کاری ڈورز میں سے گھوم جاتا ہے۔ جگہ
جگہ مختلف دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ ایک نرس آتی ہے۔ جو اپنے لباس کے بٹن بند کر رہی
ہے۔ اس کا کھلا سینہ نظر آتا ہے۔ تاثر ملتا ہے کہ شاید وہ کسی جنسی سرگرمی میں مصروف تھی۔
جوزف اس سے اپنے کمرے کے بارے میں پوچھتا ہے۔ جو اُس نے بک کروایا تھا۔ "یہاں
تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔" جوزف حیرانی سے کہتا ہے۔ نرس کہتی ہے۔ "یہاں مریض مسلسل سوتے
رہتے ہیں۔" پھر وہ اُسے ریسٹورنٹ میں بیٹھنے کو کہتی ہے۔ اور ڈاکٹر کو بلانے جاتی ہے۔
ریسٹورنٹ مکڑی کے جالوں سے بھرا ہوا ہے اور کاؤنٹر کے نیچے رکھی خوراک کیک پیسٹریاں
وغیرہ گل سڑ رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ کی ایک مکمل دیوار بالکل غائب ہے۔ اور اُس کے ساتھ ہی
آگے قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر آتا ہے۔ جوزف ڈاکٹر سے اپنے باپ جیکب کے
بارے میں پوچھتا ہے۔ جسے اس سینی ٹوریم میں داخل کروایا گیا تھا۔ اور جسے ملنے وہ یہاں آیا
ہے۔ جوزف پوچھتا ہے۔ "کیا میرا باپ زندہ ہے؟"

ڈاکٹر ایک عجیب سی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ جوزف کو بتاتا ہے کہ اُس کا باپ
اگرچہ اپنے ملک میں مر چکا ہے لیکن یہاں سینی ٹوریم میں ابھی زندہ ہے۔ کیونکہ یہاں وقت۔
کلاک کو ایک خاص وقفے کے لیے پیچھے کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اُسے اُس کے باپ کے کمرے
میں لے جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر وقت کی اضافیت پر بحث کرتے ہوئے اُسے بتاتا ہے کہ جوزف
کے باپ جیکب کی صحت یابی کا امکان بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر جاتا ہے۔ جوزف کو باہر کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ وہ ایک ٹوٹے
ہوئے روشندان کی راہ سے نیچے برف میں دبے قبرستان کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ تو وہاں ایک
کم عمر لڑکے کو دیکھتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں کوئی کتاب جیسی چیز ہے پھر وہ لڑکا بھی اوپر سینی
ٹوریم کی ٹوٹی کھڑکی میں سے باہر دیکھتے جوزف کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر اچانک جوزف خود
اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ وہ خود اُسی قبرستان میں داخل ہو رہا ہے۔ اور وہی دروازہ پھر کھول رہا
ہے۔ اب دروازہ کھل جاتا ہے۔ سامنے کوئی دیوار نہیں کھڑی۔ جوزف لڑکے روڈلف کے

ساتھ اُس دروازے میں داخل ہو جاتا ہے۔

''ہا۔'' سعید کمال لیونا کپلان کی بات پوری طرح سنے بغیر ہی منہ سے عجیب
آواز نکالتا ہے۔ ''ذرا پھر کہنا جو بات ابھی تم نے کی لیونا۔'' لیونا مشکوک نظروں سے اُس کی
طرف دیکھتی ہے۔ پولش۔ سرئیلسٹ فلم دیکھنے اور پروفیسر ملینسکی کی کلاس کے بعد
کیفے میں لنچ کا انتظار کرتے اور پروفیسر سے ملی اپنی اپنی assignments پر بات کر رہے
ہیں۔ ''میں سمجھی تھی تم میرے fantastic point کی تعریف کر رہے ہو۔'' ''بالکل
میں دوبارہ پوچھ رہا ہوں۔ تمہاری تعریف کے لیے۔'' لیونا ہنستی ہے۔ ''تعریف
خوبصورت حد تک ہولناک میٹھا زہر ہے۔'' وہ اپنی ٹیڑھی میڑھی انگریزی میں کہتی ہے۔
سعید کمال ہنس کر کہتا ہے۔ ''تمہاری انگریزی عمدہ ہے لیونا۔'' ''واقعی؟'' لیونا کی آنکھیں
ہیں۔ ''واقعی؟'' ''تھینک یو۔ اچھا۔ خیر تو میں کہہ رہی تھی کہ یہ جو سینی ٹوریم کے دروازے
sequence ہے تو یہ ہی اصل میں فلم کی key ہے۔ ایک جوزف وہ ہے جو اس حیرت
سینی ٹوریم میں داخل اپنے بیمار باپ سے ملنے آتا ہے۔ باپ جو اپنے وطن میں مر چکا ہے
لیکن سینی ٹوریم میں چونکہ وقت کو ایک خاص وقفے کے لیے پیچھے کر دیا گیا ہے۔ اس لیے
یہاں وہ زندہ ہے۔''

''ہا...... ہا...... یہ مزیدار ہے۔ زمان و مکان سے طرح طرح کے کھیل
سرئیلسٹ سینما کا خاصہ ہے۔ بلکہ یہ بہت ضروری ہے۔ تم نے دیکھا سیٹ کس طرح ایک
دوسرے میں مدغم ہوئے جاتے ہیں۔ سینی ٹوریم کا ریسٹورنٹ اندر سے سیدھا قبرستان
ملتا ہے۔ ایڈلا کے بیڈروم میں اُس کے پلنگ کے نیچے فارمن چھپا ہے جو رسی بجری کو
رہا ہے۔ اور یہیں سے راستہ گاؤں کے چوک تک جاتا ہے۔ بیانکا کے بیڈروم کے اندر
جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ خواب ہے۔ خوابوں کا ماڈل ہے۔ خواب میں تمہیں جگہوں پر
جانا نہیں پڑتا۔ جگہیں تمہارے پاس آ جاتی ہیں۔'' سعید کمال کہتا ہے۔

''تم اپنے assignement پر کام کر رہے ہو۔ پروفیسر کی بات دہرا رہے
میری بات سنو ابھی۔'' لیونا شکایتی انداز میں کہتی ہے۔

''ساری۔'' سعید کمال کہتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ویٹر اب ان کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔

''ہاں۔ میں کہہ رہی تھی...... پہلا جوزف جو سینی ٹوریم میں کھڑکی کے راستے سے
داخل ہوتا ہے دوسرے جوزف کو دیکھتا ہے۔ جو دروازے کے راستے سینی ٹوریم میں داخل ہوتا
ہے۔ جو دراصل اُس کا بچپن ہے اور روڈلف اس کا بچپن کا دوست اُس کے لیے دروازہ کھولتا
ہے۔ اب اصل میں آگے کا سب سینار یو...... اِسی وقفے کے دوران ہے۔ جب جوزف باپ
کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور پھر بچپن کے واقعات اُس کے خدشات۔ خوف۔ اور حیرت
انگیز امیجز کی شکل میں گزرتے ہیں۔

''سرئیلسٹ امیجز کے لیے حیرت انگیز سے بھی زیادہ حیرت انگیز کوئی لفظ لاؤ۔
انگریزی آزماؤ......'' سعید کمال مذاق سے کہتا ہے۔

لیکن لیونا کاپلان بہت سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ اور اپنے انگریزی ذخیرہ الفاظ میں
دوڑنا بھاگنا شروع کر دیتی ہے۔ fantastic (شاندار) incredible, unbelieveable
(ناقابل یقین) Magical (جادوئی) Amazing (انوکھا) حیرتناک ہاں یہ بھی ہے۔
Astonishing (حیرت انگیز) Awesome, Marvelous, Stunning,
Astounding۔''

''آ۔ بہت عمدہ لیونا......'' سعید کمال اب حقیقی تعریفی نظروں سے لیونا کی طرف
دیکھتا ہے۔ اور پوچھتا ہے۔ ''یہ سب امیجز...... یہ سب واقعات کیسے ہوں گے؟'' لیونا سوچتی
ہے۔ ویٹر چیک زبان میں اس سے لنچ کے آرڈر کا پوچھتا ہے۔ اور سیفی فلم دیکھتا ہے۔ انگریزی
کے سب ٹائٹلز پڑھتا ہے اور گھسیٹتا ہے۔ روڈلف جوزف کو ٹکٹوں کی البم دکھاتا ہے۔ انوکھے
ملکوں کی ٹکٹیں دیکھ کر جوزف کہتا ہے۔ ''مجھے لگتا ہے۔ میں پہلے ہی ان سرزمینوں میں جا چکا
ہوں۔'' اچانک ایک طرف سے پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تباہ حال فوجیوں کا ایک دستہ ان
کے پاس سے گزرتا ہے۔ وہ اندھے ٹکٹ کلکٹر کو ایک کرسی جیسے تخت پر بٹھائے اٹھا کر کہیں لے
جا رہے ہیں۔ جوزف ٹکٹ کولیکٹر سے بیانکا سے متعلق کسی واقعے کی حقیقت دریافت کرتا ہے۔
اندھا ٹکٹ کولیکٹر اس کے سوال کا جواب بیک وقت ہاں اور نہ میں دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

''بعض واقعات اتنے عظیم الشان ہوتے ہیں کہ 'واقعہ' میں سما نہیں سکتے اور بس واقع
ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔''

"واہ۔ واہ۔..... واہ..... چیف یہ کمال ہے۔" سیفی بے اختیار ہو کر کہتا ہے۔

"..... بعض واقعات بس واقع ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔"

سعید کمال ہوں کی آواز نکالتا ہے اور پروفیسر جولیس ملینسکی کی آواز سنتا ہے۔

"..... واقعات کے رونما ہونے کے حوالے سے یہ لائینیں سرئیلسٹ واقعات کی ontology کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

"جیسے خواب میں واقعات واقع ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔" انیلا کہتی ہے۔

"ہاں جیسے خواب میں۔" سعید کمال لیونا سے کہتا ہے۔ مشروم سُوپ سے بھرا ہوا چمچہ منہ میں ڈالتا ہے اور سوچتا ہے۔ "وہ لیونا کے ساتھ سو سکتا ہے لیکن انیلا کے ساتھ نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے تمہیں یہ فلم کافی پسند آ رہی ہے۔" سعید کمال انیلا اور سیفی دونوں سے پوچھتا ہے۔

"بہت۔ بہت زبردست۔" دونوں بیک وقت کہتے ہیں۔ اور بالی کی آواز آتی ہے۔ "سر جی۔ اگلی ریل لگے گی پانچ دس منٹ کا وقفہ ہو گا۔" اور ماسٹر دیکھ رہا ہے۔ نکا دلدل جیسی جگہ۔ لمبی گھاس۔ درختوں کے جھنڈ۔ شاخوں میں لگی کھوپڑیاں، ہڈیاں جیسے درختوں میں اُگی ہوں۔ ایک بندر مالٹا ساتھ رکھے بیٹھا ہے۔ "کیسا شاٹ ہے۔" ماسٹر کہتا ہے۔ بالی ہنستا ہے۔

"ماسٹر وہ کیسا شاٹ تھا؟ جب ہیرو..... چھپ کر ہیروئن..... نہیں پر ہیروئن تو اس فلم میں کوئی ہے ہی نہیں..... اُس گوری کو کپڑے اتارتا..... دیکھتا ہے..... چھاتیاں دیکھتا ہے اُس کی..... اور پیچھا..... ماسٹر تجھے ایسا شاٹ بنانا پڑا تو تیرا تو کیمرہ ڈول جائے....."

"کیوں..... میرا کیمرہ کوئی تیرے..... جیسا ہے۔ جو ڈول جائے گا۔ کیمرہ میں اپنا کام دیکھتا ہے بالی۔ اور کسی کام کو نہیں۔"

بالی ہنستا ہے۔ "اچھا مطلب سامنے کام ہو رہا ہو پھر بھی۔"

ماسٹر یا سین کوئی جواب نہیں دیتا۔ پھر دونوں ریلیں اپنی اپنی جگہ گھومنے لگتی ہیں۔ سکرین پر روشنی کے چھپاکے۔ بالی پروجیکٹر بند کرتا ہے۔ اور بتیاں روشن کر دیتا ہے۔ انیلا ہنس رہی ہے۔ سیفی تیزی سے گھسیٹ رہا ہے۔ پیچھے بیٹھا سعید کمال اُچھل کر چونکتا ہے اور ساتھ والی سیٹ پر سوئے ہوئے صفدر سلطان کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر انیلا اور سیفی پر ایک بے چین نظر ڈالتا ہے۔

"تم انیا والے سین پر ہنس رہی ہو؟" وہ اُس سے پوچھتا ہے۔

"نہیں۔ میں بیانکا کی باتوں پر ہنس رہی ہوں۔ کہتی ہے۔ 'یہ کیسا ونڈرفل احساس ہو گا۔ کہ بدمعاشی۔ غداری۔ بدی کی گہرائی میں اُتر جانا اور انتہائی قابلِ نفرت بن کر اپنی ذات کا احساس ختم کر دینا۔ جوزف تم بھی ایسا ہی کرو..... اس طرح تم ایک بالکل نئے انسان بن جاؤ گے۔' ہا..... ہا..... ہا..... یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ سعید کمال میرا خیال ہے۔ یہ بہت اہم لائینیں ہیں۔"

سعید کمال مسکراتا ہے۔ "ہاں۔ لیکن جوزف اُس کی بات نہیں مانتا۔ اور بیانکا اُس کی وفاداری اور مشنری انداز کا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ اور اُسے بزدل بزدل کہتی ہے۔ جوزف اُس کے بستر کے نیچے گھس کر اپنے باپ کے کمرے میں جا پہنچتا ہے۔"

سیفی گھسیٹنا بند کرتا ہے اور کہتا ہے۔ "اِس لیے کہ اندھا ٹکٹ کلکٹر۔ ٹکٹ چیک کرنے بیانکا کے آدھا جنگل آدھا بیڈ روم میں آ جاتا ہے۔ جوزف اُس سے پوچھتا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ٹکٹ کلکٹر اُسے پرسکون رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اکثر واقعات تو وقت کی ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ہر بیانیے اور کہانی کے لیے ایسے واقعات ضروری ہیں۔ اور پھر جوزف اُس سے ایسے واقعات کے بارے میں پوچھتا ہے۔ جو وقت میں کوئی جگہ نہیں رکھتے۔ اندھا ٹکٹ کولیکٹر کہتا ہے کہ ایسے واقعات دراصل وقت کے بنیادی دھارے کے ساتھ وقت کی کچھ ذیلی شاخوں جیسے ہیں۔ جو اگرچہ کچھ مشکوک اور غیر قانونی ہیں۔ لیکن ایسے واقعات سے نپٹتے ہوئے جو ریکارڈ نہیں ہو سکتے تم اتنے fussy نہیں ہو سکتے۔

بعد میں جوزف بیانکا کے بستر کے نیچے سے ہوتا ہوا باپ کے کمرے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور رستے میں مکڑی کے جالوں میں پڑی ہوئی دو آنکھیں اُٹھاتا ہے۔ اندھا ہونے کی تھیم یہاں پھر شروع ہو جاتی ہے۔ جوزف کا باپ اُسے بتاتا ہے۔ کہ جوزف کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ دو پرندوں کی زبان میں گرائمر کے غلط استعمال کا تجزیہ کرے۔ اور یوں صحت مند وقت کا

ایک ذرہ اپنے لیے بنا لے۔"

انیلا اور سیفی دونوں قہقہے لگاتے ہیں۔ سعید کمال دونوں کو ایسی اپنائیت سے دیکھتا ہے۔ جیسی اس نے پہلے ان کے بارے میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اور وہ ... پراگ سکول آف پرفارمنگ آرٹ لے جانے میں اب کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

"چیف۔ یہ کمال ہے۔ اگلی میٹنگ میں ڈسکس ہوگا۔ یہ viewing بہت ضروری تھی مانتا ہوں۔ ہم دیکھیں گے کہ ہم اپنی سرئیلسٹ فلم کے لیے اس سے کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔" سیفی پوچھتا ہے۔ اور پروفیسر جولیس جواب دیتا ہے۔

"سرئیلسٹ فلم بنانے والوں کے لیے سبق یہ ہے کہ کوئی سبق نہیں۔ تمہیں کھلی چھوٹ ہے کہ حقیقت سے پیچھے رہ جاؤ...... یا آگے نکل جاؤ...... لیکن ہاں...... اصل حقیقت صرف میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔" کلاس ہنستی ہے۔

"یہ ایک سنجیدہ بات ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بہر حال تم ناظر کو اپنے اسی حقیقت کے ملبے میں سے حقیقت یعنی معانی۔ ڈھونڈنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ یہ انسانی مجبوری ہے ... بتانا کہ کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ سو تمہارا ناظر ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ لیکن تم بھی چاہو تو اس کو اپنے ساتھ چلا سکتے ہو۔ تو...... نمبر 1۔ شاک۔ شاک کرو۔ بصری۔ سمعی۔ عقلی سب سطحوں پر جیسے لوئی بوئیل نے کیا۔ نمبر 2۔ لیکن ساتھ ساتھ کوئی ایک ایسا بنیادی نقطہ واضح کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں خواہ جس کے گرد سب واقعات...... کیسے بھی ناقابل یقین، حیرت انگیز ... خلاف عقل ہوں گھومتے ہیں۔...... جیسے سگ اندلس میں یہ ایک مرد اور عورت ہیں۔ اور ... گھڑی کے سینی ٹوریم میں...... جوزف کا کردار بذات خود ساری فلم کو باندھ دیتا ہے۔ ...

3۔ Space time کو جتنا بھی آگے پیچھے۔ تہس نہس کرو۔ ایک sense of shock ... کرو۔ سرئیلسٹ فلم ایسا نہیں کرے گی تو کون کرے گا۔ لیکن یہاں بھی اگر تم کوئی منطقی یا ... بنیادی تقسیم لانا چاہتے ہو تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔"

"ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔" انیلا کہتی ہے۔ "اگلی میٹنگ میں ڈسکس ہوگا۔"

"سینی ٹوریم ایک جگہ ہے اور کباڑ خانہ بھی ایک جگہ ہے۔" سیفی کہتا ہے۔

"اور دونوں زوال۔ مرض۔ انحطاط کی علامتیں ہیں۔" انیلا کہتی ہے۔

"اور ہاں سیدھے سیدھے symbloism سے اجتناب کرو۔ پروفیسر جولیس / سعید کمال کہتا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اگر علامتیں...... واضح نہیں ہوں گی تو بات پھر وہیں آجائے گی کہ کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔" انیلا کہتی ہے۔

"شاید ایک motiff میں صرف ایک ہی معانی کی علامتیں بنانا بھونڈا پن ہے۔ اس میں کچھ لطافت اور گہرائی نہیں...... ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سعید......" سیفی کہتا ہے۔

سعید کمال اس کی طرف دیکھتا مسکراتا ہے۔ "ٹھیک کہہ رہے ہو......"

"آئے سر جی۔" اچانک بالی کی آواز آتی ہے۔

"بالکل آئے۔" سیفی پیچھے جھک کر سوئے ہوئے صفدر سلطان کے کان کے قریب نعرہ لگاتا ہے۔"

"کون ہے؟ کیا ہوا ہے؟" صفدر سلطان ہڑبڑا کر جاگتا ہے۔

بالی پروجیکٹر کی سپول اسمبلی کا بٹن آن کرنے سے ذرا پہلے آگے بیٹھے لوگوں کی آوازیں سنتا ہے اور ہنس پڑتا ہے۔ "لگتا ہے۔ سیٹھ کا تراہ نکل گیا ہے۔ جاگ گیا ہے۔ اس گانڈو سیٹھ کو کیوں ساتھ کھجل کرا رہے ہو۔ اس کو بجلی کا علاج کراؤ۔ پھر جو پیسہ فلم پر لگاتا ہے۔ پکڑو۔ چھٹی کراؤ...... بکرے کی......"

"اتنا بکرا بھی نہیں ہے......" "سوچ سمجھ کر پیسہ لگائے گا۔ آج مجھے لگتا ہے 'یہ فلم نہیں بن سکتی۔' نہیں بن سکتی کوئی اور فلم بنے گی۔" ماسٹر منہ ٹیڑھا میڑھا کر کے سر ہلاتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچ جانے کے انداز میں کہتا ہے۔

"نام کیا ہوگا تمہاری فلم کا۔" بالی پوچھتا ہے؟

"یہ فلم نہیں بن سکتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... نہیں بن سکتی ہوگی۔ میں نے نام پوچھا ہے۔" بالی کہتا ہے۔ اور پروجیکٹر کا بٹن دباتا ہے۔

"یہی نام ہے فلم کا۔" "یہ فلم نہیں بن سکتی۔" ماسٹر ہنس کر کہتا ہے۔

بالی کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے۔ اور پھر بے تحاشہ قہقہے لگانے لگتا ہے۔ "پاگل

خانہ...... یہ نام ہے؟...... یہ فلم نہیں بن سکتی...... یہ فلم ہے۔ نام ہے......؟ ستیاناس۔"

سیفی۔ اینلا اور سعید کمال پروجیکشن کیبن سے بالی کے قہقہوں کی آوازیں سن کر تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"بالی...... کیا ہوا بالی۔ کٹا ہوا سر دیکھ کر ہنس رہے ہو۔" سیفی آواز بلند کرتا ہے اور بالی کے قہقہوں کو وہیں بریک لگ جاتی ہے۔

"کچھ نہیں سر جی۔" بالی کی آواز پولش زبان میں جوزف کی آواز۔ میں دب جاتی ہے۔ اور پروفیسر جولیس ملینسکی اپنے لیکچر میں جذباتی ہو جاتا ہے۔"...... انسان کا کٹا ہوا سر۔ ایک یونیورسل shocker ہے۔ ایک قدیمی آفاقی صدمہ۔ خوف کا حتمی پیامبر...... اور ایڈلا جب بالٹی میں ہاتھ ڈالتی ہے تو ہم نہیں جانتے وہ کیا نکالنے والی ہے۔ لیکن اُس لمحے اُس کی شکل بھی خوفناک ہو جاتی ہے اور پھر اُس کے ہاتھ میں بالوں سے لٹکا ہوا عورت کا کٹا ہوا سر برآمد ہوتا ہے۔ اور ہمیں دہلا دیتا ہے۔ اور وہ جوزف سے بھی یہی کہتی ہے۔" یہ لے جاؤ۔ اور اُنہیں ڈرا دو۔" اُنہیں سے اُس کی مراد وہ گاہک ہیں جو جیکب کی کپڑے کی دوکان میں ہنگامہ کر رہے ہیں۔ جوزف holferene کی بات کرتا ہے۔ یہ کیا ہے اس پر ہم پھر بات کریں گے۔" کلاس ہنستی ہے۔ "یہ ایک سنجیدہ بات ہے۔ جوزف ٹرے میں عورت کا کٹا ہوا سر اور شراب کا جام سجا کر جیکب کی دوکان میں گاہکوں کی افراتفری میں آ جاتا ہے۔ فوراً ہی ایک گاہک جوزف سے کہتا ہے۔ کہ وہ اس عورت کو خریدنا چاہتا ہے۔ وہ سر نہیں بلکہ اس عورت کا pronoun استعمال کرتا ہے۔ اُس شخص کی بات ہمیں پھر دہلا دیتی ہے۔ جوزف جب کہتا ہے کہ سر برائے فروخت نہیں ہے۔ تو وہ گاہک جواب دیتا ہے کہ چونکہ یہ دوکان میں موجود ہے۔ اس لیے برائے فروخت ہے۔"

"یعنی دکان میں موجود ہر چیز برائے فروخت ہوتی ہے۔" لیونا ہنس کر کہتی ہے۔ اور اپنے بیف سٹیک پر تیز چھری چلا کر گوشت کا ٹکڑا کاٹتی ہے۔ کانٹے میں اڑس کر اُسے منہ تک لے جاتی ہے۔ اور سعید کمال کی طرف دیکھتی ہے۔ جو پلیٹ میں رکھے چکن رولز اور اسپارگس کی کونپلوں کو پرتشویش نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

"کیا ہوا۔ کیا سوچ رہے ہو؟" لیونا پوچھتی ہے۔

"وہی...... اسائنمنٹ۔ جولیس کہتا ہے۔ اس فلم میں جو کچھ ہوا۔ فرض کرو وہ تم نے خواب میں دیکھا ہے۔ بس اُسے لکھ کر لاؤ......" سعید کہتا ہے اور رول کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

"ظاہر ہے ساری فلم میں جو سب کچھ ہوا وہ تو تم نہیں لکھ سکتے۔"

"نہیں۔ جولیس اتنا بھی مسخرا نہیں۔ وہ تین گھنٹوں کا سکرین پلے نہیں چاہتا۔ لکھنا صرف وہی ہے۔ جو کچھ تمہارے فرضی خواب میں آ سکتا ہے۔ یہی جولیس نے کہا تھا۔"

"پھر تو کچھ مشکل نہیں۔ بہت مختصر کر دو۔"

"ہاں...... بہت سلیکشن ہوگی۔ سارے stuff سے۔ لیکن یہی تو پروفیسر دیکھنا چاہتا ہے۔ کہ میں سارے منظر نامے سے کیا سلیکٹ کرتا ہوں۔"

"یعنی خواب دیکھتا ہوں...... خواب میں سب چلتا ہے ڈیئر۔" لیونا کہتی ہے۔

"یہی تو حقیقت ہے۔ خواب میں سب نہیں چلتا......" سعید کمال کہتا ہے۔

"گویا حقیقت ہر جگہ پیچھا کرتی ہے۔ رول کیسا ہے؟" لیونا اسپارگس رول کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔

"رول اچھا ہے۔ ہاں...... کچھ ایسا ہی ہے۔"

"لیونا سعید کی پلیٹ کی طرف کانٹا بڑھا کر تھوڑا سا اسپارگس اٹھاتی ہے۔ منہ میں ڈال کر سب کچھ سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتی ہے اور کہتی ہے۔"...... اچھا ہے...... تو مطلب یہ بھی ہے کہ یہ سرئیلزم...... یہ جو سارا فینٹسی ڈرامہ ہے اس میں بھی حقیقت کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے؟"

"آہ...... میرا خیال ہے کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تم...... اپنی پہلی فلم...... سرئیلسٹ بناؤ گے یا......؟"

سعید جیسے چند لمحوں کے لیے کھانا بھول جاتا ہے۔ کسی خیال سے بے چین سا ہو جاتا ہے اور ایک مبہم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے اور لیونا سے رازدارانہ لہجہ میں بات کرتا ہے۔ "یو نو...... کا پلان...... ہمیں سرئیلزم بہت سوٹ کرتا ہے۔ مجھے صرف ایک پیسہ لگانے والا چاہیے...... مل جائے گا۔ پیچھے میرے لوگ میرے لیے کام کر رہے ہیں۔ گروپ بن رہا ہے۔"

"فلم گروپ......؟ گڈ۔ لیکن تمہیں کیسے سوٹ کرتا ہے سریلزم......؟"

سعید کمال ہنستا ہے۔ "جیسے تمہیں کرتا ہے۔ سارے ایسٹرن بلاک کو کرتا ہے۔ جب تمہیں علم ہو کہ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو۔ دکھانا چاہتے ہو...... وہ صاف کہو گے۔ دکھاؤ گے تو مارے جاؤ گے۔ تو......"

"تو تم سریلسٹ ہو جاتے ہو۔" لیونا قہقہہ لگاتی ہے۔

"ہاں...... ہاس نے بھی تو یہی کیا...... ریت گھڑی میں......"

"لیکن بات پھر بھی چھپی نہیں رہتی...... آخر کمیونسٹ حکام نے اُسے فلم Cannes کے میلے میں بھیجنے کی اجازت کیوں نہ دی؟"

"اور جب اس نے سمگل کروا کے فلم وہاں پہنچا ہی دی۔ اُسے جیوری ایوارڈ بھی مل گیا تو پھر اگلے دس سال پولینڈ میں اُسے فلم نہیں بنانے دی گئی سزا کے طور پر۔"

"سزا...... کے...... طور پر...... اوہو۔ سزا۔ سزا۔ سزا۔" لیونا زیرلب کہتی ہے۔ سٹیک پر دانت چلانے کی اُس کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے اور وہ کہیں کھو سی جاتی ہے۔

"کیا ہوا؟" سعید پوچھتا ہے۔

لیونا چونکتی ہے اور ایک بوجھل سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ "میں سزا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جرم اور سزا۔ بہت پرانا سبجیکٹ ہے لیکن پھر بھی میں اس پر فلم بناؤں گی کمال...... ہاس واؤچیک پر سزا کے طور پر دس سال کے لیے فلم بنانے پر پابندی لگا دی گئی...... آہ...... لیکن یہ...... موت کی چہل قدمی سے زیادہ بڑی سزا تو نہیں ہے۔"

"موت کی چہل قدمی؟" سعید حیرت سے اس کے الفاظ دہراتا ہے۔

"ہاں...... تم کیا جانو۔ موت کی چہل قدمی......" لیونا خاموشی سے سر جھکا کر اپنے سٹیک کی باقیات نگلنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور سعید کمال جان جاتا ہے کہ وہ کوئی خوفناک بات ہے جو وہ اُسے سنائے گی لیکن کب...... وہ اُس پر چھوڑ دیتا ہے۔

اور پھر کھانے کے دوران وہ خاموش ہی رہتے ہیں۔ جیسے موت کی چہل قدمی پر کسی بات سے پہلے خاموشی ضروری رہی ہو۔ کھانے کے بعد کافی کے چند گھونٹ لینے کے بعد لیونا کہتی ہے۔

"میرے نانا روسی تھے۔ سٹالن کے دور میں...... تم جانتے ہو سٹالن کا دور کیا تھا......" لیونا کے الفاظ کوئی سوال نہیں ہیں لیکن سعید کمال کے چہرے پر اذیت کے تاثرات ابھرتے ہیں۔ اور وہ سر ہلاتا ہے۔ اور لیونا بات کرتی ہے۔

"نانا پرنٹنگ پریس میں کام کرتے تھے...... وہاں کچھ لوگ...... نانا کے ساتھ مل کر خفیہ پمفلٹ چھاپتے تھے۔ کمیونسٹ Regime کے خلاف...... پکڑے گئے...... کیسے...... وہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیکن سب لوگ نہیں۔ دس میں سے صرف تین جن میں نانا بھی شامل تھے۔ باقی سات فرار ہو گئے۔ پھر ان تینوں پر خوفناک ٹارچر شروع ہوا۔ ماما کہتی ہیں وہ اس تشدد کی تفصیل کم ہی بتاتے تھے۔ یا روا روی میں بتا دیتے تھے جیسے وہ کوئی اتنی اہم بات نہ رہی ہو۔ اور واقعی موت کی چہل قدمی کے مقابلے میں کوئی بھی تشدد کیا ہو گا۔ پھر بھی ان کے دوسرے دونوں ساتھی...... اس چہل قدمی سے پہلے ہی دم توڑ گئے۔ لیکن کسی نے بھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں زبان نہ کھولی...... نانا ابھی تک زندہ تھے...... میں حیران ہوتی ہوں۔ ایک اتنا نرم دل آدمی اندر سے اتنا مضبوط کیسے ہو سکتا ہے۔ تو نانا پر پھر آخر میں موت کی چہل قدمی کا طریقہ آزمایا گیا۔ Stroll of death وہ اسے یہی نام دیتے تھے۔ جیل میں...... سٹالن کا آخری زمانہ تھا۔"

"او۔ آئی۔ سی۔" سعید اپنی تاریخی معلومات کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

لیونا گہری سانس لیتی ہے۔ خالی کپ ساسر میں رکھتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "بظاہر اس میں کسی جسمانی اذیت کا پہلو سرے سے نہیں تھا۔ نانا کہتے ہیں دو ہفتے تک انہوں نے ان پر کوئی تشدد نہ کیا بلکہ جیل کے ہسپتال میں اُن کی خوب مرہم پٹی کی۔ اچھی خوراک دی...... لیکن نانا کہتے ہیں کہ اس انوکھے سلوک پر ہی انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ ضرور ان کے ساتھ کچھ ایسا ہونے والا ہے جو آج تک انہوں نے سنا نہیں ہو گا......

ادارتی نوٹ

ہم سمجھتے ہیں کہ موت کی چہل قدمی کا بیان لیونا کا پلان کی زبانی پیش کرنے کی بجائے

اُس کے نانا ڈیمیٹری سیمرنوف کے اپنے الفاظ میں من وعن درج کر دینا زیادہ سود مند ہوگا۔

ماسکو کی خوفناک سردیاں گزر چکی تھیں اگرچہ ہم لوگ موسم کی تبدیلی سے لطف اندوز
تھے لیکن جسم کا تم سے الگ ایک اپنا لینا دینا ہوتا ہے۔ یہ شرمناک ہے۔ لیکن جسم تمہیں شرمندہ
کرتا ہے۔ اور تم کچھ کر نہیں سکتے۔ خیر اب سردی اتنی نہیں تھی۔ انہوں نے میرے جسم سے اُس
سلوک کے اثرات مندمل کیے جو سلوک آندرے اور بورس کو اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔ میں
ابھی زندہ تھا اور میں نے ابھی کسی اور طرح مرنا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ مجھے جیل کے کلینک میں پال پوس کر جو تگڑا کر رہے ہیں تو ان کا
ارادہ ہے کہ پھر سے اپنا اذیت کا کاروبار شروع کر سکیں۔ خیر پھر انہوں نے مجھے واپس میرے
سیل میں منتقل کر دیا اور ایک کی بجائے دو کمبل دے دیے۔ کھانا، جو سٹاف کو ملتا ہوگا، ملنے لگا
اور ہر لقمے کے ساتھ میرا اپنے وجود پر لعنت بھیجنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن جسم ہضم بھی کرتا تھا اور
اچھی خوراک کا ذائقہ بھی بُرا نہیں لگتا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آتے جب میں مرنے کو تھا۔ میں
سوچتا...... اچھا میں نہیں کھاتا تو پھر کیا ہوگا۔ کیا میں اس طرح ان کے کسی بھی شیطانی منصوبے
کو ٹال سکوں گا۔ میرا ذہن خالی رہتا۔ اور مجھے آندرے یاد آتا جو کہا کرتا تھا جب تمہارا ذہن
خود اپنے سے کوئی سوال کرے اور خالی رہے تو سمجھو کوئی گھپلا ہے۔ تم اپنے ساتھ دھوکہ کر رہے
ہو۔ آندرے ایک فلسفی تھا اور ساتھ دندان ساز بھی تھا۔ ہم اُس سے پوچھتے تھے کہ وہ فلسفی
دندان ساز ہے یا دندان ساز فلسفی۔ جب انہوں نے اسے عذاب دینے کے لیے اس کے
دانت ہتھوڑے سے توڑنا شروع کیے تو وہ اُن متاثرہ دانتوں کی سائنسی لوکیشن کے بارے میں
سوچتا تھا۔ Second Molar, First Canine, Central Incisore اور پتہ نہیں کیا
کیا...... کیسے لوگ تھے وہ...... گالینا کو ہم وانگا کی شاعرہ کہتے تھے۔ کیونکہ اس کی آدھی شاعری
دریائے وانگا سے قربت پر اور باقی آدھی اُس سے دوری پر تھی۔ خیر...... تو میں کھاتا بھی تھا اور
میری نیند اگرچہ بڑھی نہ تھی لیکن گہری ہونے لگی تھی۔ پھر انہوں نے مجھے سگریٹ بھی دینے
شروع کر دیے میرے خدا یہ ایک معجزہ تھا۔ پھر سگریٹ ملنا شروع ہونے کے اس معجزے کے
دن بعد ایک صبح میرے سیل کا دروازہ کُھلا۔ یقیناً انہوں نے کافی آوازیں مجھے دی ہوں گی۔

کیونکہ اپنے معمول کے برعکس میں نے جاگنے میں زیادہ دیر لگا دی۔ میرا پہلا خیال
آئیوان کا تھا۔ جو ناشتہ لایا کرتا تھا۔ پھر عادتاً میری نظریں سیل کی چھت سے ذرا نیچے بنے
ایک ڈیڑھ فٹ کے شگاف اور لوہے کی تین موٹی سلاخوں کی طرف اُٹھ گئیں۔ بس اتنا ہی کافی
تھا۔ میرے پورے جسم میں جیسے برقی لہر دوڑ گئی۔ سلاخوں کا پس منظر جس نامانوس سرمئی تاریکی
کی صبح سے بنا تھا وہ کسی ناشتے کی صبح نہ تھی۔ بلکہ وہ صبح تھی جسے سزائے موت کے قیدی خوب
جانتے ہیں۔ میں بستر چھوڑ چکا تھا اور اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ جیلر میخائل زاگروف اور ایک
لمبا تڑنگا فوجی جس کے ہاتھ میں ایک بھاری پستول تھا۔ سیل کے بلب کی مدھم روشنی میں
کھڑے مجھے سرد نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''ڈیمٹری سیمرنوف کپڑے پہنو۔ جوتا پہنو۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''کیا میرا وقت آ گیا ہے؟'' میں نے پوچھا اور خود مجھے اپنی آواز بہت اجنبی سی
لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے گھٹنوں کے نیچے میری ٹانگیں ربڑ کی ہوں اور میرے دھڑ کا
وزن ان پر جھولتا ہو۔

''ڈیمٹری تمہارا وقت کب آئے گا۔ اس سوال کا جواب خود تمہارے پاس ہے۔
ابھی ہم اس جیل کی ان طویل راہ داریوں میں چہل قدمی کریں گے۔ تم آگے چلو گے۔
تمہارے عین پیچھے کرنل بالاکوف ہوگا۔ اور اس کے ہاتھ میں پستول تم دیکھ رہے ہو اور یہ بھی تم
جانتے ہو کہ گردن کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی میں گولی مارنا سزائے موت کا ہمارا آزمودہ طریقہ
ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ موت کو فوراً قریب لے آتا ہے اور قیدی کسی غیر ضروری اذیت سے
نہیں گزرتا۔ لیکن یہ لمحہ کب آئے گا کرنل اس بارے میں میرے کسی مشورے کا پابند نہیں، وہ
مکمل آزاد ہے اور یوں ڈیمیٹری تم بھی مکمل آزاد ہو۔ اس چہل قدمی کے دوران جب بھی تم
چاہو وہی معلومات ہمیں فراہم کر دو اور پھر سب کچھ اسی لمحے بدل جائے گا۔ ہم اسی وقت یہیں
واپس آ جائیں گے۔ گرم کافی پئیں گے اور میں بعد میں سفارش کروں گا کہ تمہیں gulag کیمپ
میں بھی مختصر عرصے کے لیے بھیجا جائے۔ آؤ پھر چہل قدمی کے لیے نکلیں۔ موسم بدل رہا ہے
سردی کم ہے۔ ہماری یہ صبح کی سیر سہانی ہو سکتی ہے اور تم یہیں واپس آ سکتے ہو۔ یا پھر...... جیلر
نے کندھے اُچکائے اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ میں نے کپڑے [illegible]
پہنے۔ سیل پر ایک الوداعی نظر ڈالی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں وہاں واپس نہیں آؤں گا۔ دوسری
صورت میں اگر میں گریگری، پولینا، میکس اور ایوا کے ساتھ غداری کرتا ہوں تو مجھے ابھی [illegible]
کے ساتھ کہیں بھی جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ سارا معاملہ یہیں ختم ہو سکتا ہے۔ میں [illegible]
ہوں یہ کیا کرتے ہیں۔ وہ اپنے سب حربے آزما چکے ہیں...... اب یہ بھی دیکھ لیں۔ مرنا تو [illegible]
ہی جیسے بھی ہو۔

لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا ہلاک کرنے والے کے ساتھ تمہاری زندگی کے آخری
لمحات کیسے گزرتے ہیں۔ یقین کرو اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔ جب پھر تم دیکھتے ہو کہ [illegible]
تمہارے اوپر پستول تان دیتا ہے۔ یا پھر بندوقوں کی لبلبیوں پر انگلیاں جمائے فائرنگ سکواڈ
تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ تو پھر بھی وہ سب تمہاری دنیا کا حصہ ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے
کی دنیا جو ایک بھری پُری دنیا ہے۔ زندگی ہے یا موت سامنے سے آتی ہے تو تم اُسے آتا دیکھ
پاتے ہو۔ محسوس کر سکتے ہو۔ تو محض دیکھ پانا اور محسوس کرنا بھی تو ایک طرح سے مقابلہ کرنا ہے
معاملہ کرنا ہے۔ لیکن سر کے پیچھے کی دنیا میں تو تم ازلی و ابدی نہتے ہو۔ وہ جو عین تمہارے سامنے
ہے اور وہ جو عین تمہارے پیچھے ہے دو الگ الگ دنیائیں ہیں تم اس دنیا کے لیے بنے ہو جو
تمہارے سامنے کھلی ہو۔ تمہارے سر کے پیچھے ایک عظیم خلا ہے۔ جسے تم کبھی پُر نہیں کر سکتے۔

آہ...... دیکھو۔ یہ مشکل ہے۔ میں پھر اسے کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کوئی تم پر
پیچھے سے حملہ کرتا ہے۔ اور تم بالکل نہیں جانتے تھے کہ موت پیچھے سے آئے گی۔ تو یہ ایک الگ
بات ہے۔ لیکن اگر تم ہر لمحہ جانتے ہو کہ سر سے پیچھے کی وہ دوسری دنیا جو ہمیشہ تمہاری پہنچ سے
باہر ہے وہی موت کی پیامبر ہوگی تو آگے اور پیچھے کی ازلی و ابدی تقسیم تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔
جو ہمیشہ سے بھرا ہوا تھا خالی ہو جاتا ہے۔ اور جو ازل سے خالی تھا۔ یکدم موت اور دیوانگی کے
خوف سے بھر جاتا ہے۔ اور تب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا جنون تمہیں ہلکان کر دیتا ہے۔

میرے قدم خود بخود اٹھ رہے تھے۔ اور ایک لمحے کے لیے مجھے احساس ہوا کہ کافی
تیز اُٹھ رہے تھے۔ شاید موت سے دور بھاگ جانے کی خواہش لاحاصل ہونے کے باوجود
میری کسی کوشش کے بغیر جسم کو ایک آخری فراری حرکت دے رہی تھی۔ میرے عین پیچھے کرنل

بالاکوف کا دایاں ہاتھ پستول پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے بازو کی آگے پیچھے کی حرکت میں
جھول رہا تھا۔ کب اُس کے بازو کی آگے پیچھے کی حرکت آگے اور اوپر کی وہ ایک حرکت بنے
گی۔ پستول کی نالی مجھے چھونے سے ذرا پہلے رُک جائے گی۔ کیا وہ ایسا کر چکا ہے۔ کیا وہ ایسا
کر چکا ہے۔ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش ایک دیوانگی ہے جو میرے جسم کو لرزا دیتی ہے۔

''دیمتری رُکو نہیں۔ چلتے رہو۔ کیا تم ہمیں کچھ بتانا چاہتے ہو؟''

میں نیلی آنکھوں والی پولینا اور اُس کے چھوٹے بچے کو دیکھتا ہوں۔ پھر میکسم کی
بوڑھی ماں جو ٹی بی سے مر رہی ہے۔ گریگری جو بھاگ کر پولینڈ پہنچ جانا چاہتا ہے۔ میں انہیں
نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہیں۔ ہاں شاید میں اُنہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ پمفلٹ ہم کس کے
لیے چھاپ رہے ہیں۔ وہ آگے کڑیاں نکال لیں گے۔ سٹالن اپنے قریب ترین لوگوں سے
خوفزدہ ہے۔ خبر ہے کہ Great purge کے بعد اب وہ ایک اور purge کرنے والا ہے۔

''نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں وہ سب کہاں ہیں؟'' مجھے اپنی آواز سنائی دیتی ہے۔

میرے پیچھے چلتے قدموں کی آواز لمحہ بھر کے لیے بدلتی ہے۔ کیا وہ اپنا ہاتھ اوپر اٹھا رہا ہے۔
کیا۔ کیا۔ کیا وہ پستول کو میری گردن کے قریب لا رہا ہے۔ میرے سارے حواس سر اور گردن
کے پچھلے حصے میں کسی دہکتے ہوئے انگارے کی طرح مرکوز ہو جاتے ہیں۔ گدی کے نیچے کمر
کے اوپر کی کھال تھرا کر اپنا ایک الگ وجود اختیار کر چکی ہے۔ جو میں ہوں۔ اور میں سب کا
سب وہیں ہوں۔ ہر مسام میں ایک آنکھ کھل گئی ہے۔ لیکن پھر بھی سامنے کی آنکھیں طویل
راہ داریوں میں زندگی کے آخری فاصلے ماپتی ہیں۔ کیا میں یوری پاسٹرناک کے سیل تک پہنچ
پاؤں گا۔ یوری جو سکول ماسٹر ہے۔ اور ٹالسٹائی کا عاشق ہے۔ کیا میں اُس کونے تک پہنچ پاؤں
گا۔ جہاں سے راہ داری دائیں کو مڑ جاتی ہے۔ برچ کے اس درخت تک جس پر سردیوں کی
برف کے اثرات اب بھی ہیں۔ لیکن بہار کہیں کہیں نئی کونپلوں کی آمد کا پتہ دے رہی ہے۔ جیل
کے کلینک کے سامنے تک غیر سیاسی قیدیوں کے سیلز تک کب اُس کا بازو لہرا کر اوپر کو اُٹھے گا۔
کب۔ اب۔ کب۔ اب۔ کب۔ اب...... اب...... کب...... اب......

پھر اچانک انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کیا یہ بھی ان کے
طریقہ کار کا کوئی حصہ تھا۔ لیکن میرے اوپر فوری طور پر ایک مانوس دنیا کا سکون اُتر آیا۔

خاموشی میں قدموں کی آوازوں کے خوفناک تواتر کی نسبت ان کی آوازیں ایک اجنبی زبان
کہ جب تک یہ سنائی دیتی ہیں۔ میں ہوں۔ پھر اُن کی گفتگو جو سٹالن کے فلم بینی کے شوق کے
بارے میں تھی میری توجہ اپنی طرف مبذول کرنے لگی۔ سٹالن امریکی کاؤ بوائے فلموں کا
تھا۔ رات کو یہ فلمیں دیکھی جاتی تھیں۔ اور ڈنر کرتے کرتے صبح ہو جاتی تھی۔ مجھے لگا وہ
جیسے رٹے رٹائے مکالمے دہرا رہے تھے۔ لیکن میں اُن قصوں کی دلچسپی سے بچ نہ سکا۔ پچھلے
جیسے خالی نہ رہی تھی۔ اور شاید میں یہ بھول ہی چکا تھا کہ موت کی چہل قدمی بہرحال جاری تھی۔

ہم ایک کونے سے دائیں طرف مڑے اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ وہ
راہ داری ہے جس کے آخر میں میرا سیل ہے۔ یہ آگاہی ایک تھرتھراہٹ کی طرح میرے جسم
میں دوڑ گئی۔ گویا یہ موت سے قبل کے آخری کاؤنٹ ڈاؤن کی صورتِ حال تھی...... جیسے
کہے کہ میں دس تک گنوں گا۔ مگر پھر گنتی کو سیدھا سات سے شروع کر دے...... اور اسی لمحے
مجھے جیلر کی آواز سنائی دی۔ "ڈیمتری تمہارا سیل تو آن پہنچا۔ تم نے ساری چہل قدمی ضائع کر
دی۔ شاید تم بہار کی آمد سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کیا اب تم کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

وہ تھرتھری ایک عظیم ارتعاش تھا۔ اور جو میرے حواس اور اعصاب کی مکمل شکست
تھا۔ میں چل رہا تھا۔ کھڑا تھا یا بھاگ رہا تھا۔ کچھ احساس باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن پھر ایسا لگا
میں اپنے قدموں پر گھوم گیا ہوں۔ لیکن جیلر اور کرنل بالاکوف پھر بھی میرے پیچھے ہی ہیں۔
میں پھر گھومتا ہوں۔ گھومتا ہوں۔ لیکن وہ ہمیشہ میرے پیچھے رہتے ہیں۔ آگے اور پیچھے کی
ایک ہو گئی تھی۔ سب کچھ خالی ہو گیا تھا۔ پولینا کے بچے کا معصوم چہرہ شعور کی آخری جھلک تھا
اور پھر میں کہیں نہیں تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں سیل کے فرش پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ میں جھٹکے سے اٹھ کر
بیٹھ گیا۔ تو میں زندہ تھا۔ اور موت کی چہل قدمی سے زندہ واپس آ گیا تھا۔ میرا پورا لباس پسینے
سے ایسے بھیگا ہوا تھا جیسے میں والگا میں غوطہ لگا کر آیا تھا۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا تھا
اور میرے قریب ہی فرش پر پڑے ہوئے دو سگریٹوں کے ٹکڑے جو پوری طرح پاؤں تلے مسلے
نہیں گئے تھے۔ ابھی تک دھواں دے رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے چہل قدمی کے آخری منظر کا
نظارہ کرنے کے لیے یہیں کھڑے کھڑے ایک ایک سگریٹ پیا تھا۔

کیا میں نے اُن کا یہ حربہ بھی ناکام بنا دیا ہے۔ میں نے فرش سے اُٹھ کر اپنے آپ
کو آہنی تختے کے بستر پر گراتے ہوئے سوچا تو مجھے اپنے خیال کے بچگانہ پن کا احساس ہوا۔
یقیناً یہ آخری چہل قدمی نہیں ہو گی...... لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال
تاریک بادلوں میں بجلی کی چمک کی طرح کوند گیا۔ اگر یہ آخری چہل قدمی نہیں تھی تو ہو سکتا ہے
کہ اس سے اگلی بھی آخری نہ ہو۔ اور اُس سے اگلی۔ اور اُس سے اگلی۔ اور اُس سے اگلی......

موت کی وہ چہل قدمی آخری نہ تھی۔ میرے خیال کا اتنا حصہ اگلی صبح درست ثابت
ہو گیا۔ اس بار وہ سیدھے میرے سیل میں آ گئے اور میں رات بھر سے جاگ رہا تھا یقیناً انہیں
کے انتظار میں......

لیونا پرانے بھورے کاغذوں کو سمیٹتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی ہے۔ "تو یہ ایسے
ہی آگے چلتی ہیں۔ نانا کی یادداشتیں" وہ کہتی ہے۔ "یہ ظاہر ہے Russian میں ہے میں
ترجمہ کر کے تمہیں سنا رہی تھی۔" سعید کمال تحیر کے عالم میں گہری سانسیں لے رہا ہے۔ اور
دیکھتا ہے کہ ریت گھڑی کے سینی ٹوریم کا جوزف پستول کنپٹی پر رکھ کر خودکشی کرنے لگا ہے۔ اور
سیٹی گھسیٹتا ہے...... لیکن ایک پولیس آفیسر جوزف کو خودکشی سے باز رکھتا ہے۔ پھر اُسے اس
الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ایسا خواب دیکھا ہے جو بائبل کے جوزف کے
خواب جیسا ہے۔ اور اعلیٰ ترین حلقوں میں اُس کے اس خواب پر شدید تنقید کی گئی ہے۔

انیلا مسکراتی ہے اور سرگوشی میں سیفی سے پوچھتی ہے۔ "تمہیں پتہ ہے نا، جوزف کا
خواب کیا تھا......؟ بائبل میں......"

"نہیں میں جاہل ہوں۔" سیفی بڑبڑاتا ہے۔

بالی پروجیکٹر پر گھومتے سپولز کا ایک نظر جائزہ لیتا ہے۔ "بس پندرہ منٹ کا کام رہ
گیا ہے۔ سُنا پھر ماسٹر مزہ آیا؟" ماسٹر یاسین کچھ ہچکچاتا ہے۔ "اتنی تیز لکھی ہوئی انگریزی نہیں
پڑھی جاتی یار۔" بالی قہقہہ لگاتا ہے۔ "پھر وہی بات۔ اچھا جو تُو پڑھ لیتا تو فلم سمجھ میں آ جاتی
تمہاری۔ ماسٹر اس طرح کا کام انہوں نے تجھ سے کیمرہ کرایا تو تُو پاگل ہو جائے گا۔"

"نہیں پاگل کیا کیمرہ مین نے تو جو سامنے ہے ڈائریکٹر جیسے اُسے جیسے پکڑنا چاہتا
ہے۔ بس وہی کرنا ہے۔"

بالی پھر پروجیکٹر سے کچھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اور رازداری سے کہتا ہے
میں نے ایک اور بھی اُڑتی اُڑتی سنی ہے۔"

"وہ۔ کیا؟"

"اوہو۔ پہلے یہ شاٹ دیکھ لے...... اوئے ہوئے...... یہ بابا تو بڑی
ہے۔" اور سیفی گھسیٹتا ہے...... جیکب نیم برہنہ عورتوں میں گھرا بیٹھا ہے۔ اور کھانے کی
کے آرڈر پر آرڈر دے رہا ہے۔ جوزف پریشان ہو کر ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہے۔

اونگھتے ہوئے صفدر سلطان کی آنکھیں یک دم کھل جاتی ہیں۔ وہ کسی
کے ارد گرد بیٹھی چھ سات برہنہ عورتوں کے پستان ایک ایک کر کے دیکھتا ہے۔ اور
ہے کہ یہ شاٹ ابھی گزر جائے گا۔

"ہاں۔ وہ کیا اُڑتی اُڑتی تم نے سنی بالی؟" ماسٹر پوچھتا ہے۔

"ہاں...... وہ...... اب نئے دھندے ہر طرف شروع تو ہو گئے ہیں نا......
سرکار...... اب ہر سال کوئی ایک آدھ فلم بھی بنوائے گی۔......"

ماسٹر چونکتا ہے۔ پھر کچھ سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا ہے۔ "ہوں...... ہوں......

"ماسٹر یار...... یہ جو نیا کام شروع ہونا ہے نا! تو اس میں میرا خیال رکھنا۔
دیکھ رہا ہوں۔ تیری بڑی کھٹیس ہے۔ میرا صرف یہ پروجیکشن کا کام نہیں...... تجھے
کیمرے کا کام بھی جانتا ہوں...... تیرے ساتھ 'محبت ایک پہیلی' میں اسسٹنٹ کیمرہ مین
کیا تھا۔ بھول گیا ہے۔"

اب ماسٹر کے قہقہہ لگانے کی باری ہے۔ "ابھی تو مجھے خود پتہ نہیں کیا ہونا
ہے۔ لیکن اگر کچھ ہوا اس لین میں۔ تو تجھے نہیں لینا تو کسے لینا ہے۔ ویسے بھی لگتا
رائٹروں کو تو کافی پسند آ گیا ہے۔"

"او...... اور میں تو ان دونوں پر قربان ہو گیا ہوں۔ مجھے ان کے ساتھ
لے۔ بے شک ان کی خدمت پر رکھ لے۔"

"میں نے ساتھ رکھنا ہے بھلا۔" ماسٹر ہنستا ہے۔

لیونا اپنے فلیٹ میں۔ کافی کا ایک مگ سعید کے اور ایک اپنے سامنے رکھ کر

کی راہ سے شام کی مدھم روشنی میں دھندلی ہوتی کافکا سٹریٹ کے گھروں پر نظر ڈالتی ہے۔
"میں موت کی دوسری چہل قدمی کا منتظر ہوں لیونا۔" سعید کمال بھرائی ہوئی آواز میں کہتا
ہے۔ اور لیونا پھر بھورے کاغذوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیتی ہے۔

انیلا دیکھتی ہے۔ کہ جوزف اب بالکل اندھا ہو چکا ہے اور اندھے ٹکٹ کلکٹر کے
لباس میں اُسی کا مکمل روپ دھار چکا ہے۔

سیفی گھسیٹتا ہے......۔ جوزف ایک کھلی قبر کے قریب سے گزرتا ہے۔ اُس کی ماں
غمزدہ کھڑی ہے۔ لیکن اُسے وہ دیکھ نہیں پاتی۔ اور پھر جوزف قبرستان کی راہ سے سینی ٹوریم کی
طرف بڑھ جاتا ہے۔ جو تاریکی میں ایک پرہیبت سائے جیسا نظر آتا ہے۔

The End.

فلم ختم ہو جاتی ہے انیلا اور سیفی ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔
سعید کمال کسی گہری سوچ میں ہے۔ "کیا سوچ رہے ہو سعید؟" لیونا پوچھتی ہے۔

"آ...... عجیب خیال آیا ہے میرے ذہن میں، میں سوچتا ہوں کبھی وہ لمحہ ہو گا جب
میں اس لمحے کے بارے میں سوچ رہا ہوں گا۔ کہ جب میں نے یہ کہا تھا کہ کبھی وہ لمحہ ہو گا
جب میں اس لمحے کے بارے میں سوچ رہا ہوں گا اور پھر جب میں اپنے رائٹرز کو یہ سب کچھ
جو میں نے دیکھا بتاؤں گا تو وہ لمحہ کیسا ہو گا۔ اور وہاں سے یہ سب کچھ کیسا لگے گا۔ لیونا میں
اُس لمحے یا شاید اُس لمحے کہ جیسا یہ لمحہ تب نظر آئے گا۔ سوچتا ہوں......

....

(12)

حقیقت کا کچومر یعنی مونتاژ کا کولاژ

(ادارتی نوٹ بلکہ ادارتی باب)

سعید کمال پر وہ لمحہ آتا ہے جب وہ اُس لمحے کو دیکھتا ہے جو ایک ماضی میں ایک مستقبل تھا مگر اب حال ہے۔

وہ اپنے رائیٹرز کو اُس لمحے کے بارے میں بتاتا ہے، ماضی کا مستقبل حال ہے۔ مگر پھر وہ تینوں ایک ایسے لمحہ حال کے نرغے میں آجاتے ہیں جو تباہی اور انتشار کا پیش خیمہ ہے۔ سوانگ پروڈکشنز نامی گروپ کے نہ صرف فلمی منصوبے بلکہ ان کے باہمی انسانی رشتے بھی خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ سب کچھ بکھر جانے کا منظر نامہ فلمی نہیں بلکہ حقیقی بنتا نظر آتا ہے۔ انیلا سیفی سکرین پلے کا کیا بنتا ہے؟ کیا سیٹھ صفدر سلطان سے پیسہ نکلوانے کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں؟ کیا فلم ''یہ فلم نہیں بن سکتی'' بن پاتی ہے؟ سوانگ پروڈکشنز کا انجام کیا ہوتا ہے؟

یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اور کیسے ہوتا ہے؟ ان سب سوالات کے جوابات کو ہم ''حسن کی صورتِ حال'' کے جاری بیانیہ اسلوب کے تحت اپنے اپنے وقت پر سامنے آنے کا موقع بھی فراہم کر سکتے ہیں اور یوں معاملات فلمی گروپ کی فلمی اور غیر فلمی سرگرمیوں کے کھلے اظہار کے ذریعے اپنے انجام تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بیانیہ روش اختیار کرنے پر ہم اپنے ادارتی فرائض سے غفلت برتیں گے اور حسن کی عمومی صورتِ حال کو مکمل طور پر اس کی فلمی صورتِ حال کے تابع ہو جانے کا موقع دے کر جُز کے کُل پر حاوی ہو جانے کی سنگین

بے اعتدالی کے مرتکب ہوں گے۔ ''حسن کی صورتِ حال'' وقت کی ایک کُلی صورتِ حال ہے اور اس میں موجود دیگر معاملات بشمول ''فلمی صورتِ حال'' کُل پر غالب نہیں آسکتی۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حقیقی اور ماورائے حقیقی واقعات کے اُس سلسلے کو جس کا آغاز نئے آنے والے ''عظیم نجات دہندہ'' سے نجات کی اگلی صبح کی خوشیوں اور مٹھائیاں بانٹنے کے ہنگامے میں حسن اور سیفی کی موجودگی سے ہوا ــــــ کی ایک نئی تدوین کریں اور حسن کے ساتھ چلتے رہنے حسن کا بھوت مصنف بنتے رہنے کی اپنی بنیادی ترجیحات پر قائم رہیں۔

ادارتی اسرار و رموز میں دلچسپی رکھنے والے احباب کے لیے یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ جُز کو کُل پر پھیلنے سے روکنے کے لیے ہم جُز کی ایک اظہاراتی تکنیک استعمال کریں گے لیکن ترامیم اور اضافوں کے ساتھ...... ہم سادہ لفظوں میں بات آگے بڑھاتے ہیں۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ''ریت گھڑی کا سینی ٹوریم'' نامی سرریلسٹ فلم کے آخری منظر کی فلم بینی کے بعد ہم سوانگ پروڈکشنز گروپ سے متعلق مذکورہ بالا سوالات کے جوابات کافی حد تک براہِ راست فراہم کر دیں لیکن ساتھ ساتھ اس مقصد کے لیے وہ معلومہ تکنیک زیادہ استعمال کریں جسے فلمی گرائمر کے ماہرین مونتاژ کہتے ہیں اور جس کے ذریعے انتہائی مختصر وقت میں ناظر کو طویل سلسلہ واقعات کے زمانی و مکانی پہلوؤں اور کرداروں سے متعلق اہم معلومات فراہم کر دی جاتی ہیں اور اس مقصد کے لیے Dissolve; Fades, Double exposure اور بعض اوقات Split Screen کے طریقوں سے انہیں باہم مربوط کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح فلمی کہانی کی ہفتوں کیا بلکہ برسوں پر محیط پیش رفت چند منٹوں میں سموئی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ...... اور یہ اہم ہے کہ ہم چونکہ واقعات کو سلولائیڈ نہیں بلکہ کاغذ پر اُتار رہے ہیں۔ اس لیے ہم فلمی مونتاژ کے تیزی سے گزرتے مناظر کے سیلان کو واقعاتی نتائج کی لسانی خطوط وحدانیوں میں بند کر کے پیش کریں گے...... اس طرح ایک لحاظ سے یہ مونتاژ اور کولاژ کا مرکب ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم مناظر کی البم بنائیں گے اور ساتھ ــــــ بلکہ البم کھولنے سے پہلے ــــــ یہ واضح کر دیں گے کہ اس کے اندر جو سب کچھ موجود ہے وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ آخری اہم بات یہ ہے کہ اس ترمیم شدہ تکنیک کے استعمال کے باوجود ہم بعض اہم مقامات پر سادہ پیرائے اظہار کے

استعمال کا حق بہر حال محفوظ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اب آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس [illegible] ادارتی سرگرمی کا بنیادی مقصد یہ ہوگا کہ ہم اولاً حسن کی صورتحال کی فلمی صورتحال کے [illegible] ماحصل یعنی انیلا سیفی سکرین پلے تک پہنچ سکیں اور اُسے من وعن پیش کردیں اور پھر حسن کی عمومی صورتِ حال کے ساتھ اُس کے کسی تال میل کی تلاش میں نکلیں۔ ہم اس ترکیم [illegible] فلمی/غیر فلمی تکنیک کو حقیقت کا کچومر کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم اندر دیکھو۔ باہر دیکھو۔ فلم دیکھو کی ماورائے حقیقی فلم بینی کے بعد کے حقیقی (آو حقیقی) واقعاتی منظر نامے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مذکورہ بالا قواعد کو استعمال کرتے ہوئے سوائے پروڈکشنز کے معاملات سے تیزی سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

1۔ مختلف نوعیت کی جنسی ترغیبات کے ذریعے سرمایہ دار سیٹھ صفدر سلطان کو فلم پروڈکشن کے لیے سرمایہ فراہم کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں

اپنے تمام تر لاأبالی پن اور مثالیت پسندی کے باوجود روزِ اوّل سے سوائے پروڈکشن گروپ کے تمام افراد میں یہ ادراک بالکل واضح اور قوی ہے کہ مضبوط اور قابلِ اعتماد سرمایہ کاری کے بغیر دنیا کی کوئی بھی فلم پروڈکشن ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ایک جنس زدہ بزنس مین صفدر سلطان کو اپنی فلم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صفدر سلطان فلمی دنیا میں شمولیت کو اپنی جنسی کجروی کی تسکین کا ایک وسیلہ بنانا چاہتا ہے۔ اُس کی اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیٹھ کو فلم کے معاملات میں پھنسائے رکھنے اور اُس سے سرمایہ حاصل کرنے کے لیے اتفاقِ رائے سے انیلا ایک عشوہ گر کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور سیٹھ کو رجھانے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوتی ہے لیکن جلد ہی سب کو اندازہ ہوتا ہے کہ "یہ فلم نہیں بن سکتی" جیسی فضا غیر کاروباری فلم کے لیے سیٹھ سے پیسہ نکلوانا محض انیلا کے ناپختہ ناز و ادا اور جنسی ترغیب کی نیم دلانہ کوششوں کے ذریعے ممکن نہیں ہوگا۔ انیلا "اعلیٰ مقصد" کے حصول کے لیے اس گندے کام سے لطف اندوز بھی ہوتی ہے لیکن کراہت بھی محسوس کرتی ہے۔ جلد ہی جنس زدہ سیٹھ کو قابو کرنے کے لیے زیادہ پیشہ وارانہ مدد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ پروجیکشنسٹ بالی

حل کرتا ہے اور ایسی مثالی مدد مردوں کی سیانی بلی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ سیٹھ کی مخصوص مردانہ ضروریات نہ صرف پوری ہوتی ہیں۔ بلکہ اتنے بھرپور انداز میں کہ خطرہ نظر آنے لگتا ہے کہ سیٹھ کہیں سوانگ پروڈکشنز میں واپس آنے کی بجائے بلی کے اشاروں پر ہی نہ ناچنے لگے اس صورتِ حال میں ایک تشویش ناک پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ بلی بھی اپنی سٹریٹ وومین پر مبنی زندگی پر ایک فلم بنانے کا خواب دیکھ رہی ہے۔

معاون مناظر

بالی دونوں فلموں کو ڈبے میں بند کر دیتا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ کی وجہ سے اُس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات ابھرتے ہیں۔ پاس رکھا ایک بڑا سا پیچ کس اُٹھاتا ہے۔ اور وحشیانہ انداز میں لکڑی کی ٹانگ پر کھرچنے لگتا ہے۔ ماسٹر ہنستا ہے۔ بالی قہر آلود نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ ماسٹر کی ہنسی وہیں غائب ہو جاتی ہے۔ گہری شام۔ ماسٹر گاڑی چلا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ بالی پیچھے صفدر سلطان بالی راستہ سمجھانے کے لیے اشارے کر رہا ہے۔ ایک کوٹھی کے سامنے گاڑی رکتی ہے۔ گیٹ کھلتا ہے۔ گاڑی اندر داخل ہوتی ہے۔ صفدر سلطان بالی اور ماسٹر یاسین ایک بدذوقی کی حد تک پرتعیش ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ صفدر کے چہرے پر گھبراہٹ۔ بلی ایک چالیس سالہ خوش شکل عورت چہرے پر ذہانت، آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر نرم استقبالیہ مسکراہٹ لیے اندر داخل ہوتی ہے۔ قہقہے لگاتی ہے پھر ایک دوسرے دروازے سے ایک اور جوان عورت اندر آتی ہے۔

(منظر بدلتا ہے)

کوئی اور دن بالی اور ماسٹر باہر گاڑی میں۔ صفدر اور جوان عورت ایک نیم تاریک کمرے کے بستر میں برہنہ حالت میں ہیں۔ عورت صفدر سلطان کی ایک طرف گری پتلون سے بیلٹ کھینچتی ہے اور اُس کی کمر پر کوڑے کی طرح برساتی ہے۔ صفدر سلطان کا چہرہ بہت قریب ہے۔

(منظر بدلتا ہے)

صفدر سلطان برہنہ حالت میں بستر پر الٹا لیٹا ہے اور برہنہ عورت اس کی پیٹھ پر چڑھے

کی بیلٹ سے ہلکی ہلکی ضربیں لگا رہی ہے۔ صفدر سلطان کی مدہم کراہیں سنائی دیتی ہیں۔ کمرہ کا
دروازہ بے آواز کھلتا ہے۔ ببلی اندر داخل ہوتی ہے۔ میرون رنگ کی شلوار قمیص۔ گلے کے
اُس کی وی لائینز گہری اور نمایاں نظر آ رہی ہیں۔ عورت بیلٹ چلانا بند کرتی اور آہٹ پا کر
سلطان الٹے لیٹے لیٹے سر گھما کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کراہ جیسی آواز منہ سے نکلتی ہے۔

''کون ہے......؟''

ببلی تیزی سے آگے بڑھتی ہے اور بچھ جانے کے انداز میں صفدر سلطان سے
مخاطب ہوتی ہے۔

''میں ہوں مالک آپ کی لونڈی۔ ببلی......''

صفدر سلطان ہچکی زدہ انداز میں ...... ''لونڈی...... لونڈیاں اب ہماری قسمت میں
کہاں۔ لونڈیوں کے زمانے گزر گئے۔ ہائے۔ ہائے۔ تم۔ ایک لونڈی ہو...... ہا۔ ہا۔'' (زور
ہے تو بستر کانپتا ہے)

ببلی جھکتی ہے اور نہایت ادب سے کہتی ہے۔ ''نہیں مالک میں اکیلی ہی نہیں......
میری ساری لڑکیاں آپ کی لونڈیاں ہیں......''

صفدر سلطان ویسی ہی بے یقین ہچکی زدہ ہنسی میں...... ''لونڈیاں...... ہائے
ہائے...... پر چلو جی مان لیتے ہیں......''

ببلی یک دم سخت گیر نظروں سے دوسری عورت کی طرف دیکھتی ہے۔ ''اور عشرت یہ
تم کیا کر رہی تھیں...... مالک کی کمر سے مکھیاں اڑا رہی تھیں۔ بازوؤں میں تیرے جان نہیں
ہے۔ ادھر لا۔ اور وہ الماری کھول......''

ببلی عشرت سے چمڑے کی بیلٹ لیتی ہے اور دائیں بازو کی زنانے دار حرکت سے
بیلٹ صفدر سلطان کی کمر پر برساتی ہے ایک چیخ بلند ہوتی ہے۔ عشرت الماری کھولتی ہے۔ عجیب
وغریب چیزیں سامنے پڑی نظر آتی ہیں۔ رسیاں، زنجیریں، طرح طرح کے لوشن، ایک چمڑے
کا کوڑا، فولادی مُکا، مختلف سائز کی چھریاں، چاقو، ایک بڑا خنجر، ایک پستول۔ عشرت گھوم کر ببلی
کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ ببلی صفدر سلطان کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔

''مالک لونڈی کی ایک التجا ہے۔ آپ کے...... ذرا...... ہاتھ پاؤں باندھنے پڑیں

گے......'' صفدر سلطان اب ایک مصنوعی سی حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ ''اچھا...... وہ......
کیوں......؟''

''سرکار...... آپ کی پریشانی کا بھی تو کچھ کرنا ہے نہ مالک......''

''میری پریشانی......'' صفدر سلطان عجیب اٹھلا کر کہتا ہے۔ ببلی عشرت کو اشارہ کرتی
ہے۔ عشرت الماری میں ہاتھ ڈالتی ہے اور ببلی دائیں بازو میں تھامی چمڑے کی بیلٹ کو پہلے
سے بھی زیادہ شدت سے حرکت دیتی ہے۔ اور صفدر سلطان کی چیخ پہلے سے کہیں زیادہ بلند
ہے۔ (منظر بدلتا ہے)

صفدر سلطان کی کمر اب لگتا ہے زخمی ہو چکی ہے اور وہ ساری صورت حال اُس کے
لیے کسی جنسی کجروی کی تسکین کی بجائے کوئی خوفناک شکل اختیار کر رہی ہے۔ وہ پوری قوت
سے اپنے بازوؤں اور پاؤں کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہر ضرب پر منہ سے کسی زخمی
جانور کے ڈکرانے جیسی آواز نکلتی ہے۔ عشرت دو تین چاقو لیے ببلی کی طرف بڑھتی ہے۔ جس
کی قمیض بغلوں میں پسینے سے بھیگ چکی ہے۔ وہ کوڑے مارنا روکتی ہے اور چاقوؤں کو ایک
دوسرے سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی ہے۔ صفدر سلطان متوجہ ہوتا ہے۔

''آقا...... لونڈی اب یہ......''

دہشت کی ایک لہر صفدر سلطان کی آنکھوں میں اٹھتی ہے۔ (منظر بدلتا ہے)

ببلی اب ایک خنجر لیے سامنے کے رخ سے صفدر سلطان کی طرف بڑھتی ہے۔ صفدر
سلطان اپنی وحشت کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ بھیانک چیخیں۔ پھر خنجر دیکھ کر اور ببلی کو وار کرنے
کے انداز میں اٹھاتا دیکھ کر مزید برداشت نہیں کر پاتا اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ببلی اطمینان
کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے عشرت کی طرف دیکھتی ہے۔ خنجر اس کے حوالے کرتی ہے۔
ایک نظر صفدر سلطان پر ڈالتی ہے جس کی کمر پر لمبی خون آلود لیکن سطحی خراشیں ہیں۔

''جیسے ہی یہ ہوش میں آنے لگے مجھے بلاؤ۔''

''جی میڈم، عشرت آگے کو سر جھکا کر کہتی ہے۔''

(منظر بدلتا ہے)

ماسٹر: ''لگتا ہے ببلی نے سیٹھ کا قالٹ پکڑ ہی لیا ہے۔ اب تو وہ انیلا بی بی سے شادی کی

بات بھی نہیں کرتا......''

بالی: ''انیلا سے شادی کی بات؟'' بالی کی آنکھیں حیرت اور غصے سے پھیلتی ہیں۔ شکل دیکھی ہے بہن چود نے...... لدھر کی اولاد...... خبردار جو اُس نے اُس کی طرف غلط نظر سے دیکھا۔ دونوں کا باڈی گارڈ ہوں میں۔ شہزادے کا......''

ماسٹر: (ہنستا ہے) ''نہ تو دھکے سے ہی باڈی گارڈ بن بیٹھا ہے ان کا......''

بالی: ''تجھے تو پتہ ہے ماسٹر جو بندے مجھے اچھے لگتے ہیں بس لگ جاتے ہیں۔ پھر اور کچھ نہیں پوچھتا...... ویسے بھی سیٹھ تیرے کا کچرا صاف کر دیا اُس نے...... نے......''

ماسٹر: ''بڑی شے ہے یار...... یہ بلی تیری......''

بالی: ''او...... پوری سینس ہے بھائی اُس کے پاس...... (ایک دم شرارت اور بدمعاشی سے مسکراتا ہے) ماسٹر...... یار...... تیرا۔ مطلب ہے انجن ٹھیک چل رہا ہے نا۔ کوئی ٹیوننگ شیوننگ کا مسئلہ ہو تو بتانا......''

ماسٹر یک دم اسٹیرنگ سے دونوں ہاتھ چھوڑ کر بالی کے سامنے پٹاک کی آواز سے جوڑ دیتا ہے۔

ماسٹر: ''مجھے معاف کر......''

بالی: (قہقہے لگاتا ہے) ''ویسے شریف مردوں کی بھی سیانی ہے بلی...... پاک صاف مرد...... جن...... کے شادی کے روز...... کا یا بعد کا...... مطلب حرج مرج ہو جاتا ہے ان کو بھی مشورہ دیتی ہے۔ اندر خانے...... میں نے یہ داڑھیوں والے منہ لپیٹ کر آتے دیکھے ہیں۔ پھر مجھے وہ سب کچھ بتا دیتی ہے......''

ماسٹر: ''ہاں...... تُو اس کا یار جو ہے۔ لکڑی کی ٹانگ والا یار...... ویسے بالی...... ہے جو تُو کہتا ہے...... ٹانگ کٹنے کے بعد تو زیادہ مرد ہو گیا ہے۔''

بالی: ''ہاں۔ مجھے خود تو پتہ ہے ہی۔ پر یہ بھی اُس نے سمجھایا۔ کہنے لگی دیکھ اپنی ٹانگ اب تیری ہے نہیں...... گھٹنے سے اوپر آدھ تک...... تو اُدھر ہے لکڑی کی ٹانگ۔

جس میں خارش بھی ہوتی ہے اور درد بھی...... پر خون تو نہیں ہے اس میں...... تو ادھر کا سارا خون جو آتا ہے۔ حصے کا۔ وہ کدھر جاتا ہے۔ بلڈ پریشر بھی یعنی۔ باقی خود سمجھ لے۔''

بالی قہقہے لگاتا ہے۔ اور ماسٹر دبی ہنسی ہنستا ہے۔

ماسٹر: ''حد ہو گئی ہے...... ویسے......''

بالی: ''ویسے ماسٹر تیرے جیسا شریف...... فلم لین میں...... کم ہی نظر آتا ہے......''

ماسٹر: (ٹھنڈا سانس لے کر) ''پتہ نہیں۔ ابھی تو نہ فلم ہے نہ لین ہے۔''

بالی: ''''یہ فلم نہیں بن سکتی......'' یہ فلم ہے۔۔ کیا بات ہے...... ماسٹر شہزادے شہزادی سے میری بات تو کرا...... کبھی۔ (ملتجیانہ لہجہ) مجھے کہیں ڈال لیں۔ اس طرح کی فلموں میں میرے جیسے چل جاتے ہیں۔ لکڑی کی ٹانگ والے۔ شیشے کی آنکھ والے۔ اندھے۔ کانے...... لُولے...... میں نے سمندری ڈاکوؤں کی ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں تھا ایک ٹانگ والا۔ کندھے پر طوطا بٹھائے پھرتا تھا۔ کیا ایکٹر تھا...... تو میں بھی ٹانگ اتار کر پارٹ کر لوں گا......''

(منظر بدلتا ہے)

صفدر سلطان بستر پر بیٹھا ہے۔ رو رہا ہے۔ بلی پاس بیٹھی اُسے شب خوابی کے لباس کی شرٹ پہناتی ہے۔ آخری بٹن بند کرتی ہے۔ اور اُسے اپنے ساتھ چمٹاتی ہے۔ صفدر سلطان اور بھی زور زور سے روتا ہے۔ بلی پیار سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہے۔

''نہ۔ منے۔ نہ...... سب ٹھیک ہو جائے گا منے......''

عشرت کوڑا، چُھریاں، رسیاں وغیرہ واپس الماری میں رکھ رہی ہے۔ ایک بے ساختہ ہنسی اُس کے منہ سے نکلتی ہے۔ بلی گھوم کر قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتی ہے اور صفدر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ سہلاتی ہے۔

''نہ۔ پپو۔ نہ۔ رو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا......''

صفدر اپنا سر بلی کے کندھے پر رکھ لیتا ہے۔ اور سسکیاں لینے لگتا ہے۔

''نہ۔ چھندے چندے نہ...... کہا جو ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ عشرت ہے ہی

کنجری......"

(منظر بدلتا ہے)

صفدر سلطان معمول کے لباس میں بیٹھا ہے۔ ببلی نیچے قالین پر عجیب
میں بیٹھی ہے۔ میز پر چائے وغیرہ کے برتن اور کاغذوں کا جلد شدہ ایک مسودہ
صفدر سلطان کے چہرے پر ایک طرح کی آسودگی نظر آتی ہے۔ محبت بھری نظروں سے
طرف دیکھتا ہے۔ ببلی شرما کر آنکھیں جھکا لیتی ہیں۔ صفدر سلطان کیک کا ایک ٹکڑا
ہے۔ ٹکڑا اتنا بڑا ہے کہ منہ میں سما نہیں پاتا۔ اور کچھ حصہ ٹوٹ کر نیچے گر جاتا ہے۔
گھبرائی ہوئی نظروں سے ببلی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو بدستور نظریں جھکائے بیٹھی ہے۔
کیک کا ٹکڑا نظر بچا کر پھر منہ میں ڈال لیتا ہے۔ اُس کے لب ہلتے ہیں۔ جیسے کوئی بات
ہے۔ ببلی آہستگی سے مسودے کا رُخ اُس کی طرف گھماتی ہے۔ ٹائٹل لکھا ہوا سامنے آتا ہے
'میڈم جانباز'۔

2۔ حکمت بہزاد کی نیشنل فلم انسٹیٹیوٹ بنانے کی کوششیں اور اُن کے
پروڈکشنز پر مرتب ہونے والے اثرات

جس طرح حسن کی صورتِ حال میں سوانگ پروڈکشنز کی فلمی صورتِ حال
باقاعدہ آمد "عظیم نجات دہندہ" سے نجات کے اہم واقعہ سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح
حکمت بہزاد کی نیشنل فلم انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کی دیرینہ کوششوں کی تجدید بھی اسی واقعے سے
منسلک ہے۔ نئے "عظیم نجات دہندہ" کا نیا دور اس لحاظ سے فلمی تخلیقیت اور ثقافتی
اِن دو دھاروں کے جداگانہ آغاز کو ممکن بناتا ہے۔ لیکن پھر یہ دھارے ایک دوسرے پر اثر انداز
ہونے لگتے ہیں اور درحقیقت یہی اثرات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا بالآخر سوانگ پروڈکشنز کے
تین محوری کرداروں یعنی سعید کمال، انیلا بلال اور سیفی کے نہ صرف فلمی اشتراکِ عمل بلکہ
تعلق کو بھی شدید خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔

محض واقعاتی سطح پر بات مختصراً یہ سامنے آتی ہے کہ حکمت بہزاد کی طرف سے
کمال کو فلم انسٹیٹیوٹ کا ڈائریکٹر بنانے کی پیشکش اور اُس سے متعلق فلم سازی کے حوالے

کچھ شرائط سب مل کر اُسے اپنے حالیہ جاری فلمی پراجیکٹ کے حوالے سے ڈانواں ڈول کر
دیتی ہیں اور وہ اس نئی پیش رفت میں اپنی نفسیاتی کمزوریوں کے عین مطابق اپنے ایک عظیم
مستقبل کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔ وہ نہ صرف اس بارے میں انیلا اور سیفی کو اعتماد میں نہیں لیتا
بلکہ سیٹھ کے ساتھ 'کمرشل فلم' کے حوالے سے سرمایہ کاری کی گٹھ جوڑ بھی شروع کر دیتا ہے۔ لیکن
ساتھ ہی ساتھ وہ سیفی اور انیلا سے "یہ فلم نہیں بن سکتی" کے سکرپٹ پر بظاہر اُسی جوش و خروش
سے کام جاری رکھنے کا تاثر بھی دیتا ہے اور اُنہیں اپنے پراگ کے ایام کی روداد بھی سناتا ہے۔
لیکن سعید کمال کی یہ ڈبل گیم زیادہ دیر جاری نہیں رہتی۔ اور ماسٹر یاسین کے ذریعے سیفی اور
انیلا کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ سعید کمال کیا چکر چلا رہا ہے۔ اگرچہ انہیں پس منظر میں موجود شخص
حکمت بہزاد کے بارے میں ابھی کچھ علم نہیں ہو پاتا کیونکہ ماسٹر یاسین اس بارے میں کچھ
نہیں جانتا۔

لیکن اس انکشاف کے بعد انیلا، سیفی اور سعید کمال کے درمیان تصادم کی شدید
صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ انیلا اور سیفی سعید کمال کے طرزِ عمل پر شدید ردِ عمل ظاہر کرتے
ہیں اور اُسے سوانگ پروڈکشنز سے فوری علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ سُنا دیتے ہیں۔ سعید کمال
شدید ذہنی خلفشار کے عالم میں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انہیں یقین دلانے
کی کوشش کرتا ہے کہ وہ لازماً انہیں اس پیش رفت کے حوالے سے اعتماد میں لیتا۔ لیکن چونکہ
ابھی صورتِ حال واضح نہیں تھی اِس لیے وہ ایسا نہ کر سکا وغیرہ وغیرہ پھر اسی وضاحتی تشریحی
تکرار کے دوران حکمت بہزاد کا نام پہلی دفعہ تینوں میں سامنے آتا ہے اور صورتِ حال ایک بار
پھر ڈرامائی انداز میں بدل جاتی ہے۔

سیفی نہ صرف حکمت بہزاد کی شخصیت اور اُس کے کیرئیر کے بارے میں بخوبی جانتا
ہے بلکہ سعید کمال کی طرح اُس کے کام اور نظریات سے بھی متاثر ہے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ
فلم انسٹیٹیوٹ اور فلم سازی کی سرکاری سرپرستی کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت میں
حکمت بہزاد محوری کردار ادا کر رہا ہے سیفی اور انیلا نئی صورتِ حال کے بارے میں پھر سے
سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کافی پیچیدہ نفسیاتی اور تخلیقی بحث و مباحثے کے بعد طے پاتا ہے
کہ سکرین پلے "یہ فلم نہیں بن سکتی" کے حوالے سے اور گروپ کی ترجیحات کے حوالے سے

حکمت بہزاد سے بھرپور مکالمہ کیا جائے اور اس جاری پراجیکٹ کے لیے اس کی مکمل آشیرباد حاصل کی جائے۔ اسی اثنا میں ایک اور واقعہ پیش آتا ہے جو سوانگ پروڈکشنز کی سرگرمیاں حکمت بہزاد کے ثقافتی نظریات اور فلم انسٹیٹیوٹ کے قیام کے لیے اُن کی کوششوں میں ایک بھرپور وحدت کو قائم کر دیتا ہے۔ سعید کمال کو پراگ سے لیونا اور پروفیسر جولیس ملینسکی کے خطوط موصول ہوتے ہیں۔ جن میں اُسے آئندہ سال خزاں میں پروفیسر کے زیرِ اہتمام ایک سرئیلسٹ فلم فیسٹول میں شرکت کی بھرپور دعوت دی گئی ہے۔

حکمت بہزاد فلم ''یہ فلم نہیں بن سکتی'' کے اب تک کے لکھے گئے سکرین پلے سے کافی متاثر ہوتا ہے۔ اور گروپ کو اسی فلم پر کام کرنے اور مقررہ وقت میں اُس کی پروڈکشن مکمل کر کے فلم فیسٹول میں پیش کرنے کی بھرپور حمایت کرتا ہے۔

دوسری طرف حکمت بہزاد کو فلم، آرٹ، موسیقی، ثقافت وغیرہ کے حوالے سے اپنی کوششوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے عمل میں شدید ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نئے ''عظیم نجات دہندہ'' کے انتہائی بااثر حلقوں کی بھرپور حمایت حاصل ہونے کے باوجود اور ارباب بست وکشاد کے ایک انتہائی اہم مہرے سے ذاتی تعلقات ہونے کے باوجود بہزاد کو جلد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آرٹ، ثقافت، فلم، موسیقی وغیرہ کے لیے اس کی عملی کوششوں کو غیر معمولی طور پر متشدد مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہاں تک کہ یہ مخالفت اُس کی ذاتی سلامتی تک کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

معاون مناظر (مکالمے: سادہ و ٹیلی فونی، خطوط بقیہ لیونا ادھوری کہانی وغیرہ)

سوانگ پروڈکشنز کے دفتر کی متنازعہ گول میز کے گرد منظر معمول سے بہت مختلف ہے۔ ایک تو یہ کہ حاضری صرف سعید کمال، انیلا اور سیفی تک محدود ہے۔ اور پھر یہ کہ اُن کے درمیان بھی معمول کا پرشور بحث و مباحثہ دیکھنے میں نہیں آ رہا، جو نظر آتا ہے وہ ایک جمود سا ہے۔ جیسے کسی فلم کا سٹل فریم۔

اس سٹل فریم میں سعید کمال اپنی مرغوب نشست میں بیٹھا نظر آتا ہے اس کا دایاں ہاتھ ہوا میں اُٹھا ہوا ہے جیسے ہر شخص کے ہاتھ گفتگو کو موثر بنانے کے لیے غیر ارادی طور پر حرکت

کرتے ہیں اس کی نظریں ایک ایک نشست چھوڑ کر دائیں اور بائیں آمنے سامنے بیٹھے سیفی اور انیلا کی جانب ایسے اُٹھی ہیں کہ جیسے وہ دونوں کو بیک وقت دیکھ رہا ہے اور کسی کو بھی نہیں دیکھ رہا۔ انیلا اور سیفی دونوں کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ایک شدید کھنچاؤ کی کیفیت ہے جو کسی نامعلوم اضطراب کی غمازی کرتی ہے۔

''ماسٹر یاسین نے خدا جانے تمہیں کیا بتایا۔ اُسے پوری صورتِ حال کا علم نہیں۔'' سعید کمال کی بھرائی ہوئی آواز سُنائی دیتی ہے۔ انیلا زہرآلود لہجے میں بولنا شروع کر دیتی ہے۔

''اصل صورتِ حال یہ ہے سعید کمال کہ تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ تم شروع دن سے اپنا کھیل کھیل رہے ہو۔ کسی انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر بنو یا کچھ اور لیکن یہاں اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے...... سوانگ پروڈکشنز کا سوانگ۔''

سیفی کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ بوجھل انداز میں اُٹھتا ہے۔ چند لمحے سعید کمال کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔

''یہ فلم نہیں بن سکتی چیف۔''

سعید کمال کا انداز ایسا ہے کہ ابھی رو پڑے گا۔ ''رُکو۔ خدا کے لیے رُک جاؤ۔ ساری بات سُن لو پہلے۔''

(منظر بدلتا ہے)

ماسٹر اور بالی کسی جگہ۔ ماسٹر یاسین بہت پریشان نظر آتا ہے۔ یار بڑی غلطی ہو گئی۔ مجھے سیفی کو نہیں بتانا چاہیے تھا باس کے نئے چکر کا۔

''کیوں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ یہ کیسی فلم کمپنی ہے جس کا باس فراڈیا ہے۔'' بالی کہتا ہے۔

''تو نہیں سمجھتا...... اب بڑا فساد ہو گا۔''

''تو ہونے دے۔ بات کسی پاسے تو لگے۔''

(منظر بدلتا ہے)

گول میز کے گرد سعید کمال، انیلا اور سیفی بیٹھے ہیں۔ کمرے میں روشنی مدھم ہوتی ہے اور پھر سُرخ رنگ کی روشنی میں بدل جاتی ہے۔ تینوں کے چہرے خوفناک نظر آتے ہیں اور وہ مسلسل بول رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے سامنے میز پر مُکے مار رہے ہیں۔ انیلا کا چہرہ...... میز کے

اوپر پھانسی کے دو پھندوں پر سعید کمال اور صفدر سلطان کی لاشیں لٹک رہی ہیں۔ سعید کمال کا
چہرہ سعید کمال انیلا اور سیفی کو برہنہ حالت میں گرا کر ایک ایک ہاتھ سے اُن کے گلے
ہے۔ دونوں بُری طرح تڑپ رہے ہیں۔ سیفی کا چہرہ اُس کا ہاتھ میز پر۔ اُنگلیاں میز کی
چھو کر جیسے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر یک دم میز کو اپنے سامنے سے وحشیانہ انداز
میں نیچے دباتا ہے۔ میز کا تختہ دوسری طرف سے اُٹھ کر سعید کمال کی ٹھوڑی کے نیچے لگتا ہے۔

(ادارتی نوٹ گول میز کی کہانی سُنے بغیر اس منظر کو پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے لیکن
وہ کہانی بہرحال اپنے وقت پر آئے گی)

(منظر بدلتا ہے)

اُسی وقت سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں بابا خوشیا چائے کے برتن لیے نمودار ہوتا
ہے اور میز کی طرف بڑھتا ہے۔ میز کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ سعید، سیفی، انیلا
خاموش بیٹھے جیسے خلا میں اپنی اپنی سمت گھور رہے ہیں۔ میز سعید کی طرف سے ہلکی سی اوپر
اُٹھی ہوئی ہے۔ بابا خوشیا کھانس کر اپنے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔ لیکن تینوں کی اس ساکت
کیفیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

"چاء۔ سر جی۔" بابا ڈرے ڈرے لہجے میں کہتا ہے۔ سعید کمال چونک کر بابا کی
طرف دیکھتا ہے اور اُسے چائے میز پر رکھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ بابا چائے کے برتن رکھتا ہے۔
سیفی اور انیلا بھی اپنی اس کیفیت سے باہر آ جاتے ہیں اور پھر اُٹھنے لگتے ہیں۔ جیسے جانے کا
ارادہ کر رہے ہوں۔ سعید کمال شدید مایوسی کی کیفیت میں انہیں مخاطب کرتا ہے۔

"تم لوگوں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ اس سارے منصوبے کے پیچھے اصل میں کون ہے؟"

"تم بتا دیتے۔" سیفی کندھے اُچکا کر کہتا ہے۔

"شاید تم جانتے ہی ہو گے۔ حکمت بہزاد صاحب کو..... میں انہیں سر کہتا ہوں۔"

سیفی کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلتے ہیں۔ انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔ جس
کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں۔ سیفی پھر نیچے بیٹھنے لگتا ہے۔

"انیلا ذرا رُکو..... بیٹھو....." سیفی کہتا ہے اور سعید کمال کی طرف عجیب سی نظروں
سے دیکھتا ہے۔ "تم نے کہا..... حکمت بہزاد صاحب....."

(منظر بدلتا ہے)

حکمت بہزاد کا گودام نیم روشن کمرے میں پڑے مجسمے۔ ترچھی روشنی میں بہت
نمایاں نظر آتے ہیں۔ بہزاد فرشی گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ہے۔ ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔
چہرے پر تھکن کے تاثرات۔

آواز: "ہاں..... بلے..... تم..... بتاؤ....."

بہزاد: "سر دیکھ لیں۔ اس عاجز کو لائین پر بلے۔ بلا کہنا مناسب ہے۔ مطلب آپ سے
بہتر کون جانتا ہے۔ تمام لائینیں ٹیپ ہوتی ہیں۔"

آواز: (قہقہوں کی آواز) "کم آن..... میں..... کم از کم..... تمہیں اسی نام سے بلاؤں گا
جو کالج میں تمہارا چلتا تھا..... فکر نہ کرو..... لائینوں کا..... اور ہاں..... کیا بات
ہے..... کوئی لمبی بات تو نہیں..... وہ گورا آنے والا ہے..... حالات بدل رہے
ہیں....."

بہزاد: "وہی سر۔ چھوٹے نقشے بڑے نقشے۔"

آواز: (بار بار دہراتے ہوئے) "چھوٹے نقشے بڑے نقشے۔ چھوٹے نقشے بڑے نقشے۔
چھوٹے....."

بہزاد: "جی سر۔ چھوٹے نقشے۔ ادب۔ آرٹ۔ کلچر۔ موسیقی۔ ڈانس....."

آواز: "ڈانس۔ او نو..... نو ڈانس۔ رقص و موسیقی..... یہی کہتے ہو نا۔ اس نام سے تو وہ
ایسے بدکتے ہیں نا کہ کیا بتاؤں..... خیر تو لائن کیا لے رہے ہو....."

بہزاد: "لائین کوئی نئی نہیں سر۔ وہی جو پچھلے بیس سال سے اپنی کتابوں میں لکھتا آیا
ہوں۔"

آواز: "تمہاری کتابیں..... آ..... I Love them مطلب جو تھوڑی میں نے پڑھی
ہیں۔ مقامی کلچر پر تمہارا Thesis مضبوط ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کچھ لوگوں نے کیسا
شور مچایا تھا۔"

بہزاد: "جانتا ہوں....."

آواز: "اب بلے..... تمہیں بتاؤں..... میں تو اس پوزیشن میں ہوں ہر طرف دیکھ سکوں۔

اب آہستہ آہستہ بہت زہری لوگ آ رہے ہیں۔ ان میں زہر اور آگ بھری ہوئی ہے۔"

بہزاد: (گہرا سانس لیتے ہوئے) "یہ۔ آپ نے اچھا کہا۔ زہر اور آگ بھری ہوئی ہے"

آواز: "لیکن...... ہم نے اپنا کام کرنا ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھو چھوٹے نقشے بناتے وقت ہم نے یہ بھی دیکھنا ہے کہ بڑے نقشے بنانے والوں کو کوئی غلط سگنل نہ جائے۔ اب یہ رقص و موسیقی......"

بہزاد: "لوک ثقافت میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے ہمارا ایک ہی سگنل بڑے نقشے بنانے والوں کے لیے غلط ہو سکتا ہے اور کچھ کے لیے بہت صحیح"

آواز: "ہاں...... اسی میں تو تمہاری فنکاری ہے۔ حالات بدل رہے ہیں بہن چو... سنو۔ سنو۔ سنو...... میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ تم کل تین بجے کیوں نہیں آ جاتے۔ ایک بڑا نقشہ میٹنگ ہونی ہے۔ جس میں وہ سب ہوں گے۔ سب دوسرے نقشوں والے...... تو کیوں نہ ہم...... تم...... وہاں طریقے سے پر... کچھ sound کر دو......"

سر: "کہ کلچر، آرٹ، موسیقی، رقص، فلم، تھیٹر یہ سب خالی جگہیں ہمیں پُر کرنا ہوں گی۔ نہیں تو وہاں کچھ اور گھس جائے گا......"

آواز: "ہا۔ ہا۔ ہا...... Excellent ...... اُن کے دماغ میں بات کو ڈال دو ب... طریقے سے۔"

سر: "لیکن دیکھ لیں سر۔ وہاں "روک دینے والے" "بند کر دینے والے" بھی ہوں گے۔"

آواز: "اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارا چھوٹا نقشہ اور اصل میں بہت بڑا نقشہ وہاں سب کے سامنے آ جائے۔ طریقے سے۔"

سر: "ہاں۔ طریقے سے۔ تاکہ بعد میں وہ کوڑے لہراتے ہوئے نہ آ جائیں۔ ٹھیک ہے سر میں کل ہی آتا ہوں...... یہ بات جو ہم کر رہے تھے لیکن اسے اور بھی زیادہ شریف اور معصوم کر کے۔" (دونوں ہنستے ہیں)

(منظر بدلتا ہے)

سعید کمال کے بیڈ روم میں بلی وایلڈر کی تصویر نئے فریم میں۔ اخبار میں لپٹی اس کے بستر کے قریب پیچھے دیوار کے ساتھ ٹیڑھی میڑھی پڑی ہے۔ وال کلاک رات کے گیارہ بجے کا وقت دکھا رہا ہے۔ سعید کمال بیڈ روم کے ایک مخصوص کونے میں سے نوشی کے لوازمات کے ساتھ ایک خمار آلود اطمینان کی کیفیت میں نیم دراز کوئی خط پڑھ رہا ہے۔ غیر ملکی ٹکٹوں سے بھرا لفافہ برف کی ڈلیوں اور شیواز ریگل، وہسکی کی بوتل کے درمیان کنارے کے رخ پر پھاڑ رکھا ہے۔ بوتل کی بیرونی سطح پر جمی فضائی رطوبت کے قطرے لفافے کے...... موٹے کاغذ کی بھوری سطح میں جذب ہو کر پروفیسر جولیس ملینکسی کے فاؤنٹین پین سے لکھے الفاظ کی سیاہی کو گیلے کاغذ میں پھیلا کر ناقابل شناخت بنا رہے ہیں۔ لیکن سعید کمال ان نمکین لا واقعات سے قطعاً بے خبر جولیس کی نہایت ہی قابل شناخت تحریر کو لفظ لفظ اپنے سکاچ کے جرعوں کے ساتھ اندر اتار رہا ہے۔ وہ پھر گلاس تھامتا ہے۔ پروفیسر جولیس ملینکسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"بات یہ ہے کمال جب ہم سینما میں آتے ہیں تو سرئیلزم کا مسئلہ کافی گھمبیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادب اور دوسرے آرٹس میں سرئیلزم کی دیوانگی پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ کاغذ کالے کر دو یا کینوس کسی کی جیب سے کیا جاتا ہے۔ لیکن فلم تو پہلے قدم پر ہی سرمایہ مانگتی ہے۔ یہاں پیسہ لگانے والا تمہیں ایسی عیاشی کیوں کرنے دے گا۔ اب ہمارے ہاں۔ پہلے سرکار فلم کو Fund کرتی تھی لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں۔ دیکھ کیا سامنے ہے۔ کہ ہم سرمایے کی دنیا میں جا رہے ہیں۔ اور بزنس اور مارکیٹ کے اندھے تقاضے ہمیں بھی غلام بنائیں گے۔ تو کیا اب ہم سرئیلسٹ فلم نہیں بنائیں گے۔ نہیں۔ میرا جواب ایک زوردار نہیں ہے۔ اس لیے کہ نام نہاد حقیقت پسندی — سماجی ہو یا کوئی اور — پہ بنی سب فلمیں بھی کہاں سب ہٹ ہوتی ہیں۔ پانچ فیصد سے زیادہ نہیں۔ بیشتر تو بمشکل پیسے پورے کرتی ہیں۔ یا پھر دیوالیہ کراتی ہیں۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان حالات میں ہم جیسے سرپھروں کے لیے پھر بھی بہت امکان ہے۔ اس لیے بھی کہ مقابلہ کم ہے۔ سرئیلسٹ فلم باکس آفس پر بہت تو نہیں ہوگی۔ لیکن اچھا درمیانہ بزنس کر سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ تم جو بھی چاہے کرو۔ ناظر کے لیے صرف ایک ہے ٹھیک ٹھاک سا راستہ ضرور بنا دو۔ جس پر وہ چلتا رہے اور دائیں بائیں تمہارے خواب تماشے دیکھے

رہے۔ جیسے آہ۔ مجھے پھر ریت گھڑی کا سینی ٹوریم کی سکریننگ اور تہماری کلاس یاد آتی ہے۔
تو سینی ٹوریم میں...... جو کچھ بھی دماغ الٹانے والا ہو رہا ہے۔ ناظر کو اتنا پتہ ہے کہ جوزف
اپنے بیمار باپ کو ملنے آیا ہے۔ جو برف سے ڈھکے قبرستان کے ساتھ بنے خوفناک سینی ٹوریم
میں داخل ہے۔ اب یہ کہ وہاں وقت کو پیچھے کر دیا گیا ہے۔ اس پر ناظر کو دھچکا لگے گا۔ لیکن
تو تم چاہتے ہو۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ بہرحال تو پھر اگلے سال خزاں میں ملتے ہیں۔ کچھ بھی ڈھونڈو
اپنا سینی ٹوریم ڈھونڈو...... اور وہ بات تو اپنی جگہ ہے ہی۔ گو ہٹی ہوئی ہے۔ کہ جہاں تمہاری
بندی ہے اور پھر بھی تم بکواس کرنا چاہتے ہو تو سریلزم کا چور دروازہ تو ہے ہی...... لیکن۔ خیر
یہ تمہارا چوائس ہے...... تو ڈھونڈو کچھ بھی...... لیونا مجھے بتا رہی تھی کہ تم اپنے کوئی سکرپٹ
ڈھونڈ چکے ہو...... اور اُن سے خوش ہو۔ اُن سے کہو کہ سب خوش ہوں گے اگر تم سکرین پر
آنکھیں گاڑنے والے کو جلد ہی دکھا دو گے کہ اُس نے کہاں چلنا ہے اور تم نے کہاں چلنا
ہے؟''

سعید کمال گہری سانس لیتے ہوئے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبے خط کو ایک طرف
ہٹاتا ہے۔ ''میں نے کہاں چلنا ہے تم نے کہاں چلنا ہے'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

''کچھ بھی ڈھونڈو...... اپنا سینی ٹوریم ڈھونڈو......''

سعید کمال یک دم بے چین سا ہو کر اٹھ جاتا ہے۔ ٹہلتے ہوئے تھیٹریکل انداز میں
خود کلامی ''میرے پاس اپنا کباڑ خانہ ہے جولیس۔ ہم اسے کباڑ کمپلیکس کہیں گے۔ اور اس
کے نیچے تہہ خانہ اور تہہ خانے میں عجائب خانہ......'' ہنستا ہے۔ ''رائیٹ باقی رہا۔ دیکھنے والا
فلم دیکھنے والا...... اُس نے کہاں چلنا ہے...... تو...... تو...... تو...... جوزف جو اپنے بیمار باپ
دیکھنے سینی ٹوریم جاتا ہے...... اور سیفی fucking سیفی...... جو فلم میں ایک پُراسرار سا رول
ہے اُس fucking کریکٹر کے ساتھ جاتا ہے...... کیا یہ دو مسخرے کافی نہیں۔ viewer
سیٹ سے باندھے رکھنے کے لیے...... ''جبار جمع کرنے والا''۔ اور ارشاد کباڑیا...... پھر ''نجم
نجات دہندہ'' سے نجات کی خوشی...... مٹھائی بانٹو...... یہ تم لوگوں کے لیے سمجھنا مشکل ہوگا
جولیس۔ لیونا...... ہم لوگ جب بے انتہا خوش ہوتے ہیں تو شوگر...... میٹھی مٹھائیاں...... کھا
کھلانے لگتے ہیں...... اور جبار...... جو ایک fucking ultimate collector ہے

تاریخی مٹھائیاں ایک کتے کے جسم میں ''اکٹھی'' کر رہا ہے۔ اور اُس کتے کا نام ہوپ ہے۔ ہا۔
ہا۔ ہا۔ اب بتاؤ...... جولیس...... ٹھیک ہے لیونا...... تمہارے پاس سٹالن کی موت کی چہل قدمی
ہے۔ میرے پاس ہوپ کی چہل قدمی ہے کتا جس کے جسم میں تاریخ کٹی ہوئی ہے......''

سعید کمال گلاس اٹھاتا ہے۔ اور ایک صوفے میں دھنس کر بیٹھتے وقت سنہرا مائع
چھلک کر اُس کے اوپر گرتا ہے۔ لیکن وہ بے اعتنائی سے مسکراتا ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں دبے
جولیس کے خط کو پھر آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔

جولیس کی آواز ''باقی ہم کچھ ٹیکنیکل بات بھی کرتے ہیں۔ فلم 36.MM پر ہوگی۔
لیونا بتاتی ہے کہ تم نے کوئی بدبودار سرمایہ دار بھی ڈھونڈ لیا ہے...... لیکن فلم لو بجٹ ہی رکھو......
تا کہ اُس کا زیادہ نقصان نہ ہو۔''

(منظر بدلتا ہے)

ماسٹر یاسین اور بالی قہقہے لگا رہے ہیں۔

''سیٹھ صفدر کا جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ چمڑی اُدھیڑ دی ہے ببلی نے۔ لیکن
آگے اب اُس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔'' بالی کہتا ہے۔

''لیکن سیٹھ کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ باس کہتا ہے پیسہ اب بھی اُسی کا لگوانا ہے۔''

''اس کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ببلی نے اپنی فلم بھی بنانی ہے۔ پر یہ تو بتا۔ باس
تیرے کی طبیعت خوب صاف کی پھر شہزادے شہزادی نے؟''

''وہ اب تینوں سیٹ ہیں۔ کچھ سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ شکر ہے ورنہ میری تباہی ہو
جاتی۔'' ماسٹر مطمئن انداز میں کہتا ہے۔''

(منظر بدلتا ہے)

سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں سعید کمال، سیفی اور انیلا۔ سعید کمال اپنی مرغوب
نشست میں بیٹھا ہوا ہے اور اُس کا دایاں ہاتھ ہوا میں اُٹھا ہے اور وہ سیفی اور انیلا کی طرف
دیکھ رہا ہے۔ جیسے کسی فلم کا سٹِل فریم۔

یک دم سیفی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جامد فریم متحرک ہو جاتا ہے۔ سیفی دونوں ہاتھ
گردن کے پیچھے رکھ لیتا ہے۔

"اب...... اب...... اب...... اب......" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

"یہ بھیانک ہے چیف۔ یہ موت کی چہل قدمی۔ میں نے پہلی بار جب اس کے بارے میں پڑھا تھا تو تاثر اتنا خوفناک نہیں تھا جتنا تم نے لیونا کے نانا کی کہانی میں بتایا۔"

"تم نے پڑھا تھا......؟" سعید کمال ہونٹ سکیڑ کر پوچھتا ہے۔

"ہاں۔ آرتھر کوئیزلر کے ناول Darkness at Noon میں بھی ایسی ایک سچوایشن ہے۔ لیکن یہ...... جیسے ڈیمیٹری یمرنوف......"

"اچھا...... چھوڑو...... آگے...... آگے...... بتاؤ۔ آگے کیا ہوا...... وہ پھر آئے......" انیلا بے چینی سے کہتی ہے۔

اب سعید کمال اپنی نشست چھوڑ دیتا ہے۔ پچھلی دیوار پر اس خالی جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے بلی وائلڈر کی تصویر گر چکی ہے۔

"ہاں۔ وہ۔ آئے۔ اگلی صبح پھر آئے۔ ڈیمیٹری پہلے سے اُن کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اور پھر اس نے انہیں وہ سب کچھ کہنا شروع کیا جو وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ ایک مکمل اور آخری انکار۔ وہ انہیں کبھی بھی کسی بھی صورت وہ معلومات نہیں دے گا۔ جو انہیں درکار تھیں۔ لیکن ڈیمیٹری کہتا ہے کہ اُسے حیرت ہوئی کہ لمبے تڑنگے فوجی اور جیلر دونوں نے اس کی بات کا کچھ بھی اثر نہ لیا۔ جیسے انہوں نے اُس کی بات سُنی ہی نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم ہیں۔ پھر فوجی نے ریوالور کے اشارے سے اُسے چلنے کا حکم دیا۔ اور وہ سیل سے باہر آئے اور وہ موت کی چہل قدمی پھر شروع ہوئی۔ لیکن ڈیمیٹری کہتا ہے وہ پھر اور بھی حیران ہوا کہ گذشتہ روز کی خوفناک صبح کی سیر کے برعکس کہیں کچھ بہت مختلف تھا۔ کل کے برعکس وہ مین اُس کے پیچھے چلنے کی بجائے اس سے کافی فاصلے پر چل رہے تھے۔ اور پھر سیل سے نکلتے ہی انہوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی۔ جو فاصلہ زیادہ ہونے اور آوازیں دھیمی ہونے کے باوجود ڈیمیٹری کو جلد ہی آگاہ کر گئی کہ سٹالن کے بارے میں ہی تھی...... لیکن اُس کی فلم بینی کی عادت کے بارے میں نہیں...... بلکہ ایسی کہ جیسے سٹالن کے ساتھ کچھ ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے...... پھر...... پیشاب میں گرا۔ گارڈوں کو چھٹی۔ Baraya کے Purge سے خوفزدہ...... یہودی ڈاکٹر...... چار دن سے...... دماغ کی شریان...... جیسے

اُس کے کان میں پڑے۔ وہ بظاہر اس سے اتنے لاتعلق چل رہے تھے۔ کہ ڈیمیٹری کہتا ہے کہ وہ اگر بھاگ بھی جاتا تو شاید انہیں پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن بھاگنے کی بجائے ڈیمیٹری رک گیا اور اُن کے قریب پہنچنے پر اُس نے اُن سے پوری شدت سے کہا کہ وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں اور اُسے فوراً شوٹ کر دیں۔ جواباً جیلر کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ جو ڈیمیٹری کے لیے کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی۔ اور جیلر نے کہا "ڈیمیٹری فیصلہ موت پر ہی ہوگا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ آگے چلو۔" اور وہ پھر چل پڑے۔ ابھی وہ راہ داری میں دوسری طرف گھومے ہی تھے کہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور پھر وہ اُن کے سامنے آ گیا۔ وہ جیلر کے دفتر کا ٹیلی فون آپریٹر تھا۔ اُس نے قیدی کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر وہ الفاظ کہے "سٹالن مر گیا ہے۔"

"اوہو۔" انیلا اور سیفی کے منہ سے بیک وقت استعجابی آواز نکلتی ہے۔ سعید کمال ان کے اضطراری ردعمل پر مسکراتا ہے۔ ڈرامائی لمحہ کامیابی سے پیدا کرنے پر وہ کسی تھیٹر کے اداکار کی طرح مسرور ہے۔ وہ بلندی سے نیچے دیکھنے کے انداز میں ان دونوں پر نگاہ ڈالتا ہے۔ اور اس کی آواز بھی تھیٹریکل ہے۔

"اور اس طرح لیونا کی فلم مکمل ہو جاتی ہے۔"

سیفی کچھ کہنے کو ہے لیکن سعید کمال تیزی سے گھوم کر پلٹتا ہے اور ان کے بولنے سے پہلے پھر بولتا ہے۔

"باقی...... پھر لیونا نے سٹالن کی زندگی کے آخری چند دنوں اور اُس کی موت کے معمے پر کافی بات کی۔ وہ سب کچھ جو تاریخ کا حصہ ہے۔ اس کا نانا بعد میں خردشیف کے دور میں آنے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں رہا ہونے اور پولینڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا......

"اور اس طرح لیونا کی فلم مکمل ہو جاتی ہے۔" انیلا مسکرا کر پوچھتی ہے۔

"ہاں۔" سعید ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ "ہاں۔ سر کا بھی یہی خیال ہے۔"

سیفی بے چین سا ہو کر پھر اُٹھتا ہے۔

"بہزاد صاحب سے ہماری ملاقات کب ہوگی؟"

"میں نے تمہارا اب تک کا سکرین پلے انہیں بھجوا دیا ہے۔ باقی جب مکمل ہوگا۔ تو وہ آئیں گے۔" سعید پُرجوش لہجے میں کہتا ہے۔

انیلا سیفی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ ''میرا خیال ہے اب [illegible]
بھی ہم لوگ میلے میں جا رہے ہیں......''

''ہم بھی......'' سیفی اُس کی بات مکمل کرتا ہے۔

''چیف ہم بھاگاں والا جائیں گے۔''

''پہلے تم باقی Sequence تو مکمل کرو۔ بہزاد صاحب کو میرا خیال ہے [illegible]
مشکلات کا سامنا ہے۔''

تینوں اُٹھ جاتے ہیں۔ سیفی بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

''ہوں۔ لیکن اب دیکھنا یہ بھی ہے کہ بند کرنے والے، روکنے والے کہاں تک [illegible]
جاتے ہیں۔''

(منظر بدلتا ہے)

حکمت بہزاد کا گودام ویسا ہی نیم تاریک ماحول، شب خوابی کے لباس میں بستر پر
ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ معمول کے کھلنڈرے انداز کے ساتھ [illegible]
پریشانی اور تردد کے تاثرات بھی نظر آتے ہیں۔

بہزاد: ''تمہارا یہ سریلزم حقیقت کا کچومر ہی تو ہے۔''

دوسری طرف سعید کمال اپنے بیڈ روم، میں چہرے پر مسکراہٹ آتی ہے لیکن [illegible]
تاثر یہ ہے کہ بات کوئی بے حد سنجیدہ نوعیت کی ہو رہی ہے۔

سعید کمال: ''حقیقت کا کچومر کمال ہے سر۔''

بہزاد: ''حکمت بہزاد کو جاننے کا حق پہنچتا ہے۔ کہ سریلزم کیا بلا ہے۔''

دونوں کی بوجھل سی ہنسی۔

سعید کمال: ''ویسے اب تک تو سر ماسٹر یاسین کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ سریلزم کیا بلا ہے۔''

بہزاد: ''آہ...... میرا خیال ہے۔ اب یہ گروپ تمہارا محض سوانگیہ نہیں رہا۔ بلکہ ایک [illegible]
فلم یونٹ بن گیا ہے۔'' ''یہ فلم نہیں بن سکتی...... پراگ فیسٹیول...... ونڈرفل۔''

سعید کمال: اس گروپ کو تباہی سے بچانے والے بھی تو آپ ہی ہیں سر۔ نہیں تو وہ دونوں [illegible]
گئے تھے۔ انیلا اور سیفی۔''

بہزاد کے چہرے کے تاثرات بدلتے ہیں۔

بہزاد: ''لیکن تباہی کی دوسری شکلیں...... مکروہ شکلیں ابھی پیچھا کر رہی ہیں۔''

سعید کمال: ''اوہو...... آپ کی میٹنگ ہو گئی......''

بہزاد: ''اسی کا بتانا ہے آج تمہیں...... حقیقت کا کچومر سعید...... خواب میں، نشے میں تو
نکلتا ہی ہے۔ لیکن شدید ہیجان میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔''

سعید کمال: ''ج۔ جی سر...... جیسے شاید محبت میں۔''

بہزاد: ''ہاں...... محبت کی شدت میں تمہاری دنیا سیرئیل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے بھی
بڑھ کر غصے میں، نفرت میں اور سب سے بڑھ کر خوف میں......''

سعید کمال: ''خوف میں......'' سعید کمال خوف زدہ سے انداز میں ہی بہزاد کے الفاظ دہراتا
ہے۔''

بہزاد: ''ہاں...... خوف میں......''

سعید: ''کچھ ہوا ہے...... سر۔''

بہزاد: ''ہاں...... اور تمہیں بتانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ تم لوگ...... ہم سب لوگ......
اس میں ہیں...... یہ فلم نہیں بن سکتی یہ موسیقی نہیں بن سکتی...... یہ پینٹنگ نہیں بن
سکتی...... یہ رقص نہیں بن سکتا...... یہ تھیٹر نہیں بن سکتا...... یہ ادب نہیں بن سکتا......
بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا یہ سائنس نہیں بن سکتا...... یہ فلسفہ نہیں بن سکتا......''

سعید کمال کے چہرے پر الجھن اور پھر پریشانی ظاہر ہوتی ہے، ''لگتا ہے معاملات
کچھ گڑبڑ ہو گئے ہیں سر......''

بہزاد: ''ہاں۔ کافی زیادہ گڑبڑ ہو گئے ہیں۔ دراصل مجھے اس میٹنگ میں نہیں جانا چاہیے
تھا۔ غلطی میری اپنی تھی...... لیکن سراسر کا حکم تھا کہ اسی میٹنگ میں آ جاؤ۔''

سعید کمال: ''سراسر سر؟'' سعید کمال حیرت سے پوچھتا ہے۔

بہزاد: ''ہاں جیسے میں تمہارا سر ہوں۔ اسی طرح میرا سر بھی ہے اور بہت زیادہ سر ہے اس
لیے میں اُسے سراسر کہتا ہوں......''

سعید کمال ہنستا ہے۔

سعید کمال: ''آپ کا سینس آف ہیومر سر۔'' کوئی ردِعمل سامنے نہ آنے پر پھر خاموش ہو جاتا ہے۔

بہزاد: ''ابھی مختصر بات کروں گا۔ بات یہ ہے کہ سراسر کا مسئلہ یہ ہے کہ وہی تمہارے ''عظیم نجات دہندہ'' کے حکم پر جو بڑا نقشہ بن رہا ہے اس میں وہ سب چھوٹے موٹے بڑے لمبے۔ تکون۔ گول۔ چوکور نقشے فٹ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ سب خوش رہیں۔ That's bull shit''

سعید کمال: ''یس سر۔''

بہزاد: ''میں نے انکار کیا بھی تھا کہ وہاں ''روکنے والے'' ''بند کرنے والے'' بھی ہوں گے۔ میرا جانا مناسب نہیں ہوگا...... اس کی دلیل یہ تھی کہ بہتر ہوگا کہ ہم انہیں sound کر دیں کہ کلچر اور آرٹ کے لیے ہم کیا کرنے والے ہیں...... تم طریقے سے ان کے دماغ میں یہ بات ڈال دو۔ تو میں وہاں sound کرنے چلا گیا اور مارا گیا......''

سعید کمال: ''اوہ مائی گاڈ۔''

بہزاد: ''وہ سراسر سے دائیں طرف بیٹھا تھا میں دوسری طرف تھا۔ اس طرح ہم آمنے سامنے تھے...... اپنی باری پر میں نے بات شروع کی تھی...... اس کی عمر چالیس سے زیادہ نہیں ہوگی...... اس کے باریش چہرے کے نقوش خوبصورت ہیں۔ بال گھنے اور کچھ لمبے ہیں...... اور میں جانتا تھا کہ وہ بند کرنے روکنے والوں میں سب سے ممتاز ہے...... سراسر کے اشارے پر میں نے اپنا چھوٹا نقشہ دکھانا شروع کیا۔ سن رہے ہو...... یا سو گئے ہو؟''

سعید کمال: ''نن۔ نہیں...... نہیں سر...... بالکل نہیں۔ میں سُن رہا ہوں......''

بہزاد: ''میں نے ابھی تھوڑی بات ہی کی تھی Basically وہی بات جو میری سب کتابوں میں برسوں سے موجود ہے۔ اور پھر جیسے سراسر سے طے تھا بہت Toned down انداز میں، میں نے بات شروع کی۔ اگرچہ مجھے اپنے دوغلے پن پر نفرت ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اسے بھی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے مجھے ٹوکا...... اور حقارت سے میری بات رد کرنے کی کوشش کی...... اب مسئلہ یہ ہے سعید کمال کہ نفرت تو میں

برداشت کر لیتا ہوں بلکہ اسے اچھا سمجھتا ہوں۔ لیکن حقارت ناقابل برداشت ہے۔ تم اپنے دشمن سے نفرت کر سکتے ہو لیکن ضروری نہیں کہ حقارت بھی ظاہر کرو۔ دوسرے کی نفرت تمہارے وجود کو تسلیم کرتی ہے لیکن حقارت تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی ایک کمینی کوشش ہے لیکن اس کی سرخ سکڑی ہوئی آنکھیں میرے اوپر لمحہ بھر کے لیے رُک کر ایسے اُچٹ جاتی تھیں جیسے میں ٹی بی کے مریض کی فٹ پاتھ پر چھینکی بلغم ہوں......''

سعید کمال کا منہ بگڑتا ہے اور گہری تیز سانس لیتا ہے جو سنائی دیتی ہے۔

سعید کمال: ''او...... اوہ...... مائی گاڈ...... اف...... پھر...... پھر سر...... یہ تو......''

بہزاد: (خشک سی ہنسی ہنستا ہے) ''شدید نفرت دونوں طرف۔ غصہ دونوں طرف سے۔ لیکن قتل صرف اُس کی آنکھوں میں تھا۔ زہر اور آگ۔ پھر وہی جو میں نے تمہیں...... شروع میں کہا تھا...... دنیا سرئیلسٹ ہو گئی...... ہیجان...... Emotions۔ شاید...... شاید میں نے سراسر کو مایوس کیا...... مجھے طریقے سے...... کسی اور طریقے سے بات کرنی چاہیے تھی...... اور پھر...... میٹنگ سیاہ و سفید ہونے لگی۔ جہاں بند کرنے۔ روکنے والے تھے۔ وہاں کچھ نہ کچھ...... شروع کرنے والے...... کھولنے والے بھی تھے...... مگر وہ مصلحت سے، طریقے سے...... وہی منحوس طریقے سے بات کرنے والے تھے۔ مصلحت کے تقاضوں کے مطابق...... لیکن پھر میری مصلحت کے تالے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے...... اور پھر پتہ نہیں کیا کیا کچھ میرے منہ سے نکلا۔ اور اُس کی زرد آنکھوں میں نفرت۔ غصہ اتنا شدید تھا کہ مجھے وہیں بھسم کر دینا چاہتا تھا۔ ''ہم تمہاری یہ بدمعاشیاں۔ یہ ننگے تماشے۔ رنڈی خانے بند کریں گے۔ تم نئے کھولنا چاہتے ہو۔ یہ سومنات ہم تہہ تیغ کر دیں گے...... یہ کیمٹیں۔ یہ سی ڈیاں ہم راکھ کر دیں گے۔ فلمیں۔ گانے بجانے۔ ناچ۔ سب بند کر دیں گے......''

سعید کمال: ''بند کرو۔ بند کرو۔ بند کرو...... بند۔ بند کرو...... ساری سر......'' سعید کمال کے منہ سے اضطراری انداز میں نکلتا ہے۔

بہزاد: ''نہیں ٹھیک ہے۔ یہی ہے...... تو میں نے پھر بھی...... ویل سے تشکیل کرنے کی کوشش کی۔ وہی جو میں اپنی سب کتابوں میں کہتا رہا ہوں۔ سب جانتے ہیں...... حالانکہ...... وہاں...... یہ کوشش لایعنی تھی...... پھر بھی میں نے بتانے کی کوشش کی کہ انسان خواہ صحرا کا ہو یا سمندر کا۔ پہاڑی ہو یا میدان کا۔ گاتا بھی ہے ناچتا بھی ہے...... میں بڑی زور دار تقریر کر رہا تھا۔ اگر موسیقی کو خاموش کر دو گے رقص کو مفلوج کر دو گے تمہارے جسم کے ریشے ایک ایک کر کے اینٹھنے لگیں گے اور پھر ایک دن آئے گا جب تمہارے جسم پورے کے پورے دھماکے کی طرح پھٹ جائیں گے تم چلتے پھرتے بم بن جاؤ گے۔ لیکن مجھے اس وقت بھی یہ سب کہتے ہوئے اندر سے حیرت ہو رہی تھی کہ جیسے یہ میں نہیں بول رہا ہوں...... لیکن ہیجان کے ہر کلام میں زبان کے ساتھ کچھ ہوتا ہے۔ لیکن پھر وہ زبان سے بے قابو ہو گیا اور جسم سے بے قابو ہو گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ مجھ پر جھپٹا۔ سر اسر گارڈوں کے لیے چیخنے لگا۔ گارڈ آئے۔ انہوں نے اسے اور مجھے قابو کیا حالانکہ مجھے قابو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی...... میں نے پھر زبان استعمال کی۔ گارڈوں کی پکڑ میں وہ پھر وحشی ہونے لگا۔ سر اسر کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ میرے منہ میں تولیہ گھسیڑ دیتا...... پھر اس نے سب کو اپنی اپنی نشستوں پر واپس بٹھایا۔ اٹھ اٹھ کر سب کے پاس گیا۔ پانی وانی پلائے گئے۔ سر اسر نے اپنی ایلچی کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ اور بار بار اپنی اور ''عظیم نجات دہندہ'' کی gray ass بچانے کی کوشش کرتا رہا۔''

سعید کمال: ''یہ بہت shocking ہے سر۔'' سعید کمال کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دیتی ہے۔

بہزاد: ''Indeed...... تو سر اسر کی آنکھوں میں میرے لیے شدید قسم کی ناخوشی تھی۔ وہ اس متصادم کیفیت سے پیدا ہو رہی تھی کہ وہ بلے کو رکھے یا اس کی پیٹھ پر لات مار کر دور دفع کرے یقیناً اُسے ''عظیم نجات دہندہ'' کا بھی خوف تھا کہ ایسی صورت حال کیوں پیدا کی گئی۔ بلے نے طریقے سے بات نہیں کی...... وہ بتائے یا نہ بتائے......

سعید کمال: ''ہاں کون سر......؟''

بہزاد: ''غیر ضروری سوال مت کرو۔ بات سنو۔ اور بات بس اب ختم ہو گئی ہے۔ تقریباً......''

فرش پر ایک طرف رکھے رنگ برنگے ٹیلی فونوں میں سے اسی ایک ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنا شروع ہو جاتی ہے۔ سر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھر نمودار ہوتے ہیں لیکن اب ریسیور اٹھا کر واپس رکھنے کی بجائے وہ سننے کا فیصلہ کرتا ہے۔

سعید کمال: ''آپ کا کوئی دوسرا فون آ رہا ہے سر۔''

بہزاد: ''میں جانتا ہوں یہ کیا فون ہے۔ ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔''

ریسیور اٹھاتا ہے۔ ''ہیلو'' کہتا ہے۔ چند لمحے سنتا رہتا ہے۔ چہرے پر ایک عجیب سی تلخی کے تاثرات۔ ریسیور واپس رکھ دیتا ہے اور پھر سعید سے دوسرے ریسیور پر بات کرتا ہے۔

بہزاد: ''ہیلو۔ سعید......''

سعید کمال: ''جی سر۔ کیا ہوا سر؟''

بہزاد: ''دیکھو سعید...... سر اسر مجھے ''شاہی منجم'' کہتا ہے لیکن یہ کیسی تمہارا مجھ سے بہتر پیش گوئیاں کر رہا ہے۔ مار دو۔ مار دو...... سب مار دو...... جانتے ہو...... جو ٹیلی فون کال مجھے ابھی آئی تھی وہ کیا تھی......؟''

سعید کمال: ''ک۔ کیا سر......؟''

بہزاد: ''مار دینے کی دھمکی...... دوسری تیسری بار۔''

سعید کمال: ''او...... مائی...... گاڈ۔''

بہزاد: ''ان کا کہنا ہے...... مار دیے جاؤ گے...... ورنہ باز آ جاؤ...... وہی بند کرو۔ بند کرو۔ سب بند کرو......''

سعید کمال کا منہ حیرت سے کھلا ہے اور وہ دوسری طرف سر کی خشک ہنسی کی آواز سنتا ہے۔

3۔ انیلا، سیفی اور سعید کمال تکون نما کی نفسیاتی پیچیدگیاں

عورت مرد کی جذباتی انسانی سطح پر انیلا سیفی اور سعید کمال کے باہمی تعلقات 'محبت کی تکون' کے روایتی سانچے میں تو نہیں ڈھل سکتے۔ لیکن اس سانچے کی طرح طرح کی بدلی ہوئی بگڑی ہوئی اور بعض اوقات مضحکہ خیز شکلیں مسلسل اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتحال کے پیچھے واضح طور پر تینوں شخصیات کی نفسیاتی ساخت تو ہے ہی لیکن شاید عورت کے حوالے سے سعید کمال کی کشش۔ گریز کے جذباتی مسائل جن کی جڑیں غالباً اُس کے تصور جسمانی مسائل میں ہیں۔ تکون نمائی کی اس مسلسل جذباتی جیومٹری کو تشکیل دینے میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سیٹھ صفدر سلطان کی آمد کے بعد تکونی کیفیات ایک بدہیئت مربعے کی طرف بڑھتے بڑھتے رہ جاتی ہیں۔ یہ سب معاملات ایسے ہیں کہ واقعاتی نتائج کا واضح بیان ناممکن ہے۔ پھر بلی کی آمد اور یہ انکشاف کہ سعید کمال بھی اس باکمال خاتون کی 'معالجانہ' خدمات سے مستفید ہوتا رہا ہے۔ سوانگ پروڈکشنز کی انسانی دنیا کے مسائل کو اور بھی گھمبیر بنا دیتا ہے۔ ہمارے لیے عافیت اسی میں ہے کہ ہم اس جذباتی خلفشار میں اپنی حتمی ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے سیدھا محبت، جنس، طوائفیت کے کچومر کو آگے پھیلاتے جائیں یا ڈھریاں لگاتے جائیں۔

معاون مناظر

سیفی پھر ویسے ہی میکانکی انداز میں قدم اُٹھاتا ہے۔ ''اب۔ اب۔ اب۔ کب۔ اب ریوالور کی نالی۔ اٹھ رہی ہے۔ اب۔ اب۔ میرے خدا......'' وہ تیزی سے گھوم کر سعید کمال سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''ایک بات بتاؤ چیف۔ کیا لیونا کی یہ فلم سرئیلسٹ ہوگی۔ ویسے تو یہ سب کچھ اتنا پاورفل ہے کہ وہ اسے تاریخ میں ڈال کر سیدھی سادی فلم بھی بنا دے تو......''

''نہیں اُسے سرئیلسٹ ہی ہونا پڑے گا۔'' سعید کمال اُس کی بات کاٹتا ہے۔ ''اب میں نہیں جانتا یہ فلم ہوگی۔ یا کوئی اور۔ مجھے کل اُس کا خط ملا ہے۔''

''آہ......تو میرا خیال ہے۔ اصل بات تم اب بتانے لگے ہو۔'' انیلا کہتی ہے۔

''ہاں میرا خیال ہے......''

سعید کمال کے چہرے پر تردد کے تاثرات ابھرتے ہیں اور چند قدم میز کے قریب اٹھانے کے بعد وہ ٹہلتا ہوا کمرے کے آخری بائیں کونے تک چلا جاتا ہے اور ایک لمبی کھڑکی کے سامنے لٹکتا پردہ یک دم ایک طرف ہٹاتا ہے۔ سیفی اور انیلا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سیفی سرگوشی میں انیلا سے کہتا ہے۔

''چیف آج کچھ زیادہ ہی تھیٹریکل نہیں ہو رہا۔''

انیلا سنجیدہ رہتی ہے اور کہتی ہے۔ ''میرا خیال ہے۔ کچھ بدل رہا ہے۔ ہمارے درمیان کام کا ڈھنگ کچھ بدلنے جا رہا ہے۔''

''ہوں۔ ہو سکتا ہے جیسے اُس نے ہمیں اپنے پراگ دنوں میں شامل کیا ہے۔'' سیفی کہتا ہے۔

''میرا خیال ہے۔ اُسے احساس ہو گیا ہے کہ ایک عظیم سعید کمال بننے کے لیے اُسے ہماری بھی...... ہماری ہی ضرورت ہے۔'' انیلا کہتی ہے۔

''لیکن۔ شاید تم اب اُس کا مسئلہ نہیں رہی......شاید وہ جان گیا ہے......''

''میں اصل میں......کبھی بھی۔ ویسے اُس کا مسئلہ نہیں رہی......کوئی عورت......اس طرح اس کا مسئلہ......آئی۔ ڈونٹ نو......'' انیلا بے چین سی ہو کر بات ادھوری چھوڑ دیتی ہے۔

''تمہارا اصل عاشق سیٹھ کو رہا گیا ہے۔''

''ہر وقت بکتے نہ رہا کرو......''

''اس میں کیا ہے۔ یہ تمہارے فرائض میں شامل ہے۔ اُس گڈولیڈے کو اپنی زلفِ گرہ گیر میں الجھائے رکھنا۔ تم فلم آرٹ کے لیے قربانی دے رہی ہو انیلا۔''

انیلا سرگوشی میں ہنستی ہے۔ سعید کمال بدستور کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے۔ ''یہ کیا لفظ بولا تم نے۔ گُدو......''

''گڈولیڈا......سیٹھ صفدر سلطان کو دیکھ کر یہی آواز ذہن میں ابھرتی ہے۔''

''لیکن سیٹھ گڈو جو بھی ہے۔ تم نے نوٹ کیا۔ اچانک بہت مطمئن سا ہو گیا ہے۔ سعید کے ساتھ اس کا کوئی معاملہ جیسے طے ہو گیا ہو......''

''سب کچھ ان پچھلے دس دنوں میں ہی ہوا ہے۔ ماسٹر نے بکرا ذبح کیا ہے۔ اور

بالی اور سیٹھ کو......'' سیفی ہنستا ہے۔ ''اب میں تمہیں صفدر سلطان کے مطمئن ہونے کی اصل وجہ بتانے لگا ہوں۔ سیٹھ کو سکون کرانے کے لیے ماسٹر اور بالی اُسے ایک جگہ لے گئے تھے۔''

''سکون کرانے...... کیا مطلب......؟''

''ٹانگوں کے بیچ سکون کرانے کے لیے۔''

انیلا کے چہرے پر سرخی پھیلتی ہے اور سیفی سرگوشی میں ہنستا ہے۔ ''پہلے تم ایسی باتوں پر شرماتی نہیں تھیں......''

''میرا خیال ہے سیٹھ کو کوئی اور سکون بھی ہوا ہے...... یا کرایا گیا ہے...... دنیا بدل رہی ہے۔''

سعید کمال عمارت کے عقب میں قبرستان اور چاہ پریاں والا کے مزار کی طرف دیکھتا سر گھما کر سرگوشیوں میں مصروف انیلا اور سیفی کی طرف دیکھتا ہے ایک اُداس سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔ گہرا سانس لیتا ہے اور بلند آواز میں کہتا ہے۔

''تم ٹھیک کہتے تھے سیفی سریلزم تو ہمارے پچھواڑے میں پھیلا ہوا ہے۔''

انیلا اور سیفی تیز تیز قدم اٹھاتے اس کے پاس آتے ہیں اور وہ بھی دور باہر قبرستان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

سعید کمال ہنستا ہے۔ ''وہ تمہارا جبار جمع کرنے والا...... ابھی اس کی کتبوں کے ناموں کی گنتی مکمل ہوئی ہے یا نہیں......؟ ہا۔ ہا۔ کیا کردار ہے۔ کیا بچوائشن ہے۔ مجھے ریت گھڑی کے سینی ٹوریم کا قبرستان یاد آ رہا ہے۔''

(منظر بدلتا ہے)

''میں تمہیں تین ماہ نہیں صرف ایک ماہ دیتا ہوں۔ ''سکرین پلے کے لیے بہزاد صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔'' سعید کمال حکمیہ لہجے میں کہتا ہے۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں...... ہم اکٹھے سکرپٹ پر بیٹھتے ہیں۔ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کیا؟''

''اب تم اپنے ہر حکم کو بہزاد صاحب کا حکم نہ بنا لیا کرو۔'' سیفی انگلی اُٹھا کر تنبیہ کرتا ہے۔

انیلا سگریٹ کا دھواں آہستہ آہستہ سعید کی طرف چھوڑتے ہوئے نشیلی سی آنکھوں اور ٹیڑھی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی مخصوص Husky آواز میں بولتی ہے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں

سعید ڈارلنگ۔ لکھنا تو میں نے ہے۔ تم دونوں اپنا اپنا گھسیٹا ڈالو...... ساری حصہ ڈالو مطلب......''
اور بے تحاشہ ہنسنے لگتی ہے۔ اور سیفی روتی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

''مجھے سیٹھ صفدر یاد آ رہا ہے۔ چیف تمہیں پتہ ہے کہ ماسٹر اور بالی سیٹھ کو Below the belt سکون کروا رہے ہیں۔''

سعید کمال ہنستا ہے۔ ''Below the belt اچھا ہے۔ ہاں جانتا ہوں......''

''چنی تم۔ اب...... میرا مطلب ہے کہ تمہارے کام میں اب آسانی پیدا ہو جائے گی۔ تم اب نارمل behave کر سکتی ہو سیٹھ کے ساتھ......''

''میں پہلے بھی نارمل تھی۔ I like the game مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں اگر ایک عورت اگر...... ایڈیٹ مردوں کے Behaviour پر اثر انداز ہونے کے لیے اپنی خوبصورتی اپنے چہرے اپنی آنکھوں، آواز، پروفائل کو ذرا سلیقے سے استعمال کر سکتی ہے تو اُسے اُس کا حق پہنچتا ہے۔ اور اس میں کچھ خرابی نہیں۔ میں ایک بے جسم کی feminist نہیں ہوں......''

انیلا پیکٹ سے نیا سگریٹ نکالنے لگتی ہے۔ لیکن سیفی اُس کے ہاتھ سے سگریٹ جھپٹ کر چھیننا چاہتا ہے۔ سگریٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور دونوں میں کھینچا تانی ایک طرح کی گتھم گتھا ہونے کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔

''مرنے کا ارادہ ہے تمہارا......''

''مجھے لنگ کینسر کا کوئی خطرہ نہیں۔''

''اتنی نکوٹین سے سیکس بھی مر جاتی ہے۔''

''مرتی ہے تو مرے...... تم کون ہوتے ہو؟''

''چلو...... یار...... چلو...... بعد میں دیکھ لینا...... میرا خیال ہے اجرٹن میں بیٹھتے ہیں۔ چلو...... چلو......''

انیلا اور سیفی گہرے گہرے سانس لے رہے ہیں۔ اور پھر سب دروازے کا رُخ کرتے ہیں۔ دور کونے میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

سیفی منہ سکیڑتا ہے۔ ''میں نے تو یہاں کا نمبر کسی کو نہیں دیا ہوا......''

"میرا ہوگا۔ کچھ لوگوں کے پاس ہے۔" سعید کمال بوجھل سے لہجے میں کہتا ہوا فون کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ ریسور اٹھاتا ہے۔

"ہیلو۔ آ...... ہاں۔ راشدہ۔ نہیں یار۔ ساری۔ آئی ایم ریئلی ساری۔ آئی... نہیں...... نہیں کل بھئی...... میں ابھی اجرٹن جا رہا ہوں۔ انیلا اور سیفی کے ساتھ۔ ہاں ہاں...... ہاں بھئی...... میں نے اگلے سال پراگ فلم فیسٹول میں شامل ہونا ہے......"

انیلا اور سیفی آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔

"یہ فلم نہیں بن سکتی۔" سیفی پھر گھمبیر لہجے میں کہتا ہے۔

"بنے گی یہ فلم...... 'یہ فلم نہیں بن سکتی'......" انیلا بھی ویسے ہی لہجے میں کہتی ہے۔

سیفی اپنے بیگ میں سے گھسیٹا کاپی نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ انیلا اُسے باز رکھنے کے لیے ایک زوردار تھپڑ اُس کے ہاتھ پر مارتی ہے۔ کاپی دور جا گرتی ہے۔ "بند کرو یہ ویسے اگر یہ فلم نہ بنی گھسیٹے تو میرا بیڑا غرق ہو جائے گا۔"

"ہوں۔ میرا بھی۔ پچھلے کئی ماہ سے نہ میں نے کوئی رائٹ اپ لکھا ہے۔ نہ کوئی فلم review نہ کوئی انٹرویو۔ بمشکل ایک آدھ کالم...... بات سنو۔" سیفی نیچے گری کاپی اُٹھاتا ہے۔

"ہوں۔"

"چیف سے کہو۔ اب یہ سب کرنا ہی ہے۔ تو سیٹھ سے کچھ پیسے نکلوا کر کچھ ایڈوانس تو لگائے۔ کچھ خرچے تو نکلیں......"

انیلا مسکراتی ہے۔ "ہاں...... میرا خیال ہے یہ تو ہونا ہی چاہیے۔ بہت دیر بعد خیال آیا تمہیں۔ لیکن...... پے منٹ تو مجھے ہو گی سکرین پلے رائٹر کو۔ تم کس کھاتے میں پیسے مانگ رہے ہو۔ گھسیٹا کاری فلم رائٹنگ کی کوئی کیٹگری نہیں ہے۔ ہاں مجھ سے روز کے روز خرچی لے لیا کرنا......"

سیفی گہری سانس لے کر انیلا کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔ "چیف ہے یہاں ورنہ تمہیں بتاتا اس بات کا جواب کیا ہو سکتا ہے کس قسم کی خرچی...... لیکن نیلی...... مجھے شک پڑتا ہے کہ مجھے تم سے واقعی محبت ہو چلی ہے۔"

"مجھے تو کوئی شک نہیں......" انیلا کہتی ہے۔ دونوں سعید کمال کی آواز کی طرف

متوجہ ہو جاتے ہیں۔

"ہاں راشدہ پھر بات کریں گے۔ تھینک یو۔ بائے۔" سعید کمال کی آواز اور ریسور رکھنے کی آواز آتی ہے...... "چلیں......؟" وہ کہتا ہے۔

"چلیں۔" سیفی کہتا ہے۔ چل پڑتا ہے۔

"بابے کو اب بستر سے اٹھنا چاہیے۔ دوسرا اس گول میز کی مرمت کرانی چاہیے۔ مجھے لگتا ہے اس میز کے ساتھ کوئی خوفناک مسئلہ ہو چلا ہے۔" سیفی ایسے انداز میں کہتا ہے۔ جیسے ان سب کی گفتگو اور اُس روز کی اُس میٹنگ کا آخری نتیجہ بیان کر رہا ہو۔

(منظر بدلتا ہے)

چوک خداداد میں رات کی روشنیاں۔ رات کے گیارہ بجے کی مناسبت سے اس پارک نما چوک میں اب سرگرمیاں کچھ مختلف نظر آتی ہیں۔ دور ایک نیم تاریک گوشے میں ایک چھوٹی سی دری پر ایک شخص لیٹا ایک مالشیئے سے جسم دبوا رہا ہے۔ کچھ فاصلے پر بیرونی جنگلے کے ساتھ ایک بڑی سی ریڑھی پر پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی میں انواع و اقسام کے رنگ برنگے مربے بڑی بڑی قابوں میں سجے ہوئے ہیں اور ایک عجیب اشتہا انگیز منظر پیش کر رہے ہیں۔ نارنجی گاجریں...... گہری سبز ہریڑیں۔ پیلے آملے، سیب، بھورے رنگ کا کرنٹی کا مربہ اور غیر قدرتی سبز اور لال رنگ کے پیٹھے کے مربے۔ مربوں والا بظاہر انتہائی انہماک سے اپنے کام میں مصروف ہے۔

ایک مفلوک الحال بچہ کچھ ہی فاصلے پر حسرت سے مربوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ مربوں والا پچاک کی آواز سے انگلیاں چاٹتا ہے اور کرخت آواز میں بچے سے مخاطب ہوتا ہے۔

"اوئے۔ کیا کھڑا ہے۔ سودا لینا ہے؟" بچہ انکار میں سر ہلاتا ہے۔ "تو چل پُھٹ پھر۔" وہ بچے کو الٹے ہاتھ سے دور ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ بچہ وہیں کھڑا رہتا ہے۔ قیمتی پتھر، انگشتریاں، بیچنے والا مستان علی اپنا بکسا اٹھائے قریب سے گزرتا ہے۔ مربوں پر نظر پڑتے ہی آنکھوں میں چمک آتی ہے۔ رک جاتا ہے۔ بات کرتا ہے۔

بچہ دونوں کو گفتگو میں مگن دیکھ کر خاموشی سے ریڑھی کی طرف آتا ہے۔ پھر ریڑھی کے قریب پہنچ کر تیزی سے ایک شیرے سے تربتر لمبی مربہ گاجر اچک کر بھاگ جاتا ہے۔ چند

گاجریں گرتی ہیں۔ مربوں والا شور مچاتا ہے اور لڑکے کے پیچھے بھاگتا ہے لڑکا مالش کرانے
شخص کو روندتا بھاگتا ہے۔ اُس کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔

خدا داد چوک کے دوسرے کونے میں رزاق کے ٹی سٹال کے سامنے پلاسٹک کی
کرسیوں میں سیفی اور انیلا بیٹھے ہیں سامنے ایک ڈانواں ڈول قسم کی میز پر چائے کے برتن
پڑے ہیں۔ سیفی چائے کا ایک گھونٹ لے کر کپ واپس رکھتا ہے۔ دائیں بائیں کافی چہل پہل
نظر آ رہی ہے۔ جو دن کے وقت دیکھنے میں نہیں ملتی۔ گول گپے بیچنے والا۔ چاٹ والا۔ گھوم پھر
کر آئیس کریم بیچنے والے۔

"تو پہلا سین تو صبح کا...... یہاں کی صبح کا رکھیں گے نا؟ مٹھائی بانٹنے کا۔ اور "جبار
جمع کرنے والا۔" جمع کر رہا ہے؟" انیلا پوچھتی ہے۔ اور چاروں طرف کی چہل پہل کو حسرت
سے دیکھتی ہے۔

"نہیں ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ فلم میں ہم دکھا سکتے ہیں کہ نیا "عظیم نجات
دہندہ" دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آیا ہے...... اور پرانے "عظیم نجات دہندہ" سے نجات کی
خوشی میں لوگ شام کو یہاں چوک خداداد میں مٹھائیاں بانٹ رہے ہیں۔

چاروں طرف جائزہ لیتے ہیں۔

"اور جبار وہاں کھڑا ہے۔ فٹ پاتھ پر۔" انیلا کہتی ہے۔

"اور سیفی...... یعنی دوسرا سیفی؟"

مستان علی دانت نکالتے ہوئے یک دم ان کے قریب پہنچ کر کہتا ہے۔ بائیں ہاتھ
کی ہتھیلی پر ایک کاغذ میں ہریڑیں۔

سیفی اور انیلا ترچھی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہیں۔

"آپ...... ک...... کون؟" سیفی قدرے ہچکچاہٹ سے پوچھنے لگتا ہے پھر مستان
علی کا ڈبہ دیکھ کر جیسے سب کچھ سمجھ جانے کی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ لیکن مستان علی فوراً ہی
بول پڑتا ہے۔ "سرکار۔ بھول بھی گئے......"

ایک رنگ برنگا لباس پہنے ہیجڑا کچھ فاصلے پر کھڑا سارے منظر خصوصاً نوجوان عورت
مرد کو انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔

"سرکار...... میں نے...... ہی...... تو مور اور مور پنکھ کے نگینے جناب کو میڈم کو
پہنائے ہیں۔ وہ دیکھیں۔ واہ۔ واہ......"

مستان علی سیفی اور انیلا کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دونوں ہنس پڑتے
ہیں اور اپنی اپنی انگشتری کی انگلیاں ساتھ ساتھ کھڑی کرتے ہیں۔ ہیجڑے کی آنکھوں میں
چمک آتی ہے۔ نیون سائن کی سرخ روشنی نیلم کی نیلی شفاف سطحوں پر چمکتی ہے اور انیلا خوش ہو
جاتی ہے۔

"نیلم ویسے خوبصورت پتھر ہے۔ کیسی روشنی ہے۔"

"یہ۔ اُدھر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے؟" اور مستان بھی ہنسنے لگتا ہے۔

"جی سر جی۔ وہ۔ اُدھر...... کوئی مسکین بال۔ یتیم چھوکرا۔ غفورے مربے والے کی
ایک گاجر لے کر بھاگ گیا۔ اُسے پکڑنے میں لگے ہیں۔ پر کہاں قابو آتا ہے چھلاوہ ہے۔"

"یہ اچھا ہے۔ تو بے چارے کو بھوک لگی ہو گی۔"

"جی سر۔ جی...... سر۔ غریب مسکین بندے کا بھی مربہ کھانے کو جی کر ہی سکتا ہے
آخر۔" یک دم ہاتھ میں کاغذ پر دھری ہریڑیں سیفی کے سامنے پیش کرتا ہے۔

"سر ہریڑ کھائیں گے۔ نروئی ہوتی ہے۔"

"آہ...... نہیں...... فی الحال نہیں...... شکریہ۔" سیفی کہتا ہے۔ پھر انیلا سے مخاطب
ہوتا ہے۔ "کیا سچوایشن ہے...... غریب بچہ مربے کی گاجر چُرا کر بھاگ جاتا ہے......"

مستان پھر انہیں متوجہ کرتا ہے۔ "سر جی...... ادھر کوئی فلم بنانی ہے نا آپ نے۔
شوٹنگ ہو گی......"

سیفی اور انیلا حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر انیلا انگریزی میں
سیفی سے کہتی ہے۔

"ہم لوگوں کو کتنا Underestimate کرتے ہیں۔"

اس لمحے اچانک ہیجڑا مخصوص انداز میں تالیاں بجاتا ان کی طرف بڑھتا ہے۔

"جوڑیاں سلامت رہن۔" گانے لگتا ہے۔ "دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا۔
امڑی دے دل سہارا......"

انیلا اور سیفی دونوں بری طرح نروس بھی ہو جاتے ہیں اور قہقہے بھی لگانے لگتے ہیں۔
"بھاگو انیلا بھاگو"...... مستان علی ہیجڑے کو روکتا ہے۔
"باجی...... خوشبو باجی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی کوئی بات نہیں۔"
سیفی اور انیلا میز پر پیسے رکھ کر بھاگنے کے انداز میں ہی وہاں سے جاتے ہیں۔

(منظر بدلتا ہے)

سعید کمال کے بیڈ روم میں رات۔ دیوار پر لگی ڈالی کی پینٹنگ۔
بیداری سے ایک سیکنڈ پہلے شہد کی مکھی کی انار کے گرد اڑان سے پیدا ہونے والا خواب...... سعید کمال پینٹنگ دیکھ رہا ہے۔ چہرے پر ایک نشیلی سی مسکراہٹ۔
—— پرسکون سمندر کے کنارے سے آگے کو پھیلی ہوئی شفاف ہموار تختے اور کسی براعظم کے نقشے جیسی چٹان۔ چٹان سے ذرا اوپر گویا ہوا میں معلق ایک برہنہ محوِ خواب عورت۔ بائیں طرف سمندر کے افق کے ساتھ ایک انار سے باہر کو نکلی مچھلی کے منہ سے باہر چھلانگ لگاتا شیر ایک دوسرے شیر کے ساتھ عورت کی طرف جھپٹتا ہے۔ دوسرے شیر سے آگے عورت کے قریب ایک بندوق کی سنگین جو عورت کے بازو کو چھیدنے والی ہے۔ دائیں طرف اوپر آسمان کی بلندی میں ایک ہاتھی جس کی لمبی فلیمنگو کی پتلی ٹانگوں جیسی ٹانگیں نیچے شیروں اور عورت کی طرف آ رہی ہیں۔
سعید کمال پینٹنگ سے ہٹ کر کمرے میں چند لمحے چکراتا پھرتا ہے۔ پھر ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھاتا ہے۔ نمبر ڈائل کرتا ہے۔ دوسری طرف سے اٹینڈ ہونے پر لڑکھڑا سا جاتا ہے۔
"آ...... ہم۔ آ...... ہاں...... نائیلہ...... میں سعید...... بھئی...... سعید کمال...... کیا کر رہی ہو...... پلیز...... پلیز...... جان۔ فون بند نہ کرنا...... میرا دل بند ہو جائے گا...... ڈائیلاگ نہیں مار رہا...... میں...... پہلے...... تو...... سنو...... سنو...... مجھے معاف کر دو...... میں۔ میں۔ مانتا ہوں...... اس شام کا پروگرام...... میری وجہ سے کینسل ہوا...... میں...... مجھے پلیز۔ مجھے معاف کر دو۔ ہاں۔ ہاں...... دوسری دفعہ ایسا ہوا۔ لیکن۔ لیکن جان۔ میری۔ میری مجبوری سمجھو...... میں اپنے کیریئر کے بہت نازک دور سے گزر رہا ہوں...... اور ہاں...... وہ مجھے فلم انسٹیٹیوٹ کا ڈائریکٹر بنا رہے ہیں...... ہاں۔ ہاں۔ جان۔ بالکل۔ تھینک یو...... تم کیا

اور...... کیا...... کیا...... کیا کہا ہے کسی نے میرے بارے میں...... لیڈی کلر...... وٹ بل شٹ۔"
ریسیور کریڈل پر ڈال دیتا ہے۔ گنگناتا ہے۔ گنگناہٹ یک دم ایک گانا گانے کی صورت اختیار کر لیتی ہے—— میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند سا مکھڑا رہتا ہے—— پھر قہقہے لگانے لگتا ہے۔ What a fucking idea —— تان سین میوزک بینڈ۔ شامل باجے۔ silly۔ منہ پھلا کر یک دم بھاں۔ بھاں۔ ہاں۔ ہاں۔ کی آوازیں نکالنے لگتا ہے۔ پھر قہقہے...... جم جم جم...... کیا نام رکھے ہوئے ہیں انہوں نے۔ fucking باڈی بلڈر...... یک دم ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ سعید کمال باڈی بلڈر...... پھر سعید کمال...... پھر سعید کمال...... پھر سعید کمال...... ہا۔ ہا۔ باڈی بلڈر سعید کمال...... بائی سپس۔ میرے بائی سپس......
تیزی سے شرٹ اتارتا ہے اور بنیان اور ٹراؤزر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے چند لمحے اپنے چہرے کو گھورتا رہتا ہے۔ ناک۔ ہونٹوں۔ رخساروں۔ ماتھے کو انگلی لگا کر دیکھتا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے منہ بناتا ہے۔ پھر دونوں پاؤں فاصلے پر لے جا کر اور بازوؤں کو باڈی بلڈروں کے انداز میں دائیں بائیں پھیلا کر دائیں ہاتھ کو مخصوص انداز میں گھماتا ہے۔ بائی سپس نظر آتے ہیں جو اگرچہ باڈی بلڈروں جیسے نہیں ہیں لیکن پھر بھی نمایاں ہیں۔ پھر دوسرے بازو کے بائی سپس نمایاں کرتا ہے۔ اور آئینے میں مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے۔ پھر گاتا ہے——
دنیا دے کہاں ہے آواز میری جواں ہے۔ Something wrong there......
فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ سعید کمال بری طرح چونک جاتا ہے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ ایک نظر کلاک پر ڈالتا ہے۔ رات کا ایک بج رہا ہے۔
اس وقت کون...... وہ بڑبڑاتا ہے—— نائیلہ۔ نو۔ اتنی جلدی نہیں...... شازیہ۔ فریدہ۔ ارم۔ نازلی۔ مہوش۔ نرگس۔ ریٹا براؤن......

(منظر بدلتا ہے)

انیلا بلال کے گھر کا بیرونی حصہ۔ سرکاری رہائش کے باہر بڑی بڑی باڑ۔ ایک نیم تاریک اوٹ میں انیلا اور سیفی ہم آغوشی کے عالم میں ایک دوسرے کے ہونٹوں میں ہونٹ پیوست کیے ہوئے ہیں۔ یک دم سڑک پر سے سائیکل پر گزرتے چوکیدار کی سیٹی کی بلند آواز سنائی دیتی ہے۔ دونوں ایک جبلی سے جھٹکے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر دونوں ہی شرمندہ

سی ہنسی ہنستے ہیں۔

"یہ ہمارا...... اجتماعی لاشعور تھا شاید۔" انیلا بے یقینی سے کہتی ہے۔

"ہاں۔ چوری اور چھاپہ...... ہماری گھٹی میں بیٹھا ہوا ہے۔" سیفی کہتا ہے۔

"پڑا ہوا ہے......" انیلا تصحیح کرتی ہے۔

"ہاں...... وہی وہی...... لیکن پھر بھی ہمیں کچھ رعایت حاصل ہے۔"

"وہ کیسے؟" انیلا پوچھتی ہے پھر اپنی آواز کے بلند ہونے پر خود ہی چونک کر دوبارہ دھیمی آواز میں پوچھتی ہے۔ "وہ کیسے؟"

"اس لیے کہ ہم شوقین لوگ ہیں۔" سیفی بھی اتنی ہی دھیمی آواز میں کہتا ہے اور پھر دونوں کی دبی دبی ہنسی۔

"لیکن یہ شوقین لوگ ہیں کون...... کیسے لوگ ہوتے ہیں؟"

سیفی گہری سانس لیتا ہے۔ "آہ...... یہ بڑا مشکل سوال کر دیا تم نے یہ شوقین لوگ...... میں ذرا اپنی گھسیٹا کاپی......"

سیفی موٹر سائیکل کی طرف جانے لگتا ہے۔ انیلا تیزی سے اُس کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر واپس کھینچ لیتی ہے۔ "سیدھے کھڑے رہو۔ تماشہ بنایا ہوا ہے گھسیٹے۔"

سیفی بدستور سوچنے کے انداز میں کہتا ہے۔ "میرا خیال ہے شوقین لوگ ہمارے معاشرے۔ تہذیب کہہ لو...... کے ایسے لوگ ہیں۔ جو کچھ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ جو یوں تو...... گناہ یا جرم نہیں ہوتیں...... لیکن پھر بھی ناپسندیدہ ہوتی ہیں...... تو معاشرہ انہیں جیسے تیسے برداشت کر لیتا ہے کہ بھئی...... یہ تو شوقین لوگ ہیں...... لیکن نہیں......"

سیفی شدید بے اطمینانی سے کہتا ہے۔ "نہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ شوقین لوگوں میں......"

"اس کے علاوہ پھر ہم ہیں......" انیلا کہتی ہے اور دونوں ہنستے ہیں۔

(منظر بدلتا ہے)

سعید کمال کا بیڈ روم۔ حکمت بہزاد کا گودام۔ ٹیلی فون پر بات کر رہے ہیں۔

"سن رہے ہو......؟" سر بھاری آواز میں کہتا ہے۔ اور دیواری کلاک کی طرف نظر

اٹھاتا ہے۔

سعید ہڑبڑا کر بولتا ہے۔ اناری...... شہد۔ شہد کی مکھی۔ انار...... ساری ساری

"سر...... جی سُن رہا ہوں سر......"

"انار...... اوہو...... شاید تم...... تم نے بتایا تھا تمہارے کمرے میں ڈالی کی یہ پینٹنگ لگی ہے۔ اس میں جو nude ہے جانتے ہو وہ کون ہے......؟"

"وہ سر...... ظاہر ہے...... کوئی ماڈل ہوگی......"

"ہاں۔ ماڈل بھی تھی...... لیکن اُس کا نام گالا ڈالی تھا۔"

"اوہو...... تو کیا ڈالی کی بیوی......؟"

"ڈالی کی بیوی تو آخر میں بنی لیکن اس روسی عورت نے سرئیلسٹ موومنٹ کے کئی بڑوں کا خوب دماغ خراب کیا۔ سب سے پہلے Paul Elaust کے عشق میں گرفتار ہوئی۔ اکٹھے رہنے شادی کرنے کے بعد Max Ernest پر لٹو ہو گئی۔ دوسرے کئی سرئیلسٹس کے ساتھ بھی ہر طرح کا تعلق تھا۔ حتیٰ کہ سرئیلزم کے والد صاحب۔ آندرے بریتاں سے بھی۔ بریتاں پھر اس خاتون سے نفرت کرنے لگا۔ اور فرمایا کہ آرٹسٹس پر یہ عورت کسی طرح بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ لیکن آخر میں ڈالی پر گالا کا یہ بُرا اثر بہت دیر تک چلا۔ بڑی عمر میں بھی نوجوانوں کی دلدادہ تھی ستر سال کی ہوئی...... تو ایک راک سٹار کو لاکھوں ڈالر کے تحائف دے کر قربت حاصل کی۔ دلچسپ خاتون تھی...... ہے نا؟"

سعید کمال کی آنکھیں نیند سے بند اور حیرت سے کھل رہی ہیں۔

(منظر بدلتا ہے)

چاہ پریاں والا کے اردگرد درختوں سے دوپہر کی روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے اور قبروں اور کنویں کے قریب کھڑے سعید کمال، انیلا اور سیفی کے چہروں پر پڑ رہی ہے۔ تینوں میں اب ایک زیادہ مطمئن اشتراک کار کی فضا کا تاثر ملتا ہے۔ سیفی بات کر رہا ہے۔

"اس شخص حکمت بہزاد کو ہرا آنے والا "عظیم نجات دہندہ" اپنی نقشہ کشی کی مہم میں

شامل کر ہی لیتا ہے اور یہ اپنے وہی کلچر، آرٹ، فلم، موسیقی کے نقشے لے کر پہنچ جاتا ہے۔ میں اس کی بے حد عزت کرتا ہوں۔"

"لیکن اس دفعہ میرا خیال ہے۔ روکنے والوں، بند کرانے والوں کا موڈ کچھ مختلف ہے۔" انیلا پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہتی ہے۔

"اور ابھی آگے اور بھی مختلف ہوگا...... بلکہ بہت ہی مختلف۔" سیفی کہتا ہے۔

سعید کمال عجیب سی نظروں سے انیلا کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر ہنس پڑتا ہے۔

"کیا ہوا؟" انیلا الجھن سے پوچھتی ہے۔

"گالا ڈالی۔" سعید کمال غیر حاضر سے لہجے میں کہتا ہے۔

"کیا مطلب؟" انیلا کی الجھن بڑھ جاتی ہے۔

"کچھ نہیں۔" سعید کہتا ہے۔ اور اُس کی نظر دُور عمارتوں کی طرف سے آتے ماسٹر یاسین، بالی اور بابے خُوشیے پر پڑتی ہے۔

"یہ...... وہ پروجیکشنسٹ بھی لنگڑاتا ہوا آ رہا ہے۔" سعید قدرے ناپسندیدگی سے کہتا ہے۔

"بالی کو ماسٹر نے اسسٹنٹ کیمرہ مین رکھ لیا ہے۔ ویسے اصل میں بالی کو سیٹھ صفدر سلطان کو سکون کرانے کا چارج دیا گیا ہے۔"

"سکون کروانے۔ کیا مطلب۔ کیا ہے یہ سب؟" سعید کمال کے لہجے میں اب ہلکا سا تنفر ہے۔

"دراصل بالی نے سیٹھ کا کیس ایک جہاں دیدہ خاتون کے سپرد کر دیا ہے۔ جو مردوں کی سیانی ہے...... جہاں انیلا ناکام ہوئی وہاں وہ خاتون کامیاب ہو رہی ہے۔ محض سگریٹ پلانے سے مرد رام نہیں ہوتے۔"

"دراصل میرے اندر بس صرف اپنے حصے کی طوائف ہے۔ جیسے ہر عورت میں ہوتی ہے۔" انیلا پرسکون انداز میں کہتی ہے۔

"اور جیسے ہر مرد میں چھوٹا موٹا طوائف کا گاہک چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔" سیفی کہتا ہے۔

"ہاں" انیلا اتفاق کرتی ہے۔ "لیکن سعید میں صفدر کو مِس کروں گی۔ مجھے بہت مزہ آتا

تھا یہ سوچ کر، محسوس کر کے، کہ میری آواز، میری شکل جسم شاید انداز اس بے چارے کے اوپر کہیں کچھ اثر ڈال رہے ہیں۔ تم نے مجھے محروم کر دیا سعید۔"

سعید کمال اب جھنجھلا جاتا ہے "پتہ نہیں تم لوگ کیا کہہ رہے ہو۔"

"سیٹھ کو قابو میں رکھنے کے لیے چیف۔" سیفی کہتا ہے۔

"ہا...... ہاں...... ہاں...... وہ تو ہے۔ لیکن...... بالی...... اس میں...... اور کون ہے وہ...... عورت......"

"مردوں کی سیانی۔ ببلی۔" سیفی اعلان کرنے کے انداز میں کہتا ہے۔ سیفی کے الفاظ سن کر سعید کمال کے چہرے پر ایک غیر معمولی سی تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ منہ اور آنکھیں حیرت سے کھل جاتی ہیں اور رنگت پیلی پڑ جاتی ہے الفاظ ٹوٹ پھوٹ کر منہ سے نکلتے ہیں۔ "یہ کیا...... ب...... با۔ ببلی......" یہ کیفیت جتنی سرعت سے نمودار ہوتی ہے اتنی ہی سرعت سے غائب ہو جاتی ہے اور سعید اپنے اوپر فوری قابو پا لیتا ہے۔"

"تم اُسے جانتے ہو چیف......؟" سیفی بظاہر لاپروائی سے پوچھتا ہے۔

" How the hell can I " سعید کمال ڈانٹ کر کہتا ہے اور لہجے کا احساس ہونے پر ایک دم کھلنڈرا پن ظاہر کرنے کے لیے قہقہہ لگاتا ہے۔

"عجیب معاملات ہیں۔ دنیا...... بدل رہی ہے......" بالی۔ ببلی اور بہزاد۔ آ۔ ہا۔ یہ ہے...... تین ب کی آمد کے بعد سوانگ پروڈکشنز کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔

"تین ب......؟" انیلا جیسے جانتے ہوئے بھی پھر پوچھتی ہے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ۔

"بالی۔ ببلی اور بہزاد۔ سیفی پھر کہتا ہے۔ یہ تین ب ہیں۔ یوں تو بابا خُوشیا۔ چوتھی ب بھی ہے۔ لیکن بابا خُوشیا آندرے برتاں کی بجائے ٹرسٹین زارا کا پیروکار ہے۔ یعنی ڈاڈاِسٹ ادھر ہم گالا ڈالی کے پرستار ہیں۔ کیوں چیف؟"

"کیا مطلب۔" سعید حیرت سے پوچھتا ہے۔

"میں جانتا ہوں گالا ڈالی کون تھی!" سیفی کہتا ہے۔

"کون تھی؟" انیلا پوچھتی ہے۔ لیکن بالی، ماسٹر اور بابا قریب آ جاتے ہیں۔

''آؤ بالی...... آؤ......'' سیفی کہتا ہے۔

بالی آگے بڑھتا ہے۔ سعید کمال۔ انیلا اور سیفی میز چھوڑ کر آگے آتے ہیں۔

''بس سر سلام کرنا تھا......'' ہاتھ کے اشارے سے سعید کمال کو سلام کرتا ہے

پھر سیفی اور انیلا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر آگے جھک کر ان کے قدموں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔

''ماسٹر یاسین نے مجھے اسسٹنٹ کیمرہ مین رکھ لیا سر جی۔ میڈم...... اس فلم کے لیے

''ہیں۔ کون سی فلم؟'' سیفی شرارت سے پوچھتا ہے۔

''یہی جو بن...... رہی ہے...... سر...... بھلا سا نام ہے......'' چہرے پر مسکراہٹ۔

''کیا نام؟'' سیفی پوچھتا۔

''وہ...... سر...... وہ...... یہی...... جو فلم...... ہم نے نہیں بنائی فلم......'' نہ بچ۔ یہ فلم نہیں بن سکتی، فلم......'' پھر ہنسی پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ پھر سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتا ہے

''اور یہ ایک مزاحیہ فلم ہوگی......'' سیفی اعلان کرتا ہے۔ ''ویسے چیف بالی کی تجویز بھی قابلِ غور ہے۔ ٹائٹل یہ بھی اچھا ہے۔ ''ہم نے نہیں بنائی فلم۔ کر لو جو کرنا ہے۔'' یا ''جاؤ ہم نہیں بناتے فلم۔'' یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ سریلسٹ مزاحیہ فلم ہوگی۔''

''جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔'' انیلا قہقہے لگاتی ہے۔ ''ہم کہاں تھے سیفی......؟''

سیفی سوچنے لگتا ہے۔ سعید کمال جو اپنا سنجیدہ بارعب انداز برقرار رکھے ہوئے ہے بھاری آواز میں کہتا ہے۔

''میرا خیال ہے ہوپ...... وہ کتا...... زخمی حالت میں واپس آتا ہے۔ کباڑ خانے کی دیوار کے T.V. فریم دروازے کے رستے صحن میں داخل ہوتا ہے۔''

سعید کمال پر وہ لمحہ آتا ہے۔ جو ایک ماضی میں ایک مستقبل تھا مگر اب حال ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو سعید کمال؟'' لیونا پوچھتی ہے۔

''میں سوچ رہا ہوں۔ کہ کبھی وہ لمحہ ہوگا......''

(13)

مخمل کے چراغ اور آبنوس کا ڈنڈا

انیلا۔ سیفی سکرین پلے

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہوپ بوجھل خون آلود قدم اٹھاتا کباڑ کمپلیکس کی دیوار کے ساتھ رکھے ایک ٹوٹے پھوٹے ڈیپ فریزر کی طرف بڑھتا ہے جس کا اوپر کو اٹھنے والا ڈھکن پیچھے کو کھل کر دیوار کے ساتھ لگا ہے۔ ہوپ اچھلتا ہے۔ اُس کی کوشش سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُچھل کر ڈیپ فریزر کے اندر پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن ناکام رہتا ہے۔

جم جم جم کے برآمدے میں کھڑا غریب باڈی بلڈر سعید کمال یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ ہوپ اُچھل کر ڈیپ فریزر کے اندر پہنچنے کی کوشش میں مسلسل ناکام رہتا ہے اور اُس کے منہ سے غف غف کی آوازیں نکل رہی ہیں۔ سعید کمال کے چہرے پر کُتے کے لیے رحم کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتا ہے تو اُسے ملحقہ دیوار کے پاس میوزک سینٹر میں پیتل کا بے تحاشہ بڑا باجہ بجانے والا سبحان خان نظر آتا ہے۔ اُس نے باجے کا کُھلا منہ کباڑ کمپلیکس کی دیوار پر رکھا ہوا ہے اور وہ بھی ہوپ کی طرف افسردگی سے دیکھ رہا ہے۔

سعید کمال سبحان کے قریب آتا ہے اور دونوں ہوپ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور جلد ہی دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ سبحان کہتا ہے کہ بے چارے کُتے کی مدد کرنی چاہیے لگتا ہے ڈیپ فریزر میں جانا اُس کے لیے بہت ضروری ہے۔ سعید کمال کہتا ہے کہ ڈیپ فریزر بنانے والے کتوں کی سہولت کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ سبحان کہتا ہے کہ نہیں ایسا خیال رکھا

جاتا ہے۔ لیکن اصل میں ہوپ کا ڈیل ڈول بہت زیادہ ہے۔ جبار اسے ایسی ایسی چیزیں کھلاتا ہے جو انسانوں کو بھی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہیں۔ سعید کمال کہتا ہے "بالکل اس کا ہوپ نے ...... کچھ نہیں تو ...... مطلب ہے ...... پانچ چھ کلو مٹھائی اس کے پیٹ میں ہے۔"

شہر کا ایک چوک جس کی تمام دکانیں مٹھائیوں کی ہیں۔ لوگ ہر آنے جانے والے کو مٹھائی کھلا رہے ہیں۔ ایک شخص کھانے سے انکار کرتا ہے۔ شور مچ جاتا ہے۔ یہ نعرے "عظیم نجات دہندہ" سے نجات نہیں چاہتا۔ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ دو تین لوگ بھیجے اور شخص کو فٹ پاتھ پر لٹا دیتے ہیں وہ شخص اپنا منہ سختی سے بند کر لیتا ہے۔ منہ کھولنے کی کوششیں ناکام رہتی ہیں۔ اتنے میں سفید بالوں سفید داڑھی والا نورانی صورت بابا آجاتا ہے۔ لوگ اس کے قدموں میں گر جاتے ہیں۔ بابا کڑک کر ایک خوفناک سی آواز منہ سے نکالتا ہے۔ اٹھو سب لوگ گرتے پڑتے اٹھ جاتے ہیں۔ بابا ہاتھ کے اشارے سے پوچھتا ہے کہ ان کا مسئلہ کیا ہے۔ لوگ فٹ پاتھ پر لٹائے گئے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کچھ کھسر پھسر کرتے ہیں۔ بابا بھی کچھ کھسر پھسر کرتا ہے۔ لوگ خوش ہو جاتے ہیں اور مٹھائیوں کے ڈبے لیے فٹ پاتھ پر پڑے آدمی کی طرف پلٹتے ہیں۔ دو آدمی اچانک اس کی بغلوں میں گدگدی شروع کر دیتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر لٹایا گیا آدمی ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور لوگ اس کے منہ میں مٹھائی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ آوازیں آتی ہیں۔ "برفی ڈالو...... ڈالو۔ ڈالو...... برفی ڈالو...... ڈالو...... ڈالو...... لڈو ڈالو...... میسو ڈالو...... ڈالو ڈالو...... لڈو ڈالو......"

....

سعید کمال: "یہ نورانی بابے کا رول تو اپنا بابا خوشیا بھی کرے گا۔ یہ بس ایک ہی entry ہے۔ نہ آگے تو نہیں......"

انیلا: (مسکرا کر دیکھتے ہوئے) "کہتے ہو تو آگے ڈال دیتے ہیں۔ (اداس نظروں سے گول میز کے گرد پڑی ایک خالی کرسی کو دیکھتی ہے)۔ یہاں رہتا تھا صفدر سلطان...... I miss him کام کا مزہ ہی نہیں آ رہا۔ یہ احساس کہ تم ایک مرد کے جسم و جان میں ہل چل مچا رہے ہو۔ کتنی ذہنی توانائی دیتا تھا۔ آہ......"

انیلا سگریٹ سلگاتی ہے۔ دھواں چھوڑتی ہے۔

سیفی: "اب یہ ذہنی توانائی بجلی لے رہی ہے۔ حالانکہ اُسے اس کی زیادہ ضرورت نہیں لیکن پھر بھی اُس نے تمہارے حق پر ڈاکہ ڈال دیا ہے چنی۔ لیکن جو ہو رہا ہے فلم کے لیے اچھا ہو رہا ہے۔ بالی کہتا ہے سیٹھ اب مکمل طور پر اُن دونوں کے ہاتھ میں ہے۔ بالکل موم ہو گیا ہے۔ جو چاہے کروا لو......" سعید کمال اپنی بے چینی پر قابو پاتا ہے۔ اور بُرا سا منہ بنا کر پوچھتا ہے۔

سعید کمال: "یہ بالی...... یہ شخص کیوں اچانک...... اتنا تمہارے پیچھے لگ گیا ہے؟"

سیفی: "اُس نے صاف کہا ہے کہ یا ہم...... یعنی میں اور انیلا اُسے غلام بنا لیں...... یا پھر گولی مار دیں...... وہ ان لوگوں میں سے ہے جو جن لوگوں کو چاہتے ہیں ان کے لیے جان دے سکتے ہیں اور جنہیں نہیں چاہتے اُن کی جان لے لینا چاہتے ہیں۔ لیکن کہتا ہے مجبوری ہے قانون شانون بنے ہوئے ہیں۔ الٹے سیدھے......"

انیلا: (قہقہے لگاتی ہے) "اور جانتے ہو۔ اس کی لکڑی کی ٹانگ میں درد ہوتا رہتا ہے۔"

سیفی: "یہ بات میں مان سکتا ہوں۔ Ghost limbs"

سعید کمال: (بات بدلتے ہوئے)۔ "اچھا...... اُس بندے پر تم نے zoom in کیا...... جس کے منہ میں مٹھائی ٹھنسی ہے......"

....

فٹ پاتھ پر لٹائے گئے آدمی کا منہ مٹھائیوں سے ٹھنسا ہے۔ لگتا ہے کہ اُس کا سانس بند ہو جائے گا۔ لٹانے والے اور جکڑنے والے آدمی اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہیں تو آدمی لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے اور ایک طرف بیٹھ کر الٹیاں کرنے لگتا ہے۔

اُدھر کمباؤ کمپلیکس میں ہوپ ابھی تک اچھلنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اب اُس کی یہ کوشش اس کے جسم میں سے گزرنے والی ایک جھرجھری سے زیادہ نہیں۔ باڈی بلڈر سعید کمال کہتا ہے کہ ہوپ کے مسلز جواب دیتے جا رہے ہیں۔ اب اس کی مدد کرنی ہی پڑے گی۔ سمان پوچھتا ہے کہ اُس کے اپنے مسلز کا کیا حال ہے۔ سعید کمال کہتا ہے کہ وہ ایک انتہائی غریب باڈی بلڈر ہے اور باڈی بلڈروں کی انتہائی مہنگی امپورٹڈ خوراک افورڈ نہیں کرسکتا۔ جتنا

بھی اُسے مل جاتا ہے۔ وہ کھاتا ہے۔ لیکن نتیجہ یہ ہے کہ بائی سیپس یا ٹرائی سیپس کی بجائے اُس کا صرف ایک ہی مسل بڑھ رہا ہے۔ سبحان پوچھتا ہے وہ کون سا مسل ہے۔ جواب میں کمال اُس کے کان میں کچھ بتاتا ہے اور پھر وہ دونوں اُداسی سے ہنسنے لگتے ہیں۔ سبحان کہتا ہے کہ غریب کے لیے یہ مسل بھی بے کار ہے کیونکہ کوئی اُس کے اِس مسل کا طلب گار نہیں۔ سعید کمال کہتا ہے کہ ابھی ایک امید باقی ہے۔ ''وہ کیا؟'' سبحان پوچھتا ہے۔ سعید کمال کہتا ہے کہ میں ابھی بھی ایک ریکارڈ توڑ سکتا ہوں۔ سبحان حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ جبار انکل کہتا ہے کہ میں دنیا کا سب سے غریب باڈی بلڈر ہونے کا ریکارڈ توڑ سکتا ہوں اور پھر میرا نام اس کتاب میں آجائے گا...... ریکارڈوں والی کتاب...... سبحان خان سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتا ہے۔ اور اپنے دیوہیکل باجے کے پیتل پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے۔

سعید کمال سبحان سے پوچھتا ہے کہ بینڈ کے لوگ کدھر ہیں اور وہ اکیلا وہاں کیا کر رہا ہے۔ سبحان بتاتا ہے کہ ایک لعنتی کے جانے اور نئے لعنتی بلکہ لعنتیوں کے آنے کی خوشی میں جگہ جگہ شادیانے بجائے جا رہے ہیں اور بینڈ کی ڈیمانڈ یک دم بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے مالک نے سارے بینڈ کے تین گروپ بنا کر تین مختلف جگہوں پر بھیج دیے ہیں۔ سبحان کے گروپ کو جس جگہ بھیجا گیا وہ ایک بجلی گھر تھا لیکن منیجر نے اُسے دیکھتے ہی کہا کہ اتنے بڑے پیتل کے باجے والا بندہ اندر نہیں جا سکتا۔ اندر بجلی گیارہ ہزار وولٹ تیار ہو رہی ہے۔ تاریں اور پوائنٹ کھلے پڑے ہیں۔ یہ اندر جاتا ہے تو ضرور اس کا پیتل کہیں نہ کہیں ٹکرا جائے گا اور اگر خود بچ بھی گیا تو اس کا باجہ ضرور پگھل جائے گا اور ہم اتنا بڑا نقصان پورا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ باقی سازندے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ہی شادیانے بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بجلی گھر کے منیجر نے سبحان خان کو رکشے کا کرایہ دے دیا لیکن وہ ایک سائیکل والے سے لفٹ لے کر واپس پہنچا کیونکہ سات فٹ بڑا شامل باجہ رکشے میں نہیں آتا تھا۔

سعید کمال اپنے دونوں بازوؤں کے مسلز باڈی بلڈروں کے انداز میں نکال کر دکھاتا ہے اور کہتا ہے جب تک کسی پالیسی کے تحت ایسے ڈیپ فریزر نہیں بنائے جاتے جن میں بڑے ڈیل ڈول والے گئے بھی آسانی سے کود سکیں۔ ایسے بجلی گھر تعمیر نہیں کیے جاتے جن میں سات فٹ بڑے پیتل کے شامل باجے بلا خوف و خطر بجائے جا سکیں اور جب تک غریب

باڈی بلڈروں کے لیے سستی مقامی خوراک ایجاد نہیں کی جاتی کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ کوئی ترقی نہیں ہونے والی۔ بس ایک بھن چود جاتا ہے دوسرا بھن چود آ جاتا ہے۔ اُدھر ہوپ اب اتنا ہف چکا ہے کہ اس کے جسم کی جھرجھری بھی ختم ہو چکی ہے۔

سبحان ہنسنے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہوپ کی مدد کی جانی چاہیے وہ دیوار پر ٹکے باجے کو منہ لگا کر زور لگاتا ہے اس کا منہ فٹ بال کی طرح پھول جاتا ہے پھر یکدم بجانے سے پاں کی ایک فلک شگاف آواز برآمد ہوتی ہے۔ ہوپ پر حیرت انگیز اثر ہوتا ہے اور وہ تھوڑی سی کوشش سے ہی ہوا میں اچھل جاتا ہے۔ سبحان پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز نکالتا ہے ہوپ کی کارکردگی اور بھی بہتر ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ ڈیپ فریزر میں ضرور جا پہنچے گا۔

نیچے تہہ خانے میں بنے عجائب خانے میں ''جبار جمع کرنے والا'' ارشاد کباڑیا۔ سیٹی۔ پروفیسر صفدر سلطان اور گینز بک آف ریکارڈز کا نمائندہ جان نظر آتے ہیں۔ عجائب خانہ ایک حیرت انگیز مقام ہے جو ایک طویل ٹیڑھی میڑھی سرنگ جیسا ہے۔ سرنگ کے شروع میں ایک جگہ سے جو سیڑھیوں کے قریب ہے درختوں اور پودوں کی بڑی بڑی جڑیں اندر آ رہی ہیں۔ بڑی جڑوں میں سے نکلنے والی بے شمار چھوٹی جڑیں مختلف اقسام کے سائنسی آلات تک پہنچائی گئیں ہیں جن میں رنگ برنگے مائع اُبل رہے ہیں۔ اور گیس کے برنر جل رہے ہیں۔

پروفیسر صفدر سلطان ایک سفید ایپرن پہنے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوائنٹر ہے۔ وہ باقی چاروں افراد کو سامنے جاری سائنسی عمل کی تفصیلات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''یہ جڑیں جو آپ دیکھ رہے ہیں گلزار نرسری سے آ رہی ہیں۔ جو کہ ایشیا کی سب سے لمبی نرسری ہے۔ جان یہاں جانتا ہے۔ یہ جڑیں گوشت خور پودوں کی ہیں جو میں آپ کو بتا دوں کہ اصل میں اب آدم خور ہو چکے ہیں۔ ہم نے ایک نازک سائنسی طریقہ ایجاد کیا ہے۔ جس کے ذریعے آدم خور پودوں کا عرق نکالا جا سکتا ہے۔ اور اس عرق کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا کے کسی بھی پودے کو آدم خور بنا سکتا ہے۔ ہم دشمن کے ملک میں وہاں کے پودوں کو یہ عرق استعمال کرائیں گے اور پھر نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ دشمن نیست و نابود ہو جائے گا۔ اُس کے اپنے پودے ہی اُسے کھا جائیں گے۔ اور پھر ہم دنیا پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔

سن رہے ہو جان۔ اور یہ ہماری اپنی خرد افروزی کے بل بوتے پر ہوگا......"

جان زور زور سے اقرار میں سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے۔ "وہ تو ٹھیک ہے پروفیسر مگر دنیا پر غلبہ حاصل کرنا کیا ضروری ہے۔ کیا تمہارے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ تم اپنی خرد افروزی ... حاصل کرلو......؟"

پروفیسر صفدر سلطان غضب ناک ہو کر کہتا ہے۔ "تم نے جو کچھ خود دنیا میں کیا وہ اب ہم کرنے جا رہے ہیں تو تمہیں اعتراض ہو رہا ہے۔ اب ہماری ریکارڈ بنانے کی باری آئی ہے تو تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ نوٹ کرو۔ جلدی کرو...... کہ آدم خور پودوں کا عرق سب سے پہلے ہم نے بنایا تھا۔"

جان ہاتھ میں پکڑی ایک سلیٹ پر کچھ لکھتا ہے۔ اچانک کہیں دور سے باجے کی آواز آتی ہے اور سلیٹ جان کے ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ وہ بے حد خوف زدہ نظر آنے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ ابھی ابھی اُس نے وہ بھیانک آواز سنی ہے جس کے ذریعے اُسے بے ہوش کیا گیا تھا۔

سب اپنے اپنے کانوں کے پیچھے ہاتھوں کے پیالے بنا کر سنتے ہیں اور خود بھی دائیں بائیں گھومتے ہیں۔

باہر کباڑ کمپلیکس میں ہوپ اوپر ہوا میں اُچھلا ہوا ہے۔ سجان باجے کی پہلے سے بھی بلند آواز نکالتا ہے اور لگتا ہے کہ اب ہوپ ضرور ڈیپ فریزر میں جا گرے گا۔

تہہ خانے میں جان اور جبار یک دم شور مچاتے ہیں۔ "ہاں ہے...... پاں ہے۔ پاں ہے۔" لیکن پھر جبار کہتا ہے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ آواز تان سین بینڈ کے شال باجے کی ہے۔ شاید وہ لوگ ریہرسل کر رہے ہیں۔"

اوپر ہوپ بالآخر ڈیپ فریزر میں جا گرتا ہے وہ لمبی زبان نکال کر ہانپ رہا ہے۔ باڈی بلڈر سعید کمال اور شال باجہ سجان ہنس رہے ہیں۔ سعید کمال سجان کے کندھے پر تھپکی دے کر کہتا "یہ تم نے بہت نیکی کا کام کیا ہے۔ اب دعا کرو میرا ابھی کام آج ہو جائے اور میں دنیا کا سب سے غریب باڈی بلڈر ہونے کا ریکارڈ بنا لوں۔ میں نیچے عجائب خانے میں جا رہا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ دنیا کے سب ریکارڈوں کا حساب کتاب رکھنے والا گورا جان۔

اپنا سائنس دان پروفیسر صفدر سلطان۔ انکل جبار۔ انکل ارشاد سب موجود ہیں اور ہاں وہ اخباری نمائندہ سیفی صاحب بھی تو ہے۔ آج یہ ریکارڈ بن جائے تو کل اخباروں میں آجائے گا۔"

تہہ خانے میں اب سب انکار میں سر ہلا رہے ہیں اور ایک دوسرے کی بات تسلیم کر رہے ہیں کہ واقعی اب پاں کی کوئی آواز نہیں آ رہی۔ جان مطمئن ہو کر پروفیسر کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "ٹھیک ہے پروفیسر میں تمہارا یہ claim نوٹ کر لیتا ہوں کہ آدم خور درختوں کی جڑوں کا عرق سب سے پہلے تم لوگوں نے نکالا لیکن ایسے claim اور لوگوں اور معاشروں کے بھی ہیں۔ تم اپنی اس ایجاد...... کیا کہیں گے۔ ایجاد ہی کہیں گے یا کچھ اور۔ بہر حال...... اس کی تاریخ بتاؤ۔" پروفیسر جان کے کان میں کچھ کہتا ہے اور جان سر ہلاتے ہوئے لکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "میرا خیال ہے ریکارڈ تمہارا ہی بنے گا۔ لیکن تم ہمارا طریقہ کار جانتے ہو۔ ہم بہت سخت چھان پھٹک کر کے کسی کو کسی ریکارڈ کا اہل قرار دیتے ہیں۔" پروفیسر سب سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا ہے۔ اچانک سیفی ہاتھ کھڑا کر کے جان سے پوچھتا ہے کہ کیا اُس کے پاس عالمی ریکارڈوں کا فیصلہ کرنے کے لیے بنائے گئے قوانین وضوابط کی کوئی کاپی ہے۔ جان بتاتا ہے کہ فی الحال تو نہیں۔ دراصل ادارہ ریکارڈوں کا فیصلہ کرنے والے قوانین وضوابط ریکارڈ وقت میں بنانا چاہتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس ریکارڈ وقت میں ریکارڈ بنانے کے قوانین وضوابط بنانے کا فیصلہ کن قوانین کے تحت کیا جائے گا کیونکہ کسی بھی قسم کے ریکارڈ قائم کرنے کا فیصلہ کرنے والے قوانین تو ابھی بنے ہی نہیں۔ سیفی تسلیم کرتا ہے کہ واقعی یہ ایک عجیب وغریب صورت حال ہے۔ اس دوران پروفیسر بار بار کوئی بات شروع کرنا چاہتا ہے لیکن کر نہیں پاتا۔ اس کا منہ کھل کھل کر بند ہوتا ہے۔ آخر سیفی بات ختم کرتا ہے تو پروفیسر کہتا ہے۔

"اس کے علاوہ جان ہم نے ایک اور حیرت انگیز آلہ ایجاد کیا ہے۔ اور جو مکمل طور پر انسانیت کی فلاح کے لیے ہے۔ اب ایسا نہیں کہ ہم اپنی خرد افروزی کو صرف دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہی استعمال کریں گے۔" یک دم ایک تقریری سا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ "جان۔ تم جانتے ہو کہ اپنی کمر پر خود خارش کرنا بنی نوع انسان کے لیے ہمیشہ سے ایک بہت مشکل مسئلہ رہا ہے۔ انسانی کمر پر بعض نامعلوم مقامات ایسے ہیں کہ انسانی ہاتھ کسی طرح بھی وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اب اگر ایسے مقامات کسی نامعلوم حیاتیاتی تبدیلی کو

وقتی کی وجہ سے خارش کا منبع بن جائیں تو بنی نوع انسان کسی طرح بھی محض اپنے ہاتھوں کے بل بوتے پر اُس خارش کو رفع نہیں کر سکتی۔ یعنی کھجلا نہیں سکتی۔ ہم ہزار کوشش کرتے ہیں لیکن خارش زدہ مقام تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ انسان عاجز آ جاتا ہے لیکن خارش نہیں جاتی۔ ہاں ایسی حالت میں کوئی دو افراد اس طرح کا عمرانی معاہدہ کر سکتے ہیں کہ ''تم میری کمر کھجلاؤ میں تمہاری کھجلاتا ہوں۔ لیکن جہاں اس طرح کے معاہدے کے شرم ناک پہلو کسی کی نظر سے اوجھل نہیں وہاں یہ پوری طرح مؤثر بھی نہیں۔ کسی دوسرے کو اپنی کمر کے خارش زدہ مقام کا صحیح تعین کروانا تقریباً ناممکنات میں ہے۔ خیر۔ لیکن جان اب ہم نے یہ آلہ ایجاد کر کے انسانیت کے اس دائمی دکھ کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا ہے۔''

پروفیسر صفدر سلطان سُرنگ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ہر طرف رکھی الماریوں میں سے ایک الماری کھولتا ہے اور وہاں سے ایک پلاسٹک کا بنا لمبا چھڑی نما آلہ نکالتا ہے۔ جس کے ایک طرف سٹین لیس سٹیل کا ایک چھوٹا سا انسانی ہاتھ بنا ہے اور جس کی لمبائی چار انگل اور چوڑائی تین انگل ہے۔ چھڑی جس کی دوسری طرف کچھ گھمانے والے کنٹرول لگے ہیں، جن سے ہاتھ کُھل سکتا ہے، دائیں بائیں گھوم سکتا ہے اور تیزی سے اوپر نیچے حرکت کر سکتا ہے۔ پروفیسر آلے کی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اُسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اپنی شرٹ کے پیچھے گردن کے نیچے کمر کی طرف داخل کرتا ہے۔ میکانکی ہاتھ اب کمر اور شرٹ کے درمیان میں ہے۔ پروفیسر گھوم کر جان کو دکھاتا ہے۔ پھر پروفیسر دائیں ہاتھ سے کنٹرول گھمانے لگتا ہے۔ شرٹ کے اندر کمر کی جلد پر آلے کے میکانکی ہاتھ کی کئی طرح کی حرکات کا آسانی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر خارش کر کے بہت مزے میں نظر آتا ہے اور اُس کی آواز سے یہ کیفیت جھلکتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''اب مثلاً دیکھیں اس وقت خارش میرے دونوں کندھوں کے درمیان میں مگر نیچے تقریباً دو مربع انچ جگہ میں ہو رہی ہے جہاں میرا دایاں یا بایاں کوئی بھی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہ...... دیکھیں...... یہ......'' وہ کنٹرولنگ ناب گھماتا ہے اور اس کے منہ سے آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ ''آآآآ...... آئے آ......''

جان بے حد متاثر ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ ''لگتا ہے پروفیسر تمہیں بہت مزہ آ رہا ہے۔ کھجلانا عمل ہی ایسا ہے۔ مجھے بھی دو۔ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ایک ایسی جگہ خارش ہو رہی

ہے جہاں بدقسمتی سے میرا ہاتھ آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے اور یہ ایک علمی سوال ہے۔ کیا خارش کرنے والا یہ آلہ ایسی جگہوں پر خارش کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جہاں انسانی ہاتھ سے براہ راست بھی خارش کی جا سکتی ہے۔''

پروفیسر حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور عقل میں ڈوبی سوچ بھری متعجب آواز میں کہتا ہے۔ ''واقعی یہ ایک علمی اور نظری سوال ہے۔ تعجب ہے کہ آج تک میرے ذہن میں یہ سوال نہ آیا۔ لیکن کمال ہے دیکھ لو ہماری اپنی خرد افروزی پر مبنی ٹیکنالوجی کس طرح کے نئے نئے تھیوریٹیکل سوالات سامنے لا رہی ہے۔''

سیفی پوچھتا ہے۔ ''پروفیسر کیا ہم اسے خارشی خرد افروزی اور خارشی ٹیکنالوجی کہہ سکتے ہیں؟''

''بالکل کہہ سکتے ہیں'' پروفیسر روانی میں کہہ جاتا ہے لیکن پھر بُری طرح چونکتا ہے اور غصے سے سیفی کی طرف دیکھتا ہے ''کیا کہا تم نے...... تم...... تم...... ہماری اپنی خرد افروزی کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم خرد دشمن مولویوں سے بھی بدتر ہو۔ تمہارے پاس تمسخر اور ٹھٹھے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ تم چاہتے ہی نہیں کہ ہم اپنی عقل و خرد استعمال کر کے اپنی سائنس حاصل کر کے دنیا پر غلبہ حاصل کر سکیں...... تم۔ تم۔ تم۔'' پروفیسر کا سانس رکنے لگتا ہے۔

سیفی بُری طرح نروس ہو جاتا ہے اور چیخ کر کہتا ہے ''نہیں۔ نہیں۔ پروفیسر میرا مطلب یہ نہیں۔ مجھے غلط نہ سمجھو......''

اسی دوران جان پروفیسر کے ہاتھ سے خارش کرنے کا آلہ لے لیتا ہے اور اپنی شرٹ کے سامنے کے بٹن کھول کر میکانکی ہاتھ کو کہیں نیچے کی طرف حرکت دیتا ہے۔

اچانک سیڑھیوں میں سے نیچے اترتا سعید کمال رُک کر اندر دیکھنے لگتا ہے اور پھر اپنی شرٹ اتار کر باڈی بلڈروں کے انداز میں اپنے مسلز دکھانے لگتا ہے...... کہیں دور سے تالیوں کی آوازیں آتی ہیں۔

جان خارشی آلے کے کنٹرولز کو گھما رہا ہے اور قہقہے لگا رہا ہے۔ ''پروفیسر یہ تو۔ یہ تو کمال ہے۔ اسے تو ہم خارش کے علاوہ اور بھی کئی مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ آ۔ ہا۔ آ۔ ہا۔ آ...... آؤ......'' پھر یک دم جان بُری طرح چیخنے لگتا ہے اور اس کا چہرہ کسی اذیت سے

بگڑ جاتا ہے۔ ''آ...... اوچ۔ آو......''

باڈی بلڈر سعید کمال مسلسل مسلز دکھا رہا ہے۔

جان چیختے ہوئے کہتا ہے۔ ''اُس نے...... اُس نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ او مائی گاڈ...... Help Help SOS...... May day. May day ۔ پروفیسر۔ مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ۔'' پروفیسر کے چہرے پر ایک پُر فکر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ جان کی کوئی فوری مدد کرنے کی بجائے وہ سیفی کو جھنجھوڑ کر کہتا ہے۔ ''دیکھا۔ دیکھ رہے ہو۔ جان خدا کو یاد کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خرد افروزی ہمیں بھی مذہب سے دور نہیں لے جائے گی۔ یہ بالکل غلط سوچ ہے کہ عقل اور سائنس مذہب سے دور لے جاتی ہیں۔''

سیفی زور زور سے اقرار میں سر ہلاتا ہے۔ ''بالکل۔ بالکل...... پروفیسر بالکل۔ بے شک۔ لیکن اس بے چارے کی مدد تو کرو۔''

پروفیسر بہت اطمینان سے آلے کا ایک کنٹرول گھما کر آلہ جان کی شرٹ سے باہر نکال لیتا ہے اور کہتا ہے۔ ''جان تمہیں پہلے اس کا طریقہ استعمال سیکھنا ہوگا۔ میں تمہیں اس کے استعمال کا پورا مینول دوں گا۔''

جان خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ''میں تمہاری اس ایجاد کو نوٹ کر لیتا ہوں پروفیسر اور اگر کسی نے اسے تم سے پہلے ایجاد نہیں کیا تو یہ تمہارا ریکارڈ ہوگا۔ لیکن میرے پاس وقت کم ہے میں نے ابھی دنیا کی کئی دوسروں جگہوں کو بھی جانا ہے۔ تم مجھے جلد اپنے دوسرے ریکارڈ بھی دکھا دو۔'' جان بے چینی سے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے پھر فخریہ انداز میں سب کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ ''جانتے ہو یہ دنیا کی واحد گھڑی ہے جس کا ہر پرزہ 29 فروری کے دن بنایا گیا ہے۔ اس کو بننے میں چوبیس سال لگے اور اسے ہر چار سال بعد چابی دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔''

سب حیرت سے گھڑی کی طرف پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سعید کمال شرٹ پہنتا ہوا سب کے قریب آ جاتا ہے۔

''تمہارے باقی ریکارڈ پلیز؟'' جان پھر کہتا ہے۔ پروفیسر صفدر سلطان۔ ارشاد کباڑیا اور جبار جمع کرنے والا آپس میں کھسر پھسر کرنے لگتے ہیں۔ پھر پروفیسر کہتا ہے۔

''جان جیسا کہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو ہمارے ریکارڈز تین طرح کے ہیں۔ پہلی قسم۔ ایسا جو آج تک کسی نے جمع نہ کیا ہو۔ یہ کباڑ کمپلیکس کے پروپرائیٹر ارشاد کباڑیا اور اُن کے فیلڈ ورکر ''جبار جمع کرنے والا'' کا کارنامہ بلکہ کئی کارنامے ہیں۔ کئی حیران اور پریشان کر دینے والی چیزیں ان الماریوں میں جمع کی گئی ہیں جو ابھی تمہیں دکھائی جائیں گی۔ دوسری قسم ریکارڈز کی وہ ہے جو سب سے زیادہ...... سب سے کم۔ سب سے بڑا۔ سب سے لمبا۔ سب سے چھوٹا...... وغیرہ کا ہے......لڑکے آگے آ...... آگے آ لڑکے...... پروفیسر ڈپٹ کر سعید کمال کو آگے بلاتا ہے اور جان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس لڑکے کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ غریب یعنی غریب ترین باڈی بلڈر ہے۔''

جان حیران رہ جاتا ہے۔ ''حیرت ہے۔'' وہ بڑبڑاتا ہے۔ ''دنیا کا سب سے زیادہ غریب باڈی بلڈر۔ پروفیسر میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک چوتھی قسم کا ریکارڈ بھی بنا رہے ہو۔ سب سے زیادہ نئی قسم کے ریکارڈ سوچنے کا ریکارڈ۔ شاندار۔''

پروفیسر جان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اور کچھ عاجزانہ اور کچھ فخریہ لہجے میں کہتا ہے۔ ''اور جان تیسری قسم وہی ہے یعنی دنیا میں پہلی بار، جس کی دو مثالیں تم پہلے بھی دیکھ چکے ہو۔ یعنی ہماری ''اپنی سائنسی تحقیق کا نتیجہ'' جان کی آنکھیں چمکتی ہیں اور منہ کھل جاتا ہے۔ ''اوہو یعنی آدم خور درخت کی جڑوں کے عرق اور خارش کرنے والے آلے کے علاوہ بھی کچھ ہے؟''

''بالکل۔ اور بہت اہم۔ بلکہ انقلابی......'' پروفیسر پراسرار سے لہجے میں کہتا ہے۔

پروفیسر سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکتا ہے اور سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ ''جان ابھی تک ہم ایک لحاظ سے حیاتیاتی سائنسز کی دنیا میں تھے لیکن اب میں طبیعات کے میدان میں اپنا کام سامنے لانے والا ہوں۔ جان میرا دعویٰ ہے کہ میں نے دنیا میں پہلی بار جنات کی طاقت سے بجلی پیدا کی ہے۔''

جان پروفیسر کی بات سُن کر لڑکھڑا سا جاتا ہے۔ سنبھلتا ہے۔ منہ حیرت سے کُھلا ہے۔

''جنات...... تمہارا مطلب ہے الف لیلہ...... او مائی گاڈ...... جنات کی طاقت سے بجلی...... پروفیسر اگر تم نے واقعی ایسا کر لیا ہے تو سمجھو گینز بک آف ریکارڈز میں تو تمہارا نام آئے گا ہی...... تم فزکس میں نوبل پرائز بھی حاصل کرو گے۔ او مائی گاڈ...... اس سے سائنس

میں ہی نہیں پوری دنیا میں انقلاب آ جائے گا۔" پروفیسر پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"تو جان تم پہلے کون سا ریکارڈ قائم ہوتا دیکھنا پسند کرو گے؟"

جان کہتا ہے۔ "پہلے تو یہی دکھاؤ نا جنات سے بجلی...... او مائی گاڈ...... یہی دکھاؤ ایک تمہاری کیٹگری بھی مکمل ہو جائے گی۔"

پروفیسر کہتا ہے۔ "یہ ہماری اپنی خرد افروزی کا ادنیٰ سا نمونہ ہے اور سو فی صد ہماری اپنی سائنسی تھیوری پر مبنی ایجاد ہے۔ لیکن جان پہلے مجھے تمہیں اس کی کچھ بنیادی فزکس سمجھانی ہوگی...... آؤ۔"

سب چلتے ہوئے ایک کلاس روم میں آ جاتے ہیں بلیک بورڈ پیچیدہ ریاضیاتی مساواتوں سے بھرا ہوا ہے۔ پروفیسر بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "یہ ہے۔" پھر ہنستا ہے۔

"تم نہیں سمجھو گے لیکن ڈرو نہیں میں تمہیں سادہ زبان میں جناتی بجلی کی کوانٹم الیکٹرو سٹیٹکس سمجھا دیتا ہوں۔" میز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں ایک لکڑی کے بورڈ پر دو پیتل کے چراغ ساتھ ساتھ نصب کیے گئے ہیں۔ چراغوں کی بیرونی سطح پر مخمل کا کپڑا منڈھا ہوا ہے۔ پاس ہی ایک آبنوس کا سیاہ ڈنڈا پڑا ہے۔ "جان تم جانتے ہو کہ جناتی طاقت لے بجلی پیدا کرنے کے لیے سب سے عمدہ رول ماڈل جن جس پر سب ہی متفق ہیں اور جسے سب ہی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سالوں سے بخوبی جانتے ہیں الٰہ دین کے چراغ کا مشہور و معروف جن ہے۔" "بالکل۔ بالکل ہے۔" جان چلاتا ہے۔ اور پروفیسر پوچھتا ہے۔ "اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ الٰہ دین اس جن کو بلاتا کیسے تھا؟" خاموشی کا ایک وقفہ جس میں جان ہونقوں کی طرح منہ کھولے پروفیسر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پروفیسر تیزی سے بول پڑتا ہے۔ "میں بتاتا ہوں۔ چراغ کو رگڑنے سے۔" جان زور زور سے سر ہلانے لگتا ہے۔ "بالکل۔ بالکل۔ یہ ہے۔ رگڑنے سے۔"

پروفیسر اپنا لیکچر جاری رکھتا ہے۔ "بالکل ٹھیک۔ رگڑ سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اور میری تھیوری یہ ہے کہ الٰہ دین کے چراغ کو رگڑنے سے پیدا ہونے والی بجلی ہی اصل میں جن ہے۔ جن برقی توانائی کی بعد الطبیعاتی تجسیم ہے...... جناتی مابعد الطبیعاتی کا طبیعاتی مظ

نزول دراصل برق سکون سے برق رواں کی طرف...... لیکن یہ تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔ سب کچھ میرے ریسرچ پیپر میں آ جائے گا...... میں تمہیں کاپی بھجوا دوں گا۔ میرا خیال ہے ہم اصل مظاہرے...... کی طرف توجہ دیتے ہیں۔"

جان عجیب بوکھلاہٹ کے عالم میں تالیاں بجانے لگتا ہے۔

"اب دیکھو۔" پروفیسر آبنوس کے ڈنڈے کو پیتل کے چراغوں کی مخملی سطح پر زور زور سے رگڑنے لگتا ہے۔ دونوں چراغوں کے منہ ایک دوسرے کے بے حد قریب ہیں۔ کچھ دیر رگڑنے کے بعد پروفیسر سعید کمال کو حکم دیتا ہے۔ "لڑکے...... ادھر آ......"

سعید کمال حیرت سے گھوم کر پیچھے دیکھتا ہے کہ جیسے پروفیسر اُسے نہیں بلکہ کسی اور کو بلا رہا ہے۔

پروفیسر کڑک کر کہتا ہے۔ "میں تجھے ہی کہہ رہا ہوں۔ دنیا کے غریب ترین باڈی بلڈر ادھر آ......"

سعید کمال خوف زدہ ہو کر زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگتا ہے۔ پروفیسر جبار اور ارشاد کو اشارہ کرتا ہے۔ دونوں جھپٹ کر سعید کمال کو دائیں بائیں سے جکڑ لیتے ہیں، پروفیسر مطمئن ہو کر سر ہلاتا ہے اور پھر چراغوں کے درمیان بہت چھوٹی سی خالی جگہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ مزید اشارے کرتا ہے۔ ارشاد اور جبار سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتے ہیں اور سعید کمال کو دھکیلتے ہوئے چراغوں کی طرف لاتے ہیں۔ سعید کمال چیختا ہے۔ "نہیں۔ نہیں۔ تم میری انسانی قربانی نہیں دے سکتے۔ میرا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں آنے والا ہے۔ میں ملک و قوم کا نام روشن کرنے والا ہوں۔ میں دنیا کا سب سے غریب باڈی بلڈر بننے والا ہوں۔"

پروفیسر صفدر سلطان سعید کمال کو یقین دلاتا ہے کہ چونکہ جان خود وہاں موجود ہے اس لیے اُس کا ریکارڈ ضرور بنے گا لیکن پہلے اُسے اپنی تہذیبی سائنس کی مدد کرنی ہوگی۔

پروفیسر پھر آبنوسی ڈنڈے سے چراغوں پر منڈھے مخمل کو زور زور سے رگڑتا ہے حتیٰ کہ اُس کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ پھر وہ جبار اور ارشاد کو اشارہ کرتا ہے۔ وہ دونوں سعید کمال کا دایاں ہاتھ اچھی طرح جکڑ کر اُس کی انگشت شہادت پکڑ کر چراغوں کی درمیانی خلا میں داخل کر دیتے ہیں۔ یک دم ایک نیلگوں سپارک نکلتا ہے اور ترچ کی آواز آتی ہے۔

سعید کمال، ارشاد اور جبار تینوں کے منہ سے چیخ نکلتی ہے۔ اور سب نیچے گر کر تڑپنے لگتے ہیں۔
جان بُری طرح بوکھلا جاتا ہے۔ جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں۔ ''او مائی گاڈ۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔۔''

پروفیسر فتح مندانہ انداز میں ہنستا ہے۔ ''یقیناً یہ یادِ الٰہی کا وقت ہے۔ تم نے دیکھا جان یہ سائنس۔ مذہب اور فلسفے کا وہ اعلیٰ امتزاج ہے جس کی ہمیں ہمیشہ تلاش رہی ہے۔ خیر اس پر میں الگ ایک مقالہ لکھوں گا۔۔۔۔ ہم۔ اصل درپیش صورت حال کی طرف آتے ہیں۔''

۔۔۔۔۔ دیکھو۔ انہیں ایک لاکھ الیکٹران وولٹ کا جھٹکا لگا ہے۔ لیکن صرف ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے۔ رگڑ سے صرف دو چراغوں سے اتنی بجلی۔۔۔۔ اندازہ کرو۔۔۔۔ یہی اصل میں جن ہے۔ اندازہ کرو۔۔۔۔ اگر لاکھوں چراغ بیک وقت لاکھوں آہنی ڈنڈوں سے رگڑے جائیں تو کس قدر بجلی حاصل ہوگی۔۔۔۔''

جان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہیں۔ ''شاندار۔ بے انتہا۔''

''اب آگے سنو۔'' پروفیسر اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ ''ایک ٹیکنیکل مسئلہ ہمارا اب اس بجلی کو جاری رکھنا ہے۔ یعنی چراغوں کو مسلسل رگڑتے رہنا ہے۔ اور یہ بہت معمولی کام ہے تمہاری مکینیکل انجینئرنگ یہاں ہم استعمال کریں گے۔ چراغوں کو رگڑنے والی مشینیں بنائی جائیں گی۔۔۔۔ اور اس طرح ہر معاشرہ توانائی کے میدان میں خودکفیل ہو جائے گا۔''

جان بے اختیار ہو کر پھر تالیاں بجانے لگتا ہے۔ ''کمال ہے۔ پروفیسر تمہاری خرد افروزی اور اس پر مبنی سائنس اور جناتی ٹیکنالوجی نے مجھے ششدر کر دیا ہے۔ یقیناً اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو بہت جلد تم دنیا پر غلبہ حاصل کر لو گے۔ لیکن میں اب بھی کہتا ہوں۔۔۔۔ غلبے کو اہمیت نہ دو۔۔۔۔ تم۔۔۔۔ اپنی۔۔۔۔''

''تاکہ۔۔۔۔ تمہارا غلبہ برقرار رہے۔ ہوں؟'' پروفیسر جان کی بات کاٹتا ہے۔

جان تشویش سے فرش پر گرے تینوں افراد کی طرف دیکھتا ہے جن کا تڑپنا اب بند ہو چکا ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ ''کیا یہ مر چکے ہیں؟''

پروفیسر مزاحیہ سی بوکھلاہٹ کے انداز میں جان کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ ''او۔ جان کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تینوں ابھی لوٹ پوٹ کر اٹھ جائیں گے۔'' اور واقعی اسی وقت وہ تینوں اُٹھ جاتے ہیں اور پاؤں پر کھڑے کھڑے چاروں طرف گھوم کر پہلی حالت میں واپس آ جاتے ہیں۔

یک دم ''جبار جمع کرنے والا'' شور مچانے کے انداز میں جان سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''جان۔ بس اب ہماری باری ہے۔ آخر تمہیں یہاں بلانے، رہائش، کھانے اور شراب کا خرچہ کباڑ کمپلیکس نے اٹھایا ہوا ہے۔ اب تمہیں ہماری جمع کی ہوئی حیرت انگیز کولیکشنز اپنی کتاب میں درج کرنی ہوں گی۔''

جان کہتا ہے۔ ''بالکل۔ بالکل۔۔۔۔ میں اپنی ذمہ داریاں سمجھتا ہوں۔ لیکن پروفیسر بھی تو۔ تمہارے عجائب خانے۔ کباڑ کمپلیکس کا حصہ ہے۔''

ارشاد کہتا ہے۔ ''بے شک۔ بے شک۔ ہمیں پروفیسر صفدر سلطان صاحب کی ایجادات اور سائنسی نظریات پر فخر ہے۔''

پروفیسر جو محدب عدسے سے سعید کمال کی انگلی کو چیک کر رہا ہے کہتا ہے۔ ''لیکن ارشاد کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جان پہلے اس لڑکے کے ریکارڈ ''دنیا کا غریب ترین باڈی بلڈر'' کا کوئی فیصلہ کر لے؟''

''دنیا کا سب سے نیک باڈی بلڈر'' یک دم سعید کمال غصے سے چیخ کر کہتا ہے اور پھر بار بار کہنے لگتا ہے۔ ''دنیا کا سب سے نیک باڈی بلڈر۔ دنیا کا سب سے نیک باڈی بلڈر۔۔۔۔''

پروفیسر، جان، سیفی، ارشاد اور جبار سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ سیفی جو خارشی ٹیکنالوجی کے ریمارک پر پروفیسر سے ڈانٹ کھانے کے بعد اب تک خاموش تھا یک دم متحرک ہو جاتا ہے اور سیدھا ایک نیم تاریک کونے کی طرف جاتا ہے اور مکڑی کے جالے ہٹا کر پیچھے سے ایک کیمرہ اور ٹیپ ریکارڈر اُٹھاتا ہے اور ان کی جھاڑ پونچھ کرنے لگتا ہے۔

جان حیرت سے پوچھتا ہے۔ ''میرے خدا یہ اب کیا کہہ رہا ہے؟ دنیا کا سب سے زیادہ نیک باڈی بلڈر۔۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔۔ پروفیسر یہ کیا ہے؟''

سیفی دھڑا دھڑ تصویریں بنانے لگتا ہے۔ فلیش لائیٹ بار بار چمک کر سب کچھ روشن کر دیتی ہے۔

پروفیسر تاسف سے سر ہلاتا ہے اور کہتا ہے۔ ''میرا خیال ہے جناتی رگڑائی نکل کر
اس نوجوان کے دماغ کا کوئی سرکٹ اڑا دیا ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ غریب کی بجائے سب
سے زیادہ نیک باڈی بلڈر بننے کی خواہش کرنے لگا ہے۔''

سیفی مائیک لیے جان کی طرف بڑھتا ہے اور مائیک میں پہلے خود بولتا ہے۔
''جان۔ یہ ایک عجیب وغریب صورت حال ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟''

جان مائیک تھامتا ہے پھر تیزی سے پرے ہٹا کر رازداری سے پوچھتا ہے۔ ''یہ
ریکارڈ ہو رہا ہے؟'' سیفی کہتا ہے۔ ''یقیناً ایسا ہی ہے۔''

جان پھر مائیک تھام کر بہت ذمہ دارانہ لہجے میں بتانے لگتا ہے کہ اب اُسے بیلا کور
سے دوبارہ رابطہ قائم کرنا پڑے گا اور اپنے ایکسپرٹس سے پوچھنا پڑے گا کہ آیا دنیا کا سب سے
نیک باڈی بلڈر کی کیٹیگری کو ریکارڈ کے لیے شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن جب تک
اجازت مل نہیں جاتی ہم کباڑ کمپلیکس کے کولیکشنز کے ریکارڈ کو چیک کر لیتے ہیں۔ سب لوگ
ارشاد اور جبار کی طرف دیکھتے ہیں۔

ارشاد کباڑیا تیزی سے آگے بڑھ کر بلیک بورڈ کے سامنے رکھے ڈائس کے پیچھے جا
کھڑا ہوتا ہے اور تقریر کرنے لگتا ہے۔ سیفی تصویریں بنا رہا ہے۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ میں ارشاد کباڑیا پروپرائیٹر کباڑ کمپلیکس آپ سے مخاطب
ہوں آج کا دن ہمارے لیے نہایت اہم ہے کیوں کہ یہ ہمارے خوابوں کی تعبیر کا
دن ہے۔ آپ پوچھیں گے کون سے خواب اور کون سی تعبیر۔ بھلا ایک کباڑ کمپلیکس
کے کیا خواب ہو سکتے ہیں۔ دیکھیں صورت حال یہ ہے کہ ہم نے ایک چھوٹے
سے کباڑ خانے سے اپنی جدوجہد...... جدوجہد...... نہیں میرا خیال ہے جدوجہد نہیں
کہنا چاہیے...... تو پھر کیا کہنا چاہیے۔ کیا کہنا چاہیے۔ کیا کہنا چاہیے...... خواتین و
حضرات تو پھر کیا کہنا چاہیے۔ ایک منٹ ٹھہریں...... دیکھیں میرا تجربہ بتاتا ہے کہ
جب انسان کو یہ پتہ نہ چلے کہ اُسے کیا کہنا چاہیے تو اُسے شیکسپیئر سے رجوع کرنا
چاہیے۔ تو میں بات کر رہا تھا خوابوں کی اور اس کباڑ کمپلیکس کی جو آپ دیکھ رہے
ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہم سب خواب ہی ہیں۔

We are such stuff as dreams are made on. And ourlittle life is rounded with a sleep. The Tempest. Act 4 scene I.

ارشاد کباڑیے کے منہ سے شیکسپیئر کا قول سن کر جبار جمع کرنے والا یک دم شدید
پریشان ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہو۔ بوکھلاہٹ میں کبھی پروفیسر اور
کبھی جان کی طرف جاتا ہے سیفی سے ٹکراتا ہے جو مسلسل تصویریں بنا رہا ہے۔ جھنجھلا کر زور
سے سیفی کو دھکا دیتا ہے اور سیفی لڑکھڑاتا ہوا سعید کمال کے مضبوط بازوؤں میں پہنچ جاتا ہے۔
وہ اُسے اس بُری طرح جکڑتا ہے کہ سیفی کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ ارشاد کباڑیا اپنی تقریر جاری
رکھتا ہے۔

تو خواتین و حضرات۔ خوابوں کی حقیقی تعبیر۔ میرا مطلب ہے خوابوں کا حقیقت میں
بدلنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ بزدلوں کا کام نہیں۔ بہادروں کا کام ہے جو خوابوں کی تعبیر
کے لیے ایک ہی بار موت قبول کرتے ہیں اور بزدل جو......

Cowards die many times before their death. The valiant never taste death but once.Julius Ceaser Act 2. Scene 2.

جان خوش ہو کر تالیاں بجانے لگتا ہے۔ ''واہ۔ واہ۔ شاندار۔ شاندار۔ حیران کن۔
ونڈرفل......''

جبار پروفیسر، جان اور حتیٰ کہ سیفی کے سامنے بھی ہاتھ جوڑنے لگتا ہے جسے بدستور
سعید کمال نے بازوؤں میں جکڑا ہوا ہے۔ ''پروفیسر صاحب۔ پروفیسر صاحب۔ جان
صاحب۔ اسے روکیں پلیز۔ خدا کے لیے اسے روکیں۔ ارشاد بھائی پر شیکسپیئر آ گیا ہے۔ ارشاد
بھائی کے اندر شیکسپیئر اگر چل پڑا تو رُکے گا نہیں۔ جب تک بے ہوش ہو کر گر نہیں جاتا شیکسپیئر
نکلے گا نہیں۔ روکیں۔ روکیں۔ بے ہوش......''

''نہیں۔ نہیں۔ ہم نہیں روکیں گے۔'' جان فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے۔
پروفیسر...... یہ نیا ریکارڈ بن رہا ہے۔ یہ شخص دنیا کا پہلا کباڑیا ہے جو شیکسپیئر پر اتھارٹی ہے۔ او
مائی گاڈ...... او مائی گاڈ......''

پروفیسر کچھ سوچ کر سعید کمال کو اشارے سے پاس بلاتا ہے۔ سعید کمال سیفی کو

چھوڑ دیتا ہے اور پروفیسر کے پاس جاتا ہے۔ پروفیسر اُس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتا ہے۔ سعید کمال جارحانہ اثبات میں سر ہلاتا ہے اور ارشاد کباڑیے کی طرف بڑھتا ہے جس کی تقریر جاری ہے۔

''لیکن خواتین و حضرات ممکن ہے آپ کہیں بزدل بھی تو آخر انسان ہیں ان کے خلاف اتنا تعصب کیوں ہے۔ اور اگر انسان ہیں تو آہ انسان......

What a piece of work is man, how noble in reason, how infinite in faculties.

Hamlet Act 2, Scene 2.

جان پر وجد جیسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جھومنے لگتا ہے۔ یک دم سعید کمال ارشاد کباڑیے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ لیکن ارشاد آگے سے اُسے بُری طرح کاٹ لیتا ہے۔ سعید کمال چیخ کر ہاتھ ہٹا لیتا ہے۔ کباڑیا بولتا رہتا ہے۔

''اُہ۔ کیا مصیبت ہے یہ۔ ہر طرف مصیبت ہے۔ لیکن......''

Sweet are the uses of adversity...

As you like it. Act 2. Scene 1.

جان شور مچاتا ہے۔ ''نہ کرو۔ نہ کرو...... اُسے شیکسپیئر بولنے دو۔''

پروفیسر بھی ویسے ہی چیخ کر جواب دیتا ہے۔ ''نہیں جان نہیں۔ ہم اپنی صورتحال کو بہتر سمجھتے ہیں اور صوت حال یہ ہے کہ دنیا کا سب سے غریب / سب سے نیک باڈی بلڈر شیکسپیئر پر اتھارٹی دنیا کے پہلے کباڑیے کا منہ بند کرے گا...... لڑکے۔ جلد۔ جلدی......''

ارشاد پر اب ایک جنونی سی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ سعید کمال ڈرتا ہوا پھر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ جو بول رہا ہے۔

"To be or not to be that is the question."

Hamlet Act 3. Scene 1.

جان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ سیفی اس کی تصویریں بناتا ہے اور آنسو پونچھنے کے لیے اُسے اپنا رومال پیش کرتا ہے۔

ادھر سعید کمال ارشاد کباڑیے کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ جمانے اور اُسے جکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کباڑیے کے آخری الفاظ سنائی دیتے ہیں۔

"Friends Romans, country men, lend me your ears."

''Julius Ceaser ۔ ہپ۔ ہپ۔ آ...... ہپ......''

ارشاد تھوڑی دیر مزاحمت کرتا ہے۔ پھر اُس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہے۔

جان دھمکی دینے کے انداز میں شور مچاتا ہے۔ ''مار دیا...... تم نے اُسے مار دیا...... شیکسپیئر پر اتھارٹی دینا کے پہلے کباڑیے کو مار دیا......''

پروفیسر تسلی دینے کے انداز میں جان کے کندھے پر تھپکی دیتا ہے اور کہتا ہے۔ ''وہ ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ وہ ابھی ہوش میں آ جائے گا۔ جبار بے ہوش کباڑیے کو پانی کا چھینٹا لگاؤ۔''

جبار کہیں سے پانی کا بھرا ایک جگ لاتا ہے اور ارشاد کے سر پر انڈیل دیتا ہے۔ ارشاد سر جھٹکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ حیرت سے اردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھتا ہے اور پھر باری باری سب سے مصافحہ کرنے لگتا ہے۔ جان ہنس پڑتا ہے۔

جبار ارشاد سے پُر جوش لہجے میں پوچھتا ہے۔ ''ارشاد بھائی۔ جان صاحب کو پہلی کولیکشن کون سی دکھائی جائے۔''

ارشاد خفگی سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ ''جبار جمع کرنے والا'' تو مشہور ہے اور پوچھتا مجھ سے ہے کون سا مجموعہ دکھایا جائے گا۔''

''کباڑ کمپلیکس میں آخری فیصلہ تو آپ کا ہی ہوتا ہے ارشاد بھائی۔''

''اچھا پہلے عظیم رہنماؤں والا کولیکشن دکھا دے۔''

جبار سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا جھکتا ہے۔ ''جی ارشاد بھائی۔'' کہتا ہے اور پھر وہ بھی ایک تحریری انداز میں آ جاتا ہے۔

''خواتین و حضرات......'' پھر یک دم شرمندہ سا ہوتا ہے۔ ساری خاتون تو کوئی ہے نہیں......''

جان ہنستا ہے۔ ''ہاں۔ واقعی تم لوگ خواتین کو بخوشی اپنے کاموں میں شامل نہیں کرتے۔''

سیفی بے ساختہ کہہ دیتا ہے۔ ''جان ہم خواتین کو بس ایک ہی کام میں شامل کرتے

ہیں بخوشی۔" جان خوب قہقہے لگاتا۔ "سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔"

پروفیسر آگ بگولا ہو کر سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔ "یہ شخص مسلسل تہذیبی توہین کر رہا
ہے۔ یہ بدمعاش کون ہے......"

سیفی اس دفعہ پروفیسر سے معذرت کرنے کی بجائے ارشاد کے کانوں میں کھسر پھسر کرتا
ہے۔ ارشاد فوراً پروفیسر کے کانوں میں کچھ کھسر پھسر کرتا ہے۔ پروفیسر اب بے چارگی اور
مجبوری کی کیفیت میں سیفی کی طرف دیکھ کر نظریں ہٹا لیتا ہے۔ جبار بے چین ہو کر بول اٹھتا
ہے۔ "پروفیسر صاحب کباڑ کمپلیکس میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ آپ یہ فکر نہ کریں۔"
جان بھی بول پڑتا ہے۔ "میرا خیال ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

جبار فوراً ہی بولنے لگتا ہے۔ "حضرات۔ جان...... دیکھیں عظیم رہنماؤں کے حوالے
سے ارشاد بھائی اور میرا نظریہ یہ ہے کہ عظیم رہنماؤں سے تعلق رکھنے والی ہر چیز...... ہر چیز عظیم
ہوتی ہے۔ ارشاد بھائی کا قول ہے۔ عظمت جس چیز کو بھی چھو جائے عظیم ہو جاتی ہے۔"

جان حیران ہو جاتا ہے۔ "ہر چیز۔ تمہارا مطلب ہے۔ ہر چیز۔"

جبار اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ "ہاں جان ہر چیز...... عظیم رہنماؤں سے تعلق رکھنے
والی چیزیں پہلے بھی بہت جمع کی گئی ہیں۔ تمہارے پاس بہت ریکارڈ ہوں گے ہم جانتے ہیں۔
لیکن جو چیزیں ہم تمہیں دکھائیں گے وہ تم نے آج تک نہیں دیکھی ہوں گی ایسی کوئی کولیکشن
تمہارے ریکارڈ پر نہیں ہوگی۔"

"مثال دو...... مثال دو......" یک دم جان۔ چیلنج کرنے کے انداز میں چیختا ہے۔

جبار معنی خیز انداز میں ارشاد کی طرف دیکھتا ہے۔ ارشاد صورت حال کو اپنے ہاتھ
میں لینے کے انداز میں ہاتھ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے۔

"جان۔ مثلاً کیا تم نے عظیم رہنماؤں کے کانوں کی میل دیکھی ہے۔ یا ان کے
ناک سے نکلنے والی مختلف چیزیں......"

جان بُرا سا منہ بناتا ہے۔ What the hell, what the hell یہ بکواس ہے......"

پروفیسر ہنستا ہے اور سیفی کو کندھے سے جھنجھوڑتا ہے۔ "اب وہ جہنم کو یاد کر رہا ہے۔
کیوں...... جہنم کیوں...... بھلا کیوں......"

سیفی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ارشاد پروفیسر کو ڈانٹ دیتا ہے۔ "پروفیسر پلیز
بات آگے بڑھانے دیں...... نہیں جان...... یہ بکواس نہیں ہے۔ تم۔ تم۔ میرے ایک سوال کا
جواب دو......"

جان کا رویہ مدافعانہ ہو جاتا ہے۔ "سوال۔ کیسا سوال......؟ پوچھو سوال۔ گڈ......"

"جان سوچو...... فرض کرو...... اگر تمہیں...... عظیم رہنما...... بلکہ میں تو کہوں گا عظیم ترین......
چلو عظیم ترین رہنماؤں سے ایک...... ایڈولف ہٹلر کا استعمال کیا ہوا ٹائیلٹ پیپر مل جاتا ہے۔
حقیقی۔ تاریخی...... Genuine تو تم اُسے کیا شیشے کے چھوٹے سے ڈبے میں سیل کر کے......
اعلان نہیں کرو گے...... اس کے ہونے کا...... تمہارے پاس۔ اور سچ بتاؤ...... ایمانداری سے۔
کیا لوگ اُسے دیکھنے کے لیے بے چین نہیں ہو جائیں گے۔ سچ بتاؤ۔ چلو بتاؤ...... بے قرار ہو
کر اُسے دیکھنے نہیں آئیں گے...... سچ بتاؤ۔ ہا۔ ہا...... عظیم رہنما کی ہر چیز عظیم ہوتی ہے......
ہا۔ ہا......"

جان پر عجیب سی بوکھلاہٹ طاری ہوتی ہے جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہا ہو لیکن پھر سب کچھ
واضح ہونے کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ منہ سے ہوں۔ ہوں کی آوازیں نکالتا سر ہلاتا ہے پھر
گہری سانس لیتے ہوئے سب سے مخاطب ہوتا ہے۔

"یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ ہٹلر کی ass...... sorry...... ہٹلر کے استعمال کر لینے کے
بعد وہ ٹائیلٹ پیپر یقیناً کوئی معمولی ٹائیلٹ پیپر نہیں رہتا۔ ایک حیران کرنے والی۔ ششدر
کرنے والی چیز بن جاتا ہے...... عظمت کسی بھی چیز کو چھو لے۔ حیرت انگیز...... او مائی
گاڈ...... یہ شخص بلاوجہ شیکسپیئر پر اتھارٹی دنیا کا پہلا کباڑیہ نہیں ہے۔ کمال ہے...... میں سب
سمجھ گیا ہوں...... دکھاؤ...... دکھاؤ...... مجھے اپنی عظیم رہنماؤں کی عظیم کولیکشن دکھاؤ...... رہنماؤں
کی عظیم ass......"

ارشاد رہنمائی کرنے کے انداز میں جان کو آگے لے جاتا ہے۔ باقی سب اس کے
پیچھے چلتے ہیں۔ اچانک سعید کمال سیفی کو اپنے بائی سیپز دکھانے لگتا ہے۔ سیفی چھو کر دیکھتا ہے
اور پھر سعید کمال کے کانوں میں کچھ کہتا ہے۔ سعید کمال انہیں قدموں پر رک کر اپنے کانوں کو
ہاتھ لگاتا ہے اور غصیلی نظروں سے سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔ سب لوگ جان اور ارشاد کے

پیچھے آگے بڑھ رہے ہیں سرنگ نما تہہ خانہ جلد ہی کئی سُرنگوں میں بدل جاتا ہے۔ [illegible]
نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر سرنگ میں ایک طرف الماریوں کی لمبی قطاریں [illegible]
ہیں۔ جبار اور ارشاد ایک سرنگ کے دہانے کے سامنے رُک جاتے ہیں۔ ایک دربان [illegible]
ایک سٹول پر بیٹھا ہوا ہے۔ جس نے اپنے ناک اور منہ کے سامنے ایک ماسک پہنا ہوا ہے۔
وہ سب کو ویسا ہی ایک ایک ماسک اور الٹی کرنے کا تھیلا دیتا ہے۔

(ادارتی نوٹ: یہاں سے بقیہ سکرین پلے کی خواندگی سیفی شروع کرتا ہے)

....

کیمرہ دربان کے چہرے پر zoom in کرتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں [illegible]
چمک ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماسک کے عقب میں بے آواز [illegible]
رہا ہے۔

ٹوشاٹ: جان اور ارشاد۔ جان سوالیہ انداز میں ارشاد کی طرف دیکھتا ہے۔

جان: ''یہ ماسک؟ یہ بیگ...... الٹی کے لیے......؟

ارشاد: ''اب تو تم جانتے ہو جان کہ عظیم رہنما کی ہر چیز عظیم ہوتی ہے لیکن ہم [illegible]
ہیں۔ ان عظیم چیزوں کا سامنا کر کے ہمارا کچھ بھی ردعمل سامنے آ سکتا ہے۔ [illegible]
معمولی لوگ ہیں۔ اس لیے ہمیں ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار [illegible]
چاہیے۔ بعض اوقات وزیٹرز کو ان حفاظتی تدابیر کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

جان: (مخصوص بلند آواز میں) ''میں سمجھ رہا ہوں۔ یقیناً میں سب سمجھ رہا ہوں......''

مڈشاٹ: سب انتظار کر رہے ہیں کہ ارشاد اور جان کی گفتگو ختم ہو تو سب آگے بڑھیں۔

ٹریکنگ شاٹ: کیمرہ الماریوں کے عقب سے سب کو کور کر رہا ہے۔ اس طرح کہ [illegible]
الماریوں کے اندر دیکھتے ہوئے ان کے چہروں کے تاثرات نمایاں ہوتے [illegible]
لیکن الماریوں کے اندر کیا ہے یہ نظر نہیں آتا۔

جبار: (شروع کی ایک الماری کے اندر اشارہ کرتے ہوئے) ''یہ جان...... [illegible]
رہنماؤں کے زیر استعمال رہنے والے۔ زیر جامے۔ بنیانیں۔ جانگیے۔ رول۔ [illegible]
میں پھیرنے والی کاٹن بڈز۔ اور یہ...... کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی معمولی زیر جامے [illegible]

ہیں۔ ذرا ساتھ رہنماؤں کے نام دیکھو۔''

جان: (حیرانی) ''آہ۔ آہ کوئی۔ نہیں۔ یقیناً کوئی نہیں۔ کون کہہ سکتا یہ معمولی زیر جامے
ہیں۔ آ۔ اوہو۔ او......''

جان کے چہرے پر ہلکے سے تنفر کے تاثرات ابھرتے ہیں پروفیسر مسلسل اثبات
میں سر ہلا رہا ہے۔ جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہو۔ باڈی بلڈر سعید کمال الماری کے اندر
ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہے اور پھر نظر ہٹا لیتا ہے۔ پھر دیکھتا ہے۔ پھر ہٹا لیتا ہے۔

جان: ''او...... مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... ان میں سے کچھ پر یہ بھورے بھورے دھبے
ہیں۔ یہ کیا ہیں۔''

ارشاد: ''یہ جان۔ یہ بھورے دھبے تاریخی تحقیق کا موضوع ہیں۔ ہم نے صرف اتنا کیا ہے
کہ جن ذرائع مثلاً گھریلو ملازمین۔ سیکورٹی کے عملے۔ قریبی تعلق زیادہ تر ناجائز کی
خواتین۔ اور انتہائی قابل اعتماد لیکن حقیقت میں غدار دوست۔ وغیرہ وغیرہ کے
ذریعے ہم نے یہ نایاب اشیا حاصل کیں۔ ان سے اشیا کے بارے میں قیمتی
معلومات بھی حاصل کر لیں۔ جو محققین کے لیے محفوظ ہیں اور معاوضے پر مہیا کی جا
سکتی ہیں۔ اب عام طور پر ان دھبوں کی اصل خون ہی بتائی گئی ہے جس کی وجہ
شیو۔ قتل۔ قاتلانہ حملہ۔ حادثہ۔ بغاوت۔ سوئی یا کانٹا چُبھنا۔ انقلاب یا بواسیر کچھ
بھی ہو سکتی ہے۔ تحقیق بتائے گی۔''

کلوز شاٹ: سیفی کی مخصوص بے چینی جس پر وہ قابو نہیں پا سکتا۔

مڈشاٹ: سیفی تیزی سے جان کی طرف بڑھتا ہے اور جان کے سر کو ہاتھ سے اپنی طرف جھکا
کر تیزی سے اُس کے کان میں کچھ کہنے لگتا ہے۔ جان کی آنکھیں پہلے حیرت سے
پھیلتی ہیں پھر وہ بدمعاشی کے انداز میں سیفی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے اور خوب
ہنستا ہے۔

جان: ''سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔ یوں بھی یہ تمہارے مردوں کی تہذیبی کمزوری......
نہیں...... کمزوری نہیں...... شوق...... جوش...... کیا کہنا چاہیے...... او گاڈ...... مجھے
کیا کہنا چاہیے۔''

ارشاد: (اک دم مخصوص انداز میں) "All the world is a stage and all the men and women merely players. As you like it. Act 2. Sciene 7."

جبار پھر گھبرا جاتا ہے۔ تیزی سے آگے بڑھ کر ارشاد کو بُری طرح جھنجھوڑتا ہے۔

"ارشاد بھائی۔ ارشاد بھائی۔"

ارشاد نارمل ہو جاتا ہے۔ پروفیسر قہرآلود نظروں سے پہلے سیفی اور پھر جان کی طرف دیکھتا ہے۔

پروفیسر: "جان...... تم اس...... اس...... شخص کے ساتھ مل کر ہماری تہذیبی اقدار کا مذاق نہیں اڑا سکتے...... میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

جان: (زور زور سے سر ہلاتا ہے)۔ "نہیں نہیں۔ پروفیسر بالکل نہیں...... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا...... مذاق تو دور کی بات ہے۔ گینز بک آف ریکارڈز...... ورلڈ ریکارڈز...... دنیا کی کتاب ہے...... ریکارڈ خواہ کہیں بھی ہو...... کیسا بھی ہو۔"

(جان سیفی کو آنکھ مارتا ہے)۔

کلوز شاٹ: سعید کمال کا منہ بگڑتا ہے جیسے قے آ رہی ہو اور وہ تیزی سے ماسک پہن لیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی موسیقی کی آواز آنے لگتی ہے...... گانا۔ کس لیے تجھ سے میں پیار کروں کہ تُو اک بادل آوارہ......"

جان خوش ہو کر قہقہے لگاتا ہے۔

جان: "یہ تو موزارٹ کی چالیسویں سمفنی...... ہا۔ ہا۔ ہا...... تان سین بینڈ...... لیکن یہاں اس تہہ خانے میں اس کی آواز کیسے آ رہی ہے۔"

جبار اور ارشاد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

جبار: "وہ ایسا ہے جان...... کہ اس کولیکشن کو ہوادار بنانے کے لیے...... تاکہ کسی وزیٹر کو ماسک پہننے کی ضرورت نہ پڑے ہم نے آگے۔ کچھ آگے اوپر کی طرف ایک بڑا شگاف کھولا تھا اور اس میں ایک بڑا ا ایگزاسٹ فین لگا دیا تھا۔ اُس سے یہاں تو ہوا بہت بہتر ہو گئی لیکن ارد گرد علاقے کی فضا بہت خراب ہو گئی اور لوگ اعتراض

کرنے لگے کہ یہ بدبو دار ہوا کہاں سے آ رہی ہے۔ اس ہوا کو بند کرو۔ کباڑ کمپلیکس پر حملہ ہوا۔ ایک دن ارشاد بھائی کو سڑک پر چلتے چلتے مارا گیا مجھے تانگے کے نیچے کچل دینے کی کوشش کی گئی۔ ہم نے تنگ آ کر ایگزاسٹ کا سوچ آف کر دیا۔ لیکن اب ایسا ہے کہ یہاں کی ہوا باہر تو نہیں جاتی لیکن شگاف کی راہ سے تان سین بینڈ کی موسیقی یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔

جان: (قہقہہ لگاتا ہے) ہاں موسیقی کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا...... یہ ایک الگ بات ہے۔ میرا خیال ہے ہم آگے چلیں...... آہ...... موزارٹ......"

موسیقی کی آواز اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ کسی کو ایک دوسرے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تان سین بینڈ واپس آ کر ریہرسل کر رہا ہے۔ اور ریہرسل کرتے وقت بھی خلاف معمول مائیک اور بڑے بڑے سپیکر (جیسے جلسوں اور مسجدوں میں استعمال ہوتے ہیں) لگائے گئے ہیں...... کس لیے تجھ سے میں پیار کروں......

ڈشاٹ: سبحان خان کا شامل باجا وقفوں وقفوں سے پاں کی آواز نکالتا ہے۔

کلوز شاٹ: ڈیپ فریزر میں ہوپ گہری نیند سو رہا ہے۔ پاں کی آواز سے لمحے بھر کے لیے اس کے کان کھڑے ہوتے ہیں پھر گر جاتے ہیں۔

کٹ

ٹریکنگ شاٹ: جان، ارشاد اور جبار پہلی دو الماریوں سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ موسیقی کی آواز اب اتنی بلند ہو چکی ہے کہ ان کی باہمی گفتگو بالکل سنائی نہیں دیتی لیکن دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چیخ چیخ کر بات کر رہے ہیں اور اشارے کر رہے ہیں۔

کلوز شاٹ: جان کے چہرے پر کراہت اور الٹی آنے کے تاثرات لحہ بہ لحہ شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ارشاد الماری کے اندر اشارے کر کے جذباتی انداز میں کچھ کہہ رہا ہے۔ سیفی اس کے کان کے قریب چیخ کر کچھ پوچھتا ہے۔ ارشاد انکار میں سر ہلاتا ہے پھر جان اچانک الٹی کر دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بیگ کی بجائے ماسک استعمال کر لیتا ہے۔ اگلی الماری تک پہنچتے ہیں۔ کچھ دیکھتے ہیں۔ جان تیزی سے انکار میں سر ہلانے لگتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ واپس مڑنے

کی کوشش کرتا ہے۔ ارشاد اشارہ کرتا ہے اور جبار اور سعید کمال اُسے دائیں بائیں سے جکڑ لیتے ہیں اور اگلی الماریوں کی طرف دھکیلنے لگتے ہیں۔ جان چیخنے اور التجا کرنے لگتا ہے۔ لیکن سعید کمال اور جبار اُسے مزید آگے لے جاتے ہیں۔ اچانک جان الماری کے اندر کچھ دیکھ کر شدت سے آنکھیں میچ لیتا ہے۔ ارشاد اپنے دونوں ہاتھ استعمال کرتے ہوئے انگوٹھوں اور انگشت شہادت سے اس کی آنکھیں زبردستی کھول دیتا ہے۔ جان بے ہوش ہو جاتا ہے۔

کٹ ٹو

تان سین بینڈ دوسرے گانے کی ریہرسل شروع کرتا ہے۔ او بڑے میاں دیوانے ایسے نہ بنو...... حسینہ کیا چاہے...... ہم سے سنو۔

کٹ ٹو

کھلے ڈیپ فریزر میں ہوپ جاگ کر بھونکنے لگتا ہے۔

کٹ

تہہ خانے کے ایک کونے میں مریضوں کے ایک بستر پر جان بے ہوش لیٹا ہے۔ ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ پاس ہی پروفیسر ایک سرنج ہاتھ میں لیے کھڑا ہے جس میں سبز رنگ کا کوئی سیال بھرا ہے۔ ایک طرف ارشاد، جبار، سیفی اور سعید کمال کھڑے کوکا کولا پی رہے ہیں۔ پروفیسر جان کو انجکشن دیتا ہے۔ جان فوراً ہی ہوش میں آ جاتا ہے اور اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔

مڈ شاٹ

سعید کمال پھر شرٹ اتار چکا ہے اور کوکا کولا پیتے وقت اُس کے بائی سیپز نمایاں نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی کھڑے ارشاد اور جبار کو مسلز چیک کراتا ہے۔ دونوں چھو کر دیکھتے ہیں اور تعریفی انداز میں سر ہلاتے ہیں۔

ٹو شاٹ: جان اور پروفیسر۔ جان گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر سے مخاطب ہوتا ہے۔

جان: ''پروفیسر یہ کیا ہے۔ یہ بے انصافی ہے۔ پہلے تم نے مجھے اپنے اور ہمارے اپنے۔ آہ ہمارے اپنے...... عظیم رہنماؤں کی ایسی عظیم چیزیں دکھائیں کہ میں بے ہوش

ہو گیا۔ پھر تمہارے ساتھی میرے ہوش میں آنے کا انتظار کیے بغیر کوکا کولا پینے لگے۔ یہ کیسی مہمان نوازی ہے۔''

پروفیسر: (ہنستا ہے) ''نہیں جان۔ تمہارا کوکا کولا تیار ہے...... لڑکے......''

سعید کمال تیزی سے ایک طرف رکھا کوکا کولا کھول کر جان کو دیتا ہے۔ جان پینے لگتا ہے لیکن فوراً ہی اُس کے چہرے پر متلاہٹ کے تاثرات نمودار ہوتے ہیں۔

پروفیسر: ''جان تم ٹھیک ہو؟''

جان: ''میں نہیں جانتا۔ عظیم رہنماؤں کا سب کچھ عظیم ہوتا ہے۔ اس عظیم حقیقت نے میرے اوپر بہت گہرا اثر ڈالا ہے...... او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... پروفیسر میں کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے کسی تفریح گاہ میں لے جا سکتے ہو۔ ہم پھر آ جائیں گے۔ تمہارے دوسرے ریکارڈ دیکھنے...... میں ہیڈ آفس سے کچھ مہلت لے لوں گا...... میں سب کولیکشنز دیکھوں گا۔''

ٹو شاٹ: ارشاد اور جبار ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگتے ہیں۔ ارشاد اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

جبار: ''جان ہم چند دنوں کے لیے ایک میلے میں جا رہے ہیں۔ ہم تمہیں ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہاں بھی ہم ایک انوکھی کولیکشن پر کام کر رہے ہیں۔ تھیٹر کے ایک بونے سے مل کر ہم بونے جمع کر رہے ہیں۔''

جان: (حیران پھر خوش ہو جاتا ہے)۔ ''بونے۔ آہ۔ بونے۔ تھیٹر۔ شیکسپیئر...... بونوں کی کولیکشن۔ یہ یقیناً نئی بات ہوگی۔ میں ضرور جاؤں گا۔''

جبار: بھاگاں والا ایک خوبصورت جگہ ہے۔ سورج مکھی کے کھیتوں کے ساتھ۔''

جان: ''آہ۔ سورج مکھی۔ شیکسپیئر۔ بونے...... تھیٹر...... مسٹر پروپرائیٹر...... اب تم مجھے بتاؤ گے۔ شیکسپیئر نے بونوں پر کیا کہا ہے۔''

ارشاد اچانک ایک چیلنج قبول کرنے کے انداز میں آ جاتا ہے۔ ''یقیناً جان۔ یقیناً کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ پھر شیکسپیئر کا کوئی متعلقہ قول یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالتا ہے اور جلد ہی یہ کوشش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے۔ چہرے پر اذیت کے

تاثرات نمودار ہوتے ہیں۔ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ ''بونے۔ شیکسپیئر۔ بونا۔ بونی۔ بونے۔ شیکسپیئر...... '' کم آن شیکسپیئر۔ بونا۔ بونے۔ نہیں...... نہیں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ شیکسپیئر نے بونوں پر کچھ نہ کہا ہو...... نہیں...... نہیں...... ''

ارشاد کی نہیں۔ نہیں کی آوازیں چیخوں میں بدلنے لگتی ہیں سر پر ہاتھ مارتا ہے۔ کچھ دیر بعد لڑکھڑانے لگتا ہے۔ اور پھر بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔ (جاری)

چلو چلو میلے چلو

سوانگ پروڈکشنز کا دفتر۔ کافی چہل پہل نظر آرہی ہے۔ سعید کمال۔ انیلا۔ سیفی۔ ماسٹر یاسین۔ صفدر سلطان۔ بالی اور بابا خوشیا مختلف جگہوں پر بیٹھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ انیلا گول میز کے ساتھ کاغذات کا پلندہ سمیٹ رہی ہے۔ سیفی سکرین پلے پڑھ کر سُنا چکا ہے۔ ماسٹر یاسین میز کے گرد بیٹھا۔ مسلسل حیرت زدگی کی کیفیت میں جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہا ہو کہ جو کچھ اس نے سُنا ہے وہ کیسے ہوگا۔ ہاتھوں سے وقتاً فوقتاً کیمرہ فریم بنا کر دیکھتا ہے۔ ایک طرف کونے میں صوفے پر صفدر سلطان چپ چاپ بیٹھا ہے۔ واضح طور پر وہ ایک بہت بدلا ہوا شخص لگتا ہے۔ سعید کمال ایک تیز طرار ڈائریکٹر کے انداز میں کمرے میں حرکت کر رہا ہے۔ سیفی اور بالی ایک کونے میں کھڑے مسلسل سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ بالی صفدر سلطان کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھ کر سیفی کے سامنے کوڑے مارنے اور چھری چلانے کے اشارے کرتا ہے۔ سیفی گہری سنجیدگی سے کسی انتہائی اہم معاملے کو سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتا ہے۔

سیفی: ''واہ...... واقعی مردوں کی سیانی ہے...... ببلی۔''

بالی: ''ایسی ویسی سر جی...... ویسے سر جی ایک گزارش تھی...... آپ کو تو...... پتہ ہے میرا ببلی کا خاص ٹانکا ہے۔''

سیفی: ''ہوں۔ جانتا ہوں۔''

بالی: ''تو ببلی سر جی۔ اور اس کا خاوند سینڈو۔ دونوں فلموں میں سٹنٹ کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اب تو خیر کام اتنا رہا نہیں۔ ویسے ببلی نے اپنی فلم بھی بنائی ہے۔ اپنی

لائف پر۔ سٹنٹ مین پر۔ کہتی ہے۔ سکرپٹ لکھوایا ہوا ہے۔ پر وہ تو کب کی بنا رہی ہے فلم۔ پیسہ کیسا لگائے گی......''

سیفی: (حیرت سے) ''کیا۔ ببلی سٹنٹ وومین ہے۔''

بالی: ''جی سر جی...... تو وہ کہتی تھی اس فلم جو نہیں بن رہی اس میں اُسے کوئی سٹنٹ کا پارٹ مل جائے اور اس کے خاوند سینڈو کو بھی......''

سیفی یک دم مڑتا ہے اور بلند آواز میں انیلا سے پوچھتا ہے۔

سیفی: ''انیلا۔ آگے سکرپٹ میں کہیں سٹنٹ ایکشن کی گنجائش نکلتی ہے؟ سٹنٹ مین وومین کا ایک جوڑا مل رہا ہے......''

سعید کمال جواب ماسٹر سے کچھ بات کر رہا ہے۔ چونک کر مڑتا ہے۔

انیلا: ''آ...... سٹنٹ وومین بھی ہے...... یہ تو اچھا ہے۔ میرا خیال ہے جب ہم نے آگے بھاگاں والا کے میلے میں جانا ہے۔ وہاں تو لوکل تھیٹر بھی ہم نے کور کرنا ہے...... پھر بونے جمع کرنے...... میلے میں سٹنٹ بھی تو ہوتے ہیں...... کون ہیں یہ سٹنٹ آرٹسٹ۔''

سیفی: ''ببلی اور سینڈو۔''

سعید کمال ایک دم چونکتا ہے اور چہرے کے تاثرات بدلتے ہیں۔

سعید کمال: ''ہولڈ اِٹ۔ ہولڈ اِٹ۔ یہ کون ہیں۔ یہ کیا ہے...... ببلی اور سینڈو......''

بالی: ''ببلی اور سینڈو...... باس......''

سعید کمال: (اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا ہے۔ سیفی اور انیلا سے مخاطب ہوتا ہے) ''سرئیلسٹ سناریو کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جس کو چاہیں کاسٹ میں گھسیڑ لیں......''

انیلا سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالتی ہے اور ہانک لگاتی ہے۔

انیلا: ''صفدر سگریٹ لوگے۔''

صفدر سلطان: (انتہائی عاجزانہ انداز میں معذرت کرتا ہے) ''نہیں میڈم...... بہت بہت شکریہ۔ مجھے موافق نہیں۔ برا نہ منائیں پلیز......''

انیلا: (ہونٹوں اور چہرے کو ٹیڑھا میڑھا کرتے ہوئے) ''اوہو۔ سب سموکرز ختم ہوتے

جا رہے ہیں۔''
(بالی پر نظر پڑتی ہے۔ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ ہونٹوں پر نمودار ہوتی ہے)
''بالی تم لے لو......''
بالی ''جی میڈم۔ جی میڈم'' کرتا گرتا پڑتا انیلا کے پاس پہنچتا ہے۔ سگریٹ لیتا
ہے۔ اور سجدہ کرنے کے انداز میں جھک کر سلام کرتا ہے۔

انیلا: ''کم از کم تمہاری لکڑی کی ٹانگ کو سگریٹ نوشی سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''
ماسٹر یاسین اور سیفی ہنستے ہیں۔

بالی: (رازدارانہ لہجے میں) ''میں تو خود دو پیکٹ روز پھونک جاتا ہوں۔ میڈم جی۔''

سیفی: ''تم اگر چمنی ہو تو یہ ریلوے انجن ہے پرانا۔ پتھر کے کوئلے والا جو آدھے آسمان
میں دھواں بھر دیتا تھا۔''

سعید کمال کے علاوہ سب ہنستے ہیں۔ اسی لمحے بابا خُوشیا بہت سے گلاب کے ہار
پکڑے اندر آتا ہے۔ اور سب کو ہنستا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکتا ہے۔ پھر خود
بھی ہنسنے لگتا ہے۔

بالی: (سیفی اور انیلا سے) ''میں سرکار بس آپ کا نوکر ہوں۔ خادم ہوں۔ غلام ہوں۔
بس اب تمنا یہی ہے کوئی آپ سے اونچی نیچی بات کرے اور پھر تماشہ دیکھے۔''
(ترچھی نظر سے سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے)
اس لمحے بابا خُوشیا آگے آتا ہے اور سب کے گلے میں ایک ایک گلاب کا ہار ڈالنے
لگتا ہے۔ سب لوگ ہنستے ہیں۔

سیفی: ''یہ کہاں سے بابا جی......''

بابا: ''پیچھے سائیں گلاب۔ پیر و مرشد۔''

سیفی: ''میں دیکھ رہا ہوں بابا جی...... تمہارا ادھر چاہ پریاں والا میں آنا جانا بہت بڑھ گیا
ہے۔ کسی دن کسی پری نے تمہیں پکڑ کر ساتھ کنوئیں میں اُتر جانا ہے۔''

بابا: ''لے جائے۔ جو بھی لے جائے۔'' انگلی کھڑی کر کے ناچنے لگتا ہے۔ ''حق۔ حق۔''
سعید کمال صفدر سلطان سے کچھ بہت سنجیدہ کھسر پھسر میں مصروف نظر آتا ہے۔

صفدر بار بار اقرار میں سر ہلا رہا ہے۔

سعید کمال: ''حکمت بہزاد صاحب بھی اب متفق ہیں کہ اس پراجیکٹ میں پیسہ لگانا گھاٹے کا
سودا نہیں۔''

صفدر سلطان: ''کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ سعید صاحب کوئی مسئلہ ہی نہیں۔''
پاس رکھا بیگ اُٹھاتا ہے۔ ایک چیک بک نکالتا ہے۔ سیفی دیکھتے ہی نعرہ لگاتا ہے۔

سیفی: ''حق......'' اور بابے کے ساتھ ناچنے میں شامل ہو جاتا ہے۔ بالی بھی کچھ بھانپ
کر اپنی لکڑی کی ٹانگ سے ٹھک ٹھک کرتا ناچنے لگتا ہے۔
صفدر سلطان سعید کمال سے کچھ پوچھ رہا ہے۔ عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی
ہے۔ رقص رُک جاتا ہے۔ سعید کمال فون اٹینڈ کرتا ہے۔

سعید کمال: (دھیمی آواز میں) ''آ...... ہاں۔ رخشی...... میں سعید کمال۔ اوہو نہیں۔ ڈیئر......
پرسوں نہیں......''

بابا گلاب کا ہار لیے سعید کمال کی طرف بڑھتا ہے اور اُس کے گلے میں ڈالنے کی
کوشش کرتا ہے ہار ریسیور کی تار سے الجھتا ہے۔ پھر فون گرتے گرتے بچتا ہے۔
سعید کمال بری طرح جھنجھلا جاتا ہے۔ ''ہٹ...... ہو...... ایڈیٹ...... او...... نو......
نو...... نہیں نہیں رخشی...... پلیز...... ناٹ یو......''
سیفی بابے کو پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ صفدر ہونقوں کی طرح چیک بک اور قلم پکڑے بیٹھا
ہے۔ چہرے پر ایک طرح کی اُداسی نظر آتی ہے۔ رقص پھر شروع ہو جاتا ہے۔ انیلا
قہقہے لگاتی ہے۔ صفدر پر نظر پڑتی ہے سنجیدہ سی ہو کر سیفی کو ایک طرف لے جاتی ہے۔

انیلا: (سیفی سے رازدارانہ لہجے میں) ''پتہ نہیں۔ اُس عورت نے کیا کیا ہے صفدر کے ساتھ۔''

سیفی: ''اب تم میرا دماغ خراب کرو گی...... (دھیمی آواز میں غصے کا اظہار) وہی جو وہ
شخص چاہتا تھا...... جس کی اُسے ضرورت تھی...... مردوں کی سیانی ہے بِلّی...... اور
پھر ساتھ فلموں میں سٹنٹ کرتی ہے......''

انیلا: ''یہ بھی کوئی سٹنٹ ہی ہے......'' (موضوع بدلتی ہے)

انیلا: ''ابھی تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی آگے...... بھاگاں والا کے میلے میں...... وہ کئی سٹار تھیٹر

کی ہیروئیں...... اور وہ بونا...... اور باقی سب کچھ...... سب کیسے connect ہوگا......؟''

سیفی: ''یہ مت بھولو کہ یہ کباڑ کمپلیکس کی کہانی ہے۔ اور ''جبار جمع کرنے والا'' [illegible] اب اس کا اگلا پاگل پن بونے جمع کرنے کا...... یہیں سے ہم...... [illegible] پکڑتے ہیں۔ باقی بونا تھیٹرز میں ہے۔ سب کچھ...... ایک ہو جائے گا......''

انیلا: ''آئی۔ سی...... ہاں۔ میرا خیال یہ ہے...... سو یہ پروفیسر ساتھ جائے گا [illegible] کیا خیال ہے......؟''

سیفی: ''نہیں پروفیسر ادھر ہی رہے گا۔ ارشاد بھی ادھر ہی رہے گا۔''

انیلا: ''بائی دی وے اس پروفیسر کا آخر میں کرنا کیا ہے۔''

سیفی: ''میرا خیال ہے پاگل ہو جاتا ہے......''

انیلا: ''اور فٹ پاتھ پر بجلی پیدا کرنے والے اللہ دین کے چراغ بیچتا پھرتا ہے۔''

سیفی: ''واہ۔ واہ۔ جانو...... یہ ہوئی نا، بات میری جان...... یہ بنا۔ excellent۔''

انیلا بہت خوش ہو جاتی ہے۔

انیلا: ''ہاں۔ نا...... ہے نا۔''

سیفی: ''دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو۔ سیٹھ چیک کاٹ رہا ہے۔''

انیلا دیکھتی ہے۔

انیلا: ''مجھے تو یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا......''

سیفی: ''تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے......''

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔

انیلا: ''سب کچھ آؤٹ آف کریکٹر ہو رہا ہے......''

سعید کمال دونوں کی طرف دیکھتا ہے۔ گہری سانس لیتا ہے۔

سعید کمال: ''سیفی کتنے دن ہم ٹھہریں گے وہاں؟''

سیفی: ''دو تین دن شاید چیف۔ جتنا تمہاری Recce کے لیے ضروری ہوا۔'' (نعرہ لگاتا ہے) ''چلو چلو۔ میلے چلو۔ چلو چلو بھاگاں والا چلو۔''

....

(14)

حسن کے وہ تین دن۔ کالی بھیڑ سے سورج مکھی تک۔

ڈایازی پام کے سائیڈ ایفیکٹس یعنی سرئیلزم وغیرہ

ہم سمجھتے ہیں کہ 'مونتاژ کا کولاژ' جیسی مشکوک ادارتی کارروائی کے ذریعے ہم سوانگ پروڈکشنز کے معاملات کو ایک ایسے موڑ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جس سے حسن کی فلمی صورتِ حال اور عمومی صورتِ حال ایک ہی مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں اور پھر حسن کی اُچٹتی منظر بینی میں تحیر کا ایک نیا باب کھلتا ہے اور نظر، ناظر، نظارہ میں تقسیم جیسے ختم ہونے لگتی ہے۔ ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں ایک مقام کی طرف جو شاید مقام ہی نہیں ہے۔ یہ کیا مقام ہے؟

یہ ایک ایسا حیرت انگیز مقام ہے کہ جس کی طرف توجہ دلانے والے کو اولاً اور فوراً اپنے لفظ حیرت انگیز کی کم مائیگی کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ اُس کا تحیر اتنا مکمل اور استعجاب اتنا شدید ہے کہ گویائی کا خاتمہ ہی کمالِ اظہار ٹھہرتا ہے۔

یہ کامل حیرت کا دورانیہ ہے جو اصل میں ایک ہی لمحہ ہے جو بھوری سیاہ چٹانوں کے ساتھ ساتھ آمنے سامنے رکھے قد آدم آئینوں میں ساکت ہے۔ یہ ایک ویران پہاڑی رستہ ہے جو بلند پہاڑوں میں سے گزرتی سڑک سے جُدا ہو کر گہری سبز گھاس میں کھلے جنگلی پھولوں کے پتھریلے قطعے میں ایک بند گلی کی طرح کھڑی چٹانوں میں سے گزرتا ہے اور پھر اطراف میں موجود فلک بوس چوٹیوں اور گہری ترائیوں کے گھنے جنگلوں کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ یوں کچھ بھی حیرت انگیز نہیں سوائے وہاں موجود اُن دیواروں جیسے بلند آئینوں کی موجودگی کے جو

چٹانوں کی بند گلی کی تینوں اطراف میں اس طرح آمنے سامنے رکھے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے وجود کو عکس در عکس کی کبھی ختم نہ ہونے والی، نظر کو چکرا دینے والی سرنگ میں دور سے دور ہٹاتے جا رہے ہیں شاید کسی خاتمے کی طرف جو لاانتہا میں کہیں ہے مگر نہیں ہے۔

یہ لامتناہی سراب ہے اور حسن اس میں —— نہیں ہے۔ بار بار نہیں ہے۔ گہرے سناٹے میں پہاڑی چشموں سے آتے پانی کی کومل سطحیں سہ پہر کے نیلے آسمان سے اترتی سورج کی شعاعوں کو عکس کے خداؤں آئینوں کی جانب پھینکنے کی طفلانہ شرارت کرتی ہیں اور پھر ہوا کا جھونکا دیودار کے درخت کی ایک شاخ کو لہرا دیتا ہے تو آمنے سامنے آئینوں پر شعاعیں کوندتی ہیں اور گہری سبز شاخ ان گنت ہو کر لامتناہی فاصلے تک لہرا جاتی ہے۔ آئینوں کی تینوں دیواروں کے اندر آ جانے والا کوئی بھی وجود لا وقت میں ان گنت ہو کر لاانتہا تک پھیل جاتا ہے۔ عکس در عکس در عکس در عکس۔ اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن کو دیکھتا ہوا عکس در عکس آئینوں کی سرنگ میں دور سے دور ہٹتا۔ معدوم سے معدوم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لاانتہا کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔ اور حسن کی گمشدگی کے اُن تین دنوں میں یہ تیسرا دن ہے۔

ادارتی نوٹ

وہ تین دن؟

''اُچٹتے خوف کی داستان'' کے مصنف یعنی حسن کے (مختصر) سوانح نگار نے حسن کی زندگی کے ایک بڑے کرائسس یعنی جب اُسے ملازمت میں ترقی کے نتیجے میں اس کی ''اُچٹتی منظر بینی'' کی روٹین سے یک دم محروم ہونے کا خطرہ لاحق ہوا —— کو حسن کی زندگی کا ایک ''مثالی حقیقی صدمہ'' قرار دیا۔ اس صدمے کے اثرات حسن کی جسمانی (اور یقیناً ذہنی) صحت پر بھی مرتب ہوئے۔ بقول سوانح نگار زندگی میں پہلی بار اُس نے معالج سے رجوع کیا (کیا حسن اتنی مثالی صحت کا مالک تھا؟ تعجب ہے)۔ اُسے بے خوابی، گردن کے پٹھوں میں کھنچاؤ اور آنکھوں میں درد کے لیے ادویات دی گئیں تاکہ وہ جلد صحت یاب ہو کر اپنے دوسرے کچھ ملازمین کے ہمراہ کمپنی کے کسی ٹور پر جا سکے۔ اسی ٹور کے دوران حسن تین دن کے لیے لاپتہ ہو گیا۔ لیکن چوتھے دن پھر خود ہی ڈیوٹی پر واپس آ گیا لیکن اپنے ایام گمشدگی کے بارے کسی کو کچھ بھی بتانے سے اُس نے صاف انکار کر دیا)

یہ حیرت انگیز ہے۔ اور ہمارے لیے بطور مدیر حیرت ناقابل فہم بھی (فی الحال) یہ سب معاملات یقیناً حسن کی سوانح میں (مختصر ہی سہی) زیادہ تفصیلی توجہ کے مستحق تھے لیکن فاضل مصنف نے انہیں صرف چند لائینوں میں لپیٹ دیا۔ بہرحال اُس کی اپنی ترجیحات ہوں گی لیکن ہماری ترجیحات میں یقیناً یہ معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور ہم اسے ''حسن کی صورتِ حال'' کے مجموعی پس منظر میں سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے —— ہم ''ہر ممکن'' پر اصرار کریں گے، دیکھا جائے تو ''مثالی حقیقی صدمہ'' کا جو تصور اس تحریر میں سامنے لایا گیا ہے یعنی ایسا صدمہ جس کا دکھ آپ دنیا میں کسی ایک بھی شخص کے ساتھ بانٹ نہ سکیں، اتنا گھمبیر اور دل ہلا دینے والا المیہ ہے کہ اس پر صفحوں کے صفحے کالے کیے جا سکتے ہیں لیکن ہم ایسا کچھ بھی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ ہمیں دوسرے بہت سے افراد کے صدمات کا جائزہ بھی لینا ہے جو شاید اتنے ''مثالی'' اور ''حقیقی'' نہ ہوں لیکن بہرحال ''حسن کی صورتِ حال'' کا حصہ ہیں۔ مثال کے طور پر سوانگ فلم گروپ کے ممبران کے صدمات جو اپنے اپنے طور ہی پر اس امید و بیم میں مبتلا ہیں کہ اعلیٰ پائے کی فلم ''یہ فلم نہیں بن سکتی'' کبھی بن سکے گی یا نہیں۔ اور آرٹ اور کلچر کے چیمپیئن حکمت بہزاد کی زندگی بھر کے صدمات میں کھلنے والا نئے صدمات کا باب۔ اپنی گھریلو تہذیب کی خرد افروزی کے چیمپیئن پروفیسر صفدر سلطان کا صدمہ کہ الہ دین کے چراغ کا جن بجلی پیدا کرنے میں کوتاہی کیوں کرتا ہے۔ پروفیسر کے شاگرد سعید کمال کا صدمہ کہ ارشاد کباڑیے نے پروفیسر کے خرد افروزی کے مسودے کو کیا واقعی آگے ردی کے بھاؤ بیچ دیا۔ ''پیارا'' نامی بونے کا کافی حقیقی صدمہ کہ جب وہ بے بی کشار کا وصل حاصل کرتے کرتے محروم رہ جاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی دوسرے سعید کمال۔ دوسری انیلا۔ دوسرے صدمے۔ لیکن حسن کے ساتھ ساتھ مثالی حقیقی صدمے کے بلند معیار پر کون پورا اُترے گا؟ کوئی پورا اُترے گا بھی یا نہیں۔ دیکھتے ہیں۔ وقت آنے پر دیکھیں گے۔ فی الحال ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔

یوں حسن کو اس غیر معمولی مقام اور مقام حیرت دونوں تک پہنچا دینے والے سلسلہ واقعات کا آغاز ایک خلافِ معمول لیکن پھر بھی عام سے واقعے سے ہوا تھا یعنی ملازمتی ذمہ داری کے سلسلے میں ایک دور افتادہ پہاڑی مقام تک کا سفر اور واپسی۔ لیکن سفر اس لحاظ سے خلافِ معمول تھا۔ کہ اس سے پیشتر حسن کبھی اتنی طویل اور متنوع مسافتوں کے کسی تجربے سے نہیں گزرا تھا اُس کی اُچٹتی منظر بینی بیشتر وہی صبح و شام کے پون پون گھنٹوں کے پک اینڈ ڈراپ کے درمیانی سفر تک ہی محدود رہی تھی سوائے بعض خاندانی تقریبات میں ناگزیر شرکت کے لیے کیے گئے میدانی علاقوں کے چند گھنٹوں کے سفروں کے جو اُس کے لیے کوفت، جبر اور آزمائش کے علاوہ اور کچھ نہیں رہے تھے۔

لیکن اس خلافِ معمول سفر پر جانے کا آفس آرڈر حسن کو کچھ ایسے ایام کے دوران ملا جب وہ خود ایک مختلف کوفت اور آزمائش سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں اُسے اپنی عمر بھر کی "اُچٹتی منظر بینی" کا معمول شدید خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ فیکٹری کی اعلیٰ انتظامیہ کے حلقوں میں یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ اُسے ملازمت میں ترقی دے کر شہر ہیڈ کوارٹر بھیجا جا رہا ہے اور ظاہر ہے ایسا کوئی بھی نیا معمول اُس کے زندگی بھر کے معمول کو ختم کر دیتا۔ وہ اس خبر سے بے چین ہوا پھر پریشانی اور اضطراب اس قدر بڑھا کہ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اُس کی بے خوابی اور پٹھوں کے کھنچاؤ کے لیے نسخہ لکھ دیا۔ ادویات نے، وہ جو بھی تھیں اُسے کافی پُرسکون کر دیا۔ اُس کی گردن کے کھنچے پٹھے بھی ڈھیلے پڑنے لگے اور کئی راتوں کے بعد سونے بھی لگا۔ وہ ایک عجیب طرح سے مطمئن سا ہو گیا تھا اور سوچتا تھا کوئی بات نہیں ایم۔ڈی سے صاف کہہ دے گا کہ اُسے یہ ترقی قبول نہیں۔ چنانچہ خلافِ معمول سفر پر روانگی سے پہلے کسی آئندہ کوفت کا خدشہ اس کے دل میں نہیں تھا بلکہ اس کا دل تو انوکھی توقعات اور نامعلوم خدشوں کے چیلنج سے بھرا تھا۔ تحیر کے بے شمار چھوٹے بڑے چیلنج جن کے کسی بھی [illegible] آزار کو وہ ہمیشہ بڑی کامیابی سے اپنے احتمالی تشریحی ہتھ کنڈوں کے ذریعے زائل کر دیا کرتا تھا۔ لیکن حسن نہیں جانتا تھا کہ اُس خلافِ معمول سفر کے دوران اُس کی "اُچٹتی منظر بینی" اُچٹنے سے محروم ہو کر کسی نامعلوم سمت میں مڑنے والی ہے اور ایک تحیر کی کایا کلپ اُس کے ممکن/ناممکن/احتمالی/غیر احتمالی کے آزمودہ فارمولوں کو لایعنی بنانے والی ہے۔

حسن کی کمپنی نے اپنی کیمیکل فیکٹری کی معدنی کیمیاوی ضروریات پورا کرنے کے لیے عرصے سے شمالی پہاڑی علاقوں میں ڈولومائیٹ فیلڈ سار اور سالیکا کی محدود کان کنی کا ایک یونٹ قائم کر رکھا تھا۔ جو ڈولومائیٹ مائیننگ سائیٹ کہلاتا تھا۔ کچھ عرصے سے مقامی ٹھیکیدار اور کمپنی کے بعض کارکنوں کی ملی بھگت سے سائیٹ اکاؤنٹس میں بدعنوانی کی شکایات مل رہی تھیں چنانچہ ایک سات رکنی ٹیم تفتیشی آڈٹ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس ٹیم میں سینئر اکاؤنٹینٹ حسن رضا ظہیر بھی شامل تھا۔ اُس دور افتادہ پہاڑی مقام تک پہنچنے کے لیے کمپنی نے دو گاڑیاں تفویض کیں۔ ایک بڑی لینڈ روور جس میں پوری آڈٹ ٹیم سما سکتی تھی اور دوسری ایک زائد گاڑی جو مائیننگ یونٹ کا تمام ریکارڈ کمپیوٹرائزیشن کے لیے واپس لانے اور کسی ہنگامی صورت حال میں متبادل کے طور پر میسر ہونے کے لیے ہمراہ کی گئی۔ لینڈ روور میں یقیناً اتنی جگہ تھی کہ پوری ٹیم کے علاوہ بھی دو تین افراد بیٹھ سکتے تھے لیکن حسن نے دوسری گاڑی میں پچھلی سیٹ پر اکیلے ڈرائیور کے ہمراہ بیٹھنے کو ترجیح دی۔ بلکہ اُس کے اس فیصلے پر اُسے کچھ تمسخرانہ اور طنزیہ فقروں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن وہ جانتا تھا کہ طویل سفر میں کسی مداخلت کے بغیر "اُچٹتی منظر بینی" کے لیے یہ ایک مثالی صورت حال ہو گی۔

دونوں گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے متفقہ سٹاپ اور اوقات طے کیے لیکن اس کے علاوہ وہ اپنے چھوٹے موٹے سفری فیصلے کرنے میں آزاد تھے اور ایک دوسرے کا پیچھا کرنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ حسن کی گاڑی کا ادھیڑ عمر باتونی ڈرائیور نور خان خوش تھا کہ اُسے بالکل اکیلے سفر نہیں کرنا پڑے گا صاحب ساتھ ہو گا۔ لیکن تھوڑے سفر کے بعد ہی اُسے احساس ہوا کہ صاحب تو کوئی بات ہی نہیں کرتا اور مسلسل کھڑکی سے باہر ایسے دیکھتا رہتا ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر بھی اُس نے سوچا وہ ہمت نہیں ہارے گا اور کوئی نہ کوئی موقع دیکھ کر صاحب کی چُپ توڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اس کا تجربہ اُسے بتاتا تھا کہ بڑے بڑے 'چُپ گروپ' لوگ بھی کہیں نہ کہیں ضرور بول پڑتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو نور خان سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ کسی باتونی آدمی کے لیے اکیلا ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا کسی کم گو شخص کا ساتھ۔ اور صاحب تو اُسے کم گو سے بھی آگے کی کوئی چیز لگتا تھا۔ بس کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ تو جو وہ باہر دیکھتا ہے تو جو اُسے نظر آتا ہے وہ...... وہ بھی تو اُسے بتا سکتا ہے کیا ہے۔

"صاحب یہ خالی ایریا دیکھتا ہے؟"

کوئی جواب نہیں۔

"یہ پچاس ایکڑ کا...... گرد کانٹا تار لگا ہے۔"

کوئی جواب نہیں۔

"ادھر ہمارا مالکوں کا مخالف گروپ بہت بڑا رائس مل بناتا ہے"۔

کوئی جواب نہیں۔

"بڑا سخت مقابلہ ہے صاحب۔"

"ہوں۔"

نور خان ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور گاڑی ہائی وے پر دوڑتی رہتی ہے۔ کچھ تو صاحب ایسا دیکھے گا کہ خود اُس سے بات کرے گا۔ کسی سے بھی بات کرے گا۔ ہے اور دیکھتا ہے کہ اگلے قصبے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں اور اسی لمحے صاحب بات کرتا ہے۔

'روکو' حسن کہتا ہے۔ پہلے نور خان سمجھتا ہے اُس کے کان بجے ہیں وہ گاڑی رہتا ہے۔ 'روکو' حسن پھر کہتا ہے اور اس کی آواز میں کچھ ایسا تردد ہے کہ نور خان صاحب' 'جی صاحب' کہتا گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیتا ہے۔ بائیں طرف پہلی دکانیں ہیں۔

عمر بھر بیماریوں اور ادویات کے استعمال کا تجربہ بہت محدود ہونے کی وجہ بھول ہی گیا تھا کہ جن دواؤں نے اُس کی گردن کی اکڑن دور کی تھی اور اُسے پھرے کے قابل بنایا تھا وہ دوائیں اُسے اُس خلاف معمول سفر کے دوران بھی استعمال کرنا وہ انہیں گھر بھول چکا تھا۔ پتہ نہیں کیوں نور خان کی بے تکی سی بات "صاحب یہ خالی ایریا ہے؟" سُن کر اُسے اچانک ان دواؤں کا خیال آ گیا۔ اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اس کا جسم سُن سا ہو گیا لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر کا نسخہ بھی اُس کے بریف کیس میں پڑا ہے رستے میں کہیں بھی وہ کسی میڈیکل سٹور سے لے سکتا ہے۔ وہ صبح کی خوراک بھول گیا ہے اور دوپہر آگے آنے والی ہے۔ اُسے جلد

ادویات حاصل کرنا ہوں گی۔ اُس نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی تو اُس کے گردن کے پٹھوں میں اکڑن اور درد پھر واپس آنے لگا۔ وہ مسلسل باہر دیکھ رہا تھا لیکن اُچٹتی نظر سے نہیں۔ منتظر متلاشی نظروں سے اور پھر سڑک کے کنارے ایک قصبے کی دکانیں شروع ہوتے ہی اُس نے کہا۔

'روکو'۔

نور خان اب صاحب سے کچھ پوچھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ لیکن حسن اُسے کچھ پوچھنے کا موقعہ دینے سے پہلے ہی گاڑی سے اُتر چکا ہے۔ وہ ان چند قصباتی دکانوں کی طرف جا رہا ہے جن میں ایک چھوٹا سا میڈیکل سٹور بھی ہے۔ نور خان دور سے دیکھتا ہے کہ صاحب دکاندار کو کوئی کاغذ دیتا ہے اور نور خان جان جاتا ہے کہ وہ کوئی نسخہ ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ صاحب کی کس بیماری کا نسخہ ہے۔ حسن جانتا ہے اور بوڑھا دکان دار نذر حسین بھی بخوبی جانتا ہے کہ ایسی دوائیں کیسی بیماریوں کے لیے دی جاتی ہیں۔ اُن میں سے ایک دوا وہ خود عرصے سے استعمال کر رہا ہے۔ اس دوا کا نام ڈایازی پام ہے۔

نذر حسین علاقے کی سول ڈسپنسری سے کمپاؤنڈر ریٹائر ہوا تھا اس لیے وہ ادویات کے بارے میں عام لوگوں سے زیادہ جانتا ہے۔ لیکن اُس وقت وہ شش و پنج میں ہے۔ کار سے اُترنے والے شہری گاہک کے نسخے میں ایک دوا جس برانڈ کی ڈایازی پام لکھی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے۔ لیکن تھوک میں ملنے والی کُھلی وہی دوا اُس کے پاس وافر مقدار میں موجود ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ پریشانی کا مریض جسے سکون چاہیے اُس کی اس پیشکش پر کیسا ردعمل ظاہر کرے گا کہ وہ اُس کے برانڈ کی بجائے اپنی مگر وہی دوا اُسے دے سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے وہ اُس سے معذرت کر لے لیکن وہ گاہک چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔ نذر حسین حسن کو صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ برسوں تک دیہاتی مریضوں کو ادویات کا جمع خرچ سمجھانے کے معمول نے اُس کے لہجے میں ایک ایسا اعتماد بھر دیا ہے جو حسن کو فوری متاثر کرتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے خاص طور پر ریٹائرڈ کمپاؤنڈر کی یہ دلیل کہ اسپرین کسی بھی نام سے آئے ہے تو اسپرین۔ بس ڈایازی پام کسی بھی نام سے آئے ہے تو ڈایازی پام۔ حسن دوا لینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اُدھر دور سے دیکھتا نور خان حیران ہے کہ صاحب

دکاندار سے اتنی لمبی بات کیا کر رہا ہے۔

نذر حسین ادویات کا لفافہ گاہک کے حوالے کرتا ہے۔ گاہک ادائیگی کرتا ہے۔ وہ
اُسے جاتے ہوئے دیکھتا ہے اور دل سے خواہش کرتا ہے کہ ادویات اُسے وہ سکون دے دیں
جس کی اُسے ضرورت ہے۔ اُسے خیال آتا ہے کہ اُسے خود بھی ایک گولی لینی چاہیے اور چائے
منگوانی چاہیے۔ گاہک گاڑی میں بیٹھتا ہے۔ گاڑی چل پڑتی ہے۔ اور عین اُس وقت ریٹائرڈ
کمپاؤنڈر کو یاد آتا ہے کہ وہ ایک خاص بات جو اُس وقت بار بار اُس کے ذہن میں آ رہی تھی
جب وہ گاہک کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اُس کے قائل ہو جانے کی صورت میں
اُسے بار بار تاکید سے بتائے گا، وہی بات وہ اُسے سرے سے بتانا بھول گیا تھا۔ وہ اس
بھولنے کے مرض کا کیا کرے۔ گاہک کو بتانا ضروری تھا کہ اُسے کھلی ڈایازی پام کی آدھی گولی
لینی ہے کیونکہ نسخے میں لکھی گولی اور کھلی گولی میں دو اور پانچ کا فرق ہے۔ نذر حسین نسیان کا
مریض ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا نسیان عمر کی وجہ سے ہے لیکن ڈایازی پام کے بارے میں
کافی کچھ جاننے کے باوجود بھی وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے نسیان کی اصل وجہ بھی ڈایازی پام ہی
ہے۔ کیونکہ اس دوا کے ذیلی اثرات میں نسیان، خاص طور پر حالیہ یادداشت کی خرابی
سرفہرست ہے۔ نذر حسین کا سول ڈسپنسری کا ڈاکٹر یہ بات جانتا تھا اور نذر حسین کی ملازمت
کے آخری ایام میں اُس کی بیوی کی موت کے صدمے کو اُس کے لیے قابل برداشت بنانے
کے لیے ڈایازی پام تجویز کرتے وقت اُسے پندرہ دن سے زیادہ استعمال نہ کرنے کی ہدایت
کی تھی اور اُسے بتایا بھی تھا کہ یہ دوا یادداشت کی خرابی پیدا کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ
پندرہ دن نذر حسین کے لیے باقی ساری عمر پر محیط ہو گئے تھے۔ لیکن جو بات نذر حسین کا ساتھ
ڈاکٹر بھی شاید ایک عام چالو ڈاکٹر ہونے یا ترجیحات میں فرق ہونے کی بنا پر نہیں جانتا تھا وہ یہ
تھی کہ انسانی جسم و جان پر ڈایازی پام کے ذیلی ناپسندیدہ اثرات نسیان سے کہیں آگے جنونی
کیفیات تک جا سکتے ہیں۔ گو نسیان اگر بہت احتمالی ہے تو جنونی کیفیات انتہائی کم احتمالی۔

نذر حسین کو پیشہ ورانہ پریشانی گھیرے میں لے لیتی ہے وہ کھوکھے والے کو چائے
لانے کا کہتا ہے۔ مگر آدھا گھنٹہ بعد شیشے کے چھوٹے سے گلاس سے آخری گھونٹ لیتے وقت
اُسے یاد نہیں آتا کہ اُس نے کار والے گاہک کو کتنی گولیاں دی تھیں۔ دو گھنٹے بعد اس کا ملازم

مددگار لڑکا جسے اس صبح خلاف معمول کسی ضروری کام سے کہیں جانا پڑ گیا تھا (اور حسن کی
صورتِ حال کیا کی کیا ہو گئی۔ کہاں کے واقعات کہاں کہاں اثر ڈالتے ہیں۔ حیرت ہے)
دکان پر واپس آتا ہے تو وہ اُسے اپنی غلطی کے بارے میں بتانا چاہتا ہے لیکن اُس کے ذہن
میں نہیں آتا کہ وہ گاہک جو ویگن سے اتر کر...... ویگن سے یا کار سے...... خیر...... تو وہ گاہک
جو دو تین مشہور برانڈ کی ڈایازی پام میں سے کوئی ایک...... کون سی...... مگر کون سی مانگ رہا
تھا۔ وہ خاموش رہتا ہے اور دل ہی دل میں فیصلہ کرتا ہے کہ سارا قصور طیفے (لڑکے کا نام) کا
ہے نہ وہ جاتا نہ ایسا ہوتا...... کیا ہوا......؟ پھر دن میں کسی وقت طیفے نے جب اُسے پوچھا کہ
ڈایازی پام کی پیلی گولیوں والا ڈبہ کیا کھولا گیا تھا کہ اچھی طرح بند نہیں تو نذر حسین کو کچھ یاد نہ
آیا کہ ایسا آخر کیوں ہے۔ نسیان ہر قسم کی پریشانی کے خلاف مسلسل جیت رہا تھا خواہ وہ پریشانی
ڈایازی پام ہی کیوں نہیں رہی ہو۔

ادارتی نوٹ

ہم سمجھتے ہیں کہ ''حسن کی صورتِ حال'' میں ''اشیا کی سوانح'' کی بے پناہ اہمیت کا
تقاضہ ہے کہ سوئٹزر لینڈ کی ہافمین لا۔روش کمپنی کی ایجاد کردہ مشہور زمانہ دوا ڈایازی پام کی سوانحی
اور صفاتی تفصیلات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ دنیا کی مقبول ترین ادویات میں یہ ایک دوا
حسن کی صورتِ حال پر کیوں اور کیسے اثر انداز ہوئی اور ہوئی بھی یا نہیں؟ ہم اس بارے میں کوئی
آخری فیصلہ نہیں دیں گے کیونکہ ''حسن کی صورتِ حال'' غالباً کا کھیل ہے اور مکمل یقین اور مکمل
لاعلمی دونوں کا یہاں کوئی عمل دخل نہیں۔

ڈایازی پام کی کہانی ایک سطح پر ڈاکٹر لیو سٹرن باخ کی کہانی بھی ہے۔
ڈاکٹر سٹرن باخ ایک پولش یہودی کیمیا دان تھا جو 1908ء میں آسٹریا میں پیدا ہوا۔ آرگینک
کیمسٹری میں اعلیٰ تحقیقی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سوئٹزر لینڈ کی مشہور دوا ساز کمپنی ہافمین
لا۔روش سے منسلک ہو گیا۔ یورپ میں نازیوں کے بڑھتے ہوئے غلبے کو دیکھتے ہوئے کمپنی
نے 1941ء میں ڈاکٹر سٹرن باخ کو اپنے دوسرے یہودی سائنس دانوں سمیت نیو جرسی
امریکہ میں اپنی شاخ میں بھجوا دیا۔

موڈ بدلنے والی ادویات۔ سکون آور ادویات۔ ذہنی پریشانی کا خاتمہ کرنے والے کیمیاوی مرکبات پر تحقیق بیسویں صدی کے شروع سے ہی دوا ساز کمپنیوں کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکی تھی۔ افیون، کلورل ہائیڈریٹ، برومائیڈ اور پھر 1930ء میں ایجاد ہونے والے باربیوریٹس سب اپنے نشہ آور ذیلی اثرات کی وجہ سے قابل قبول نہیں رہے تھے۔ 1950ء میں Phenothiazine اور پھر Meprobromate بھی پریشانی دور کرنے والی اور کم نشہ آور ادویات کے طور پر سامنے آئیں لیکن ان ادویات کی کارکردگی بھی پوری طرح تسلی بخش نہیں تھی۔

ان حالات میں ڈاکٹر لیو نے 1954ء میں کچھ ایسے کیمیاوی مرکبات پر پھر سے تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا جن کا مطالعہ اُس نے بیس سال قبل اپنی تعلیمی زندگی کے دوران تحقیقی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کیا تھا یہ مرکبات Benzheptoxdiazines کہلاتے تھے لیکن اُن کے حیاتیاتی اثرات ابھی نامعلوم تھے۔ ڈاکٹر لیو نے اپنی نئی تحقیقی کوشش کے ذریعے چالیس نئے مرکبات دریافت کیے لیکن بدقسمتی سے وہ سب بطور ادویات بے اثر اور بے مصرف ثابت ہوئے۔ آخر میں اُس نے اپنی تحقیق کا رخ بدلنے کے لیے ایک مرکب کو ایک دوسرے کیمیکل Methylamine سے کیمیاوی عمل سے گزارا اور اُسے ایک سفید قلمی پانی میں حل ہونے والا پاؤڈر جیسا مرکب حاصل ہوا جسے اُس نے R05-0690 کا لیبل لگایا اور اس کے طبی خواص پر بعد میں تحقیق جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن لیو سٹرن باخ کا کہنا ہے کہ وہ بعد میں اس مرکب کو سرے سے بھول گیا اور ڈیڑھ سال تک بھولا ہی رہا۔ حتیٰ کہ 1957ء میں ڈاکٹر لیو کی لیبارٹری کی صفائی وغیرہ کے کام کے دوران اُس کے ایک اسسٹنٹ کی نظر اس کیمیکل پر پڑی۔ اُس نے ڈاکٹر سٹرن باخ سے پوچھا کہ وہ اُسے پھینک دے یا پڑا رہنے دے۔ تب ڈاکٹر کو اپنا فراموش شدہ R05-0690 یاد آ گیا۔ وہ جواب دینے سے پہلے چند لمحے ہچکچایا پھر اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ اُسے لا۔ روش کی فارموکولوجیکل ریسرچ لیبارٹری میں مزید ٹیسٹوں کے لیے بھجوا دے۔

اُسی سال جولائی میں سٹرن باخ کو فارموکولوجی کے سربراہ ڈاکٹر لوویل رینڈل کی رپورٹ ملی کہ چوہوں اور بلیوں پر یہ کیمیکل آزمانے سے پتہ چلا ہے کہ یہ عضلات کو ڈھیلا کرنے، سکون دینے، کھنچاؤ کم کرنے میں مدد دیتا ہے اور خواب آور بھی ہے۔ اور اہم بات یہ

ہے کہ Meprobamate کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ موثر ہے۔ ڈاکٹر سٹرن باخ کے رد شدہ چالیس کیمیاوی مرکبات کے مقابلے میں یہ کیمیکل 1,4-Benzodiazepine ایک سات ارکان کا رنگ فارمولا تھا۔ جو زبردست فارماسیوٹیکل صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اس طرح کیمیاوی ردی میں پھینکے جانے سے بچ نکلنے والا یہ مرکب Chlordiazepoxide 1960ء میں دنیا کی پہلی Benzo گروپ کی دوا لبریم کی شکل میں مارکیٹ ہوا۔ تین سال بعد اس گروپ کی دوسری دوا Diazepam ویلیم کے برانڈ نام سے آئی جو لبریم کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر تھی خاص طور پر ذہنی پریشانی دور کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے (حسن کو یہی دوا تجویز کی گئی)۔ جلد ہی یہ ادویات دنیا کی سب سے زیادہ مقبول عام ادویات میں شامل ہو گئیں اور ہافمین۔ لا۔ روش کمپنی نے اس کی فروخت سے اربوں ڈالر کمائے۔ چند ہی دہائیوں میں اس گروپ کی تقریباً چالیس ادویات مارکیٹ میں آ گئیں۔

Benzo ادویات پر تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا اور اُن ادویات کے نظام عصبی پر اثرات اور ان کی نافع اور مضر دونوں خصوصیات پوری تفصیل سے سامنے آئیں۔ یہاں ہم حسن کی صورتِ حال کے پس منظر میں مختصراً ان کا ذکر کریں گے۔

تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ Benzo ادویات انسانی دماغ میں موجود عصبی لہروں پر اثر انداز ہونے والے مادوں میں سے ایک مادے Gamma-Aminobutyric-Acid (Gaba) کے قدرتی اثرات میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ Gaba جو ایک Neuro-Transmitter ہے قدرتی طور پر دماغ میں ہونے والی ایک خاص قسم کی عصبی ہل چل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ Gaba کے اثرات میں اضافہ کر دینے سے ان ادویات کی مسکن (Sedative) خواب آور (Hypnotic) ذہنی پریشانی میں کمی کرنے (Anxiolytic) تشنج دور کرنے (Anticonvulsant) پٹھوں کو ڈھیلا کرنے (Muscle-Relaxant) خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ (نوٹ۔ ان معاملات کی حیاتیاتی کیمیاوی فنی تفصیلات کے بارے میں بھی گو ہم سب کچھ جانتے ہیں لیکن عوام الناس کی سہولت کے پیش نظر پیش کرنے سے اجتناب کریں گے)۔ Benzo کی ان خصوصیات سے اُس کے بہت نپے تلے انداز میں استعمال کے ذریعے مندرجہ ذیل ذہنی/جسمانی عارضوں کے علاج کے لیے کام لیا جانے لگا۔

شدید ذہنی پریشانی۔ بے چینی اور ٹینشن کی کیفیات۔ دوسرے افراد سے سماجی روابط قائم کرنے میں دشواری۔ خلجان (Agitation)۔ بے خوابی (حسن کے اس مسئلے کے لیے تجویز کی گئی)۔ یاسیت۔ افسردگی کی ایسی کیفیات جن میں بے چینی نمایاں ہوتی ہے۔ دل، تنفس کے عمل سے متعلق عوارض جن کی اصل وجہ جسمانی کی بجائے نفسیاتی/ذہنی ہوتی ہے مثلاً نفسیاتی انجائینا، اختلاج قلب، جذباتی محرکات سے جنم لینے والا بلڈ پریشر، تنفس کے بعض امراض، پیٹ کے درد، انتڑیوں کی تشنجی کیفیات، مثانے کے تشنجی امراض، حیض میں بے قاعدگی اس کے علاوہ نفسیاتی وجوہات پر مبنی سر درد، پٹھوں کا اکڑاو (حسن کے اس مسئلے کے لیے بھی ڈایازی پام تجویز کی گئی) جلدی امراض، دمہ، السر، قولنج وغیرہ۔

دنیا میں آج تک کوئی ایسی دوا ایجاد نہیں ہوئی جو مطلوبہ نافع اثرات کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی ناپسندیدہ اور بعض اوقات تو انتہائی مضر ذیلی اثرات پیدا نہ کرتی ہو۔ Benzo ادویات بھی اس بنیادی طبی حقیقت سے مبرا نہ تھیں چنانچہ طویل عرصے تک عالمی سطح پر اس کے استعمال کے بعد بے شمار قسم کے ناپسندیدہ ذیلی اثرات/سائیڈ ایفیکٹس سامنے آنے لگے۔ مثلاً

تھکاوٹ، غنودگی، پٹھوں کی کمزوری، توجہ میں کمی، جذباتی بے حسی، سر درد، سر چکرانا، ہر چیز کا دو نظر آنا، نظامِ انہضام کی خرابیاں، جنسی خواہش میں کمی یا زیادتی، یادداشت خصوصاً حالیہ واقعات کی یادداشت کا متاثر ہونا (دیکھو نذر حسین ریٹائرڈ کمپاؤنڈر حال دوا فروش کی مثال) اور اس سے متعلقہ غیر مناسب رویہ۔

ان ذیلی اثرات کے علاوہ Benzo ادویات کے کچھ ذیلی اثرات وہ ہیں جنہیں ماہرین طب Paradoxical اثرات کے زمرے میں ڈالتے ہیں (ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کی صورتِ حال کے حوالے سے یہ انتہائی اہم ہیں) اس اصطلاح کے استعمال سے ان کی مراد یہ ہے کہ جن عوارض کے علاج کے لیے یہ ادویات استعمال کی جاتی ہیں ان ہی سے مماثلت رکھتی کیفیات ذیلی ناپسندیدہ اثرات کی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس نوع کے چند سائیڈ ایفیکٹس مندرجہ ذیل ہیں۔

شدید بے چینی، بے کلی، چڑچڑاہٹ، جارحانہ رویہ، واہمے، جنونی غصے کے دورے، ڈراؤنے خواب، وہم، التباس (یعنی ایسے مناظر کا دیکھنا یا آوازوں کا سننا جو حقیقت میں کوئی

وجود نہیں رکھتیں)، دیوانگی، انتہائی نامناسب سماجی رویہ، شخصیت میں نمایاں تبدیلیاں جن کا تعلق حقیقت کے ادراک اور خود آگہی سے ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ Benzo ادویات کے مذکورہ بالا ذیلی اثرات کا ظہور ایک احتمالی اور امکانی میدان ہے جو انتہائی احتمالی (یادداشت کی خرابی) سے لے کر انتہائی کم احتمالی (جنونی کیفیات) تک پھیلا ہوا ہے مگر جو ظاہر ہے ناممکن نہیں ہے اور جو ناممکن نہیں اُسے کبھی نہ کبھی رونما ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا یہی حسن کی صورتِ حال کا پہلا اور آخری رہنما اصول ہے۔ پس ہم Benzo کی کہانی اور ڈاکٹر سٹرن باخ کے انسانیت پر احسان کی کہانی یہیں ختم کرتے ہیں اور حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔

نور خان دیکھتا ہے کہ صاحب واپس آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خریدی دواؤں کا ایک چھوٹا سا لفافہ ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔

''چلیں صاحب؟'' وہ پوچھتا ہے۔

''ہوں'' نور خان کو صاحب کی آواز آتی ہے وہ گاڑی آگے بڑھاتا ہے اور بیک مرر میں دیکھتا ہے کہ صاحب اپنے بیگ میں سے پانی کی ایک بوتل نکال رہا ہے یقیناً دوا کھانے کے لیے۔ صاحب دوا کھا لیتا ہے۔ نور خان کا دل چاہتا ہے وہ اُس سے پوچھے کہ سب خیریت تو ہے۔ لیکن اس کی ہمت نہیں پڑتی۔ یوں بھی اب آگے زیادہ پر ہجوم سڑک آنے والی ہے جہاں قصبے کے لوگ یوں آزادانہ پھر رہے ہوتے ہیں جیسے سڑک کوئی کھیل کا میدان ہو۔ آگے اس سڑک کے کئی طرح کے ٹکڑے آتے رہتے ہیں اور نور خان کو اس جگہ سے بطور ڈرائیور سخت نفرت ہے۔ بار بار ہارن بجانا پڑتا ہے۔ ٹریفک جیم رہتی ہے۔ کوئی نہ کوئی پلی ٹوٹی رہتی ہے۔ یا پھر سڑک آئے دن بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ہارن چیک کرنے کے لیے دو تین بار بٹن دباتا ہے۔

سکول کے بچے اور سورج مکھی کے کھیت: عدم بازیافت کا حیرانیہ

حسن ہارن کی آواز سنتا ہے اور دیکھتا ہے کہ یہ خلاف معمول سفر اس کے لیے منظر بینی کے کچھ مختلف زاویے ضرور سامنے لا رہا ہے۔ لیکن کچھ عجیب ہے کہ معمول کے اُچٹنے

کی بجائے نظریں جیسے منظر پر چپکنے لگی ہیں۔ چیزیں کچھ دیر تک اُس کی نظروں تلے رہتی ہیں۔ جیسے رکتی ہیں اور پھر گزرتی ہیں حالانکہ گاڑی متحرک ہے۔ دیہاتی، قصباتی گہما گہمی کے کئی رنگ حسن کے لیے نرالے ہیں۔ لوگ ایسے آزادانہ مزے سے پھر رہے ہیں جیسے وہاں کوئی سڑک موجود ہی نہ ہو۔ گاڑی رینگتی آگے بڑھتی ہے۔ نور خان بار بار ہارن بجاتا ہے مگر بے سود۔ ٹریکٹر، ٹرالیاں، کاریں ایسے کھڑی ہیں جیسے گزر نہیں رہیں پارک کی گئی ہیں۔ مکئی کے بھنے بھٹے، گنڈیریاں، ناریل کے ٹکڑے، ختائیاں، ہر چیز کو دیکھتے ہی اُن کا ذائقہ حسن کو جیسے اپنے منہ میں محسوس ہوتا ہے اُسے یاد نہیں پڑتا اُس نے پہلے کبھی ایسا محسوس کیا تھا (Gaba?)۔ تعویز، تسبیحیں، عطر کی شیشیاں، منجن کی ڈبیاں بیچنے والے گاڑی پر یلغار کر دیتے ہیں۔ ہر سودا بیچنے والے کے ساتھ ایک ایک گداگر چپکا ہوا ہے۔ حسن کسی پر توجہ نہیں دیتا وہ دیکھتا ہے کہ ایک لوہار کی دکان پر بھٹی دہکتی ہے اور زمین پر ایک گھوڑا پڑا ہے جس کی چاروں ٹانگیں بندھی ہیں۔ اگلی دو اور پچھلی دو الگ الگ۔ پھر لوہار ایک اوزار میں دہکتا ہوا کیل پکڑ کر گھوڑے کے ایک کُھر کے نزدیک لاتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہتھوڑے سے کیل کُھر میں ٹھونکنے لگتا ہے دھواں اٹھتا ہے اور زندگی میں پہلی بار گھوڑے کو نعل لگنے کا منظر دیکھنا حسن کو ششدر کر دیتا ہے۔ گاڑی تھوڑا آگے رینگتی ہے۔ حسن چاہتا ہے نور خان سے کہے خواہ مخواہ ہارن نہ بجائے اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں لیکن وہ اُسے کچھ نہیں کہتا اور سکول کے دیہاتی قصباتی بچوں کے ایک گروپ کو دیکھتا ہے۔ بچے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو پتلون قمیص پہنے اور ٹائی لگائے ہوئے ہیں اور دوسرے ملیشیے کی شلوار قمیص میں ملبوس ہیں۔ حسن دور سے انہیں دیکھتا ہے لیکن پھر بھی محسوس کرتا ہے کہ دونوں قسم کے بچوں میں کوئی کشمکش موجود ہے اور پھر اُس کشمکش یا جو کچھ بھی ان بچوں میں ہے کا اظہار کافی بے رحمانہ طریقے سے ہوتا ہے۔ ٹائی پتلون بچے کے پیچھے کھڑا ایک ملیشیا شلوار قمیص بچہ اُس کے کان پر اُنگلی سے زور کا پٹوکا مارتا ہے۔ بچہ بلبلا کر پلٹتا ہے اور پیچھے کھڑے بچے کی طرف دیکھتا ہے جو ایسا لاتعلق دائیں بائیں دیکھتا بن جاتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن حسن دیکھتا ہے اور دیکھنے سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہے کہ آگے پیچھے دائیں بائیں کھڑے بچوں میں اضطراب کی جو کیفیت ہے اس میں یوں تو تمسخر اور بیگانہ کھلنڈرا پن ہمکتا ہے لیکن غصے اور نفرت کی آنچ بھی لپکنے کو آتی ہے۔

پٹوکا مارنے والا بچہ پھر وہی حرکت کرتا ہے لیکن ابھی انگلی سے ضرب لگانے والا اُس کا ہاتھ آگے کھڑے بچے کے کان سے پوری طرح پلٹ بھی نہیں پاتا کہ اس کے پیچھے کھڑا ٹائی کوٹ بچہ اُس کے سر پر زور سے چپت لگاتا ہے۔ بس اتنا ہی عمل۔ ردِعمل در ردِعمل ہی کافی ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف ان کی بچگانہ جدوجہد جلد ہی گتھم گتھا زور آزمائی اور کہیں کہیں مار کٹائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ حسن کے ارد گرد آتے جاتے لوگ پہلے تو محظوظ ہوتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں مگر جب کوئی دیکھتا ہے کہ ایک ٹائی کوٹ بچے کو دوسرا اس کی ٹائی سے پھندا لگانے میں مصروف ہے اور اُس کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی ہیں اور پھر ایک ملیشیا شلوار بچے کو دوسرے نے اس بُری طرح دانتوں سے کاٹا ہے کہ اُس کے ہاتھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ اُن کے بستے اور سکول بیگ کُھل رہے ہیں اور کتابیں کاپیاں پنسلیں سڑک پر بکھر رہی ہیں تو وہ مداخلت کرتے ہیں۔ وہ دونوں قسموں کے بچوں کو کھینچ کھینچ کر الگ الگ کرنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ بکھری ہوئی تعلیمی چیزیں واپس ان کے بستوں، بیگوں میں ٹھونسنے لگتے ہیں ٹریفک میں بھی کچھ ہل چل ہوتی ہے۔ اور پھر حسن دیکھتا ہے کہ ایک جہاں دیدہ سا شخص دونوں قسم کے بچوں کو ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کو کہتا ہے کچھ بچے ہاتھ ملاتے ہیں کچھ نہیں ملاتے۔ پھر وہ ایک چھوٹے بچے کو اوپر اٹھا کر ایک چھوٹی سی دیوار پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اور بلند آواز میں کہتا ہے۔

"بس جی بس۔ صلح کر لو۔ صلح کر لو...... سب بھائی بھائی ہو...... لو جی...... یہ چھوٹا بچہ انگریزی نظم سنائے گا۔

"سناؤ گے نا۔"

"ہاں" بچہ کہتا ہے اور حسن دیکھتا ہے اور سنتا ہے کہ وہ بچہ انتہائی اعتماد سے ایک مشہور نرسری رائیم سنانا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کی پر اعتماد آواز اس کی عمر کی مناسبت سے حیرت انگیز طور پر بلند ہے اور سب تک پہنچ رہی ہے۔ حسن کی گاڑی رینگنا شروع کرتی ہے۔ حسن بے چین ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے نور خان پر بہت غصہ آتا ہے۔ اور وہ اپنے غصے پر حیران ہوتا ہے۔ گاڑی پھر رُک جاتی ہے اور لگتا ہے ابھی کافی دیر رُکے گی۔ ٹریفک کا اژدہام کچھ ایسا ہی ہے۔ حسن گاڑی کے ساتھ ہی باہر کھڑے دو ادھیڑ عمر افراد کی گفتگو بھی آسانی سے سن سکتا

ہے۔ پھر وہ بچے کی آواز سن کر حیران ہوتا ہے کہ کتنے اعتماد سے وہ ایک ہی نرسری رائیم بار بار پڑھتا جا رہا ہے۔

BA BA BLACK SHEEP
HAVE YOU ANY WOOL
YES SIR, YES SIR
THREE BAGS FULL
ONE FOR THE MASTER
ONE FOR THE DAME
ONE FOR THE LITTLE BOY
WHO LIVES DOWN THE LANE

بچہ ایک منٹ میں رائیم تقریباً تین بار دہرا رہا ہے۔ اس کی آواز میں کوئی ایسی ہٹ ہے کہ سب بچے اپنی اپنی قسم کے سکون میں چلے جاتے ہیں۔ اپنی چیزیں ڈھونڈنے اور اپنے آپ کو سنبھالنے لگتے ہیں۔ اور ٹریفک اب بالکل ساکن ہے۔ ہارنوں کی آواز اور نرسری رائیم کی آواز ایک دوسرے میں مل رہی ہیں۔ حسن باہر کھڑے دونوں افراد کی گفتگو زیادہ توجہ سے سننے لگتا ہے وہ نرسری رائیم سناتے بچے کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔

فرد نمبر 1: ''بڑی سوہنی انگریزی پڑھ رہا ہے۔ ہے کہ نہیں؟''

فرد نمبر 2: ''ہاں...... ہے...... ان سکولوں کا یہ تو پھر ہے۔ انگریزی میں چالو کر دیتے ہیں۔''

فرد نمبر 1: ''تو اور کیا چاہیے۔ انگریزی میں چالو ہو گیا تو زندگی بن گئی بچے کی، ویسے یہ سُنا تا کیا ہے؟ کوئی کوئی لفظ تو تمہارے پلے بھی پڑتا ہو گا۔ ہے کہ نہیں؟''

فرد نمبر 2: ''ایسا کوئی خاص کر تو نہیں پڑتا۔ کسی چھوکرے سے پوچھتے ہیں (ایک لڑکے کو بلاتا ہے) اوئے کاکا...... اوئے ادھر آ...... یہ چھوٹو کیا سُنا رہا ہے انگریزی میں کیا پڑھتا جا رہا ہے......؟ اوئے کاکا...... سُن...... رُک۔''

لڑکا: ''ہاں بابا کیا بات ہے؟''

فرد نمبر 2: ''او یار...... یہ چھوٹو کاکا...... کیا سُنا رہا ہے؟''

لڑکا: ''مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ اس کے کسی سکولیے یار سے پوچھو...... یہ جنہوں نے

پڑ گھنٹیاں پہنی ہوئی ہیں۔ گلوں میں پھاہ ڈالے ہوئے ہیں'' (ہنستا ہے)

فرد نمبر 1: ''پڑ گھنٹیاں......؟''

فرد نمبر 2: ''ان کی پینٹوں کو کہہ رہا ہے۔''

لڑکا: ''اور نہیں تو کیا۔ ان کی پیٹیوں سے اِن کے پد اِن کے اندر ہی پھنس جاتے ہیں اور گندی ہوا پھر سر کو چڑھتی ہے اور انہیں اثر ہو جاتا ہے...... اس کو دیکھو چھوٹے کو...... ادھر بھلا کسی کو آتا ہے سمجھ انگریزوں کا گانا...... کیسے با۔ باں...... باں...... کر رہا ہے منہ کھول کھول کر...... دیکھا بابا تم نے کیسے باں باں کرائی ان پڑ گھنٹیوں کو...... کیسی کراری پھینٹی لگائی پھر...... ہم نے۔''

فرد نمبر 1: ''اس کو جانے دو...... یہ سڑتے ہیں اُن سے...... خود انگریزی کا ٹوٹا بھی نہیں آتا...... باتیں کرتا ہے......''

فرد نمبر 2: (لڑکے سے) ''پھینٹی تو خیر پتر دونوں طرف سے برابر لگی ہے۔ بلکہ شاید تم ملیشیا شلواروں کو کچھ زیادہ ہی لگی ہے۔''

لڑکا: (بھڑک کر) ''...... سُوَر کا...... لگی ہے۔ بڈھیا تیری آنکھیں ہیں کہ کول ڈوڈے......''

فرد نمبر 1: ''دیکھا ان کی بدتمیزی...... جا...... جا...... بیٹا جا...... اللہ تجھے ہدایت دے......''

لڑکا: ''تجھے نہ دے ہدایت پہلے۔ تُو کمالے مولوی کا چھوٹا بھائی ہے ناں۔ مجھے پتہ ہے۔ تمہارا بڑا بھائی کمالا ملوانا ہے مولوی میت کا...... ملوانے گھی کھانے...... جمعراتیے۔ روٹیاں مانگنے والے...... ملوانے گھی کھانے...... چھوٹے مُنڈوں کے ساتھ بُرا کام کرتے ہیں۔''

(حسن لڑکے کی بے باکی پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ مسلسل نرسری رائیم سُنانے والے بچے پر بھی حیران ہے۔ پھر ایک تیسری حیرت دونوں حیرتوں پر حیران ہونے کے بعد انہیں آمنے سامنے رکھ دیتی ہے جیسے آمنے سامنے آئینے۔ حسن کو چکر سا آتا ہے۔ پھر سنبھل جاتا ہے۔ کچھ عجیب ہے اس کے ساتھ کچھ عجیب ہو رہا ہے۔ مگر کیا؟ (کیا؟GABA) وہ رائیم سنتا ہے۔ Ba Ba Black Sheep...... بے باک لڑکا دونوں افراد کو تمسخر اور حقارت سے دیکھتا

ہوا جاتا ہے تو حسن دیکھتا ہے کہ وہ وہی لڑکا ہے جس نے پہلا پٹو کا مارا تھا۔ دونوں افراد کچھ
بدمزگی کے عالم میں کھڑے رہتے ہیں پھر ایک دوسرے لڑکے کو بلاتے ہیں۔ ٹریکٹر بھی
رُکی ہوئی ہے)

فرد نمبر 1: "کاکا...... کاکا جی......"

لڑکا: "جی۔ انکل......"

فرد نمبر 1: "بیٹا تیرا نام کیا ہے؟"

لڑکا: "سعید کمال انکل......"

فرد نمبر 2: "اچھا بیٹا سعید کمال...... یہ جو تیرا ساتھی انگریزی پڑھ پڑھ کر سنا رہا ہے۔ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔"

لڑکا: (حیرت سے) "آپ کو نہیں پتہ انکل......۔ یہ نرسری رائیم ہے۔"

فرد نمبر 1: "ہچھ۔ ہچھ...... پر یہ کہتا کیا ہے؟"

لڑکا: "اچھا آپ کہتے ہیں اِس کا Ba Ba Black Sheep کا میں ترجمہ کروں۔"

فرد نمبر 2: "کچھ کر و یار...... کچھ بھی کرو...... بس ہمیں سمجھاؤ یہ کہتا کیا ہے۔"

لڑکا: "جی انکل...... اُسے بس ذرا شروع سے شروع کرنے دیں...... یہ کیا اس نے...... جی...... وہ کہہ رہا ہے...... با۔ با۔ کالی بھیڑ......"

فرد نمبر 1: (حیرت) "ہیں...... بابا کیا...... بھیڑ کا نام بابا ہے......"

لڑکا: "نہیں انکل...... یہ بھیڑ کی آواز ہے......۔ با...... با...... جیسے بھیڑ بولتی ہے ایسے۔"

فرد نمبر 1: "لیکن بیٹا بھیڑ تو کرتی ہے۔ بھے۔ بھے...... بھ۔ اے...... اے...... یہ کیسی بھیڑ ہے جو کرتی ہے با...... با...... با......"

لڑکا: (تھوڑا جھنجلا جاتا ہے) "انکل۔ انگلش میں بھیڑ...... با...... با...... ہی کرتی ہے......"

فرد نمبر 1: "لیکن بیٹا بھیڑ تو بھیڑ ہے۔ انگلش کیا اور دیسی کیا......"

"اور اوپر سے کالی بھیڑ......"

فرد نمبر 2: (دونوں افراد خوب ہنستے ہیں لیکن لڑکا کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوتا۔ جانے لگتا ہے فرد نمبر 1 تیزی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے جانے سے روکتا ہے)

فرد نمبر 1: "بیٹا باقی بھی تو بتا...... نا...... ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ بھیڑ انگریزی میں بھے بھے کرتی ہے تو با۔ با کی آواز آتی ہے...... ٹھیک ہے۔ آگے...... پر آگے...... وہ دیکھ چھوٹا...... پڑھے جا رہا ہے۔"

لڑکا: "اس کا مطلب ہے انکل...... با۔ با۔ کالی بھیڑ کیا تیرے پاس کچھ اون ہے؟"
(فرد نمبر 1 اور فرد نمبر 2 ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جیسے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں)۔

فرد نمبر 1: "اچھا بھیڑ سے پوچھا ہے...... پر کس نے پوچھا ہے؟"

فرد نمبر 2: "چھوڑ اسے...... جس نے بھی پوچھا ہے...... اچھا تو بھیڑ کیا جواب دیتی ہے......؟"

لڑکا: "جی انکل...... بھیڑ کہتی ہے...... ہاں سر...... ہاں سر...... نہیں (لڑکا رُک کر کچھ سوچتا ہے جیسے اپنے ترجمے سے مطمئن نہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد پھر زیادہ یقین سے کہتا ہے) ہاں بھیڑ جواب دیتی ہے...... "جی جناب۔ جی جناب...... تین تھیلے بھرے پڑے ہیں۔"

ادارتی نوٹ

ظاہر ہے حسن کسی طرح جان نہیں سکتا تھا مگر ہم جانتے ہیں کہ سعید کمال نامی یہ لڑکا بعد میں بڑا ہو کر ایک انتہائی کامیاب مترجم بنا لیکن تحریروں کا مترجم نہیں بلکہ سُننے بولنے والا مترجم جو ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی بولیاں بولنے والوں کے درمیان پھیلے لسانی اندھیرے میں روشنی کی شعاع بنا دونوں طرف لپکتا رہتا ہے...... سُنتا ہے بولتا ہے سُنتا ہے۔ اس لڑکے نے بنیادی بین الاقوامی زبانوں کے علاوہ کئی مقامی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی لیکن پھر ایک دن وہ خود بھی عالمی اور مقامی کے درمیان پھیلے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ ہم اس مترجم کی اندوہ ناک کہانی پھر کبھی سنائیں گے۔ اگر موقع ملا تو۔ فی الحال ہم 'کالی بھیڑ' پر

واپس آتے ہیں۔ تو لڑکا فرد نمبر 2 سے کہتا ہے۔

لڑکا: "جی جناب۔ جی جناب...... تین تھیلے بھرے پڑے ہیں"

فرد نمبر 2: "او تیرا بھلا ہو جائے۔ اکٹھے تین تھیلے...... کتنے بڑے تھیلے تھے......"

فرد نمبر 1: "او یار جتنے بھی بڑے تھے...... بات آگے سُننے دو......"

فرد نمبر 2: "نہ پر پھر بھی بڑی کوئی جتل بھیڑ ہوگی...... ہاں بیٹا آگے پھر (پھر ایک فرد
رائیم پڑھتے بچے کی طرف دیکھتا ہے۔ حیرت سے سر ہلاتا ہے)......
دیکھو...... پڑھے جا رہا ہے۔ پڑھے جا رہا ہے...... تو پھر آگے کیا کہتی ہے
بھیڑ...... تین تھیلے اُنے...... بھرے جو پڑے ہیں۔"

لڑکا: "جی انکل۔ بھیڑ کہتی ہے...... ایک تھیلا تو مالک کے لیے ہے اور ایک
لیے......"

فرد نمبر 1: "آ...... ہا...... آ...... بالکل...... یہ ہوئی نا بات...... مالک کا حق پہلے ہے
جی۔ نہ پر حق انصاف کی بات......"

فرد نمبر 2: "اوخو...... جو دوسرا...... جو مالکن کا ہے وہ بھی تو مالک کا ہی ہے۔ مالکن بھی
کی ہے نا......"

فرد نمبر 1: "آ...... یہ بھی ہے...... حساب سے...... مالکن نے کہیں اور تھوڑا لے جانے
اون کا۔"

(فرد نمبر 2 فرد نمبر 1 کو کان قریب لانے کا اشارہ کرتا ہے۔ فرد نمبر 1 اپنا کان
نمبر 2 کے منہ کے قریب کرتا ہے۔ فرد نمبر 2 کچھ کھسر پھسر کرتا ہے۔ دونوں قہقہے لگاتے
اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ پھر فرد نمبر 1 نمبر 2 کے کان میں کچھ کھسر پھسر
کرتا ہے پھر قہقہے اور ہاتھ پر ہاتھ مارنا اور یہ سلسلہ کچھ دیر چلتا ہے جیسے وہ لڑکے کو بالکل بھول
چکے ہیں۔ لڑکا انتہائی تجسس سے اُن کی طرف دیکھ رہا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اُن کے قریب
ہو کر اُن کی سرگوشیاں سُن سکے۔)

لڑکا: "انکل کیا باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے بھی بتائیں نا پلیز۔"

(فرد نمبر 1 اور فرد نمبر 2 چونکتے ہیں اور لڑکے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)

فرد نمبر 2: "نہ۔ بیٹا۔ نہ......"

لڑکا: "کیا باتیں کر رہے تھے؟ مزے کی باتیں تھیں......؟"

فرد نمبر 1: "کچھ نہیں بیٹا۔ کچھ نہیں...... تم آگے سناؤ...... کالی بھیڑ کا گانا......"

لڑکا: "گانا نہیں۔ رائیم...... سُناتا ہوں لیکن پہلے آپ بتائیں کیا باتیں کر رہے
تھے......؟"

فرد نمبر 2: "کچھ نہیں بیٹا...... کچھ نہیں...... تم آگے سناؤ...... ضد نہیں کرتے...... بڑوں کی
باتیں ہیں......"

لڑکا: "بتائیں...... بتائیں......"

فرد نمبر 2: (نرم لہجے میں) "بڑوں کا کہنا مانتے ہیں۔"

فرد نمبر 1: "تم نے قاعدے میں پڑھا نہیں؟ بڑوں کا ادب کرو......"

لڑکا: "ہم قاعدے نہیں پڑھتے......"

فرد نمبر 2: "اچھا یار نہ پڑھو...... تم اپنی کالی بھیڑ کی بات سناؤ آگے...... ہیں۔"

فرد نمبر 1: "شاباش......"

(لڑکا با دل نخواستہ پھر باقی ماندہ نرسری رائیم کا ترجمہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے)

لڑکا: "اب تو ویسے آخری لائین ہی رہ گئی ہے۔"

فرد نمبر 1: "اچھا تو پہلے کالی بھیڑ نے کہا تھا۔ تین اون کے تھیلے ہیں۔ ایک تو ہوا مالک کے
لیے...... دوسرا مالکن کے لیے...... (ہنسی دباتا ہے) اب باقی رہ گیا ایک......
حساب کرلو...... تھیلا اون کا......"

فرد نمبر 2: "کالی اون کا......"

فرد نمبر 1: "بڑی مہنگی ہوتی ہے ویسے...... نُچل کالی اون...... رنگی ہوئی نہیں...... اصل۔"

فرد نمبر 2: "چل رہنے دے...... تو بیٹا جی...... تیسرا تھیلا کدھر گیا؟"

لڑکا: "یہی بات تو بھیڑ آخر میں بتاتی ہے......"

فرد نمبر 1 اور فرد نمبر 2 (اشتیاق سے) "ای۔ شاوش۔ کیا...... کیا......"

لڑکا: "بھیڑ کہتی ہے۔ایک تھیلا اُس چھوٹے لڑکے کے لیے جو آگے کہیں گلی میں رہتا ہے"

(دونوں افراد کے منہ سے حیرت زدہ آوازیں نکلتی ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

فردنمبر1: "ہیں...... یہ کیا......"

فردنمبر2: "لڑکے کا ہے...... جو گلی میں...... آگے کہیں...... رہتا ہے۔"

لڑکا: "چھوٹے لڑکے کا...... چھوٹے لڑکے کا جو آگے کہیں گلی میں رہتا ہے۔ اون کا تھیلا اُس کا ہے......"

فردنمبر1: "اوخو...... پر کس طرح...... ایویں...... مفت میں...... ہے کون یہ لڑکا......؟"

فردنمبر2: "چھوٹا لڑکا......؟"

لڑکا: "پتہ نہیں۔"

فردنمبر2: "بیٹا ہے کیا؟ کالی بھیڑ کے مالک کا......؟"

فردنمبر1: "بیٹا ہوتا تو ساتھ رہتا...... آگے کہیں...... گلی میں جا کر...... کیوں رہتا؟"

فردنمبر2: "اور پھر ہے بھی ابھی چھوٹا...... بات پتے کی ہے...... بڑا ہوتا تو...... سوچتا...... گھر بار والا ہو کر ماں باپ سے باغی ہو کر کہیں اور جا بسا ہوگا"

فردنمبر1: "گلی میں آگے...... اچھا...... اچھا یہ بتا...... یہ چھوٹا لڑکا جو ہے تو حساب سے اُس طرح تو نہیں...... کہ ہے ویسے بڑا...... عمر کے حساب سے...... پر چھوٹا بیٹا مالک کا...... ہیں؟ اس طرح ہے؟"

لڑکا: "پتہ نہیں۔"

فردنمبر2: "تجھے بتایا نہیں ماسٹر نے......؟"

لڑکا: "نہیں۔"

فردنمبر1: "سب کچھ کالی بھیڑ پر ہی چھوڑا ہوا ہے۔"

فردنمبر2: (سوچتے ہوئے) "نہ پر بات ہے رمز کی...... کالی اون کی تیسری بوری اُسے مل جاتی ہے۔ مالکوں سے ہٹ کے......"

فردنمبر1: "بوری نہیں...... تھیلا......"

فردنمبر2: (چڑ کر) "او چلو جی...... جو بھی ہے...... بوری جتنے جتنے تھیلے آ گئے ہیں اب تو...... تجھے پورے کا پورا سالم اندر ڈال کر اوپر سے گنڈھ لگا دیں...... چل میرے بھائی۔ پتہ بھی نہ چلے......"

فردنمبر1: "یار تُو تو ایویں غصہ کر گیا ہے......"

فردنمبر2: "بات بات پر ٹوکا نہ کر...... میں گہری بات کر رہا ہوں...... تھیلا اون کا چھوٹے لڑکے کو بے حساباً ملے تو کیوں ملے۔ کوئی تو انصاف ہوگا...... کہتا ہے بوری...... نہیں تھیلا......"

فردنمبر1: (اک دم شور مچا دینے کے انداز میں) "اوخو...... خو...... میں سمجھ گیا...... چکر کیا ہے...... اچھا بیٹا جی...... یہ جو چھوٹا لڑکا ہے۔ یہ کالی بھیڑ کے مالکوں کے گھر کا ما ہے کوئی، مطلب ہے کوئی نوکر شوکر ہے ان کا......؟"

لڑکا: "پتہ نہیں......"

فردنمبر2: "آ...... نہیں...... ویسے تو نے یہ سوچا ٹھیک ہے...... اچھا نوکر پتہ نہیں ہے کہ نہیں...... اچھا...... یہ بتاؤ...... کوئی نائیوں کا چھور ہے یہ...... چھوٹا لڑکا...... بھیڑ اُسی نے 'مُنی' ہے...... بھیڑ چھیلنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے...... تھیلا اون کا اُسے مزدوری میں ملا ہوگا۔ پکی بات ہے......"

فردنمبر1: "نہ۔نہ۔نہ...... اتنی مزدوری نہیں مل سکتی۔"

(فردنمبر2 نمبر1 کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہے۔ پھر لڑکے کے کندھے پر تھپکی دیتا ہے)۔

فردنمبر2: "اُس کی بات چھوڑ...... نائیوں کا منڈا ہے نا......؟"

لڑکا: "پتہ نہیں......"

فردنمبر2: "ہر بات کا تجھے پتہ نہیں۔ پڑھاتے کیا......؟" (کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

فردنمبر1: "او یار...... عام خاص نائی بھیڑ نہیں مونڈتے...... وہ بڑا قینچا ہوتا ہے......"

فردنمبر2: "قینچا نہیں...... مشین...... کہہ لو...... مشینا ہوتا ہے...... حجامت کرنے کا۔ بندے کے سر پر پھیرو تو ایک ہی پھیرے میں ٹنڈ تیار ہو جائے۔ پر بات تُو بھی ٹھیک کرتا

ہے۔ یہ کام نہیں چھوٹے لڑکوں کا یہ......"

فردنمبر 1: "ہاں۔ سوائے اس کے کہ...... وہی جو میں نے قیافہ لگایا تھا...... کہ ہے ویسے بڑا چنگا بھلا سیانا...... پر کسی حساب سے چھوٹا بھی ہے...... اچھا تو...... تم...... [illegible] چھوٹا بیٹا ہے؟...... چلو سب سے چھوٹا......"

لڑکا: "پتہ نہیں۔"

فردنمبر 1: "چلو...... ایک تو جو بات پوچھو۔ اخے...... پتہ نہیں...... تنخواہیں کس بات کی لیتے ہیں ماسٹر......"

فردنمبر 2: "اور...... ان کے...... ٹائیوں والے سکول کے...... ماسٹر...... استانیاں...... تنخواہیں بھی انت کی لیتے ہیں......"

فردنمبر 1: "اور پتہ اتنا بھی نہیں...... کہ یہ جو چھوٹا لڑکا گلی میں آگے کہیں کھیہ کھا رہا ہے نا اُس کو ایویں مفت میں کالی بھیڑ کی اون کا تیسرا بھرا تھیلا کیوں مل جاتا ہے۔ یہ نہیں بتاتے۔ یہ نہیں پڑھاتے ماسٹر......؟"

لڑکا: "وہ تو نہیں بتاتے...... لیکن ویسے مجھے پتہ ہے اُسے کیوں ملتا ہے چھوٹے لڑکے کو اون کا تھیلا۔"

(لڑکا دونوں کو کان قریب لانے کا اشارہ کرتا ہے۔ فردنمبر 1 اور فردنمبر 2 ایک دوسرے کی طرف اور پھر لڑکے کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر ہچکچاتے ہوئے اپنے چہرے لڑکے کے منہ کے قریب لاتے ہیں۔ لڑکا ان کے کانوں میں کچھ کھسر پھسر کرتا ہے۔ فردنمبر 1 اور فردنمبر 2 کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں)

حسن حیرت سے یہ منظر دیکھتا ہے۔ اور اُسی لمحے ٹریفک متحرک ہو جاتی ہے اور نور خان گاڑی آگے بڑھاتا ہے۔ حسن بے چین ہو کر نور خان کو گاڑی روکنے کا کہنا چاہتا ہے لیکن پھر باز رہتا ہے۔ بے چین ہونے اور باز رہنے کے درمیان وقت کا ایک عجیب سا وقفہ ہے جسے حسن محسوس تو کرتا ہے لیکن پہچان نہیں پاتا۔ چند لمحوں کا وقت جیسے پورے دن پر پھیل گیا ہے لیکن پھر بھی وہ وہیں ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ حسن سوچتا ہے۔ (کیا GABA؟) وہ مڑ کر دیکھتا ہے۔ گاڑی کی انتہائی سست رفتار کی وجہ سے لڑکا ابھی تھوڑا ہی پیچھے ہے۔ پھر حسن

دیکھتا ہے کہ لڑکا الگ کھڑا ہو جاتا ہے اور ہنستا ہے۔ وہ فردنمبر 1 اور فردنمبر 2 کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ مارنا چاہتا ہے لیکن حیرت نے جیسے انہیں بت بنا دیا ہے۔ پھر لڑکا اپنے ہی بائیں ہاتھ پر زور سے اپنا دایاں ہاتھ مارتا ہے اور قہقہہ لگاتا ہے۔ حسن جانتا ہے کہ اگر وہ چند لمحے اور وہاں رُک سکتا تو دونوں افراد کے ردِعمل سے اُسے لڑکے کی کھسر پھسر کے بارے میں کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا۔ لیکن حسن رُک نہیں سکتا۔ لڑکے کی کھسر پھسر ایک خالی جگہ بن چکی جسے وہ اب خود پُر کر سکتا ہے۔ ہمیں چونکہ بوجوہ علم ہے کہ Ba Ba Black Sheep کا ترجمہ کرنے والے لڑکے نے دونوں افراد کے کان میں کیا کھسر پھسر کی اس لیے ہمیں کسی خالی جگہ کو پُر کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم حسن کے ساتھ چلیں گے۔

اور حسن سوچتا ہے چھوٹے لڑکے نے دونوں افراد سے کہا ہوگا۔ "پہلے تم بتاؤ تم نے ایک دوسرے کے کانوں میں کیا بات کی تھی؟"

حسن کا حیرانیہ کافی حد تک زائل ہو جاتا ہے۔ خالی جگہ پُر ہو جاتی ہے۔ وہ مسکراتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک نشیلا لٹکاؤ اور مزے کا پھیلاؤ ہے۔ جو دنیا سے حسن کے کسی نئے تعلق کا اعتراف ہے۔ نور خان عاجز آئے ہوئے انداز میں کہتا ہے۔ "اس جگہ ٹریفک بہت جام ہوتا ہے سر۔ روڈ پر بازار لگاتا ہے یہ پاگل لوگ۔ پونا گھنٹہ ضائع کر دیا۔ دلشاد کافی آگے نکل گیا ہوگا۔ دو بجے اُسے ہوٹل پر ملنا تھا سب نے روٹی کھانا تھا۔ ٹھیک صاحب۔"

"ہوں" حسن کہتا ہے۔ لیکن اس کی 'ہوں' لمبی اور تھرتھراتی ہے۔ "یہ تو ہے" وہ کہتا ہے اور لحہ بھر کے لیے اُسے اپنی آواز اجنبی سی لگتی ہے۔

"ویسے آگے بھی پلی ٹوٹا ہوا ہے صاحب۔ جام کا اُدھر بھی خطرہ ہے۔ دلشاد بھی اُدھر ہی پھنسا ہوگا۔ صاحب اگر اجازت دیتا ہے تو گاڑی دائیں طرف چھوٹی روڈ پر نکال لیتا ہے۔ اوپر سے پیرو وال۔ حالی پور سے گھوم کر پھر آگے جا ملے گا بڑی سڑک پر۔ ٹریفک کم ہے تیز جائے گا صاحب۔ پھر ٹوٹی پلی کا کوئی چکر مکر نہیں ہے۔ کچھ عجب نہیں دلشاد سے بھی آگے نکل جائے۔ اور وہ اُدھر ہی پھنسا ہو۔" "ٹھیک ہے تم بہتر سمجھتے ہو" حسن کہتا ہے اور اچانک اُسے خیال آتا ہے کہ اُس چھوٹے لڑکے کا کیا بنا ہوگا جسے انہوں نے دیوار پر کھڑا کر کے نرسری رائیم سُنانے کو کہا تھا؟ کیا وہ ابھی تک سُنا رہا ہوگا اور پھر بچے کی آواز اُس کے کانوں

میں گونجنے لگتی ہے۔

با۔ با۔ کالی بھیڑ
کیا تیرے پاس کچھ اون ہے
جی جناب۔ جی جناب
تین تھیلے بھرے پڑے ہیں
ایک مالک کے لیے ایک مالکن کے لیے
اور ایک اُس چھوٹے لڑکے کے لیے
جو آگے کہیں گلی میں رہتا ہے۔

اور حسن اچانک اس بچے کو ایسے دیکھنے لگتا جیسے وہ اس کی نظروں کے سامنے ہو۔ واقعی وہاں کھڑا گا رہا ہو۔ (GABA?)

ادارتی نوٹ

یہاں شاید بے محل نہیں ہوگا اگر اس نرسری رائیم کی تاریخ اور بعض دیگر متعلقہ امور کی طرف محض اشارہ کر دیا جائے۔ یہ انگلش نرسری رائیم 1761ء سے گائی جا رہی ہے۔ اس کے نفس مضمون کا تعلق، ایک نظریئے کے مطابق 1275ء میں بادشاہ ایڈورڈ 1 کے دور میں انگلستان میں اون پر لگائے جانے والے ٹیکس سے ہے جو پندرھویں صدی تک برقرار رہا۔ اون کی صنعت انیسویں صدی تک ملک کی معیشت کے لیے کلیدی حیثیت کی حامل رہی۔ اسی لیے Ba Ba Black Sheep میں اس پس منظر کو فخریہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کچھ محققین نے اس رائیم کو غلاموں کی تجارت اور نسل پرستی جیسے معاملات سے بھی منسوب کیا ہے لیکن ان کے موقف کو بالعموم قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

اور ہمیشہ کی طرح اب بھی حسن ڈھونڈتا ہے حیرت کے چھوٹے بڑے ایسے مناظر جن سے نظر اچٹ کر گزر جائے اور لمحوں میں وہ کوئی نہ کوئی سوال پیچھے چھوڑ جائیں اور حسن لمحوں میں ہی ان کے جواب ڈھونڈ لے یا پھر کبھی کبھی پہروں اُن کی خالی جگہوں میں بھٹکتا

رہے۔ مگر اب وہی مانوس لمحے پھیل رہے ہیں اور خالی جگہیں شفاف لچکیلے ربڑ کی طرح کھنچ کر لمبی ہوتی جا رہی ہیں یا شاید یہ محض ایک جسمانی احساس ہے؟ کیا ہوا ہے؟ حسن نہیں جانتا مگر وہ دیکھتا ہے کہ نور خان کا اختیار کردہ چھوٹی قصباتی سڑکوں کا وہ سفر اُس کے لیے منظر بینی کے کچھ اور بھی مختلف زاویے ضرور سامنے لا رہا ہے——— گاڑی ایک طویل اور بلند مٹی کے بند پر سے گزرتی ہے۔ سڑک کی دونوں اطراف کی گہرائیوں میں غریبانہ قسم کے گھر مسلسل گزر رہے ہیں۔ بلندی پر سے کوئی بھی شخص سر گھما کر چھوٹے چھوٹے صحنوں اور کھلے دروازوں میں رونما ہونے والے واقعات کو ایک ہی لمحے میں بھانپ کر تیزی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ حسن حیران ہوتا ہے کہ اینٹوں کے ڈبے جیسے اُس مکان کے مکین صحن میں بنے اپنے کُھلی چھت کے غسل خانے کے بارے میں کیا واقعی نہیں جانتے کہ اونچی سڑک پر سے گزرتا کوئی بھی راہ گیر اُن کی 'غسلی خلوت' میں جھانک سکتا ہے۔ حسن 'دیکھتا' ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ مکمل پردے میں مکمل برہنگی۔ نایاب تاک جھانک کا لمحہ حسن کو حیران کر دیتا ہے۔ کیا ہماری عورت کا جسم بھی ایسا خوبصورت ہو سکتا ہے؟ حسن سوچتا ہے۔

سورج مکھی کے پھولوں کے وسیع و عریض کھیت حسن کو متحیر کر دیتے ہیں وہ جو ہمیشہ گملوں میں چھوٹی موٹی کیاریوں میں اُگے بیس تیس ایسے پھول دیکھتا آیا ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں سورج مکھی دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ اُسے خیال آتا ہے شاید نور خان خود ہی گاڑی روک کر اُسے یہ نظارہ دیر تک دیکھنے دے گا لیکن نور خان گاڑی نہیں روکتا مگر وہ کہتا ہے۔ "صاحب اس پھول کو سورج کا عاشق بولتا ہے۔ ایسا تو اسے سورج مکھی کہتا ہے۔" سورج مکھی تو یہ اپنے سورج جیسے چہرے کی وجہ سے ہے حسن سوچتا ہے لیکن حسن کو سورج مکھی کے سورج سے عشق کا علم ہے۔ سینکڑوں ایکڑ میں پھیلے ان گنت پھول سورج کی طرف منہ کیے سورج کو تکتے ہیں۔

اور حسن دیکھتا ہے کہ کچھ سورج مکھی ایسے بھی ہیں جو سورج سے منہ موڑے کھڑے ہیں اور ایسی اطراف میں دیکھ رہے ہیں جدھر کوئی سورج نہیں۔ حسن کی پہلی حیرت میں دوسری حیرت در آتی ہے۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ سورج مکھی کا کوئی پھول سورج کے علاوہ کسی اور طرف کیسے دیکھ سکتا ہے؟"

اور حسن خالی جگہیں پُر کرتا ہے ——— ہوسکتا ہے دوسرے پھول سورج کی
میں حائل ہو رہے ہوں۔ ہوسکتا ہے کسی غلط کھاد کے استعمال یا کسی وائرس کے حملے کی وجہ سے
ان پھولوں کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہوگئی ہو کہ وہ اپنی فطرت سے انحراف کرکے سورج کی
بجائے کسی دوسری طرف دیکھنے لگے ہوں۔ ہوسکتا ہے سورج مکھی کے لیے درحقیقت سورج
سے بھی زیادہ اہم کوئی اور ہستی رہی ہو جسے صرف یہی چند پھول پہچان سکتے ہوں۔ ہوسکتا ہے
اتنے فاصلے سے مجھے پھولوں کی صحیح سمت کا اندازہ لگانے میں غلطی لگی ہو۔ اور حسن کو پھر
سا پڑتا ہے کیا سمتیں واقعی گڑبڑا رہی ہیں۔

ادارتی نوٹ

جہاں تک سورج مکھی کے پھول کا رخ ہر وقت (ظاہر ہے سورج کی موجودگی میں) سورج کی طرف رہنے کا تعلق ہے تو حسن نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ سائنسی ہے۔ جیسے کہ ہر اصل وجہ ہوتی ہے۔ سورج مکھی کے پھولوں کی یہ حرکت (حرکت ہونے کے معنوں میں) Phototropic Movement کہلاتی ہے۔ اور یہ بڑھوتری کے ہارمون (Growth Harmone) Auxin نامی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہوتا اصل میں یوں ہے کہ جب سورج مکھی کے پودے کا تنا سورج کی سیدھی روشنی حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف سایہ دار حصے میں Auxin کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور اُس کی بڑھوتری کی رفتار میں تیزی آجاتی اور اُس کی جسامت میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ تنے کے دونوں حصوں کی غیر مساوی بڑھوتری پھر Phototropic Movement کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور سورج مکھی کے پھول کا رخ سورج کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس سائنسی صورت حال سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ سورج مکھی کے جو پھول سورج کی سمت نہیں مڑتے ان کے Auxin ہارمون میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوتی ہے۔

اس توجیہہ کے علاوہ حسن چاہتا تو اساطیری ذرائع بھی استعمال کرسکتا تھا جو بعض حالات میں ——— ہم ''بعض حالات میں'' پر اصرار کریں گے ——— زیادہ پُر اثر ثابت ہوتے ہیں اور ان ''بعض حالات'' میں Benzo-Gaba مالیکیولی دنیا کے حالات و واقعات کو بھی

یقیناً شامل کیا جاسکتا ہے ——— کہتے ہیں یونان قدیم میں ایک دوشیزہ کلیٹیا نامی رہتی تھی جس کا خواب تھا کہ یا تو وہ شہزادی بنے گی یا پھر جل پری۔ لیکن ایسا کچھ بھی ہونے کی بجائے وہ سورج دیوتا اپالو کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔ دیوتا مذکور کچھ عرصہ تو کلیٹیا کے عشق کی تصدیق موزوں جسمانی ردعمل کے ذریعے کرتا رہا لیکن پھر وہ اکتا گیا (دیکھا گیا ہے کہ دیوتاؤں کے ساتھ اکثر ایسا ہو جاتا ہے) اور اُس نے کلیٹیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ بے چاری کلیٹیا تنہا رہ گئی۔ وہ ایک ہی جگہ کھڑی رہتی تھی اور اپالو کی رتھ کو آسمان میں ظاہر ہوتے اور دوسری طرف سفر کرتے دیکھتی رہتی تھی پھر رات بھر بھی وہیں کھڑی اُس کی رتھ کا پھر سے انتظار کرتی رہتی تھی۔ نو دن اور نو راتوں تک اُسے مسلسل ایک ہی جگہ کھڑا رہتے دیکھ کر اپالو دیوتا کو کلیٹیا پر رحم آ گیا (جو ہم سمجھتے ہیں بعض حالات میں عشق کی ایک گھٹیا شکل ہوتا ہے لیکن ہم اپنی اس رائے پر اصرار نہیں کریں گے) اور اُس نے اُسے ایک پھول میں تبدیل کردیا جو اب بھی دن بھر اپنے محبوب کے چہرے کو تکتا رہتا ہے اور ہمیشہ تکتا رہے گا اور انسانی کلیٹیا کے پاؤں اور ٹانگوں کے برعکس اُس کی جڑیں اور تنا بھی کبھی تھکن کا شکار نہیں ہوں گے۔

سورج مکھی کی Phototropic Movement کی یہ توجیہہ Auxin نامی ہارمون کے عمل کی نسبت زیادہ دل لبھانے والی ہے لیکن ہم اس کے ذریعے سورج بے زاری کے مرتکب کسی باغی سورج مکھی کے طرزِ عمل کی مدافعت کیسے کریں گے؟ یقیناً اس کے لیے ایک مشکل تخیلاتی مشق درکار ہوگی اس لیے بھی کہ اساطیر اپنے متن میں آزادانہ ترمیم و تغیر کی اجازت ذرا کم ہی دیتی ہیں۔ یوں بھی جہاں تک تخیلاتی مشق باالفاظ دیگر ''حیرت کی ادارت'' کا تعلق ہے۔ اس کا رخ کچھ ایسے معاملات کی طرف مڑنے والا ہے جو حسن کی صورت حال کی ہماری اس متنازعہ ادارتی سرگرمی کے لیے ایک بہت بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے ——— ہم کسی حقیقت پر ہمیشہ کی طرح اب بھی اصرار نہیں کریں گے ——— کہ حسن میلوں تک پھیلے سورج مکھی کے ان زرد نظارہ لمحوں کی خالی جگہیں پُر کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ نہ صرف وہ اُن خالی جگہوں کو پُر کرنے میں ناکام ہے بلکہ اب وہ خود ایک خالی جگہ ہے۔ جسے کچھ بھی، کوئی بھی پُر کرسکتا ہے خالی مکان آسیب کو دعوت دیتے ہیں اور خالی ذہن دیوانگی کے شیطان کو۔ حیرانیہ یہ ہے کہ یہاں اب کوئی حیرانیہ نہیں کوئی دورانیہ نہیں۔

وقت مر چکا ہے اور مقام کہیں نہیں۔ حتیٰ کہ لامکان۔ لازمان بھی لاتعلق ہو چکے ہیں۔ پھر کوئی نہیں بس زرد ہے۔ زرد زرد ہے اور زرد ہی زرد ہے۔ کوئی تمیز نہیں۔ کوئی سوال نہیں۔ کوئی خلا جگہ نہیں۔ کہ خالی سے پُر ہو چکا ہے۔ منظر ہی منظر بینی ہے ناظر ہی نظارہ ہے۔ کائنات ایک پیلے سکوت کے نرغے میں آچکی ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حسن اب بھی دیکھتا ہے۔ ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں۔

....

(15)

زرد ہی زرد ہے۔ نظر۔ ناظر۔ نظارہ۔ سب زرد ہے

......حسن پھر اور پھر اور پھر سوچتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میری نظر کا دھوکہ ہو اور تمام سورج مکھی کے پھول صرف اور صرف سورج کی طرف منہ کیے کھڑے ہوں۔ پُراعتماد بچے کی متاثر کن آواز میں با۔ با بلیک شیپ نامی شہرہ آفاق نظم کے الفاظ کی گونج اُسے مسلسل سنائی دیتی ہے۔ وہ سورج بیزار سورج مکھی کے پھولوں کے انوکھے طرزِ عمل کی کوئی احتمالی وجہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آ جاتا ہے۔ کیا اُس کا ذہن خالی ہو چکا ہے وہ حیران ہوتا ہے مگر حیرانی پر یقین نہیں کر پاتا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے پھر یہ سوال بھی باقی نہیں رہتا۔

اگر کوئی اُس وقت حسن کو چونکا کر پوچھتا ''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' تو وہ بھی یقیناً اس سوال کا پہلا اور آخری جواب دیتا۔

''کچھ نہیں۔''

مگر اس طرح حسن کچھ بھی غلط جواب نہ دیتا۔ کچھ بھی نہ چھپاتا۔ اُس کا 'کچھ نہیں' خالی ہے۔ وہ خالی کو خالی سے سوچتا ہے اور خالی کو خالی سے پُر کرتا ہے۔ مگر حسن سے یہ سوال کوئی نہیں پوچھتا۔ نور خان بھی نہیں۔

بعد میں حسن کے بارے میں کئی طرح کے پوچھنے والوں نے نور خان سے کئی سوال کیے۔ حسن کی گمشدگی پر خاندانی، دفتری، طبی اور قانونی سوالات جو صرف کمپنی ڈرائیور نور خان سے ہی پوچھے جا سکتے تھے کیونکہ وہ حسن کی گمشدگی سے اٹھارہ بیس گھنٹے پہلے کے واقعات کا واحد عینی شاہد تھا اور وہ ایک حیرت ناک کہانی سناتا تھا۔

اس کہانی کو سناتے وقت وہ ہمیشہ بات ایسے شروع کرتا تھا۔

''خانو کا گُجر کے قصبے سے گزرتے وقت ہم لوگ بڑا بُرا جیم میں پھنس گیا۔ صاحب باہر دیکھتا تھا سکولوں کا بچہ لوگ کیا تماشہ لگا رہا تھا، لوگ بھی ہنس رہا تھا انہیں دنگا فساد کرتے دیکھتا۔ پھر ایک بچہ ایک عجیب سا انگریزی گانا پڑھنے لگا۔ با۔ با۔ کیا۔ آگے اللہ جانتا۔ آگے پتہ نہیں کیا۔ صاحب بڑے شوق سے دیکھتا سُنتا رہا۔ وہاں سے بڑی مشکل سے ہم نکلا۔ پھر آگے سورج مکھی کا کھیت شروع ہوا۔ یہاں بھی صاحب کا نظر اُدھر ہی رہا۔ جما ہوا۔ بس یہاں ہی صاحب پر اثر شروع ہوا۔ ہمیں پکا یقین ہے۔''

''اثر سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''صاحب اثر یعنی کہ منحوس اثر...... جو ہوتا ہے۔ ہم خود نہیں بچ سکا اس سے...... جو اگلا پندرہ بیس گھنٹہ۔ جو...... صاحب کا ساتھ گزرا صاحب...... عجیب عجیب واقعہ ہوا۔''

''تم سے جو پوچھا جائے اُس کا جواب دو...... کیسا اثر ہوا حسن رضا ظہیر صاحب پر......''

''جی سر...... صاحب جیسے یک دم سے بدل گیا...... سر۔''

''کیسے بدل گیا۔ کچھ چھپانا مت۔ سب بتاؤ۔''

''جی صاحب اس روز کمپنی کا دفتر سے نکل کر چار پانچ گھنٹہ کا سفر میں تو صاحب نے ہمارا ساتھ ایک بات بھی نہ کیا...... ہم نے کیا بھی...... تو جواب نہیں دیا...... بس وہ ٹکٹکی باندھ کر گاڑی سے باہر دیکھتا تھا...... جیسے کچھ ڈھونڈتا تھا...... میں بھی چُپ تھا بس...... کیا بولتا...... پھر 'خانو کے گجر' کا رش جیم آیا۔ توبہ توبہ۔ اور باہر سکول لے بچوں کا تماشہ مار کٹائی اُس نے دیکھا بہت دیر...... جب تک گاڑی رکی تھی صاحب...... پھر گاڑی چلی...... جیم ٹوٹا...... ہم آگے گیا...... پھر سورج مکھی کا کھیت شروع ہوا...... اُس نے دیکھا...... بہت دیکھا...... اور پھر وہ بدل گیا۔''

''کیا مطلب......''

''صاحب جو بات بھی نہ کرتا تھا صاحب...... اُس نے مجھے بلایا اور گاڑی روکنے کو بولا۔ یہی نہیں وہ بولا۔ ''نور خان ہم ان سورج مکھی کے کھیتوں تک جائیں گے۔'' میں حیران

تا مگر خوش تھا تھوڑا...... صاحب کا چُپ تو ٹوٹا...... اب باقی رستہ کوئی ہم سے بات تو کرے گا۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا صاحب...... آگے کیا ہونے والا...... کیسا غدر آنے والا ہے...... یا پھر جادو کا کھیل......''

''یا پھر جادو کا کھیل......؟''

''ماما۔ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔ ابو کو تو سورج مکھی کے پھولوں سے نفرت تھی۔ یاد ہے......؟ نہیں...... آپ کو یاد نہیں...... میں ایک دفعہ باہر گلی سے...... جو ریڑھیوں پر پودے بیچے پھرتے ہیں...... اُن سے دو گملے سورج مکھی کے خرید لایا...... پچھلے برآمدے میں رکھنے کے لیے۔ تو ابو پیلے پڑ گئے...... جیسے غصے میں وہ پیلے پڑ جاتے تھے......''

''مگر وہ غصے میں آتے کب تھے بیٹا...... حسن...... ہاں خوف...... میں...... کبھی کبھی...... خدایا میں کیا کروں...... حسن کہاں چلے گئے۔''

''تو کہنے لگے...... بیٹا تم یہ لے تو آئے ہو...... جانتا ہوں واپس نہیں کرو گے...... مگر انہیں میری نظروں سے دور رکھنا...... میں نے کہا ابو یہ تو بڑے پیارے پھول ہیں سورج مکھی کے...... وہ کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے......''

''ہاں...... وہ کچھ کہے بغیر...... اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے......''

''یہ شخص جھوٹ بولتا ہے ماما...... اس نے ابو کے ملازمین کی تنخواہوں کے بریف کیس پر قبضہ کرنے کے لیے انہیں......''

''نہیں...... بیٹا...... نہیں...... ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالنا......''

''ہوں...... تو پھر تم اکاؤنٹینٹ صاحب کو وہاں لے گئے کھیتوں کے پاس؟''

''جی صاحب...... ہم نے گاڑی سڑک سے اتار کر ایک جگہ کھڑی کیا...... کافی اجاڑ پڑا تھا صاحب...... پھر ہم کھیتوں کی طرف چلا...... کچھ فاصلہ تھا۔ آگے...... مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا ''صاحب گاڑی چھوڑ کر زیادہ دور نکلنا اچھا نہیں صاحب...... آپ کا سامان اندر پڑا ہے۔ آپ پھول دیکھ آؤ...... ہم اِدھر ہی ٹھہرتا ہے...... کہنے لگا۔ ''نہیں...... ہو سکتا ہے ہمیں آگے جانا پڑے'' پھر اُس نے خود ہی سیٹ پر سے اپنا بریف کیس اٹھایا اور بولا۔ یہ میں لے جاتا ہوں...... باقی کا خیر ہے۔'' اور ہم کھیتوں اور سڑک کے درمیان گھاس...... اونچا۔ نیچا۔

جھاڑی۔ چھوٹا موٹا پودا...... سے گزرا...... آگے آگیا۔"

"بریف کیس کس کس کے ہاتھ میں تھا؟"

"صاحب نے مجھے تھما دیا صاحب۔"

"تمہیں علم تھا بریف کیس میں کیا ہے؟"

"نہیں صاحب۔"

"کب علم ہوا؟"

"صاحب نے ہم کو خود بتایا صاحب اور پھر جب اکاؤنٹینٹ صاحب نے تھیٹر والوں پر پیسہ لٹانا شروع کیا۔"

"کون تھیٹر والے......؟"

"وہ ماجرا آگے آئے گا صاحب۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... تم بتاؤ۔"

"دیکھنے بتانے میں فرق ہے صاحب...... جدھر تک نظر مار کرتا تھا سورج مکھی تھا...... عجب نظارہ تھا...... صاحب۔ جیسا...... دنگ جیسا رہ گیا...... جیسے بت بن گیا۔ اور وقت تھا کہ گزرتا تھا...... مجھے فکر تھا...... حالی پور پہنچ کر بڑی سڑک کو مڑنے کا جلدی تھا...... صاحب تھا کہ وہیں جما کھڑا تھا۔ "صاحب ابھی آگے بہت سفر پڑا ہے۔" ہم ڈرتے ڈرتے بولا۔ اس کا جواب ہی کچھ اور تھا۔ بولا "تم ٹھیک کہتے ہو نور خان...... یہ پھول سورج کا عاشق ہے۔ بس اُسی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو نہیں دیکھتا...... دیکھ لو...... ٹوٹ کر گر پڑا ہے...... ہے۔" مجھے کچھ سمجھ نہ آیا وہ کیا کہتا ہے۔ ہم بولا "صاحب ابھی آگے کافی جانا ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔" بولا "ہم نے ادھر جانا ہے نور خان" اُس نے ایک چھوٹا پگ ڈنڈی کی طرف اشارہ کیا جو سورج مکھی کے کھیتوں کے اندر جاتا تھا...... یا میرے مولا...... یہ کیا کہتا ہے......"

"پھر...... کیا کہا تم نے...... کیا ہوا......؟ دیکھو کچھ چھپانا نہیں۔ سب بتاؤ۔ اسی میں تمہاری بچت ہے۔"

"میرا تو صاحب...... ہوش گم ہو گیا...... خدایا صاحب کیا کہتا ہے......

اسی وقت مجھے یقین ہوا کہ صاحب پر کچھ اثر ہو گیا ہے...... مگر میں جواب دہ تھا صاحب

صاحب کو آگے منزل پر پہنچانا تھا...... یہی میں نے کہا "صاحب میں نے منزل پر آپ کو پہنچانا ہے صاحب...... ادھر وہ باقی افسر لوگ انتظار کرتا ہوگا...... ہم کیا جواب دے گا؟ ہمارا پکڑ ہو گا۔ بولا "منزل اب کچھ اور ہے نور خان۔" "

"ایک منٹ...... نور خان...... یہ سورج مکھی کے جو کھیت تھے یہ ہائی وے پر نہیں تھے...... تم جو کہتے ہو واپس بڑی سڑک پر......"

"میرا ہی مغز پھر گیا تھا صاحب۔ سوچا...... ادھر خانو کے گجر کے جیم سے نکلتا ہوں تو آگے ٹوٹی لال پکی کا خرابہ میں پھنس جائے گا...... ادھر سائیڈ روڈ سے نکال کر پیرو وال سے ہوتا آگے حالی پور سے پھرتا پھر بڑا ہائی وے پر چڑھ جائے گا......"

"پھر تم نے اُنہیں منع نہیں کیا نور خان...... کھیت میں جانے سے...... آخر تم بھی کمپنی کے ملازم ہو۔ اور جیسا کہتے ہو...... تمہیں لگ رہا تھا اُس پر...... کیا...... تھا......"

"اثر صاحب...... یا سایہ کہہ لو......"

"اب یہ سایہ کیا ہے۔ بات الجھاؤ مت...... آگے چلو......"

"میں نے صاحب بہت کہا...... اُس کا بازو پکڑا...... روکا...... مگر ہمارا حیثیت دیکھو صاحب...... ڈرائیور ہے...... وہ افسر ہے...... اور پھر وہ بولا ہنس کر...... پہلی دفعہ اُسے ہنستا دیکھا...... بولا "تم جاؤ نور خان۔ نہیں جانا چاہتے میرے ساتھ تو...... میں واپس آ جاؤں گا...... تم جاؤ...... میں ڈولومائیٹ سائیٹ پہنچ جاؤں گا۔ .O.K" مگر صاحب ہم اُسے کیسے چھوڑ سکتا تھا میرے مولا بڑا مشکل وقت تھا...... چھوڑتا تھا مرتا تھا...... ساتھ جاتا تھا پھر مرتا تھا...... پھر سوچا کچھ ہو...... ساتھ جانا ہی ٹھیک ہے...... کیا عجب اس کے ساتھ کچھ ہو جائے۔ جس اثر میں وہ ہے۔ ساتھ رہے گا تو کچھ کر تو سکے گا۔ سوچا کہیں سے کمپنی کا ہیڈ کوارٹر میں فون کر دے۔ پھر اپنا بے وقوفی پر ہنسا...... ادھر اُجاڑ...... بیابان میں...... فون کہاں...... خیر ایسا بیابان بھی نہیں...... خیال آیا۔ سورج مکھی کا تیل نکالنے کا فیکٹری بھی تو ادھر کہیں قریب ہوگا۔ ادھر ضرور فون ہو گا...... کسی بڑے سے میرا بات ہو جائے تو سر سے بلا ٹلے۔ میں نے کہا نہیں صاحب...... ہم آپ کے ساتھ جائے گا۔ جدھر بھی آپ جائے گا۔ نور خان ساتھ جائے گا۔

"یہ میرا فیصلہ تھا صاحب......"

"یہ فیصلہ ٹھیک تھا تمہارا...... It was OK-Yes"

"صاحب بہت خوش ہوا۔ اتنا خوش کہ گانا گانے لگا۔"

(ڈی۔ایم۔ڈی اور ایریا مینجر ہنس پڑتے ہیں)۔

"گانا گانے لگا۔ او مائی گاڈ...... نیاز صاحب...... میں تو چیف اکاؤنٹینٹ ایچ۔آر۔ ظہیر کو بہت ہی خاموش طبع۔ بے ضرر۔ کام سے کام رکھنے والا...... شخص سمجھتا تھا۔"

" Exactly سب ایسا ہی سمجھتے ہیں...... مگر کام میں بے حد Competent...Yes۔"

"بالکل...... اچھا کیا گانا تھا......؟"

"وہی صاحب جو ان سکول کا بچہ لوگ کو...... گاتا سنا تھا صاحب...... با۔با۔ بلیک کچھ ایسا۔"

"اوہو۔"

Ba Ba Black Sheep
Have You Any Wool
Yes Sir Yes Sir
Three bags Full
One for The Master
One For The Dame
One For the Little Boy
Who Lives Down The Lane

"با۔با۔با۔با...... آپ کو تو پوری رائیم یاد ہے سر......"

"ہاں...... بچپن میں بہت پڑھی...... بلکہ سنائی ہم نے یہ رائیم...... بس وہ اشارہ کرتے تھے اور ہم شروع ہو جاتے تھے......"

"آپ بچپن سے ہی بہت Confident رہے ہوں گے۔ I Can Imagine"

"I Don't Know لیکن با۔ با۔ بلیک شیپ فیورٹ رائیم تھی...... اچھا تو نور خان اکاؤنٹینٹ صاحب یہ رائیم سنانے یا گانے لگے...... رائیٹ......؟"

"جی۔جی۔صاحب...... یہی نامراد...... میرا مطلب ہے جی یہی گاتا تھا......"

"تو رائیم اُس نے گائی...... OK کتنی مرتبہ......؟"

"کئی بار صاحب...... مجھے تو لگا خانو کے گُجر کا بچہ لوگ کی طرح وہ بھی کہیں...... گاتا ہی نہ جائے۔ گاتا ہی نہ جائے۔"

"ہوں...... پھر......؟"

"یہاں۔ پھر...... پھر صاحب...... مجھے پھر لگا صاحب جیسا...... کچھ سودائی سا ہوتا جاتا ہے۔ وہ......"

"ایک منٹ...... ڈاکٹر ہارون...... پرسنل میڈیکل فائل میں ایسا کچھ ہے؟"

(خاموشی کے لمحات جن میں نوجوان کمپنی ڈاکٹر ہارون پاشا کے صفحات پلٹنے کی آوازیں آتی ہیں۔ اور فیکٹری کے پلانٹ ایریا سے ہائیڈروجن سلفائیڈ کی سڑے ہوئے انڈوں جیسی بو آتی ہے۔ فیومز ڈی۔ایم۔ڈی کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بھی "گو انتہائی خفیف مقدار میں" پہنچ جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ انجینئرنگ والوں کی کھنچائی کرے گا کہ وہ کاربن ٹیٹرا کلورائیڈ پلانٹ کی Leakage ابھی تک بند کیوں نہیں کر سکے۔ نور خان اس اچانک وقفے پر تھوڑا سکھ میں آتا ہے۔ لیکن پھر پریشان ہو جاتا ہے...... او خدایا۔ وہ آگے آنے والے سخت بے شرمی کے کاموں کا حال کیسے بتائے گا۔ وہ بونا اور وہ عورت سورج مکھی کے کھیتوں میں، چھپا کیا کر رہا تھا؟ یااللہ مجھے معاف کر میں وہ لفظ منہ پر نہیں لا سکتا۔ لیکن صاحب بار بار کہتا ہے۔ بیان میں کچھ چھپانا نہیں۔ سب بتانا ہے۔ اسی میں تمہاری بچت ہے۔ خدایا ہم کس مصیبت میں ڈل گیا ہے۔ کیوں ہم نے گاڑی ہیرو وال کا طرف موڑا۔ سیدھا چلتا مرتا رہتا...... چار گھنٹہ لگتا تو لگتا...... یہ تو نہ ہوتا...... اور وہ اکاؤنٹینٹ صاحب...... تھا تو پہلے ہی پاگل پر چُپ چُپ پاگل...... رہتا...... جیسا تھا...... میں تو وہیں رہتا...... میں تو نہ مارا جاتا...... یااللہ خیر کر......

"نہیں...... میڈیکل ریکارڈ تو پرفیکٹ ہے۔ ساری عمر کوئی ایک بھی میڈیکل لیو نہیں لی۔ بلڈ پریشر، شوگر، جوڑ، اعصاب، خون کے ٹیسٹ، دل، ای۔سی۔جی، سب نارمل...... سر...... کم از کم مجھ سے زیادہ نارمل......" ڈاکٹر ہارون پاشا کہتا ہے۔

"ہوں...... تو نور خان...... تم کہہ رہے تھے...... تمہیں لگا ظہیر...... Derange ہو

رہا ہے۔"

"کیا صاحب؟"

"وہی جو اثر...... سودائی...... جو تم کہتے ہو......"

"جی صاحب...... جی صاحب......"

"اور سُنو۔ پہلے بھی کہا ہے۔ کچھ چھپانا نہیں تم نے...... رائیٹ۔ بیان ریکارڈ ہو رہا ہے۔ سب کچھ بتاؤ۔ اسی میں تمہاری بچت ہے۔ OK۔"

"او خدایا......"

"کیا؟"

"کک...... کچھ نہیں صاحب...... آگے بتاتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ گانا تو اُس نے بند کر دیا۔ مگر پھر دونوں بازو باہر کو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے...... جیسے...... کیا کہے گا...... جیسے پورے کھیت سے گلے مل رہا ہے۔"

"آئی۔ سی۔"

پھر بولا۔ "ایسا نظارہ تم نے کبھی دیکھا نور خان...... ہم نے نہیں دیکھا۔ ہم اس کا کیا بتاتا ہے صاحب۔ ویسا...... جیسا یاد آتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتا تھا وہ کیا کہتا ہے...... جو یاد آتا بتاتا ہے۔"

"ہاں...... ہاں...... بتاؤ...... اُس کے اپنے الفاظ میں بتاؤ...... گڈ۔"

"پورا یاد نہیں آتا صاحب...... کہتا...... میں نہیں دیکھتا...... مشکل ہے مشکل ہے۔ جیسا یاد آتا ہے...... کہتا...... کچھ بھی نہیں دیکھتا...... وہ دیکھتے نہیں۔ نظر رکتا ہے۔ آنکھ ٹھہر جاتا ہے...... کچھ ایسا ہی بولتا...... اپنے سے۔ صاحب...... پر ایک اس کا بات ہمیں یاد ہے صاحب...... لفظ۔ لفظ......"

"ہاں۔ ہاں۔ بتاؤ......"

کہتا "دیکھو نور خان...... ان لاکھوں سورج مکھی کا پھولوں کو دیکھو...... اگر یہ سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا ہے تو میں بھی دیکھ سکتا ہوں...... آؤ ہم دیکھتا ہے۔"

"یہ اُس کے Exact الفاظ ہیں؟"

"جی سر...... کچھ ایسا ہی بولا۔ اس پر میں نے پھر آخری کوشش کیا...... اُسے واپس

صاحب...... ہم بولا۔ صاحب اُدھر ہمارا انتظار میں وہ سب لوگ بہت پریشان ہوگا کرنے کا صاحب...... پھول آپ نے دیکھ لیا...... اب واپس چلتا ہے صاحب......"

"اب یہاں سے واپس کون جا سکتا ہے" وہ بولا۔ پھر کچھ خیال آیا "تم اگر اب بھی جانا چاہتا ہے نور خان تو جا سکتا ہے...... یہ بریف کیس بھی لے جا...... اس میں کیش ہے۔ ہم اس سورج مکھی کے کھیت کے آخری کنارے تک جانا چاہتا ہے۔ اس کے دوسری طرف کیا ہے...... کچھ تو ہوگا...... جانا ہے تو جاؤ...... رکنا ہے تو رک جاؤ......" اب صاحب یہ اس کا بات بوٹی مندی کا تھا۔ کوئی اثر نہ لگتا تھا۔ میں نے سوچا کتنا ہوگا...... کھیت کتنا ہوگا...... دیکھنے میں لگتا تھا کہیں ختم نہیں ہوتا۔ لیکن آخر تو ہوگا...... پھر دوسرا کھیت آ جائے گا کوئی...... کوئی دوسرا زمین آئے گا...... کچھ بھی آئے گا...... رستہ آ جائے گا...... سومیل تو نہیں ہوگا...... صاحب اپنا شوق پورا کرلے گا...... پھر ہم واپس آ جائے گا......۔ کہیں تو یہ پگ ڈنڈی دوسری طرف کھیت سے نکلتا ہوگا...... ٹھیک ہے صاحب...... ہم تمہارے ساتھ جائے گا...... جدھر تم جائے گا...... ہم جائے گا...... لیکن پھر۔ واپس......؟"

"ہوں...... پھر...... واپس۔ کیا......"

"صاحب...... صاحب میری پوری بات سُننے سے پہلے ہی دس قدم آگے تھا...... وہ کھیت میں گھس گیا تھا...... میں تیزی سے پیچھے گیا...... اور پھر ہم آگے پیچھے چلنے لگا۔ صاحب تو اثر میں تھا......"

ادارتی نوٹ

"صاحب تو اثر میں تھا"۔ ہم سمجھتے ہیں کمپنی کے باتونی ڈرائیور نور خان کا یہ ریمارک جواب تک اُس کے تفتیشی انٹرویو میں ایک سے زائد مرتبہ آ چکا ہے حسن کے Benzo-Gaba دنیا میں داخلے کے قوی امکان کو اپنے دائرہ اثر میں سمیٹنے کے علاوہ دیگر امکانات کے دروازے بھی کُھلے رکھتا ہے۔ ہم حسب ضرورت "حسن کے زیرِ اثر" کی صورتِ حال میں رونما ہونے والی اس بظاہر حسی/ادراکی (Perceptual/ Cognitive) کایا کلپ کو

سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ''اچٹتی منظر بینی'' کے حیرانیوں کے اُچھال کی [illegible]
شانت مناظر پر جمی ہوئی، لمحوں پر رکنے والی، چیزوں اور انسانوں سے معاملہ کرنے [illegible]
میں ساتھ دینے والی، کیف و مستی رچانے والی نظر لے لیتی ہے۔ حیرانیے [illegible]
جگہیں پُر کرو کے حکیے کی جگہ، خالی کو خالی سے پُر کرو کا 'ممکن ناممکن' لے لیتا [illegible]
کیفیت ہے جسے علمی لوگ Paradox بھی کہہ لیتے ہیں۔ جو کچھ بھی نام دیا جائے [illegible]
کامشاہدہ ہے کہ صاحب پر جب اثر ہوا تو اُس کی چُپ ٹوٹ گئی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ [illegible]
زبانی ہی نہیں تھی بلکہ پورے ذہن کی تھی اور جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا جسم کی بھی [illegible]

چنانچہ جسم و جان کی ''چُپ ٹوٹنے'' پر عمر بھر کا حسن بے اثر چند دنوں کے [illegible]
بااثر ہوا لیکن دونوں کے درمیان حائل ''حسن زیرِ اثر'' کی صورتِ حال کے بیان کو [illegible]
بنانے کے لیے ہم اب بار بار رُک کر Benzo-Gaba مالیکیولی خلیاتی کائنات [illegible]
اشارے نہیں کریں گے بلکہ کچھ دیر تک حسن سے مراد ''حسن زیرِ اثر'' ہی لیں گے۔ [illegible]
سمجھتے ہیں کہ ''حسن کی صورتِ حال'' جیسا کہ اب ظاہر و باہر ہے امکان و احتمال [illegible]
ہے —— Benzo-Gaba کا جراپنی جگہ —— لیکن ہوسکتا ہے کہ حسن کی صورتِ حال [illegible]
اب حسن زیرِ اثر کی صورتِ حال) کے یک لخت اور زیادہ شدت سے متحرک ہو جانے کی [illegible]
وجہ (گو ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ اصل کیا ہے اور نقل کیا) حد نگاہ تک [illegible]
سورج مکھی کے پھولوں کی گہری زردی ہو جو حسن کے ''لمحہ موجود'' کو ایک ناقابلِ یقین [illegible]
وسیع و عریض زرد میدان (یعنی برقی مقناطیسی میدان۔ حوالہ رنگ کی طبعیات) میں [illegible]
حسن پر حاوی حسی مہیج کو ہزاروں گنا شدید کر رہی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس غیر معمولی [illegible]
نتیجے میں حسن کے عصبی نظام میں پیچیدہ عصبیاتی اور کیمیاوی واقعات جنم لے رہے ہوں [illegible]
Benzo-Gaba کے علاوہ اور اس کے ہمراہ بھی) جو بالآخر اس کے مجموعی خارجی [illegible]
لسانی ردعمل کو متاثر کرتے ہوں۔ ہم اس موضوع پر ایک طویل مقالہ رقم کر سکتے ہیں [illegible]
فکشن کے مصنفین کے انداز میں) لیکن خوفِ فسادِ خلق کے پیشِ نظر اپنے تئیں باز رکھتے [illegible]

پس طے ہوا کہ خارج کی اسٹیج پر موجود حسن ہی اب حسن زیرِ اثر ہے [illegible]
کردار ہے۔ اسٹیج کے عقب میں خلیاتی کیمیاوی حسن کا کوئی حوالہ اب سے موقوف [illegible]

آگے ہماری عملی ادارتی تکنیک یہی ہوگی کہ ہم ''صاحب تو اثر میں تھا'' کے مظہر کو کچھ تو نور خان کی زبانی پیش کریں گے لیکن گاہے بگاہے ادارتی تقاضوں (بعض مشکوک اذہان اگر ہمارے اس ادارتی احساس ذمہ داری کو ڈھکوسلا سمجھتے ہوں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں) کے مطابق اس بیان کو اظہاری متبادلات مثلاً صیغہ واحد غائب۔ واحد حاضر (یعنی کیا حسن بذاتِ خود؟ شاید یہ ناممکن ہو۔ بہرحال دیکھتے ہیں) یا ''صیغہ غائب غائب'' (یعنی ایسا بیان جس کی ذمہ داری نہ ہم قبول کریں نہ کوئی دوسرا۔ بالکل لاوارث کلام) کی زبان میں ڈھالتے رہیں گے۔ تو ہم نور خان یعنی حسن (یعنی حسن زیرِ اثر) کی طرف چلتے ہیں۔

''......صاحب تو اثر میں تھا۔ مگر چند قدم چلا تو جیسا ہم بھی اثر میں آ گیا۔''

''ماما...... اب یہ شخص ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ خود بھی پاگل ہے۔ پہلے اس نے پاپا پر الزام لگایا پاگل پن کا......''

''حسن پاگل نہیں تھے۔ یا اللہ وہ کہاں ہیں۔ کہاں چلے گئے...... (سرگوشی) بیٹا سنو۔''

(سرگوشی) ''جی ماما۔''

(سرگوشی) ''آج پلاٹ کی قسط دینی ہے۔''

(سرگوشی) ''میں جا رہا ہوں ماما۔''

''کیسا اثر آ گیا تھا تم پر نور خان؟''

''صاحب سُننے دیکھنے میں فرق ہے۔ عجب ہوا تھا۔ سورج تھا۔ بے انت سورج مکھی تھا۔ صاحب یہ جو ہم ادھر اُدھر دیکھتا ویسا نہیں تھا۔ اُس نے بہت اونچا۔ بندے سے اونچا۔ جس سے تیل نکالتا صاحب۔ بندہ اندر چُھپ جاتا...... او خُدایا...... کیسا پیلا ہوا تھا۔ گھنا بھاپ جیسا اور خوشبو ایسا کہ دماغ کو پھیر دیتا تھا......''

—— سورج مکھی کے کھیتوں میں داخل ہوتی وہ پتلی سی پگڈنڈی کوئی پگڈنڈی نہ تھی۔ دو کھیتوں کے درمیان ایک حد بندی تھی جس پر کاشت کرنے والا پانی دینے والا کبھی چلا ہوگا اور فصل کی کٹائی کے وقت کبھی پھر چلے گا۔ مگر حسن کے لیے وہ ایک راستہ تھا جو سیدھا سورج کے عاشق کے دل میں اترتا تھا۔ حسن نے سورج کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور اُس کی

آنکھیں چندھیا گئیں۔ سورج مکھی کے علاوہ کوئی بھی سورج کو دیکھ نہیں سکتا۔ اُس نے پھر دیکھا اور اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اُس نے مان لیا کہ وہ سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتا۔ اُس کا چندھیانا ہی اُس کا دیکھنا ہے۔ کیا وہ سورج کا عاشق ہے؟ ان لاکھوں لاکھوں عاشقوں میں سے ایک؟ تب اُسے حیرت ہوئی۔ اور وہ حیرت رُکتی نگاہ سے اُبھی حیرت کا خلا نہ تھی جو ہمیشہ "خالی جگہ پُر کرو" کا حکم ساتھ لاتی تھی۔ وہ حیرت نظر سے پہنچی تھی دیکھنے سے پہلے تھی کہیں اندر تاریکی اور سناٹے کا کامل خلا تھی۔ اور پھر اُسے اس حیرت پر حیرت ہوئی جیسے خالی خالی سے پُر ہو جائے۔ اُسے حیرت ہوئی کہ وہ نہیں جانتا کہ عشق کیا ہے۔ عاشق ہونا کیا ہے پھر بھی سورج مکھی کے گھنے گرم کھیت میں جہاں زرد مرطوب ہوا کے دخان میں سب زرد ہی زرد ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ زردی عشق ہے۔ زرد عشق ہے جس میں سیاہ آنکھ محبوب کو تکتی ہے۔ اور حسن ایک عاشق نہیں ہے——

....

"اچھا تو ظہیر آگے گھستا گیا کھیت میں۔ کیا کرتا رہا؟"

"صاحب ہم کیا بتائے صاحب کیا کرتا تھا۔ وہ جو ہم نے بولا وہ کسی اثر میں تھا۔ کبھی سورج کو تکتا تھا کبھی پھول کو۔ حیران پریشان۔ جیسے کہتا ہو یا خدا یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر ٹھنڈی آہیں جیسا بھرتا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کچھ نہیں تو پندرہ بیس منٹ وہ ایک ہی جگہ کھڑا رہا۔"

"او مائی گاڈ۔ اور تم...... تم کیا کرتے رہے اس دوران؟ پندرہ بیس منٹ بہت ہوتے ہیں۔"

"ہم نے کیا کرنا تھا صاحب۔ برابر کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتا تھا اور اللہ سے دعا کرتا تھا کہ وہ اس جنجال سے نکالے۔"

"ہوں...... پھر؟"

"پھر صاحب...... صاحب نے پھر ایڈوانس کیا...... وہ پگ ڈنڈی جیسا پتلا راستہ تو آگے جیسے مٹی میں مٹی ہو گیا۔ اب وہ کھیت تھا اور وہ ہزاروں لاکھوں سورج مکھی تھا سر سے اونچا اور ہم گھنا کھیت کے اندر تھا۔ کچھ پتہ نہ تھا کدھر دایاں جاتا کدھر بایاں۔ باہر کدھر نکلے گا۔ اور خبر نہیں نکلے گا بھی کہ نہیں۔ ہم نے صاحب کو خبردار کیا صاحب "صاحب" ہم بولا "ایسا راہ گم

کر جائے گا صاحب۔ آگے کدھر ہے پیچھے کدھر ہے کچھ معلوم نہیں۔" اس پر وہ ہنسا۔ بولا "مجھے بھی کچھ معلوم نہیں نور خان...... آگے پیچھے ہی نہیں۔ دائیں بائیں بھی۔ اور اوپر نیچے بھی...... کچھ معلوم نہیں۔" ایسا وہ پھر ہنسا اور پھر کہا۔ کچھ معلوم نہیں۔ کچھ معلوم نہیں۔ جیسا کوئی بہت مزے کا بات کرتا ہو۔"

"I See۔"

"تو ایسا ہی وہ آگے جاتا اور ہم پیچھے آتا۔ اُدھر پیلے پھولوں کا خشبو الگ دماغ کو خلاص کرتا تھا۔ ہمارا نیچے بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر صاحب رکتا نہ تھا۔ ہم نہیں جانتا آدھا گھنٹہ۔ پونا یا پورا ہم اس کے پیچھے چلا۔ وہ آگے تھا گھنا جنگل جیسا میں سامنے آتا پودا۔ ٹہنی۔ پھول ہلاتا رستہ بناتا وہ آگے جاتا تھا۔ او خدایا وہ کب رُکے گا۔ ہمارے دل میں بس یہ تھا۔ کدھر نکلے گا۔ کہیں باہر نکلے گا بھی یا نہیں۔ دل میں اب خوف اٹھتا تھا صاحب اور پھر اک دم سے وہ رک گیا۔"

"اوہو۔"

"وہ اپنے قدموں پر اک دم سے رُک گیا صاحب۔ مڑا اور ہمارا جیسا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابر دیکھا او خدایا۔ ہمارا تو وحشت سے کلیجہ سکڑ گیا صاحب...... وہ کیسا صاحب تھا۔ اس کا آنکھیں خون کا موافق تھا اور چہرے کا کھال اُسی منحوس جیسا پھول جیسا پیلا تھا۔ پھر وہ بولا "تُو کون ہے اور کیوں میرے پیچھے آتا ہے؟" او خدایا اب ہم جانتا تھا وہ کیسا ظالم اثر میں ہے۔ دیکھتا تھا کوئی شیطانی مخلوق اس پر قابض ہے اور اب ہمارا خون پی کر ہی جائے گا۔ ہم بھاگنے کو تھا مگر پھر کیا دیکھتا ہے کہ وہ تو وہی صاحب ہے۔ ویسا کا ویسا۔ وہ مڑا اور پھر چل پڑا وہی ہمراد گانا گاتا آگے ایڈوانس کرنے لگا۔ با۔ با۔ شیپ جیسا۔ جیسا کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"I See۔"

"میں صاحب بت بنا کھڑا تھا۔ یا اللہ آگے جائے یا پیچھے۔ آگے جاتا ہے تو وہ ظالم مخلوق ہے۔ جو صاحب میں ہے وہ ضرور ہمارا روح قبض کرے گا۔ پیچھے جاتا ہے تو کدھر جاتا ہے۔ اچانک وہ بولا۔ خدایا جیسے پیچھے آنکھیں تھا۔ "نور خان آ جاؤ۔ مجھے لگتا ہے۔ سورج مکھی کا دوسرا کنارہ کہیں قریب ہی ہے۔ ہم دوسری طرف نکلنے والا ہے۔ تو صاحب دوسری طرف کا خیال اور اُس منحوس حالت سے نکلنے کا خیال ہم کو پھر اُس کے پیچھے لے گیا۔"

''ٹائم کیا تھا نور خان جب یہ سب چل رہا تھا تمہارے اور اکاؤنٹینٹ صاحب
کے ساتھ......''

''ٹائم کا تو جیسے ہمیں خیال ہی نہیں تھا صاحب...... لیکن سوچتا ہے سورج زوال پر
تھا...... عصر کا ٹائم ہوگا......''

''OK پھر...... تم......''

''آ...... ب۔ تب...... ہم...... اب۔ صاحب سب۔ اللہ معاف کرے۔ کیا
زمانہ آ گیا؟''۔

''کیا مطلب نور خان...... کیا بات کر رہے ہو تم...... کیا زمانہ...... کیا مطلب۔ کیا ہوا؟''

''بہت گھبرا سا گیا ہے...... What's the matter۔ ڈاکٹر صاحب۔''

''گھبراؤ نہیں...... پانی پیو نور خان۔ شاباش...... گڈ......''

''بولو...... بولو...... کیا کیا ظہیر نے......؟''

''میرا خیال ہے سر...... Let him relax a bit۔''

''OK''

''صاحب کا بات نہیں صاحب...... کچھ اور بات ہے۔ بہت بے شرمی کا بات
ہے۔ بہت بے غیرتی کا بات ہے۔ عورت۔ مرد...... بُرا فعل......''

''اوہو۔''

''اوہو...... I See مگر وہاں عورت کہاں؟''

''اوہو......''

''تو کوئی بات نہیں۔ تم نے تو سب کچھ بتانا ہے۔ بیان ریکارڈ ہو رہا ہے۔ تمہاری
ڈیوٹی ہے۔ کم آن۔''

''صاحب۔ اب...... جب...... تب...... ہم...... کیسا......''

"I Guess he saw something Highly graphic."

''perhaps۔ نور خان...... ڈاکٹر صاحب...... اسے کہیں......''

''نور خان...... تم کہو...... جیسے بھی...... ہم سمجھ جائیں گے...... شاباش......''

فحش کا امکان ایک جیتے جاگتے مجسم وجود کی طرح ڈی۔ایم۔ڈی۔
پرسائل منیجر اور کمپنی ڈاکٹر کے درمیان آن کھڑا ہوتا ہے۔ ہر انسان کی طرح وہ فحش کی ازلی
حسرت میں مبتلا ہیں لیکن اُسے جھوٹ کا پہناوا پہنانے کی بے بسی حسرت پر حاوی ہے۔ ادھر
نور خان کی بے بسی ایک مہیب خوف ہے جو اُس کی نسلوں کو زمانوں تک لرزہ براندام کرتا رہے
گا۔ بے لباسی کی اندھی قوت کا مقابلہ وہ اندھا ہو کر اندھا کر کے ہی کر سکتا ہے۔ لیکن حسن اب
اندھا نہیں ہے ''اُچٹتی منظر بینی'' کے چھچھلتے اندھیارتے کی شکار اُس کی نظر اب ٹھہر کر گہرے
سکون میں اُتر کر منظر کی سب شانت وسعت کو رنگ وصوت کی شدت کو، آہنگ کو لمحہ بہ لمحہ اندر
اتارتی ہے۔ اندر جو خلا ہے خلا سے بھرتا ہے اور زرد حیرت سارے میں پھیل جاتی ہے۔ زردی
زرد ہے سب زرد ہے اور عشق ایک زرد تحیر ہے...... اور حسن گاتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ بلیک شیپ......
پھر بھی لمحے بھر کے لیے اس کے زرد تحیر میں جو اندر باہر ایک ہے اس کے زندگی بھر کے 'عادتی'
تعجب کا لمحہ آن گھستا ہے...... یہ بے لباس مرد جو بے لباس عورت کے سامنے کھڑا اُس کے جسم
کے مرکز پر ہونٹ جمائے ہوئے ہے کیسا ہے کہ بمشکل اُس کی کمر تک پہنچتا ہے لیکن پھر بھی
سورج کے عاشق پھولوں کے جنگل میں جب کہ سورج کا حسن روشن چمکتا ہے یہ سب کتنا
فطری ہے کہ ایسا ہی تھا ایسا ہی ہے اور ہو گا یہاں کسی ایسی حیرت کا کوئی مقام نہیں جب کہ
سورج مکھی کے ان گنت پھول ٹوٹے ہوئے زمین پر بے تحاشہ گرے ہوئے اور پھر ہاروں
میں پروئے ہوئے اُن کے جسموں کو ایک نیا لباس پہنائے ہوئے ہیں۔ زرد ہی زرد ہے سب
زرد ہے۔ اور زرد ہی عشق ہے اور وہ عاشق...... اور حسن ایک عاشق نہیں ہے ——

''وہ کوئی مردُود یونا تھا صاحب کوئی فاحشہ عورت کے ساتھ...... اور...... اور بُرا فعل
جیسا کر رہا تھا......''

(ڈی۔ایم۔ڈی سوچتا ہے کہ ''برا فعل جیسا'' سے اس شخص کی کیا مراد ہے۔ یا تو بُرا
فعل ہوگا یا نہیں ہوگا۔ 'فحش' کے درجنوں ضابطے۔ قواعد اور بے قاعدگیاں اس کے تصور میں
آتی ہیں اور وہ شدت سے نور خان سے پوچھنا چاہتا ہے کہ وہ بتائے کہ اُس نے کیا دیکھا پوری
تفصیل سے بتائے۔ لیکن وہ ایسا کوئی تقاضا نہیں کرتا بلکہ پرسائل منیجر کی طرف دیکھتا ہے۔
جس کی آنکھوں میں چمک ہے اور ہونٹوں پر سختی۔ وہ پھر اپنی بات دہراتا ہے)

"وہی سر۔ I think perhaps he saw something highly pornographic... (ایم۔ ڈی ہنس پڑتا ہے۔ اُس کا قہقہہ اس کے اعصاب کو کچو کے دیتا ہے۔)

"What do you mean 'perhaps'. It is obvious enough... Doctor...?"

"Exactly Sir"...... ڈاکٹر اتفاق کرتا ہے۔

"ہاں۔ تو نور خان...... ٹھیک ہے۔ ہم سمجھ گئے۔ ظہیر...... ظہیر نے کیا کہا پھر...... کیا ہوا......؟ جب اُس نے یہ سب دیکھا......"

"جی صاحب...... بتاتا ہے...... جب ہم نے پہلی بار ان کا آوازیں جیسا سنا تو صاحب رُکا...... تھوڑا آگے اس طرف گیا۔ ہم بھی گیا۔ اور اُن مردودوں کو تو دیکھا جو دیکھا لعنت ہزار بار...... خدا غارت کرے...... لیکن بہت بربادی کیا ہوا تھا اُدھر کھیت کا...... پھولوں کا...... بوٹے کا...... کچھ نہیں...... تو مرلہ برابر مقام میں...... سب فنا تھا۔ آخر کسی کا ملکیت تھا۔ سوچا صاحب سے کہے گا...... پھر سوچا خود کہے گا فیکٹری والوں سے جب ادھر فون لگانے جائے گا...... پھر جی میں آیا۔ لعنت بھیجتا ہے...... ہٹو۔ بس ہٹو...... اُدھر سے...... اور ہم ہٹ گیا صاحب پیچھے...... سوچا صاحب بھی ہٹ جائے گا...... لعنت بھیجے گا...... اور ہم چلے گا۔ آگے مگر......"

"مگر کیا......؟"

"صاحب تو اُدھر سے ہلتا نہ تھا...... برابر جما کھڑا تھا......"

"اوہو......"

"I see"

———— عشق کا گہرا دھمکتا دہکتا زرد رنگ اچانک سر پر آن کھڑے گھورتے آسیب کے مداخلتی رنگ کے سامنے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ سورج مکھی مرد عورت کی آنکھوں میں موت کی سیاہی پھیل جاتی ہے مگر لمحوں میں عورت کی آنکھوں سے غائب ہو جاتی ہے اور اندر امنڈتے جنون کی سرخی اُس کی آنکھوں میں تھرانے لگتی ہے۔ سرخی جو مداخلت کار کے لیے ہلاکت کا پیغام لیے ہوئے ہے۔ حسن نظریں ہٹا لیتا ہے۔ دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے...... "میں آگے جا رہا تھا...... میں دوسری طرف جانا چاہتا ہوں...... مجھے علم نہیں تھا میرے رستے میں کون ہے...... کہاں ہے...... میں سورج مکھی کی دوسری طرف جانا چاہتا ہوں......"
حسن ہٹ جاتا ہے ————

"پھر صاحب نے اُن مردودوں سے اللہ جانے کیا بات کی...... اور واپس جہت آیا...... جدھر ہم کھڑا تھا۔ ہم نے سوچا...... ضرور ان بے غیرتوں کو جہنم واصل کرنے کا بات کیا ہوگا...... اور اب ہم سے کوئی تھانہ، کچہری، مُلّا مسجد کی بات کرے گا...... مگر نہیں صاحب وہ تو چپ تھا...... کہیں اور تھا......"

"OK وہی جو تم بار بار کہتے ہو...... کسی اثر میں...... اُسی کیفیت میں تھا......"

"جی...... ڈاکٹر صاحب ویسا...... وہ تو تھا...... وہی تھا...... وہ مخلوق جو اُس میں تھا...... وہ کئی شکل بدلتا تھا...... ہم سمجھ گیا تھا......"

"تو اب کیا...... شکل بدلی......"

"جی ماما...... میں آج بھی گیا تھا...... اس بدمعاش ڈرائیور کا بیان ختم ہونے میں نہیں آتا...... پتہ چلا ہے کہ وہ کوئی لمبی کہانی سنائے جاتا ہے۔"

"اور ابھی تک انہوں نے اُسے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔"

"نہیں۔ ان کا خیال ہے پاپا خود ہی واپس آ جائیں گے۔"

"یا اللہ حسن کہاں چلے گئے۔"

"میں نے ڈی۔ ایم۔ ڈی کو کہا کہ ڈرائیور کو پولیس کے حوالے کریں...... چار چھتر پڑیں گے تو سب بتائے گا۔ پاپا کہاں گئے......"

"پھر......؟"

"کہنے لگا ابھی ہم جلد بازی میں پولیس کو Involve نہیں کرنا چاہتے کمپنی کی بدنامی ہوتی ہے۔ لیکن اگر آخر کرنا پڑا تو ضرور کریں گے۔ اور یہ پورا تفصیلی بیان بھی پولیس کے حوالے کریں گے۔ لیکن نور خان کمپنی کا پرانا اور ایماندار آدمی ہے...... باقی ہم ظہیر صاحب کے کیس کو Medically بھی دیکھ رہے ہیں۔"

"حسن تو کبھی بیمار نہیں ہوئے۔"

"ماما انہوں نے کمپنی کا ڈاکٹر بھی ساتھ بٹھایا ہوتا ہے۔"

"حسن کِدھر چلے گئے۔ تمہیں پتہ ہے پلاٹ کی ابھی آدھی سے زیادہ قسطیں ادا کرنی باقی ہیں۔"

"جی ماما...... مجھے پتہ ہے۔"

"جی ڈاکٹر صاحب...... شکل...... دیکھو...... ایسا...... پورا بدلتا تو نہیں تھا...... اللہ معاف کرے...... ایسا...... جیسا رنگ جیسا بدلتا تھا......"

"میرا خیال ہے Doc وہ Expression کی بات کر رہا ہے Facial Expression بدلا ہوگا......"

"Of course کیسا رنگ بدلا...... نور خان...... ہوں......؟"

"جی صاحب...... وہ گم جیسا تھا...... جیسا اُن سکول کے جھگڑالو...... انگریزی گانا بچوں کو دیکھ کر...... تھا...... اور مسکراتا بھی تھا...... جیسا خوش جیسا ہوتا تھا...... توبہ۔ اللہ معاف کرے...... ہم کو لگا جیسا وہ مزا...... میں تھا......"

"ٹھیک۔ ٹھیک......"

"تو صاحب تب...... ہم پہ پھر دورہ جیسا پڑا...... اپنا کو پھر ہزار بار لعنت بھیجا...... نہ ہم بڑی سڑک سے گاڑی ہٹاتا...... نہ ہم اس منحوس پھول کا کھیت کے پاس گزرتا...... اور نہ ہم اُس شیطانی آفت میں پھنستا...... او خدایا...... اور نہ صاحب پر وہ شیطانی مخلوق قبضہ کرتا......"

"اچھا...... رُکو...... سنو......" کمپنی ڈاکٹر ہارون پاشا جو مسلسل ایک فائل دیکھ رہا ہے۔ ہاتھ اُٹھا کر کہتا ہے۔

"جی ڈاکٹر صاحب...... جی صاحب......"

"رستے میں...... سفر کے دوران...... کیا نام...... آ...... مسٹر حسن رضا ظہیر نے ـــ حسن صاحب نے...... کوئی دوائی...... کوئی میڈیسن...... کھائی......؟ تمہیں کچھ علم ہو......"

"آ...... آ...... یہ بات...... آ...... ہم کو یاد آتا ہے...... صاحب۔ آ...... آ...... اب ہم کو ٹھیک یاد آتا ہے۔ وہ بہت پہلے کا بات ہے...... جب ہم فیکٹری سے نکلا تھوڑا آگے آیا...... یہی کوئی پانچ منٹ بعد...... صاحب نے گاڑی ایک جگہ رکوایا...... جیسا اُس کا چُپ طبیعت تھا۔ بولا کچھ

نہیں۔ اُترا...... برابر ہم نے دیکھا...... ایک انگریزی دواخانہ پر گیا...... چھوٹی مارکیٹ جیسا میں...... کچھ لیا...... واپس آیا...... پانی کا بوتل اُس کے پاس تھا...... کچھ عجب نہیں کھایا ہو...... اللہ بہتر جانتا ہے...... دوا لیا تو...... کھایا بھی ہوگا...... مگر یاد آتا ہے صاحب۔ کھایا۔ کھایا صاحب بالکل کھایا۔"

"بالکل کھایا...... That may be سر یہ میرے پاس پچھلے ایک ہفتے کا ریکارڈ ہے جو شاید اس فائل میں نہیں ہے...... مسٹر ایچ۔ آر۔ ظہیر...... چیف اکاؤنٹینٹ...... یہ پچھلے Monday کو میرے پاس نہیں۔ ہمارے دوسرے کولیگ...... ڈاکٹر تحسین مرتضےٰ کے پاس گئے۔ بے خوابی۔ گردن کے پٹھوں میں کھنچاؤ۔ اور خاص طور پر آنکھوں میں درد...... کی شکایات لے کر آئے۔ انہیں نظر چیک کروانے کی ایڈوائس کی گئی...... ایک سادہ سی Pain Killer اور میں کہوں گا...... سادہ سی ہی Tranqulizer دی گئی......"

"لیکن یہ Employee ہمارے تو...... جتنا میں جانتا ہوں...... بہت Well Adjusted تھے...... I don't know, anyway"

"جی سر...... یہ پچھلے روٹین چیک اپس کے تمام ریکارڈ میں کوئی بیماری...... نہیں۔ انہوں نے تو شاید اسپرین بھی استعمال نہیں کی ہوگی...... لیکن ان حالیہ Tension Symptoms کا...... پرسانل منیجر صاحب شاید کچھ بتا سکیں......"

"آ...... جی...... میرا خیال ہے۔ کچھ ہے...... پچھلے دس دن سے وہ پہلی بار...... میں کہوں گا پوری سروس میں پہلی بار...... مجھے کافی Disturbed لگا...... میرا خیال ہے اس دن کے بعد سے جب اُسے پتہ چلا کہ اُسے پروموشن کے بعد شہر ہیڈ کوارٹر میں بھیجا جا رہا ہے۔"

"اُسے تو خوش ہونا چاہیے تھا۔"

"آ...... Some how ڈاکٹر...... اُسے شہر سے روز یہاں آنا جانا پسند تھا...... I don't know لوگ بھی یہی بتاتے ہیں۔"

"I see لوگوں کی عجیب عجیب Preferences ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ تو سامنے آتا ہے کہ وہ واقعی کسی پریشانی۔ Tension میں تھا...... OK اُسے ٹھیک Prescription دیا گیا...... ڈایازی پام...... 2 ملی گرام۔ 2 دفعہ...... میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ Benzodiazipine دوائیاں بعض اوقات...... میرا مطلب سائیڈ افیکٹس......

Acute Hyperexcited States اور Mental Confusion, Hallucinations بھی پیدا کر سکتی ہیں...... یہ Extremely Rare ہے...... (انتہائی غیر احتمالی) Highly Improbable لیکن ظاہر ہے کہ (ناممکن) Impossible نہیں۔ اور جو ناممکن نہیں ہے وہ بہر حال کبھی بھی ہو سکتا ہے......"

"ہم اس پوائنٹ کو نوٹ کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب...... یہ اہم ہے...... پرویز صاحب۔"

"میں سر...... میں...... نوٹ کرتا ہوں۔"

"ہاں تو نور خان...... تمہاری کہانی...... ابھی جاری ہے۔ کیوں؟"

"جی صاحب...... اللہ ہم کو معاف کرے......"

"ماما اب وہ کہتے ہیں، پاپا کو کسی میڈیسن کا Reacton ہوا ہے...... ہوا ہوگا۔ مطلب......"

"بکواس۔ حسن نے عمر بھر کوئی دوا نہیں کھائی......"

"لیکن اب کھا رہے تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے...... ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔ اور ساری عمر کوئی دوا نہیں کھائی۔ شاید اس لیے زیادہ اثر ہوا ہوگا...... وہ کہتا ہے۔"

"مگر بیٹا...... کون سی دوا...... وہ کوئی بیمار نہیں تھے...... اس دن بھی جب گئے صبح ناشتے میں دو انڈے پراٹھا اور جیم کھا کر گئے...... اگر بیمار ہوتے تو مجھے پتہ نہ چلتا بھلا۔"

"ماما وہ جو دوائیاں ہوتی ہیں۔ Tension کی...... بے خوابی کی...... وہ لے رہے تھے۔"

"مگر انہیں کوئی ٹینشن نہیں تھی...... بکواس کرتا ہے ڈاکٹر......"

"ماما...... وہ...... میرا مطلب ہے...... وہ ہیڈ کوارٹر ٹرانسفر نہیں ہونا چاہتے تھے نا۔"

"اچھا...... وہ...... وہ...... اچھا۔ وہ...... نہیں...... وہ...... بالکل بھی نہیں۔ وہ تو پھر بالکل راضی ہو گئے تھے...... بالکل ہنسی خوشی......"

"ہوں۔ تو پھر نور خان۔ تم لوگ نکلے وہاں سے۔ اس سورج مکھی کے کھیت سے۔" ڈاکٹر پوچھتا ہے۔

---

(16)

میلہ بھاگاں والا میں 'تھانہ تھیٹر'

نور خان اپنا بیان جاری رکھتا ہے

"ابھی کہاں نکلا صاحب۔ ابھی تو صاحب ویسا ہی گم سم کھڑا تھا۔ اور ہم دل میں اپنے آپ کو گالیاں دیتا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ دونوں مردود پودوں کو ہٹاتا ہمارے برابر آ کھڑا ہوا ہے......"

"کون؟ وہ بونا اور عورت۔"

"جی صاحب۔ مگر اب کپڑا اور پڑا پہنا تھا۔ او خدایا۔ کیسا ہنستا۔ تالی بجاتا وہ صاحب کی طرف آیا۔ ہمارا تو عقل گم ہو گیا۔ دیکھو بے غیرت کو...... ابھی کیسا حال میں پکڑا گیا ہے...... مگر جیسا کچھ ہوا ہی نہیں...... صاحب سے ہاتھ ملایا صاحب۔ اپنا بچہ جیسا ہاتھ۔ فاحشہ نے بھی ہاتھ ملایا صاحب......۔ ہم استغفار بولا...... دل میں صاحب کا...... اور صاحب کا گناہ معاف کرے۔"

"اوہو کیا کیا ظہیر نے...... کیا کہا؟"

"ابھی کچھ نہیں کیا صاحب......۔ وہ بونا جیسا بڑی خوشی میں تھا۔ بولا ایسا بولا۔ 'سر میں سمجھ گیا ہے۔ آپ بھی فلم یونٹ میں ہے۔ جبار صاحب جو فلم یونٹ ساتھ لایا ہے۔ وہ سب اپنا ٹینٹ میں ہے۔ میلہ زوروں پر ہے...... سر۔'"

"میلہ؟ ادھر کوئی میلہ لگا تھا؟"

"جی صاحب...... میلہ۔ او خدایا...... کبھی وہ میلہ ہی نہ...... ہوتا...... کیا خبر۔ وہ

بتاہی نہ آتا۔۔۔۔۔۔تو صاحب۔۔۔۔۔۔میلہ کی بات۔۔۔۔۔۔ بوتا کی بات۔ میلہ۔۔۔۔۔۔ صاحب ہنستا ہے اور ایسا جیسا اک دم سے ہنس پڑتا ہے۔ بولا "میلہ۔ آ۔۔۔۔۔۔نور خان ہم میلہ دیکھے گا۔"

فاحشہ خوب ہنسا "بولا۔ سر۔۔۔۔۔۔ ہم آپ کو میلہ دکھائیں گا۔۔۔۔۔۔ ہمارا تھیٹر۔۔۔ میں آج ساسی پنارو کا شو چلتا ہے۔

"ہا۔ہا۔ہا۔۔۔۔۔۔" کمپنی ڈاکٹر اپنی ہنسی روک نہیں پاتا اور پھر ایم۔ ڈی اور پرسائل منیجر بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

"یہ سسی پنوں ہے ناں۔۔۔۔۔۔" ایم۔ ڈی فخریہ انداز میں پوچھتا ہے۔

"جی سر۔ بالکل۔۔۔۔۔۔"

"اس کا مطلب ہے لوکل کلچر پر میری معلومات اتنی بُری نہیں ہیں۔"

"لوکل کلچر کو سراب یہ نیا سیٹ اپ جو آیا ہے۔۔۔۔۔۔" ڈی۔ ایم۔ ڈی کچھ بات کرنے لگتا ہے۔

"جی صاحب یہی نام بولا اس۔۔۔۔۔۔"

"ایک منٹ نور خان۔ سر بات کر رہے ہیں۔" پرسائل منیجر کہتا ہے۔ اور ڈی۔ ایم۔ ڈی بات جاری رکھتا ہے۔

"جی سر۔۔۔۔۔۔ یہ لوگ۔ لوکل کلچر کو promote کرنے کی ان کی خاص پالیسی ہے۔"

"اوہو۔۔۔۔۔۔ آپ تو بہت ویل انفارمڈ لگتے ہیں۔۔۔۔۔۔" ایم۔ ڈی گھڑی دیکھتے ہوئے کہتا ہے اور ڈی۔ ایم۔ ڈی خوش ہو جاتا ہے۔

"بس سر ہم تو انجینئر لوگ ہیں۔ ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق۔"

ایم۔ ڈی بھی موڈ میں آ جاتا ہے۔ نور خان شدید بے چین ہو کر باری باری اُن کے منہ تکتا ہے۔

"کیوں انجینئر کا کلچر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

"بالکل ہے سر۔۔۔۔۔۔ میں اس انفارمیشن کی بات کر رہا تھا، ہمارے ایک دور کے عزیز ہیں حکمت بہزاد صاحب۔ کلچر۔ آرٹ۔ فلم میں بہت in ہیں۔۔۔۔۔۔" ڈاکٹر پاشا کے چہرے پر چمک آتی ہے۔

"حکمت بہزاد۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔ رائٹر بھی ہیں ناں۔ آرٹ فلم پر۔ میرے ایک رائٹر دوست ان کے بڑے فین ہیں۔ کلچر منسٹری میں بھی رہے ہیں۔"

"جی۔ جی۔" ڈی۔ ایم۔ ڈی نوجوان ڈاکٹر کی بالاتر مداخلت پر تھوڑی سی سرد مہری دکھاتا ہے اور پھر اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ "جی۔۔۔۔۔۔ تو ان سے ملاقات ہوئی ہے ایک خاندانی تقریب میں۔ وہ ان لوگوں کے کلچر، آرٹ، فلم، تھیٹر وغیرہ کے پالیسی میٹرز پر کوئی کام کر رہے ہیں۔"

"او، آئی سی۔" ایم ڈی کہتا ہے۔ "کیوں نہ ہم بھی مالکان سے سفارش کر کے فیکٹری میں کوئی ناچ گانا فلم ولم کا سلسلہ شروع کرائیں لیبر خوش ہو جائے گی۔"

"That would be wonderful Sir" ڈاکٹر کہتا ہے۔

"تو میری ان سے بات ہوئی سر۔ بہت ناخوش تھے۔۔۔۔۔۔"

"ناخوش۔۔۔۔۔۔ وہ کیوں؟" ایم۔ ڈی پوچھتا ہے۔

"انہیں دھمکیاں مل رہی ہیں۔"

"دھمکیاں۔۔۔۔۔۔ کیسی دھمکیاں۔۔۔۔۔۔ کون دے رہا ہے۔ دھمکیاں۔۔۔۔۔۔"

"یہی۔۔۔۔۔۔ کچھ دوسرے گروپ۔۔۔۔۔۔ سر۔" ایم۔ ڈی اور ڈاکٹر ایک نظر نور خان کی طرف دیکھتے ہیں۔ نور خان پرسائل منیجر سے اشارے میں پانی مانگتا ہے۔

"پانی۔۔۔۔۔۔ پیے گا صاحب۔۔۔۔۔۔"

پرسائل منیجر دروازہ کے قریب بیٹھے ایک اٹینڈنٹ کو بلاتا ہے۔

"نذر۔ نور خان کو پانی پلاؤ۔"

"آئی۔ سی۔۔۔۔۔۔"

"وہ کہتے ہیں یہ سب کنجر خانہ بند کرو۔۔۔۔۔۔ کلچر کے نام پر بدمعاشی اور بدکاری نہیں پھیلنے دیں گے۔۔۔۔۔۔"

"ویسے۔ بات تو۔۔۔۔۔۔" پرسائل منیجر کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے اور ایک نظر نور خان کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ "تم پانی جا کر پی لو۔ نور خان اور ہم بھی سر۔۔۔۔۔۔ کچھ بریک نہ لیں چائے کے لیے۔"

ایم۔ ڈی ایک نظر گھڑی دیکھتا ہے۔ "sure"۔

نورخان جاتا ہے۔ اٹینڈنٹ بھی جاتا ہے۔ پھر پرسائل منیجر سے مخاطب ہوتا ہے

"آپ پرویز صاحب کچھ کہنے لگے تھے......"

"جی...... میں کہنے لگا تھا...... بات تو دھمکیاں دینے والوں کی ٹھیک ہے۔ ایسے بونا اور...... وہاں کیا کر رہا تھا......"

ایم۔ ڈی۔، ڈی۔ ایم ڈی۔ اور ڈاکٹر قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ پرسائل منیجر شرمندہ سا ہو جاتا ہے۔ ایک اٹینڈنٹ آتا ہے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کی کال ہے۔"

ڈاکٹر ایم۔ ڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "میں سر ذرا کال......"

"پلیز......" ڈاکٹر جاتا ہے۔

"یار تم ڈاکٹری کے ساتھ ادب میں بھی منہ مارتے ہو۔ قسم خدا کی تمہارے سُننے کی چیز ہے۔"

"قصہ کیا ہے؟ ہوا کیا ہے؟"

"یار۔ ابھی بہت مختصر...... تفصیل ملنے پر بتادوں گا۔ ادھر فیکٹری سے ایک آدھ ہم گئی اوپر کہیں کسی پہاڑی علاقے میں جہاں ان لوگوں کا ایک مائننگ یونٹ ہے۔ ایک گاڑی میں تو بہت سے لوگ تھے لیکن دوسری میں صرف چیف اکاؤنٹینٹ اور اُس کا ڈرائیور تھے۔ اب وہ اکاؤنٹنٹ رستے میں کہیں غائب ہو گیا ہے۔ تین دن سے لاپتہ ہے۔ ڈرائیور واپس آ گیا ہے۔ ظاہر ہے وہ اکیلا ساتھ تھا اُس سے پوچھا جائے گا۔ اب وہ سفر کا سارا قصہ سُنا رہا ہے۔ اور جیسے سُنا رہا ہے۔ او مائی گاڈ۔ تم سُنتے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے جو بتایا۔ نمونے کے طور پر......"

"کیا؟"

"تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"آنے دو۔"

"سورج مکھی کے کھیت میں ایک بونا اور ایک تھیٹر کی عورت...... وہ کیا کہتے ہو تم لوگ...... داد عیش دے رہے تھے......"

"You mean real fucking around............"

"اب اس کا کچھ کہہ نہیں سکتے...... وہ ڈرائیور کہتا ہے۔ بُرا فعل جیسا کر رہے تھے......

Not exactly۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔"

"اور وہ بھی سورج مکھی کے کھیت میں۔ ہا۔ ہاخ۔ ہاک۔ ہا...... ونڈرفل...... یار صوفیہ لارین کی فلم Sun Flower دیکھی تھی...... لیکن یہ کوئی اُس سے آگے کی چیز لگتی ہے۔ اس کی داد میں دیتا ہوں......"

"بالکل...... تمہارے لیے میٹریل ہے اس میں......"

"لیکن تمہارے لیے کیا میٹریل ہے۔ یہ تو پولیس کیس ہے۔ تم وہاں کیا انیروگیشن کر رہے ہو؟"

"In a way یہ اکاؤنٹینٹ بندہ...... ساری عمر مثالی صحت میں رہا ہے۔ پھر پچھلے ہفتے اُسے کسی Mild anxiety وغیرہ پر Diazepam شروع کرائی گئی۔ ہوسکتا ہے اُس کی وجہ سے اُس نے Strangely behave کرنا شروع کر دیا ہو......"

"تمہارا مطلب ہے Adverse effect تو کیا اُس نے ایسا کیا......؟"

"ہاں تو اور کیا...... ہا۔ ہا۔ بلیک شیپ اور سورج مکھی کے کھیت ایسے ہی تو نہیں آ گئے......"

"کیا......؟"

"یار باقی ملاقات پر...... ادھر ایم۔ ڈی انتظار کر رہا ہے...... ابھی تو ہم ایک میلے میں پہنچنے والے ہیں۔ OK"

"OK پاشا...... میں یہ Miss نہیں کرنا چاہتا...... جلد ملو...... میلے سمیت۔"

"بالکل۔ بالکل۔ O.K۔"

"اچھا تو وہ بونا اکاؤنٹنٹ صاحب کو کسی فلم یونٹ کا آدمی سمجھا؟"

"جی صاحب۔ ایسا کچھ...... لیکن صاحب۔ ایسا کچھ نہ بولا۔ جو بولا۔ بونا سے بولا۔۔ وہ بس یہ تھا...... میلہ۔ میلہ...... میں میلہ دیکھوں گا۔ خدا معاف کرے...... مگر صاحب

اثر میں تھا بے چارہ ایسا جیسا ناچنے لگا......"

ڈاکٹر گہری سانس لیتا ہے۔"یہ یقیناً Acute hyper excited state ہے سر......"

"کیا صاحب......؟ ڈاکٹر صاحب......"

"کچھ نہیں۔ تم بات کرو......"

"تو سب ادھر سے چلا صاحب...... بونا ناچتا جیسا۔ اور وہ عورت۔ سورج مکھی کا پودا...... ہٹاتا آگے چلا۔ بونا بار بار گھوم کر صاحب کو دیکھتا تھا اور مجھ پر ایک بُرا شک کا نظر ڈالتا تھا۔ ہمارا جی چاہتا تھا ادھر ہی زمین میں گاڑ دے بد بخت کو۔ پھر ہم نے دیکھا عورت بایاں کو چلا۔ جیسے اکیلا کہیں جاتا اور بونا دایاں کو...... صاحب کے آگے...... ہم سب سے پیچھے تھا۔"

"وہ کیوں...... Any way پھر......"

"پھر صاحب۔ شور۔ سنا...... جیسے آگے...... کوئی۔ باہر کوئی...... بازار آتا ہے جیسے بیچنے والا کا آواز...... آتا ہے...... پھر اک دم سے وہ خدائی خوار کھیت ختم ہوا صاحب اور ہم باہر تھا......"

"اوہو......"

"اور سامنے میلہ تھا صاحب۔ ہم میلہ میں تھا......"

ایم۔ڈی کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ جاتا ہے۔

"آپ جاری رکھیں پلیز۔ مجھے ایئر پورٹ جانا ہے۔ وہ جرمن فرم کا چیف آرہا ہے۔ کل مجھے kindly ایک رپورٹ دے دیں۔ اور ڈاکٹر صاحب medical point of view سے ضرور comment دیں۔ بہت ضروری ہے......"

....

ایم۔ڈی کا کمرہ۔ ایم ڈی ٹیلی فون پر بات کر رہا ہے۔ ڈی۔ایم۔ڈی۔ پرسانل منیجر اور ڈاکٹر مؤدبانہ انداز میں اندر آتے ہیں۔ ڈی۔ایم۔ڈی کے ہاتھ میں ایک فائل۔ ایم۔ڈی۔ سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ تینوں میز کے گرد رکھی کرسیوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔

"Basically NaCl is our raw material. concentrated brine from saltmine. oh yes. Thank you."

ریسیور رکھتا ہے۔ اور کسی سوچ میں بے چینی سے سر ہلاتا ہے۔ پھر یک دم ڈی۔ایم۔ڈی سے مخاطب ہوتا ہے۔

"جرمن چاہتے ہیں کہ ہم انہیں cheap کاسٹک سوڈا provide کریں۔ پھر وہ یہاں پلانٹ کا سوچیں گے۔"

"انٹرنیشنل مارکیٹ سے کم تو ہمارے لیے مشکل ہوگا سر......"

"ہوں...... ہاں...... دیکھتے ہیں۔ آہ۔ ہاں۔ اب یہ معاملہ...... اکاؤنٹنٹ آیا واپس؟"

"نہیں سر۔ ابھی نہیں۔ میں نے اُس کے گھر بھی کئی بار فون کیا ہے۔ پتہ نہیں میرا وہم ہے۔ غلط ہوگا۔ لیکن وہ لوگ کچھ زیادہ پریشان نہیں لگتے تھے بلکہ کوئی خاتون پوچھنے لگی حسن ہیڈ کوارٹر آجائیں گے تو ان کی pay کتنی raise ہوگی۔" پرسانل منیجر کہتا ہے۔

ایم۔ڈی۔ لاتعلق سے انداز میں کندھے اچکاتا ہے۔ "بہر حال ہم تو پریشان ہیں نا بھئی...... ہمارا employee ہے۔"

"جی سر...... آپ بالکل درست فرمارہے ہیں۔" ڈی۔ایم ڈی پر تشویش انداز میں کہتا ہے اور فائل پر ہاتھ رکھتا ہے۔ "اور جو کچھ بھی آگے وہاں اُس رات ہوا سر۔ مائی گاڈ...... خوفناک واقعات ہیں سر۔ اگرچہ۔ ایچ۔ آر۔ ظہیر کچھ ایسا Directly involved تو نہیں لیکن ایک angle سے دیکھا جائے تو......"

ایم۔ڈی کے ماتھے پر بل پڑتے ہیں۔ "Don't tell me...... کوئی پولیس ریفرا تو نہیں؟"

ڈی۔ایم۔ڈی گہری سانس لیتا ہے۔ "بالکل ہے سر...... بلکہ...... بہت زیادہ ہے...... رپورٹ میں سب کچھ ہے سر......" فائل آگے بڑھاتا ہے۔

"وہ میں دیکھ لوں گا...... مجھے بریف کرو...... ڈاکٹر صاحب آپ نے میڈیکل اینگل دیکھا؟"

"Absolutely Sir"

''گڈ...... ہوں...... تو...... وہ تو...... کسی میلے کی بات کرتا تھا...... پولیس کہاں سے آ گئی؟'' ڈی۔ایم۔ڈی، پرسائل منیجر اور ڈاکٹر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ ڈی۔ایم۔ڈی گہری سانس لے کر پڑھنے کا چشمہ لگاتا ہے۔ فائل کھولتا ہے اور ایک انٹری پر نظر ڈال کر بولنا شروع کرتا ہے۔

''یہ میلہ بھاگاں والا کا میلہ تھا سر۔ اس علاقے میں۔ مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ عرصہ پہلے۔ سن فلاور آئل مل میں ایک دفعہ......''

''آئی۔سی۔۔ تو یہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ Bloody Idiots......'' ایم۔ڈی اکدم کچھ جھنجلا سا جاتا ہے۔ ''پھر......؟''

''پھر...... ڈی۔ایم۔ڈی بھی کسی الجھن میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اصل میں سر اس شخص۔ نور خان ڈرائیور کا بات کرنے کا انداز...... آپ نے دیکھا ہی ہے۔ ایسا ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ facts کتنے ہیں اور اس کا اپنا ری ایکشن کتنا ہے۔ پھر یہ معاملہ ایسا بھی ہے...... لگتا ہے...... کہ کسی بھی تفصیل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آگے اگر یہ کیس Take up ہوتا ہے۔ تو پولیس کو ایک اور طرح سے involve کیا جائے گا۔ Police may come under fire لیکن ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے......''

''اوہ...... come on...... آپ بتائیں۔ فارگٹ اٹ۔ جو اس نے بتایا وہ بتائیں۔ جو آپ ضروری سمجھتے ہیں......''

ڈاکٹر مداخلت کرتا ہے۔ ''ویسے سر نور خان کا پورا بیان ریکارڈڈ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو سُن......''

''او۔ نو...... لیکن...... اُسے Transcribe بھی کرا لیں...... پرویز صاحب۔'' ایم۔ڈی۔ پرسائل منیجر کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ ہوسکتا ہے لیگل...... ضرورت پڑے...... O.K؟......''

''جی بالکل سر...... میں......'' پرسائل منیجر بھی ڈی۔ایم۔ڈی کی طرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ بس اب اُسے بولنا شروع کر ہی دینا چاہیے۔

''یہ کہتا ہے سر کہ...... بونا انہیں کھیت کے کنارے کھڑا چھوڑ کر جیسے بھاگتا ہوا

جلیبیوں اور قتلموں کی ایک دوکان کی طرف گیا جس کے سامنے پانچ لوگوں کا ایک گروپ بیٹھا چائے پی رہا تھا اور قتلمے کھا رہا تھا۔''

''Wait a minute یہ قتلمہ کیا چیز ہے؟ میں نے پہلی دفعہ یہ لفظ سنا ہے۔''

پرسائل منیجر مسکراتا ہے اور اشارے سے بتاتا ہے۔ ''سر یہ ایک...... ایک اس سائز کی تلی ہوئی روٹی جیسی چیز ہوتی ہے اوپر سرخ بیسن لگا ہوتا ہے......''

''اوہو Huge...... اُدھر ہماری لیبر کی کنٹین میں بکتی ہے......''

اب ڈاکٹر ہنس پڑتا ہے۔ نہیں سر...... ادھر کہاں یہ۔ خاص میلوں کی چیز ہے۔

''Any way تو یہ لوگ......''

''نور خان بتاتا ہے کہ وہ لباس حلیے سے کوئی بڑے شہر کے لوگ لگتے تھے۔ دو کا وہ خاص طور ذکر کرتا ہے۔ ایک لنگڑا سا آدمی جس کے پاس ایک بیساکھی تھی اور دوسری ایک عورت جو سگریٹ پی رہی تھی۔ اور دیکھا جائے تو یہی دونوں آگے کے واقعات میں...... یعنی ان کا رول اہم ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ بونے نے اُن لوگوں سے کوئی بات کی اور ان کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے اُن کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگے۔ بلکہ بیساکھی والے آدمی نے بونے کو اوپر اٹھا لیا۔ کوئی مذاق ان میں شروع ہو گیا اور نور خان کہتا ہے کہ وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے...... اصل میں یہی فلم یونٹ تھا...... انہوں نے بونے کو بتایا ہوگا کہ وہ تو انہیں جانتے ہی نہیں۔ وہ انہیں کہاں سے پکڑ لایا ہے؟ اب وہ کہتا ہے کہ بات یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی اور بونے کو...... اس کے اپنے الفاظ میں...... کیا تھا؟'' ڈی۔ایم۔ڈی ڈاکٹر کی طرف دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر مسکراتا ہے۔

''جی...... بونا...... مردود۔ ہم نے سوچا۔ بس اب لعنت پڑے گا۔ دفعہ ہو جائے گا مردود۔ لیکن وہ پھر آیا صاحب......'' ڈاکٹر نور خان کے لہجے کی نقل اُتار کر کہتا ہے۔

سب ہنس پڑتے ہیں۔

ایم۔ڈی پھر سے بیانیے میں بھرپور دلچسپی لینے لگتا ہے۔ ''اور۔ وہ عورت کہاں گئی......'' وہ پوچھتا ہے۔

''وہ وہیں تھی...... فلم یونٹ کے ساتھ تھی۔'' ڈی۔ایم۔ڈی فوری وضاحت کرتا ہے۔

"نہیں۔ وہ دوسری...... جو بونے کے ساتھ......"

ڈی۔ایم۔ڈی ڈاکٹر اور پرسائل منیجر ایک معنی خیز نظر ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں اور ڈاکٹر بولتا ہے۔

"وہ۔ سر...... تھیٹر کی کوئی ایکٹرس تھی...... جس کا نور خان بتاتا ہے۔ کہ رات تھیٹر میں بونے کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی...... اور وہ ہنگامہ شروع ہوا......"

"ڈانس۔ ہنگامہ؟" ایم۔ڈی پریشانی سے کہتا ہے لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ ڈانس پر پریشان ہے یا ہنگامے پر......"

پرسائل منیجر پہلی دفعہ ہمت کر کے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے۔"جی۔ سر۔ ڈانس میں وہ گھوڑی بنی تھی اور بونا کوچوان...... ٹانگہ لاہوری میرا......"

ایم۔ڈی کی الجھن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔" What the hell is going on اس میں ہمارا وہ اکاؤنٹنٹ کدھر ہے۔"

ڈاکٹر ڈی۔ایم۔ڈی کی طرف اجازت طلب کرنے کے انداز میں دیکھتا ہے۔

"آ...... یہاں...... میرا خیال ہے...... Medically بہت اہم Development ہے۔ سر۔ بونا پھر ان لوگوں کے پاس آیا۔ ان سے معذرت کی کہ وہ انہیں کچھ اور سمجھا۔ لیکن اس نے انہیں نہ صرف میلہ دیکھنے بلکہ رات ان کا تھیٹر شو سی پنوں دیکھنے کی بھرپور دعوت دی۔ میں نور خان کے ریمارکس چھوڑ رہا ہوں...... سر۔"

"گڈ۔ گڈ۔ facts only۔ پلیز......"

ڈاکٹر بات جاری رکھتا ہے۔ "Basically۔ اب ہمارے medical end سے سر یہ ایک classic کیس بنتا ہے benzodizipine کے Psychiatric adverse reaction کا......"

"وہ کھانا کھانے کا بتائیں۔" ڈی۔ایم۔ڈی اگرچہ سکھ کا سانس لیتا ہے کہ بات اب ڈاکٹر ہی کرے گا لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ کوئی اہم بات رہ نہ جائے۔"جی سر میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر ڈی۔ایم۔ڈی کو یقین دلاتا ہے اور پھر ایم۔ڈی کی طرف دیکھتا ہے۔"تو بونا ایچ۔آر ظہیر صاحب اور ڈرائیور کو رات تھیٹر دیکھنے کی دعوت دے کر چلا

گیا۔ نور خان نے سوچا اب اُسے کسی طرح ظہیر صاحب کو واپس لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اُسے اس گاڑی کی بھی فکر تھی۔ جو سورج مکھی کے کھیتوں کے دوسری طرف ویرانے میں کھڑی تھی......" ڈی۔ایم۔ڈی پھر لقمہ دیتا ہے۔

"Exactly...... لیکن ظہیر نے نور خان کی اس suggestion پر اس قدر شدید غصے کا اظہار کیا کہ وہ ڈر گیا۔ اب سر یہ typical ہے۔ extremely aggressive behaviour۔"

"ہوں...... رائٹ۔ رائٹ......"

"اب معاملہ مزید خراب اس طرح ہوا...... ظہیر نے کہا اُسے بھوک لگی ہے۔ نور خان اسے کبابوں کی دوکان پر لے گیا۔ کھانے کے بعد مسٹر حسن رضا ظہیر نے پانی پیا اور وہی گولیاں پھر لیں...... مائی گاڈ...... حالانکہ اگر وہ dose لینی بھی تھی تو شام کو...... اور پھر سر Disaster یہ کہ رات جب یہ لوگ تھیٹر میں جانے کو تھے تو کھانے کے ساتھ اُس نے پھر یہ دوائی۔ پتہ نہیں کتنی تھی۔ اب میرا خیال ہے یہ fatal تھا۔ fatal for his mind...... سر۔"

ایم۔ڈی۔ گہری سوچ میں سر ہلاتا ہے۔ "I see۔ پھر...... کھانے کے بعد۔"

"یہ لوگ نور خان کہتا ہے۔ میلے میں پھرتے رہے۔ اور بونا اور وہ گروپ بھی کہیں ان کے آس پاس ہی رہا۔ ظہیر نے...... نور خان کا خیال ہے اس سگریٹ پیتی عورت کو دیکھ کر خود سگریٹ پینے کی خواہش کی۔"

"وہ سگریٹ پیتا ہے؟"

"بالکل نہیں سر۔" پرسائل جواب دیتا ہے۔

"Unusual thought and behaviour...... ایک documented ری ایکشن ہے سر۔ ایسا مریض...... ایک اور دلچسپ بات جو اس طرح کے کیسز سے سامنے آئی ہے۔ میں پھر عرض کروں گا سر کہ یہ highly improbable ضرور ہے۔ Rare ہے۔ لیکن ناممکن نہیں......"

"ہوں...... اور جو ناممکن نہیں...... وہ تو ہو ہی سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی......" ایم۔ڈی

پر تفکر انداز میں کہتا ہے۔

''Exactly۔ سر۔ کبھی کبھی...... اب یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ acute adverse reaction میں ڈایازی پام کے...... مریض کی۔ سوشل سیٹ اپ میں...... کیا موزوں ہے نامناسب ہے اور کیا نہیں ہے...... اس کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہاں...... یہ دلچسپ ہے مریض کسی بھی سچوایشن میں غیر معمولی خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ کوئی بات ہی نہ ہو...... وہ موت کے کنویں میں حسن صاحب نے جو کیا...... یہ لوگ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلتی دیکھ رہے تھے۔ موٹر سائیکل پر سٹنٹ مین کے پیچھے ان کی کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ ایک راؤنڈ ختم ہوا۔ تو سٹنٹ مین نے اوپر کھڑے تماشائیوں کو دعوت دی۔ اب کسی میں ہمت ہے تو آئے پیچھے بیٹھے اور موت کا نظارہ کرے۔ سو روپے انعام۔ اک دم ظہیر نے نعرہ لگایا۔ ''میں بیٹھوں گا۔'' نور خان کہتا ہے وہ سنبھل ہی نہ سکا کہ اُسے روک سکے اور ظہیر سیڑھی اُتر کر نیچے وہاں ان کے لکڑی کے تختوں کے بنے کنویں کی تہہ میں پہنچ گیا۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔ سٹنٹ مین قہقہے لگانے لگا۔ اور باتیں اُس کی...... ظہیر کو ڈرانے کے لیے دیکھنا سو روپے کے لیے گردن نہ تڑوا لینا...... حسن نے کچھ کہا جو نور خان سن نہ سکا۔ اور پھر وہ اُسے ساتھ لے گیا۔

''لے گیا۔ یعنی...... موٹر سائیکل...... اُسے کیا۔ کیا۔ وہ موت کا کنواں یعنی پیچھے بیٹھ گیا۔'' ایم۔ڈی چیختا ہے۔

''یس سر۔ بالکل۔''

''او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... This is absolutely mad''

''جی۔ سر...... میں۔ Actually...... اب Worried ہوں۔ آج تیسرا دن ہے۔ اور وہ...... اگر بعد میں اُس نے وہ سب دوا کھالی ہے۔ تو benzo poisining بھی ہو سکتی ہے۔''

''میں نے کہا ہے آج شام تک دیکھیں گے...... پھر پولیس کو involve کرنا ہی پڑے گا...... پھر کیا ہوا آگے......'' ایم۔ڈی کا تجسس اب بہت نمایاں ہے۔

''پھر سر...... نور خان کے بیان کے مطابق اس سو روپے سے ظہیر رات گئے تک میلے میں نظر آنے والی ہر اچھی بُری چیز کھاتا رہا۔ سو روپیہ کافی رقم ہوتی ہے۔ قلفے، جلیبیاں،

طرح طرح کے شربت پکوڑے، اندرسے اور ہر اوٹ پٹانگ چیز خریدتا رہا۔ تعویذ، انگوٹھیاں...... عطر...... چاقو اور پتہ نہیں کیا کیا۔''

''اور وہ ڈرائیور...... وہ......؟''

پرسانل منیجر اک دم اپنا موقع دیکھ کر بات کرتا ہے۔ ''ویسے سر میں یہ عرض کروں گا نور خان نے اپنی پوری کوشش کی کہ کسی طرح حسن صاحب کو واپس لے جائے۔ ہمارا پرانا ایماندار ملازم ہے۔ بریف کیس اُس کے ہاتھ میں تھا۔ چھ لاکھ کا کیش اُس میں تھا۔''

''I Know۔'' ایم۔ڈی مختصر جواب دیتا ہے اور پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھتا ہے۔

''جی۔ تو رات ہو گئی۔ تھیٹر کے باہر یہ لوگ کھڑے رہے جہاں سامنے اونچے پلیٹ فارم پر ہیجڑے ناچتے دیکھتے رہے ظہیر صاحب دیکھتے رہے اور ڈرائیور وہی اس کا شاکی توبہ توبہ کرتا رہا۔ اور پھر بونے نے انہیں دیکھا اور بہت آؤ بھگت سے انہیں اندر لے گیا۔ اس نے کہا کرسیاں بہت تھوڑی ہوتی ہیں صرف خاص مہمانوں کے لیے باقی دیہاتی لوگ پیچھے دریوں پر بیٹھ کر تھیٹر دیکھتے ہیں۔''

''دریوں پر؟'' ایم۔ڈی تعجب کرتا ہے......

ڈی۔ایم۔ڈی فوراً اپنی معلومات ظاہر کرنے کا موقع دیکھتا ہے۔ ''سر یہ۔ ہمارے پرانے سفری تھیٹر جو ہوتے ہیں اب تو اتنے رہے نہیں۔ میرے دادا بتاتے تھے کسی زمانے میں میلوں ٹھیلوں پر ساری ساری رات ان کے تھیٹر شو چلتے تھے۔ ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں، شیریں فرہاد، مرزا صاحباں، یہودی کی لڑکی۔ سلطانہ ڈاکو...... مٹی کا سٹیج بناتے تھے اور سامنے کھلا پنڈال۔ لوگ دریوں پر ہی بیٹھتے تھے...... بلکہ بعض اوقات تو زمین پر ہی۔''

''Very intersting...... آپ لوکل کلچر میں بہت rich ہیں۔ I am very poor...... جی۔ ڈاکٹر صاحب۔''

''تو سر بونے نے حسن رضا ظہیر صاحب کو سٹیج کے سامنے دوسری لائن میں بٹھا دیا۔ دو ہی لائنیں تھیں۔ اور نور خان پیچھے گیٹ کے قریب قناتوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔''

''وہ کیوں...... وہاں اکاؤنٹنٹ کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھا؟''

''وہی سر۔ اس کا مذہبی معاملہ...... شیطانی کام وغیرہ...... پھر کہتا ہے کہ پاس

بریف کیس تھا اور اُسے حفاظت میں رکھنا چاہتا تھا۔"

"ایک لحاظ سے اس کا یہ فیصلہ اچھا ہی ثابت ہوا۔" ڈی۔ایم۔ڈی رائے دیتا ہے۔

"وہ کیسے......؟"

"جی سر...... میں بتاتا ہوں۔ اسی جگہ وہ واقعہ ہوا جس کے بعد اس رات کے خوفناک واقعات شروع ہوئے۔" ڈاکٹر کی آواز میں ہلکی سی لرزش ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی روداد کے کسی انتہائی جذباتی اور ہیجانی مقام تک پہنچ چکا ہے اور مناسب الفاظ کا انتخاب اس کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ وہ ڈی۔ایم۔ڈی پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ جیسے اُسے دعوت دے رہا ہو کہ آگے وہ سنبھال لے۔ لیکن وہ اپنا لاتعلق انداز برقرار رکھتا ہے۔ ڈاکٹر گہری سانس لیتا ہے۔

"اب یہاں سر۔ ہوا اصل میں یہ...... اور میں نور خان کے وہ سارے ادھر اُدھر کے ری ایکشن بالکل نکال کر بتاؤں گا......"

"آف کورس۔ آف کورس۔" ایم۔ڈی کا تجسس اب انتہا پر ہے۔

"اکاؤنٹنٹ صاحب سے اگلی...... پہلی لائن میں وہ سب لوگ بیٹھے تھے جنہیں فلم یونٹ ہی کہا جا سکتا ہے۔ پانچ مرد اور وہ عورت جس کے سگریٹ پینے پر نور خان کو خاص اعتراض تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی فلم ایکٹرس ہو۔ ان میں ایک تو وہ تھا جس کی...... بعد میں پتہ چلا کہ ایک ٹانگ لکڑی کی تھی اور ہاتھ میں ایک بھاری بیساکھی تھی۔ دوسرا کوئی تھا جس کی بونے کے ساتھ کوئی خاص دوستی تھی۔ باقی تینوں میں ایک جو کیمرے سے جگہ جگہ تصویریں بناتا پھرتا تھا ہو سکتا ہے ان کا کیمرہ مین ہو اور باقی دو ڈائریکٹر پروڈیوسر ہو سکتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ہوگا۔ غالباً۔"

"کیا یہ تفصیل اہم ہے۔" اک دم ایم۔ڈی پوچھتا ہے۔ ڈاکٹر پر ہلکی سی گھبراہٹ کا رنگ آتا ہے۔ پھر وہ اعتماد سے کہتا ہے۔

"جی سر...... میں سمجھتا ہوں۔ یہ اہم ہے...... پیچھے پنڈال بھر چکا تھا۔ مقامی دیہاتی لوگ شور مچا رہے تھے۔ سٹیج کے قریب تین پولیس والے ڈیوٹی دے رہے تھے لیکن ڈیوٹی سے زیادہ وہ اسٹیج پر سے وقتاً فوقتاً گزرنے والی تھیٹر کی ایکٹرسوں کو دیکھنے اور ان پر آوازیں کسنے میں مصروف تھے خاص طور پر ایک پولیس والا۔"

"آئی۔سی......"

"شو شروع ہوا۔ یہ کوئی ڈانس تھا...... جو بعد میں جیسے نور خان نے نقشہ کھینچا۔ میرے لیے کچھ مشکل ہے بتانا۔ کیسا ہوگا...... لیکن وہی عورت اور بونا آگے پیچھے کھڑے کھڑے دوڑ رہے تھے اور بونا اس کی کمر میں ایک دوپٹہ ڈالے ایسے ہی پکڑے ہوئے تھا جیسے کسی تانگے کا کوچوان ہو اور ریکارڈ پر وہ گانا چل رہا تھا......" ڈاکٹر کچھ سوچتا ہے۔ پرسائل اُس کی مدد کرتا ہے۔

"تانگہ لاہوری میرا۔ گھوڑا پشوری میرا۔ میں ہوں البیلا تانگے والا...... بہت پرانا گانا ہے سر......" پرسائل کھسیانے سے انداز میں کہتا ہے۔

"آ...... Very Intersting...... اور وہ عورت...... آئی مین۔ وہی تھی...... ڈانس میں جو...... سن فلاور کے کھیت میں......؟"

"جی...... سر۔ وہی تھی بلکہ نور خان نے کہیں سے اُس کا نام بھی سن کر...... گالیاں دے کر بتایا...... کیا تھا۔ ہاں بے بی کٹار......"

"وٹ از کٹار......؟"

"خنجر...... سر......" ڈی۔ایم۔ڈی فوراً بتاتا ہے۔

ایم۔ڈی ہنستا ہے۔

"یہ میرا خیال ہے جیسا نور خان کے بیان سے ہم نے اخذ کیا۔ تھیٹر والوں کا کوئی بہت ہٹ آئٹم تھا...... بقول اُس کے بدمعاشوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ اور گانا مسلسل بج رہا تھا۔ اس دوران۔" (ڈاکٹر کا لہجہ بدلتا ہے)

"لیکن اس دوران اب یہ بھی ہو رہا تھا کہ اگلی لائن والوں یعنی فلم یونٹ والوں کے سامنے وہ پولیس والے بار بار آن کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اُن میں سے خاص طور پر ایک تو بہت ہی بدتمیز تھا۔ اور وہ اُن کی ساتھی عورت کے سامنے اس طرح رک جاتا تھا کہ اُس کے لیے سٹیج کو دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اُس پولیس والے کو عورت کے ساتھیوں نے اور خود اُس عورت نے بھی دو تین بار منع کیا لیکن اُس نے کوئی خاص اثر قبول نہ کیا۔"

"ہوں......"

''پھر تماشائیوں نے ویلیں دینی شروع کر دیں......''

''ویلیں What the hell is that?......''

''تماشائی سٹیج پر پرفارم کرنے والوں کو پیسے دیتے ہیں سر۔ وہ دو دو روپے، پانچ پانچ روپے کے نوٹ لے سٹیج کے قریب جاتے تھے اور وہ بونا اور وہ گھوڑی مطلب عورت اسی طرح ناچتے بھاگتے مڑتے تھے اور ڈانسر عورت آگے کو جھک کر نوٹ اچک لیتی تھی اور پھر بعض اوقات کسی تماشائی کے اصرار پر نسبتاً بڑا نوٹ منہ میں تھام لیتی تھی۔ اس پر ایک زبردست ہنگامہ مچ جاتا......''

ایم۔ڈی پرسائل منیجر کی طرف ایک نظر دیکھتا ہے۔ ''کافی...... کہہ دیں......''

پرسائل مودبانہ سر جھکاتا ہے اٹھتا ہے اور جاتا ہے۔

''اسی دوران پہلی لائن فلم یونٹ اور اُس پولیس والے میں چپقلش جاری رہی۔ ایک موقع پر بیساکھی والے اور پولیس والے میں کچھ تکرار بھی ہوئی۔''

''اور یہ ڈرائیور ہمارا یہ سب دیکھ رہا تھا...... وہ تو کہیں پیچھے نہیں کھڑا تھا......؟''

''جی...... لیکن وہ کہتا ہے اس کی نظریں مسلسل سٹیج کی بجائے صاحب پر، یعنی اکاؤنٹنٹ صاحب پر ہی جمی تھیں اور پھر اُس نے دیکھا کہ...... یک دم ظہیر صاحب اٹھے اور تیزی سے اُس جگہ کی طرف بڑھے جہاں انہیں پتہ تھا کہ نور خان بریف کیس لیے ہوئے ایک لٹکی ہوئی کھڑی قنات کی اوٹ میں تقریباً چھپا کھڑا ہے۔ وہ کہتا ہے پہلے تو اُس نے شکر ادا کیا کہ بس صاحب کا دل بھر گیا ہے اور اب وہ اُس منحوس بدمعاشی کے اڈے سے نکل جائیں گے۔ لیکن ظہیر صاحب کا تو کچھ اور ہی ارادہ تھا۔ انہوں نے نور خان کو بریف کیس کی چابی دی اور کہا کہ وہ اندر سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اُسے دے......''

''او۔ مائی گاڈ...... وہ۔ اُس۔ اُدھر۔ پرفارمرز کو دینے کے لیے......؟''

''جی سر...... نور خان کہتا ہے کہ اُس کا تو دل ڈوب گیا۔ اُس نے اکاؤنٹنٹ صاحب کو بہت ٹالنے کی کوشش کی۔ اس پر اُن کی کیفیت وہی ہوگئی یعنی کہ Extreme aggressive behaviour اور انہوں نے اس سے بریف کیس ہی چھیننے کی کوشش کی۔ اس پر نور خان نے عقلمندی کی۔ اُس نے تیزی سے بریف کیس کھولا اور سب سے چھوٹے یعنی سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی ظہیر کے حوالے کی۔ ظہیر تیزی سے گڈی لے کر سٹیج

کی طرف چلا گیا اور نور خان وہاں سے بھاگا۔ تھیٹر سے باہر نکلا اور کہتا ہے اندھیرا تھا، رات تھی۔ تھیٹر کے پاس ہی ایک مٹھائی کی بڑی دکان جو لکڑی کے بڑے بڑے میزوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ اور اُس کی پچھلی طرف کوڑا کباڑا اکٹھا تھا۔ ان کے نیچے گھس کر اس نے بریف کیس وہاں چھپا دیا۔ اور پھر ویسے ہی بھاگتا ہوا واپس آ گیا......''

ایم۔ڈی تعریفی انداز میں سر ہلاتا ہے۔ ''گڈ...... یہ شخص smart ہے......''

''یس سر۔ واپس آیا تو کہتا ہے کہ اب بریف کیس پاس نہیں تھا اس لیے آگے ہی آ گیا اور ظہیر کی خالی کرسی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور ظہیر مسلسل سو سو کے نوٹ ایک ایک کر کے اس ناچتی عورت کے منہ میں تھما رہا تھا۔ اور لوگ پاگل ہو رہے تھے۔

''This, This, This...... یہ۔ یہ......'' ایم۔ڈی بہت excited ہو جاتا ہے۔ ''یہ۔ This is the point...... جہاں سے میرا خیال ہے ہماری involvement شروع ہو جاتی ہے......''

''Exactly سر...... اب نور خان کہتا ہے کہ اس عورت نے سگریٹ سلگایا پولیس والے نے اسے دیکھ کر قہقہہ لگایا اور کوئی فقرہ کسا جس پر اس کے ساتھی نے اٹھ کر اُسے بدتمیزی نہ کرنے اور بکواس نہ کرنے کو کہا۔''

''کون...... وہ۔ بیساکھی والا؟''

''نہیں۔ کوئی دوسرا سر۔ اس پر پولیس والے نے اُسے بھی بکواس نہ کرنے کو کہا۔ اب نور خان سن سکتا تھا۔ پاس ہی بیٹھا تھا۔ عورت نے بھی اُسے اونچی آواز میں بُرا بھلا کہا۔ پولیس والے نے پھر کوئی بدتمیزی کی۔ اس پر بیساکھی والے نے اٹھ کر پولیس والے پر جھپٹنا چاہا لیکن باقی ساتھیوں نے اُسے کھینچ کر واپس بٹھا دیا۔ نور خان کہتا ہے کہ ادھر ظہیر صاحب عورت کے منہ میں نوٹ تھماتا جا رہا تھا۔ لیکن بونا ناچنے کے باوجود پہلی لائن کی کشمکش کو صاف دیکھ رہا تھا اس نے دوپٹہ چھوڑ کر سٹیج کے کنارے قریب جا کر اس پولیس والے کا نام لے کر اُسے مخاطب کیا اور اُسے بتایا کہ اس کے مہمان بیٹھے ہیں اور منت سماجت کر کے اُسے ان کے سامنے سے ہٹ جانے کو کہا۔ جواباً پولیس والے نے بونے سے کوئی فحش مذاق کیا۔ اور قہقہہ لگاتا پیچھے ہٹا۔''

پر ساؤنڈ مینجر اور اٹینڈنٹ کافی لاتے ہیں۔ اٹینڈنٹ کافی سب کے سامنے رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سامنے رکھے گلاس میں پانی ڈالتا ہے اور چند گھونٹ لیتا ہے۔ پھر ڈی۔ ایم۔ ای کی طرف دیکھتا ہے۔

"......سر۔ میرا خیال ہے کوئی essential point میں نے miss تو نہیں کیا۔"

"بالکل نہیں۔ بالکل نہیں ڈاکٹر صاحب...... بلکہ آپ میری لکھی رپورٹ سے زیادہ اچھا بتا رہے ہیں۔ سب نچوڑ نکال کر......"

ڈاکٹر کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑتی ہے اور وہ پھر اپنا بیان شروع کرتا ہے۔

"اب سر۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ مسٹر ایچ۔ آر۔ ظہیر اس وقت Acute hyper exicited state میں تھے۔ کل میں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر شفقت سے بھی یہ ڈسکس کیا۔ کچھ لٹریچر بھی دیکھا۔ Benzo کے سائیکیاٹرک ایڈورس ایفیکٹس درحقیقت مریض کی اپنی اصل ذہنی زندگی سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ظہیر صاحب جو کچھ کر رہے تھے اس کے ذمے دار نہیں تھے......"

ایم۔ ڈی غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ "ذمے داری...... یہ...... اگر کوئی میڈیکولیگل معاملہ بنتا ہے تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا ڈاکٹر صاحب اور پھر۔"

"نور خان کہتا ہے بونا واپس گیا۔ ریکارڈ اب بھی بج رہا تھا۔ پنڈال میں وقتاً فوقتاً ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا۔ کھلی جگہ تھی۔ اچانک ظہیر صاحب کے ہاتھ سے وہ سو سو کے کچھ نوٹ پھسلے اور سٹیج پر گرنے کی بجائے ہوا سے اڑ کر پہلی لائن کی طرف گئے اس پر ان تینوں پولیس والوں نے نوٹ جھپٹنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہی بدتمیز پولیس والا لڑکھڑا کر اس عورت کے اوپر گرا......"

"اوہو......"

"نور خان کہتا ہے کہ بس پھر بیساکھی والے نے کچھ نہیں دیکھا...... اور نور خان اُس کی تعریف کرتا ہے کہ غیرت مند مرد تھا...... اُس نے کھینچ کر پولیس والے کو اٹھایا اور جونہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا۔ اُس نے بیساکھی کا ایک بھرپور وار کیا جو اتنا شدید تھا کہ پولیس والے کا سر پھٹ گیا اور اُس کے سر اور کان سے خون تیزی سے نکلنے لگا، وہ چکرایا اور گر پڑا۔"

"مائی گاڈ۔ مائی گاڈ...... اور حسن رضا......؟"

نور خان نے اٹھ کر اُسے کھینچ کر اسٹیج سے پیچھے ہٹا لیا۔ ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ باقی دونوں پولیس والوں نے زخمی ساتھی کو تیزی سے وہاں سے ہٹا لے جانے کی کارروائی شروع کی۔ اسٹیج پر تھیٹر کے باقی مرد عورتیں بھی اکٹھے ہو گئے کہ ہوا کیا ہے؟ تھیٹر روک دیا گیا۔ ایک پولیس والے نے انہیں گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ مالک کو بلاؤ ـــــ جواب آیا۔ مالک تو کل کا جا چکا ہے۔ پھر اُس نے سب کو دھمکی دی کہ ادھر سے کوئی ہلا تو اس کی خیر نہیں۔ فیصلہ رانا صاحب کریں گے۔ اور وہ چند لوگوں کی مدد سے زخمی ساتھی کو وہاں سے ہٹا لے گئے۔ نور خان کہتا ہے کہ اُس نے تیزی سے ظہیر صاحب کو وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کی۔ جو اُس وقت غصے کی بجائے اس کیفیت میں تھا کہ جیسے کچھ سمجھ نہ آ رہا ہو کہ کہاں ہے اور کیا ہو رہا ہے...... A state of confusion...... میرا خیال ہے۔"

"تو نکلے وہاں سے......؟"

"نہیں سر۔ دروازے پر ایک اور پولیس والا موجود تھا۔ اُس نے انہیں گالیاں دے کر واپس دھکیل دیا۔ یہ لوگ واپس اپنی سیٹوں پر آ گئے۔ ادھر تماشائیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ وہ تھیٹر دیکھنے آئے ہیں پیسے خرچے ہیں۔ شو کرو۔ شو کرو۔ شو کرو کے نعرے لگنے لگے۔ اس پر تھیٹر والوں نے کوئی مشورہ کیا اور پردہ تھوڑی دیر بند رہ کر پھر کھلا تو...... سسی کا رول کرنے والی ایک ایکٹرس صحرا میں نظر آتی ہے۔ تماشائی اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اُدھر نور خان کہتا ہے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ بونا فلم یونٹ والوں سے مسلسل کوئی کھسر پھسر کر رہا تھا۔ غالباً انہیں مشورہ دے رہا تھا کہ وہ انہیں کسی اور رستے سے نکال دیتا ہے۔ لیکن وہ انکار کر رہے تھے۔ بلکہ اس نے اُن میں سے کسی کا ایک فقرہ سنا بھی...... کہ انہوں نے کچھ غلط نہیں کیا اور ان کے بڑے تھانیدار کو آنے دو رانا یا جو بھی ہے...... آئے گا تو وہ اُسے بتائیں گے کہ کیا ہوا ہے۔ لیکن بونا یقیناً رانا صاحب کو ان سے کہیں بہتر جانتا تھا......"

"آئی۔ سی......"

"وہ بتاتا ہے کہ پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ پولیس کی دو جیپیں باہر لوگوں کی چیخ و پکار میں تھیٹر کے سامنے آ کر کھڑی ہوئیں۔ لمحوں میں پولیس والوں نے بھاگتے

ہوئے اندر گھس کر اسٹیج پر اور پہلی اور دوسری لائن کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اردگرد کی رسیاں کاٹ
کر قناتیں گرادیں اور تماشائیوں کو لاٹھیاں مار مار کر بھگا دیا۔ نور خان کہتا ہے جیسا کہ
قیامت آگیا۔"

"اوہ......"

ڈاکٹر چند لمحے ایک تناؤ زدہ خاموشی کی حالت میں رہتا ہے پھر کہتا ہے۔

"اس کے بعد سر اس رات وہاں جو کچھ ہوا۔ اور اصل میں تھانہ بھاگاں والا جو
ہوا وہ انتہائی shocking ہے۔ اگرچہ ہمارے ظہیر صاحب یا ڈرائیور تو کسی طرح بھی
directly اُس میں involved نہیں ہیں۔ لیکن اگر کل Police Brutality کا یہ معاملہ
پریس میں آجاتا ہے اور پھر پولیس والے پر حملے کا کیس تو ہے ہی...... تو مطلب یہ ہے کہ ظہیر
اور ڈرائیور کو بطور گواہ یقیناً طلب کیا جا سکتا ہے۔ اور کمپنی سے پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ وہاں
کیا کر رہے تھے۔"

ایم۔ڈی منہ سکیڑ کر کافی کا گھونٹ لیتا ہے۔

"ہمارے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ اگر بات وہاں تک گئی تو دیکھ لیں گے۔ ابھی ذہن
اپنی opinion بنا رہا ہوں۔ تو پھر کیا ہوا......؟"

"تو سر وہ تھانے دار رانا جو بھی تھا۔ Drunk تھا یا نہیں، اس نے خوفناک کارروائی
شروع کی۔ بیساکھی والے کو اُسی وقت پکڑ لیا گیا۔ اس کے علاوہ فلم یونٹ کے تمام لوگ بھی
کی سب ایکٹرسیں اور ایکٹر۔ اُس نے پوچھا...... تھانے دار نے...... مالک کہاں ہے۔ بالا
بونے نے بتایا کہ مالک کل ہی واپس چلا گیا ہے۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں یہ ڈرائیور...... اس کا بیان...... پوری طرح قابل اعتبار ہے
is he reliable" ایم۔ڈی پوچھتا ہے۔

"میرا خیال ہے سر ڈاکٹر صاحب پہلے ہی صرف اہم بنیادی واقعات بتا رہے
ہیں۔" ڈی۔ایم۔ڈی کہتا ہے اور بے چین سی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر دبے ہوئے
لہجے میں کہتا ہے۔ "آگے...... پھر......"

"O.K...... آگے...... ہم...... بنیادی......"

ڈاکٹر گہری سانس لیتا ہے اور سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے جیسے کوئی ذمہ داری قبول کر رہا
ہو۔ آگے پھر سر...... مم۔ میں...... مختصراً بتاتا ہوں۔ رانا ان سب لوگوں کو تھیٹر والوں کے ٹرک
میں ہی بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر تھانہ بھاگاں والا لے آیا جو نور خان بتاتا ہے بس کوئی دس
منٹ کی drive پر تھا۔ فلم والوں نے بہت بڑھ کر بحث کرنے کی کوشش کی، اس پر رانے نے
انہیں گالیاں دیں۔ تھیٹر والے اُس کے پاؤں پڑتے رہے انہیں تھپڑ اور ٹھڈے پڑے۔"

"Obviously...... ایسا تو ہوا ہوگا...... اصل میں کیا ہوا......؟" ایم۔ڈی کی
بے چینی مزید بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر پھر گہری سانس لیتا ہے۔ اس کی کافی سامنے پڑی ٹھنڈی ہو چکی ہے وہ
ٹھنڈی کافی ایک ہی دفعہ غٹ غٹ کر کے پی جاتا ہے۔

"تھانے میں رانا نے سارے لوگوں کو حوالات میں تین الگ الگ کمروں میں بند کر
دیا۔ تھیٹر والے، فلم والے اور ہمارے ان دونوں سٹاف ممبرز کو۔ پھر نور خان کے بیان کے مطابق
تھیٹر کی سب عورتوں کو اور ایکٹروں کو رات بھر تھانے کے عملے نے ریپ کیا...... Damn it......"

"اوہو۔ Damn it...... اوہو...... اوہو" ایم۔ڈی عجیب سے تاثرات کے ساتھ سر
کو دائیں بائیں حرکت دیتا ہے۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ وہ تاسف کا اظہار کر رہا ہے یا غصے کا......
"what next?...... ڈاکٹر...... صرف اہم اور بنیادی باتیں۔" اور وہ وہ بے ساختہ ہنس پڑتا
ہے لیکن پھر یک دم خاموش ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر بھی بات جاری رکھنے کے لیے خاموش ہو
جاتا ہے اور پھر اس موقع پر نور خان کے الفاظ یاد کرتا ہے۔ تاکہ بنیادی بات چُن لے اور زائد
چھوڑ دے۔ اور بازیافت کے ایک ہی لمحے میں ایک روز پہلے کا نور خان کا بہت سا بیان اُس
کے ذہن میں سے گزر جاتا ہے............

"......رانا مردود...... شکل سے ہی زانی۔ شرابی۔ لگتا تھا صاحب...... آدھی رات کا
عالم تھا۔ تھانے...... ہمارا کمروں...... حوالات کا سامنے...... پاگل کتا کے موافق بھونکتا تھا......
ہنستا تھا...... آوازیں دیتا تھا۔ شادے۔ پرویز۔ نیامت۔ اسلم۔ ظہور ہا کو...... کون کون
صاحب...... اوئے۔ آؤ اوئے...... پہلے تو ان کنجروں کے ساتھ وہی کرو نا...... جوان کا کام
ہے...... لیلیٰ مجنوں...... ہیر رانجھا...... سسی پنوں...... سوہنی مہینوال...... مرزا صاحباں...... اوئے

آج سارے تھیٹر ادھر ہی چلا دو...... پھر پاگل جیسا سب...... مل کر ہنستا تھا......"

"تمہیں یہ سب کچھ سامنے نظر آ رہا تھا......؟"

"جی صاحب...... وہ دو کمرہ ہمارا کمرہ کا سامنے تھا...... ایک میں تھیٹر والا...... اور
دوسرے میں فلم والا۔ ہمارا سامنے تھا درمیان میں جگہ تھا...... صاحب تو سو گیا تھا......"

"ظہیر صاحب سو گئے تھے......؟"

"جی صاحب۔ بے ہوش جیسا نیند...... مگر ہم...... کا۔ نیند...... کہاں...... ہم اللہ
سے دعا مانگتا تھا اس قیامت سے نکلے...... اور رانا...... کالا خنزیر جیسا...... بھونکتا تھا...... کہ
تھا...... اوئے...... پہلے یہ آج کا شو کی ہیروئنیں...... سی۔ ہیر۔ بے بی۔ سوہنی کو تو پہنچاؤ
اوپر میرے کمرے میں...... بڑا دیر ہوگئی ہے پنوں رانجھا مہینوال بنے...... ایسا وہ بدمعاش بولتا
تھا اور دوسرا کوئی ہنستا...... کہتا...... اور صاحب ان کا اپنا پنوں۔ رانجھا۔ مہینوال کا کیا بنے
گا......؟ رانا بڑا ہنسا۔ بڑا ہنسا...... ہم...... سمجھا ہنس ہنس کر پھٹ جائے گا۔ ادھر اکا دُکا
صاحب...... بس سوتا تھا...... سوتا تھا......"

"اوہو...... Benzo......"

"کیا صاحب......؟"

"کچھ نہیں...... تم بتاؤ......"

"ہنسی رُکا...... صاحب...... تو ظالم بولا...... اوئے...... وہ مودا کدھر ہے...... کسی
نے بتایا...... وہ تو سر۔ لنگڑے کا خدمت کر رہا ہے۔ پھر ہم نے چیخوں جیسا آواز پہلی بار
سنا...... اور جیسا کوئی ضرب لگاتا۔ بار۔ بار۔ بار۔"

"لنگڑا یعنی...... وہ بیساکھی والا......؟"

"وہی صاحب...... تو رانا...... بولا...... ٹھیک ہے...... پر...... وہ تو دوسری لین پر
بھی چلتا ہے نا...... ایسا کچھ بولا...... اُس کو بتاؤ...... پنوں، مہینوال کی بھی خدمت کرے ذرا۔
پھر سب ہنسا بہت۔"

ڈاکٹر۔ ڈی۔ ایم۔ ڈی اور پرسائل ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"اس کی رپورٹ کل ایم۔ ڈی صاحب کو لکھ کر دینی ہے۔" ڈی۔ ایم۔ ڈی کہتا

ہے۔ "کر لیں گے سر...... Don't worry......" ڈاکٹر کہتا ہے۔ "تو نور خان پھر......؟"

"پھر کیا صاحب...... تھیٹر والا عورت لوگ اور تین مرد لوگ کو وہ کہیں اور لے
گیا...... پولیس والا...... بونا...... ان کا پاؤں پڑتا تھا...... لوٹ پوٹ کرتا تھا...... عورت اس کو
بولتا بھی تھا...... نہ کر۔ پیارے۔ نہ کر...... ہمارا قسمت ہے...... پہلی بار صاحب ہم کو۔ بونا پر
ترس آیا۔ بے چارہ کیسا اپنا عورت لوگ کا عزت بچانے کو تڑپتا تھا۔ اور وہ رانا...... اس
نے...... بونا کو دونوں ہاتھوں میں گڈا جیسا اٹھایا اور دوسروں پر پھینک دیا...... گالی نکالا۔ اس
کو۔ دیکھو اوئے...... ہے کسی کے کام کا...... پھر بولا...... آج...... میرے سامنے اس کو گھوڑی
بنا...... ذرا...... آ۔ آ۔ آ اور پھر ہنسا......"

"اور ان فلم والوں نے کوئی...... تم کہتے ہو وہ بھی وہیں تھے۔ سب دیکھ رہے
تھے...... انہوں نے کوئی بات نہیں کی؟" ڈاکٹر پوچھتا ہے۔

"جی صاحب۔ جی صاحب...... وہ بھی ہوا۔ وہ بھی ہوا...... جب یہ سب کارروائی
چلتا تھا...... رانا شیر موافق دھاڑتا تھا...... فلم والا مرد اور وہ عورت سلاخوں کو ہلاتا چیختا تھا......
شور مچاتا...... یہ تم کو بہت مہنگا پڑے گا...... یہ جو تم کر رہا ہے...... مت سمجھو یہ سب کر کے تم بچ
جائے گا...... یہ...... یہ۔ ہے۔ یہ۔ وہ۔ اوپر تک جائے گا...... اخبار میں آئے گا...... نہیں
چھوڑیں گا ایسا جیسا...... فون۔ فون۔...... ہمیں۔ مجھے فون...... اس پر رانا بڑا دیر سنا ان سنا کرتا
رہا...... پھر ایسا جیسا...... رانا تڑپ کر اپنا چھوٹا تھانے دار سے بولا...... جاوید...... اُن کی بک
بک بند کراؤ...... نہیں تو...... ٹھہرو...... میں۔ کراتا ہوں...... پھر اک دم سے ادھر ان کے
سلاخوں کے سامنے گیا......"

"تمہارا مطلب ہے حوالات کے جس کمرے میں فلم والے بند تھے۔ ان کی
سلاخوں کے سامنے......؟"

"جی صاحب...... رانا سانپ جیسا پھنکارتا...... اُدھر بولا...... تم نے اپنا بک بک
بند کرنا ہے یا نہیں...... تم بند کرو بکواس۔ اُدھر فلم والا بولا...... او خدایا...... اب رانا پاگل ہو
گیا...... اس کا سر کا اوپر بلب جلتا تھا۔ لٹکتا جیسا۔ مگر چہرہ نظر آتا تھا...... اس کا ہونٹ......
آنکھیں کانپا اُس نے کہا...... اس بندے کا بہت بڑا گالی دیا...... اور کہا...... ایک لفظ تو نے اور

بولا تو...... اس کو یہ جو تیرے ساتھ ہے۔ اس کو بھی لے جائے گا...... ہیرے۔ کیا۔ [illegible]
ساتھ۔ تھیٹر کیا اور فلم کیا۔ کنجریاں تو سب ایک ہے۔ پھر کرنا جتنی مرضی بک بک۔ بولا حرامی
ہے...... بول۔ بول...... بہن چود بول اب...... معاف کرنا۔ صاحب۔ گالی اس مردود کے منہ
سے نکلا......"

"It is ok...... پھر......؟"

"او خدایا...... رانا کا اس بات پر صاحب...... ایسا ہوا صاحب...... جیسا ہم وہ
وہ سب مرد۔ جیسا گونگا ہو گیا۔ جیسا لڑکھڑا گیا۔ عورت بھی پیچھے ہٹ گیا...... ہم سامنا کر رہا
لیٹا جیسا سب دیکھتا سنتا تھا۔ کوئی کچھ نہیں بولا...... عورت بھی۔ پیچھے ہٹ گیا دیوار کو...... اور
رانا پھر قہقہہ مارتا...... بولا...... میں تمہارا لحاظ کر رہا ہے...... بکواس کرتا ہے...... پھر کس نے
پوچھتا...... اوئے شادے اوئے...... اس کا غیاثے کا کیا حال ہے......؟ اب کوئی بولا کہ
لگے ہیں سر میں...... اچھا۔ اس سے ڈاکٹر سے کہو۔ میڈیکل رپورٹ مجھ سے پوچھ کر لکھے۔ ان
سب پر قاتلانہ حملے کا کیس بنتا ہے...... بکواس کرتا ہے۔ فلم والا بالکل سہم گیا صاحب...... اور
رانا...... وہاں سے چلا گیا...... رات ایسا تھا جیسا گزرتا ہی نہ تھا۔ اور کوئی دوسرا کمرے سے عورت
لوگ کا...... چیخنے چلانے۔ اونچا رونے کا آوازیں آتا تھا...... رات ایسا ہی گزر گیا...... ایک
موقع...... صاحب جاگ گیا...... مجھے بولتا تو کون ہے...... ہے...... ہم کدھر ہے...... یہ جگہ
کیا ہے...... ہمارا دل دہل گیا کہ اب کوئی اور لپھڑا پڑتا ہے۔ مگر وہ پھر سو گیا...... ایسا ہی۔
ایک فلم والا ہم کو...... آواز دے کر...... پوچھتا...... آپ کون لوگ ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔
ہم کچھ نہ بولا...... سوچا...... اس کا معاملہ الگ ہے...... ہمارا الگ...... کیوں بتائے۔ اور صبح
تک ایسے ہی ہم جھوٹا سوتا رہا......"

"جی ڈاکٹر صاحب...... کس سوچ میں پڑ گئے......؟"

"اوہو...... کچھ نہیں سر......" ڈاکٹر چونکتا ہے۔

"تو آپ کا خیال ہے کہ یہ شخص۔ اکاؤنٹنٹ ہمارا رات جو جاگا کسی پہچان کے بغیر تو
یہ بھی اسی ڈرگ کا اثر تھا؟" ایم۔ڈی پوچھتا ہے۔

"Of Course سر...... اور کوئی explanation بنتی نہیں۔ خیر تو نور خان بتا

ہے کہ صبح تقریباً گیارہ بجے انہیں تھانیدار نے بلایا...... نور خان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ
تھانیدار اب کافی بدلا ہوا تھا...... اُس نے اُن سے ایک ہی سوال پوچھا" وہ سونے کے ڈولوں کی
گڈی کہاں سے آئی تھی؟" ظہیر اس کے بتانے کے مطابق بالکل خاموش تھا۔ اس پر نور خان
نے تھانیدار کو بتایا کہ وہ کمپنی کے ٹور پر آئے تھے ایسے ہی اندر چلے آئے تھیٹر میں۔ کیش تو ہوتا
ہے پاس ہم لوگ آگے ٹور پر جا رہے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ خیر اُس نے ان دونوں کے نام پتے
لکھ کر انہیں جانے دیا......"

"نام پتے لکھ لیے...... That's bad......" ایم۔ڈی۔ کہتا ہے۔

"میرا خیال ہے سر کہ...... اُس کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ وہاں سے نکل تو
بلکہ نکال تو لایا...... ظہیر کو بھی......" ڈی۔ایم۔ڈی۔ کہتا ہے۔

"یس۔...... یس...... یس...... یو آر رائٹ...... دیکھیں گے...... او مائی گاڈ...... تو
یہ نکل آئے وہاں سے تھانے سے؟"

"جی سر...... اور اگرچہ یہ ہم سے متعلق بات نہیں تھی ایک طرح سے۔ ڈرائیور اور
ظہیر ابھی وہیں تھے کہ سپاہی فلم والوں کو بھی لے آیا۔ اور جو ہم نور خان کے Expression
سے سمجھے ہیں ان سب کے ساتھ بھی رانے کا رویہ رات سے بہت مختلف تھا۔ اُس نے انہیں
کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔ لیکن وہ بیٹھے نہیں۔ لیکن انہوں نے کسی قسم کا کوئی ری ایکشن بھی ظاہر نہ
کیا۔ تھانیدار نے پھر ان دونوں کو کہا کہ وہ جا سکتے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ انہیں حوالدار غیاث
پر حملے کے کیس میں بھی گواہی کے لیے طلب کیا جائے، نور خان کہتا ہے کہ تھانے دار کے
کمرے سے نکلتے وقت۔ اُس کے کانوں میں تھوڑی اور گفتگو بھی پڑی۔ کسی فلم والے نے کہا
کہ وہ فون کرنا چاہتے ہیں۔ رانے نے کہا کہ فون کی ضرورت نہیں وہ بھی جا سکتے ہیں......"

"کچھ ایسا ہی بتا رہا تھا سر......؟" ڈاکٹر ڈی۔ایم۔ڈی کی طرف سوالیہ نظروں سے
پوچھتا ہے۔ ڈی۔ایم۔ڈی لاتعلق سے انداز میں کندھے اُچکاتا ہے۔

"ہاں۔ شاید...... تھانے دار اُن لوگوں سے جو بات کر رہا تھا لیکن ان کا معاملہ تو
ختم ہو گیا۔"

"جی...... Exactly۔ لیکن وہ لنگڑا جوان کا ساتھی تھا اُس کے بارے میں تھانیدار

نے اُنہیں بتایا...... اقبال احمد۔ بالی جو تمہارا ساتھی ہے۔ اُس نے حوالدار غیاث...... کا پھاڑا ہے اس کو ٹانکے لگے ہیں اور اس کے کان کا پردہ بھی پھٹ گیا ہے...... یہ serious ہے۔ ڈاکٹر مجھے بتا رہا تھا۔ باقی آپ جو حکم کریں......

نور خان کہتا ہے کہ یہ آخری الفاظ تھے جو اُس نے سنے اور وہ حسن رضا ظہیر صاحب کو لے کر باہر آ گیا۔"

"او گاڈ۔ او گاڈ...... وہ...... بہرحال That is none of our business۔ لیکن اکاؤنٹنٹ کہاں گیا؟" ایم ڈی کہتا ہے۔

"اب نور خان کہتا ہے سر کہ اُسے فوری طور پر دو کام کرنے تھے ایک تو کیش والا بریف کیس قابو کرنا تھا۔ اور پھر گاڑی تک پہنچنا تھا۔ ظہیر ساتھ تھا لیکن بالکل گم سم کسی بات کا جواب نہ تھا نہ خود کوئی بات کرتا تھا۔ تھانے کے باہر یہ لوگ سڑک پر آئے۔ تھانہ قصبے کے مضافات میں تھا۔ اکا دکا دکانیں تھیں اور ارد گرد وہی سورج مکھی کے کھیت۔ پتہ چلا کہ میلہ وہاں سے پانچ میل دور ہے اور ایک مقامی ویگن پر جانا ہوگا۔ اور وہی ویگن اُسے بعد میں میلے کے قریب سے گزار کر اُس دوسری سڑک پر بھی لے جا سکتی ہے۔ جہاں اُس نے ایک روز پہلے گاڑی کھڑی کی تھی۔ یہ فیصلہ کر کے وہ اس پر عمل کرنے کو تھا کہ بے چارے پر ایک اور افتاد آ پڑی۔"

"Oh Really...... کیا ہوا۔ میں حیران ہوں یہ حسن کہاں غائب ہو گیا۔ یہ لوگ اس Bloody پولیس اسٹیشن سے بھی نکل آئے۔"

"جی سر اب ہم اس کی گمشدگی کے واقعے تک ہی پہنچنے والے ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ رات بھر یہ لوگ حوالات میں بند رہے اور انہوں نے ان لوگوں کو کسی لیٹرین وغیرہ میں بھی جانے نہیں دیا تھا۔ کھیت دیکھ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ فراغت حاصل کرے۔ یہاں اس کا بیان ہے سر......" ڈاکٹر مسکراتا ہے اور خفیف سی مسکراہٹ ڈی۔ ایم۔ ڈی کے چہرے پر بھی آتی ہے۔

"I can imagine......" ایم ڈی کہتا ہے۔

"اب مسئلہ یہ تھا کہ ظہیر صاحب کا کیا کرے۔ کہتا ہے کہ اُس نے اکاؤنٹنٹ صاحب کو بار بار تاکید کر کے ایک درخت کے نیچے بٹھایا اور منت کی کہ ادھر سے ہلنا نہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ ظہیر نے اقرار میں سر ہلایا بھی۔ یہ بے چارہ گیا۔ کہتا ہے کوئی دس منٹ بعد واپس آیا تو ظہیر صاحب غائب......"

"او مائی گاڈ۔ او مائی گاڈ......"

ظاہر ہے جس شاک کی کیفیت سے وہ گزرا ہوگا۔ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتا پھرا اور پوچھتا پھرا۔ آخر ایک ٹائر پنکچر والے نے بتایا کہ سڑک پر سے آدھ گھنٹہ پہلے ایک بڑی پک اپ وین اُس کے پاس آ کر رکی تھی۔ پنکچر لگوانے۔ وین میں پیچھے بڑے بڑے شیشے لدے تھے۔"

"شیشے؟"

"میرا خیال ہے آئینے mirrors ہوں گے سر...... اور وہ اس کے پاس ہی کام کروا کے پانچ منٹ پہلے نکلی ہے۔ اور اُس درخت کے سامنے سے گزری ہے۔ جدھر تم کہتے ہو تمہارا بندہ کھڑا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اُس پک اپ میں بیٹھ گیا ہو۔ نور خان نے اُس سے پوچھا کہ وہ سڑک آگے کدھر جاتی ہے۔ پتہ چلا کہ سیدھی تو اونچے پہاڑی علاقے کو جاتی ہے لیکن آگے دو میل بعد دو اور سڑکیں دائیں بائیں نکلتی ہیں۔ اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتے کہ وہ پک اپ کدھر گئی ہوگی۔ یہاں پر نور خان کہتا ہے کہ اک دم اس کا دل ٹھہر گیا اور اُس نے سوچا کہ یہ خدائی معاملہ ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتا سوائے اس کے جو اُس کے بس میں ہے۔ وہ میلے میں آیا اُس جگہ جہاں اُس نے بریف کیس چھپایا تھا۔ اور ارد گرد دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تھیٹر راتوں رات غائب ہو چکا تھا۔ اس نے ایسے ہی کسی سے تجسس سے پوچھا، پتہ چلا کہ وہ لوگ رات کے پچھلے پہر تھانے سے واپس آ گئے تھے اور دو گھنٹوں میں سب کچھ اپنے دو ٹرکوں میں لاد کر نکل گئے۔ دن کی روشنی میں مٹھائی والے کی دوکان کے نیچے گھس کر بریف کیس نکالنا مشکل تھا لیکن خیر یہ کامیاب ہو گیا۔ سب کچھ محفوظ تھا......"

"Really...... چیک کیا گیا...... سب کیش......" ایم۔ ڈی تینوں افراد کے سامنے سوالیہ انداز میں کہتا ہے پر سائل انتہائی ذمہ دارانہ سرگوشی میں جواب دیتا ہے۔

"یس سر۔ سیکشن نے مکمل چیک کیا ہے۔ ریکارڈ کے مطابق۔ بہت معمولی فرق ہے سر۔"

"I see۔"

"وہی سر...... جو حسن نے ادھر تھیٹر میں...... دیا آرٹسٹ کو......"

"ایک بات بتائیں ڈاکٹر...... And I must tell you, you are a wonderful narrator۔"

"تھینک یو سر...... لیکن نور خان سے بہتر نہیں......"

سب ہنستے ہیں۔

"میں پوچھنا چاہتا ہوں یہ جو پیسے اُس نے دیے آپ کہہ رہے تھے ویلیں...... دوسرے لوگ دے رہے تھے۔ ایکٹرس کو...... یہ ادھر کے تھیٹر میں لازمی ہوتا ہے؟ تجسّس کے علاوہ...... بس اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں......"

ڈی۔ایم۔ڈی جو ڈاکٹر کی تعریف پر کچھ بجھ سا گیا تھا، اک دم اپنی معلومات کے اظہار کا موقع دیکھتا ہے۔

"یہ۔یہ۔ اصل میں سر...... لوگ اپنی خوشی...... آئی مین......"

ڈاکٹر پھر بات درمیان میں سے پکڑ لیتا ہے۔

"یہ سر۔ ہمارے کلچر میں ایک طریقہ ہے۔ اپنی ذاتی...... appreciation ظاہر کرنے کا...... لیکن میں سمجھتا ہوں...... It is just fun...... آگے سر......" ڈاکٹر کا لہجہ بتاتا ہے کہ وہ اب اس روداد کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

"Please۔"

"نور خان آخر گاڑی تک پہنچ گیا جو خدا کا شکر ہے محفوظ تھی۔ وہاں سے وہ سیدھا آئل مل پہنچا۔ ان لوگوں نے اُس کا رابطہ ہمارے ہیڈ کوارٹر سے کروایا۔ وہاں پہلے ہی ان دونوں کی گمشدگی پر کافی تشویش تھی۔ اُسے ڈولو مائیٹ سائیٹس پہنچنے کی بجائے فوراً واپس فیکٹری رپورٹ کرنے کو کہا گیا۔ اور یہ کل صبح یہاں آ گیا۔"

ایم۔ڈی۔ میز پر ہاتھ مارتا ہے۔ "لیکن وہ...... گم ہے ابھی۔ He is still missing...... یہ اکاؤنٹنٹ...... still missing...... میرا خیال ہے ہمیں کسی بھی ایمرجنسی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"اُس کے گھر پوچھا گیا تھا......؟"

"جی سر...... چیک کیا گیا۔ کئی بار...... پھر انہوں نے ریسیور ہی اُٹھا دیا......"

"نان سینس...... لیکن کہاں ہے...... یہ شخص...... حسن...... حسن کہاں ہے؟"

یہ کامل حیرت کا دورانیہ ہے جو اصل میں ایک ہی لمحہ ہے۔ یہ لامتناہی سراب ہے اور حسن اس میں — نہیں ہے۔ بار بار نہیں ہے۔ گہرے سناٹے میں پہاڑی چشموں سے آتے پانی کی کومل سطحیں سہ پہر کے نیلے آسمان سے اترتی سورج کی شعاعوں کو عکس کے خدائی آئینوں کی جانب پھینکنے کی طفلانہ شرارت کرتی ہیں اور پھر ہوا کا جھونکا دیوار کے درخت کی ایک شاخ کو لہرا دیتا ہے تو آمنے سامنے آئینوں میں شعاعیں کوندتی ہیں اور گہری سبز شاخ ان گنت ہو کر لامتناہی فاصلے تک لہرا جاتی ہے۔ آئینوں کی تینوں دیواروں کے اندر آ جانے والا کوئی بھی وجود لاوقت میں ان گنت ہو کر لاانتہا تک پھیل جاتا ہے۔ عکس در عکس در عکس در عکس۔ اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن دیکھتا ہے...... اور حسن حسن کو دیکھتا عکس در عکس آئینوں کی سرنگ میں دور سے دور ہٹتا۔ معدوم سے معدوم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لاانتہا کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔ اور حسن کی گمشدگی کے اُن تین دنوں میں یہ تیسرا دن ہے۔

ایم۔ڈی کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلتا ہے۔ ایک اٹینڈنٹ اندر داخل ہو کر مؤدبانہ خاموشی سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈی۔ایم۔ڈی سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔

"اکاؤنٹنٹ صاحب آ گئے ہیں سر......" وہ کہتا ہے۔

"What?" ایم۔ڈی اضطراری انداز میں کہتا ہے اور سب اپنی سیٹوں میں تھوڑا اوپر کو اٹھ جاتے ہیں۔

....

"جی ڈاکٹر صاحب میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں اپنی دوا گھر بھول گیا تھا۔ اس دیہاتی دکان سے دوائی خریدنی پڑی۔"

"وہی جو آپ کو نسخے میں دی گئی تھی؟"

"جی۔ وہی......"

"وہ...... باقی ہے...... آپ کے پاس؟"

"نہیں وہ میں نے سب کھالی تھی۔"

"سب۔ اوہ......"

"اس پر بھی مجھے...... اس دوسرے شخص نے مجبور کیا...... بلکہ اُسی نے کھائی۔"

"دوسرا شخص۔ پلیز ذرا وضاحت کریں......"

"وضاحت نہیں ہو سکتی...... مشکل ہے...... ناممکن ہے...... مجھے لگتا تھا ایک تو میں ہوں لیکن میرے ساتھ ایک اور شخص ہے۔ وہ بھی میں ہی ہوں...... اور وہ بہت کچھ کرتا پھرتا ہے۔ لیکن میں اُسے روک نہیں سکتا......"

"کیا کرتا پھرتا ہے؟"

"بس...... خواب جیسا ہے۔ مگر خواب جیسا بھی نہیں ہے...... یاد آتا ہے لیکن پھر یاد نہیں آتا۔ بس...... سب کچھ تو جیسے سورج مکھی کے اندر ہے...... میرے سامنے میں ہوں۔ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ آئینے میں آئینہ۔"

"آپ کی طبیعت اب تو ٹھیک ہے نا...... آپ کی...... ظہیر صاحب۔"

"جی۔ بالکل...... نور خان نے مجھے بتایا...... کچھ کیش missing ہے۔ کہتا ہے میں نے خرچ کیا...... کیسے...... جو وہ بتاتا ہے...... مجھے کچھ علم نہیں...... مگر شاید ایک بونا ناچ رہا تھا۔ اور وہ عورت...... اور وہ...... سورج مکھی کے کھیت میں...... تھے...... یا شاید آئینوں میں آمنے سامنے۔ مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔"

ڈاکٹر حسن کی طرف غور سے دیکھتا ہے جو بظاہر پھر کہیں گم ہے۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ہے۔

"چلیں وہ تو جو اُس کیفیت میں ہوا ظاہر ہے۔ اُس کا amnesia ہو سکتا ہے۔ یادداشت مدد نہیں کرے گی۔ لیکن پھر تھانے سے نکلنے کے بعد کہاں گئے آپ؟ آپ کو پہلی دفعہ کب ہوش آیا...... مطلب ہے اسے یوں لیں کہ...... پہلی دفعہ کب آپ کو لگا کہ وہ دوسرا شخص جا چکا ہے۔؟"

"ایکسیڈنٹ سے پہلے......"

"ایکسیڈنٹ؟"

"جی......"

"کیسے...... کیسے۔ کہاں۔ کدھر......؟"

حسن گہری اُداسی سے مسکراتا ہے۔ "دراصل بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب...... میں...... میں دیکھتا ہوں......"

"دیکھتے ہیں......" ڈاکٹر مشکوک انداز میں حسن کی طرف دیکھتا ہے۔ "میرا خیال ہے آپ کی طبیعت اب...... ابھی۔"

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں...... میں ساری عمر دیکھتا رہا ہوں...... میں وہاں کھڑا تھا۔ پتہ نہیں کیا جگہ تھی۔ میں وہاں کیوں تھا کہ وہ کھلی بڑی پک آپ آئی۔ جس میں بڑے بڑے آئینے آمنے سامنے پڑے تھے۔ تینوں طرف۔ اور درمیان میں وہ بیٹھا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ شخص آئینوں میں آمنے سامنے ویسے ہی درجنوں شاید سینکڑوں۔ شاید ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں......"

"جی۔ جی۔ جی......" ڈاکٹر کاغذ پر کچھ نوٹ کرتا ہے...... Optical hallucination۔

"میں دیکھتا ہوں...... میں قریب ہو گیا بالکل اس پک اپ کے پیچھے...... وہ بندہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ وہ چھتر پہاڑی جا رہے ہیں۔ چلنا ہے؟ دس روپے۔ میں نے شاید سر ہلایا ہوگا۔ ایسے ہی اُس نے کھینچ کر بٹھا لیا۔ پھر شاید میں سو گیا۔ پھر ایک دھماکے جیسی آواز سے آنکھ کھلی۔ ڈرائیور کنڈیکٹر آپس میں لڑ رہے تھے۔ میں اُترا۔ اُس نے کہا جاؤ۔ بھائی۔ ہمارا ٹائی راڈ کھل گیا ہے۔ چٹان سے ٹکرا گئے ورنہ گئے تھے سب۔ اب ہم سارا سامان ادھر ہی اتاریں گے...... اور کوئی دوسری گاڑی لائیں گے۔ مکینک ساتھ لائیں گے۔ تم نے چھتر جانا ہے۔ تو ادھر کھڑے ہو جاؤ...... بس آ جائے گی۔"

"یہ جگہ کا نام پھر بتائیں...... چھتر......" ڈاکٹر لکھتا ہے۔

"چھتر پہاڑی ہے۔ پھر۔ وہ بڑے بڑے آئینے اتار کر قریب ہی درختوں اور چٹانوں میں کھڑے کرنے لگے۔ بہت سارے آئینے ٹوٹ چکے تھے۔ چٹانیں، آئینے، آمنے

سامنے رکھتے تھے، آئینے کے سامنے آئینے، خالی کے سامنے خالی۔ درمیان میں جو آیا وہی بھر گیا۔ میں بھر گیا۔"

حسن ہنستا ہے۔ ڈاکٹر گہری سانس لیتا ہے۔

"میں آپ کے لیے تین دن کا ریسٹ لکھ رہا ہوں۔ حسن رضا ظہیر صاحب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شکر کریں۔ آپ کو Benzo poisining بھی ہو سکتی تھی۔"

ڈاکٹر اُٹھ کر جانے لگتا ہے۔ حسن اک دم بے چین ہو کر پوچھتا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب وہ ڈولومائیٹ سائیٹ کی رپورٹ آ گئی ہے؟"

"آ۔ I don't know سر...... میرا شعبہ نہیں وہ بتا دیں گے آپ کو۔"

ڈاکٹر پھر جانے لگتا ہے۔ حسن تیزی سے اپنی جیب میں سے کچھ نکالتا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب......" ڈاکٹر مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ حسن تاش کے پتوں کی جسامت کے دو آئینوں کے ٹکڑے اُسے دکھاتا ہے۔ مسکراتا ہے۔ ڈاکٹر حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔"Oh I see ...... یہ وہاں سے Mirrors...... تو کیا واقعی...... وہ Hallucination نہیں تھی......؟" ڈاکٹر ہارون پاشا دھیمے لہجے میں گویا اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

حسن دونوں آئینوں کے ٹکڑوں کو آمنے سامنے کرتا ہے......

"میں۔ دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب......"

ڈاکٹر آنکھیں سکیڑتا ہے اور کندھے اچکا کر جاتا ہے۔

....

(17)

سوانگ پروڈکشنز لکی سٹار تھیٹر میں

پہلے پونے تین دن بذریعہ سیفی گھسیٹا کاری اور انیلا نوٹس / سین / پوائنٹس

(سیفی)۔ سب سے بڑا سوال کم از کم میرے لیے اب یہ بنتا جا رہا ہے کہ ہم کوئی سریلسٹ ڈاکیومینٹری بنا رہے ہیں یا سریلسٹ فیچر فلم۔ اول الذکر تو ویسے ہی ناممکن ہے شاید کیونکہ ڈاکیومنٹری کسی حقیقی صورت حال کو حقیقی ہی رہنے دیتی ہے بلکہ اس پر فخر کرتی ہے جبکہ ہم حقیقت کا کچومر بنا کر ناظر کے سامنے رکھیں گے اور توقع کریں گے کہ وہ کچومر بنانے کی حرکت کے پیچھے چھپی کسی بڑی حقیقت کو سمجھ جائے۔ چیف کہتا ہے ایسی کوئی توقع ضروری نہیں اور پھر وہ اپنے گرو پروفیسر جولیس کے حوالے دیتا ہے۔ انیلا کہتی ہے یہ ساری بحث ہی غیر متعلق ہے۔ بس فلم بنی چاہیے۔ ناظر کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی فلم کے واقعات اور کرداروں کو حقیقی زندگی سے اخذ کیا گیا ہے یا وہ محض تخیل کی پیداوار ہیں اور اُدھر بہزاد صاحب انتظار کر رہے ہیں کہ کب ہم یہاں Reckie سے فارغ ہو کر واپس پہنچتے ہیں۔ اور ایک بھرپور میٹنگ ہوتی ہے۔

یقیناً ناظر کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ لکی سٹار تھیٹر کی سسی اصل نام انیلا ہماری سکرپٹ رائٹر انیلا بلال پر مرمٹی ہے۔ اور اکثر اُس سے بغل گیر ہو کر اُس کے گال چومنے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور کہتی ہے "نیلی باجی تم مجھے بڑی پیاری لگتی ہو۔" اکثر مرد ایکٹرسوں سے لمبی ترنگی گوری چٹی بلی جیسی آنکھوں والی فرخندہ بلی جو ہیر بنتی ہے۔ کچے رنگ مگر تیکھے نقوش اور چمکیلی آنکھوں والی چنو دلاری جو لیلیٰ ہے اور پھارے کی گھوڑی بے بی کنارہ جو

اپنے جسمانی ابھاروں کی وجہ سے قیامت سمجھی جاتی ہے یہ سب بھی انیلا پر فریفتہ ہیں۔ انیلا حیرانی سے کہتی ہے ایسی گہری عورت کی عورت سے دوستی والی عورتیں اس نے آج تک نہیں دیکھیں۔ ان کے جسم سے اٹھتی گرمی اُن کی استعمال کی خوشبو کا حصہ لگتی ہے اور سانس کے ذریعے تمہارے اندر اتر جاتی ہے۔ اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ میری بچپن کی سہیلیاں ہیں جبکہ کوئی سہیلی نہ تھی اور ابھی دو دن ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ انیلا کا یہ احساس بہت عجیب ہے۔ میں نہیں کہوں گا کہ اُس کے اس احساس میں کوئی ہم جنسیت ہے۔ کیونکہ ایکٹر کمال (مجھے خدا یہ ہم نامی ایک آسیب کی طرح ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے) سے کی کا عشق لکی سٹار تھیٹرز کے سٹارز میں ایک محبت بھرا مذاق ہے۔ جو چلتا رہتا ہے۔ اور بوٹا پیارا تو سسی کے قریب سے گزرتے ہوئے 'اساں جھوک چنن دی جاناں' ضرور گنگناتا ہے۔ یوں بونے کا اپنی گھوڑی بے بی کنار سے عشق تو سب سے بڑا پر لطف موضوع ہے۔ جو یہاں ان لوگوں میں چلتا ہے۔ ان دونوں کا وہ آئٹم ٹانگہ لاہوری میرا...... میرا خیال ہے۔ بہت ہی Erotic ہے لیکن پھر بھی vulgar نہیں۔ اور یہی بات دلچسپ ہے۔

ان لوگوں نے ہمارے ٹینٹ، تھیٹر کے بڑے احاطے میں ہی اپنے ٹینٹوں سے کچھ فاصلے پر لگوا دیے۔ ایک میں، میں انیلا اور چیف ہیں اور دوسرے میں جبار، ماسٹر یاسین اور بالی۔ تھیٹر کے یہ لوگ ہمارے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ ایسے جیسے وہ ہمارے...... ہمارے کے۔ غریب رشتے دار ہوں۔ فلم کے بارے میں ان کے رویے ملے جلے ہیں۔

لیکن جب بونے نے انہیں یقین دلایا کہ ہم وہ اصل بڑا دھندا کرنے والے فلمی لوگ نہیں ہیں تو وہ یک دم ہمارے، بہت زیادہ دوست بن گئے ہیں اور ہمیں اپنی طرح کی حد تک 'نکالے ہوئے' 'بٹے ہوئے' لوگ سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن ہیر، سوہنی، سسی، صاحباں لیلی اور بے بی کنار کے ساتھ انیلا مزے میں ہے۔ وہ سب بھی سگریٹ پینے والیاں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس ایک بات نے بھی ان کے درمیان کوئی فاصلہ اگر تھا تو وہ یک دم ختم کر دیا۔ انیلا سسی تو چرس بھی پیتی ہے اور انیلا نے ایک بار اُس کی سُوٹے کی پیشکش قبول بھی کر لی۔ اور پھر سسی، ہیر اور سوہنی نے اُسے کئی مزے کے واقعات سنائے۔ سسی پنوں کے سٹیج پر لگے دریا کے پردے کے پیچھے نومولود سسی ایک ٹوکری میں ڈال کر "بہائی" جاتی ہے۔ راجا نجومی کی پیش گوئی

برداشت نہیں کر پاتا کہ اس کی بیٹی جوان ہو کر اُس کی عزت کو بٹہ لگائے گی۔ دریا کی لہروں کا پردہ سٹیج کے آخر میں ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلا دیا جاتا ہے۔ اور ٹوکری کو ہچکولے کھاتے پانی میں بہتا دکھانے کے لیے پیارا بونا ٹوکری کو سر پر اٹھائے پردے کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتا ہے اور اس میں کئی بار بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ اونچی نیچی زمین کی وجہ سے کبھی تو بونے کا سر ٹوکری سمیت باہر نکل آتا ہے اور کبھی ٹوکری ہی سرے سے غائب ہو جاتی ہے اور عطا دھوبی جس نے ٹوکری اٹھائی ہوتی ہے اور سسی کا باپ بنا ہوتا ہے، منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ایک بار پیارا پھسل کر گر پڑا۔ ایسے موقعوں پر تماشائی تھیٹر کے اصل کام سے زیادہ خوش ہوتے ہیں اور خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ ایک بار سلطانہ ڈاکو اور کیپٹن ینگ میں زبردست مکالمہ چل رہا ہوتا ہے کہ اچانک انگریز پولیس والا خاموش ہو جاتا ہے اور ونگ میں کاغذ لیے بیٹھے ہر فن مولا ماسٹر یاسین (میں نہیں سمجھتا کہ ہمارا پیچھا کرنے والی ہم نامی محض اتفاق ہے۔ اور اگر اتفاق نہیں تو پھر کیا ہے) کے prompt کرنے اور سلطانہ ڈاکو کے کھانسنے اور گھورنے کے باوجود خاموش رہتا ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے کہ سلطانہ ڈاکو اور کیپٹن ینگ دونوں سٹیج پر بھاگنے دوڑنے اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ تماشائی قہقہے لگاتے ہیں پتہ چلتا ہے کہ اسٹیج پر سانپ چڑھ آیا ہے۔ سانپوں کا علاقہ ہے۔ پھر دونوں ایکٹروں میں سے کوئی کیپٹن ینگ کے بید کی چھڑی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔ پھر مدتوں یہ بحث چلتی ہے کہ سانپ کو سلطانہ ڈاکو نے مارا تھا یا کیپٹن ینگ نے۔ اس طرح کے Off stage واقعات ہمارے لیے بہت کام کے ہو سکتے ہیں۔ آخر کباڑ کمپلیکس اور میلہ بھاگاں والا اور خاص طور پر لکی سٹار تھیٹر کے درمیان کوئی تسلسل تو ہونا چاہیے۔ انیلا سے ڈسکس ہوگا۔ اگر انیلا نے انیلا کی جان چھوڑ دی۔

(انیلا بلال)

- سکرین پلے کے بھاگاں والا (میلہ) تک تسلسل میں اس کی کباڑ کمپلیکس تھیمز کا تسلسل برقرار رکھنا ہوگا۔
- خاص طور پر جان کو جو کچھ ہم اب تک کباڑ کمپلیکس میں دکھا چکے ہیں اور اس کا جو تاثر اُس کے ذہن پر قائم ہوا ہے۔ میلہ اب اس تاثر سے آگے کی چیز ہے۔ ایک طرح

سے یہ اس کا Cultural counterpart ہے؟؟؟؟

- o جان تم پوچھ سکتے ہو کہ ہم آخر تمہیں یہاں کیوں لائے ہیں۔ کباڑ کمپلیکس کے اس میلے میں آخر کیوں؟ دراصل یہ میلہ بھی ہمارے کمپلیکس کا ایک حصہ ہی ہے۔ یہ کباڑ کمپلیکس کا کلچرل ونگ ہے (یہ بہت Loud ہو جائے گا شاید۔ سرئیلزم؟؟؟ اتنا واضح نہیں؟؟)
- o ارشاد کباڑیے کی شیکسپیئر پر Expertise بلاوجہ نہیں ہے۔ وہ دراصل یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے...... کہ کیا ظاہر کرنا چاہتا ہے؟؟؟؟
- o جبار جمع کرنے والے کے جمع کرنے، ریکارڈ قائم کرنے کے جنون کی تھیم بہر حال ایک بنیادی motif ہے اور جو میلے میں برقرار رہنی چاہیے۔

سین ۔ مڈ شاٹ ۔ جان ۔ جبار ۔ سیفی اور بونا مٹھائیوں کی دوکان کے سامنے کھڑے ہیں ۔ جان حیرت سے ایک بہت بڑے تھال میں پڑے قتلموں کی طرف دیکھ رہا ہے۔

(لانگ شاٹ Pan) میلے کی سرگرمیاں ۔ لوگوں کے ہجوم ۔ آتے جاتے ۔ بہت خوش ہیں ۔ مزے میں ہیں ۔ تربوز کھا رہے ہیں ۔ جلیبیاں کھا رہے ہیں zoom in zoom out موت کا کنواں ۔ لکی سٹار تھیٹر کا Banner ۔ Zoom in ہیر رانجھا ۔ سسی پنوں ۔ سوہنی مہینوال ۔ لیلیٰ مجنوں ۔ شیریں فرہاد ۔ مرزا صاحباں ۔ سلطانہ ڈاکو ۔ یہودی کی لڑکی ۔ کیمرہ ہر پوسٹر پر stay کرتا ہے ۔ zoom in ...... Pan ...... اور پھر zoom in ...... دنیا کے عجوبے کے بینرز سامنے آتے ہیں۔

آڈیو ۔ لاؤڈ سپیکر ۔ آیئے مہربان ۔ دیکھیے مہربان ۔ دو سروں والا کھوتا دیکھو ۔ مرغی عورت دیکھو ۔ جل پری دیکھو ۔ سر عورت کا دھڑ مچھلی کا ۔ سینڈو ماسٹر سہراب شیشہ کوٹ کر کھائے گا اور دو من کا وٹہ دانتوں سے اٹھائے گا ۔ بارہ کلو کا چقندر دیکھو ۔ تیرہ فٹ کا سانپ دیکھو ۔ دیکھو ۔ دیکھو ۔ بار بار دیکھو ۔ میڈم پونم پٹرول پیے گی ۔ آگ کا کھیل دکھائے گی ۔ جان پر کھیل جائے گی ۔ پر پھر واپس آئے گی ۔ کس لیے میری جان ۔ اس پاپی پیٹ کی خاطر مہربان ۔ ٹکٹیں کم ہیں میری جان ۔ دو روپے ۔ دو روپے ۔ دو روپے ۔ دو روپے ......

کٹ

مڈ شاٹ ۔ مٹھائیوں کی دوکان ۔

جبار: "جان میرا Claim یہ ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی روٹی ہے۔ اس میں ایک دو سال کے بچے کو آسانی سے باندھا جا سکتا ہے۔ اور یہ بڑے انسانوں کے سر اور کندھوں کو مکمل ڈھانپ سکتی ہے۔ اسے بطور شال استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

جان: "یہ حیرت انگیز ہے اور کیا تم اسے کبھی بطور خوراک بھی استعمال کر لیتے ہو؟"

کلوز شاٹ ۔ سیفی تیزی سے تصویریں بنا رہا ہے۔

کٹ

کلوز شاٹ ۔

بونا ایک قتلمہ توڑتا ہے اور کھاتا ہے۔ پھر جان کو دکھاتا ہے۔

پیارا: "مسٹر جان ۔ یہ دیکھو ...... میں کھا رہا ہوں ...... تم بھی ۔ ٹرائی کرو۔"

پیارا ایک لقمہ جان کی طرف بڑھاتا ہے ۔ جان کچھ ہچکچاتا ہے لیکن پھر لقمہ لیتا ہے۔

جان: "یہ اتنا سرخ کیوں ہے؟" لقمہ منہ میں ڈال لیتا ہے اور چباتا ہے۔

سیفی: (طنزیہ انداز میں جان کی طرف دیکھتے ہوئے) "ہاں کیسا رہا......"

جان: "یہ مختلف ہے میں کم از کم اتنا ضرور کہوں گا ۔ سپائیسی ہے ۔ یہ واضح ہے ...... اور میں یہ بھی کہوں گا کہ یہ انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔"

سیفی: (قہقہہ لگاتا ہے) "ہاں کہ آخر یہ ہے کیا ...... لیکن کم از کم اس کے سرخ رنگ کے بارے میں جان میں تمہیں بتا سکتا ہوں......"

جان: (اشتیاق سے اور بھی تیزی سے منہ چلاتے ہوئے) "کیا واقعی ......؟"

سیفی: "ہاں اس کا سرخ رنگ ۔ جو تم دیکھ رہے ہو، خون کا ہے ...... اسے ہمارے ہاں صدیوں سے ظلم کی ہر شکل، خاندانی، تہذیبی، مذہبی اور سامراجی کے خلاف جدوجہد میں جان دینے والوں کے خون سے بنایا گیا ہے ۔ یعنی جان دینے کی وہ صورتیں جن میں خون خارج ہوتا ہے ۔ مثلاً......" جان کا منہ بگڑ جاتا ہے ۔ جیسے ابکائی آ رہی ہو۔

جان: "بند کرو...... پلیز......"

کٹ

Big Close شاٹ۔ تھال میں پڑے لچھے۔

نو شاٹ۔ سیفی قہقہہ لگاتا ہے۔ جان منہ کے سامنے ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔

سیفی: "ہولڈ اٹ جان — ہولڈ اٹ — فکر نہ کرو — ایسا کوئی ایک بھی ... بھانے والا ہمارے ہاں کبھی رہا ہی نہیں۔ ہماری تہذیب۔ اس کی اجازت ہی نہیں دیتی —"

جان: "آو — تہذیبی خرد افروزی —" "مجھے پروفیسر صفدر سلطان یاد آرہا ہے۔"

سیفی: "جبار صاحب آپ پروفیسر صاحب کو ساتھ کیوں نہیں لائے — یہاں ان کی تہذیبی دلچسپی کی کافی چیزیں تھیں — مگر شاید وہ میلہ بھاگاں والا کو اپنی خرد افروزی کا حصہ نہیں سمجھتے —"

جبار اچانک ایک جلیبی اٹھاتا ہے اور جان کے ہاتھ میں زبردستی تھما دیتا ہے۔

جان: "او مائی گاڈ — یہ جلیبی ہے — یہ کیا ہے — کیا یہ دنیا کی سب سے بڑی جلیبی ... ہے۔"

جبار: "دنیا کی سب سے زیادہ ٹیڑھی میڑھی مٹھائی پر غور کرو۔ اتنے میں، میں سیفی کی بات کا جواب دوں گا — ہاں — سیفی صاحب میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا تو لیکن وہ اللہ دین کے چراغوں کی رگڑ سے جناتی بجلی پیدا کرنے کی سائنس میں انتہائی مگن ہیں۔ آخری ڈنڈے کو۔ ہاتھی دانت کے ڈنڈے اور شیشم کی لکڑی سے بدل بدل کر تجربات کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں تجربات سائنس کی اساس ہیں۔"

سیفی: "اساس۔"

(جان یک دم شور مچا دیتا ہے۔)

جان: "نہیں۔ نہیں — پروفیسر ایسا نہیں کر سکتا۔ گینز بک اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آخری ڈنڈا ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ اگر پروفیسر کچھ بدلتا ہے۔ تو یہ کوئی نیا ریکارڈ ہوگا — یہ کوئی مذاق نہیں۔"

سیفی: "ہاں یہ کوئی مذاق نہیں۔ ویسے جان تم شوق سے لچھے کھاؤ۔ اس کا سرخ رنگ خون سے نہیں بلکہ قدرتی لال رنگ سے بنایا گیا ہے۔ خون کو بھول جاؤ۔" جان ...

سے کھانے لگتا ہے۔

جان: "لیکن میں کہوں گا کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی روٹی — ٹھیک — ہے نا۔ یہ مانتے ہیں — اس کا آفٹر ٹیسٹ اس کے ٹیسٹ سے بہتر ہے۔"

جبار: "یہ بھی ایک ریکارڈ ہو سکتا ہے روٹی جس کا آفٹر ٹیسٹ اس کے ٹیسٹ سے بہتر ہے۔"

جان: "دیکھتے ہیں لیکن پہلے اس کے سائز کو ماپیں گے۔ کوئی ریکارڈ بنتا ہے تو —"

سیفی: "ویسے جان۔ یہ ذہن میں رکھنا مراکش اور افغانستان کی روٹیاں بھی مقابلے پر ہوں گی۔"

جان کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نظر آتے ہیں۔

جان: "یہ شخص بار بار مجھے confuse کر رہا ہے۔ خاص طور پر ادھر میلے میں آ کر۔ ادھر پروفیسر اس کو کافی چیک رکھتا تھا، اگرچہ یہ پروفیسر کو بھی اشتعال دلاتا رہتا تھا۔ لیکن کیا اب میں اس کی statements کو گینز کمپلیکس کی آفیشل statements سمجھوں؟"

جبار: "ہرگز نہیں۔ گینز کمپلیکس کی آفیشل statements صرف ارشاد بھائی جاری کر سکتے ہیں۔ ابھی یہاں میلہ بھاگاں والا میں ہم صرف ریکارڈز کے claim درج کروا رہے ہیں جان۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی روٹی۔ سب سے ٹیڑھی میڑھی مٹھائی اور پھر پیارے نے جو لسٹ ساڑھے سات سو بوٹوں کی قسمیں جمع کرائی ہے۔"

جان: (قہقہے لگاتا ہے) "ہا۔ ہا۔ ہا۔ میں کہتا ہوں وہاں تمہارے پاس کچھ ہے۔ ویل ان پیار آیا۔ ساڑھے سات سو بوٹے مرد ہو گئیں۔ لیکن تم انہیں اکٹھے کیسے کرو گے۔ کیا اسی طرح اس carnival میں —؟"

سیفی: "یہ carnival نہیں ہے مسٹر جان۔ Carnival ہمارے ہاں نہیں ہوتے یہ کچھ اور ہے — تم خود confuse ہو رہے ہو — گینز بک کے سربراہ سے ہم بہت بڑی توقعات رکھتے ہیں۔ ہی۔ ہی۔"

جان: "یہ شخص مجھے پریشان کر رہا ہے۔ او گاڈ یہ شخص مجھے پریشان کر رہا ہے —"

جبار: "جان تم اس شخص کو نظر انداز کرو۔ اس کی باتوں اور حرکتوں کی کوئی اہمیت نہیں

سب فیصلے وہیں واپس کباڑ کمپلیکس میں جا کر ہوں گے......"

جان: "اوہو۔ ٹھیک...... لیکن تم مجھے 'عظیم رہنماؤں کی ہر چیز عظیم ہوتی ہے' والا ایگزی
دوبارہ نہیں دکھاؤ گے؟ وہ ایک منحوس مقام ہے جو مجھے بے ہوش کر دیتا ہے......"

جبار: "نہیں...... یہ ضروری نہیں۔"

اسی دوران بونا پلیٹوں میں قتلموں کے ٹکڑے ڈال کر سب کو دیتا ہے۔ سیفی ایک ٹکڑا
چٹکی میں دبا کر اٹھاتا ہے اور جان کو دکھاتا ہے۔

سیفی: "ویسے جان...... اس چیز...... قتلمہ روٹی کے اور بھی استعمال ہیں...... تم اسے
کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے سامنے پھیلا کر کیلوں سے ٹھونک کر ڈیلڈ
بند کر سکتے ہو یا پھر ایک قتلمہ بچھاؤ اُس پر سبزیاں گوشت پھیلاؤ اور دوسرا اوپر ڈال
دو۔ دنیا کا سب سے بڑا سینڈوچ تیار......"

جان: (غصے سے) "دنیا کا سب سے بڑا سینڈوچ پہلے ہی بن چکا ہے آسٹریلیا میں دو
سال پہلے...... اور۔ اور...... اس تمہارے سرخ پہیے سے بہت بڑا ہے۔ تمہیں
بتا دوں......"

جبار: "جان۔ جان...... پلیز۔ جذباتی نہ بنو...... ابھی ہم نے تمہیں اور کئی عجائبات
دکھانے ہیں۔"

بونا یک دم اسی لہجے میں آواز لگانے لگتا ہے۔

بونا: "دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو...... دو سروں والا کھوتا دیکھو۔ جل پری دیکھو۔ سرکٹی عورت
دیکھو۔ بارہ کلو کا چقندر دیکھو تیرہ فٹ کا سانپ دیکھو......"

سب ہنستے ہیں۔

سیفی: "قتلمہ انسان کو جذباتی کر دیتا ہے۔ کیوں جان...... یہ ایک سائنسی سوال ہے۔
پروفیسر صفدر سلطان کی تہذیبی خرد افروزی کے لیے ایک اہم سوال......"

جاری

O یہ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ فلمی سیفی کا کردار اصلی / نقلی سیفی کے کردار کے بہت قریب ہو

جا رہا ہے۔ یہ بطور رائٹر ایک زبردست کمزوری ہے۔

(سیفی)

انیلا کہتی ہے کہ اس کا فلمی سیفی کا کردار اس فقیر کی گندی عادات اپنا رہا ہے۔ اور یہ بطور رائٹر اس کی ناکامی ہے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ کردار کا نام بدل دے کیونکہ میرا نام بدلنا تو اب مشکل ہے۔ اس پر بات ہم نامی اور پھر کئی سٹار تھیٹر میں ہمارے ہم ناموں اور خاص طور پر اُس کی ہم نام انیلا سسی کی طرف چلی گئی۔ آج ادھر ہماری پہلی رات تھی۔ ان کا سب سے مقبول تھیٹر ہیر رانجھا چلا۔ ہم لوگ یعنی چیف، میں، ماسٹر یاسین (کچھ دیر اس کا ہم نام ماسٹر یاسین بھی اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر ساؤنڈ ایفیکٹ دینے چلا گیا) جبار اور بالی پہلی لائن میں بیٹھے تھے۔ انیلا اپنی سسی انیلا کے ساتھ ونگ میں بیٹھ کر ہیر فرخندہ بلی کے کام پر اس کی تعریف اور تنقید سنتی رہی اور ساتھ اس کا دیا ہوا قوام والا پان چبا کر تھوکتی رہی۔ ادھر چیف میرے ساتھ تھیٹر دیکھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بحث کرتا رہا کہ ہمیں کسی طرح فلم سکرپٹ میں اسے incorporate کرنا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ہم سیدھا سیدھا ان داستانوں کو شامل کر سکتے ہیں۔ یہ فضول بات ہے۔ (میری گھسیٹا کاری کا گھسیٹا پن میں نے یہاں آ کر محسوس کیا ہے کچھ کم ہو گیا ہے۔ یقیناً فراغت کی وجہ سے...... بہرحال) ہاں اسٹیج کے آگے پیچھے کے مزاحیہ واقعات کسی طرح آ سکتے ہیں۔ مثلاً آج ہی جب ہیر رانجھا کے آخر میں ہیر کے خاندان کے تیار شدہ زہریلے لڈو کھا کر سب یکے بعد دیگرے فوت ہو کر گر جاتے ہیں۔ تو پردہ پوری طرح بند ہونے سے پہلے ہی اٹھ جاتے ہیں، اس پر دیہاتی تماشائی بہت خوش ہوتے ہیں اور اسے شو کا حصہ سمجھ کر ہی تالیاں بجاتے ہیں۔ گویا فیروز زبردست ہیر گاتا ہے۔ ہیر ہی نہیں۔ سسی پنوں اور مرزا صاحباں بھی۔ بتایا گیا اسے کئی بار فلم اور ٹی وی میں گانے کی آفر ہوئی لیکن نہیں گیا۔

ہم بھی پرفارمنس پر بہت خوش تھے لیکن کچھ پولیس والے مسلسل پریشان کرتے رہے۔ بار بار ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے تھے۔ بالی کو بہت قہر چڑھتا رہا۔ ایک بار تو لنگڑاتا ہوا اٹھ ہی کھڑا ہوا اور ایک پولیس والے کو سختی سے ایک طرف ہٹ جانے کو کہا۔ اُس پر وہ بولا لو ایک کیدو اور آ گیا۔ یہ ایک خوفناک لمحہ تھا مجھے لگتا تھا بالی اس کو جان سے مار دے گا مگر

میں نے اور حیرت انگیز طور پر چیف نے خود تیزی سے اٹھ کر اسے واپس بٹھایا اور پھر پیار سے اور دونوں ماسٹر یا سینوں نے پولیس والوں کو سمجھا بجھا کر ہمارے سامنے سے ہٹ کر کھڑے ہونے پر آمادہ کر لیا۔

شو کے بعد انیلا آئی بلکہ ہم سٹیج کے پیچھے کھلے احاطے میں لگے ٹینٹوں کے دائیں بائیں بچھی دریوں پر کچھ اداکاراؤں اور عملے کے سوئے ہوئے بچوں کے پاس سے گزرتے رستہ بناتے درمیان میں بچھی اس وسیع و عریض دری کے قریب آئے جو میر مرجان کا فرشی تخت ہے۔ اتنے میں انیلا آئی اور کافی جھومتی ہوئی سی آئی۔ اس کے ساتھ سسی اور سعید کمال بھی تو یعنی جس نے رانجھے کا رول کیا تھا، سب آئے۔ چیف ان سب سے اور وہ چیف سے ذرا فاصلے پر ہی رہتے ہیں۔ انیلا سسی کمال سے کہنے لگی "کمالے تم آج اس فرخو بلی چندری کے زیادہ ہی صدقے واری نہیں ہو رہے تھے؟" کمال نے آہ بھر کر کہا۔ "کیا کروں سوہنیے...... پر نہ تو تو تو۔ سوہنی بھی نہیں...... سوہنی تو۔ جہاں آرا اور گیتی آرا سوہنی بنتی ہے...... ہائے۔ ہائے۔"

"تو جاؤ پھر اُسی کی ٹانگوں میں گھس جاؤ۔" سسی بولی...... اس بات پر رانجھے نے کوئی اثر قبول کرنے کی بجائے کہا "تو من موہنی ہے سسیئے۔ اب کیا کریں۔ نہ تُو ہیر بن سکتی ہے اور نہ میں پنوں...... ابھی تو فرخندہ بلی ہیر ہے اور میں کمال رانجھا ہوں۔ پر کیا کریں پارٹ تو پارٹ ہے۔ پارٹ تو کرنا ہے۔ ہاں کل اگر کوئی نئی کہانی بنانے والے لکھاری آ جائیں اور سسی رانجھا۔ ہیر مرزا۔ سوہنی مجنوں اور لیلیٰ مہینوال کے قصے بنا دیں تو پارٹ بھی چلے اور عاشقی بھی چلے۔"

اس پر لکی سٹار کے سب سے بوڑھے اداکار ہدایت کار اور گرو میر مرجان نے کچھ کہا جسے میں سمجھ نہ سکا۔ جو یقیناً اُسی...... بلکہ صوبہ خان طبلچی کے بیان کے مطابق نوے کے پیٹے میں ہے اور اسٹیج کے پیچھے نیم دائرے میں لگے ٹینٹوں کے درمیان بچھی اُس وسیع و عریض دری کے عین مرکز میں رکھے بے شمار رنگ برنگے گدوں اور گاؤ تکیوں کے ڈھیر میں سیاہ لباس پہنے براجمان رہتا ہے۔ میں پہلے اُسے لکی سٹار تھیٹر کا مالک سمجھا۔ لیکن پیارے نے بتایا کہ تھیٹر کا مالک شمشاد ایرانی ہے اور وہ آج ہی اچانک جا چکا ہے۔ اس کے اس طرح اچانک کہیں چلے جانے کو تھیٹر والے وچھوڑا کہتے ہیں۔ ایسا وہ کبھی سال دو سال میں ایک دو بار کرتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وچھوڑے پر تھیٹر لپیٹ دیا جاتا ہے اور پھر مالک کے دوبارہ ظاہر ہونے پر کام پھر شروع

ہوتا ہے۔ مگر یہ واقعہ سب کو سخت افسردہ اور خوف زدہ کر دیتا ہے۔

خیر تو اس رات دو بجے شو کے بعد کھانا لگنے سے پہلے جب کمال رانجھے اور انیلا سسی میں وہ معرکۃ الآرا مکالمہ چل رہا تھا اور سسی رانجھا اور سوہنی مجنوں، شیریں مہینوال اور فرہاد صاحباں جیسے مکمل دیوانے امکانات کی باتیں قہقہوں میں بلند ہوئی تھیں۔ ہم تینوں یعنی انیلا، میں اور چیف نے ایک ہی وجدان کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہم جان گئے کہ کباڑ کمپلیکس کے سرئیلزم کا تسلسل بھاگاں والا میلے میں اور لکی سٹار تھیٹر میں جیسے قائم ہو گیا ہے۔ یہ ذہنی اشتراک کا ایک حیرت انگیز لمحہ تھا اور یہ وہی بات تھی، اس سے جڑی آگے کی بات تھی، اُس کی تصدیق تھی جو بات انیلا نے آج سہ پہر کو بے بی کنار کے ساتھ ہمارے پر جوش مکالمہ کے بعد کی تھی۔ "سٹیج کے پیچھے 'غیر سٹیج' ہماری فلم کا تھیٹر ہے" اُس نے کہا تھا اور پھر ہم نے میر مرجان کی لرزتی غصیلی آواز دوبارہ سنی۔ اور اب مجھے اس کے الفاظ سمجھ میں آ گئے۔

"جو پارٹ میں عاشقی لاتا ہے وہ عاشقی میں بھی پارٹ کرتا ہے۔ آ۔ آ۔ غا۔۔۔ آغا جی...... ایسے...... ویسوں کو کان سے پکڑ کر با...... با...... باہر نکال دیتے تھے۔" میر مرجان نے کہا اور کھانسنے لگا۔ اور ساتھ ہی انیلا سسی "ہائے۔ میں مرگئی" کہہ کر میر مرجان کے قریب بیٹھ گئی اور اُس کے لرزتے ہاتھ چومنے لگی۔ کمال رانجھا میر مرجان کے پاؤں دبانے لگا اور چنو دلاری لکی سٹار کی لیلیٰ اپنے دوپٹے سے میر مرجان کا ماتھا اور ہونٹ صاف کرنے لگی۔ فرخندہ ہیر اپنے لمبے تڑنگے اور زور آور ہاتھوں سے اس کے دائیں بائیں تکیوں گدوں کو اس طرح جمانے لگی کہ اس کے سال خوردہ جسم کو زیادہ سکھ مل سکے۔

"آ...... آ...... غا...... آغا...... جی نک...... نکال...... دیتے تھے...... آ...... میں۔" اُس نے پھر کہا اور اُس کی آواز ڈوب گئی۔ چنو دلاری تیزی سے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لائی۔ 'جی مرجانی' اُس نے کہا اور میر مرجان کی سرگوشی سن کر اونچی تحکمانہ آواز میں بولی۔

"پانی لاؤ اور کھانا لگاؤ۔ یہ دلدار کدھر مر گیا ہے۔ دلدار۔ دلدار۔" دلدار تھیٹر کا باورچی کم ایکٹر ہے لیکن اپنی خوراک کی ذمے داریوں کی وجہ سے اور اپنے بھورے بالوں کی وجہ سے صرف سلطانہ ڈاکو میں کیپٹن ینگ کا رول ادا کرتا ہے۔

"لگ رہا ہے۔ چیخا نہ کرو پینو۔" کہیں دور سے کیپٹن بیگ کی آواز آئی۔ اور وہ اور
بھی زور سے چیخی۔ "چل چل جلدی کر۔"

پینو دلاری کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ لیکن پہلے روز ہی
جب ہم ان لوگوں میں کافی گھل مل گئے۔ سوائے چیف کے اور جبار کے جو صرف بیارے اور
اُس کی بونوں کی تصویروں اور لسٹوں میں مگن رہتا ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ پینو دلاری ہمارے
کیدو لنگڑے یعنی بالی کو کافی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اور پھر میں نے انہیں الگ باتیں
کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ موقع دیکھ کر میں نے بالی سے پوچھا بھی کہ کیا چل رہا ہے۔ جواب میں
اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بولا "سرکار بلی جیسی عورت ہے آپ جانتے ہیں مگر
پھر بھی اُس نے مجھ سے قسم لی ہوئی ہے کہ اُس کے علاوہ اور کسی کو اپنی عورت نہیں بناؤں گا۔ وہ
یہ بھی کہتی ہے عورت صرف تمہاری ہوں۔ باقی کام دھندہ ہے جیسے مالشیے کرتے ہیں...... میں
تیرے لیے صاف ہی رہتی ہوں بالی۔" اُس نے پھر ہاتھ جوڑے۔ "نہیں سرکار ایسی کوئی بات
نہیں۔ پینو دلاری ویسے نام کیسا ہے؟ پر آپ نہیں سمجھیں گے۔"

"میرا خیال ہے میں سمجھ رہا ہوں۔ پر یہ تمہیں کیا کہتی ہے؟ پینو دلاری...... نام تو
پیارا ہے۔ میرا مطلب ہے میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ہے، نہ بتانا چاہو تو نہ بتاؤ۔"

"آپ بھی پیاری ہے۔ آنکھیں سر جی دیکھیں...... یہ بڑی ودھ عورتیں ہیں۔ آدمی
سے زیادہ تو میڈم جی پر عاشق ہو گئی ہیں۔ پر...... میڈم جی...... جو...... میرا مطلب ہے
ان سے...... زیادہ۔ میرا مطلب ہے۔ یہ بہت آگے کی عورتیں ہیں......"

"کیا مطلب؟" میں نے کچھ سمجھتے ہوئے بھی پوچھا۔

بالی کے چہرے پر ایک سوالیہ الجھن اور ہچکچاہٹ نمودار ہوئی اور پھر یک دم وہ چل
گیا اور ہنس کر بولا۔

"پینو دلاری کہتی ہے مجھے سر جی۔ میں یہاں آ جاؤں۔ کہتی ہے چھوڑ فلم...... فلم جھوٹا
کام ہے۔ تھیٹر سچا کام ہے۔ پھر خود ہی کہتی ہے۔ پر اب یہ زیادہ دیر چلنے والا نہیں۔ اور پھر وہ
کسی مالک کی بات کرتی ہے جو وچھوڑا دے گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ وچھوڑا کیا ہے۔" بالی حیرت
سے کہتا ہے۔

"پتہ نہیں۔" میں بھی حیرت سے کہتا ہوں اور پھر بلی...... مردوں کی سیانی بلی سے
مجھے سیٹھ صفدر سلطان کا خیال آتا ہے۔ اور میں بالی سے اُس کے بارے میں پوچھتا ہوں وہ
قہقہہ لگاتا ہے۔

"بلی مردوں کی سیانی ہے سر جی۔ آپ کا سیٹھ تو گیا۔ بلی کے پاس بڑے عرصے
سے ایک اسٹنٹ مین عورت کی کہانی ہے۔ اس کی اپنی کہانی...... وہ اس نے لکھوائی ہوئی ہے
ایک رائٹر شاہنواز سے جو کبھی اُس کا عاشق تھا پھر اُسے ٹی بی ہو گئی اور مر گیا۔ سیٹھ کو بلی نے
راضی کر لیا ہے اُس فلم بنانے پر...... پیسہ لگانے پر۔"

میں تھوڑا پریشان ہو جاتا ہوں۔ ابھی بہر حال ہماری یہ فلم، یہ فلم نہیں بن سکتی، بنی
ہے اور سیٹھ سے funding کی ضرورت پڑے گی۔ چیف کا سر۔ بھی اُسے یہی مشورہ دیتا
ہے۔ مجھے سر یعنی حکمت بہزاد کا خیال آتا ہے۔ یہ شخص کب سے ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا
ہے۔ گناہ کی مار کے بغیر آرٹ، کلچر تھیٹر کرنے والے لوگ اگر کہیں ہیں تو صرف کمی سٹار تھیٹر
والے ہیں اور یہ تھیٹر ابھی لگی ہے کہ چل رہا ہے۔ ان لوگوں میں یہ احساس گہرا ہے کہ کچھ ہوا
ایسی چل پڑی ہے کہ یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ صرف فلم ہی ان کی دشمن نہیں، اصل دشمن
کہیں اور ہے......

بالی کے ساتھ یہ مکالمہ اور میری سوچیں پہلے روز کی شام ہوئی جب کہ دور سے سرکئی
عورت اور میڈم پونم کا آگ کا کھیل دیکھنے کی دعوت آ رہی تھی۔ جانی ہیجڑہ اور فیروز گویا باہر
پلیٹ فارم پر ناچ گانے کا انتظام شروع کر چکے تھے۔ کہ چیف اور ماسٹر یاسین آئے۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے؟" چیف نے پوچھا۔

"کہاں......؟"

"میں...... سورج مکھی کے کھیتوں...... کی ریکی کرنا چاہتا ہوں۔ کئی اینگلز سے۔
ماسٹر بھی سمجھتا ہے کہ اس سے ہمیں بڑا گہرا effect ملے گا۔"

"ہاں...... رائٹر لوگ بھی چلیں تو اچھا ہو گا باس۔" ماسٹر یاسین نے عجب شرارت
بھری مسکراہٹ سے کہا اور چیف نے ترچھی نظر سے دور کھڑی اینلا کو دیکھا جو بے بی کنار اور
پیارے کے ساتھ خدا جانے کیا گپ لگا رہی تھی۔ اور پھر جب ماسٹر، بالی اور چیف اپنے

کیمرے لیے چلے گئے تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ گپ کیا تھی۔ میں نے سیٹی بجا کر (حرکت جو
عام طور پر میں نہیں کرتا) انیلا کو بلایا۔ پیارے نے گھوم کر دیکھا اور میری طرف ہاتھ ہلایا اور
پھر وہ اپنا میگا فون لیے باہر پلیٹ فارم کی طرف چلا گیا۔ انیلا اور بے بی کٹار دونوں میرے
قریب آ گئیں۔ انیلا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ پتہ چلا کہ پیارا اور بے بی کٹار انیلا سے یہ ذکر کر
رہے تھے کہ لکی سٹار تھیٹر اصل میں صرف ان کے کوچوان اور گھوڑی والے آئیٹم کی وجہ سے چل
رہا ہے۔ لیکن پھر بھی چونکہ وہ دونوں ایکٹر نہیں ہیں اس لیے انہیں خاص طور پر بے بی کو زیادہ
اہمیت نہیں دی جاتی۔

انیلا نے سگریٹ نکالا تو بے بی کٹار بولی۔ "باجی جان پکا پیو گی؟" انیلا نے ایک نظر
میری طرف دیکھا اور میں نے خواہ مخواہ اُسے کڑی نظر سے دیکھا حالانکہ اجازت مانگنا اور
اجازت نہ دینے کا وہاں کوئی چکر ہی نہیں تھا۔ پھر انیلا نے ہنس کر کہا......

"نہیں پھر سہی۔"

"تاجی مجھے دیتا ہے پکے۔" بے بی نے وضاحت کی۔ تاجی سے اُس کی مراد لکی
سٹار کے سب سے خوبرو ہیرو مہتاب دُرانی سے تھی۔ جو مرزے اور مہینوال کا رول کرتا ہے۔ جو
پنو دلاری کی طرح ذرا لیے دیے رہتا ہے۔ وہ فلمی لین میں جانے کی دھمکیاں دیتا تھا لیکن
جب ایک بار اُسے ایک فلم میں پھل بیچنے والے کا رول اور وہ بھی بغیر پیسوں کے...... کے علاوہ
کچھ نہ ملا تو واپس آ گیا۔ مذاق چلتا رہا کہ "چلو فروٹ تو ساری عمر کا کھا آیا ہے۔"

"پیارا میرے اوپر بڑی نظر رکھتا ہے۔" بے بی نے رازداری سے بتایا۔ "سمجھتا ہے
تاجی کے ساتھ میرا یارانہ ہے۔ ہے کچھ بھی نہیں۔ تاجی کو بس اپنے آپ سے اور پیسے سے پیار
ہے دلے کو......" پھر یک دم اس کی نظر میرے اور انیلا کے ہاتھوں پر نیلم اور زمرد کی انگوٹھیوں
پر پڑی اور یوں لگا جیسے اُس کا سانس پھول گیا۔

"او ہائے...... او ہائے...... او ہائے...... اوئے۔ اوئے" اُس نے کہا اور ہر او ہائے
کے ساتھ اُس کے سینے کے ابھار ایک آزادانہ اثبات میں حرکت کرتے رہے۔

"She is one hell of a woman. Isn't she?"

انیلا نے بے اختیار ہو کر مجھے کہا۔ اور بے بی مشکوک انداز میں اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"انگریزی میں گالیاں دے رہی ہو باجی جان......؟" اُس نے منہ بنا کر پوچھا اور
ہم دونوں ہنس پڑے۔

"نہیں وہ تو تمہاری تعریف کر رہی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں کہ تم کتنی پیاری ہو......" انیلا نے کہا اور وہ خوش ہو گئی اور پھر یک دم اُس نے
میری اور انیلا کی انگوٹھی والی انگلیاں اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیں اور ہمیں ایک مشترکہ
آنکھ ماری۔

"شادی تو نہیں کی نا؟" اس نے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دے کر آگے اپنی
رائے ظاہر کی۔ نہیں کی...... بہت اچھا کیا...... اور کرنا بھی نہ۔ بڑا گندا کام ہے۔ میں نے بھی
ایک بار کی تھی۔ "پر پھر دفع کر دی......"

میں نے اور انیلا نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر اس
جہاں دیدہ رقاصہ کے ازدواجی مشوروں پر کان دھرے مگر اب وہ نیلم اور زمرد کے بارے میں
کچھ کہہ رہی تھی۔ "نیلا پتھر سبز پتھر......" اس نے آہ بھری "راس آ جائیں تو کیا بات ہے۔
ورنہ...... ویسے یہ پہنے ہوئے ہوں تو جادو نہیں چلتا......"

"جادو۔" انیلا نے حیرت سے کہا "تم یہ باتیں جانتی ہو؟"

"ادھر سب ہی چندریاں...... جانتی ہیں...... ایک دوسرے پر کالا علم کراتی ہیں۔ وہ
نہیں پنو...... کالو ولاری...... لیلو...... اُس کا تو وار بڑا ہی قاتل ہے۔ اس نے ایک عامل پکڑا
ہوا ہے۔ جس کے ساتھ وہ سوتی بھی ہے۔ وہ تین مہینے ہوا میں غائب رہتا ہے پھر ظاہر ہو جاتا
ہے۔ پچھلے ساون سے پھر آیا ہوا ہے۔ اگلے تین ماہ کے لیے ٹونے کرا کے لائی ہے کی......"

میرے لیے ہنسی دبانا مشکل ہو رہا تھا یہی حال انیلا کا تھا۔ اُس نے غالباً جلدی سے
موضوع بدلنے کے لیے پوچھا۔

"تمہاری شادی کس سے ہوئی؟"

"ماسٹر یاسین سے۔ وہ نہیں جو ہر پاسے پیچ کستا پھرتا ہے۔ وہ نہیں جو تمہارے
کیمرے والے کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے...... وہ نہیں جو ہر مشین میں انگلی دیتا پھرتا ہے۔"
اُس نے تیزی سے دو تین شناختیں بتائیں اور میں نے پہچاننے میں بالکل دیر نہ لگائی۔

"بالکل...... بالکل۔ ماسٹر یاسین......"

"ہے نا! وہی...... چندرا مجھے بھی مشین ہی سمجھنے لگا...... میں نے کہا جا اپنی مشین ٹھیک کرا پہلے......" بے بی نے قہقہہ لگایا۔ "بڑا مزہ آیا...... میری بات سے اُس کے دل میں وہم بیٹھ گیا...... اصل بات یہ تھی مجھے اُس سے ہر وقت ڈیزل کی بُو آتی تھی...... اور پھر یہ شادی کتنا کام تو ہے ہی......"

"ہوں......" انیلا نے سگریٹ سلگانے سے پہلے آواز نکالی۔ "پھر......؟"

"پھر کیا۔ میر مرجان نے نکاح کرایا تھا اور اُسی نے طلاق کروا دی۔ میر جانی کا کہا تو پتھر پر لکیر ہے۔ سب مانتے ہیں مالک بھی شمشاد ایرانی۔ میں بھی خیر مانتی ہوں۔ پر۔" اُس کی آواز میں ہچکچاہٹ آئی۔

"کیا ہوا......؟" انیلا نے تجسس سے پوچھا۔

"پر۔ دل میں بات تو رہ جاتی ہے نا...... ایک بار...... اُدھر ڈیزل مین سے میری شادی سے پہلے...... میں میر جانی کے سامنے اکیلی بڑی روئی پیٹی۔ میر جانی مجھے پارٹ دے...... اور کچھ نہیں تو سوہنی کمہارن کا پارٹ ہی دے دے...... سوہنی نہیں تھی۔ وہ۔ پتہ ہے ناں...... چندری جو اپنے عاشق کے پٹ کا گوشت کھا گئی......" بے بی کنار نے کراہت سے ہونٹ سکیڑے اور بات جاری رکھی۔ باجی جان۔ ویسے یہ کیا بات ہے۔ مجھے تو جھوٹ لگتی ہے...... تم فلمیں۔ کہانیاں لکھتی ہو...... ایسا کیا ہو سکتا ہے۔ اور بھلا اس کو دیکھو کچے تو ادھر دوسرے کنڈے پر بھلا گوشت روٹی کھانے جاتی ہے...... اصل بات کیا ہے......؟"

میں نے انیلا کی طرف دیکھا، اُس سے کچھ جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ میں نے کہا "بے بی۔ اصل بات تو اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ تو قصے کہانیاں ہیں...... تو پھر میر مرجان نے تمہیں سوہنی کمہارن کا پارٹ دیا......؟"

"کہاں۔ سُنتا رہا۔ تسلی دیتا رہا...... ایویں...... پھر ایک دم ہنس پڑا...... کہنے لگا۔ تو نے اپنا آپ دیکھا ہے تُو تو کچا گھڑا گلنے سے پہلے ہی ڈوب جائے گی۔ اور میرا دل ڈوب گیا۔"

"اوہو......" ہم دونوں کا اظہار افسوس بے ساختہ تھا جسے اُس نے قبول کیا اور پھر بولی پر وہ میر جانی ہے۔ میر مرجان ایویں تو نہیں۔ میرے آنسو دیکھ کر...... میرے سر پر ہاتھ

رکھ...... کر بولا...... دیکھ داری...... اُدھر تیرے اور پیارے کے صدقے سب کی روزی لگی ہوئی ہے۔ تو پارٹ میں جائے گی تو سب بھوکے مر جائیں گے...... اور کوئی مانے نہ مانے مجھے تو پتہ ہے نا۔ اور میرا لفظ ہے صرف تیرے لیے اور پیارے کے لیے۔ نہ میں آگے کسی سے کہتا ہوں اور نہ تو کہے گی...... میرا دل ٹوٹ کر جیسے پھر جڑ گیا۔ پھر کبھی میں نے اُس سے پارٹ کی بات نہیں کی۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ جس میں فیروز گوئیے کی سریلی آواز میں ہیر کا ایک بول سنائی دیا۔

"تمہارا نام داری ہے؟" انیلا نے پوچھا۔

"ہاں۔ سرداراں بیگم...... داری بولتے ہیں۔ بے بی کنار تو شو کا نام ہے۔ میری ماں کا بھی یہی نام تھا...... شو کا...... بے بی کنار......"

"تمہاری ماں کا...... نام...... اک دم میرے ذہن میں اُچھپا کا سا ہوا اور مجھے بابا بُوشیا نظر آیا۔ اوہو......"

"کیا ہوا؟" انیلا نے مجھے ایک نظر دیکھ کر پوچھا۔

"وہ مجھے کچھ یاد آگیا تھا......" میں نے سوچا اُسے بعد میں بتاؤں گا کہ بابے بُوشیے کے عشق کا معمہ حل ہو چکا ہے۔

"اور تمہاری ماں اب......؟" میں نے بے بی کنار / سرداراں بیگم / داری سے پوچھا۔ "مر گئی۔ پہلے پوست کے ڈوڈے پینے لگی۔ پھر افیون پر آئی۔ ایک رات خوراک میں حساب نہ رہا۔ صبح مری پڑی تھی۔ میں پندرہ سال کی تھی...... میری ماں ویسے پارٹ بھی کر لیتی تھی بھی صاحباں کا......" اس نے ایسے لہجے میں کہا۔ جیسے اس کی ماں کا مرنا اور صاحباں کا پارٹ کرنا ایک جیسے واقعات ہی تھے۔

"صاحبان۔ مہربان۔ قدردان...... ہیر رانجھا آج کا شو مہربان۔ ہیر رانجھا...... رانجھا رانجھا آکھدی میں آپے رانجھا ہوئی......" اچانک پیارے کی پاٹ دار آواز میگا فون کی راہ سے سنائی دی۔ اور بے بی کنار نے چیخ کر کہا۔ "ہائے میں مر گئی......" اس نے کلائی پر بندھی چھوٹی سی گھڑی دیکھی جس نے تو ابھی میک اپ تھوپنا ہے۔ پہلا آئٹم ہمارا ہوتا ہے۔

تمہیں پتہ ہے ناں۔ دیکھنے آؤ گے نا...... اور کوئی آئے نہ آئے...... تم دونوں ضرور آنا تم مجھے
بڑے اچھے لگے ہو......"

"میک اپ...... خود کرو گی؟" انیلا نے ایک سحر زدہ سی آواز میں پوچھا۔

"نہیں...... راجہ پاؤڈرل کرے گا۔"

میں ہنس پڑا۔ "پاؤڈرل اچھا ہے۔ یہ تمہارا میک اپ مین ہے؟"

"ہاں...... جلدی جاؤں...... وہ فرخو بلی گئی تو گھنٹہ اس پر لگا دے گا......"

وہ بھاگنے کو تھی کہ میں نے کہا۔ "ایک سیکنڈ پلیز...... تمہاری ماں کے اس آدمی
میں...... میرا مطلب ہے...... بونا...... کوئی اور......؟"

"ہاں...... وہ چاچا موچھا ہوتا تھا...... ماں مری تو وہ چلا گیا۔ فلم میں۔ سنا ہے وہ
بھی مر گیا ہے۔" اُس نے کہا اور بھاگ گئی۔

"ہاں...... وہ بھی مر گیا ہے۔" میں نے زیر لب کہا اور انیلا کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ
دیر خاموش اجنبیوں کی طرح ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے کہا۔

"یہ ایک کافی دیوانی دنیا ہے۔ نیلی لیکن فلم یا نو فلم...... میں اسے گھسیٹ رہا ہوں۔
ذرا بہتر طریقے سے۔ عرصے سے کوئی فیچر نہیں لکھا......"

"ہاں۔" اُس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "فلم تو ہے...... ابھی تو ہے
سیلی...... فلم تو ہے...... میں بھی نوٹس لے رہی ہوں...... کچھ سین لکھے ہیں...... رات شو کے
بعد...... وقت ہوگا...... مگر تھیٹر...... یہ تھیٹر......"

وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنی نیلم کی انگشتری کو دیکھا
اور مسکرائی۔ جانے کیوں۔ کلی ستار تھیٹر میں رات کے شو کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہر شخص کسی
سے کوئی ہدایت لیے بغیر وہی کچھ کر رہا تھا جو اُسے کرنا تھا۔ شام کے وقت میلہ زوروں پر ہوتا
ہے۔ جس کا ثبوت ایک مدھم شور کی صورت باہر سے ہم تک پہنچ رہا تھا۔ ہم دونوں سٹیج کے
عقب کی دنیا میں کھڑے ایک بہت بڑی دری کے عین درمیان میں بیٹھے اُس بے حد بوڑھے
شخص کو ایک نظر دیکھتے تھے جو وہیں بیٹھا بیٹھا اور تکیوں اور گدوں کا رخ موڑ کر اپنے آپ کو ہر
رخ سے آسودہ کر لیتا تھا اور ہر طرف جاری کارروائیوں کو بھانپ رہا تھا۔ کیدو۔ رانجھا۔ سیدا۔

کھیڑا۔ سہتی سب اپنے اپنے کاسٹیوم میں تھے اور اِدھر اُدھر مختلف غیر سٹیج کاموں میں مصروف
تھے۔ سہتی ایک خربوزہ کھا رہی تھی۔ رانجھا حقہ پی رہا تھا اور ساتھ بیٹھے سیدے کو واری گھور رہا
تھا۔ سیدا ہر واری پر بار بار کھانس کر ایک اخبار پڑھنے کی ناکام کوشش میں مشغول ہو جاتا تھا۔
اتنے میں فرخندہ بلی دندناتی ہمارے پاس سے گزری، اُس نے رک کر اپنے دو بچوں کو جو گیند
سے کھیل رہے تھے، دو زوردار چانٹے لگائے۔ جس پر وہ روتے ہوئے ایک خیمے کی طرف
بھاگ گئے۔ میں ہیر مرجان کی مدھم آواز سننے میں کامیاب ہو گیا۔

"نہ کر فرخو نہ کر۔" اور فرخو ہمیں دیکھ کر رکی اور مسکرائی اور اُس کے خوبصورت سفید
دانت چمکے اس نے انیلا کو کندھوں سے جکڑ لیا جو ویسے بھی اُس کے کندھے تک تھی۔

"میڈم جی جان جی...... آج میرا کام ضرور دیکھنا...... اور تم بھی۔ آپ بھی......
مجھے پتہ لگ گیا ہے تم ایک دوسرے کے 'وہ' ہو۔"

وہ کھل کر ہنسی اور پھر اس نے بظاہر ایک بالکل لاتعلق بات کی۔ "میں اپنے دونوں
بچوں کو پڑھا رہی ہوں۔ اخبار میں لکھنا تم۔ اچھا میں چلوں۔ پاؤڈرل سے میک اپ کرانا ہے۔"

اور وہ تیزی سے ایک خیمے کی طرف بڑھی اور پھر ہمیں مرد عورتوں کے چیخنے چلانے
اور کسی مرد کی اونچی آواز میں ڈانٹنے کی آوازیں آئیں۔ ہم دونوں اس خیمے کی طرف بڑھے جو
یقیناً کلی ستار تھیٹر کا میک اپ روم تھا۔ پردہ کھلا تھا۔ ایک سفید بالوں والا بوڑھا ایک بڑے
آئینے کے سامنے بے بی کنار کو بٹھائے اُس کے ہونٹوں پر گہری سرخ لپ سٹک لگا رہا تھا۔ اور
فرخندہ بلی دھاڑ رہی تھی۔ "یہ پہلے آ گئی ہے۔ میں کہاں مروں جا کر......"

"جہاں دل کرے جا کر مرو......" بے بی کنار نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے کہا۔ "بکو مت
دونوں۔ نہیں تو۔ ایک چانٹا ماروں گا۔" پاؤڈرل نے اُس سے کہا۔ پھر فرخندہ بلی کی طرف دیکھ
کر حلیمانہ انداز میں کہنے لگا۔ "جو پہلے آئے پہلے کرائے۔ جاؤ۔ بس پانچ منٹ کے بعد آنا۔" اور
فرخندہ ہیر گہری گہری سانسیں لیتی اپنے ناپسندیدہ خاوند سیدے کھیڑے کے ساتھ جا کر بنچ پر
بیٹھ گئی اور پھر یک دم اُس کے بنے سنورے تیل میں چپڑے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں
بے ترتیب کر دیا۔ سیدے کھیڑے کا چہرہ رونے والا ہو گیا...... ہیر نے قہقہہ لگایا اور سیدے نے
رونی آواز دے کر رانجھے سے کہا۔ "کما لے۔ کنگھی ہے تیرے پاس؟" "نہیں میرے پاس

کنگھا ہے لینا ہے۔ جا۔ پاؤڈرل سے لے کنگھی۔'' سیدا کھیڑا ایک اپ ٹینٹ کے دروازے میں داخل ہونے کو ہی تھا کہ پاؤڈرل کی زبردست ڈانٹ ''ہٹ ہٹ۔ چل دور ہٹ'' سے جیسے پیچھے کو گرنے کو ہوا۔ کافی لوگ ہنس پڑے جن میں میں اور انیلا بھی شامل تھے۔ پھر انیلا یک دم سنجیدہ ہوگئی اور ایک گہری اُداسی کی کیفیت میں بولی۔

''سٹیج کے پیچھے ایک غیر سٹیج ہے سیفی۔ اور وہی ہمارا سٹیج ہے۔ ہماری فلم کا سٹیج۔''

میں نے اس کی طرف محبت سے دیکھا اور اُس سے قربت کی ایک دیوانی خواہش میری آنکھوں میں یقیناً جھلکی کیونکہ انیلا مخصوص خواہش سے بھرپور اپنی انکار کی مسکراہٹ میرے لیے لائی۔ اسی لمحے میں نے دیکھا کہ چیف، ماسٹر یاسین، جبار اور بالی باہر کا دورہ کر کے واپس آگئے ہیں۔ ہم سیدھے ایک دوسرے کی طرف گئے اور پھر چیف کے اشارے پر اپنے ٹینٹ میں آگئے۔ چیف ان لوگوں کے سامنے اپنی فلم کی کوئی بات کرنا یا کوئی بھی ردِعمل ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔

''ہم نے کئی basic locations مارک کی ہیں۔ انیلا۔ سیفی...... سورج مکھی کے کھیت ہم ضرور exploit کریں گے۔ بائی داوے ماسٹر۔ وہ عجائبات...... سرکئی عورت اور باقی سب کچھ......؟''

''ہاں...... وہ پیارے نے ہماری مشکل آسان کر دی تھی۔ وہ لوکیشنز بھی ہم نے مارک کر لیں۔ لیکن اب تو یہ لکھنے پر ہے۔ سین آئیں گے تو۔'' ماسٹر یاسین نے ایک بہت بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا۔

چیف نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب مسئلہ یہ ہے کہ یہ میلہ اب ایک سال بعد لگے گا۔ یہ تو نکل گیا۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم باقی سب شوٹنگ شہر کی اور کباڑ کمپلیکس کی مکمل کر لیں۔ اور بالکل آخری سین یہاں شوٹ کریں۔ پھر میں شاید فلم جولیس کو اگلے سال خزاں سے پہلے پراگ بھجوا سکوں۔ بلکہ خود لے کر جاؤں۔''

''اگلے سال'' میں نے اور انیلا نے اک دم کہا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ ہم نے یہ بات تو سوچی ہی نہیں تھی کہ میلے سال میں ایک بار ہوتے ہیں۔ اور کئی سٹار تھیٹر اور باقی سب کھیل تماشے پھر سال بعد یہاں آئیں گے۔

''ایک سال میں تو خدا جانے کیا کچھ ہو جائے۔'' انیلا نے گہری اداسی سے کہا۔

''بہرحال سعید کئی بنیادی باتیں واضح ہو رہی ہیں۔ باقی ہم آج کا تھیٹر کا شو دیکھیں گے، اور بھی بہت کچھ ذہن میں آئے گا۔''

''آج کا شو۔ اچھا...... ہیر رانجھا......'' چیف نے بے یقینی سے لہجے میں کہا۔ ''ہم وہاں بیٹھیں گے۔''

''ہاں باس۔ پیارے نے اگلی سیٹیں ہمارے لیے reserve کر دی ہیں۔'' ماسٹر یاسین نے اشتیاق سے کہا۔

''ہم شو دیکھیں گے۔'' میں نے کہا۔

....

اور شو ہم نے دیکھا۔ انیلا نے کھیل کا کچھ حصہ انیلا سسی کے ساتھ ونگ میں بیٹھ کر دیکھا اور باقی ہمارے ساتھ پہلی لائن کی سیٹوں میں جہاں وہ پریشان کرنے والے پولیس والے بھی موجود تھے۔

کھانا لگ گیا۔ سب سے پہلے میر مرجان کے لیے غالباً دلیے کا ایک بڑا پیالہ آیا۔ اور سسی چمچے میں تھوڑا تھوڑا لا کر ہر بار پھونک مار کر اس کے پوپلے منہ میں ڈالنے لگی۔ کھانا میں نے دیکھا کافی پرتکلف تھا۔ پہلے میں اس غلط فہمی کا شکار ہوا کہ شاید یہ تکلف ہمارے حوالے سے ہے لیکن پھر میں جان گیا کہ ہر شو کے بعد ایک دعوت کرنا ان لوگوں کا معمول ہے۔ چیف کے لیے کھانا اُس کے ٹینٹ میں بھجوا دیا گیا۔ اور پھر اچانک اس روز کی ہیر نے انیلا سے صاف صاف پوچھ لیا۔

''باجی جان دیکھا میرا کام۔ کیسا لگا۔'' ''بہت اچھا۔'' انیلا نے بے ساختہ کہا۔ اور اسی لمحے اُس نے اور میں نے دیکھا کہ سسی میر جان کے منہ میں چمچہ ڈالنے کے بعد اس کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اور پھر وہ بولی۔

''انیلا جان میرا کل شو ہے۔ یاد ہے نا۔'' اس نے کہا۔ اور انیلا نے اُسے یقین دلایا کہ اُسے یاد ہے۔ اُدھر فرخندہ بلی کو سسی کی یہ مداخلت پسند نہ آئی۔ وہ انیلا سے مزید تعریف چاہتی تھی۔ اور اس ناپسندیدگی کا اظہار اُس نے دیسی مرغے کی کافی سخت ٹانگ کی ہڈی کو پرشور

آواز سے چبا کر کیا۔ میں نے تیزی سے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی جو کامیاب رہی۔

''شو بہت اعلیٰ رہا...... زیادہ مزا آتا...... اگر وہ پولیس والے پریشان نہ کرتے۔''

میں نے شکایتی سے لہجے میں کہا۔ اس پر میں نے محسوس کیا کہ لمحہ بھر کے لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر پیارے نے جو بریانی میں زردہ ملا کر اُس پر قورمہ ڈال کر کھانے کے چکر میں تھا کہا۔

''میں نے منت ترلا کر کے الگ بٹھا تو دیا تھا تینوں کانسٹیبلوں کو...... پر وہ کسی اور کے سر پر شیر ہیں۔''

''ہاں۔ رانا۔ تھانیدار۔ ایک بہن چود ہے...... بُو لی کتا......'' مہتاب درانی نے کہا۔

پھر میں نے دیکھا کہ میر مرجان کا سر لرزنا شروع ہو گیا ہے۔ اور سسی نے اس کے ہونٹوں کے قریب کان لے جا کر سُنا اور سر ہلانا شروع کر دیا۔ دائرے کی شکل میں بیٹھے سب عورتوں مردوں پر خاموشی طاری ہو گئی اور سب جیسے غیب سے کسی آواز کے منتظر ہو گئے۔ آخر انیلا سسی نے چاروں طرف سر گھما کر سب کو دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اندر کی اداکارہ جاگ اٹھی ہے۔

''سنو سنو۔'' اس کی پاٹ دار آواز ابھری۔ ''میر مرجانی کہتے ہیں اس تھانیدار سے کوئی پنگا نہ لے۔ بس اپنے ادھر دو تین دن پورے کرو۔ اور جاؤ۔ شمشاد وچھوڑے پر چلا گیا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کیوں؟''

''وہ ایسے کبھی سال چھ مہینے بعد اچانک چلا تو جاتا ہے۔ تھیٹر بند ہو جاتا ہے۔ پھر جب اپنی مرضی سے مہینے دو بعد آ جاتا ہے۔ تو شو پھر شروع ہو جاتا ہے۔ سب کو پتہ ہے۔ کیا پوچھتی ہے۔'' نازلی ایک ادھیڑ عمر اداکارہ جو سیدے کھیڑے کی بہن کا رول کرتی ہے۔ اور کی سٹار تھیٹر کی انتظامی درجہ بندی میں کافی اوپر ہے، اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''نہیں۔ نہیں...... نہیں سنو۔ سنو نہیں۔'' انیلا سسی میر مرجان کی سرگوشی سُن کر پھر آگے اُسی انداز میں بولی۔ ''وہ سارے شو ختم ہونے کے بعد وچھوڑے پر جاتا ہے اگر اُسے جانا ہو۔ اس بار پہلے ہی چلا گیا۔ دو شو باقی ہیں۔ کیوں۔ کیوں۔ کیوں......؟''

''تو پھر پُھٹ نا منہ سے۔'' فرخندہ بلی گرجی اور مہینوال مہتاب اور رانجھا سعید کمال دونوں ہنس پڑے۔ سسی نے فرخندہ کی بجائے ان دونوں کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

اور اسی لمحے دری کے ساتھ زمین میں گہرے بانس پر لگا بلب پھڑ پھڑانے لگا۔ ''ڈیزل ختم ہو گیا ہے''۔ ماسٹر یاسین نے کہا اور تیزی سے کھانا چھوڑ کر قناتوں کے بڑے احاطے کے ایک دور افتادہ کونے میں لگے جنریٹر کی طرف بھاگا۔ روشنی کے جھپاکوں نے کسی سٹیج لائٹ کی طرح اس محفل کو اور بھی تھیٹریکل کر دیا۔ سسی کی آواز آئی۔

''شمشاد اس لیے چلا گیا ہے کہ اس نے ایک بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔''

''کیا خواب دیکھا ہے؟'' ایک نسوانی آواز ابھری جو نازلی کی تھی۔

''میر جانی کہتے ہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ بس ادھر اپنا ٹیم پورا کرو۔ ابھی تین دن اور ہیں۔ اور پھر نکل جاؤ۔ اپنے اپنے پیاروں سے مل آؤ۔ پھر جب مالک واپس آئے گا۔ پھر شو چلے گا۔''

''میرے پیارے تو ادھر ہی ہیں۔ میں کدھر جاؤں۔'' استاد پاؤڈر مل کی دردناک آواز سنائی دی اور ساتھ ہی مکمل اندھیرا چھا گیا۔ اور بھاگاں والا کے دور افتادہ علاقے کی سیاہ رات اک دم ظاہر ہو گئی۔ میں نے ساتھ بیٹھی انیلا کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہم اتنی زبردست تاریک رات دیکھنے کے عادی ہی نہیں رہے شہر میں رہنے والے۔''

''ہاں...... مگر اس میں ایک ڈرانے والی خوبصورتی ہے۔''

''تم پاؤڈر مل جی میرے ساتھ چلو گے'' اچانک پیارے بونے کی آواز آئی۔

''ہاں۔ پیاروں کے پاس نہیں جانا۔ پیارے کے ساتھ تو چلے جانا......'' چنو دلاری کی آواز آئی۔ اور سب لوگ ہنس پڑے۔ مکمل تاریکی میں اب ہم سب اندازے سے ہی اپنے سامنے رکھی پلیٹوں اور رکابیوں میں رکھے کھانے تک رسائی حاصل کر رہے تھے اور خاموشی کے ایک وقفے میں، مَیں نے محسوس کیا کہ مکمل تاریکی میں ضیافت کے صوتی تاثرات میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی ہے۔ شاید چمچوں کے غلط جگہوں پر بار بار ٹکرانے سے یا کھانے والوں کی محتاط بڑبڑاہٹ کی وجہ سے۔ نازلی کی آواز پھر آئی۔

''پیارے تُو تو مجھ سے دس ہزار لے کر گیا تھا اس تھانیدار کو سُور کھلانے کے لیے شمشاد اور تُو دونوں گئے تھے۔ اب کیا تکلیف ہے اُس کو؟'' بعد میں مجھے پتہ چلا کہ نازلی تھیٹر کی خزانچی / کیشیئر تھی۔

"وہ تو ہر جگہ ہی ہوتا ہے نازو۔ پولیس ہر میلے پر قدم بعد میں رکھتے دیتی ہے۔ پہلے لیتی ہے۔ پر بندے بندے میں فرق ہوتا ہے۔ ادھر ہی پچھلے سال چوہدری پرویز تھا۔ بھلا بندہ تھا۔ اس کو شو کا شوق بھی تھا۔ مگر میں تمہیں سارا قصہ سناتا ہوں۔ میر جانی سناؤں؟"

میر مرجان کی سرگوشی کے بعد کسی کی آوز آئی۔ "ہاں پیارے سناؤ۔"

"تو پیسے چوہدری پرویز نے بھی لیے تھے۔ لیکن بڑا سوہنا میلہ کمایا تھا ہم نے۔ اب اس کے پاس گئے رانے کے پاس۔ تو پہلے تو دو گھنٹے اس نے باہر بٹھائے رکھا۔ ملا ہی نہیں۔ پھر بلایا تو ایسے کھڑے رکھا جیسے ہم کسی واردات میں پکڑے گئے ہوں۔ کافی دیر وہ سامنے پڑا کوئی رجسٹر دیکھتا رہا، ہم کھڑے رہے۔ پھر کہتا۔ "تو پھر آ گئے ہو ادھر کنجر خانہ کھولنے...... پچھلے سال کا روزنامچہ میں نے دیکھا ہے۔ چوہدری پرویز نے تو تمہیں کھلی چھٹی دی ہوئی تھی۔ میں نہیں دوں گا۔ میں ایسے حرام کاری کے کام چلنے نہیں دیتا اپنے تھانے کی حدود میں......"

مجھے پتہ لگ رہا تھا کہ شمشاد سے یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی۔ "تھانیدار صاحب......" وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میں نے اُس کا ہاتھ دبایا، وہ خاموش ہو گیا اور میں بولا۔

"عالی جاہ۔ ہم فنکار لوگ راس دھاریے ہیں۔ کھیل کرتے ہیں...... لوگوں کا جی خوش کرتے ہیں......"

"لوگوں کا جو کچھ خوش کرتے ہو وہ میں جانتا ہوں۔ نہ پر۔ مالک تُو ہے ٹڈے یا یہ ہے؟"

"جناب میں ہی ہوں۔ لیکن پیارا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شمشاد بڑا نا اپنے قابو میں حساب سے بولا۔ اور میں نے سوچا یہ ٹھیک ہے۔ بات...... پھر اُس نے کہا۔ ہم تھیٹر کرتے ہیں جناب۔ پچھلے ستر سال سے کر رہے ہیں......"

"مطلب ستر سال سے کنجر خانہ کھولا ہوا ہے۔ ہیں؟" رانا ہنسا۔ "شمشاد کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا وہ صاف کانپا...... اور میں پھر بولا......"

"جو بھی کہہ لیں سرکار...... باقی آپ حکم کریں......" اور میں نے شمشاد کا ہاتھ پھر دبایا، اشارہ کیا کہ وہ بھی یہی بات کرے......"

"جی سر۔ آپ حکم کریں۔ شمشاد نے بھی کہا۔ اس پر رانا بڑے موڈ میں آ گیا۔ ہمیں

اشارے سے بنچ پر بیٹھنے کو کہا۔ ہم بیٹھ گئے۔ پھر کہتا...... "حکم تو مجھے عالی جاہ کا یہ ہے کہ یہ پرانے اور جو نئے چکلے کھلے ہوئے ہے نا، ان کو فنا کر دو۔ پر کیا کریں۔ دنیاداری بھی تو دیکھنی ہے۔ ہاں وہ خود لگے ہوئے ہیں۔ کوئی قانون پاس کرا رہے ہیں۔ یہ کنجر کھاتے سارے بند کرو...... تو پھر دیکھنا تم لوگ۔ تمہارا حشر کیا ہوتا ہے۔ پر ابھی...... چلو۔ اپنا بھلا گُلا کر لو...... ایک [illegible] چود یہ میلہ چار پانچ دن چلتا ہے۔"

میرے منہ سے نکل گیا۔ "سرکار عرس بھی ہے ساتھ بزرگوں کا۔" اس پر اس نے بڑی بڑبڑ کی، "او تُو رہنے دے اوئے عرس...... آیا بڑا......" پھر پتہ نہیں کیا منہ ہی منہ میں کہتا رہا۔

پھر یک دم اونچی آواز میں بولا۔

"میں نے ایک بار کہا بھی تھا۔ سرکار حضرت۔ عالی جاہ۔ یہ میلے بند کرائیں۔ بڑا گند ہے۔ بہن چود...... آپ اسمبلی میں بیٹھے ہیں۔ کچھ کریں...... کہنے لگے رانا بچے بس دیکھتا جا۔ آگے آگے...... بدی کی...... کوئی مشکل سا لفظ بولے...... ہاں...... بیخ کنی کریں گے...... بیخ کنی۔ بولو بیخ کنی...... بولو...... بیخ کنی...... ہم دونوں چپ رہے۔ اس پر رانے نے زبردست قہقہہ لگایا۔"

"نہیں بولا جاتا نا...... زبان پر نہیں چڑھتا...... پر جب یہ ہوتی ہے بیخ کنی نا بیخ...... بیخ کنی تو...... وہ سب جو...... یہ...... تماشہ...... فلم تھیٹر ہیں...... ہا۔ ہا...... یہ تو سب سے بڑا چود خانہ ہے...... ہے نا......؟"

"ہم پھر بھی کچھ نہ بولے......"

تاریک رات میں پیارے کی آواز ابھرتی تھی تو کبھی کبھی سنانے میں تھانے دار کے لیے دبی دبی گندی گالیوں کی آوازیں بھی گونج کی طرح ابھرتی تھیں اور حیرت انگیز طور پر سکون آور محسوس ہوتی تھیں۔ اب پیارے کے بیان میں ایسے ہی موقع پر اچانک کمال رانجھے کی آواز ابھری۔

"نہ پر ضرور تو نے حرف حرف اس کا سنانا ہے۔ مادر چود کا۔ پاگل کتے کا......"

"میر جانی کہتے ہیں تو نہیں سناتا۔" پیارے نے ناراضگی سے کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد میر مرجان کی بھرائی ہوئی آواز سنانے میں تھرتھرا گئی۔ "سنا پیارے۔

سب سنا۔ سب سنو۔ تمہیں پتہ چلے۔"

اور پھر اچانک پیارے کے دوبارہ کچھ بولنے سے پہلے بے بی کنارا نے اٹھ کر زوردار آواز میں ہانک لگائی۔

"ڈیزل۔ ماسٹر۔ ڈیزل...... جلدی ٹھیک کر بتی...... کوڑھ چل گیا ہے تیرے ہاتھوں پر کیا؟" "لگا۔ ہوا...... ہوں...... وقت لگے گا۔" دور سے ماسٹر یاسین کی آواز آئی۔ "لگا ہوں۔" وہ بُڑ بڑا کر بیٹھ گئی۔ ایک آدھ دبی دبی ہنسی سنائی دی اور پھر ویسا ہی سناٹا اور اندھیرا۔ رات کے دو بجے میلہ تماشائیوں سے خالی ہو چکا تھا اور باہر سے بھی معمول کے ہجوم کا شور اب سنائی نہیں دیتا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اور حلوائیوں کے برتن دھونے کی آوازیں ضرور آتی تھیں۔ پھر پیارے کی آواز آئی۔

"پھر وہ بڑی لہر میں آ گیا۔ جیسے بڑی موج میں ہو۔ کہنے لگا۔ ایک بات بتاؤ تم ماسٹر اور...... مالک صاحب...... یہ جو تمہارے ہیر رانجھا، مرزا صاحباں۔ سسی پنوں تھے یہ...... کیسے لوگ تھے......؟ بولو۔ بولو۔ بتا دو...... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپس میں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ شو اپنا کرو تم...... ایسی کوئی بات نہیں...... بس میرے سوال کا جواب دو...... بولو بولو...... گھبراؤ نہیں......"

اک دم گھر رگھر ر پھٹ پھٹ کی آواز آئی۔ جنریٹر چل پڑا اور بتی آ گئی۔ روشنی نے چند لمحوں کے لیے لوگوں کو چندھیا دیا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے بیشتر کا کھانا ان کے سامنے ویسا کا ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔ جبکہ میں اندھیرے میں اپنی پلیٹیں صاف کر چکا تھا۔ اس پر مجھے کافی شرمندگی سی ہوئی۔ شاید لکی سٹار تھیٹر کے مالک اور بونے کا اس پولیس والے سے مکالمہ میری زندگی سے غیر متعلق تھا۔ میرے دائیں طرف آلتی پالتی مارے بیٹھی انیلا نے بونے کی طرف دیکھا، اس نے میرے چہرے میری آنکھوں میں کیا دیکھا، میں نہیں جانتا لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں نامعلوم خوف اور نفرت کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ پھر میں نے بونے کی طرف دیکھا جو دائرے میں ہماری دائیں طرف فیروز گویے اور صوبہ خان ٹیلی کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس بھرا اور غٹا غٹ کر کے پی گیا۔ پھر گلاس رکھ کر میرے اور انیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اور میں حیران ہوا کہ کیوں اور پھر وہ بولا۔

"پڑھے لکھے مہمان آئے ہوئے ہیں ہمارے۔ ہمارے سر ماتھے پر...... یہ سوال جو اس کتے کے پلے نے پوچھا کہ ہیر رانجھا، مرزا صاحباں، سسی پنوں، سوہنی مہینوال۔ لیلیٰ مجنوں کیسے لوگ تھے......؟ تو سر جی۔ آپ بیٹھے ہیں میڈم جی ہیں...... ہم اس سوال کا کیا جواب دیتے اُسے۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا معاملہ ہے۔ بڑے عالم لوگوں کا اتنا تو ہم ان پڑھ بھی جانتے ہیں۔ میں تھا اور شمشاد ایرانی بھی بس واجبی پڑھا لکھا ہے۔ پر دیکھیں۔ سن کر بتائیں کہ اس نے جواب ٹھیک دیا کہ نہیں؟ شمشاد نے کہا۔

"جناب عالی...... یہ۔ بات۔ تو آپ معاف کریں بڑی عجیب کرتے ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں۔ یہ ہمارے اپنے قصے کہانیاں ہیں۔ ڈرامے ہیں۔ بڑے لوگوں نے لکھے ہیں۔ ہماری...... تاریخ ہے...... پھر اس میں...... بڑی حکمت کی باتیں ہیں۔ معرفت کی باتیں ہوتی ہیں۔ بڑی رمزوالی باتیں ہوتی ہیں۔"

مالک کی یہ بات سن کر رانا پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا...... "رمز کی باتیں...... رمز کی باتیں...... میں بتاؤں تمہیں ان میں کیا رمز ہے۔ اور پھر وہ ہاتھوں سے گندے گندے اشارے کرنے لگا...... یہ ہیں رمز کی باتیں۔ اوئے یہ سارے تمہارے عاشق معشوق زانی مرد تھے۔ کرز مرد تھے اور کھوچل رنیں تھیں ساتھ۔ چالو زنانیاں۔ نالے کی ڈھیلی...... بہن چود...... کہتا ہے رمز کی باتیں ہیں وہ۔ اوئے اوئے یہ دکھاتے ہو...... تم...... زنا کا تھیٹر دکھاتے ہو...... بے کرنیں۔ بہنیں بیٹیاں گھروں سے یاروں کے ساتھ بھاگیں...... ہیں؟ اور پھر اور پھر۔ اس نے پھر وہی گندے گندے اشارے کیے...... اور خوب ہنسا۔ اور ہم سر جھکائے بیٹھے رہے۔"

اچانک ماسٹر یاسین تیز تیز قدم اٹھاتا جنریٹر سے واپس آ گیا اور قہر آلود نظروں سے بے بی کنارا کی طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً اس کا ارادہ اس کو منہ توڑ جواب دینے کا تھا۔ لیکن ماحول کی غیر معمولی گھمبیرتا دیکھ کر سہم سا گیا اور چپ چاپ دائرے میں چھوڑی اپنی خالی جگہ میں واپس بیٹھ گیا اور بریانی کھانے لگا۔ پیارے نے پھر ہماری طرف دیکھا۔

"تو سر جی...... مالک ہمارے شمشاد ایرانی نے اس منحوس کو کوئی غلط جواب تو نہیں دیا۔ کیا جواب دیا۔ میڈم جی...... سیفی صاحب۔ جبار صاحب...... بتائیں کہ اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا......؟"

میں نے اور انیلا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جیسے ہماری زبان گنگ ہو
گئی۔ اور جب ہماری خاموشی تکلیف دہ حد تک طویل ہو گئی تو مزے کی بات یہ کہ ماسٹر
ہمارا کیمرہ مین ہماری مدد کو آیا اور بولا۔

''بالکل پیارا جی۔ بالکل۔ یہی جواب بنتا تھا۔ اعلیٰ جواب دیا...... لعنتی کو۔'' اور پھر
مجھے بالی کی آواز سنائی دی۔

''ٹھیک جواب تو یہ بنتا تھا کہ مار مار کر سور بنا دیتے کتے کو۔'' اس نے پرجوش لہجے
میں کہا اور میں نے دیکھا کہ چھو دلاری تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اور پھر
میں نے بھی اپنے حلق سے آواز نکلتی سنی۔

''بالکل...... آپ کے مالک نے بہت معقول جواب دیا۔ بہت عمدہ جواب دیا
اس شخص کو...... لیکن میرا خیال ہے اس طرح کے لوگوں کے ساتھ بحث کرنا بے کار تھا۔''

''بالکل۔ بالکل...... اللہ آپ کا بھلا کرے۔ یہ بات......'' بونا مطمئن ہو کر بولا۔

''اور میں سمجھ گیا تھا جاتے ہی یہ بات۔ پر وہ مردود بار بار پنگا لیتا تھا۔''

''تو پھر آگے کیا بات ہوئی؟'' تاجی مہینوال نے پوچھا۔ اور ماتھے پر پڑی لٹ کو
مخصوص انداز سے جھٹک کر پیچھے کیا۔

''بس کوئی۔ کسی اپنے...... پتہ نہیں کون...... عالی جاہ۔ حضرت...... کی بات کر
رہا...... کوئی ہے...... ہو گا...... اس کا اوپر کہیں...... بند کر دیں گے۔ وہ سب بند کرا دیں گے۔
سب بند کرا دیں گے۔ وہ بیچ کنی۔''

بند کرو۔ بند کرو۔ سب بند کرو۔ مجھے کچھ یاد آیا اور یقیناً انیلا کو بھی۔ ہم نے ایک
دوسرے کی طرف دیکھا۔

''سارے زانی کھاتے بند کرا دیں گے......'' تھوڑی اُس کی بُڑبُڑ رکی تو میں نے
جرأت کر کے کہا۔ سرکار حکم کر دیتے...... اگر آپ حکم نہیں کرتے۔ تو ٹرک ابھی کھولے نہیں
واپس چلے جاتے ہیں۔ اس پر وہ چونکا۔ نہیں نہیں، کرو۔ پھر اُس نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگا۔
ہاں چلاؤ۔ چلاؤ اپنے شو۔ نذر حسین تمہیں بتا دے گا...... پھر آواز بھی دینے لگا۔ ''نذرے۔
نذرے۔ نذرے'' ایک حوالدار آ گیا اور وہ خود کرسی سے اٹھ کر پتلون اوپر کھینچتا پچھلے دروازے

سے کہیں دفع ہو گیا......''

''اور پھر...... دس ہزار ان کو دیے؟'' نازلی نے پوچھا۔

بونا ہنسا...... ''دس ہزار۔ کیا بات کرتی ہو نازو...... دس ہزار...... پچاس ہزار......
پورے پچاس ہزار......''

''نذرا ہمارے ساتھ آیا۔ مالک کے پاس کیش تھا اس نے دیا۔''

پوری محفل میں۔ ایک مختلف قسم کی سراسیمگی بھری سرگوشیاں پھیل گئیں۔ لوگ اپنے
قریب بیٹھے لوگوں سے بات کرنے لگے۔

''پچاس ہزار۔ تو کمانا پھر کیا ہے؟ کھیہ تے سواہ۔ پٹی ماسٹر صنوبر خان بولا۔

''آ...... میں تو کہتا ہوں۔ قناتیں اکھاڑو۔ اور ابھی چلو۔ ویسے بھی شمشاد وچھوڑا
دے گیا ہے۔ گھروں کو ہی جانا ہے ہم نے۔ میں تو کہتی ہوں یہی بات اُس نے دل کو لگا لی۔
شمشاد نے ورنہ وہ وچھوڑا نہ دیتا ابھی۔'' فرخندہ بلی نے کہا اور پھر اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ
دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر رونے لگی۔ ساتھ بیٹھے معمر ایکٹر سانول نے جو ہیر کے باپ
چوچک کا رول کرتا ہے، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی۔

''نہ۔ نہ۔ فرخو۔ نہ۔'' اور پھر اچانک مرکز میں میر مرجان کے ساتھ بیٹھی انیلا سسی
نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور چاروں طرف گھوم گھوم کر شی۔ شی کی آوازیں نکالنے لگی، سب
نے دیکھا کہ میر مرجان سو چکا ہے۔ اُس کا سانس وقفوں سے جب اس کے بند پوپلے ہونٹوں
سے خارج ہوتا ہے تو اس کے ہونٹ لمحہ بھر کے لیے پُٹ کی آواز سے کھل کر پھر بند ہو جاتے
ہیں۔ پھر کوئی کچھ نہ بولا۔ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ وہیں بیٹھ کر دلجمعی سے کھانے لگے۔ ہم
سب بھی خاموشی سے اٹھے اور اپنے ٹینٹوں کی طرف بڑھے۔ اچانک جبار میرے قریب آیا اور
رازداری سے کہنے لگا۔

''تین سو ستائیس بونوں کی جو لسٹ پیارے نے دی ہے اُن میں سے صرف پندرہ
تھیٹروں سرکسوں تماشوں میں کام کرتے ہیں۔ 20 ہوٹلوں کے دربان ہیں...... گیارہ دفتروں میں
کام کرتے ہیں...... ساٹھ کا ذاتی کاروبار ہے...... اس کی الگ لسٹیں بنانی پڑیں گی، کیا کیا کاروبار
ہے۔ لمبی لسٹ ہے...... لیکن......''

''جی۔ جی...... جی......'' میں نے گھبرا کر کہا۔ اور حیران ہوا کہ اس شخص کو کیا جواب دوں۔ وہ اپنی اُسی دھن میں تھا۔ اور بونے کی وہ خوفناک پولیس مقابلہ کہانی شاید اُس نے سُنی بھی نہیں تھی......

''خیر لسٹ کو ابھی چھوڑیں...... اصل جو نکتہ سامنے آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ان تین سو ستائیس بونوں میں ایک بھی بھکاری نہیں ہے۔ یہ پروفیسر صفدر سلطان کے لیے ریسرچ کا ٹاپک نہیں بنتا کیا؟ بونوں میں بھیک مانگنے کی صلاحیت شاید نہیں پائی جاتی۔ میرا مطلب ہے اس طرح کا......''

''دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اور میرے لہجے کی عدم دلچسپی بھانپ کر وہ بالی اور ماسٹر یاسین کی طرف متوجہ ہو گیا جو جمائیاں لے رہے تھے۔

''بڑا کوئی کتا تھانیدار ہے بھئی......'' بالی نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور پھر وہ تینوں اپنے ٹینٹ میں چلے گئے۔

میں اور انیلا اپنے ٹینٹ میں آئے تو چیف کو ایک بے زار سے انہماک کے عالم میں کوئی کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا۔

''یہ اندھیرا کیوں چھایا رہا؟ تم اتنی دیر وہاں کیا کرتے رہے۔ کھانا ہی کھاتے رہے۔''

میں نے اُسے اندھیرا کیوں چھایا رہا اور اتنی دیر باہر کیا کرتے رہے کے بارے میں صرف بنیادی امور سے آگاہ کیا۔ جنہیں وہ ایک نظر کتاب اور ایک نظر مجھ پر ڈالنے کے شاہانہ انداز میں سنتا رہا۔

''ہوں۔ عجیب بات ہے'' اُس نے کتاب دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا لکھا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''لکھا نہیں...... جو تم نے بتایا ہے، اس پر کہہ رہا ہوں۔ پولیس والوں نے اب ایسے درس دینے شروع کر دیے ہیں...... یہ بدمعاشی ہے...... جیسے وہ تینوں پولیس والے آج behave کر رہے تھے......''

''میں نے بڑی مشکل سے بالی کو روکا......'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ اُسے قابو میں رکھو...... تم لوگ ہی رکھ سکتے ہو۔'' چیف نے ایک نظر کتاب

سے ہٹا کر میری اور انیلا کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں کہا۔ انیلا خاموش بظاہر کسی گہری سوچ میں چارپائی پر لیٹ گئی تھی۔ جب ہم لوگ یہاں آئے تھے تو اسے ایک الگ ٹینٹ کی پیشکش کی گئی لیکن اُس نے اس مشترکہ انتظام کو ہی پسند کیا۔ ٹینٹ میں یہاں چارپائیوں کے سرہانے کی طرف ایک بلب روشن تھا جو بے نیند رات میں مطالعے اور ہر قسم کی تحریری سرگرمیوں کے امکان کو بھی روشن کر رہا تھا۔ میں نے اپنی گھسیٹا کاپی پکڑی۔ اور کچھ مبہمانہ انداز میں شروع کی گئی اپنی گھسیٹا کاری کو آگے شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

انیلا ہماری باتوں میں شریک ہونے کی بجائے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے چارپائی کے ساتھ نیچے رکھے بیگ میں سے اپنا کاغذوں کا فولڈر نکالا اور اُسے تکیے پر رکھ کر بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور پھر قلم کاغذ پر اتار لے گئی۔ میں نے پہلی دفعہ اُسے لکھتے دیکھا تھا۔ میں دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد میرے چہرے پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اچانک کبھی کبھی غیر محسوس سے انداز میں آگے پیچھے ہلنے لگتی ہے۔ جیسے بعض چھوٹے بچے سبق یاد کرتے وقت کرتے ہیں۔ پھر میں نے تیزی سے اپنی نظریں اُس پر سے ہٹا لیں۔ 'غیر عورت' کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا کوئی شرافت نہیں تھی۔ لیکن میرے دل نے شدت سے خواہش کی کہ کاش چیف وہاں سے کہیں دفع ہو جائے۔ لیکن ایسا کچھ ہونے کی بجائے مجھے چیف کی آواز سنائی دی۔

''یار میں یہ fucking فقرہ پڑھ پڑھ کر sick ہو گیا ہوں۔''

''کیا......'' میں نے اخلاقاً پوچھا۔

''وہی...... حقیقت افسانے سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ خاک ہوتی ہے۔ حقیقت سے زیادہ dull...... غیر دلچسپ چیز اور کوئی ہے ہی نہیں...... اگر ایسا ہے تو ریلسٹ سینما کرو۔ سرریلیزم۔ میں جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ فرانسوا دی دی اے کی کتاب ہے حقیقت۔ غیر حقیقت اور ماورائے حقیقت۔ بیسویں صدی کے سینما میں۔''

''اچھا۔ اچھا۔''

لوئی بیونل اور ہاس واؤچیک کو اس نے بھرپور ڈسکس کیا ہے۔ خاص طور پر کچھ سینز
”کون سے۔“ میں نے اب واقعی گھسینا شروع کر دیا۔ کیونکہ محسوس ہو رہا تھا کہ
چیف جان بوجھ کر مداخلت کر رہا ہے۔ میں نے کنکھیوں سے انیلا کی طرف دیکھا وہ اپنے کام
میں مگن تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا......

”یار۔ وہ...... ایک تو وہی...... پیانوں پر لدے گدھوں کی لاشیں۔ پادری۔ پھر وہ
کریکٹر۔ ہتھیلی میں بڑے سوراخ سے نکلتے کالے مکوڑے...... لوئی بیونل...... اور ادھر
سینی ٹوریم میں...... بیانکا کے جنگل بیڈروم میں اندھے ٹکٹ کولیکٹر کا وقت کے بوسیدہ دھاروں پر
مکالمہ۔ ایڈلا...... کے ہاتھ میں کسی عورت کا کٹا ہوا سر......“

”میرا خیال ہے وہی باقی ماندہ سرکٹی عورت ادھر ہمارے میلے کی دنیا کے عجوبے شو
میں آ گئی ہے۔“ میں نے کاپی ایک طرف ہٹا کر کہا ”اور جو شاید ابھی ہم نے دیکھنا ہے......“
چیف ہنس پڑا۔ ”freak show آئی ڈونٹ نو......“ اُس نے کہا اور مجھے کچھ
اندازہ نہ ہوا کہ وہ میری بات پر ہنسا ہے یا میری گھسیٹا کاری بند کرانے میں اپنی کامیابی پر ہنسا
ہے۔ اب وہ میری پوری توجہ حاصل کر کے بات کرنے لگا۔

”تم لوگ تو ادھر تھیٹر میں گھسے رہے ہو۔ ہم نے باہر کچھ کام کیا ہے۔ یہ لیکن ظاہر
ہے تم نے ہی لکھنا ہوگا۔“ اُس نے اب اپنی تنقیدی نظروں میں انیلا کو بھی شامل کیا جس کے
انہماک میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

”کیا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم لوگ سورج مکھی کے پھولوں سے...... بلکہ کھیتوں سے شروع کریں گے۔ میں
نے ماسٹر کو سمجھا دیا ہے...... اور اس کا اسسٹنٹ وہ تمہارا fan بالی بھی سمجھ گیا ہے۔ کام دیے
جاتا ہے...... خیر۔ تو ہم...... سورج مکھی کے کھیت میں کیمرہ داخل کریں گے...... یہ عجب
سورج مکھی کے پودے ہیں، انسان کے قد سے بھی اونچے۔ تو...... کیمرہ......“

”Camera as character۔“

”In a way“

”ہوں۔ ٹھیک داخل ہو گیا Camera۔“

”تو اس زرد پھولوں کی deep space سے گزرتے ہوئے ہم یک دم باہر
نکلتے ہیں۔“

”ہم سے مراد Camera ہے؟“

”Exactly۔“

تو یک دم سامنے بھرپور میلہ نظر آتا ہے۔

”یہ اچھا ہے چیف“ میں نے بے ساختہ تعریف کی اور ایک نظر پھر انیلا کی طرف
دیکھا۔ پھر میں نے منہ سے سی کی آواز نکالی اور انگوٹھے سے انیلا کی طرف اشارہ کیا۔ چیف
مزید تعریف کے یوں خاتمے پر کافی بور سا ہوا لیکن میں نے مٹھی بند کر کے اسی انگوٹھے سے
روایتی بہت اعلیٰ کا اشارہ کیا تو کھل اٹھا اور وہ کافی دھیمی آواز میں انیلا کو ڈسٹرب نہ کرنے کے
بھرپور خیال کے ساتھ کہنے لگا۔

”ویسے اگر تم سمجھتے ہو کہ ہماری وجہ سے ان تھیٹر والوں کو کوئی پرابلم ہوگی۔ پولیس
وغیرہ...... یونو...... جو تم نے بتایا...... Bull shit...... تو ہم کل دوپہر تک نکل جاتے ہیں۔
تھیٹر نہیں دیکھتے...... ہمارا کام تو اصل میں یہاں ہو چکا ہے۔ جو ضروری دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔“

”ہرگز نہیں۔“ یک دم انیلا کی کڑاکے دار آواز آئی اور میرے علاوہ یقیناً چیف بھی
دہل گیا۔

”میں نے انیلا کا شو دیکھنا ہے۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا ہوا ہے۔“ اُس نے
بات مکمل کی۔

چیف کا منہ حیرت سے سکڑ گیا۔ ”انیلا کا شو! انیلا۔ وٹ......؟“

”وہ انیلا سسی۔ اُس ایکٹرس کا نام بھی انیلا ہے۔ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔“

”اوہو۔ سسی پنوں۔“ اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر کندھے اچکانے
کی کوشش کی جو تکیے میں دھنس کر ناکام رہی۔ ”ٹھیک ہے...... دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے تمہارا وہ
Stage behind the stage or non-stage کا آئیڈیا اچھا ہے۔“

”تھینک یو۔“ انیلا نے کہا اور پھر اپنے فولڈر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ویسے بھی سیفی“ چیف نے ایک بار پھر دھیمی آواز میں کہا۔ ہمارا ان لوگوں کے

جھگڑے سے کیا تعلق، ہم تو تماشائی ہیں......"

"ہاں...... خود تماشہ کرنے والے تماشائی......" میں نے بھی جان بوجھ کر بہت ہی دھیمی آواز میں کہا اور پھر اپنی بے چاری گھسیٹا کاپی پکڑی۔ اور بہت ضبط کیا اور انیلا سے نہ کہا۔ "تمہارے کان تو ادھر ہیں تم کام کیا کر رہی ہو۔" مگر کچھ کام تو وہ کر رہی تھی۔ اس کا قلم بھاگ رہا تھا۔

....

(18)

دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دوئیروں والا کھوتا دیکھو

(انیلا)

کلوز اپ۔ جان کے چہرے پر ایک سخت گیری مسکراہٹ۔ سر اور انگشت شہادت دونوں انکار میں ہلا رہا ہے۔ Zoom out

جان۔ جبار اور سیفی میلہ بھاگاں والا میں ایک جگہ کھڑے ہیں۔ جبار کافی بوکھلایا ہوا لگتا ہے۔ جبکہ سیفی کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ہے۔ مختلف فاصلوں پر چلتے چلتے یا رُک کر لوگ انہیں اور خاص طور پر جان کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں۔

جان: "نہیں۔ نہیں۔ مسٹر جبار...... مسٹر سیف آئی گینز بک آف ریکارڈز دنیا کی چند اہم ترین کتابوں میں ہے۔ ریکارڈز ایک انتہائی نازک اور اہم معاملہ ہے۔ اسے مذاق نہ بناؤ پلیز۔ اب تمہارا claim ہے کہ یہ دنیا کا سب سے سخت ٹوتھ برش ہے (جبار کے ہاتھ میں پکڑی ایک مسواک کی طرف اشارہ کرتا ہے) لیکن یہ محض ایک درخت کی ٹہنی ہے۔ کاٹی ہوئی۔"

(کچھ بچے جیسے مسلسل جان کو بھی میلے کے ایک تماشے کے طور پر دیکھنے کے لیے ساتھ ساتھ ہیں اور سیفی اور جبار کے قریب آن کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک بچہ جبار کی ٹانگوں سے الجھ جاتا ہے اور جبار گرنے لگتا ہے۔ جبار طیش میں آ کر مسواک لے کر بچوں پر پل پڑتا ہے اور ان کے سروں پر مسواک سے ضربیں لگانے لگتا ہے۔ بچے بھاگ جاتے ہیں۔ جان قہقہے لگاتا ہے)

جان: ''بچوں کو مت مارو جَیب ...... میں تمہیں جَیب کہہ لوں ......؟''

جبار: (بے زاری سے) ''جو مرضی کہہ لو۔''

جان: ''گڈ ...... تو جَیب ...... یہ تو دیکھو کہ تمہاری قوم دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپی سے بلکہ حیرانی سے گورے بندے کو دیکھنے والی قوم ہے۔ حالانکہ گورا ادھر تین سو سال تم پر حکومت کر کے گیا ہے (سیفی کی طرف دیکھتا ہے) ایسا ہی ہے مسٹر سیف آئی — کبھی کبھی تم مجھے شکل سے مورخ لگتے ہو۔''

کٹ

بچے پھر آہستہ آہستہ تینوں کے قریب کھسکنے لگتے ہیں اب اُن میں ایک دو بڑے بچے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ قریب آ جاتے ہیں۔

مڈشاٹ: جان دونوں کانوں میں انگوٹھے رکھ کر ہاتھ پھڑ پھڑا کر زبان نکال کر انہیں دکھاتا ہے۔ بچے خوب ہنستے ہیں۔ سیفی برا سا منہ بناتا ہے۔

سیفی: ''دیکھو جان۔ ہم ایک سچوایشن میں ہیں۔ یہ میلہ ...... جیسا کہ تم جانتے ہو کباڑ کمپلیکس کا بھاگاں والا chapter ہے۔''

جبار: (ماتھا پیٹتے ہوئے) ''Chapter ...... یار ...... خدا کے لیے یہ کوئی کتاب تو نہیں ہے ......''

جان ہنس پڑتا ہے۔

جان: ''جَیب کیا اس شخص کو کباڑ کمپلیکس کی نمائندگی کے اختیارات مل گئے ہیں۔ اگر ایسا ہو چکا ہے تو میں اس سے بات کروں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میلے کی پیچیدہ صورت حال سے نپٹنے میں ناکام ہو رہے ہو۔ تم نے ابھی تک صرف دنیا کی سب سے بڑی روٹی اور سب سے ٹیڑھی میڑھی مٹھائی کے کلیم جمع کرائے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تم ایک اعلیٰ پائے کے collector ضرور ہو۔ لیکن جب سب سے لمبا، سب سے چھوٹا، سب سے موٹا سب سے پتلا، سب سے اونچا، سب سے نیچا، سب سے پہلے، سب سے آخر وغیرہ وغیرہ کا کام آتا ہے تو تم بوکھلا جاتے ہو ...... اور ہاں — ایک اور ...... ایک اور بات ...... ''دنیا میں صرف ایک ہی ......'' ''جیسا دنیا میں اور

کوئی نہیں ......'' ''کبھی نہیں۔ کہیں نہیں ......'' ایسے کسی ریکارڈ کا کلیم تو تم نے کبھی پیش کیا ہی نہیں۔ اور ...... جَیب جلدی کرو ...... میرے پاس وقت کم ہے۔ گینز بک کا اگلا ایڈیشن چھپنے کا وقت خطرناک حد تک قریب آ چکا ہے۔ اور میں یہاں تمہارے جلیبا ئز کھا رہا ہوں ...... بائی دا وے یہ مجھے ایک پاؤنڈ اور مل سکتی ہیں ابھی ...... یہ ایک جہنمی میٹھی مٹھائی ہے۔ لگتا ہے شوگر منہ کے رستے سے ہی نہیں میری arse کے رستے بھی اندر جا رہی ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔''

جبار: ''ابھی لو گے یا بعد میں ...... میں نے ہوپ کے لیے بھی دس کلو لے کر جانی ہیں۔''

جان: (مسکراتا ہے) ''ہوپ ...... آہ ...... ہوپ ...... تمہارا عظیم الشان کتا ...... اگر تم اس کا وزن پندرہ کلو اور بڑھا دو تو وہ دنیا کا سب سے موٹا۔ وزنی کتا ہونے کا ریکارڈ قائم کر سکتا ہے۔ اس وقت یہ ریکارڈ کیلے فورنیا کے بل ڈاگ ڈوگو کا ہے ...... لیکن میرے خدا جلدی کرو ...... جَیب، سیف آئی مجھے تین دن بعد انڈونیشیا پہنچنا ہے۔ جہاں ایک تو وہی ایشیا کی سب سے چوڑی نرسری کا ریکارڈ ہے جو چیلنج ہو گیا ہے۔ دنیا کی سب سے چھوٹی قینچی۔ سب سے اونچا نلکا ...... اور۔ اور ...... (جیب سے اپنی نوٹ بک نکال کر دیکھتا ہے) ہاں۔ کچھ پرفارمنس ریکارڈ ہیں۔ تیس بلب توڑ کر کھائے گا ...... چھ گیلن پٹرول منہ کے رستے باہر جلا کر دکھائے گا۔ بیئر کے ڈیڑھ سو گلاس ......''

(ایک دم سیفی بے تابی سے جان کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے)

سیفی: ''ایک منٹ جان ...... ایک منٹ۔ پلیز ...... یہ پرفارمنس کے کلیم تو ہم ابھی تمہیں ابھی ادھر دکھانے والے ہیں ...... ایک ادھر ہمارے Freak Show میں۔''

جان: ''آہ ...... I love freak shows ...... دکھاؤ۔ دکھاؤ ...... لیکن ...... پہلے کباڑ کمپلیکس کی نمائندگی کا فیصلہ کرو۔''

کٹ

بچوں اور چند بڑوں کا ایک گروپ پھر کچھ فاصلے پر کھڑا جان کو دیکھ رہا ہے۔ جان اُن کی طرف بڑھتا ہے۔ سیفی اور جبار آپس میں گفتگو شروع کرتے ہیں۔ جان دونوں کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

جان: ''hurry up...... جُیب فیصلہ کرواتی دیر میں بچوں کے ساتھ نرسری رائیم گا کے جا رہا ہوں۔''

کٹ

بچے جان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ہنستے ہیں۔ جان پھر مسخروں جیسے منہ بناتا ہے۔ بچے اور بھی ہنستے ہیں۔

کٹ

مڈ شاٹ: سیفی اور جبار میں گفتگو بہت سنجیدہ اور دلائل دینے کے انداز میں شروع ہوتی ہے۔

جبار: ''دیکھو سیفی صاحب......'' (اور اس کے ساتھ audio distortion شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے آڈیو کیسٹ فاسٹ فارورڈ کی جائے)

کٹ

جان اور بچے نرسری رائیم گا رہے ہیں۔ اور ٹیبلو کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

Ba Ba Black Sheep

Have You Any Wool

بچے اشارے سے جان سے پوچھتے ہیں۔ چند ایک کالی بھیڑ کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔

کٹ

سیفی اور جبار کی گفتگو اسی distorted audio میں جبار کا تقریر کرنے کا انداز۔ سیفی ہوا میں مکے لہرانے لگتا ہے۔

کٹ

جان کے ساتھ بچوں کا ٹیبلو جاری ہے۔

جان کی بھاری آواز۔

Yes Sir Yes Sir

Three Bags Full

ایک بچہ اون کے تین تھیلے ایک ایک کر کے نیچے رکھتا ہے۔

کٹ

سیفی اور جبار میں اُسی انداز میں مکالمہ زور شور سے جاری۔

کٹ

ٹیبلو۔ جان

One for the Master

(ایک بچے کی طرف اشارہ اور وہ تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماسٹر بننے کا انداز اختیار کرتا ہے۔ جان ہنستا ہے۔

کٹ

جبار سیفی کے سامنے زور زور سے اقرار میں سر ہلا رہا ہے۔ سیفی زمین سے ایک گندا سا کاغذ اٹھا کر اُسے جھاڑتا ہے اور پھر جیب سے ایک پین نکال کر دونوں چیزیں جبار کی طرف بڑھاتا ہے۔

کٹ

جان

One For The Dame

ایک بچہ ناک پر انگلی رکھتا ہے۔ جان ہنستا ہے۔

One For The Little Boy

Who Lives Down The Lane

جان اور بچے مڑ کر بازو لمبا پھیلا کر دور ایک طرف اشارہ کرتے ہیں۔

کٹ

سیفی گھوم کر کھڑا ہے اور جبار اُس کے کندھے پر کاغذ رکھے تیزی سے لکھ رہا ہے۔ پھر دستخط کرتا ہے۔ اور سیفی کو سر سے پکڑ کر اپنی طرف گھماتا ہے۔ جان ہنستا ہوا آتا ہے۔ سیفی اک دم سے بہت بدلا ہوا انسان نظر آنے لگتا ہے۔ گھومنے کے دوران ہی اب اس کے جسم پر ایک تھری پیس سوٹ نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتا ہے۔ اور کاغذ جان کی طرف بڑھاتا ہے۔

سیفی: ''مسٹر شیکسپیئر نے مجھے کباڑ کمپلیکس کے ترجمان کے طور پر اپوائنٹ کیا گیا ہے یہ میرا لیٹر ہے۔''

جان کاغذ لیتا ہے۔ آنکھیں اچکا اچکا کر پڑھتا ہے۔

جان: ''یہ ایک عمدہ دستاویز ہے۔ مگر مجھے اس پر تمہارے کمپلیکس ادارے کی مہر درکار ہوگی......''

جبار جیب سے ایک گول پیتل کی مہر نکالتا ہے۔ جان سے کاغذ لیتا ہے چند لمحے ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ جیسے کاغذ کسی جگہ رکھنے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر تیزی سے کاغذ سیفی کے ماتھے پر رکھ کر زور سے مہر لگاتا ہے۔ سیفی کی چیخ نکلتی ہے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتا ہے۔ جبار کاغذ پھر جان کے حوالے کرتا ہے۔ جان کاغذ پر ایک نظر ڈال کر اُسے احتیاط سے تہہ کرتا ہے، کندھے سے اپنا بھاری بیگ اتارتا ہے۔ زمین پر رکھتا ہے، کھولتا ہے، اندر سے ایک پیچیدہ سا فولڈر نکالتا ہے جس پر ایک گلوب کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ جان کاغذ کو فولڈر کے اندر ایک جگہ رکھتا ہے۔ پھر بیگ بند کرتا ہے۔ جان سیفی کی طرف دیکھ کر طنزیہ سے انداز میں مسکراتا ہے اور اُسے آنکھ مارتا ہے۔

''ہیلو...... lover boy ...... اب میرے لیے یہاں کیا ہے۔ تم اب اپنے کباڑ کمپلیکس کے مکمل سرکاری ترجمان ہو۔ تمہارا لفظ میرے لیے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب سے۔''

جبار: (غصے سے) ''ایسا کچھ نہیں۔ اسے صرف تمہیں یہ میلہ دکھانے...... اور جو جو ریکارڈ بنتے ہیں، ان کے کیس درج کرانے کا کام دیا گیا ہے کیونکہ یہ دلیلیں اچھی طرح دے لیتا ہے۔ سیفی چلو پہلے دنیا کے ہمارے عجوبے دکھاؤ جان کو...... اور اسے ثابت کرو کہ ہمارے پاس دنیا کے سب سے بڑے عجوبے ہیں...... چلو۔ چلو...... میں تم سے کہہ رہا ہوں۔''

سیفی کڑی نظروں سے جبار کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر جان پر نظر پڑتے ہی چہرہ بجر کھل اُٹھتا ہے۔ آگے جھکتے ہوئے تیزی سے اُس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

سیفی: ''مسٹر شیکسپیئر...... آہ...... دنیا کے ان حصوں میں تمہیں دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی ہے۔''

جان: ''call me John پلیز...... خوشی میری ہے۔ میرا خیال ہے اب ریکارڈز تمہارے۔ اور جلدی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن میرے پاس وقت کم ہے۔''

جان اپنے بیگ کے بکل بند کر کے اٹھانے لگتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ بیگ خاصا بھاری ہے۔ سیفی پھر جبار کی طرف دیکھتا ہے اور اُسے اشارہ کرتا ہے۔

سیفی: ''اے...... ش...... شش...... ہشت...... کم آن......''

جبار حیران رہ جاتا ہے۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ شاید سیفی نے اُس کے پیچھے کھڑے کسی شخص کو مخاطب کیا ہے۔

سیفی: ''کم آن بوائے...... مسٹر شیکسپیئر کا baggage...... اُٹھاؤ۔''

جبار اُنگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے پھر پوچھتا ہے کہ کیا اُسے ہی مخاطب کیا جا رہا ہے۔

سیفی: ''yes بوائے۔ Dont be an idiot...... اسے carry کرو...... مسٹر شیکسپیئر آئیں پلیز...... ہم freak show دیکھیں گے۔ اسے چھوڑ دیں۔ وہ لے آئے گا......''

جان ہچکچاتے ہوئے بیگ وہیں چھوڑ دیتا ہے۔ سیفی کے ساتھ چلنے لگتا ہے۔ جبار ہونقوں کی طرح منہ کھولے وہیں کھڑا ہے۔ جیسے دماغ مکمل طور پر ماؤف ہو چکا ہو۔ اور فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ بیگ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ جان اور سیفی کی طرف دیکھتا ہے جو کچھ دور جا چکے ہیں۔ تیزی سے ان کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر رُکتا ہے اور پیچھے کو بھاگتا ہے۔ بیگ کے پاس رُکتا ہے اٹھانے کو ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن پھر رُک جاتا ہے۔ انکار میں سر ہلاتا ہے اور پھر سیفی اور جان کی طرف دیکھتا ہے جو اب اور بھی دور جا چکے ہیں۔ پھر ان کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن آدھے رستے میں پھر رُک جاتا ہے۔

کٹ

ایک لمبوترا سا مشکوک شکل وصورت کا آدمی جان کا بیگ اٹھا لیتا ہے۔

کٹ

ڈشاٹ: جبار کی نظر مشکوک آدمی پر پڑتی ہے۔ چہرے پر شدید پریشانی اور افراتفری کے تاثرات۔ آدمی کی طرف بھاگ اٹھتا ہے۔

کٹ

سین: جان اور سیفی۔

لانگ شاٹ: ایک جگہ رک جاتے ہیں اور مڑ کر اُس جانب دیکھتے ہیں جدھر بیگ چھوڑا گیا تھا۔ دور جبار بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔

ٹوشاٹ: جان جیب سے دو لمبے سگار نکالتا ہے۔ ایک سیفی کو دیتا ہے اور دوسرا خود لیتا ہے۔ ماچس نکالتا ہے اپنا سگار سلگاتا ہے۔ دھوئیں کے بادل اڑتے ہیں۔ سیفی اس انتظار میں ہے کہ وہ اس کا سگار سلگوائے گا لیکن وہ جلتی ہوئی دیا سلائی پھینک دیتا ہے۔ دیا سلائی پاس سے گزرتے ایک گداگر کے اوپر گرتی ہے اور اس کی گدڑی آگ پکڑ لیتی ہے، گداگر چیخنے لگتا ہے۔ جان دیکھتا ہے کہ سیفی سگار ہاتھ میں لیے انتظار کر رہا ہے۔

جان: ''او۔ ساری......''

تیزی سے ماچس کی ڈبیا کھول کر دیا سلائی نکالنا چاہتا ہے لیکن ڈبیا خالی ہے۔ خالی ماچس سیفی کو دکھاتا ہے۔

سیفی: ''او۔ نو پرابلم......''

سیفی تیزی سے گداگر کی جلتی ہوئی گدڑی اتارتا ہے اور ہاتھ کی چٹکی میں دبا کر ایک فاصلے پر رکھتے ہوئے شعلوں سے سگار سلگاتا ہے۔ گداگر دعائیں دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔

جان: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گداگر بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں۔''

سیفی: ''ہوں...... ہاں...... ایک سطح پر...... یہ قرینِ قیاس...... ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے مسٹر شیکسپیئر...... لیکن یہ اتنا آسان نہیں۔''

جان پھر اک دم پریشان ہو کر اسی سمت دیکھنے لگتا ہے۔ جدھر سے دونوں آئے ہیں۔

Pan میلے کی سرگرمیاں عروج پر نظر آتی ہیں۔

کٹ

سین

جبار لبوترے مشکوک آدمی کو جھپٹ کر پیچھے کالر سے پکڑ لیتا ہے۔ اور اُس کے ہاتھ میں پکڑے بیگ پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔

جبار: ''چور۔ اٹھائی گیرے...... بدمعاش۔ میرا بیگ چُرا رہا ہے...... چھوڑ۔''

مشکوک آدمی: ''ہٹ۔ ہٹ...... ہاتھ نہ لگانا...... یہ سرکاری بیگ ہے۔''

جبار: ''تیری سرکاری کی...... ایسی تیسی۔ چھوڑ......''

مشکوک آدمی: ہٹ۔ ہٹ...... میں کہتا ہوں۔ مارا جائے گا...... سرکاری بیگ ہے۔''

جبار کو دھکا دیتا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں

کٹ

جان جو بدستور اُدھر ہی دیکھ رہا ہے۔ اپنی نظریں پھر سیفی پر لاتا ہے۔ جان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات اور بھی نمایاں ہیں۔ سیفی ایک گہرے تنفر آمیز انداز میں چاروں طرف جاری میلے کی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا ہے۔

جان: ''ہاں تو تم کہہ رہے تھے dandy boy...... یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا کتنا آسان نہیں ہے...... (زیرِ لب) ''او۔ میرے بے چارے ریکارڈز......''

سیفی: ''ان لوگوں کے بارے میں (چاروں طرف دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتا ہے) ان لوگوں کے بارے میں کوئی رائے دینا آسان نہیں۔ لیکن یہ بہت آسان ہے۔ یہ انتہائی نا قابلِ اعتبار لوگ ہیں۔''

جان: ''کیا تم ان لوگوں میں جَیب کو بھی شامل کرو گے۔''

سیفی: ''سو فیصد۔ جبار اور ارشاد دونوں...... تم ریکارڈز کی بات کرتے ہو جان...... میں کہتا ہوں پہلے ریکارڈز کی درستگی کی بات کرو۔''

جان: (گھڑی دیکھتے ہوئے) ''ریکارڈز کی درستگی؟ What the hell is that......''

سیفی: ''تمہیں پتہ ہے مسٹر شیکسپیئر۔ (کوئی بڑا انکشاف کرنے کا پُراسرار لہجہ اپنا لیتا ہے)

کباڑ کمپلیکس کا اصل مالک کون ہے؟

جان: ''ظاہر ہے۔ ارشاد اور جیب۔''

سیفی: ''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہی تو سب سے بڑی تاریخی غلطی ہے۔ کباڑ کمپلیکس کا اصل مالک میں ہوں۔ اور جمع کرنے کے جتنے بھی ریکارڈز ادھر بنے ہیں وہ درحقیقت میرے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ارشاد، جبار میرے ملازم ہیں لیکن اب یہ اس پر قابض ہو کر گینز بک میں اپنا نام درج کرانا چاہتے ہیں۔ انتہائی دغا باز لوگ ہیں۔ فریبی۔ انتہائی ناقابل اعتماد۔'' جان بری طرح بوکھلا جاتا ہے۔

جان: ''او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... اب تو مجھے یقین ہے جیب میرا بیگ لے اڑا...... میں برباد ہو گیا...... اس بیگ میں۔ دنیا بھر کے انتہائی اہم ریکارڈز ہیں۔ مقدس راز ہیں۔ خوفناک راز ہیں۔ او گاڈ...... گینز بک کا نیا ایڈیشن اب کبھی نہیں چھپ سکے گا۔ او ہو اور۔''

سیفی ہنستا ہے۔ بڑھ کر جان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتا ہے۔

سیفی: ''کم آن...... مسٹر شیکسپیئر...... گھبراؤ نہیں...... تمہارا بیگ...... محفوظ ہے۔ تمہیں واپس ملے گا۔ وہ واپس لائے گا...... جبار ایک انتہائی قابل اعتبار ایمان دار اور وفادار آدمی ہے...... وہ جان پر کھیل جائے گا لیکن تمہارے بیگ پر آنچ نہیں آنے دے گا......''

جان کا منہ حیرت سے کھل جاتا ہے منہ سے آ۔ آ۔ آ۔ کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔

جان: ''آ...... تت...... یہ۔ تم...... ابھی تو تم نے کہا تھا۔ وہ دغا باز ہے جیب...... کیا۔ کیا میں...... خواب دیکھ رہا ہوں...... چٹ...... چٹکی اِدھر کاٹو...... پلیز...... ادھر چٹکی کاٹو......''

جان اپنی بائیں کلائی اس کے سامنے رکھتا ہے۔ سیفی زبردست چٹکی کاٹتا ہے۔ جان کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلتی ہے۔

سیفی: ''اب تمہیں یقین آ گیا ہو گا کہ تم خواب نہیں دیکھ رہے۔ جان۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا، کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے...... کباڑ کمپلیکس کے اپنے قوانین فطرت ہیں۔

لیکن اب آؤ ہم چلیں دیکھیں...... جیب کا کیا مسئلہ ہے؟''

کٹ

مڈ شاٹ: میلے میں ایک جگہ۔ جبار اور مشکوک لمبوترا زخمی مرغوں کی طرح لڑ رہے ہیں بیگ درمیان میں پڑا ہے۔ لڑائی کے دوران دونوں بیگ پر جھپٹ کر اُسے اُڑا لے جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی بھی کامیاب نہیں ہو پاتا۔

کٹ

(مڈ شاٹ)

ایک باریش تھانیدار اور چند سپاہی بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں۔

کٹ

جان بھاگتا ہوا اور سیفی اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا اس جگہ آتے ہیں جہاں جبار اور لمبوترے میں لڑائی جاری ہے۔

جان: ''جیب۔ جیب۔ what the hell is going on۔''

سیفی: ''Take it easy John...... یہ اتنا آسان نہیں ہے...... مداخلت نہ کرو...... ہمارے اپنے طریقے ہیں۔''

جان رُک جاتا ہے۔

اچانک باریش تھانیدار اور تین سپاہی بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔

تھانیدار: ''خبردار۔''

جبار اور لمبوترے کی لڑائی رُک جاتی ہے۔ تھانیدار جان اور سیفی کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے پھر تیزی سے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی کنگھی نکالتا ہے اور اپنی لمبی داڑھی میں پھیرنا شروع کر دیتا ہے۔

کٹ

لانگ شاٹ: میلے میں تھیٹر کی لوکیشن (slow zoom in)

فیروز گویا گا رہا ہے۔ جانی ہیجڑہ ناچ رہا ہے۔ اور بونا میگافون میں اناؤنسمنٹ کر رہا ہے۔

بونا: ''صاحبان۔ قدردان۔ مہربان۔ سسی پنوں۔ سسی پنوں۔ آج کا کھیل۔ آج کا

ڈرامہ۔ آج کا تھیٹر...... دیکھیے۔ دیکھیے۔ دیکھیے۔ سسی پنوں۔"

کٹ

تماشائی ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ دھکم پیل۔

کٹ

بونا: "پہلے آیئے۔ پہلے پایئے۔ ٹکٹیں ختم ہونے والی ہیں۔ مہربان۔ سسی پنوں۔ سسی پنوں......"

گویئے کے گانے کی آواز۔ چند تماشائی سٹینڈ کے نیچے کھڑے ہیجڑے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ ایک تماشائی منہ میں انگلیاں ڈال کر تیز سیٹی بجا رہا ہے۔ ہیجڑہ آنکھ مارتا ہے۔

Zoom out۔ مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے پولیس والے۔

ایک مٹھائی والے کی دوکان کے نیچے چھپا ہوا پولیس والا ایک دوربین سے تھیٹر کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا ہے۔

ایک پولیس والا دودھ ابالنے کے بڑے خالی کڑاؤ میں بیٹھا ہے۔ اوپر بوری ڈالی ہوئی ہے۔

ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا۔ ایک درخت کے اوپر چڑھا ہوا۔

ایک برقعہ پہن کر پھرتا ہوا۔

ایک وردی کے اوپر ایک گداگر کا چوغا پہنے ہوئے گداگر کے بھیس میں۔

سب تھیٹر کے تماشائیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

کٹ

تھانیدار بدستور داڑھی میں کنگھی کر رہا ہے۔ آنکھیں جیسے گہرے سکون کی حالت میں ہیں۔ جیسے وہیں کھڑے کھڑے سو جائے گا۔

جان اور سیفی سگار پیتے مسلسل اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

مشکوک لبوتر ا اور بہار ایک طرف کھڑے ایک کٹے ہوئے پھل بیچنے والے سے پلیٹوں میں پھل ڈلوا رہے ہیں۔ پھر کانٹوں سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ منہ چلاتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"کیا یہ کنگھی خواب آور ہے۔ (یک دم ہنسنے لگتا ہے) ...... مجھے پروفیسر کا وہ جلد کو آرام پہنچانے والا خارشی آلہ یاد آ گیا......"

جان: "آ...... آہ...... ہا...... اچھا ہوا تمہیں یاد آ گیا...... یہ ریکارڈ بھی درست کر و مائی

سیفی: ڈیئر مسٹر شیکسپیئر وہ کمری خارشی آلہ۔ جناتی بجلی کے چراغ۔ اور آدم خور درخت کی جڑوں کا عرق۔ سائنس کی ان حیرت انگیز ایجادات کی تھیوری بھی میں نے ہی پروفیسر کو دی تھی...... پورا ڈیزائن بنا کر دیا...... پروفیسر صرف مکینک ہے ریکارڈ...... درست کر لو۔"

جان: (عاجز آ کر) "مجھے میرا بیگ ملے تو میں دستاویزات میں ریکارڈز کی درستی کروں...... یہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہے۔ پولیس آفیسر داڑھی میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا ہے۔ جیب...... کدھر ہے جیب؟ (دیکھتا ہے) ہاں جیب کٹے ہوئے پھل کھا رہا ہے اور اُس کا دشمن بھی......"

سیفی: "نہیں۔ وہ دشمن نہیں......" (چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے پھر جان کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ جان کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں)۔

جان: "......Really!?"

سیفی: "بالکل...... اُس نے میرے آتے ہی خفیہ اشارے سے اپنی شناخت کرا دی تھی...... تمہارا بیگ تمہیں مل جائے گا لیکن اسی تھانیدار کے ذریعے......"

جان: "اوہ Freak show بھی رہ گیا......"

کٹ

مڈشاٹ: میڈم پونم ایک بوتل سے پیٹرول منہ میں بھرتی ہے۔ بوتل دور کھڑے ایک شخص کو پکڑاتی ہے۔ منہ پونچھتی ہے۔ پھر ایک جلتی مشعل لیے دور کھڑا ایک شخص میڈم کے قریب آ کر اس کے دور تک پھیلے ہاتھ میں مشال پکڑاتا ہے۔ میڈم مشال کو منہ سے تین فٹ دور رکھ کر پیٹرول کا فوارہ پھینکتی ہے۔ آگ کے شعلے آسمان کو بلند ہوتے ہیں۔ تماشائی تالیاں بجاتے ہیں۔

کٹ

سیفی اور جان وہیں کھڑے ہیں۔ سگار تقریباً ختم ہونے والے ہیں۔ تھانیدار بدستور داڑھی میں کنگھی کر رہا ہے۔ اب لڑکھڑا رہا ہے۔

سیفی: "میرا خیال ہے جان۔ اب تمہیں مداخلت کرنی پڑے گی۔ تمہارے چونکانے اور دہلانے سے وہ متوجہ ہوگا۔ پلیز......"

جان ہنستا ہے۔

جان: "O.K......" (منہ سے بلند آواز نکالتے ہوئے) "ہے...... ہے۔ آفیسر۔ آ...... فی...... سر......"

تھانیدار چونک کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کنگھی جیب میں ڈالتا ہے۔ کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہے۔ پھر گرتا پڑتا جان اور سیفی کے قریب پہنچ کر اٹینشن کھڑا ہو جاتا ہے اور سیلوٹ مارتا ہے۔

جبار اور لبوترا اپنی خالی پلیٹیں ریڑھی والے کو واپس کرتے ہیں اور کٹے پھلوں سے بھری ایک ایک پلیٹ اور لیتے ہیں۔

تھانیدار: "یس سر۔ یس سر...... ساری سر...... نو سر...... یس سر......"

سیفی: (بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "وہ بیگ دیکھ رہے ہو......"

(تھانیدار بیگ کی طرف دیکھتا ہے)

تھانیدار: "یس سر......"

سیفی: "اس بیگ میں دنیا بھر کا ریکارڈ ہے......"

تھانیدار: "یس سر......"

سیفی پھر اشارے کرتے ہوئے۔ "اب ان دونوں کو دیکھو جو گرما کھا رہے ہیں۔"

تھانیدار لبوترے کو دیکھتا ہے اور تھر تھر کانپنے لگتا ہے، منہ سے آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔

تھانیدار: "آہ۔ او...... آؤ...... وہ...... تت......"

سیفی: "ہاں۔ بالکل...... اپنے آپ کو سنبھالو......"

جان: "......Take it easy officer......"

سیفی: (جان کی طرف اشارہ) "اور اب۔ ان کو پھر دیکھو...... اور سنو۔ غور سے سنو۔ سنو۔"

کٹ

فریک شو۔ ٹھاٹ باٹ۔ فریک شو کا مالک۔ اور دو سروں والا گدھا۔

فریک شو کا مالک: "سنو۔ سنو۔ سنو۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو...... دو سروں والا کھوتا دیکھو۔ ایک سر جاگتا ہے ایک سر سوتا ہے۔ ایک سر ہنستا ہے۔ ایک سر روتا ہے۔ صاحبان قدردان۔ یہ دو سروں والا کھوتا ہے۔ ایک سر شیر ہے۔ ایک سر چیتا ہے۔ ایک سر مرتا ہے۔ ایک سر جیتا ہے...... بچہ لوگ تالی بجائے گا۔"

بچے بھرپور تالیاں بجاتے ہیں۔ بڑے قہقہے لگاتے ہیں۔

ایک تماشائی: "اس کی عمر کیا ہے؟"

مالک: "اس کی عمر ہم نہیں بتائے گا صاحب...... سمجھ لو یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ ایک دنیا ہم سے اس کی عمر پوچھتی ہے صاحب۔ ہم نہیں بتاتا۔ ایک گورا ہر سال یورپ سے آتا ہے۔ اس کی عمر پوچھتا ہے۔ اس کی فلم بناتا ہے۔ کہتا ہے ایسا گدھا کروڑوں میں ایک ہوتا ہے۔ ہم سے کروڑوں لو...... اور یہ ہمیں دے دو۔ ہم اس کو میوزیم میں رکھے گا۔ لیبارٹری میں ڈالے گا۔ اس پر سائنس کا تجربہ کرنا مانگتا ہے۔ مگر ہم آن بان کو نہیں دیتا۔ نہ۔ نہ۔ نہ۔ لاکھوں دے کروڑوں دے۔ ہم قوم سے غداری نہیں کرے گا صاحب۔ دو سروں کا گدھا قوم کی ملکیت ہے۔ آن بان...... ہمارا عزت ہے۔ ہمارا غیرت ہے۔"

دوسرا تماشائی: "آن بان کون......"

مالک: "اس کا نام ہے جناب (گدھے کے ایک سر پر ہاتھ پھیرتا ہے) یہ آن ہے صاحب......" (گدھے کا وہ سر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا ہے)......

تماشائی ہنستے ہیں۔

مالک: "اور اس کا نام بان ہے صاحب۔ (دوسرے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ دوسرا سر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا ہے)۔

تماشائی حیران ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سرگوشیوں اشاروں سے حیرت کا اظہار کچھ آسمان کی طرف اشارے کرتے ہیں۔

تیسرا تماشائی: ''بس اللہ کی قدرت ہے۔''

مالک پھر تیزی سے ایک دائرے کی صورت میں گدھے کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہے اور بلند آواز میں بولنے لگتا ہے۔

مالک: ''سنو۔ سنو۔ سنو۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو...... دوسروں والا کھوتا دیکھو۔ ایک سر جاگتا ہے۔ ایک سر سوتا ہے۔ ایک سر ہنستا ہے۔ ایک سر روتا ہے۔ یہ دو سروں والا کھوتا ہے۔''

اچانک جان کندھے سے بھاری بیگ لٹکائے اور ہاتھ میں فلم کیمرہ پکڑے آتا ہے۔ اُس کے ساتھ سیفی جواب شیروانی شلوار اور پگڑی پہنے ہوئے ہے۔ پیچھے تھانیدار جبار کو ہتھ کڑی لگائے ہوئے آتا ہے۔ جبار کے چہرے پر ضربوں کے نیلے نشان۔ لباس تار تار۔ جان کو دیکھتے ہی فریک شو کا مالک بلند آواز سے بولنے لگتا ہے۔

مالک: ''آ گیا۔ آ گیا...... میرا گورا صاحب آ گیا۔ کل کا آتا آج آ گیا......''

جان قہقہے لگاتا ہے۔ تالیاں بجاتا ہے۔ گدھے کے قریب جاتا ہے۔

جان: ''Hi Buddy...... تم ٹھیک ہو (مالک سے مخاطب)...... اس کی ذہنی صحت کا اب کیا حال ہے۔''

مالک: ''کون سا ذہن (باری باری ایک ایک سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے) آن...... یا بان......''

جان: ''آ...... ہا...... الگ الگ بھی اور مشترکہ بھی......''

کلوز اپ: جبار کسی گہری سوچ میں۔ گدھے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر اچانک انتہائی تیزی سے تھانیدار کو ہتھ کڑی سے گھسیٹتا ہوا گدھے کے قریب پہنچ جاتا ہے اور تیزی سے گدھے کے دونوں سروں میں کچھ سرگوشی کر دیتا ہے۔ گدھے کے دونوں سر ایک دم ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتے ہیں اور وحشیانہ انداز میں دائیں بائیں حرکت کرنے لگتے ہیں۔ پھر گدھا زور سے سیفی کو ایک زبردست دولتی مارتا ہے۔ سیفی زمین پر گر جاتا ہے۔ پگڑی کھل جاتی ہے۔ پھر جان کو دولتی مارنے لگتا ہے جان اچھل کر ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔

جان: ''او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ......''

ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ تماشائی بھاگنے لگتے ہیں گدھا رسی تڑوا کر چاروں طرف بھاگنے لگتا ہے اور اُس کے دونوں سر لوگوں کو کاٹنے لگتے ہیں اور وہ دولتیاں مارنے لگتا ہے۔

مالک: ''آن بان...... آن بان...... بیٹا...... بیٹو...... آن بان بیٹو۔''

اچانک تیرہ فٹ کا سانپ گدھے کے دونوں سروں کے اوپر گرتا ہے۔ گدھے کا ایک منہ اس کے سر کو پکڑ لیتا ہے دوسرا دُم کو۔ اچانک میڈم پونم پیٹرول کی آگ کا فوارہ اس پر چھوڑتی ہے۔ آگ کے شعلے سیفی اور جان کی طرف بڑھتے ہیں۔ تھانیدار تیزی سے جبار کو گھسیٹتے ہوئے ایک خیمے میں گھس جاتا ہے۔

کٹ

میلے میں مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے پولیس والے ایک ایک کر کے کلوز اپ میں۔

کٹ

تھیٹر کا شو ختم ہو چکا ہے۔ تماشائی گنگناتے ہوئے باہر نکل رہے ہیں۔
چند تماشائیوں کی آنکھوں کا کلوز اپ۔

Dissolve

بے بی کٹار اور بونے کے ڈانس sequence میں سے چند جھلکیاں۔ گانا ٹانگہ لاہوری میرا۔ گھوڑا پشوری میرا۔

رانجھا جوگی بنا ہوا ہیر کے دروازے پر جاتا ہے۔ سسی صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ سوہنی کا کچا گھڑا پانی میں ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ہیر اور رانجھا کی ملاقات۔

Fade out

تماشائی تھوڑا اور آگے بڑھ چکے ہیں۔ یک لخت پولیس والے اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر تماشائیوں پر جھپٹتے ہیں اور انہیں گرفتار کرنے لگتے ہیں۔ ایک افراتفری اور چیخم دھاڑ مچ جاتی ہے۔

کٹ

کباڑ کمپلیکس کا احاطہ:

پولیس گرفتار ہونے والے تماشائیوں کے ساتھ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوتی ہے۔ کچھ تماشائی آسانی سے پھلانگ نہیں سکتے۔ پولیس مدد کرتی ہے۔ گرتے ہیں۔ پولیس اٹھا کر دوسری طرف اندر پھینکتی ہے۔ تماشائیوں نے کئی سٹار تھیٹر کے بڑے بڑے پوسٹر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہیر رانجھا۔ سسی پنوں۔ مرزا صاحباں۔ لیلیٰ مجنوں۔ سوہنی مہینوال۔

تھانیدار ایک طرف کوڑا پکڑے کھڑا ہے، ہر تماشائی کو دس دس کوڑے لگا رہا ہے۔ ایک طرف میز کرسی لگائے پروفیسر صفدر سلطان اور ارشاد بیٹھے ہیں۔ کوڑوں سے فارغ ہونے کے بعد تماشائی میز کی طرف جاتے ہیں اور ارشاد انہیں ایک اسٹامپ پیپر دیتا ہے اور پھر ان سے دستخط کرا کے جبار جس کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں۔ انہیں ایک ایک کر کے دیوار میں بنے لکڑی کے TV فریم دروازے کی راہ سے باہر نکالتا جاتا ہے۔ ایک کونے میں جان اور سیفی کھڑے ہیں اور سب منظر انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ سیفی تھری پیس سوٹ میں ہے۔

سیفی: ''میں نے تمہیں کہا تھا نا مسٹر شیکسپیئر یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

جان: ''ہاں یہ بہت مشکل ہے......''

ہوپ ہر طرف دندناتا پھرتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی کو کوڑے لگتے دیکھ کر بھونکنے لگتا ہے۔ پھر ٹہلتا ہوا پروفیسر کی کرسی کے قریب کھڑا ہو کر بُری طرح بھونکنے لگتا ہے۔

پروفیسر: (ایک تماشائی سے اسٹامپ پیپر لے کر) ''کہانی پر عمل کرنے کی سزا کیا ہے؟''

تماشائی: ''موت......''

پروفیسر: ''ٹھیک ہے۔ پھر بولو۔ (کتے سے) ہش۔ ہش۔ جبار۔ جبار۔ جبار۔۔۔''

تماشائی: ''موت۔''

پروفیسر: ''شاباش۔ ہیر رانجھا۔ مرزا صاحباں۔ سسی پنوں کی کہانی پر عمل کی سزا کیا ہے؟؟''

تماشائی: ''موت۔'' (روتا ہے)

ہوپ وحشیانہ انداز میں بھونکنے لگتا ہے۔ تماشائی دروازے سے باہر نکلنے کے انتظار

میں کھڑا ہے اور جبار تیزی سے پروفیسر کی طرف آتا ہے۔

جبار: ''پروفیسر۔ پروفیسر...... جی پروفیسر۔''

پروفیسر: (کتے کی طرف اشارہ) ''اس کو ہٹاؤ...... جونہی مٹھائی آئی ہے اس کو ڈالو...''

جبار قریب ہی کھڑے سیفی کو سوالیہ اجازت طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔ سیفی ہاتھ کی انگلی اٹھا کر دائیں بائیں ہلاتا ہے۔ نفی کا اشارہ کرتا ہے۔

جبار: (پروفیسر سے) ''سیفی صاحب کہتے ہیں ابھی اجازت نہیں۔''

پروفیسر زبردست طیش میں اٹھتا ہے کرسی پیچھے گرتی ہے۔ اور تیزی سے سیفی اور جان کی طرف جھپٹتا ہے۔

پروفیسر: ''یہ شخص کون ہے۔ اور کیوں بار بار پریشان کرتا ہے۔ جان۔۔۔ تمہیں خارش مشین کے کتنے پیس چاہئیں......؟''

جان: ''دو درجن کافی ہوں گے پروفیسر۔''

یک دم جبار ایک طرف سے مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبہ لاتا ہے اور سب کو مٹھائی کھلانے لگتا ہے۔ تھانیدار کوڑے مارنے بند کر کے مٹھائی کھاتا ہے۔ سب کھاتے ہیں۔ جبار باقی مٹھائی ہوپ کے سامنے ڈالتا ہے۔

سعید کمال باڈی بلڈر اپنے بائی سپس دکھاتا آتا ہے۔ اس کے ساتھ شال باجے والا باجا اٹھائے آتا ہے۔

جان: ''پروفیسر یہ...... (سیفی کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتا ہے)۔ مسٹر سیف آئی نے ان نئے ریکارڈز میں میری بڑی مدد کی ہے۔ کئی سٹار تھیٹر لگانا جرم نہیں، دیکھنا جرم ہے۔ دیکھنا جرم نہیں، کہانی پر عمل کرنا جرم ہے...... اور اس کی سزا موت ہے۔۔۔''

پروفیسر غصے میں اچھلنے لگتا ہے۔

پروفیسر: (سیفی کی طرف اشارہ) ''یہ۔ یہ...... یہ شخص۔۔۔ ہماری یہ ہماری تہذیبی قدروں کو مسخ کر کے پیش کر رہا ہے۔ یہ غدار ہے۔ یہ ہماری ثقافت کی غلط ترجمانی کر رہا ہے......''

پروفیسر چاروں طرف بے چینی سے دیکھتا ہے۔ پھر سعید کمال باڈی بلڈر اور شال

باجے والے سجان کی طرف دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بجاتا ہے۔ سعید کمال پیچھے سے سیفی کو اور باجے والا جان کو جکڑ لیتے ہیں۔ اور اس کا باجا اوپر ہوا میں سات فٹ بلند ہو جاتا ہے۔ یک دم ارشاد اپنا کام چھوڑ کر اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھتا ہے۔

ارشاد: "All the world is a stage and men and women merely players."

جبار: ''روکو۔ روکو۔ جبار بھائی کو روکو۔ اُن پر شیکسپیئر آ گیا ہے۔''

سیفی: ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا جان یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

پروفیسر کوئی اشارہ کرتا ہے۔ باجے والا باجے کے کھلے منہ کو جان کے سر کے قریب لے جاتا ہے۔ اور زور سے پاں کی آواز نکالتا ہے۔

جان: ''آ۔ آہ...... یہ...... اتنا...... آسان نہیں ہے۔''

جان بے ہوش ہو جاتا ہے۔

....

انیلا نوٹس۔ کیا یہاں The End ہو جائے گا...... نہیں۔ ابھی بڑے مسائل ہیں۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ سیفی نمبر 1۔ سیفی نمبر 2۔ سیفی نمبر 3۔

سرئیلزم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام لگے گا۔ سیفی نمبر......؟

سیفی (معمول کی گھسیٹا کاری) (دوسرے دن۔ دوپہر دو بجے)

''ہاں...... یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' میں انیلا کے کل رات اور آج ابھی دو گھنٹے میں لکھے گئے سین پڑھنے کے بعد کہتا ہوں۔ اور اب اپنی معمول کی گھسیٹا کاری میں ہوں۔ یعنی گھسر۔ گھسر۔ گھسر۔ گھسر۔ گھسٹ۔

میرے پاس اب وقت ہے۔ یعنی تقریباً ایک گھنٹہ بھر۔ ہم لوگ تھیٹر والوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی بجائے میلے میں قتلمے کھانے کی کوشش کریں گے۔ چیف ان ثقافتی غذاؤں سے گھبراتا ہے۔ اس وقت وہ ماسٹر، بالی، جبار اور پیارے کے ساتھ 'دنیا کے

عجوبے' نامی freak show میں اگلے سال شوٹنگ کے امکانات طے کر رہا ہے۔ فوٹو بنائے جا رہے ہیں۔ یہ شو ہم نے آج صبح دس بجے دیکھا۔ پھر میں اور انیلا ــــ رائٹرز کا جوڑا ــــ خیمے میں آ گئے اور ٹیکنیکل سٹاف اپنے کام کے لیے پیچھے رہ گیا۔ یوں میلے میں ہوا اڑ گئی ہے کہ فلم بن رہی ہے بلکہ شوٹنگ ہو رہی ہے۔ حالانکہ ایسا ابھی کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ ہم واپس آئے تو انیلا نے آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا اور 'یہ فلم نہیں بن سکتی' کے اگلے کئی سین لپیٹ ڈالے۔ میں اس دوران چیف کی سرئیلسٹ سینما پر کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر اُس نے اچانک لکھنا بند کر کے سارا پلندہ یعنی جو اُس نے گذشتہ رات لکھا تھا اور جو ابھی لکھا تھا، مجھے دیا۔ ''پڑھو'' اُس نے حکم دیا اور وہی کتاب میرے ہاتھ سے جھپٹ کر اُسے میری نسبت زیادہ سنجیدگی سے پڑھنے لگی۔ میں نے پڑھنے میں آدھا گھنٹہ لگایا اور پھر اتنی ہی دیر کے لیے سکرین پلے کی نئی developments جو بھاگاں والا میلہ میں کرداروں کی آمد سے پیدا ہوئی ہیں یعنی جنہیں انیلا نے پیدا کیا ہے۔ زیرِ بحث آئیں۔

''ہاں۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' میں نے سکرپٹ کے آخری فقرے پڑھنے کے بعد انیلا سے کہا۔ اُس نے اس بیہودہ کتاب کو ایک طرف رکھنے میں کچھ لمحے لگائے۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ اُسے میری رائے کی کچھ ایسی پرواہ نہیں ہے۔ پھر ایک مشکوک بے اعتنائی سے پوچھا۔

''کیا اتنا آسان نہیں ہے؟''

''کئی باتیں اتنی آسان نہیں ہیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً۔ یہ کہ سرئیلسٹ humour اور سادہ humour میں فرق ہوتا ہے، ایسے تمام مقامات جہاں تم نے ایسی کوشش کی ہے، انہیں مجھے دوبارہ دیکھنا پڑے گا......''

''بکواس۔ تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو۔ دنیا کے سب سے بڑے مسخرے؟''

''ہاں۔ لیکن جان نہیں مانتا۔''

اس پر وہ ہنس پڑی اور یہی میں چاہتا تھا۔

''اور کیا آسان نہیں ہے۔ گھسیٹے۔ مسخرے......''

''آ...... کرداروں نے جو نئے روپ دھارے ہیں۔ مطلب آؤٹ آف کیریکٹر

ہوئے ہیں۔ اس سے وہ ٹائپ بن گئے ہیں۔ پہچانے جانے جاتے ہیں۔ مثلاً دوسرا ایکٹنگ جوزا ہے۔ نیا جبار۔ مشکوک لمبوترا۔ داڑھی والا کنگھی والا تھانے دار۔ پتہ چل جاتا ہے یہ کون ہیں۔"

"ہوں۔" اُس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "یہ تو ہے شاید۔ میں نے بھی سوچا تھا۔ عجیب مصیبت ہے" واضح کرنے کا اشارہ کرو تو ٹائپ۔ ورنہ خاک بھی پتہ نہیں چلتا...... اچھا کچھ کرتے ہیں۔ انہیں اور دھندلاتے ہیں...... اور......"

"اور یہ کہ جو تم نے ان چند گھنٹوں میں لکھ دیا ہے اس میں کیڑے نکالنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

اب وہ اصل میں خوش ہوئی اور بے تابانہ اپنی سگریٹ کی طرف بڑھی۔ "اور وہ جو آخری حصہ ہے؟"

"اعلیٰ۔ جو تم نے سب کچھ "خوابا" دیا ہے۔ یہاں سے۔ بھاگاں والا میلے سے سیدھی کباڑ کمپلیکس میں۔"

"سنگ اندلس میں بندہ کمرے میں گولی کھاتا ہے اور باہر کہیں باغ میں گرتا ہے۔"

"ایڈلا کے پلنگ کے نیچے سے جوزف گاؤں کے چوک میں پہنچ جاتا ہے۔"

"سعید نے...... مطلب...... یہ میلہ ایک سال بعد لگے گا۔ اس سپیڈ پر نہیں لا سکتے۔ ناممکن لگتا ہے...... سعید...... پراگ فلم بھیج سکے گا......؟"

"ایسے فیسٹیول اکثر ملتوی ہو جاتے ہیں۔ freak show اچھا ہینڈل ہوا ہے۔"

"ہے۔ نا۔ ابھی تو دیکھنا ہے۔ میں نے سوچا۔ ابھی اس کا جو بنتا ہے بنا لوں......"

"دو سَروں والا گدھا کمال کی مخلوق ہے۔ اگر اگلے سال تک زندہ رہا۔"

"ہاں۔ سیفی۔ یہ بھی ہے۔ ایسی چیزیں۔ مطلب جانور اکثر مر جاتے ہیں۔"

"ابھی تک تو مرا نہیں...... ویسے اس سے بھی لوگ مطلب نکالیں گے۔"

"تمہیں کیا مصیبت ہے۔ مطلب نکالیں گے تو نکالیں۔ بلکہ نکالنا چاہیے اور ہم لکھتے کس لیے ہیں۔ فلم میں کس لیے بکواس کرتے ہیں۔ کہ لوگ مطلب نکالیں......"

"کسی طرح اس میں...... مطلب سارے سکرپٹ...... میں وہ آ جاتا نا...... چیف کی گرل فرینڈ کے نانا...... کی موت کی چہل قدمی کا...... کوئی متبادل...... ب۔ اب۔ اب......"

"یہ کوئی ضروری تو نہیں...... چیف کو خوش کرنے کے لیے؟"

"نہیں۔ ویسے ہی بات کی ہے...... قطعاً ضروری نہیں۔"

"ویسے سیفی...... ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ہمیں علم ہو جائے کہ ہمارے اوپر کوئی تباہی آنے والی ہے...... ہمیں مار دیا جانے والا ہے...... اکثر...... ہمیں لمحہ بھر پہلے بھی علم نہیں ہوتا کہ بربادی آنے والی ہے۔"

"ہاں...... یہی...... trick ہے نا...... ہم قاری کو...... بلکہ ناظر کو یہ تاثر دے دیتے ہیں...... کہ دیکھو آگے ان بے چاروں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور انہیں کچھ علم ہی نہیں......"

"ہاں...... لیکن ہم کوئی thriller نہیں بنا رہے۔"

"ویسے لگتا ہے تم لکی سٹار کے مالک اور بونے کے اس خبیث تھانے دار کی ٹڈبھیڑ سے کافی متاثر ہوئی ہو......"

انیلا کسی گہری تکلیف دہ سوچ میں چلی جاتی ہے۔ "تمہارا مطلب ہے وہ sequence...... پتہ نہیں...... میں نے کوشش سے تو کچھ نہیں لکھا...... بس آ گیا......"

"وہ جو...... لاتھیٹر۔ non stage کا تم نے سوچا تھا......"

"ہاں۔ وہ بھی ہے...... ابھی ہے...... آج ہم دیکھیں گے نا...... سی پنوں۔ میں نے کچھ سوچا ہے۔ صحرا کے کچھ سین...... کچھ کرتے ہیں...... تم...... ایک کام کرو......"

"کیا؟"

"وہ فیروز...... ان کا گویا جو کچھ گاتا ہے ناں...... اس کے کچھ transcript مجھے لا دو......"

"وہ ہم کر لیں گے......"

اور پھر میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انیلا کے اس کام پر محض زبانی ردعمل ظاہر کرنا کافی نہیں کہ باہر سے آواز آئی۔ "انیلا...... انیلا...... انیلا" یہ انیلا سی کی آواز تھی۔ انیلا (میرے والی) کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی اور مجھے بھی اُس نے عجیب سے انداز سے دیکھا اور ہنسی۔

"آ جاؤ انیلا۔" انیلا نے کہا اور انیلا اندر آ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک ہم نام جب اپنے دوسرے ہم نام کو آواز دیتا ہے تو اصل میں کسے آواز دیتا ہے۔ دونوں ہم ناموں میں سے کسی کا بھی میرے اس مسئلے میں دلچسپی لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سی کے پیچھے اور پرفیوم۔ جو میں کہوں گا۔ کافی مشہور اور مہنگا پرفیوم تھا —— کی خوشبوٹینٹ کی گرم ہوا میں اک دم سے بھر گئی تھی۔ جو لوگ کبھی خیمے میں رہے ہوں، جانتے ہیں کہ خیمے کی ہوا کمرے کی ہوا سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور خیمے کے مکینوں کا بے تحاشا اثر قبول کرتی ہے اور اُن پر جوابا اثر ڈالتی ہے۔ پورا خیمہ 'میرا الٹیا شہر بھنبھور' بن گیا تھا۔

"آؤ انیلا کہیں بیٹھیں گپ لگائیں۔" سی نے مجھ غریب پر ایک رقیبانہ غیرت کی نگاہ ڈالی اور پھر میرے حق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے انیلا کی ہم زاد انیلا سی انیلا کو اُٹھا کر لے گئی۔ اُس کی آنکھوں میں انیلا کے لیے ایک سلگتی ہوئی چمک ہے اور اب مجھے یقین سا ہو رہا ہے کہ کوئی چکر ہے۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں آج رات تھیٹر کا آخری شو سی پنوں دیکھنے کے بعد ہم نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ انیلا بلال انیلا سی سے بچ جائے گی۔

گھسیٹ سیفی گھسیٹ

سہ پہر چار بجے (قتلموں۔ مٹھائیوں کی دوکان کے باہر)

○ کچھ ہوا ہے

قتلمے جلیبیاں اور پکوڑے کھائے جا چکے ہیں اور چائے کا انتظار ہو رہا ہے۔ چیف انیلا کا حالیہ لکھا سکرپٹ پڑھنے میں شدید بے تابی کا اظہار کر رہا ہے۔ لیکن انیلا کا اصرار ہے کہ وہ فائنل کرنے کے بعد دکھائے گی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آج رات کا آخری تھیٹر دیکھنے کے بعد ممکن ہے کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اضافے تو یقیناً ہوں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپروچ ہی بدلنی پڑے۔ ابھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سب کچا پکا ہے۔ انیلا جب سی کے چنگل سے نکل کر پورے پونے گھنٹے بعد واپس آئی تھی تو کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ سانس پھولی اور چہرے پر سُرخی سی تھی۔ میں نے کچھ پوچھا نہیں کیونکہ

تھوڑی دیر بعد چیف، ماسٹر، بالی اور جبار واپس آ گئے تھے۔ اس وقت بھی وہ کچھ کھوئی کھوئی سی ہے۔ مجھے لگتا ہے کچھ ہوا ہے۔

○ بالی مسئلہ ہی حل کر دیتا ہے

چائے کے دوران میں نے سکرین پلے کے موضوع سے چیف کی توجہ ہٹانے کے لیے میلہ بھاگاں والا کے پھر انعقاد کے لیے سال بھر کے انتظار پر تشویش کا اظہار کیا۔ چیف کی تشویش مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ پروفیسر جولیس سے التجا کرے گا کہ فیسٹیول کو کسی طرح ایک ماہ آگے لے جائے۔ کیونکہ فلم submit کرانے اور میلے کی تاریخ میں ایک ماہ کا ہی فرق بنتا ہے۔

"اگر یہاں کے sequence زیادہ لمبے ہوں گے۔" اُس نے انیلا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر کہا "تو اور بھی مشکل ہو جائے گا۔" انیلا نے تو اُسے کوئی جواب نہ دیا لیکن بالی یک دم ہنسنے لگا۔ میں نے سوچا شاید ماسٹر نے اُس کے کان میں چوڈاری کے حوالے سے کوئی مذاق کیا ہے۔ ایسا مذاق چل رہا تھا...... لیکن ایسا نہیں تھا۔ چیف نے اُس کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھا۔ ان دونوں میں فاصلہ ابھی برقرار ہے کیونکہ دونوں جانتے ہیں کہ اصل وجہ بجلی ہے اور دونوں ہی اُس سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر ہیں اور مستفید بھی ہو رہے ہیں —— خیر یہ تو ایک الگ قصہ ہے لیکن پھر بالی جلد ہی سنجیدہ ہو کر کہنے لگا اور براہ راست چیف سے۔ "سر جی۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ادھر میلے میں جو کچھ لگا ہے۔ یہ سب کچھ مہینے دو مہینے بعد۔ کسی اور میلے میں جا لگتا ہے۔ تو میلے تو سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم وہاں چلے جائیں گے۔ موت کا کنواں، عجوبے، سپ، ڈبل کھوتا......" ڈبل کھوتا پر سب خوب ہنسے...... "تو ہم وہاں شوٹنگ کریں گے اور ادھر سورج مکھی۔ سارے کھیت۔ آگے۔ پیچھے یہ میلہ اکھڑتا ہے تو ماسٹر اور میں ادھر آ کر سب شاٹ لے لیں گے۔ پھر cheat کر کے سب بن جائے گا، سارا ایڈیٹنگ کا کام ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔" ماسٹر اور چیف۔ دونوں کے چہرے پر بے ساختہ خوشی کی لہر دوڑ گئی...... "کیوں ماسٹر؟" چیف نے پوچھا۔ ماسٹر نے ہراس سی خوشی سے بالی کی

طرف دیکھا۔ ''سامنے کی بات ہے۔ حد ہے۔ دماغ میں آئی ہی نہیں۔'' اس پر چیف
نے پہلی دفعہ بالی کو قبول کر لیا ''Excellent...... بالی...... یہ بہت...... اچھا ہے۔ میرا
خیال ہے یہی اس مسئلے کا حل ہے۔'' بالی خوش ہو گیا۔ میں نے بھی بالی کی تعریف کی
لیکن ساتھ ساتھ ماسٹر کو بھی شامل کیا۔ ''اور تھیٹر...... وہ لوگ پتہ نہیں اب۔ کب کس
میلے میں جائیں۔ ان کا مالک کہیں چلا گیا ہے۔'' انیلا نے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔
اور بالی بولا ''جی میڈم...... لیکن ان کا مالک زیادہ سے زیادہ دو حد تین ماہ میں واپس آ
جاتا ہے۔ جسے وہ وچھوڑا کہتے ہیں۔ اس حساب سے وہ آئے تو اگلا تھیٹر ان کا پیر جوگل
کا ہوگا جو کافی بڑا میلہ ہے ہم یہ تھیٹر وہاں جا کر کر سکتے ہیں۔''

''تجھے یہ سب کس نے بتایا بالی......'' میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا اور سب
ہنس پڑے سوائے جبار کے جو اپنے رجسٹر میں اپنے ہی کوئی حساب کتاب لگا رہا تھا۔
لیکن پھر اچانک وہ بولا۔ ''ہاں۔ پیر جوگل کا میلہ کافی بھاری ہوتا ہے۔ وہاں ایک برگد
کا درخت ہے جو دس ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ ریکارڈ ساڑھے دس ایکڑ کا ہے۔ انڈیا
میں۔'' تو سب حیران رہ گئے......

○ ایک عجیب واقعہ

بالی کے تجویز کردہ حل نے سب کی طبیعت پر اچھا اثر ڈالا۔ اچانک یہ ممکن نظر
آنے لگا کہ اگر ہم سکرین پلے اگلے دو ہفتوں میں مکمل کر لیں اور پھر ہر چیز پر متفق ہو
جائیں تو فلم اُتنے وقت میں بن سکتی ہے جو چیف کے پاس ہے۔ اس سے ایک جوشیلی
سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور چیف نے مجھے اور انیلا کو رفتار تیز کرنے کی وارننگ بھی دے
دی۔ اُس نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا کہ 'سر' یعنی حکمت بہزاد صاحب موجودہ
پیش رفت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ ہم لوگ ریکی کے لیے بھاگاں والا کے میلے
میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر اُس نے مجھے اور انیلا کو ڈھکے چھپے انداز میں یہ بھی بتایا کہ
انہیں اس مخصوص حلقے کی طرف سے دھمکیاں بدستور مل رہی ہیں۔ زیادہ تفصیلات کا
میٹنگ میں پتہ چلے گا جو ہماری واپسی کے جلد بعد ہی ہوگی۔ بہزاد صاحب سے اس
میٹنگ کا سب کو شدت سے انتظار ہے۔ پھر ہم میلہ sequence کو شروع کرنے

کے لیے سورج مکھی کے کھیتوں میں سے کیمرے کو بطور کردار لانے پر اور پھر میں اس
کے تکنیکی اور انیلا اس کے narrative پہلوؤں پر بات کرتی رہی۔ میلہ سورج مکھی کے
کھیتوں کے بالکل ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور دائیں بائیں سڑک کے کنارے پھیل
جاتا ہے۔ ہم لوگ اب کافی دیر سے مٹھائیوں، قتلموں کی دکان کے سامنے بیٹھے تھے اور
میری نظریں سورج مکھی کے گھنے قد آدم پودوں کی طرف تھیں جو ہم سے تقریباً بیس
پچیس فٹ کے فاصلے پر کھیت کا آخری کنارہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ
ایک جگہ سے پودے ہلے اور ایک طرف ہٹے اور پیارا بونا ایک انسانی چوہے کی طرح
اُس سے برآمد ہوا اور اُس کے ساتھ ہی بے بی کنار جو تیزی سے ایک دوپٹے سے چہرہ
چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی تھیٹر کی طرف بھاگ گئی اور پھر ان کے پیچھے دو اور
افراد باہر آ گئے۔

بونے نے ان دونوں سے کچھ بات کی اور پھر اچانک اُس کی نظر ہم پر پڑی۔ اور
میں مزید حیران ہوا یہ دیکھ کر کہ وہ جیسے ان دونوں اشخاص سے ہمارے بارے میں ہی
بات کر رہا تھا۔ پھر وہ بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اور ہمیں کہنے لگا ''سر آپ کے مہمان
آئے ہیں۔'' ہم سب نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ چیف نے کہا کہ ہمارے تو
کوئی مہمان نہیں تم کن کی بات کرتے ہو اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہ جنہیں ہمارے
مہمان کہہ رہا ہے وہ تو خود ہم سے کچھ ہی فاصلے پر غالباً کچھ کھانے پینے کے لیے بیٹھ
رہے ہیں۔ پیارا بہت شرمندہ ہوا۔ اور بالی اور ماسٹر نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ بالی
نے تو اسے گود میں اٹھا لیا۔ پھر غالباً اُس نے ان لوگوں کے پاس جا کر اپنی غلط فہمی پر
معذرت بھی کی۔ لیکن میرے ذہن میں بڑی بے چینی تھی کہ آخر وہ سورج مکھی کے
کھیتوں سے کیسے برآمد ہوئے۔ پھر پیارا اور بے بی کنار ادھر کیا کر رہے تھے۔ اور وہ
لوگ حقیقتاً کون تھے اور کیا انہیں کھیتوں میں ملے تھے؟ کہاں ملے تھے؟ عجیب بات
تھی۔

پیارے نے میرے ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا اور کوئی بہانہ بنا کر تھیٹر
کو بھاگنے کو تھا کہ میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ اگر مجھے فیروز گویے کے گائے

گانوں کے بول لا دے تو بڑا احسان ہوگا۔ وہ کہنے لگا وہ فیروز کو ادھر بھیج دیتا ہے۔

وہ دونوں افراد جن میں سے ایک بہت معقول صورت کسی بینک کا اسسٹنٹ منیجر ہوسکتا تھا۔ یا کسی یونیورسٹی کا پروفیسر۔ یا کسی درمیانے درجے کی انشورنس کمپنی کا سینیئر ملازم۔ یا کوئی وکیل۔ بھاگاں والا کے میلے میں اک دم سے الگ تھلگ سا نظر آتا تھا جیسے بھولے سے ادھر آنکلا ہو۔ صرف لباس، وضع قطع اور حلیہ شہری ہونے کی بات نہ تھی ہم بھی سب پتلون شرٹس میں تھے۔ لیکن اُس شخص کے بارے میں کچھ ایسا تھا جو سمجھ نہ آتا تھا۔ اُس کا ساتھی البتہ صاف نظر آتا تھا کہ اُس کا ملازم ہے، وہ اس کا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا اور اُس کا ڈرائیور بھی ہوسکتا تھا لیکن ڈرائیور کیسے؟ وہ تو سورج مکھی کے کھیتوں سے نکلے تھے۔ میں نے سوچا کہ شو کے بعد ہونے سے ضرور پوچھوں گا کہ وہ لوگ اصل میں کون ہیں اور اُسے کہاں ملے تھے۔ ہم لوگ اب وقت گزار رہے تھے۔ پھر ہم نے سوچا کہ ایک بار پھر چائے پی کر لگے ہاتھوں موت کا کنواں بھی دیکھ ڈالتے ہیں۔

وہ دونوں بھی قتلمے کھا رہے تھے لیکن اس کا ڈرائیور یا ملازم ساتھی مجھے بے حد پریشان سا نظر آیا وہ بار بار مشکوک اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتا تھا جب کہ یونیورسٹی پروفیسر یا بینک منیجر کے چہرے پر ایک عجیب سوئی ہوئی سی مسکراہٹ تھی۔ اور ہر طرف دیکھتے ہوئے وہ لگتا تھا کہ بہت لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کبھی یک دم ہنس پڑتا تھا۔ پھر اپنے سر کو جھٹکتا۔ میرے اتنے انہماک سے انہیں دیکھنے پر ہی غالباً انیلا نے پوچھا۔ ”تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟“ ”نہیں“ میں نے کہا اور دیکھا کہ وہ شخص اپنے چھوٹے ہینڈ بیگ میں سے غالباً کوئی دوا نکال کر کھا رہا تھا۔ اس کا ساتھی وقفوں وقفوں سے اُس سے کچھ بات کرتا تھا جس کا انداز کچھ سمجھانے والا تھا۔ اچانک بینک منیجر یا وکیل یا پروفیسر نے ملازم کو غصے سے دیکھا لیکن اس کا انداز ایک دم سے اتنا بدل گیا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ وحشیانہ سا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کی طرف نہیں دیکھوں گا۔

اور پھر فیروز گویا اپنی گانوں کی کاپی لے کر آیا۔ میں نے اس کے ذخیرے سے چند چیزیں نقل کیں انیلا کے لیے ...... اس میں کچھ وقت لگ گیا۔ اور جب میں فارغ

ہوا تو دیکھا کہ وہ دونوں نامعلوم افراد جا چکے تھے۔

لیکن میں نے بلکہ ہم سب نے پھر انہیں دیکھا۔ میرے خدا...... ہوا یوں کہ ہم نے وہی سوچا کہ موت کا کنواں بھی لگے ہاتھوں دیکھ لیتے ہیں۔ چیف اب High spirits میں تھا۔ کیونکہ اب اُسے ہماری فلم 'یہ فلم نہیں بن سکتی' بنتی نظر آ رہی تھی۔ موٹر سائیکلسٹ کے پیچھے اُس کی ساتھی لڑکی بیٹھی اور انہوں نے خوب چکر لگائے، وہ کنویں کے اوپری کنارے تک آ گئے اور یوں لگتا تھا کہ موٹر سائیکل اچھل کر باہر نکل جائے گی۔ لڑکی مسکرا کر تماشائیوں کو سلام کرتی تھی۔ تالیاں بجتیں پھر وہ نیچے چلے گئے موٹر سائیکل رکی اور سٹنٹ مین نے اعلان کیا۔ ”ہے کوئی مائی کا لال جو میرے پیچھے بیٹھے جیسے ماہ پارہ بیٹھی تھی۔ سو روپے انعام ملے گا۔“ ابھی وہ یہ بات کر ہی رہا تھا کہ وہی آدمی اچھا خاصا معقول صورت، پروفیسر، وکیل وغیرہ وغیرہ۔ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ ”میں بیٹھوں گا......“ میرے خدا...... میرے ذہن میں آیا کیا اس شخص کا کوئی ذہنی مسئلہ ہے۔ میں اُس کے ساتھی سے، جواب لگتا تھا کہ اُس کی اُس حرکت پر بے ہوش ہی ہو جائے گا، پوچھنا بھی چاہتا تھا لیکن پھر مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اب انیلا بھی اس شخص میں گہری دلچسپی لیتی نظر آئی۔ ہم نے اُسے ”سورج مکھی کے کھیت سے نکلا انسان“ کہا۔ تو نہ صرف وہ سورج مکھی انسان سٹنٹ مین کے پیچھے بیٹھا بلکہ بہت خوش اور ذرا بھی نہ ڈرا۔ حیرت ہے۔ وہ کون ہے؟ اُس نے سو روپے کمائے۔ مجھے یقین ہے کہ سٹنٹ مین اس صورت حال پر ذرا خوش نہ تھا لیکن اُس نے خوش دلی برقرار رکھی۔ میرے ذہن میں خیال آیا انیلا سے پوچھوں گا کہ کیا ہم جان کو اس طرح کی سچوایشن میں ڈال سکتے ہیں؟ کہ سٹنٹ مین اُس کی خوب چیخیں نکلوائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

○ پیکنگ

اس کے بعد وہ عجیب وغریب مالک ملازم جوڑا یا خدا جانے وہ کون لوگ تھے۔ ہمیں پھر نظر نہ آیا۔ موت کے کنویں سے نکل کر دیکھا کہ ابھی بھی تھیٹر کا شو شروع ہونے میں گھنٹہ باقی ہے۔ جبار نے کہا کہ وہ واپس ٹینٹ میں جا کر اپنا سامان پیک کر لینا چاہتا ہے۔ پھر اُس نے ہمیں آگاہ کیا کہ ریکارڈز کے مطابق چینی لوگ دنیا میں سب سے اعلیٰ

سامان پیک کرنے والے ہیں جبکہ فرانسیسی سب سے بُرے ہیں۔ پھر سوچا گیا کہ کیوں نہ ہم سب بھی وہی حرکت کریں جو جبار کر رہا ہے۔ وقت بھی گزر جائے گا۔ اور کسی بھول دیکھتے ہی ہم سامان پکڑ کر گاڑیوں ـــــ دو گاڑیاں ایک چیف کی جسے وہ خود ڈرائیو کرتا ہے ـــــ اور دوسری اُس نے مہیا کی ہے جو ماسٹر چلاتا ہے ـــــ میں بیٹھیں گے اور راتوں رات نکل جائیں گے۔

سامان پیک کرنے میں مجھے دس منٹ سے زیادہ نہ لگے، اپنا کون سا اتنا سامان تھا۔ اور اتنا ہی وقت انیلا کو۔ پھر میں نے چیف کو اُس کی کتابیں اور پتلونیں اکٹھی کرنے میں مدد دی۔

اچانک انیلا کی آواز آئی۔ اور انیلا کی آنکھیں چمکیں اور سسی اندر آ گئی۔ اب وہ مکمل سسی تھی۔ میک اپ اور کاسٹیوم میں...... اس نے ہم دونوں مردوں پر ایک لاپرواہی نظر ڈالی۔ اور انیلا سے کہنے لگی۔ ''انیلا جانی ذرا سگریٹ تو پلا۔'' انیلا کو اور کیا چاہیے تھا۔ میں نے گھٹیا پن کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''پلیز باہر۔'' اور غالباً ان کا تو پہلے سے ارادہ ہی یہی تھا وہ دونوں ٹینٹ سے باہر نکلیں۔ اور مجھے یہ آخری گھسیٹا کاری کرنے کا موقع مل گیا۔

''She is stunning'' اچانک مجھے چیف کی آواز سنائی دی۔

''Indeed she is'' میں نے صدق دل سے اعتراف کیا۔

پھر باہر سے ہمیں دونوں کی ہنسی سنائی دی۔ ''بہت پیاری لگ رہی ہو'' کسی انیلا نے کہا اور میں پہچان نہ سکا کس نے کس کو کہا۔

اب ہم جا رہے ہیں۔ لکی سٹار تھیٹر کا آخری شو سسی پنوں دیکھنے۔ اور میں اپنی گھسیٹا کاپی ادھر ہی چھوڑ رہا ہوں ہینڈ بیگ میں۔

....

(19)

پھوار

(ادارتی نوٹ شاید آخری)

حسن کی صورت حال کے بیان/اظہار/وضاحت/تفہیم/تشریح/بلکہ ابہام کچھ بھی کہہ لیں کے طویل عمل کے دوران ہم بطور مدیر حیرت اپنے خود اختیار کردہ اور غالباً بے حد متنازعہ مداخلتی کردار سے کافی حد تک مطمئن ہیں اور کسی تنقیدی ہستی یا ادارے سے معذرت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ حسن کی صورت حال جو انسان کے حسی اور وقوفی تجربے میں یک دم شگاف ڈالنے والے خلا کو احتمالی واقعات واسباب سے پُر کرنے کا منظرنامہ ہے (ہمیشہ کی طرح ہم اس منظرنامے کی صحت پر قطعاً اصرار نہیں کریں گے) دیکھا گیا ہوگا کہ یہ منظرنامہ اکثر و بیشتر ہماری کسی مداخلتی ادارتی کارروائی کا محتاج نہیں رہا اور اپنے اندرونی تحرک اور بعض اوقات خوفناک تحرک کے ذریعے آگے بڑھتا رہا۔ یہ صورت حال اب بھی برقرار ہے اور برقرار رہے گی۔

ہم صرف یاد دہانی اور بیانیہ ترجیحات کی تجدید کے لیے یہ الوداعی ''خالیائی'' مداخلت کر رہے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ...... اور یہ عام فہم ہے...... کہ خالی جگہیں پُر کرو ـــــ کا خالی...... خالی جگہوں۔ خالی واقعات۔ خالی مقامات۔ خالی اوقات۔ خالی کرداروں۔ خالی اقدار۔ خالی اذہان۔ خالی ہیجانات حتیٰ کہ خالی متن میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اور پھر ہماری اپنی انتہائی ذاتی ''خالی بصیرت'' کے باوصف یہ 'خالی' ہم ذہنی کا شکار کوئی کردار بھی ہو سکتا ہے اور کسی چیز کی ان کہی تاریخ بھی ہو سکتا ہے۔ (چیزوں کے لیے کوئی تو

بولے گا) گول میز کی کہانی...... ابھی سنائی نہیں گئی لیکن حسن کی صورت حال میں متن کا ایک بڑا خلا اب سینئر اکاؤنٹینٹ حسن رضا ظہیر کے ایام گمشدگی پر کمپنی ڈرائیور نور خان کے بیان اور ایامِ میلہ بھاگاں والا پر سیفی کی گھسیٹا کاری کے درمیان حائل ہے اور یہ خلا۔ ذلت۔ نحوست۔ اور بربادی کے عذاب کے کیسے اظہار سے پُر ہوسکتا ہے ہم مداخلت نہیں کریں گے۔ لیکن۔ چیزوں کے سوانحی خلا کو پُر کرنے اور حسن کی صورت حال میں ہم نامی کے بظاہر بے تُکے رشتے میں بندھے کرداروں کے انجام کا مختصراً ذکر کر دینے کی خصوصی صلاحیت بہرحال ہم رکھتے ہیں اور مناسب وقت پر اس کا استعمال بھی کریں گے۔

تو کیا ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں...... لیکن ہم نہیں جانتے۔ کب تک کہاں تک...... احتمالی اور غیر احتمالی دونوں ہمارے لیے آسان ہیں قابل قبول ہیں۔ انتہائی غیر احتمالی بھی ناممکن نہیں اور جو ناممکن نہیں اُسے کبھی نہ کبھی ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا...... لیکن ناممکن...... ناممکن ایک اور خلا ہے...... تو کیا حسن اب ناممکن کو ناممکن سے پُر کرتا ہے؟ خالی کو خالی سے پُر کرتا ہے......؟ کمپنی ڈاکٹر ہارون پاشا حسن کی گمشدگی اور پھر واپسی کے برسوں بعد تک اس سوال کا جواب Benzo Gaba کیمیاوی خلا میں ڈھونڈتا رہا۔ اس کا جواب کیا ہوگا...... یہ سب جاننے کے لیے ہم چلتے ہیں، ہم حسن کے ساتھ چلتے ہیں ویسے ہی جیسے اب تک چلتے رہے ہیں، گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے۔

پھوار وہ مہین بارش ہے جو نہ بھگوتی ہے نہ خشک رہنے دیتی ہے۔ دنیا اُن آنکھوں جیسی ہے جو نہ خشک ہیں نہ روتی ہیں۔ چاہ پریاں والا کے اردگرد اونچے گھنے درخت بھی ایسے ہی ہیں۔ اور سائیں گلاب کا مزار۔ پیچھے احاطے میں پشت دکھاتی شہر کی عمارتیں۔ اور عشق میں وصال کی مہلک منتیں ماننے والوں کا کنواں۔ اور آگے دور تک گہرا پھیلا قبرستان سب ایسے ہیں۔ اور انیلا بلال کی آنکھیں بھی اُسے بتاتی ہیں کہ ایسا ہی ہے۔ سوانگ پروڈکشنز کے دفتر کے کونے میں اونچی لمبی کھڑکی کے سامنے کھڑی وہ دیکھتی ہے کہ سرمئی بادلوں نے کنوئیں سے آگے قبرستان میں پھیلی سہ پہر کو تاریک کر دیا ہے اور کہیں کوئی حرکت کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا۔

''بابا جی۔ آج ادھر قوالی ہوگی؟'' انیلا بابے خُوشیے سے پوچھتی ہے جو —— وہ جانتی ہے —— کہ ساتھ ہی کچن میں اُس کے لیے چائے بنا رہا ہے اور وقفوں وقفوں سے رو رہا ہے۔ بابا خُوشیا ان میں سے ہے جو بات بات پر رو پڑتے ہیں۔ جوانی میں وہ اپنی اس کمزوری پر کافی مشکل سے قابو پا لیتا تھا مگر اب اس کے لیے ناممکن تھا اور پھر قابو پانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کل شام جب وہ بھاگاں والا میلہ سے سیدھے دفتر ہی آئے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں بس کوئی ایک آدھ بات کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے نظریں چراتے تھے۔ ان کے چہرے جیسے مر گئے تھے۔ آنکھیں ٹھنڈی ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ سب آئے تھے مگر لکڑی کی ٹانگ والا بالی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اُس نے ان سے چائے کے لیے پوچھا تھا مگر اُسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ صرف اُسے اتنا سنائی دیا تھا کہ وہ کل شام ادھر آئیں گے۔ اور پھر وہ چلے گئے تھے۔ اور وہ یہ سب دیکھ کر رو پڑا تھا پھر اُس نے بڑی مشکل سے ماسٹر یامین کو اس کی اِدھر ہی پارک کی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف جاتے دیکھ کر بازو سے کھینچ کر روکا تھا اور پانچ سات منٹ میں اُس نے اُسے جو کچھ بتایا تھا، اُسے سن کر وہ ساری رات روتا رہا تھا۔

''نہیں بی بی قوالی تو اِدھر بدھ کو ہوتی ہے۔ آج تو ہفتہ ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ اور چائے کے کپ میں چینی ڈالتے ڈالتے رہ جاتا ہے۔ اُسے یاد آتا ہے بی بی چائے میں چینی نہیں پیتی۔

''بدھ...... ہفتہ......'' انیلا بے خیالی میں یہ الفاظ دہراتی ہے۔ ''بدھ پہلے آتا ہے ہفتے سے یا...... بعد میں؟'' وہ اور بھی بے خیالی سے پوچھتی ہے۔ اور دور چاہ پریاں والا کے کنوئیں کی چرخی کی طرف دیکھتی ہے۔ ''کیا چرخی گھوم رہی ہے؟ کوئی اس وقت ڈول نکال رہا ہے۔ یا نہیں۔'' وہ حیران ہوتی ہے۔ ''بدھ ہفتے سے پہلے ہے یا بعد میں؟'' بابا خُوشیا بی بی کی بات سن کر پھر رو پڑتا ہے۔ اور پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہے۔ اور تھوڑی بہت کوشش جاری رکھتا ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہ چائے کے کپ کو پرچ سمیت ایک چھوٹی سی ٹرے میں رکھ کر کچن سے باہر آتا ہے۔ بی بی کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر بابا گلاب کے مزار کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ ٹرے صوفوں کے سامنے پڑی میز پر رکھتا ہے۔

''چائے بی بی'' وہ آواز کو قابو کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''بابا جی...... ادھر کنویں پر ڈول...... وہ رات کو۔ نکالتے ہیں۔ وہ بھی بدھ کو؟''

''جی...... بی بی......'' اس کی آواز بھرا جاتی ہے۔ اور وہ تیزی سے کچن میں واپس چلا جاتا ہے۔

''کنویں سے ڈول نکالتے ہیں...... بس......؟'' انیلا سسی پوچھتی ہے۔ ''پوری بات بتاؤ نا! انیلا جانی......'' وہ اٹھلا کر کہتی ہے اور انیلا کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ ''میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں......؟''

''پکڑ لو۔'' انیلا عجیب بے چینی اور شرمندگی سے کہتی ہے اور وہ اُس کا ہاتھ پہلے ہی پکڑ چکی ہے۔ انیلا انیلا سسی کو چاہ پریاں والا کی کہانی سنانا شروع کرتی ہے۔ اور وہ کہانی انیلا سے انیلا تک منہ سے نکل کر کانوں تک جانے کی بجائے دونوں کے ایک دوسرے کو تھامے ہاتھوں کے گہرے لمس کی راہ سے لہروں کی صورت میں آگے بڑھتی ہے۔ سامنے وہ میر مرجان کو اُس کے خیمے سے نکال کر درمیان میں پڑی بڑی چوڑی دری اور تکیوں میں اس کی مرضی کے مطابق بٹھا لٹا رہے ہیں۔ پنو دلاری جو گزشتہ رات کی نسبتاً زیادہ پکے رنگ کی نظر آ رہی ہے ان کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتی ہے۔ صبح کے دس بجے ہیں۔ لکی سٹار تھیٹر میں ان کا دوسرا دن ہے۔ ٹینٹ میں سعید کمال اور سیفی freak show میں جانے کی بات کرتے ہیں، انیلا رات کافی دیر لکھتی رہی ہے وہ اس بات پر بات کرتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں کہ جان کے کردار کے لیے انہیں کوئی گورا ایکٹر کہاں سے ملے گا۔

انیلا سسی کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں۔ اور اس کے جسم سے اٹھتی خوشبو انیلا تک پہنچتی ہے وہ اس کا ہاتھ دباتی ہے اور ہنستی ہے۔ ''یہ تو سب کہانی ہے۔ نا......''

سسی بہت سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ ''نہیں رانی...... یہ ہوتا ہے...... یہ سچی بات ہوگی...... سن میں اور کمال آئیں گے...... چاہ پریاں والا میں...... ہائے ہائے ہم کوئی پریوں سے کم ہیں۔ پانی کا ڈول ڈول اوپر ڈالیں گے...... سُن...... کپڑوں سمیت ہی...... یا کپڑے اتار کر......؟'' دونوں خوب ہنستی ہیں۔

''کپڑے اتار بہن چود کنجری......'' تھانیدار رانا کی آواز آتی ہے۔ ''ادھر بندے بندے کے نیچے پڑتی ہے...... یہاں نخرے کرتی ہے...... کنجری...... سسی بنی پھرتی ہے۔ ہیر کی

ماں...... بہن چود کپڑے اتار...... سوہنی دیکھو ذرا...... دلی...... مرزا صاحباں ہیں۔ سسی پنوں ہیں۔ ہیر رانجھا...... ہا۔ ہا۔ ہا۔ اتار۔ اتار...... دوں ایک ڈنڈا۔ تیری......''

انیلا انیلا کی چیخ سنتی ہے اور تڑپ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور وہ بھی چیختی ہے، تب اس کے ساتھ کے دو مرد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور چیختے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ حوالات کی سلاخوں کو ہلا دیتے ہیں۔

''بلاؤ۔ بلاؤ۔ اس ذلیل...... شخص کو......'' سیفی چلاتا ہے۔

''وہ...... تم۔ سب بچ نہیں...... سکو گے۔ you fucking bastard۔'' بلاؤ...... اس......'' تب تیسرا مرد لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے اور کہتا ہے۔

''باس...... باس...... نہ...... نہ...... کچھ نہ کہو۔ وقت نکالو...... میڈم ساتھ ہیں۔'' ماسٹر یاسین تیز سرگوشی میں کہتا ہے۔

''کیا مطلب؟'' سیفی کچھ نہیں سمجھ پاتا۔ ''بلاؤ۔ اُس خبیث کو......'' ماسٹر یاسین سیفی اور سعید کمال کو سلاخوں سے پیچھے کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور انیلا خود ہی پیچھے ہٹ کر پچھلی دیوار کے ایک کونے میں ڈھیر ہو جاتی ہے۔ جہاں دوسرے کونے میں چوتھا مرد بیٹھا ہے۔ جبار پھٹی پھٹی نظروں سے خلا میں دیکھ رہا ہے۔ اور پھر وہ آ جاتا ہے۔ پتلون اوپر کھینچتا ہوا۔

''گالی کس نے دی ہے......؟'' وہ اب بڑے سکون سے پوچھتا ہے۔

''میں نے...... اور ابھی اور دوں گا......'' سیفی کہتا ہے اور ماسٹر یاسین اُسے جھنجھوڑتا ہے اور بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے کانوں میں سرگوشی کرتا ہے۔ یک دم سعید کمال بھی حیرت انگیز طور پر خاموش ہو کر دیوار کے ساتھ کمر لگائے بیٹھ جاتا ہے۔ اور انیلا جو اس لمحے کی دانش مندی ان سب سے بڑھ کر سمجھ چکی ہے، تھکی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ ''سیفی بیٹھ جاؤ پلیز۔'' سیفی کھڑا رہتا ہے۔ رانا ہنستا ہے۔

''اچھا...... میں تو سمجھتا تھا میں نے گالیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہوئی ہے...... واہ بھئی...... تو دو گالی مجھے۔ ہوں...... رانا ثناء اللہ میرا نام ہے۔ ایس۔ ایچ۔ او بھاگاں والا ہوں...... اس بہن چود تھانے میں...... پر اٹھ دس دن میں...... وہ...... مجھے اوپر لے جانے والے ہیں...... جہاں میری ضرورت ہے...... دو گالی مجھے...... دو...... دو۔ دو......'' وہ دھاڑتا

ہے۔ اور اُس کی آواز کی قوت جیسے انہیں حوالات کی پچھلی دیوار سے بھی پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ انہیں گھورتا رہتا ہے۔ تھیٹر کے منجھے ہوئے اداکار کی طرح وہ اپنی timing پر مکمل دسترس رکھتا ہے۔

''دیکھو...... تم لوگ ان کنجروں کے لیے پھڈا نہ ڈالو...... تمہارے آدمی نے ڈیوٹی دیتے پولیس کے اہلکار پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ میں چاہوں تو سب کو FIR میں لپیٹ دوں...... کیا سمجھے......؟''

اور وہ سب جیسے سمجھ چکے ہیں کہ مکمل خاموشی ہی ان کا بہترین تحفظ ہے۔

''یہ کنجر لوگ ہیں، ان کا تو کام ہی یہ ہے۔ بس عملہ ذرا شغل میلہ کر رہا ہے۔'' یک دم اسے اپنی بات کے کسی مزاحیہ امکان کا احساس ہوتا ہے، وہ ہنس پڑتا ہے۔ ''شغل میلہ...... ہا۔ ہا۔ ہا...... میلہ ہی تو ہے...... شغل اِدھر ہے...... میلہ اُدھر لگا ہے...... ہا۔ ہا۔ ہا...... کیا ہے......؟''

ان کی گہری خاموشی برقرار ہے۔ رانا ثناء اللہ بھی یک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے اور مضحکہ خیز دکھائی دینے لگتا ہے۔

''ویسے میں تمہیں بتا دوں...... تم فلموں والے ہو نا...... یہ سارے بدمعاشی کھاتے۔ زانی دھندے بس سال، دو سال کی بات ہیں...... سب بند ہو جائیں گے...... وہ سب بند کر دیں گے۔''

''کون؟'' سیفی کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔ رانا حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ایک تمسخر آمیز لہجے میں کہتا ہے۔

''او...... میں نے سوچا گالی دو گے...... تم پوچھتے ہو کون......'' وہ پھر خاموش ہو جاتا ہے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو...... یک دم بولتا ہے۔ ''وہ جنہیں نیکی بدی کا پتہ ہے۔ جن کے اندر حیا ہے۔ غیرت ہے۔ عالی جاہ کہتے ہیں یہ سب کچھ پاک کرنا پڑے گا۔ سب کچھ...... سب ننگے کام۔ بند ہوں گے۔ زنا کے سب چور دروازے بند ہوں گے...... عالی جاہ...... کہتے ہیں...... رانا...... اصل نعرہ تو یہ ہے۔ پاک کرو صاف کرو...... اصل کام تو یہ ہے پاک کرو۔ صاف کرو......'' ''اور یہی کام تم اس وقت کر رہے ہو......'' سیفی پھر اپنے اوپر

[...] رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ ماسٹر یاسین اٹھ کر اُسے کندھوں سے دھکیل کر نیچے بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ دیکھتے ہیں کہ رانا کسی شدید قسم کی تبدیلی سے گزرتا ہے۔ اُس کی آنکھیں باہر ابلنے کو آتی ہیں اور وہ غصے سے کانپنے لگتا ہے۔ پھر غلیظ ترین گالیاں کسی پھٹے ہوئے گٹر پائپ سے پھوٹنے والے متعفن سیاہ پانی کے فوارے کی طرح ان سب کے اوپر سے گزرتی رہتی ہیں۔ دیر تک۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا ہے اور شراب کے ابخرے حوالات کے کمرے میں اندر تک مار کر رہے ہیں۔ ''میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں...... بہن چود...... بکواس کرتا ہے۔ اپنی ضمانتوں کی فکر کرو۔ تم...... کنجریوں کا حمایتی بن کر آیا ہے۔'' پھر یک دم اس کی نظریں انیلا کی آنکھوں پر جم جاتی ہیں۔ اور انیلا کی سب خفتہ جبلتیں اُسے بتاتی ہیں کہ یہ تباہی کا لمحہ ہے، وہ تار پر چل رہی ہے اور وہ سامنے سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک لمحے میں سب کچھ برباد ہو سکتا ہے اور پھر انیلا دیکھتی ہے کہ میڈم پونم پوری دنیا سے بے خبر ہو چکی ہے، اس کی مکمل توجہ منہ میں بھرے آگ بننے والے سیال اور دائیں ہاتھ میں تھامی جلتی مشال پر ہے وہ جانتی ہے کہ پٹرول کی پھوار کو کتنی دور سے آگ دکھانی ہے کہ شعلہ دور تک آگے تک اوپر تک پھیل جائے، ذرا ادھر نہیں ہوا تو وہ خود جل کر راکھ ہو جائے گی اور پھر شعلہ دور تک شدت سے آگے پھیلتا ہے۔

رانا اپنی نظریں ہٹا لیتا ہے اور سعید کمال کو جیسے براہ راست مخاطب کرتا ہے۔

''اور کچھ نہیں تو یہ جو تمہارے ساتھ ہے اس کا ہی خیال کر لو...... جو بھی یہ ہے......''

وہ ہنستا ہے اور دائیں ہاتھ سے چٹکی بجاتا ہے۔ ''نہیں تو...... نہیں تو...... بس اتنی دیر لگنی ہے۔ جوان عملہ ہے، گرم خون ہے۔ پتہ بھی نہیں چلنا...... ہا۔ ہا۔ ہا......''

وہ چٹکیاں بجاتا جاتا ہے۔ اور پھر کسی کو حکم دینے کی آواز اُن کے کانوں تک پہنچتی ہے۔

''اوئے۔ شبیرے...... اُس لنگڑے کی دوسری ٹانگ ابھی ٹوٹی ہے کہ نہیں...... بہن چودو...... ساتھ...... کام بھی دیکھو...... کڑی چود باریاں لگا رہے ہیں۔ بند کرو یہ بٹن...... چلو...... چلو...... اس کی جو لکڑ کی ہے...... اسی سے توڑو...... دلے کی دوسری ٹانگ بھی...... ذرا ٹھوک کے......''

انیلا دیکھتی ہے کہ حوالات میں ان کے سامنے کے کمرے میں سورج مکھی کے کھیت

سے نکلا آدمی اور اس کا ساتھی بے سدھ لیٹے سو رہے ہیں۔ وہ سیفی کی بھرائی ہوئی آواز سنتا ہے۔

''سورج مکھی آدمی دیکھ رہے ہو سعید...... وہ سامنے۔''

''کون......؟ اچھا...... وہ...... دونوں...... سو رہے ہیں۔''

''لگتا ہے وہ کوئی بربادی کا فرشتہ ہے اور اپنا مقصد حاصل کر چکا ہے۔ اور اب گہری نیند میں...... مگر فرشتے شاید سوتے نہیں...... اور ان کے ڈرائیور بھی نہیں سوتے۔'' سیفی اس کے ساتھ دیوار سے لگی انیلا کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہے مگر وہ کہیں اور ہے۔

''ہاں...... وہ سب کچھ...... اُس کے بعد شروع ہوا...... جب اس بندے نے پیسے لٹانے شروع کیے...... کون ہیں یہ لوگ......؟'' ماسٹر یاسین سرگوشی میں پوچھتا ہے۔

وہ بالی کی چیخیں پھر سننا شروع کرتے ہیں۔ جواب پہلے سے بھی زیادہ بلند ہیں اور تھانہ بھاگاں والا کے سمعی بصری خلا میں بلند ہوتی کسی بھی دوسری چیخ سے زیادہ بلند ہیں۔

''چیف۔ بالی ایک بہادر انسان ہے۔ لیکن چیخ پر قابو کوئی نہیں پا سکتا۔ اور کسے ہیں پانا بھی نہیں چاہیے...... لیکن سوال یہ ہے کہ ایک رات میں کوئی کتنی دفعہ چیخ سکتا ہے؟ کتنی دفعہ کسی کو چیختا سن سکتا ہے؟ جبار صاحب گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کا کوئی ریکارڈ ہے؟ ایک رات میں سب سے زیادہ چیخیں مارنے کا......؟'' سیفی کہتا ہے اور وہ دوسرے کونے کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر جبار جمع کرنے والا گہری نیند سو چکا ہے۔ تب ماسٹر یاسین گھبرائی ہوئی مدھم آواز میں منت کرنے کے انداز میں کہتا ہے۔

''باس...... سیفی صاحب...... مم۔ مم۔ مطلب ہے...... زیادہ باتیں نہ ہی کریں۔۔۔ تو...... اچھا ہے...... خاموش رہیں......''

وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی بات نہیں کرتے صرف سنتے ہیں۔ اور پھر بالی کی چیخوں اور دوسری چیخوں میں وہ انیلا کی آواز ابھرتی سنتے ہیں۔ اور آواز سے پہلے بھی اس آواز کی ڈرانے والی اجنبیت سنتے ہیں۔

''ہاں۔ خاموش رہو۔ مت بولو...... تم مجھے بچانا چاہتے ہو۔ تو مت بولو۔۔۔ ایک ایک...... انیلا ہی کافی ہے...... انیلا تو کنجری ہے...... میں ایک شریف عورت ہوں۔ میرا نام انیلا بلال ہے...... میرا باپ ایک معزز آدمی ہے...... میں کنجری نہیں ہوں۔۔۔ ایک انیلا کافی ہے...... تم...... مجھے ریپ نہیں کر سکتے...... ایک ہی سسی کافی ہے۔۔۔ ایک ہی ہیر کافی ہے۔۔۔ ایک ہی سوہنی کافی ہے...... ایک...... ایک...... ایک ہی......'' وہ قہقہے لگاتی ہے۔

سیفی اور سعید کمال جھپٹ کر اُس کے سامنے آتے ہیں۔ سیفی اُسے جھنجھوڑتا ہے۔

''انیلا۔ انیلا...... کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے تمہیں......؟ انیلا...... ہوش میں آؤ۔ نہ کرو۔۔۔ نہ کرو......''

''نہ کرو۔ نہ کرو...... کچھ نہ کرو۔ بند کرو۔ بند کرو۔ سب بند کرو۔۔۔ میں انیلا بلال ہوں...... میں ایک فلم بنا رہی ہوں جس کا نام ہے 'یہ فلم نہیں بن سکتی۔۔۔' یہ ایک سرئیلسٹ فلم ہوگی...... جس میں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ حقیقت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔۔۔ اور غیر حقیقت کہاں ختم...... صفدر سلطان تم مجھے ریپ نہیں کر سکتے صفدر...... میں کنجری نہیں ہوں۔۔۔ میں ایک معزز شریف عورت ہوں...... جاؤ...... اپنی سب ہیروئنوں کو ریپ کرو۔۔۔''

انیلا اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ سیفی اور سعید کمال بھی۔

''ناک بند کر کے دیکھیں۔ دورہ پڑ گیا ہے۔'' ماسٹر یاسین روہانسی آواز میں کہتا ہے۔

''بکواس مت کرو'' سعید کمال غراتا ہے اور انیلا کہتی ہے۔

''وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ کسی لمحے وہ میری گردن میں گولی مار دیں گے۔ اب۔ اب۔ اب...... اب...... یہ فلم پراگ سرئیلسٹ فلم فیسٹیول میں اگلے سال ہٹ ہوگی...... اب۔ اب...... اب......''

سیفی انیلا کو بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے۔ اور اس کے سر کو اپنی گردن کے ساتھ دبا لیتا ہے۔

انیلا کا جسم کانپ رہا ہے اور آواز ڈوب رہی ہے۔

سوانگ پروڈکشنز کے دفتر کی لمبی کھڑکی کے ساتھ کھڑی انیلا بلال صوفوں کی میز پر رکھا چائے کا کپ اٹھاتی ہے تو اس کا ہاتھ لرزتا ہے۔ وہ ٹھنڈی چائے کا کپ پھر واپس رکھ دیتی ہے۔ پھیکی ٹھنڈی چائے بہت ہی بُری لگتی ہے۔ وہ واپس کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔

بادل زیادہ گہرے ہو چکے ہیں۔ چاہ پریاں والا کے کنویں کی چرخی کا اب اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ گھوم رہی ہے یا ساکن ہے۔

"بی بی۔ چائے اور بنا دوں؟" اسے بابے خُوشیے کی آواز آتی ہے۔
"نہیں بابا جی...... میں اُدھر جاؤں گی۔ باہر قبرستان کی طرف...... یہ لوگ آئے نہیں ہیں؟"
"بی بی۔ آپ پہلے آگئی ہیں......"
"ہاں...... شاید۔ ان لوگوں میں سے کسی کا فون تو یہاں نہیں آیا تھا......؟ سیفی کا، سعید کا......؟"

"نہیں...... بی بی......"

"جی سر۔ وہ hysteric ہو گئی تھی......" سعید کمال ریسیور دائیں سے بائیں کان پر منتقل کرتا ہے اور اپنی بیڈ روم کی کھڑکی کی راہ سے عقبی لان کی طرف دیکھتا ہے۔ بادل گھنے ہیں مگر کیا بارش ہو رہی ہے۔ وہ جان نہیں پاتا۔

"اس طرح کی سچوایشن میں تو کوئی بھی collapse ہو سکتا تھا۔ یہ بہت تکلیف دہ ہے...... بہت...... اور مجھے اب...... اِس کا پتہ چل رہا ہے" سر کی آواز میں ایک لرزش ہے جیسی سعید کمال نے پہلے کبھی نہیں سنی......

"میں کل شام سے آپ کا نمبر ٹرائی کر رہا ہوں...... سر...... ہم واپس آگئے تھے۔ لیکن نمبر اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا......"

"اوہو۔ اوہ...... یہ۔ یہ...... مصیبت ہے۔ مجھے جلد کہیں۔ مجھے کچھ انتظام کرنا ہوگا...... سیکورٹی والے چاہتے ہیں میں رہائش گاہ تبدیل کر لوں...... تمہیں بتایا تھا نا...... اس میٹنگ کے بعد......"

"یس سر...... جس میں آپ نے انہیں کہا تھا...... کہ......"

"میں نے بہت کچھ کہا تھا...... چھوڑو...... دفع کرو...... پھر۔ پھر...... پھر خیریت رہی...... انیلا......؟"

"جج۔ میرا خیال...... جی۔ آپ سر آ کب رہے ہیں؟"

"بہت جلد۔ اب تو تم لوگوں سے ملنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس طرح کا واقعہ Shatter کر دیتا ہے انسان کو......"

انیلا چاہ پریاں والا کی لکڑی کی بھاری چرخی گھماتی ہے اور گھماتی ہے۔ رسے سے

بندھا پانی کا ڈول اوپر تک آ جاتا ہے۔ وہ ڈول باہر نہیں نکالتی بس پانی کو دیکھتی رہتی ہے۔ پھر یک دم چرخی پر مضبوطی سے جمے اپنے ہاتھ کو ہٹا لیتی ہے۔ چرخی پرشور آوازیں نکالتی الٹی گھومتی ہے اور ڈول تیزی سے نیچے کو گرتا ہے اور پھر ایک دھماکہ دار چھلاکے سے کنویں کا پانی پھر کنویں کے پانی میں جا ملتا ہے۔ انیلا پھر چرخی گھماتی ہے۔ اوپر۔ اوپر۔ اوپر...... ڈول پھر اوپر آ جاتا ہے...... پھر چھوڑ دیتی ہے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک قبر کے تعویز پر سر جھکائے بیٹھا بابا خوشیا انیلا کے پاس جاتا ہے۔ بے چینی سے اٹھتا ہے۔

"بی بی۔ بی بی...... ایسے رسہ ٹوٹ جاتا ہے۔ چرخی بھی پرانی ہے۔"

کچھ دور بابے گلاب کے مزار کے دو مجاور سنگ مرمر کے فرش پر گری گلاب کی پتیوں کو نرم جھاڑو سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں مگر پھوار نے پتیوں کو فرش پر جما دیا ہے۔
"لال گلاب رنگ چھوڑ جائے گا" ایک کہتا ہے۔

"ہاں۔ لال گلاب سنگ مرمر پر مرتا ہے۔ رنگ دے جاتا ہے۔" "دھو دے" دوسرا کہتا ہے۔ پھر دونوں چاہ پریاں والا کی طرف دیکھتے ہیں۔ دفتروں سے آئی عورت پھر چرخی گھما رہی ہے۔ وہ دونوں بابے خُوشیے کو جانتے ہیں۔

"سودائی ہے۔" ایک کہتا ہے۔

"سودائی نہ ہو تو ادھر کیوں آئے۔"

ڈول پھر اوپر تک اٹھ آتا ہے وہ پھر پانی میں دیکھتی ہے۔ پھر اُسے احساس ہوتا ہے کہ اُدھر سے کوئی آیا ہے جدھر سے وہ آئی ہے۔ سیفی قریب آ رہا ہے۔ وہ آ جاتا ہے۔ وہ اُسے دیکھتا ہے اور کچھ پوچھتا ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس کا ہاتھ چرخی کو روکے ہوئے ہے۔ سامنے پانی سے لبالب بھرا ڈول واپس کنویں میں گرنے کے لیے رسے پر لرز رہا ہے۔ وہ گہری سانس لیتی ہے۔

"آؤ۔" وہ کہتی ہے۔ سیفی اس کے قریب آ جاتا ہے۔ وہ بایاں ہاتھ بڑھا کر ڈول کو پکڑتی ہے دایاں چرخی سے ہٹا لیتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے ڈول اوپر اٹھاتی ہے۔ اوپر۔ اوپر۔ اوپر وہ ڈول اُلٹتی ہے۔ چاہ پریاں والا کا پانی دونوں کو شرابور کر دیتا ہے۔ سیفی کچھ نہیں بولتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ وہ اپنا بازو اُس کے کندھے تک پھیلا دیتا ہے۔ قبر کے تعویز کے

سہارے بیٹھا بابا خوشیا آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا ہے۔ روتا ہے اور جھومتا ہے۔

''ہاں۔ تم انہیں بتا سکتے ہو۔ میں یہ معاملہ ایسے ہی نہیں چھوڑوں گا...... اس کی ہائی لیول انکوائری ہوگی۔ تم لوگوں کو بھی آنا پڑے گا۔ اور وہ تھیٹر والے...... وہ کہاں ہوں گے......؟'' بہزاد پوچھتا ہے۔

سعید کمال گہری سانس لیتا ہے۔ ''مل۔ ہی۔ جائیں گے سر...... کہیں نہ کہیں......''

خاموشی کے ایک وقفے کے بعد اسے سر کی آواز آتی ہے۔ I am really so sorry for them یہ ایسے ہی نہیں ختم ہوگا۔ سعید...... نہیں۔ نہیں۔ This is outrageous۔''

''اس تھانے دار کو بھی...... یقیناً اس بات کا احساس ہو گیا تھا...... جب اُس نے اگلے دن ہمیں جانے دیا...... وہ کافی نرم پڑ رہا تھا...... وہی رفع دفع کی bull shit...... اور پھر بار بار ٹیلی فون پر کسی اپنے عالی جاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا......''

''اور تمہارا کیمرہ مین...... وہ کیسا تھا......؟ تشدد...... کوئی نشان......؟''

''بالی کو اُس نے وہاں سے کہیں ہٹا دیا...... ڈاکٹر کی رپورٹ...... نہیں آئی...... وہی بدمعاشی لیکن وہ یقیناً افراتفری میں تھا...... وہی بار بار ٹیلی فون ڈائل کر رہا تھا۔ ہماری بات سن ہی نہیں رہا تھا...... ''آپ آزاد ہیں جی جائیں۔'' ''ہوں...... جائیں۔ چلو۔ اسے بھی چھوڑ دیں گے...... رپورٹ آلے......'' اور ریسیور کان سے لگا ہے...... اور پھر وہی عالی جاہ سے بات کرا دیں...... یہ چل رہا تھا۔''

''کیا کہا تم نے عالی...... جاہ......؟'' سعید کمال حکمت بہزاد کی آواز سنتا ہے۔

''یس سر...... وہی...... کوئی لنک ہوگا...... اُس کا......''

''عالی جاہ......'' اسے پھر بہزاد کی آواز آتی ہے۔ اور پھر خاموشی کا ایک وقفہ جو کافی طویل ہے۔

''سر...... آپ...... ہیلو؟'' آخر سعید کمال ہچکچاہٹ سے کہتا ہے۔

''آ۔ ہاں...... میں۔ ادھر ہی ہوں...... میرا خیال ہے وہ تھانیدار کہاں بات کرتا

...... میں جانتا ہوں...... میٹنگ پر تمہیں بتاؤں گا اور یہ ٹریجڈی تو ہے۔ لیکن دوسرے معاملات بھی میں سمجھتا ہوں ڈسکس کریں گے۔ فلم کی فنڈنگ کا مسئلہ......''

وہ دونوں پریوں کے کنوئیں سے ہٹ کر قبرستان کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ سرکنڈوں کو ہٹاتے جھاڑیوں سے گزرتے وہ قبرستان میں گہرا اتر جاتے ہیں۔ بابا خوشیا ویسے ہی سر جھکائے پیچھے چلتا ہے۔ سیفی گھوم کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ ''بابا جی آپ چلو...... چیف آنے والا ہے۔ ماسٹر بھی۔ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں......''

بابا خوشیا واپسی کے لیے مڑتا ہے۔ پھر ہچکچاتا ہے رُکتا ہے۔ کہتا ہے ''کن من ہو رہی ہے۔ مٹی گیلی ہے۔ ڈھیلی ہے۔ کبھی کبھی پیر کے نیچے کوئی قبر بیٹھ جاتی ہے اور بندہ نیچے کسی اور کی قبر میں چلا جاتا ہے۔ ذرا دھیان سے......''

سیفی اور انیلا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سیفی آسمان کی طرف دیکھتا ہے جو درختوں کی ٹہنیوں میں سے نظر آتے گہرے سرمئی بادلوں سے بھی کہیں پیچھے ہے۔

''یہ کن من نہیں بابا جی۔ پھوار ہے...... اور فکر نہ کریں ہم اپنی قبروں میں ہی اتریں گے۔ ادھر دیکھ لیتے ہیں کہاں ہمارا نام لکھا ہوا ہے......؟''

بابا خوشیا جذباتی انداز میں سر ہلاتا چلا جاتا ہے۔

انیلا کے چہرے پر کسی بات سے چونک جانے کے تاثرات ہیں۔ ''میرے خدا۔ میں تو بھول ہی گئی تھی......''

''کیا؟'' سیفی پریشانی سے پوچھتا ہے۔

''اِدھر کہیں ضرور...... میرا نام لکھا ہوگا۔ اِدھر کہیں ضرور...... میرا نام لکھا ہوگا۔''

''اِدھر کہیں ضرور میرا نام لکھا ہوگا...... اِدھر کہیں ضرور میرا نام لکھا ہوگا۔'' سیفی کہتا ہے اور گہری سانس لیتا ہے۔ بھیگی ہوا اس کے اندر اترتی ہے۔ اور سکون دیتی ہے۔ پھوار میں سے اب اچانک کوئی قطرہ گرتا ہے اور بابے خوشیے کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ قبروں میں سے گزرتے ایک میڑھے میڑھے رستے پر قدم بڑھاتے ہیں۔ پھر دائیں بائیں دور تک پھیلے ان گنت اونچے نیچے چھوٹے بڑے۔ کنکریٹ کے سادہ۔ سنگ مرمر کے عالی شان۔ غریبانہ۔ امیرانہ کتبوں پر نظریں ڈالتے آگے بڑھتے ہیں۔

انیلا۔ انیلا۔ انیلا۔ انیلا۔ سی۔ انیلا۔ انیلا۔ سی۔ انیلا...... انیلا...... سیفی۔ سیفی۔ سیفی۔ انیلا۔

''جبار کی کتبہ شماری کے مطابق پچھلے ایک سال میں خالد اور رضیہ مرنے والوں میں سرفہرست رہے۔'' اچانک سیفی کہتا ہے۔

انیلا کچھ نہیں کہتی۔ سیفی کچھ نہیں کہتا۔ نام۔ نام۔ نام۔ نام۔ نام۔ نام۔

''اس کا نام کیا ہے؟'' تھانیدار رانا ثناء اللہ جبار کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے۔

''کس کا نام؟'' جبار پوچھتا ہے۔

''تیرا اور کس کا؟......'' رانا سامنے کھڑے سیفی۔ سعید کمال۔ انیلا بلال اور ماسٹر یاسین کی طرف سوالیہ سی نظریں گھماتے ہوئے کہتا ہے۔

''جبار۔''

''جبار کیا......؟ پورا نام بتا۔''

جبار تھانیدار کی میز پر رکھی مختلف چیزوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کی نظریں ایک قلم دان پر جم جاتی ہیں۔

''پورا نام......'' رانا پھر چڑچڑاہٹ سے پوچھتا ہے۔

''عبدالجبار کرلو......''

''کرلو...... کیا مطلب کرلو...... کہتا ہے کرلو......'' رانا حیرت سے اُس کی طرف اور باقی افراد کی طرف دیکھتا ہے۔ ''یہ بندہ مجھے مشکوک لگتا ہے۔ یہ آپ کے ساتھ ہے......؟ کیسے؟ یہ ڈائریکٹر صاحب ہے۔ رائٹر دو ہوئے۔ کیمرہ مین...... دوسرا وہ جس نے ہمارے حوالدار کا سر کھول دیا ہے۔ 375.302...... لگتی ہیں اُس پر...... ماکھے...... ماکھے......''

ایک پولیس والا آتا ہے۔

''جی...... رانا صاحب...... جی۔''

''اوئے۔ اُس چُوہے ڈاکٹر کی رپورٹ آئی ہے یا کہ نہیں ابھی تک......؟'' اک دم چونک کر انیلا کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیتا ہے۔ ''معاف کرنا میڈم...... اس کام میں زبان گندی ہو جاتی ہے۔''

انیلا اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔ اُس کا چہرہ باقی سب کی طرح مکمل طور پر بے حس ہے۔ رانا پھر جبار کی طرف اور زیادہ شدت سے متوجہ ہوتا ہے۔

''کام کیا کرتا ہے تو......؟''

جبار چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ ''ہوں......؟ ہاں۔ کام...... میں جمع کرتا ہوں......''

''جمع کرتا ہے۔ کیا......؟ چوری کا مال جمع کرتا ہے......؟''

اک دم جبار انگلی سے قلم دان کی طرف بار بار اشارے کرتا ہے۔ ''یہ۔ یہ۔ یہ۔ جو پلاسٹک کے قلم دان ہیں۔ ان کا سب سے بڑا جمع کرنے والا۔ بنگلور انڈیا میں ہے۔ اٹھارہ ہزار سات سو چار قلم دان ہیں اُس کے پاس۔ گنیز بک کا ریکارڈ ہے...... یہ بات......''

رانا اب حقیقی حیرت سے جبار کی طرف دیکھتا ہے۔ اور پھر سعید کمال کی طرف اور پھر سر کے قریب انگلی گھماتا ہے۔

''پاگل ہے۔''

''چھوڑیں تھانیدار صاحب...... جبار صاحب۔ ہمارے props پراپرٹی سیکشن کے انچارج ہیں۔ فلم یونٹ میں ہی ہیں......''

''ہچھ۔ ہچھ۔ ہچھ......'' وہ سر ہلاتا ہے۔ ''ٹھیک...... ہے جی......'' سامنے رکھے کاغذ پر نظر ڈالتا ہے۔ ''تو نام پتے ہو گئے......''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ بے چینی سے اٹھاتا ہے۔

''ہیلو۔ جی۔ جی...... سیکرٹری صاحب...... اچھا جی...... آ رہے ہیں جی...... اچھا جی...... حضرت۔ عالی جاہ کے PA کو نوٹ کرا دیا ہے۔ رانا بات کرنا چاہتا ہے......؟ مہربانی۔ بڑی مہربانی...... ہاں کچھ پھڈا ہی ہے...... حضرت ہم تو عالی جاہ کے قدموں کی خاک ہیں...... ان کے حکم پر گند صاف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پر دیکھو جی حضرت جی...... جو گند صاف کرتا ہے...... اس کو۔ اس پر۔ آپ بھی کبھی۔ تھوڑا بہت گند لگ ہی جاتا ہے...... لاکھ بچے...... تھوڑا گند لگ ہی جاتا ہے۔ ہاں جی۔ جی میں۔ جی نہیں۔ آدھے گھنٹے میں کرتا ہوں جی فون......''

رانا رسیور رکھتا ہے۔ یک دم عجیب ہونق سے انداز میں سامنے پڑے قلم دان کو

دیکھتا ہے۔ اُسے چھوتا ہے۔ پھر اُسی انداز میں جبار کی طرف دیکھتا ہے''اسے جمع کرتے ہیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا......''

''یہ اسے...... یہ پیپر ویٹ بھی...... یہ بڑا پاپولر collector item ہے۔ فرانس کی عورت کے پاس۔ ستر ہزار نو سو ساٹھ شیشے کے پیپر ویٹ ہیں۔''

رانا یک دم بوکھلا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور سعید کمال کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ''ٹھیک ہے جی۔ ڈائریکٹر...... میری طرف سے ابھی آپ آزاد ہیں۔ نام بچے ہو گئے ہیں۔ بس دعا کریں۔ غیاثا حوالدار مرے نہ...... نہیں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ بڑی بُری سٹ ماری ہے اُس نے۔ آپ کے بندے نے...... کیا نام...... کاغذ کی طرف دیکھتا ہے۔ اقبال احمد...... عرف۔ بالی۔ ہاں بالی......''

''میرا خیال ہے میں سمجھ رہا ہوں۔ پر تمھیں کیا کہتی ہے پیو دلاری۔ نام تو پیارا ہے۔'' (سیفی بالی سے پوچھتا ہے)۔ ''آپ بھی پیاری ہے سر جی...... آنکھیں دیکھیں...... کہتی ہے ادھر ہی آ جاؤ۔ تھیٹر میں...... بنا بنایا کیدو لنگڑا مل گیا ہے......'' بالی ہنستا ہے اور کہتا ہے۔ ''یہ بڑی ودھ عورتیں ہیں سر جی۔ آدھی سے زیادہ تو میڈم جی پر عاشق ہو گئی ہیں......''

انیلا دیکھتی ہے کہ جہاں کبھی لکی سٹار تھیٹر تھا وہاں اب ایک بہت بڑا بدصورت مٹی کا قطعہ ہے جس کے اوپر میلہ بھاگاں والا میں ان کے شوز کے تماشائیوں کے ان گنت ٹکٹ بکھرے ہوئے ہیں۔ پھٹے پرانے چکنے لفافے...... جہاں کبھی کچن تھا وہاں سیاہ کوئلے اور راکھ کا ڈھیر نظر آتا ہے۔ درمیان میں میر مرجان کی دری کی حدود ابھی تک باقی ہیں اور سب خیموں قناتوں کے اکھڑے کھونٹوں کے نشان۔ اور سب سے بڑا مٹی کا وہ اونچا لمبا چوڑا چبوترا اب بھی نظر آ رہا ہے جو لکی سٹار تھیٹر کا سٹیج تھا۔ سعید کمال ماسٹر یاسین کے کان میں کچھ کہتا ہے اور وہ کیمرے کا رخ ادھر کر کے تصویریں بنانے لگتا ہے۔

انیلا اُدھر سے نظریں ہٹا لیتی ہے۔ اور دیکھتی ہے کہ مٹھائی کی بڑی دوکان والا ایک آدمی ان سب کا سامان سیفی کے حوالے کر رہا ہے۔ جبار ساتھ کھڑا ہے۔ ''یہ سارا سامان بوٹا آپ کا دے گیا ہے۔ اور یہ کاغذ اس نے دیا تھا۔ کسی جبار صاحب کو دینا ہے۔''

''میں جبار ہوں۔ یہ بوٹور کی لسٹیں ہوں گی۔'' جبار تیزی سے کاغذ اس کے ہاتھ

سے چھین لیتا ہے۔ سیفی گہری سانس لیتا ہے ''اور کچھ بتایا۔ اُس نے...... کدھر گئے وہ لوگ......؟''

''اللہ بہتر جانتا ہے جی...... مجھے کچھ بتایا نہیں......'' صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص جان چھڑانا چاہتا ہے۔

''کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں جی...... نیامت...... پُر شیرہ جلیبیوں کا حساب سے بتانا...... کل آخری دن ہے ادھر/...... پچتا نہ پھرے۔ کھنڈ پہلے ہی مہنگی ہے......''

''ہوں...... اور کوئی بات نہیں کی......'' سیفی بہت جھجکتے ہوئے پوچھتا ہے۔ پہلے مٹھائی والے کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات ابھرتے ہیں پھر جیسے یک دم اُسے کچھ یاد آتا ہے۔

''ہاں...... سچ...... ان کا کوئی وڈا وڈیرا ادھر رات مر گیا تھا۔ یہ اُس نے بتایا''

''اوہ'' سیفی کے چہرے پر گہرا سا سایہ اتر آتا ہے۔ ''کون۔ کون......؟''

مٹھائی والے کی بے زار لاتعلقی پھر واپس آ جاتی ہے۔ ''پتہ نہیں جی...... بس وہ آئے تھانے سے۔ گھنٹے دو نہیں لگائے انہوں نے پٹ پٹانے میں...... ٹمک پورے کر لیں اپنے...... وہ بیگوں۔ ٹیچی کیسوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''انیلا۔ انیلا۔ انیلا۔ سی انیلا۔ سی......''

انیلا اور سیفی رضیہ بیگم ولد شہاب دین عمر تیس سال کی قبر کے تعویز پر بیٹھ جاتے ہیں۔

''کہیں نہیں...... میرا نام کہیں نہیں......'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہتی ہے۔

''وہ میر مرجان ہی ہوگا...... جو اس رات مر گیا......'' وہ سیفی کی بوجھل آواز سنتی ہے۔

''ہاں...... اور کون ہو سکتا ہے......؟'' انیلا کہتی ہے۔

''سنو۔ سنو۔ سنو...... میر مرجان کہتا ہے۔ کوئی اس تھانے دار سے پنگا نہ لے بس اپنا وقت پورا کرو اور جاؤ......'' سسی کہتی ہے۔

انیلا جھومتی آتی ہے، اس کے ساتھ سعید کمال رانجھا ہے۔ ''کمالے تم آج اس فرخو لُلی چندری کے زیادہ ہی صدقے واری نہیں ہو رہے تھے؟''

''تو من موہنی ہے سسی اب کیا کریں...... نہ تو ہیر بن سکتی ہے نہ میں پنّوں...... پر

پارٹ تو پارٹ ہے۔ پارٹ تو کرتا ہے......"

"جو پارٹ میں عاشقی کرتا ہے۔ وہ عاشقی میں بھی پارٹ کرتا ہے۔" میر مرجان لرزتی آواز میں کہتا ہے اور اُس کا سر کانپتا ہے۔

پھوار اب بھی برسے جاتی ہے۔ پانی کا ایک قطرہ انیلا کی آنکھ سے ڈھلکتا ہے جو بارش کا قطرہ نہیں ہے۔ انیلا روتی ہے۔ بہت روتی ہے۔ سیفی اس کے سر کو اپنے کندھے پر سہارا دیتا ہے۔ اُس کے آنسو پریوں کے کنویں کے پانی سے بھیگے اُس کے لباس میں جذب ہوتے جاتے ہیں۔

....

حسن ٹھٹھک کر اپنے قدموں پر رُک جاتا ہے۔ اور تیزی سے ایک درخت کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ اپنے ہم نام کی قبر سے ذرا دور ایک قبر کے تعویز پر بیٹھے مرد عورت کو وہ اگر لحہ بھر کے لیے اور نہ دیکھتا تو بالکل ان کے سامنے پہنچ جاتا۔ عورت اپنا سر مرد کے کندھے سے اٹھاتی ہے اور اپنے آنسو پوچھتی ہے۔ اور وہ نرمی سے اس کے ہونٹ چومتا ہے۔ رضیہ بیگم ولد شہاب دین، حسن پڑھتا ہے۔

'ہو سکتا ہے یہ عورت ان دونوں میں سے کسی کی ماں ہو۔ عمر تیس سال......نہیں نہیں بہن ہوگی......"

مرد اور عورت اپنے اپنے بائیں ہاتھ ایک دوسرے پر رکھتے ہیں۔ اور ان کی انگلیوں میں نیلم اور زمرد کے نیلے اور سبز پتھر سرمئی روشنی میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ دیر تک گہری نظروں سے اپنی انگلیاں۔ اپنے سبز اور نیلے پتھر دیکھتے رہتے ہیں۔ اور بارش پھوار سے بدل کر رِکن مِن میں بدل جاتی ہے۔

"شوقین لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔" مرد کہتا ہے۔ عورت کچھ نہیں کہتی، سر اوپر اٹھا کر دیکھتی ہے لحہ بھر کے لیے خوشی کی ایک نامعلوم سی لہر اُس کے چہرے پر سے گزر جاتی ہے۔ وہ دونوں اُٹھتے ہیں اور اس سمت سے مخالف سمت کی طرف بڑھ جاتے ہیں جدھر سے حسن آیا ہے۔

اور پھر حسن پر وہ کیفیت آتی ہے۔ جو اُس کی اچنتی منظر بینی میں پہلے کبھی نہ تھی۔

"میں نے پہلے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ یہ سب ایسا ہی...... یہ دونوں کہیں...... بہت قریب سے دیکھے ہیں" یاد سے خالی یاد حسن کے ذہن کو بھر دیتی ہے اور ایک سنسناتا خلا اس کے سر میں اتر آتا ہے۔ پاؤں رکھنے کو کوئی جگہ نہیں۔ حرکت کرنے کو کوئی سمت نہیں۔ کچھ بھی کہیں نہیں۔ حسن کہیں نہیں۔

ادارتی نوٹ

اچنتے خوف کی داستان یعنی حسن کی مختصر ترین سوانح کے مطابق اپنا ہم نام کتبہ دیکھنے کے واقعات حسن کی گمشدگی کے تین ایام کے بعد پیش آتے ہیں۔ چونکہ 'حسن کی صورت حال' بیانیے کے تقاضوں کے مطابق یہ ایام سوانگ پروڈکشنز کی میلہ بھاگاں والا سرگرمی کے متوازی ہیں اس لیے مذکورہ بالا کرداری تعامل (interaction) زمانی و مکانی ابہام پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے شروع میں واضح کر دیا تھا ہم 'اچنتے خوف کی داستان' کو حسن کی صورت حال کی مستند بنیاد نہیں سمجھتے۔ ترمیم شدہ زمانی تسلسل حسن کی اس سوانح کے پس منظر میں غیر احتمالی تو ہو سکتا ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اور...... وہی بات...... جو ناممکن نہیں اُسے ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

کمپنی ڈاکٹر ہارون پاشا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ benzo کے شدید ضرر رساں مستقل ذہنی اثرات کے اس کیس کو جب تک ممکن ہو سکا زیر مشاہدہ/زیر علاج رکھے گا۔ اور اگر ممکن ہوا (آخر کیوں ممکن نہیں ہوگا) تو اس پر کوئی میڈیکل پرچہ لکھ کر کہیں چھپوانے کی کوشش بھی کرے گا۔

حسن کمپنی ڈرائیور نور خان سے پوچھتا ہے بابا بلیک شیپ اور آئینوں کے سامنے آئینوں میں حسن ہی حسن کے درمیانی وقت میں وہ کہاں تھا؟...... تھکا ہوا۔ بیزار نور خان خاموش رہتا ہے مگر صاحب کچھ پوچھ رہا ہے کچھ تو بتاتا ہے، وہ جلد جلد صاحب کی یاد سے خالی یاد کو اپنی یاد سے بھر دیتا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز۔ قطعاً ناقابل یقین دنیا ہے۔ ناممکن۔ ناممکن۔ ناممکن۔ ناممکن...... آئینوں کے اندر لاکھوں حسن بولتے ہیں۔

اب بارش برتی ہے۔ حسن دیر تک سبز نیلے پتھر کی انگوٹھیاں پہنے مرد وعورت کو دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر واپسی کے لیے ہم نام کے کتبے کے قریب سے گزر جاتا ہے۔ وہ پھر آئے گا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے وہ قبر کے تعویز کے مرکز میں بھری گیری مٹی کی زمین میں اپنے اُگائے سورج مکھی کے پودوں کو دیکھتا ہے جو ابھی بہت چھوٹے ہیں اور پہچانے بھی نہیں جاتے کہ کبھی ان پہ سورج مکھی کے پھول آئیں گے۔ حسن جاتا ہے۔

سوانگ پروڈکشنز کے دفتر میں سعید کمال، ماسٹر یاسین اور بابا خُوشیا ایک مجموعی انتظار کی کیفیت میں جو سعید کمال کی گول میز سے کونے کی کھڑکی تک اور واپسی کی بے چین چہل قدمی۔ صوفے پر بیٹھے ماسٹر یاسین کی مسلسل ہلتی ٹانگ اور کچن میں بابے خُوشیے کی مسلسل کھٹ پٹ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہر بار کھڑکی کے قریب پہنچ کر واپس مڑتے وقت سعید کمال باہر چاہ پریاں والا کے احاطے میں پارک کی گئی گاڑیوں اور پیچھے کسی استوائی جنگل جیسے گھنے درختوں میں چھپے قبرستان کی طرف ایک نگاہ ڈالتا ہے کہ وہ دونوں اُسے واپس آتے ہوئے نظر آئیں۔

اُسے ماسٹر یاسین کے اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے، وہ رکتا ہے اور اُس سے بات کرتا ہے۔

''سیٹھ صفدر سلطان کا مالی تعاون ہمارے لیے اب بھی بہت ضروری ہے ماسٹر اگر یہ فلم بنی ہے تو......''

''سیٹھ صاحب کل ادھر آئیں گے باس۔ انہوں نے مجھے کہا ہے'' ماسٹر کہتا ہے اور گھوم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

''Oh I see......'' اس کے چہرے پر تشویش کی ہلکی سی لہر ''تم نے یہ سب کچھ انہیں بتایا تو نہیں......؟''

''نہیں باس......'' ماسٹر ہچکچاتا ہے پھر کہتا ہے۔ لیکن میں نے...... بلی کو ضرور بتایا...... بالی کا معاملہ تھا۔''

سعید کمال کے چہرے کا تاثر جوں کا توں رہتا ہے۔ گہری سانس لیتا ہے۔ ''آ۔ yes...... بلی۔ indeed...... ہوں۔ of course۔''

سعید کمال پھر آگے بڑھ جاتا ہے گول میز لحہ بہ لحہ اُس کے قریب آ رہی ہے۔ ماسٹر اس انتظار میں کھڑا ہے کہ واپس پلٹنے پر شاید وہ پھر اُس سے کوئی بات کرے گا۔ لیکن وہ واپسی

میں اسے نظر انداز کر کے کھڑکی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

ماسٹر بیٹھنے کی بجائے کچن کی طرف بڑھتا ہے۔ سعید کمال کھڑکی کے سامنے سے گھومتے ہوئے باہر نظر ڈالتا ہے۔ پھر واپس مڑتا ہے۔ عین اسی وقت بیرونی دروازے سے انیلا اور سیفی اندر داخل ہوتے ہیں۔

ان کے لباس بھیگے ہوئے ہیں لیکن اُن کو کس قدر بارش کے پانی نے بھگویا ہے اور کتنا پریوں کے کنوئیں کے پانی نے اب کوئی نہیں بتا سکتا۔ یوں ان میں سے کوئی بھی بتانے سننے۔ پوچھنے میں کوئی دلچسپی لیتا نظر نہیں آتا۔ کوئی بھی انیلا، سیفی سے کچھ نہیں پوچھتا۔

پھر کچھ بھی کہے بغیر وہ گول میز کی طرف بڑھتے ہیں اور سعید کمال اپنی مخصوص نشست اور انیلا سیفی دائیں بائیں اور ساتھ ماسٹر یاسین بیٹھ جاتا ہے۔ بابا خُوشیا ایک بڑا سا تولیہ خاموشی سے لاتا ہے اور سیفی اور انیلا کو دکھاتا ہے۔ دونوں اٹھ کر باری باری اپنے بال چہرے اور کہیں کہیں جسم کو خشک کرنے کی کوشش کر کے پھر واپس بیٹھ جاتے ہیں۔ بابا خُوشیا چائے کے کپ سب کے سامنے رکھتا ہے۔ خاموشی گہری ہے کوئی کچھ نہیں بولتا۔

''بابا جی...... ٹیلی فون وہاں سے اُٹھا کر ادھر ہی رکھ دیں...... سر کا فون کسی بھی وقت آ سکتا ہے......''

بابا خُوشیا دور کونے میں رکھے ٹیلی فون کو اُٹھا کر اس کی لمبی تار کو صوفوں اور کرسیوں کے ساتھ ساتھ پھیلاتا لاتا ہے اور سعید کمال کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

''تھینک یو بابا جی۔'' وہ بے تاثر آواز میں کہتا ہے۔ اور بابا خُوشیا ایک نظر اُس پر اور پھر باقی سب پر ڈالتا ہے۔ وہ چائے پینے کے لیے وہیں بیٹھنے لگتا ہے پھر اس کا جسم کانپتا ہے اور وہ اپنا کپ اٹھا کر واپس کچن کی طرف چلا جاتا ہے۔

سعید کمال ٹیلی فون کی پوزیشن ہلکی سی بدلتا ہے اور اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ڈائیل سے نیچے ایک تیز تسلسل سے سیاہ پلاسٹک پر برسنے لگتی ہیں۔ کئی لمحے گزر جاتے ہیں۔

''سر...... حکمت بہزاد صاحب...... سے میری بات ہوئی ہے۔'' یک دم سعید کمال بولنا شروع کر دیتا ہے لیکن تینوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا، وہ اپنے اپنے سامنے گول میز کی اپنے حصے کی گولائی ان جانے میں تھامے ہوئے ہیں۔

"ویسے تو سب کچھ ان سے میٹنگ میں جلد ڈسکس ہو گا لیکن...... یہ واضح ہے کہ وہ کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ اس واقعے کی ہائی لیول انکوائری ہو گی۔ بات بہت اوپر تک جائے گی۔ انکوائری ٹیم بھاگاں والا جائے گی۔ ہمیں بھی کسی دن جلد ہی جانا ہو گا وہاں statements...... کے لیے وہ ان تھیٹر والوں کو...... سب کو...... بھی بلا لیں گے...... انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے۔ یہ unnoticed نہیں جائے گا...... پریس...... آف کورس...... He is shocked...... پہلی بات......"

وہ دوسری بات کا انتظار کرتے ہیں۔

"فلم بنے گی۔ فلم انسٹی ٹیوٹ کا معاملہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ سر کہتے ہیں ہو سکتا ہے وہ 70% تک فنڈنگ کروا دیں گے۔ باقی کل سیٹھ صاحب آ رہے ہیں۔ ان سے 30% کی بات ہو گی۔ پیسے کا مسئلہ حل ہو جائے گا...... دوسری بات۔"

تیسری بات سننے سے پہلے یک دم انیلا اپنی نشست سے اٹھتی ہے اور صوفوں کے درمیان پڑی میز پر رکھا اپنا پرس اٹھا کر لاتی ہے۔ بیٹھتی ہے۔ پرس سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر نکالتی ہے۔ سعید کمال کے چہرے پر پہلی دفعہ تناؤ میں خفیف سی کمی کے اثرات نظر آتے ہیں جیسے سمجھ رہا ہو کہ شاید معاملات معمول پر آ رہے ہیں۔ انیلا پیکٹ کھولتی ہے...... سگریٹ نکالتی ہے۔ سگریٹ انگلیوں میں گھماتی ہے لائیٹر اٹھاتی ہے۔ جلاتی ہے۔ بند کرتی ہے۔ اس کی مکمل توجہ اپنی انگلیوں میں ہونے والے واقعات پر مرکوز ہے۔

"تیسری بات یہ ہے کہ......" وہ تھوڑا ہچکچا کر رُک کر پھر بولتا ہے۔ "کہ...... یہ معاملہ جب ختم ہو جائے۔ اور جب...... آئی مین...... when we are out of it...... تو ہم سکرین پلے کا آخری حصہ جلد از جلد مکمل کریں۔"

سعید کمال خاموش ہو جاتا ہے اور خاموش رہتا ہے جیسے واضح کرنا چاہتا ہو کہ تیسری بات ہی آخری بات تھی۔

سیفی گہری سانس لیتا ہے اور کہتا ہے۔ "سکرین پلے کا آخری حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ چیف۔ سٹیج کے پیچھے غیر سٹیج ریپ کا تھیٹر ہے۔ جو کھیلا جا چکا ہے تم اسے کاغذ پر لکھ سکتے ہو۔"

یک دم انیلا انگلیوں میں گھومتا سگریٹ توڑ دیتی ہے۔ اسے اپنے سامنے میز پر رکھ دیتی ہے۔ پھر دوسرا سگریٹ نکالتی ہے توڑتی ہے۔ رکھتی ہے پھر تیسرا۔ ٹوٹے ہوئے سگریٹوں کا ڈھیر اُبھرتا جا رہا ہے۔ لائیٹر درمیان میں رکھتی ہے۔ توڑتی ہے رکھتی ہے۔ پیکٹ کو ہاتھ میں کچل کر اوپر رکھتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ اتنے انہماک سے کرتی ہے کہ جیسے وہاں کوئی بھی موجود نہ رہا ہو۔ اور جو موجود ہیں ان کے لیے اس کے انہماک کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔

"یہ معاملہ کبھی ختم نہیں ہو گا سعید کمال۔ ہم اس سے کبھی بھی باہر نہیں آ سکیں گے۔"

وہ چونک کر اُس کی آواز سنتے ہیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے سگریٹوں، خالی پیکٹ اور لائیٹر کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے اکٹھا کرتی ہے، سب کچھ اپنے دستی رومال میں ڈالتی ہے۔ ایک ایک ذرہ چنتی ہے۔ رومال اٹھاتی ہے۔ اٹھتی ہے۔ اور سب کچھ دور پڑے ڈسٹ بن میں گرا دیتی ہے۔ پھر میز کی طرف واپس آنے کی بجائے پھر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔ باہر بارش پھر پھوار میں بدل چکی ہے۔ لیکن بادل جوں کے توں ہیں۔

سعید کمال، سیفی اور ماسٹر یاسین اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اپنی اپنی نشستوں کے سامنے گول میز کو ایسی مضبوطی سے دبوچے ہوئے ہیں کہ جیسے مہاگنی کی لکڑی سے بنی وہ کئی دہائیاں پرانی چیز تیزی سے حرکت کرے گی اور کہیں دور ہٹ جائے گی۔ "ہم کل پھر مل رہے ہیں۔" سعید کمال بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔ اور جھٹکے سے اُٹھ جاتا ہے۔ اور پھر باقی سب بھی۔

....

(20)

گول میز کی کہانی

مہاگنی کی اس فرنیچر چیز نے یقیناً پچھلے پچاس سالوں میں کئی بار تیزی سے اور کبھی آہستگی سے بھی، حرکت کی اور ایک جگہ ایک مقام سے ایک انسانوں سے ہٹ کر دوسری جگہ دوسرے مقام اور دوسرے انسانوں میں چلی گئی۔ چیزیں...... آہ چیزیں۔ یہ گول میز شاید وہ آخری چیز ہے جس کی سوانح ہم حسن کی صورت حال میں شامل کریں گے۔

ستون جیسے چار بھاری پایوں کے اوپر مہاگنی کی لکڑی کے چھ ٹکڑوں سے بنا ایک مکمل گول تختہ اور نیچے سے اس ساخت کو جکڑنے والا فریم مہاگنی کے جن تین درختوں کی لکڑی سے بنایا گیا وہ جنوبی امریکہ کے ملک پیرو کے مشرقی حصے کے ایمزن جنگلات میں ڈیڑھ سو سال پہلے پیدا ہوئے۔ نوے سال میں بلند پختہ درخت بننے کے بعد انہیں کاٹا گیا۔

ان میں سے ایک درخت کاٹتے وقت ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ جو اب تک مہاگنی کے loggers میں سنایا جاتا ہے۔ درخت کاٹنے والے انڈین مزدور اسے کاٹنے پر آمادہ نہ تھے کیونکہ اس میں پانچ مسلسل دوشاخے تھے اور اس طرح وہ ناگاڈاماشی جنگل کی روح کا مسکن ہونے کی وجہ سے مقدس درخت تھا لیکن لیبر انچارج ڈی سوزا نے انڈینز کو بید مارے اور درخت کاٹنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے درخت کاٹا لیکن گرتے وقت انتہائی خلاف توقع وہ متوقع سمت میں گرنے کی بجائے اُدھر گرا جہاں انچارج کھڑا تھا، ڈی سوزا وہیں مر گیا۔ بعد میں تینوں درختوں کی گیلیوں کو کاٹا گیا اور مہاگنی کی تجارت کرنے والی ایک فرم نے انہیں سنگاپور اور انڈونیشیا برآمد کر دیا۔ جہاں یہ مہاگنی کے عمدہ تختوں میں تبدیل ہونے کے بعد سنگاپور کی ایک مشہور فرنیچر کی دکان میوشو،

جس چینی لفظ کے معنی لکڑی کا خواب ہیں، کے گودام میں پہنچ گئے۔

'لکڑی کا خواب' نامی فرنیچر کارخانے کا چینی مالک لی پانگ اگرچہ مہاگنی کی اس قسم یعنی Big Leaf Mahogany یا Hondourn کا حیاتیاتی نام Swietenia Macrophylla نہیں جانتا تھا لیکن ایک فرنیچر ساز کے طور پر اس لکڑی کی حقیقی قدر و قیمت اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اُسے علم تھا کہ اپنے لمبے سیدھے ریشوں۔ بھورے سرخ رنگ جو صفائی پر ایک قدرتی چمک دیتا ہے اور کٹائی رندائی ٹھکائی میں موم لیکن استعمال میں بے حد مضبوط اور لکڑی کی سب بیماریوں سے بالکل محفوظ اس لکڑی سے دنیا بھر کے بڑھئی محبت کرتے ہیں۔ اور اسی طرح دنیا بھر کے اعلیٰ فرنیچر کے شوقین عام لکڑی کی نسبت بہت مہنگے مہاگنی کے فرنیچر سے محبت کرتے ہیں۔ لی پانگ لکڑی کے ایسے خواب دکھانے بنانے میں زبردست مہارت رکھتا تھا۔

مئی کی ایک شام جب بندرگاہ کی طرف سے آتی کارگوشپس کی hoot لی پانگ کی متاثرہ سماعت کو کچھ زیادہ ہی تنگ کر رہی تھی۔ ایک گاہک آیا۔ اُس نے لی سے ایک گول میز خریدنی چاہی جو مہاگنی سے بنی ہو اور جس کے گرد چھ یا سات افراد بیٹھ سکیں۔ لی نے پیشہ ورانہ عاجزی سے مارلو (جیسا کہ بعد میں نام پتہ چلا) کو کہا کہ اس کے پاس بنی بنائی ایسی کوئی میز نہیں لیکن وہ آرڈر پر اُسے بنا کر دے سکتا ہے۔ آرڈر دے دیا گیا اور قاعدے کے مطابق لاگت کی آدھی رقم ایڈوانس کے طور پر بھی دے دی گئی۔ رسید پر گاہک نے اپنا نام مارلو لکھا تو لی پانگ نے پوچھا کہ کیا وہ اس طرح کا میز پوکر جوا کھیلنے کے لیے بنوانا چاہتا ہے یا ڈائننگ ٹیبل کے طور پر یا کہ میٹنگ کانفرنس ٹیبل کے طور پر۔ سب میں تھوڑا فرق ہوگا۔ پوکر میز کے اوپر گول دائرے کے ساتھ ساتھ نرم فوم سے بنی rail لگانی پڑے گی۔ جس پر جوا کھیلنے والے کھیل کے دوران اپنے بازو رکھتے ہیں۔ ڈائننگ...... لیکن مارلو نے لی پانگ کی بات درشتی سے کاٹتے ہوئے کہا کہ وہ فضول بکواس نہ کرے اور جو کہا گیا ہے بس وہی کرے۔ نرم دل چینی بڑھئی ڈر گیا، اُس نے مارلو کو یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا اور دو ماہ بعد اُسے میز تیار ملے گا۔ لیکن مارلو دو ماہ نہیں بلکہ تین ماہ بعد بھی میز لینے نہ آیا۔ چھ ماہ گزر گئے۔ سال۔ ڈیڑھ سال۔ دو سال گزر گئے۔ مارلو نہ آیا۔

انہیں دنوں بندرگاہ کے علاقے میں واقع سائرن اینڈ سی نامی بار کے انگریز مالک جان شیکسپیئر نے اپنے اس چھوٹے سے شراب خانے کے ڈانواں ڈول کاروبار کو کسی نہ کسی طرح ترقی دینے کا فیصلہ کیا۔ اُسے مشورہ دیا گیا کہ اس مقصد کے لیے ایک تو وہ اپنی ویٹرس لڑکیوں کے لباس بہت مختصر کر دے، دوسرے ذیلی کمرے میں جہاں اُس نے کاٹھ کباڑ جمع کر رکھا ہے وہاں دو میزوں کے پوکر کا لائسنس حاصل کر کے چھوٹا سا کاسینو شروع کر دے۔ جان نے مشورہ مان لیا اور لائسنس حاصل کرنے کے بعد فی الحال پوکر کے ایک میز سے کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے 'لکڑی کا خواب' مشہور فرنیچر سٹور کا دورہ کیا۔ وہاں اُسے ایک طرف الگ تھلگ رکھی گول میز بہت پسند آئی۔ جیسے اُسی کے لیے بنائی گئی تھی لیکن مالک لی نے اُسے بتایا کہ وہ آرڈر پر بنی ہے۔ جان نے اچھی رقم کی پیشکش کی۔ لی لالچ میں آ گیا یوں بھی اُس نے سوچا کہ مارلو اگر دو سال نہیں آیا تو اب کیا آئے گا۔ جان میز لے گیا۔

اتفاق کی بات دیکھیے کہ تین دن بعد ہی مارلو اپنی میز لینے آ گیا۔ اُس نے جیب سے ٹیڑھی میڑھی رسید نکالی جس سے چرس، تمباکو اور پسینے کی بو آ رہی تھی اور لی کے حوالے کی۔ لی گھبرا گیا لیکن اُس نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ یوں تو قاعدے کے مطابق اتنے عرصے بعد آنے کی وجہ سے اُس کا ایڈوانس بھی ضبط ہو جاتا ہے۔ لیکن کارخانے کی ساکھ کے لیے اسی ایڈوانس میں اُسے دوبارہ اور نئی میز مل جائے گی۔ مارلو نے ایک ایسے جنونی غصے سے جس کا لی عادی نہ تھا کہا کہ وہ اپنی ساکھ اور اپنی نئی میز اپنے مقعد کے سوراخ میں گھسیڑ لے (اس کے لیے اُس نے مناسب گندا لفظ استعمال کیا) اور اُسے تاوان کی رقم ادا کرے۔ رقم بتانے سے پہلے اُس نے جھپٹ کر لی کے ایک مریل سے انڈونیشین ملازم کو دبوچ لیا اور اُس کے گلے پر چاقو رکھ کر رقم کا مطالبہ کیا جو ایڈوانس کی رقم سے کوئی سو گنا زیادہ تھی۔ نرم دل صلح جو کاروباری چینی نے فیصلہ کرنے میں ایک منٹ بھی نہ لگایا، وہ نیچے تہہ خانے میں جا کر تجوری سے رقم نکال کر لایا اور امریکی ڈالروں کا پیکٹ مارلو کے حوالے کیا۔ مارلو نے ملازم کو ایک طرف دھکا دیا اور رقم لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ لی نے دیکھا کہ انڈونیشین ملازم کی پتلون بُری طرح بھیگ چکی ہے اور اُسے سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی ہے۔ موت سے اتنی زیادہ قربت کا اُس بے چارے کا پہلا تجربہ تھا اور خود لی کا بھی۔ اُس نے فوراً 'لکڑی کا خواب' شو

روم بند کرنے اور سب ملازمین کو گھر جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ خود بھی ایک بدھ خانقاہ میں چلا گیا اور دو گھنٹے مراقبے میں خاموش بیٹھا رہا۔ آخر اُسے یہی سمجھ آیا کہ یہ سب کچھ دراصل تین دن پہلے شروع ہونے والے خرگوش کے سال کا اثر ہے اور یہ سال اس کے لیے بھاری ہو گا۔ مارلو پھر آئے گا۔ مگر مارلو نہ آیا، اسی رات وہ موٹر بوٹ کے ذریعے منشیات سمگل کرنے کی ایک مہم میں اپنے دو ساتھیوں سمیت جو اُس کے ساتھ ہی چند ہفتے پہلے ڈیڑھ سال کی جیل کاٹ کر واپس آئے تھے اور ان میں سے ایک 'سات کا گینگ' کا اُس کا اپنا باس تھا، سب مارے گئے۔ وہ میز مارلو نے باس کے حکم پر ہی آرڈر کی تھی۔

ادھر جان کا سائرن اینڈ سی بار اور ایک میز کا پوکر کاسینو چل نکلا۔ گاہک ہلکے پھلکے نشے کی حالت میں نسوانی جسم کی فراوانی سے ایک کھلنڈرے اشتعال میں آ جاتے اور پھر ان کا جی داؤ لگانے کو چاہتا۔ جان نے پوکر کو باضابطہ رکھنے کے لیے ایک تجربہ کار ڈیلر ملازم رکھا جو کھیل کے شروع میں ہی واضح کر دیتا تھا کہ پانچ پتوں کی اسٹینڈرڈ پوکر کھیلی جائے گی four of kind اور فل ہاؤس سے لے کر pair تک وہ سب سیٹوں کی قدر و قیمت واضح کر دیتا۔ ڈیلنگ۔ betting ہوتی اور showdown میں سب سے اعلیٰ سیٹ شو کرنے والا سب مال لے جاتا۔ ہاؤس کو ہونے والی آمدنی اچھی خاصی تھی اور جان سوچنے لگا کہ اُسے ایک دوسری میز بھی جلد لگانی چاہیے مگر جس روز اُس نے لی کو ایک نئی میز کے لیے آرڈر دینا تھا، اُس سے ایک رات پہلے ہی ایک واقعہ پیش آیا جس نے سب کچھ برباد کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک نیا کھلاڑی کھیلنے آ گیا جسے دیکھتے ہی زمانہ ساز ڈیلر سمجھ گیا کہ 'مصیبت' ہے لیکن اُسے انکار کرنا بھی مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ ڈیلر نے کھیل کے قواعد و ضوابط اس پر واضح کر دیے۔ جنہیں وہ ہلکی ہلکی غراہٹ جیسی آوازیں پیدا کر کے سنتا رہا۔ کھیل شروع ہوا تین کھلاڑی تو شروع میں ہی فولڈ کر گئے۔ لیکن نیا کھلاڑی بیٹنگ بڑھاتا رہا آخر دو رہ گئے اور جب showdown ہوا تو پتہ چلا کہ دونوں کے پاس فل ہاؤس ہے لیکن نئے کھلاڑی کا فل ہاؤس قیمت میں چھوٹا ہے یعنی 666kk کے مقابلے میں 555jj۔ جیتنے والا ایک بڑی رقم کے chips سمیٹ ہی رہا تھا کہ سب نے شکاری چاقو کے کڑکڑانے کی آواز سنی۔ اور پھر نئے کھلاڑی نے ڈیلر کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ اور اُسے میز پر جمع تمام chips کے بدلے cash دینے کا حکم دیا۔ اس پر جیتنے

والے نے شور مچایا کہ ڈیلر اگر انہیں تحفظ نہیں دے سکتا تو جوا خانہ کیوں کھولا گیا ہے۔ اور وہ پھر اپنے chips اٹھانے لگا۔ اس پر نئے کھلاڑی نے بجلی کی تیزی سے ڈیلر کو ایک طرف دھکا دیا اور جیتنے والے پر چاقو سے وار کیا جو اتنا شدید تھا کہ ایک ہی لمحے میں نہ صرف اس کی شرٹ بلکہ پیٹ بھی پھٹ گیا اور انتڑیاں اچھل کر باہر میز پر پھیل گئیں۔

بار میں موجود جان نے اسی لمحے پولیس کو فون کر دیا۔ جو لمحوں میں پہنچ گئی۔ پولیس مقابلہ ہوا۔ نئے کھلاڑی کو گولی ماردی گئی۔ ڈیلر بھی زخمی ہوا۔ جیتنے والا بھی مر گیا۔ اس واقعہ کے بعد سائرن اینڈ سی کی مقبولیت یک لخت ختم ہو گئی۔ جان شیکسپیئر نے سب کچھ فروخت کیا اور سکاٹ لینڈ واپس جا کر ڈیری فارمنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب کچھ سمیٹنے کے ان ایام میں اچانک اس کا ایک پرانا اچھا واقف کار ڈچ vincent zeeman ادھر آ نکلا۔ جو کارگوشپ ایس۔ ایس بورنیو کا کیپٹن تھا۔ جان نے اُسے سب کچھ بتایا، ونسینٹ نے اُس کے فیصلے کی تائید کی اور ساحلی جواریوں کی نسبت پہاڑی گائیوں میں زندگی بسر کرنا زیادہ محفوظ قرار دیا۔ پھر اُس کی نظر بکھرے ہوئے سامان میں مہاگنی کی اُس گول میز پر پڑی جس پر ابھی تک انسانی خون اور دیگر آلائشوں کے آثار باقی تھے۔ اُسے خیال آیا کہ سات آٹھ بندے گرد بٹھانے والی یہ گول لکڑی اگر جہاز کے crew room میں رکھوا دی جائے تو تھکے ہارے عملے یعنی 'کام چور بدمعاشوں' کے لیے ٹانگیں توڑنے۔ تاش کھیلنے اور مڈشپ مین ڈوڈی بانڈے کے چیتی لونڈوں سے گندے تعلقات پر گپ شپ لگانے کا اچھا انتظام ہو جائے گا۔ میز ایس۔ ایس بورنیو کے crew room میں پہنچ گئی۔

ایس ایس بورنیو ایک پینتیس سالہ جنرل کارگوشپ تھا۔ اور یوں بحری قوانین کے مطابق اپنی عمرِ طبعی سے بھی پانچ سال اوپر گزار چکا تھا۔ جہاز کی مالک ولندیزی کمپنی اُسے جنوبی ایشیا کی ایک بندرگاہ کے قریب جہاز توڑنے والے ایک وسیع و عریض yard پر بیچنے کا اصولی فیصلہ کر چکی تھی۔ ''لیکن کیپٹن ونسنٹ زی مین 'محبت کی کشتی' (Love Boat) جو اس کا ایس۔ ایس بورنیو کے لیے پیار کا نام تھا، کو چھوڑنے سے پہلے دنیا کا کم از کم ایک اور چکر ضرور لگا لینا چاہتا تھا۔ سنگاپور سے انواع و اقسام کا کارگو لاد کر وہ گہرے بحرالکاہل میں ہونولولو کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا تو وہ جانتا تھا کہ دنیا کے گرد اُس کا آدھا چکر تو اسی طرح پورا

ہو جائے گا۔

جب ایس۔ ایس بورنیو جنوبی چین کے سمندر میں پہنچا تو زی مین جانتا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے سیاہ راتوں کے علاقے میں ہے اور اس کے علاوہ اس کا جہاز افریقہ کے بعد دنیا کے دوسرے نمبر کے خطرناک بحری قزاقی کے علاقے میں ہے۔ اس رات بھی ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے سیکنڈ میٹ کے ہمراہ ڈیک پر کھڑے ہو کر تاریک ترین سمندر اور بادلوں سے مکمل ڈھکے تاریک آسمان کا نظارہ کیا تو اُسے دور افق پر ایک روشنی دکھائی دی۔ جو شاید ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس نے سیکنڈ میٹ کو اس پر نظر رکھنے کو کہا اور خود نیچے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ پھر اُس نے اپنے میوزک باکس میں Cobi Schreijer کے کلیکشن میں سے فوک ڈانس Henriks Mazurka آدھا سنا تھا اور اُس کے پاؤں اپنی کئی گزشتہ محبوباؤں کے ساتھ فلور پر اٹھ رہے تھے کہ سیکنڈ میٹ گھبرایا ہوا اُس کے کمرے میں آیا اور اُسے بتایا کہ یہ کسٹمز والوں کی سپیڈ بوٹ ہے۔ اور وہ شاید جہاز پر board کرنا چاہتے ہیں۔ کسٹمز والوں کو کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن حقیقتاً وہ قزاق تھے۔ ٹی گول میز کے گرد بیٹھے ڈیک کیڈٹ اور دو Sea Men نے دیکھا کہ کسٹمز والے گن پوائنٹ پر کیپٹن زی مین اور سیکنڈ میٹ جیری ڈوڈ بائین کو Crew Room میں لا رہے ہیں۔ سی مین الفانسو کا ہاتھ اپنے پستول کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مشین گن کے فائر سے میز کے گرد بیٹھے سات افراد کو گولیوں سے بھون دیا گیا اور لمحوں میں اُن کی لاشیں میز کے گرد پھیل گئیں۔ پھر انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا اور جہاز آسانی سے لوٹ لیا گیا۔ قزاقی کے زندگی میں پہلے اور آخری اس واقعے نے کیپٹن کو اس قدر دل برداشتہ کر دیا کہ اُس نے جہاز ران کمپنی سے فوری طور پر جہاز چھوڑنے کا مطالبہ کیا اور جہاز کو بھی اپنی آخری منزل یعنی جہاز توڑنے کے yard میں پہنچانے کا مشورہ دیا۔ کیپٹن زی مین کا مطالبہ اور مشورہ دونوں مان لیے گئے۔

دنیا کے تیسرے بڑے شپ بریکنگ یارڈ کے جس پلاٹ پر ایس۔ ایس۔ بورنیو کو پہنچایا گیا، اس کا انچارج رحمان دادا تھا جو بڑے سے بڑے جہاز کو کسی بڑی مشین کے استعمال کے بغیر محض مزدوروں کی جسمانی محنت کے ذریعے پینتیس چالیس دنوں میں scrap میں تبدیل کرنے کا سب سے بڑا ماہر جانا جاتا تھا۔ یاد رہے کہ دنیا کے دوسرے ایسے یارڈز میں

یہی کام چھ ماہ سے پہلے مکمل نہیں کیا جاتا۔ کارگو شپ کے اپنی ہی طاقت سے ساحلی ریت میں دھنسنے کے بعد رحمان دادا نے معمول کے مطابق جہاز کا ایک دورہ کیا۔ وہ اور اُس کے چند خاص آدمی فرسٹ ڈیک اور سیکنڈ ڈیک سے نیچے اترتے۔ لوڈر۔ ڈاکنگ برج سے ہوتے ہوئے انجن روم مین انجن بوائلر اور سٹیرنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے جب کرو روم میں پہنچے تو انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح کمپنی نے جہاز کو سب ساز و سامان سے صاف کر دیا ہے۔ لیکن پھر انہیں کرو روم کے کونے میں کاٹھ کباڑ کا ایک بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔ اُسے ہٹایا گیا تو نیچے سے ایک بڑی مضبوط شکل کی گول میز برآمد ہوئی جو رحمان دادا کے تجربے کے مطابق مہاگنی کی تھی جس کا شمار دنیا کی گراں ترین لکڑیوں میں ہوتا ہے۔ میز پر خون کے دھبے تھے۔ اور دوسری گندگی بھی لیکن اس کے علاوہ وہ بہترین حالت میں تھی۔ رحمان دادا نے اگلی صبح کام شروع کروانے سے پہلے بھاری میز کو جہاز سے اتروایا اور اپنے ایک ٹھکانے تک پہنچا دیا۔

جہاز توڑنے کی صنعت سے تعلق رکھنے کے علاوہ پینتالیس سالہ رحمان دادا کا ایک پارٹ ٹائم تعلق مختلف سیاسی جماعتوں کے زیر زمین شعبوں سے بھی تھا۔ اس کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی تھی کہ کسی ایک سیاسی جماعت کے زیر زمین سربراہ کی وفاداری اختیار کرنے کی بجائے وہ ان سب سے ذاتی دوستی قائم کرتا تھا۔ اور ضرورت کے مطابق انہیں پیشہ ورانہ انسانی مہارت فراہم کر دیتا تھا جو دراصل یارڈ میں اُس کے لیے کام کرنے والے بعض ایسے افراد کی شکل میں ہوتی تھی جو قانون کے حوالے سے اپنی مختلف سوچ رکھتے تھے۔ اس طرح اُسے ہر طرح کے حالات میں اپنے ہمدرد میسر رہتے تھے۔ اس اپروچ کو اختیار کرنے میں اس کے بھتیجے سیفی کا گہرا ہاتھ تھا۔ رحمان دادا نے شادی نہیں کی تھی اور خاندان میں بھی کوئی اُسے منہ لگانے کو تیار نہیں تھا لیکن اُس کا یہ بھتیجا سیفی اس سے ملتا رہتا تھا۔ اور اس میں سیفی کا اپنا مفاد بھی تھا۔ وہ سیاسیات کا طالب علم تھا اور عملی سیاست سے دور دور رہ کر اس سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے اس مقصد کے لیے رحمان دادا، اُس کے خاندان کے متروک چچا سے زیادہ موزوں شخص کون ہو سکتا تھا۔

رحمان دادا اور سیفی میں ہونے والی بظاہر سیاست پر گفتگو میں اُس سیاست کا ذکر تک نہ ہوتا تھا جو اخبارات میں چھپتی تھی اور کبھی کبھی ٹیلی ویژن پر بھی نظر آتی تھی اور جس پر

ملک و قوم کے غم میں گھلنے والے کالم نگار رو رو کر دردمندی سے تبصرے کرتے تھے اور ہر مسئلے کا آخری حل صاف صاف پیش کرتے تھے جنہیں صرف وہی جانتے تھے۔ ادھر مڈل پاس چچا اور ایم۔اے پاس بھتیجا دونوں متفق تھے کہ سیاست۔ جمہوری ہو یا فوجی، مذہبی ہو یا نسلی طاقت کی بنیاد دو چیزوں میں ہے پیسہ اور جرم۔ "دولت جرم کو کنٹرول کرتی ہے دادا اور جرم دولت کو" سیفی ہنس کر کہتا۔ "اور اصل میں جو چیز کنٹرول کرنے والی ہے دادا وہ کیا ہے بتاؤ" وہ رحمان دادا سے پوچھتا تو وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ اور "بولی میری مچھلی" فش شاپ کے بیرے کو آدھا کلو مزید پمفرٹ مچھلی تل کر لانے کو کہتا ہے اور ساتھ لیموں اور مائی اونیز ساس لانے کی ہدایت کرتا۔ اس پر سیفی ہنستا اور کہتا۔ "وہ اصل چیز موت ہے دادا۔ جو شخص دوسروں، مخالفوں کی موت پر اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ اور صرف موت ہی نہیں بلکہ موت کے انداز پر بھی۔ فتح اسی کی ہوتی ہے۔ طاقت کا سرچشمہ...... درد ہے۔" سیفی کی آواز سرگوشی میں بدل جاتی اور پھر وہ انگریزی میں کہتا۔ "pain, pain, is the real power....." ایسے موقعوں پر رحمان دادا کو ایک دوسرا شک ہوتا کہ شاید اس کا یہ بہت پڑھا لکھا بھتیجا کھسک رہا ہے۔ لیکن پھر ایسا کچھ بھی نہ ہوتا لیکن شپ بریکنگ یارڈ سے ہٹ کر آنے والے ذرا مہذب علاقے میں واقع 'بولی میری مچھلی' فش شاپ میں ہونے والی ان دونوں بحثوں کے بعد رحمان دادا کی عملی پالیسی خوب پختہ ہو گئی کہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے کوئی واضح وفاداری نہیں ظاہر کرے گا۔ بلکہ صرف ـــــ کسی کے لیے بھی زیر زمین دنیا کے انسانی اور تکنیکی وسائل حاصل کرنے کے لیے رابطے کا کام کرے گا اور بس۔ زمین سے اوپر کوئی بھی آئے جائے، رہے گا وہی جس کی زیر زمین جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اور رحمان دادا جڑیں مضبوط کرانے میں گاہے بگاہے اپنے کسی دوست کی مدد کر دیا کرتا تھا اور بس۔ کیونکہ اس کا یہ اپنا اعتماد مضبوط تھا کہ اس کا اصل کام دنیا بھر کے تھکے ٹوٹے جہازوں کو سکریپ میں بدلوانے کا خطرناک کام روز کے دیہاڑی داروں سے انتہائی سستی مزدوری کے ذریعے کرواتا ہے۔ تاکہ سکریپ سے سٹیل recycle کرنے کی صنعت مضبوط ہو سکے۔ رحمان دادا اپنے جہازی مسئلے مسائل کا ذکر کم ہی سیفی سے کرتا تھا لیکن مہاگنی کی یہ اعلیٰ کاریگری کی شاہکار میز ملنا ایسا واقعہ ضرور تھا جس میں وہ اُسے شامل کر سکتا تھا، اور پھر اس سے مشورہ بھی لے سکتا تھا کہ وہ اب اس کا کیا کرے۔

سیفی نے دلچسپی سے اس گول میز کو دیکھ کر خون کے دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا ''دادا اس میز کے گرد قتل ہوئے ہیں۔'' ''ہاں۔ مجھے بھی شک پڑتا ہے۔'' رحمان دادا نے کہا۔ لیکن تم مجھے یہ بتاؤ بس کہ اب اس کا کیا کروں۔ دو باتیں میں نے سوچی ہیں۔ ایک بڑی پرانی فرنیچر کی دکان ہے کوگا فرنیچر اس کو بیچ دوں۔ پیسے اچھے مل جائیں گے۔ یا پھر اپنے کسی ''دوست'' کو تحفتاً دے دوں۔ مگر کس دوست کو......'' رحمان دادا نے سوال ادھورا چھوڑا۔

''ہاں۔ کس دوست کو۔ ہمارے لیے تو سب ہی قابل احترام ہیں۔'' سیفی نے کہا اور وہ دونوں خوب ہنسے......

''ہاں۔ قابل احترام اور سب ایک سے بڑھ کر ایک......'' رحمان دادا کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ دل کھول کر قہقہے لگائے۔

''مگر کسی کو دینا تو ہے یہ تحفہ......''

پھر انہوں نے کئی دوستوں مگر ایک دوسرے کے دشمنوں میں سے کسی ایک کو وہ تحفہ دینے کی موزونیت پر بحث کی۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ آخر انہوں نے ــــ جہاں عقل کام نہ کرے وہاں اتفاق کام کرے گا ــــ کا آخری انسانی حربہ استعمال کیا۔ اور ''دوستوں'' کے ناموں سے قرعہ نکالا۔ مچھلی کی دکان کے چھوٹے بچے بیرے نے ہنستے ہوئے پرچی اٹھا کر سیفی کو دی۔ لکھا تھا سرجن۔ سیفی نے عجیب عجیب سے منہ بنائے اور کہا۔ قسمت سرجن کی دادا۔ اور وہ پھر خوب ہنسے۔

''ہاں ایسی میز اچھی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔ سرجن کو ہی دے دیتا ہوں۔ چاہے گھر لے جائے یا کلینک۔''

سیفی نے کہا۔ ''دادا پہلے تو میز کے اوپر نیچے اچھی طرح چیک کر لو۔ کوئی ایسا نشان سٹکر جس سے پتہ چل سکتا ہو کہ کہاں سے آئی ہے۔ پھر تم اسے سرجن کو دے دو۔ سرجن اصل میں ایک مقبول سیاسی جماعت کے زیر زمین شعبہ کی ایک شاخ کا انچارج تھا اور کلینک ایک خفیہ مرکز تھا جہاں مخالفین کو مرحلہ وار بھرپور اذیت کی کیفیات سے گزارنے کے بعد مردہ اجسام میں تبدیل کرنے کا کام انتہائی مہارت سے سرانجام دیا جاتا تھا مخالفین کا ایک ایسا ہی ادارہ لیبارٹری کے نام سے جانا جاتا تھا اور جس کے سربراہ کا نام سرنج تھا۔

رحمان دادا نے میز کے دائیں بائیں گھوم کر جب نیچے گھس کر غور سے جائزہ لیا تو اُسے ایک اسٹکر چپکا ہوا نظر آیا جسے اتارنا مشکل تھا، اس نے سیفی کو نیچے بلایا۔ اُس نے دیکھا کہ اسٹکر پر چینی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے اور ایک لائن انگریزی کی بھی ہے۔ میڈ اِن سنگاپور۔ یہ سنگاپور کے کاریگروں کا شاہکار ہے دادا۔ اس اسٹکر کو رگڑ کر صاف کر دو۔ اور پھر دے دو سرجن کو۔ ویسے بھی آج کل اُسے خوش رکھنے میں فائدہ ہی ہے۔'' رحمان دادا نے سر ہلایا۔ پھر تاسف سے میز کی طرف دیکھا اور بولا ''ویسے سیفی یار ــــ دل نہیں چاہتا اسے سرجن کو دینے کو......''

''تو پھر دادا بیچ دو...... ذرا دُھلا لو...... لیکن اگر ضرور تحفہ ہی دینا ہے تو پبلک لائبریری میں رکھوا دو۔ لوگ ارد گرد بیٹھ کر اخبار پڑھیں گے ــــ اور اگر ساتھ میں ثواب بھی کمانا چاہتے ہو تو ہمارے پاس ہی ایک مدرسہ ہے۔ مولانا ارد گرد بچوں کو بٹھا کر درس دے سکتے ہیں۔ یا پھر آج کل اُن کے پاس پہاڑوں سے اُتر کر لوگ آ رہے ہیں۔ وہ ارد گرد بیٹھ کر اپنی کلاشنکوفیں درمیان میں رکھ کر کھانا کھا لیں گے۔''

''پہاڑوں سے اُتر کر آ رہے ہیں۔ کون؟'' رحمان دادا نے حیرت سے پوچھا اس پر سیفی نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔

''ایک لمبی کہانی شروع ہونے والی ہے دادا۔ چھوڑو...... ویسے دادا میرا مشورہ یہ ہے کہ اب وقت آ رہا ہے کہ تم اپنے جہاز توڑنے پھوڑنے پر زیادہ توجہ دو ــــ یہ کام پارٹیوں سے الٹی سیدھی یاری کا آگے آگے بہت خطرناک ہونے والا ہے۔''

رحمان دادا نے سیفی سے مزید کوئی سوال جواب نہ کیا۔ لیکن چینی اسٹکر صاف کرنے اور میز کو دھونے دھلانے کے بعد سرجن کے پاس بھجوا دیا گیا۔

آئندہ ڈیڑھ سال تک گول میز کلینک کے تہہ خانے میں سرجن اور اس کی ٹیم کی زندہ مخالفین کو مردہ مخالفین میں تبدیل کرنے کی کارکردگی میں ایک آلاتی معاون کا کردار ادا کرتی رہی۔ پھر ایک رات جب کہ مردہ مخالفین کے دو بنڈل تیار ہو چکے تھے اور تیسرے کے منہ پر ٹیپ چپکا کر اُسے مہاگنی کی بنی گول میز پر لٹا کر اس کے دائیں ہاتھ کے ناخن پلاس سے کھینچنے کا کام مکمل ہو چکا تھا اور بائیں گھٹنے میں برمے سے ابھی صرف دو سوراخ کیے گئے تھے

کہ اطلاع آ گئی کہ اب تک کے سیاسی مخالفین نے اب دوست بننے کا فیصلہ کر لیا ہے اور دونوں طرف کی ہائی کمانڈ آپس میں گھل مل رہی ہے۔ اس لیے کلینک کی سرگرمیاں روک دی جائیں۔ سرجن اور اس کے عملے میں یہ بحث چھڑ گئی کہ میز پر لیٹے زندہ اور مردہ کے درمیان سابقہ سیاسی مخالف اور حال دوست کے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ آخر یہی متفقہ فیصلہ ہوا کہ اگر "روک دیا جائے" کہا گیا ہے تو روک دیا جائے۔ رات بھر کی ڈیوٹی سے تھکے ہارے عملے کے چند افراد نے اُس نئے دوست کو اُس کے گھر کے سامنے لٹا دیا۔ جہاں اس کے اہل خانہ نے اللہ کا شکر ادا کر کے اس کی بحالی صحت کے لیے مناسب کارروائی شروع کر دی۔ اگلے دن حکم آیا کہ کلینک کو غائب کر دیا جائے تا حکم ثانی۔ سرجن اور عملے نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب انہیں کچھ عرصہ آرام کرنے کا موقع ملے گا۔ کلینک خالی کر دیا گیا۔ اور بڑی گول میز ایک کارکن نے ایک گدھا گاڑی پر لاد کر گوگا فرنیچر والا کے پاس پہنچا دی۔ گوگا اُس بیچنے والے کے بارے میں کچھ معلومات رکھتا تھا چنانچہ ایک تو اُس نے فوری طور پر کوئی بھی سودا بازی کیے بغیر اس کی منہ مانگی قیمت پر میز خرید لی۔ اور بعد میں دیر تک میز کو مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے کاریگروں کو بلا کر میز کو دھلوا کر ریگ مار سے صاف کروایا اور پھر اس کی بہترین پالش کروائی۔ دیکھنے والے دنگ رہ گئے مگر اس کے کاریگر اور بھی حیران ہوئے جب گوگا نے میز اپنے سٹور میں رکھنے کی بجائے ریل کے ذریعے شمال میں واقع ایک بڑے شہر میں اپنے ایک ہم پیشہ گوگی فرنیچرز کو مناسب قیمت پر بھجوا دی۔ گوگا اور گوگی میں ایسے کاروباری تبادلے معمول کی بات تھی۔ اور اسی معمول کے مطابق گوگی نے گوگا سے میز کے بارے میں کاروباری لحاظ سے کارآمد معلومات حاصل کرنا چاہیں تو گوگا نے بتایا کہ میز کو امپورٹڈ ہی کہیں گے کیونکہ وہ زیادہ تو نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہے کہ یہ میز پرانے بحری جہاز توڑنے والے کسی شخص کے ذریعے شہر میں پہنچی تھی۔ تو پھر امپورٹڈ ہی ہوئی نا۔ گوگی نے اطمینان سے کہا۔ گوگا نے اتفاق کیا اور فون بند کرنے سے پہلے چلتے چلتے ذکر کیا کہ ویسے اُس نے سنا ہے کہ چند دن پہلے ہی اُس شخص اور اس کے بھتیجے کو کسی نے گولی مار دی ہے۔ گوگی تھوڑا حیران ہوا اور پھر بھول گیا۔

گوگی کے پاس پہنچ کر لی پانگ کے 'لکڑی کے خواب' کی تخلیق بہت جلد ایک نئی

شناخت حاصل کر گئی۔ گوگی نے اس کے مہاگنی اور امپورٹڈ ہونے کا بہت چرچا کیا۔ بلکہ اخبار میں ایک چھوٹا سا اشتہار بھی دے دیا کہ ایک امپورٹڈ گول میز۔ ڈائننگ۔ میٹنگ۔ اور دوسرے مقاصد کے لیے (دوسرے مقاصد کی وضاحت اُس نے گاہک پر چھوڑ دی)۔ میز کو شوروم میں بہترین display دیا گیا۔ اور خصوصاً شام کو جب کہ امرا اور جینٹری اس کی دوکان میں آتی۔ میز کے ساتھ دیوار میں چھپی ترچھی روشنیاں آن کر دی جاتیں اور اس طرح میز کے ٹھوس حسن اور پرنفاست پائیداری میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ امپورٹڈ کی وضاحت کے لیے گوگی نے یہ کہانی بنائی کہ میز اٹلی کی ہے اور اطالوی سفارت کار جاتے ہوئے بہت مہنگے داموں بیچ گیا ہے۔

'ایک کائیاں کاروباری کی جبلت کے ساتھ طبقہ امرا کی میز میں دلچسپی دیکھتے ہوئے گوگی میز کی قیمت ہر روز بڑھاتا رہا اور بالآخر وہاں تک لے گیا جہاں صرف فرنیچر کا بہت اعلیٰ ذوق رکھنے والے اور خاص طور پر اس کے جمالیاتی پہلوؤں سے متاثر ہونے والے ہی اُسے خریدنے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ ایسے ہی دو افراد زارکو کمپنی کا ایریا منیجر سعید کمال اور اُس کی بیوی انیلا بلال تھے۔ انیلا میلان کی مشہور آرٹ اکیڈمی Academia Di Belle Art Di Bera سے Ceramics اور سنگ تراشی میں تعلیم حاصل کر کے آئی تھی۔ گوگی نے میز کی اطالوی شناخت کا اندر سے ڈرتے ڈرتے حوالہ دیا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ یہ گاہک اُس طرح کے ہیں جو سب کچھ جانتے ہیں اور اُس کی فضول بکواس اُسے الٹی بھی پڑ سکتی ہے۔ لیکن انیلا بلال کے لیے یہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اور مہاگنی کی بنی گول میز خرید لی گئی اور الحاج صفدر سلطان کی رہائش گاہ قصرِ سلطان پہنچا دی گئی۔ جو حقیقی معنوں میں ایک قصر ہی تھا۔ چار کنال کے وسیع و عریض مرکزی لان کے ارد گرد ایک مرکزی خاندانی رہائش گاہ کے علاوہ اس کے دو بیٹوں شادی شدہ سعید کمال اور غیر شادی شدہ جبار کے رہائشی یونٹ تھے۔ اس کے علاوہ نیم دائرے میں ان عمارتوں کے سامنے سے گزرتی Drive way کے آخر میں مہمانوں کے لیے کمرے تھے۔ اور ان سب تعمیرات کے بائیں عقبی حصے میں ملازمین کے لیے کوارٹر۔

لان کے مرکز میں ایک پگوڈا نما تعمیر تھی جسے موسم کے مطابق شام کو کھلے میں بیٹھنے کے لیے یا پھر لان پارٹیوں کے موقع پر بُوفے میزوں کی ترتیب کے لیے استعمال کیا جاتا تھا...... جب میز قصرِ سلطان پہنچائی گئی تو سعید کمال نے اُسے پگوڈا میں منتقل کرانے کا مشورہ

دیا جسے انیلا نے سختی سے رد کر دیا اور میز کو اپنے رہائشی حصے میں پہنچانے کا حکم دیا۔ مزدور لوگ جب بھاری میز کو بڑی احتیاط سے آگے لے جا رہے تھے، سامنے سے ایک ملازمہ الحاج صفدر سلطان کی والدہ اور باقی سب کی دادو اسی سالہ مبارکہ خاتون کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی لا رہی تھی، دادو کا دھڑ مفلوج تھا اور اعضائے نطق بھی متاثر شدہ تھے لیکن باقی وہ ٹھیک ٹھاک تھیں۔ سعید کمال نے حیرت سے دیکھا کہ اس vantage فرنیچر کو دیکھتے ہی دادو کی آنکھیں پھیل گئیں، حیرت سے یا دہشت سے، سعید کمال کچھ سمجھ نہ سکا پھر اُس نے دیکھا کہ دادو کی ایرانی بلی خانم کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ اُچھل کر دادو کی گود میں جا بیٹھی۔ جب میز پاس سے گزری تو وہ ڈری ڈری غرابٹیں حلق سے نکالتی رہی اور دادو دائیں بازو کو زور زور سے ہلا کر جیسے اس میز کو دور ہٹا دینے کے شدید اشارے کرتی رہیں۔ انیلا نے نفرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"ویسے کمال تمہارا کیا خیال ہے اس عورت کو اب مر نہیں جانا چاہیے۔" اُس نے اچانک کہا اور کمال سے بھی پہلے وہ خود حیرت میں ڈوب گئی کہ یہ الفاظ، جو ٹھیک ہے اُس کے اندر کی آواز ہوں گے، اس منہ سے نکل کیسے گئے۔ آٹھ سالہ شادی شدہ زندگی میں اُس نے کبھی ایک بار بھی اپنی نفرت کا اظہار اس طرح بے باکانہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس گھر میں نفرت کے مواقع کی قطعاً کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے سسر الحاج صفدر سلطان کا خاندان کو ہر قیمت پر ایک مٹھ رکھنے اور گاہے بگاہے موقع دیکھ کر اپنی مخصوص، بقول انیلا منافقانہ بدبودار اقدار کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے رہنا نفرت انگیز تھا۔ وہ اکثر "مغربی گمراہ کن" ثقافت کے جہنمی رویوں کو گالیاں دیتا تھا لیکن اس کے دونوں بیٹوں نے امریکہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ انیلا کے شوہر نے وہیں سے ایم۔ بی۔ اے کیا تھا۔ درمیانہ سیفی ابھی ادھر ہی پڑھ رہا تھا۔ باقی رہا تیسرا جبار تو اُس کا ملکی یا مغربی کسی قسم کی تعلیم سرے سے مسئلہ ہی نہ تھی، اُس کا بس ایک ہی مسئلہ تھا سیکس اور سیکس۔ اور جو خود انیلا کو بھی کبھی کبھی ان مخصوص نظروں سے دیکھنے سے نہیں چوکتا تھا اور وہ نفرت سے بھر جاتی تھی۔ اور سب سے زیادہ نفرت تو اُسے ساس صفیہ بیگم سے تھی جو اُٹھتے بیٹھتے پوتا پوتا کا راگ الاپتی تھی۔ بیٹے کے گھر میں آٹھ سال میں ایک بھی بچہ پیدا نہ ہونا اُن کے لیے دنیا کا سب سے سنگین مسئلہ تھا۔ وہ ہزار نفرت انگیز گھناؤنے طریقوں سے بیٹے اور بہو

کے میڈیکل ٹیسٹ بھی کروا چکی تھی اور خفیہ طور پر ان کی خوراک میں تعویذ کا دھلا پانی بھی ملا چکی تھی۔ جسے ایک دفعہ انیلا نے پکڑ بھی لیا تھا اور زبردست ہنگامہ کھڑا کیا تھا پھر ان لوگوں نے اُسے دو سال تک کسی آرٹس کالج میں اعزازی کام بھی نہیں کرنے دیا تھا۔ مگر اب وہ جاتی تھی۔ اور اب اُس نے لان کے ایک کونے میں دس لاکھ کی لاگت سے ایک گیس کی بھٹی بھی لگوائی تھی جسے وہ تندور کہتی تھی اور جہاں وہ clay اور ceramics کے اپنے مجسمے بناتی تھی۔ اور اپنے دوستوں کو بتاتی تھی کہ اگر یہ تندور نہ ہوتا تو یقیناً وہ پاگل ہو چکی ہوتی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس نے کبھی سعید کمال کے سامنے اتنے کھلے جارحانہ الفاظ میں اُس کے خاندان کے کسی فرد کے لیے اتنی شدید نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

سعید کمال نے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اس کا پہلا خیال یہی تھا کہ شاید اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ "کیا کہا تم نے......؟" اُس نے پوچھا۔

اور انیلا نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پھر وہی الفاظ کہے گی اور اُسے کہنے چاہئیں آخر کیوں نہیں۔ اس شخص کو جو میرا خاوند ہے بُرے لگتے ہیں تو لگیں اور اُس نے کہا۔ "میں نے یہ کہا کہ یہ بڑھیا تمہاری دادی اب مر کیوں نہیں جاتی۔ خوامخواہ زندگی سے چمٹی پھرتی ہے۔" اوگاڈ یہ مجھے شاید نہیں کہنا چاہیے تھا...... اس نے سوچا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا تم اپنے حواس میں ہو — تم — اپنے ان آرٹسٹ لفنگے دوستوں کے ساتھ...... پھر لے رہی ہو کیا Hash — ecstsy — speed — اور bullshit, like that......"

اب انیلا خاموش رہی۔ قصر سلطان میں گول میز کی آمد کے ساتھ وہاں کے مکینوں کے لیے یہ ایک انوکھے آغاز کا آغاز تھا۔

انیلا نے میز کو اپنے رہائشی حصے میں جسے وہ سرونٹس کوارٹرز کے مقابلے میں طنزیہ طور پر ماسٹرز کوارٹرز کہتی تھی، ہر جگہ کوئی مقام دینے کی کوشش کی لیکن کہیں بھی وہ پہلے سے قائم ترتیب و توازن سے ہم آہنگ نہ ہوتی تھی۔ "کیا مصیبت ہے" وہ تھک ہار کر بیٹھی تو اُسے سعید کو ایک دیرینہ مسئلے پر پھر رگیدنے کا بہانہ مل گیا "اگر میرا کوئی اپنا چھوٹا موٹا مکان ہوتا تو یہ نہ ہوتا۔ لیکن اس خاندانی اصطبل میں تو ہر جانور کے لیے رسی کھونٹا تیار ہے۔ اب اگر کوئی بڑا

ڈرائنگ روم ہوتا تو ایک طرف رکھوا دیتی جہاں لوگ برج کھیل سکتے تھے۔"

"برج کون کھیلنے آتا ڈارلنگ......" سعید کمال نے اس کی قدرے حیران کن معمول سے کہیں زیادہ بدزبانی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ شام گہری ہو رہی تھی اور پھر اُس نے اُسے اشارے دیئے کہ وہ اُس کے ساتھ سونا چاہتا ہے۔

"لاکھ کوشش کر لو۔ کوئی بچہ نہیں بنے گا...... shit...... تم اپنی ماں کو یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک گائے پال لے۔ ہر سال بچہ دے گی۔ دودھ الگ...... اور ہاں......" کچھ یاد آنے پر وہ چیخی۔ "تمہارا چھوٹا بھائی جبار...... وہ ہر وقت ایسے ہوتا ہے جیسے بیل مستی میں ہو like a bull in heat...... اُسے کوئی گائے لا دو...... ہر سال بچہ تیار...... ابھی تو وہ بیچارہ۔ سرونٹ کوارٹرز کے رستے سے اپنے ماسٹرز کوارٹر میں عورتیں منگواتا ہے۔ تمہیں شاید بتایا تھا ایک دفعہ اُس نے مجھے چھونے کی کوشش کی تھی...... بتایا تھا......؟"

انیلا اُسے وہ واقعہ کئی دفعہ بتا چکی تھی، پھر بھی اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا 'شاید...... بتایا تھا" اور اس نے سوچا...... کہ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں اس عورت کے ابھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی لاش کو اسی کی بھٹی میں ہی جلا کر راکھ کر دوں...... پھر اُسے بھی حیرت ہوئی کہ اس طرح کی وحشیانہ سوچ پہلے کبھی اُس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ مگر اس لمحے جب کہ سعید کمال اور انیلا بلال برآمدے میں ابھی ویسے ہی رکھی اس میز کے آمنے سامنے بیٹھے تھے، وہ یقیناً یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند ہفتے بعد ہی اُسے کسی اور عورت کی لاش کے ٹکڑے انیلا بلال کی سرامکس اور terracota کے شاہکار bake کرنے والی بھٹی میں راکھ کروانے ہوں گے۔ اور اس کام میں نہ صرف اس کا چھوٹا بھائی اور ملازم بلکہ باپ بھی شریک ہوں گے۔ ہر انسان کی طرح مستقبل سے بے خبر سعید کمال نے فی الحال تصور میں انیلا بلال کے جسم کے ٹکڑے کیے اور اسے مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ انیلا کے ساتھ انصاف کرنے کے تصور نے اُس کی اُس کے لیے خواہش کو اور بھی بڑھا دیا۔ اُس نے پھر اُسے مخصوص اشارے کیے۔

"اچھا۔ بابا...... پہلے اس میز کو کہیں رکھواؤ نا......I love this table" انیلا نے دونوں مٹھیوں کو میز پر دھما دھم بجاتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی چیخی۔ "او مائی گاڈ۔ او مائی گاڈ...... مجھے پہلے خیال کیوں نہیں آیا۔ تندور۔ کمال۔ تندور......" اور سعید کمال سمجھ گیا کہ وہ کیا

چاہتی ہے اور اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لکڑی کی یہ مصیبت جسے وہ لاکھ روپے دے کر لایا تھا ٹلی۔ میز انیلا کے تندور کے قریب رکھوا دی گئی جس کے اوپر مضبوط جست کی چوڑی چھت بنوائی گئی تھی۔

"مجھے clay کو ہینڈل کرنے۔ پھیلانے کے لیے ایسی ہی Flat space کی ضرورت تھی...... یہ بنوائی ہی میرے لیے گئی تھی......"

"ہوں۔ تو تم...... تمہاری کچھ...... وہ مٹی کی چل رہی ہے۔ statue activity؟"

"statue...... تم لوگوں کے ذہن میں بُت پھنسے ہوئے ہیں۔ حاجی صاحب کی طرح......" اس نے حقارت سے کہا۔ "یہ کچھ اور کام ہے بھائی۔ یہ میز بھی...... ابھی تو نہیں...... یورپ سے واپسی پر شروع کروں گی۔" ان دنوں پروگرام یہ تھا کہ انیلا بلال آرٹس کالج کے اپنے کچھ پسندیدہ کولیگز کے ساتھ (اور کافی حد تک اُس کے خرچے پر) میلان جائے گی۔ جہاں اُس نے یہ سب تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ لوگ اس کا سابقہ ڈیپارٹمنٹ اور آرٹ اکیڈمی دیکھیں گے۔ متعلقہ لوگوں سے ملیں گے چند دن گھومیں پھریں گے۔ اور پھر سعید کمال اُسے جائن کرے گا، کولیگز واپس چلے جائیں گے اور وہ دونوں ڈیڑھ دو ماہ یورپ میں گزار کے واپس آ جائیں گے۔ مزدور جا چکے تھے۔ میز انیلا بلال کے تندور کے پاس رکھوانے کے لیے چند ملازمین اکٹھے کیے گئے جن میں فضل دین ڈرائیور بھی شامل تھا جس کی پوتی خالدہ چند ماہ پہلے ہی کویت سے آئی تھی جہاں اُس کا باپ درزی کا کام کرتا تھا۔ باپ اور خود خالدہ کی شدید خواہش کے مطابق اُسے ایک اچھے مقامی کالج میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخل کروایا گیا تھا۔ دادا پوتی سرونٹس کوارٹرز میں رہتے تھے۔ اور پھر وہی بات کہ مہاگنی کی بنی گول میز کو قصر سلطان کے چار دوسرے ملازموں کے ساتھ ایک طرف سے اٹھواتے ہوئے وہ کیسے جان سکتا تھا کہ چند ہی دن بعد اس میز پر اس کی پوتی کی لاش کے ٹکڑے کیے جائیں گے اور پھر ان کو بھٹی میں جلا دیا جائے گا۔ سچ ہے مستقبل سے بے خبری انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ میز رکھوا دی گئی اور سعید کمال اور انیلا بلال بالآخر بیڈ روم میں چلے گئے۔

خالدہ جاوید ایک خوش شکل اور ذہین لڑکی تھی اور زندگی میں کچھ بننا چاہتی تھی۔ ایف۔ ایس۔ سی کی طالبہ ہونے کی وجہ سے کالج سے واپسی پر سہ پہر کو وہ ایک ٹیوشن سینٹر میں

چلی جاتی اور اکثر غروب آفتاب کے بعد واپس آتی۔ سرونٹس کوارٹرز قصر سلطان کے مین گیٹ کے بائیں طرف سب رہائشی عمارتوں سے پیچھے کافی فاصلے پر تھے لیکن خالدہ کبھی کبھی آسانی کے لیے پچھلی سڑک کے رستے سرونٹس کوارٹر میں پہنچنے کی بجائے مین گیٹ کا چھوٹا رستہ بھی اختیار کر لیتی تھی۔ اگر وہ یہ رستہ اختیار نہ بھی کرتی تو پھر بھی اُس کا الحاج صفدر سلطان کے چھوٹے بیٹے جبار کی نظروں میں آنا ناگزیر تھا کیونکہ وہ اپنے خاص ذاتی ملازم دلدار کے ذریعے ملازمین میں female resources سے آگاہ رہتا تھا۔ خالدہ کو راہ پر لانے کے لیے جبار کے معمول کے سب طریقے ناکام رہے جن میں اپنی مردانہ وجاہت پر اعتماد، شہزادی بنانا، لالچ اور دھمکی سب شامل تھے تو ایک تاریک گہری شام اُس نے خالدہ کو ٹیوشن سینٹر سے واپس آتے اپنی سیاہ شیشوں کی گاڑی میں اٹھوایا اور اپنے بیڈ روم میں پہنچایا۔ اور نیم بے ہوشی کی حالت میں اس سے زیادتی کی۔ بعد میں ہوش آنے پر جب خالدہ نے بڑے نوٹوں کی کئی بڑی بڑی گڈیوں کو نظر انداز کر کے شور مچانا اور باہر کو بھاگنا چاہا تو جبار نے شدید افراتفری کے عالم میں اُسے خاموش کرنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا۔ اور اس وقت تک جمائے رکھا جب تک وہ بالکل خاموش نہ ہو گئی۔ اسے بہت حیرت ہوئی جب اُسے اندازہ ہوا کہ وہ تو مر چکی ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ شور نہ مچائے اور اس کی پیشکش قبول کر لے جس میں دونوں کا بھلا تھا۔

فضل دین جب ہر امکانی جگہ پوتی کو تلاش کر چکا تو روتے ہوئے اپنے مالک اپنے محسن کے پاس آیا۔ الحاج صفدر سلطان بھی بہت پریشان ہوئے۔ کیونکہ فضل دین کو وہ حقیقتاً اپنا خاندانی ڈرائیور سمجھتے تھے اور اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ وہ اسی وقت اُس کے ساتھ متعلقہ تھانے گئے اور بچی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ تھانے دار اتنی بڑی شخصیت کو اپنے ڈرائیور کی پوتی کے معاملے میں اتنی ذاتی دلچسپی لیتے دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اُس نے رپورٹ درج کی، معلومات حاصل کیں اور کارروائی شروع کرنے کا یقین دلایا۔ اسی رات تین بجے جبار نے بھائی اور باپ کو اعتماد میں لیتے ہوئے اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔

تینوں باپ بیٹے سعید کمال کی طرف اکٹھے تھے کیونکہ چند دن پہلے انیلا یورپ جا چکی تھی۔ 'کیا ہو چکا ہے' یہ جاننے پر الحاج صفدر سلطان بری طرح لڑکھڑا گئے اور دونوں بیٹوں

کو شک ہوا کہ شاید انہیں دل کا دورہ پڑ چکا ہے۔ لیکن پھر جب ان کے حواس بحال ہوئے تو پہلی بات انہوں نے یہ کی "سیفی کو بلاؤ" سیفی۔ سیف سلطان جسے اُس کے بے تکلف دوست SS کہتے تھے اور کبھی کوئی ہٹلر کی بدنام زمانہ قاتل فورس SS سے اس کی ہم نامی کا مذاق بناتا تھا تو ایک عجیب سا تاثر اُس کے چہرے پر نظر آتا تھا۔ سیفی حاجی صاحب کا منجھلا بیٹا تھا اور امریکہ میں ایم۔بی۔اے کر رہا تھا۔ وہ اُسے اپنا حقیقی جانشین سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق بڑا سعید کمال زن مرید تھا اور اُس کی نہ کوئی قوت فیصلہ تھی اور نہ ارادہ، اور رہا چھوٹا جبار تو وہ خاندان کا بدمعاش تھا جو اکثر شرفا کے معزز خاندانوں میں بدقسمتی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سیفی تھا جو خاندان کی عزت و ناموس اور ترقی کا رکھوالا بن سکتا تھا۔ اور جب الحاج صفدر سلطان خاندان کو ایک مٹھی دیکھنے کی بات کرتے تھے تو اس سے ان کی مراد صرف خود میاں بیوی اور بیٹے بیٹیاں نہ تھے بلکہ بیوی کا خاندان۔ دو بیٹوں کے سسرالی خاندان۔ بہو کا خاندان اگرچہ وہ بہو ایسی تھی جسے اُن جیسے صلح پسند آدمی نے بھی خواب میں کئی بار ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ نکلتی تھی۔ اس کے علاوہ ان خاندانوں کے بھی آگے خاندان۔ اس طرح یہ کوئی پچیس تیس خاندانوں کا سپر خاندان بنتا تھا۔ جن کی ترقی، عزت و وقار، مرنا، جینا ایک دوسرے سے الگ نہیں تھا۔

"سیفی کو بلاؤ" الحاج صفدر نے پھر شدید جذباتی انداز میں کہا۔

"وہ تو بلاتے ہیں ابا جی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ابھی فوری طور پر کیا کیا جائے۔" سعید کمال نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا، اس کی آواز میں دہشت تھی اور جسم کانپ رہا تھا۔

اس پر اچانک الحاج صفدر سلطان کو خیال آیا کہ جبار بیٹے کی اس سنگین حرکت پر اُن کا اُسے کچھ بُرا بھلا کہنا تو بنتا ہے۔ چنانچہ پانچ دس منٹ تک انہوں نے اُسے گالیاں دیں اور سزا و جزا سے متعلق لعنت ملامت کی لیکن ان کے اس سب کلام میں کوئی گہرا تاثر نہیں تھا کیونکہ صفدر سلطان اپنے چھوٹے بیٹے جبار کو مدتوں پہلے ہی معاف کر چکے تھے، وہ جان چکے تھے کہ وہ ماں پر گیا ہے۔ کئی دہائیاں پہلے جب ابھی وہ قصر سلطان کی منزل سے کافی دور تھے صفیہ بیگم نے ایک ملازمہ بچی پر اتنا تشدد کیا تھا کہ وہ مر گئی تھی۔ وہ ملازمہ کے ہاتھوں پر بھاری کفگیر سے ضربیں تو لگاتی ہی تھی لیکن اس روز وہ اُس کے سر پر بھی ضربیں لگا بیٹھی۔ انسان سے اندازے

کی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ یہ صفیہ بیگم کا شوق تھا۔ بہر حال وہی جانتے تھے کہ کس طرح انہوں نے بے شمار رقم اور کئی سطح کے تعلقات استعمال کر کے معاملہ ختم کرایا تھا۔ موجودہ معاملہ بھی ویسا ہی تھا اور ان کا دل بتاتا تھا کہ یہ بھی حل ہو جائے گا۔ لیکن اب ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس طرح کی بھاگ دوڑ کرتے جیسی عزت دار خاندانوں پر ایسا بُرا وقت آنے پر کی جاتی ہے۔ اللہ بُرے وقت سے بچائے انہوں نے دعا کی۔ اور پھر کہا۔ ''سیفی کو بلاؤ۔''

''بلاتے ہیں ابا جی۔'' اب جبار نے کہنا شروع کیا جو باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کے دوران بالکل خاموش رہا تھا۔ ''بلاتے ہیں سیفی بھائی جان کو...... لیکن ابھی...... جیسا سعید بھائی جان نے کہا ہے۔ کرنا کیا ہے؟'' ''تو میں بتاتا ہوں۔'' دلدار کہتا ہے۔ ''مُدا ہی غائب کر دو۔ راکھ کر دو......''

''کیا مطلب......'' سعید کمال نے پوچھا۔

''دیکھیے بھائی جان۔ اُسے دو تین لاکھ دینا ہوگا...... وہ...... کہتا ہے...... دیکھیں...... بھابی تو اتفاق سے...... میں کہتا ہوں۔ یہ بھی اچھا ہے۔ یورپ گئی ہوئی ہیں...... ان کا جو...... تندور...... ہے......''

''what...... تمہارا دماغ خراب ہوا ہے......'' سعید کمال اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''ہمیں خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا...... سب دلدار کرے گا۔ obviously...... بس۔ اس حصے میں کسی ملازم کو نہ آنے دیں...... وہ کہتا ہے۔ ایک رات کا کام ہے۔ وہ کل رات شروع کرے گا...... اور یہ furnace تو بھائی جان آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ آرٹ۔ مجمے بنانے والے۔ کسی ایک بندے کی ضرورت سے بہت آگے ہے...... اس پر تو پورا ڈیپارٹمنٹ کام کر سکتا ہے۔ بھابی نے محض آپ کا خرچہ کروانے...... کے لیے بنوائی تھی...... بہر حال...... یہ ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا...... بعد میں وہ سب صفائی بھی کر دے گا......''

''ذلیل۔ کمینے۔ بے حیا۔ بد بخت۔ نامراد۔ لعنتی...... یہ تو نے کیا کیا......'' الحاج صفدر سلطان نے پھر سٹارٹ لیا۔ اور دل میں سوچا کہ اگر اس ترکیب پر کام ہو جائے تو یقیناً بہت آسانی ہو جائے گی۔ لیکن انہوں نے پھر کہا۔

''سیفی کو بلاؤ۔''

سعید کمال نے گہری سانس لی وہ خود بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا جس پر اُس کا باپ پہنچ تھا، ساتھ وہ اِس اتفاق پر بے حد مطمئن ہوا کہ انیلا سین پر نہیں ہے۔ دلدار کو اس کا کام کرنے دیا گیا اور سیفی کو اگلی فلائٹ پر ہی گھر بلا لیا گیا۔ اس رات ساری رات بھٹی جلتی دیکھ کر صفیہ بیگم نے سعید کمال سے پوچھا تو اُس نے لاپروائی سے کہا۔

''انیلا کچھ چیزیں clay کی چھوڑ گئی تھی کہ انہیں bake کروا دینا۔ وہ سب کرتے رہے......'' سعید کمال نے کہا اور صفیہ بیگم مطمئن ہو گئی۔

دلدار نے سب کچھ صاف کر دیا۔ اور اس کام میں اس نے مہاگنی کی نئی گول میز سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور بعد میں اُسے بھی بھرپور صاف کر دیا۔ سعید کمال نے بے چینی سے اُس میز کو وہاں سے ہٹوا کر پگوڈے کے نیچے رکھوا دیا۔ اور پھر وہی عجیب بات ہوئی اگلے روز دادو کی وہیل چیئر جب پگوڈے کے نیچے پڑی میز کے قریب سے گزری تو اُن کی ایرانی بلی خوفناک آوازیں نکالتی دہشت کے عالم میں ان کی گود میں بیٹھ گئی اور وہ خود لرزتے ہوئے ہاتھ سے میز کی طرف اشارے کرنے اور منہ سے کچھ بات کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ صفدر سلطان اور سعید کمال اُدھر سے گزرے اور انہوں نے یہ سب واقعہ دیکھا تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور صفدر سلطان نے کان ماں کے منہ کے قریب کر کے کچھ سننے کی کوشش کی۔

''جی امی جی۔ جی...... ہٹوا دیتے ہیں۔ آج ہی نکال دیتے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور باپ بیٹے کی نظروں میں اور بھی حیرت آ گئی۔

اُسی شام الحاج صفدر سلطان کا ایک دوست درانی جو رئیل اسٹیٹ کا کام کرتا تھا، انہیں ملنے آیا۔ وہ لان میں بیٹھے۔ باتوں باتوں میں صفدر سلطان نے میز کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یار درانی...... یہ میز ہم نے...... بچوں نے خریدی۔ بڑے شوق سے...... لیکن یہ کہیں بھی ڈھب سے سیٹ نہیں ہو رہی۔ اِدھر اُدھر لڑھکتی پھرتی ہے۔ تمہیں اگر ضرورت ہو تو......''

دُرانی لالچی آدمی تھا۔ اُس نے آنکھیں چمکا کر کہا ''تحفہ دے رہے ہیں حاجی صاحب۔'' الحاج صفدر نے سوچا اس کمینے لالچی کی بات مان لینی چاہیے۔

''ہاں۔ ہاں۔ دُرانی...... بالکل...... میری طرف سے...... کیوں نہیں۔'' انہوں نے کہا تھوڑے سے قلق کے ساتھ کہ وہ جلد بازی نہ کرتے تو کہیں نہ کہیں تو بک جاتی۔

اُسی رات لی پا نگ کا وہ "لکڑی کا خواب" دُرانی بلڈنگ میں منتقل ہو گیا جسے دُرانی نے بڑے قبرستان سے ملحقہ قطعہ میں بنوایا تھا اور فرنیشڈ آفسز کو کرائے پر دینے کا بہت کامیاب سلسلہ شروع کیا تھا۔ میز ابھی تک کرائے پر نہ اٹھے ایک آفس میں رکھوا دی گئی جہاں ایک خالی جگہ میں دُرانی ایک عام قسم کی بڑی آفس ٹیبل رکھوا کر ایک پارٹی کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب اُسے خیال آیا کہ پارٹی کوئی آرٹسٹ فلمی ٹائپ لوگ ہیں تو اُسے خیال آیا کہ اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے اس گول میز سے بہتر اور کوئی فرنیچر نہیں ہو سکتا۔ اگلے روز مستری یاسین نے آ کر اُس کی خوب رگڑائی کی تو اُسے بعض عجیب سے دھبے اور تیز دھار آلے کی ضرب کے کچھ نشان نظر آئے۔ لیکن اس نے پٹین لگا کر جو پالش کی تو میز کی خوبصورتی دیکھ کر وہ خود دنگ رہ گیا۔

گول میز کی دُرانی بلڈنگ کے اس دفتر میں منتقلی کے بعد قصرِ سلطان میں رواں دواں سلسلہ ہائے واقعات ایک لحاظ سے گول میز کی کہانی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جبار کی کہانی یا خالدہ کی کہانی یا پھر قصر سلطان کی کہانی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یا پھر اور بہت سی انواع و اقسام کی کرسیوں میزوں کی کہانیوں میں بٹ جاتے ہیں۔ بڑی میزیں۔ سبز کپڑے والی میزیں۔ رنگ برنگے بہت سے ٹیلی فونوں والی میزیں۔ جھنڈے والی میزیں...... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ انسانوں کی طرح چیزیں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر پیچھے کچھ عرصے کے لیے ایک عارضی خلا ضرور چھوڑتی ہیں۔ اس عارضی خالی جگہ کو ہم مختصر ترین انداز میں پُر کرنے کی کوشش کریں گے۔

سیفی۔ سیف سلطان یا SS آیا۔ اس نے سب ماجرا انتہائی سکون سے سننے کے بعد گہری سانس لی اور کہا۔ "سرکٹ بنانا پڑے گا۔" اور اُس نے دو تین لسٹیں بنائیں جن پر "انسانی وسائل"۔ "انسانی تعلقات"۔ "مالی وسائل"۔ جیسے عنوانات لکھے تھے۔ اور پھر ایک بڑے flow chart پر یہ سب کچھ "انسانی واقعات" سے جڑتے چلے گئے۔ سیفی کے سرکٹ کو انتہائی مختصر ڈھانچے کی سطح پر رکھتے ہوئے ہم اسے کچھ اس طرح لکھ سکتے ہیں۔ پانچ انتہائی اعلیٰ سطح کے پولیس حکام۔ دس نچلے درجے کے پولیس ملازمین۔ دو جج۔ دو فوجی۔ چار گریڈ 21 سے اوپر کے بیوروکریٹ۔ دو نامور وکیل۔ دو نامور صحافی۔ دو انتہائی کامیاب ڈاکٹر۔ زیرزمین

دنیا کے دو کارندے۔ دو غیر متنازعہ مذہبی شخصیات۔ دو سفارت کار۔ دس لاکھ۔ تین لاکھ۔ دو لاکھ۔ تین لاکھ۔ چھ لاکھ۔ دو گاڑیاں۔ ایک مکان۔ بیرون ملک سیر اور کاسینوز کے اخراجات۔ بیس لاکھ۔ پھر دس لاکھ...... الحاج صفدر سلطان کا بہت سلیقے سے تھانیدار کے کان میں ڈالنا کہ لڑکی کسی آشنا کے ساتھ بھی غائب ہو سکتی ہے...... خالدہ کے باپ کی کویت سے آمد۔ [illegible] ڈرائیور کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال۔ راست بازی کی ایک مخصوص شہرت رکھنے والے ایک تفتیشی افسر کی جبار کو شامل تفتیش کرنے میں ناکامی۔ دلدار کا اپنے گاؤں میں گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کرنا۔ خالدہ کے باپ جاوید کی ایک قصباتی اخباری رپورٹر سے ملاقات۔ قصر سلطان کے بارے میں شکوک و شبہات پر مبنی رپورٹ چھپوانے میں ناکامی۔ رپورٹر پر پراسرار تشدد۔ کویت میں جاوید کے عربی کفیل کا اُسے مزید ویزا دینے سے انکار...... سیفی کا درزی جاوید کی مدد کرنا...... قصر سلطان میں منعقد ہونے والی دعائیہ مذہبی تقریبات میں چار گنا اضافہ۔ ایک ہم پلہ خاندان میں جبار کی شادی کے سلسلے میں ابتدائی مثبت سلسلہ جنبانی۔ وغیرہ وغیرہ۔ وغیرہ۔

سیفی کو سرکٹ مکمل کرنے میں چھ ماہ لگ گئے۔ اس کے لیے اسے یونیورسٹی میں اپنا سمیسٹر freeze کرانا پڑا۔ سیفی کے سرکٹ سے باہر ہونے والا صرف ایک واقعہ دلچسپی کا حامل ہے۔ ان واقعات کی ابتدا میں ہی سعید کمال یورپ جا کر اپنی بیوی (انیلا شادی کے بعد انیلا کمال کہلوانے پر شدید غصے کا اظہار کرتی تھی) انیلا بلال کو جاپان نہ کر سکا۔ وہ دو ہفتے بعد واپس آئی تو پہلی بات جو اُس نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ گول میز غائب ہو چکی ہے۔ اُس نے سعید کمال سے پوچھا تو اُس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ پھر انیلا بلال اپنی ذاتی ملازمہ کو الگ بٹھا کر دیر تک پتہ نہیں کیا باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ پورا ایک دن رات خاموش رہی۔ ناشتے کی میز پر حیرت انگیز طور پر اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو اُس نے سعید کمال کے سامنے رکھی۔ یہ مشہور مصنفہ اگاتھا کرسٹی کا ایک ناول تھا۔ سعید کمال دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور انیلا کی طرف دیکھا اور انیلا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں اصطبل میں تو رہ سکتی ہوں لیکن بُچڑ خانے میں نہیں۔ تم کل ہی وہ اطالوی طرز کا بنگلہ لے رہے ہو جو میں نے تمہیں بتایا تھا......"

''ٹھیک ہے۔'' سعید کمال نے مری ہوئی سی آواز میں کہا۔

''باقی میری طرف سے سب جہنم میں جائیں......'' انیلا نے کہا۔ وہ ساری عمر سعید کمال کو ہی نہیں اس پورے خاندان کو مطیع رکھنے کا اتنا نادر موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح 'بے جان' چیزیں انسانوں کی دنیا کی مجہول یعنی شاہد (passive witness) یا کہہ لیں مجہول کردار (passive character) بن کر انسانوں کے تجربے کو اُس کے انسانی مرکز سے گریزاں کرتے ہوئے ایک نئے اور مختلف انسانی بیانیے کو جنم دے سکتی ہیں۔ آخر یہ ضروری تو نہیں کہ ہر واقعے کا محور انسان ہو۔ چیزوں کے محور سے پھوٹنے والی یہ انسان گریز انسانی دنیا ایک متعین اور مخصوص 'احساسی فضا' قائم کرتی ہے جیسا ہم نے پیچھے کہیں پرتگالی شراب کی خالی بوتل، ارشاد کباڑیے کے سلیپنگ بیگ اور پیارا بونے کے میگافون کی مثالوں میں دیکھا۔

ہم حیران ہیں (اور حسن کی پیروی میں بطور مدیر حیرت یہی ہمارا منصب ہے) کہ پیرو کے ایمزن کے تین مہاگنی درختوں کی لکڑی سے بنی اس چیز۔ چینی کاریگر کی مہارت کے شاہکار اس میز کے ارد گرد رونما ہونے والے انسانی کرداری طرز عمل اور واقعاتی تاریخی سلسلوں کی دنیا میں روز اول سے ہی 'شر کی نحوست' کی وہ احساسی فضا گہری مستحکم ہو گئی جو اذیت کی مٹی میں عذاب کی فصلیں کاشت کراتی ہے۔ انسان اور انسان بلکہ حیوان تک کے درمیان ایک اٹل ازلی خلا حائل ہے۔ خیر اور شر بس اتنا ہے کہ تم اس خلا کو کیسے پُر کرتے ہو۔ کتے کو مت مارو۔ اس شخص کو میز پر لٹا کر پلاس سے اُس کے ناخن نہ کھینچو۔ اس عورت کو کپڑوں میں لپیٹ کر پتھر مت مارو۔ اس شخص کو موت کی چہل قدمی نہ کراؤ۔ کتے کی جگہ تم ہو۔ شخص کی جگہ تم ہو۔ عورت کی جگہ تم ہو۔ تم دوسرے اور اپنے کے درمیان خالی کو حیرت انگیز طور پر چند لمحوں کے لیے اپنے آپ سے پُر کر لیتے ہو۔ جو ایک معجزہ ہے۔ (کہہ لیں ارتقائی معجزہ ہے) شر اس معجزے سے عاری ہے۔ وہ میرے اور تیرے درمیان پھیلی نیستی کو نیستی سے پُر کرتا ہے۔ نیستی کو نیستی سے پروان چڑھاتا اور تاریکی میں تاریکی پھیلاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہم ان کافی رٹے پٹے لیکن ازلی انسانی معاملات پر خواہ مخواہ اپنے مشکوک فلسفے بگھارنے کی عیاشی کر رہے ہیں۔ لیکن عیاشی بھی کبھی کبھار ناگزیر ہو جاتی ہے خواہ

وہ مدیر حیرت جیسے لاانسان کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ ہم اپنے اصل سوال کی طرف آتے ہیں اور جس کا جواب بہت آسان ہے۔ کم از کم ہمارے لیے۔ سوال یہ ہے کہ صرف ایک چیز یعنی یہ گول میز کس طرح اپنی طویل تاریخ میں مسلسل ''شر کی نحوست'' کے گہرے حصار میں رہ سکتی ہے۔ وہی بات...... ہم سمجھتے ہیں کہ یہ انتہائی غیر احتمالی ہے۔ لیکن پھر بھی ناممکن نہیں اور جو ناممکن نہیں اُسے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر کوئی تجزیہ کار میز کو ایک فعال مرکز ماننے کی بات کرتا ہے۔ اور دعوے کے ثبوت میں مہاگنی کے پانچ بار دو شاخہ ہونے والے مقدس درخت کی انڈین روح نگاڈا ماشی کے غیر مرئی شر کو درمیان میں لاتا ہے تو ہم اسے ناممکن مانتے ہیں۔ یا زیادہ درست یہ کہنا ہوگا کہ اسے ناممکن ماننے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے تئیں غیر مرئی معاملات سے معاملہ کرنے کے اہل نہیں سمجھتے۔

یوں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قصر سلطان اور سیفی سرکٹ سے خارج ہونے کے بعد گول میز کے گرد قائم 'شر کی نحوست' کا نام نہاد حصار کچھ دیر تک قائم نہیں رہتا۔۔۔ لیکن شاید یہ کہنا درست نہیں ہوگا...... کہہ لیں اُس طرح قائم نہیں رہتا۔ یعنی اُس طرح کی نحوست...... جسے انسان انواع و اقسام کے کیفیاتی اسماء (مثلاً وحشت و بربریت، دہشت، خوف، ناقابل یقین سفاکی، درندگی، ہوس، شیطنیت، کمینگی، کھلی بدمعاشی، جبر، ظلم، ناانصافی وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ) سے بیان کرنے کی کوشش بلکہ ناکام کوشش کرتے ہیں۔

دُرانی بلڈنگ کے فرنشڈ آفس میں جگہ پانے کے بعد میز جن چھ سات افراد کے تصرف میں آتی ہے ان کی انسانی دنیا کے بارے میں یہ کہنا کہ 'شر کی نحوست' سے یکسر پاک تھی بالکل لغو بات ہوگی۔ مگر بات پلڑا بھاری ہونے کی ہے، وہی پرانی فرشتے اور شیطان کے درمیان جھولتے رہنے یا کسی ایک طرف ہمیشہ کے لیے قائم ہو جانے کی بات۔ یہ وہ دھیمی کھلنڈری نحوست ہے جو انسان کو انسان پر برتری حاصل کرنے کا بظاہر ''ناقابل تسلیم محرک'' بنتی ہے۔ اور ''مجھے مانو'' ۔ ''مجھے مانو'' کے ایک اور ازلی انسانی خلا کو پُر کرنے کی بھیک مانگتی ہے۔ دھمکی دیتی ہے۔ اور تعجب ہے کہ 'عورت کو پتھر نہ مارو' اُس شخص کو بجلی کے جھٹکے مت دو میں عورت اور شخص کے خلا کو تو انسان پوری شدت سے گو لمحاتی طور پر ہی سہی، اپنے آپ سے بھر دیتا ہے۔ لیکن ''مجھے مانو مجھے پہچانو'' کے عذاب سے بلبلاتے انسان کے خالی کو لاتعلقی کے

خالی سے پُر کر کے اُسے اور بھی بدحال کر دیتا ہے......'' یہ خالی کو خالی سے پُر کرو کا ایک اور منظر نامہ ہے۔

سوانگ پروڈکشنز نامی چھ سات افراد کے اس گروہ اور خاص طور پر ان میں سے تین یعنی دو مرد اور ایک عورت کا ''مجھے مانو مجھے پہچانو'' کا یہ منظر نامہ ایک فلم بنانے کے مختلف مراحل پر محیط تھا۔ گو فلم کے ذریعہ اظہار کے فنی، جمالیاتی اور تخلیقی پہلوؤں سے ان کے خلوص اور commitment پر ان میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے پر شک نہیں تھا۔ لیکن محبت کی ٹوٹتی پھوٹتی تلون کی آمد اور فلم کے مالیاتی مسائل حل کرنے کے لیے ایک جنس زدہ لیکن عیار دولت مند شخص کے ساتھ جنسی ترغیب کا مضحکہ خیز کھیل اس منظر نامے میں ''خالی ـــــ بھرا ہوا'' کی جدلیات کی کئی دلچسپ شکلیں پیدا کرتا رہا۔ سائرن اینڈ سی پوکر کلب کے بعد پہلی دفعہ گول میز کے گرد ایک مخصوص نشست حاصل کرنا گروپ کے ایک فرد کے لیے ایک سنگین مسئلہ بن گیا۔ سیٹھ کے جسمانی مسائل حل کرانے کے لیے اسے مردوں کی معاملہ فہم ایک عورت کی مدد فراہم کرنا بھی ایک کامیاب چال نہ بن سکا اور فلم کی مالیاتی عملیت خطرے میں پڑ گئی۔ لیکن اس سب کے باوجود لی پانگ کے 'لکڑی کے خواب' اور اس گول میز کے گرد انسانی خوابوں اور حقیقتوں کی دنیا ماورائے حقیقت اور عدم حقیقت کی طرف تو ضرور جھکتی رہی لیکن اس کی سابقہ تاریخ سے کچھ عرصے تک کافی مختلف رہی۔

لیکن پھر وہ واپس آئی 'شر کی نحوست' ایک مختلف روپ میں اور ایک انتقامی شدت کے ساتھ۔ فلم کی تکمیل کے ایک مرحلے پر ایک دوسرے مقام کے سفر سے واپسی پر جب وہ میز کے گرد بیٹھے تو محبت، دوستی، تخلیق، تحریر، تکنیک، فن، مہارت، جنس، مانو۔ پہچانو، نفرت، قبولیت اعلیٰ مقصد، محنت، قربانی کی اس نازک دنیا کے ہمیشہ کے لیے برباد ہو جانے کا احساس اُن میں شدید تھا۔ مگر نحوست کی تاریکی میں گم ہو جانے سے محفوظ رہنے کے لیے امید کی آخری کرن شاید اب بھی باقی تھی؟ بربادی کے سفر کے بعد سوانگ پروڈکشنز میں ہونے والی اگلی میٹنگ کا حال اس سوال کا جواب فراہم کر سکتا ہے۔

....

(21)

خالی کو خالی سے پُر کرو

1۔ موت کی وبا

2۔ حسن سے خالی حسن

3۔ ہم نامی کی گمنامی

4۔ یہ فلم نہیں بن سکتی

1۔ موت کی وبا

پچھلے دن کے سرمئی بادل، پھوار، کِن مِن اور موسلا دھار بارش کی سہ پہر اب نہیں ہے۔ اور دُرانی بلڈنگ میں سوانگ پروڈکشنز کے دفتر کی لمبی کھڑکی کے سامنے آج پھر کھڑی باہر دیکھتی انیلا بھی کچھ ایسا ہی دیکھتی ہے۔ سہ پہر کی روشنی بابے گلاب کے مزار۔ چاہ پریاں والا اور ملحقہ قبرستان کے درختوں میں گہرے سائے بنا رہی ہے۔

گول میز کے قریب کھڑا سعید کمال بابے خُوشیے کو اپنی مخصوص نشست کے عین اوپر آویزاں بلی وائیلڈر کی تصویر اتروا کر وہاں پاس ہی لگی انگمار برگمین کی تصویر لگانے کی ہدایات دے رہا ہے۔ بابا خُوشیا ایک کرسی پر کھڑا اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔

بیرونی دروازے سے ماسٹر یاسین آتا ہے۔ انیلا گھوم کر دیکھتی ہے۔ ماسٹر ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہے۔ انیلا سر ہلا کر جواب دیتی ہے اور پھر باہر دیکھنے لگتی ہے۔ ماسٹر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ ہاتھ ہلا کر سعید کمال کو بھی سلام کرتا ہے۔ مگر اس کی طرف جانے کی بجائے بوجھل قدم اٹھاتا انیلا کے قریب سے گزرتے ہوئے باہر دیکھتا ہے اور رک جاتا ہے۔

"یہ لائٹ اس وقت کی میڈم بڑی کمال ہوتی ہے۔ شوٹنگ، فوٹوگرافی کے لیے"

ماسٹر ہچکچاتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہوں......" انیلا لاتعلقی سے کہتی ہے پھر جیسے اُسے کچھ یاد آتا ہے۔ "ماسٹر...... اُدھر میلے میں آپ لوگوں نے کافی تصویریں بنائی تھیں...... کیا تھیٹر کی بھی......؟" وہ پوچھتی ہے۔

"ج۔ جی...... میڈم" ماسٹر کی آواز میں افسردگی ہے۔ "بالی نے اتاری تھیں زیادہ سب ہیں...... ویسے بالی کا آج کچھ...... مطلب...... انتظام ہو جائے گا۔"

"بالی کا کچھ ہو جائے گا...... کیا مطلب۔"

"وہ...... آج...... ابھی تھوڑی دیر بعد...... سیٹھ صاحب نے آنا ہے...... فون پر بتایا کچھ چل رہا ہے۔ باس نے ہی کہا تھا...... ابھی فلم کے لیے پیسے کی ضرورت ہے......"

انیلا کے تاثرات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماسٹر کی بے ربط باتوں سے کچھ نہیں سمجھ سکی۔ پھر نفرت کی ایک لہر اس کے چہرے پر سے گزرتی ہے۔

"صفدر سلطان نے یہاں آنا ہے......"

"ج۔ جی...... جی۔ میڈم......" ماسٹر کہتا ہے۔ اور سعید کمال اور بابے خُوشیے کی طرف دیکھتا ہے۔

سعید کمال اُسے ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے اور آواز دیتا ہے۔

"ماسٹر۔"

انیلا پھر اپنا بے حس چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ لیتی ہے اور ماسٹر میز کے قریب کھڑے سعید کمال کی طرف چلا جاتا ہے۔

"تصویر بدلوا رہے ہو باس۔"

سعید کمال ماسٹر کے قریب جا کر رازداری سے بات کرتا ہے۔

"دیکھو ماسٹر۔ یہ bull shit۔ یہ تصویر بدلنا بدلوانا کچھ نہیں...... میں چاہتا ہوں یہ دونوں (ایک نظر انیلا کی طرف دیکھتا ہے) واپس آ جائیں۔ بھول جائیں جو کچھ ہوا۔ تم سیلی کو جانتے ہو۔ میں چاہتا ہوں میری یہ بکواس حرکت دیکھ کر وہ خوب بکواس کرے اور کچھ نارمل ہو۔ یار جو ہو چکا۔ وہ ہو چکا...... ہم آگے جائیں......"

ماسٹر سازشی تعریفی نظروں سے سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے۔

"سمجھ گیا باس...... ویسے سیٹھ نے فون پر بس ایسے ہی اشارہ کیا تھا کہ بالی کا کچھ ہو جائے گا......"

سعید کمال کے ماتھے پر حیرت سے بل پڑ جاتے ہیں۔

"بالی کا کچھ ہو جائے گا...... سیٹھ...... کہتا ہے۔ کیا مطلب؟"

بابا خُوشیا بلی وائیلڈر کی تصویر کی جگہ انگمار برگمین کی تصویر لگانے کے بعد انگمار برگمین کی تصویر کی جگہ بلی وائیلڈر کی تصویر لگانے کے لیے ایک کرسی سے اتر کر دوسری کی طرف بڑھتا ہے۔

"ابھی سیٹھ آئے گا...... تو بتائے گا باس۔"

بابا خوشیا تصویر لیے دوسری کرسی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہونے لگتا ہے تو تصویر اُس کے ہاتھ سے گرنے لگتی ہے۔ اُسے پکڑنے کی کوشش میں توازن کھونے لگتا ہے۔ شور مچاتا جھولنے لگتا ہے۔

"ما۔ ماس۔ ماسٹر۔ ماسٹر پک کڑ...... ڑو...... پک۔ پک۔ ڑا۔ ڑو۔"

انیلا گھوم کر دیکھتی ہے۔ ماسٹر تیزی سے جھپٹ کر بابے کو گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے سعید تصویر کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

انیلا بے اختیار ہنسنے لگتی ہے۔ سعید سب سے پہلے اُٹھتا ہے۔ انیلا کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنستا ہے۔ ماسٹر اور بابا بھی اٹھتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔

"سب بچ گئے...... بلی وائیلڈر سمیت" سعید کہتا ہے۔ "ماسٹر...... بلی کو تم پلیز اس کی جگہ پہنچا دو......"

ماسٹر یاسین ہنستے ہوئے تصویر لے کر کرسی پر کھڑا ہوتا ہے اور ٹانگنے لگتا ہے۔ بابا خوشیا کھڑا کانپ رہا ہے۔

"بابا جی...... آ...... آپ...... میرا خیال ہے چائے...... میں چاہتا تھا...... سیفی آ جاتا......"

سیفی آتا ہے۔ سعید کمال پرجوش انداز میں بات جاری رکھتا ہے۔ "لو...... think of the devil......"

سیفی قریب آتا ہے اور سب کے چہروں پر باری باری نظر ڈالتا ہے۔ خود اُس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ہیں۔ انیلا یک دم سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ سعید کمال تیزی سے استقبالیہ انداز میں اُس کی طرف بڑھتا ہے۔

"ہم لوگ بلی وائیلڈر کی جگہ انگمار برگمین کی تصویر لگا رہے تھے۔" سعید کہتا ہے۔ ماسٹر تصویر ٹانگنے کے بعد اترتا ہے اور مسکراتا ہوا سیفی سے مصافحہ کرتا ہے۔

"اور پھر سب کی الٹ بازی لگ گئی۔" ماسٹر کہتا ہے۔ سیفی کرسی سیدھی کر کے میز کے گرد اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر سعید کمال۔ انیلا بلال اور ماسٹر بھی۔

"انگمار برگمین......" سیفی گہرا سانس لیتا ہے "seventh seal والا......"

"exactly......" سعید کمال کہتا ہے اور ماسٹر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہے۔ "میں نے سوچا بلی...... کی نسبت انگمار برگمین کا کام تو کہیں بلند ہے اُسے یہاں ہونا چاہیے" سعید انگلی سے اوپر تصویر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر انیلا کی طرف دیکھتا ہے "تم نے بھی ہو گی seventh seal...... انیلا......"

"ہوں...... ہاں۔ میرا خیال ہے۔" انیلا سیفی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔ اور سیفی بتاتا ہے۔

"ایک knight اور اس کا squire صلیبی جنگ سے اپنے وطن سویڈن واپس آتے ہیں جو سیاہ موت یعنی طاعون کے نرغے میں ہے۔ نائٹ اکیلا شطرنج کھیل رہا ہے کہ موت ایک مذہبی لبادہ اوڑھے راہب کے روپ میں آتی ہے اور اُسے بتاتی ہے کہ اُس کا وقت آ گیا ہے۔ نائٹ موت کو شطرنج کھیلنے کی دعوت دیتا ہے۔ جو موت قبول کر لیتی ہے۔ اور نائیٹ اور موت شطرنج کھیلنے لگتے ہیں......"

"آ...... ہاں...... یہ classic ہے...... I stil love it" سعید کمال جھوم کر کہتا ہے۔

سیفی گہری سانس لیتا ہے اور میز کو کناروں سے پکڑتا ہے۔ "لیکن چیف یہ میز شطرنج کھیلنے کے لیے بالکل موزوں نہیں...... ہاں...... شاید جوا کھیلنے کے لیے ہو......"

"تم...... موت کو بلاؤ...... میز......" سعید کمال روانی میں کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے۔ اور سیفی بھی ہنس پڑتا ہے۔

"مجھے بلانے کی ضرورت نہیں...... چیف...... وہ خود آ رہی ہے...... موت کی دیا......" پھر ہنستا ہے۔ "جیسے بھاگاں والے کا تھانے دار کہتا ہے، پہاڑوں سے اتر کر آ رہی ہے...... مگر میں کہتا ہوں آسمانوں سے اُتر رہی ہے......"

سعید کمال یک دم بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ میز پر رکھے ٹیلی فون کو چھوتا ہے۔ "مجھے سر کی کال کا انتظار ہے۔ ابھی شام تک کال آئے گی۔ میری آج اُن کے پی۔ اے سے دو دفعہ بات ہوئی ہے۔ فلم اینڈ پرفارمنگ آرٹس انسٹی ٹیوٹ کا معاملہ کافی آگے بڑھ چکا ہے...... خیر وہ تو الگ بات ہے...... لیکن اس...... اس معاملے پر وہ ایک ہائی لیول انکوائری ٹیم بنا چکے ہیں...... میں۔ تمہیں یقین دلاتا ہوں...... یہ معاملہ...... ایسے ہی ختم نہیں ہوگا...... ہرگز

نہیں...... میرا خیال ہے تھیٹر والوں کو ڈھونڈنے کے لیے...... وہ لوگ...... نکل بھی پڑے ہیں...... اور آج بہزاد صاحب نے بتانا ہے کہ وہ یہاں ہمارے پاس کب آ رہے ہیں میٹنگ کے لیے......" سعید کمال کے لہجے میں دبا ہوا جوش ہے۔

انیلا اور سیفی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ گہری خاموشی کے کئی لمحے گزر جاتے ہیں۔

"آ...... ہا۔ جی۔ واہ۔ واہ...... واہ کورم تو پورا لگتا ہے۔" اچانک ایک بلند آواز سن کر وہ چونک پڑتے ہیں۔ سیٹھ صفدر سلطان اندر آ رہا ہے۔ اور دیکھنے میں ہی وہ کافی بدلا ہوا شخص لگ رہا ہے۔ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس اور چہرے پر ایک احمقانہ سا اعتماد۔ ماسٹر یاسین بہت تپاک سے جب کہ سعید کمال بہت نپے تلے انداز میں استقبال کے لیے اُٹھتے ہیں۔ جبکہ انیلا اور سیفی دونوں ـــ چہروں پر تنفر کے تاثرات۔ لاتعلقی سے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ قریب آتا ہے۔

"لیکن جی بڑی خاموشی بنی ہوئی ہے...... کیوں جی...... سیفی صاحب" وہ سیفی اور پھر انیلا کی طرف دیکھ کر ہنستا ہے لیکن پھر ان کے بے تاثر چہرے دیکھ کر کھسیانا سا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

"میں اپنی ہی سیٹ پر بیٹھ رہا ہوں نا جی......" صفدر سلطان ایک بار پھر خوش دلی کا تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

"ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔" سعید کمال کہتا ہے۔

"لیکن بندے تو...... میرا مطلب ہے...... دونوں رائٹر صاحب...... تو لگتا ہے ناراض بیٹھے ہیں۔"

"نن۔ نہیں۔ سیٹھ صاحب۔ ایسی کوئی بات نہیں......" ماسٹر یاسین بھرپور انداز میں یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور سعید کمال شدید ملتجیانہ نظروں سے انیلا اور سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔

"ہیلو کیسے ہیں آپ جی......" انیلا صفدر سلطان کی طرف دیکھ کر کہتی ہے اور وہ کھل اٹھتا ہے۔

"بس جی ٹھیک ہیں۔ آپ کے سگریٹ بڑے یاد آتے ہیں۔" وہ ہنس کر کہتا ہے اور سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔ "کیوں جی سیفی صاحب...... کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟"

"بس جناب وقت وقت کی بات ہے۔ پریشانی ویسے کوئی نہیں۔" سیفی کہتا ہے۔

"ہاں جی وقت واقعی بدل گیا ہے۔" صفدر سر ہلا کر کہتا ہے۔ "بندے بدل گئے۔

وقت کیوں نہیں بدلے گا......" وہ انیلا کی طرف دیکھ کر ہنستا ہے۔

سعید شدید بے چینی کا شکار نظر آتا ہے۔ "میرا خیال ہے کام کی بات شروع کریں۔ صفدر سلطان صاحب......"

"جی۔ جی۔ بالکل...... پہلی بات تو یہ ہے ڈائریکٹر صاحب سر ـــ کہ میں نے اب صحیح طریقے سے فلم لائن میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ٹھیک ٹھاک طریقے سے۔ دوسرے کاروبار کے ساتھ ایک یہ بھی۔ ماسٹر کا بھی یہی مشورہ تھا۔ دوسرے دوستوں کا بھی ـــ میں اور میڈم بلقیس مل کر ایک دفتر کھول رہے ہیں۔"

"میڈم بلقیس......؟" سعید کمال پوچھتا ہے۔

"آ...... جی...... وہ۔ بجلی......" صفدر تھوڑی سی ہچکچاہٹ سے کہتا ہے۔

"اوہ...... جی۔ جی......" سعید کمال کے چہرے پر سے ایک سایہ سا گزر جاتا ہے۔

"تو...... ہم سر...... ایک فلم بنائیں گے۔ میڈم ـــ مطلب ـــ بجلی ـــ حساب سے وہ بھی فلم لائن میں ہی ہے...... آپ کو پتہ ہی ہوگا سنٹ میں ـــ یعنی وہ مین ہیں جی ـــ سکرپٹ انہوں نے لکھوایا ہوا ہے ـــ ہر کوئی کہتا ہے۔ بڑا بزنس کرے گی فلم۔ میڈم جانباز...... نام رکھا ہے فلم کا۔"

"I see......" سعید کمال گہری سانس لیتا ہے اور انیلا اور سیفی کی طرف دیکھتا ہے۔ صفدر سلطان بات جاری رکھتا ہے۔

"دوسری بات...... جو آپ کی 60 اور 40 کی پارٹنرشپ کی آفر ہے تو سر۔ اس کا یہ ہے کہ آپ کا سکرین پلے آ جائے...... کہانی آ جائے ـــ سکرپٹ صاف ستھرا پڑھنے والا آ جائے...... تو سر...... اب تو میں لائن میں ہوں نا ـــ اُسے کچھ لوگوں کو دکھائیں گے ـــ پڑھوائیں گے...... پھر دیکھیں گے...... باقی ادھر جو میں آپ کے ساتھ رہا۔ بیٹھا۔ اُٹھا۔ سُنا۔ دیکھا۔ آپ کا کام۔ سر جی...... تو اس کا تو جسے بھی لائن کے بندے کو بتایا ـــ یہی بولا ہے یہ اِدھر کا کام نہیں۔ ہمارے علاقے کا کام نہیں ـــ اِدھر لوگ نہیں دیکھتے ایسی فلمیں ـــ ڈبہ ہے تباہ کن...... مارے جاؤ گے......"

سعید کمال بُرا سا منہ بنا کر کندھے اُچکاتا ہے۔ اور ماسٹر کی طرف دیکھتا ہے جو سر جھکا لیتا ہے۔ صفدر سلطان ہنستا ہے اور انیلا کی طرف دیکھتا ہے۔

"لیکن آپ فکر نہ کریں...... بالکل فکر نہ کریں...... میں جانتا ہوں...... (سینے پر ہاتھ رکھتا ہے) اعلیٰ کام ہونا چاہیے...... فلمی میلہ...... کیا آپ کہتے تھے...... کانز...... فرانس...... کچھ کرلیں گے جناب...... اعلیٰ کام ہونا چاہیے...... سیفی صاحب...... جلدی کریں اب...... آپ سرکار...... آج آپ...... وہ نہیں کر رہے ساتھ ساتھ...... کاغذوں پر...... شرڑ شرڑ...... شراٹا...... فافٹ...... گھس...... گھس...... گھساتا......" (قہقہہ لگاتا ہے)

سیفی گہری سانس لیتا ہے۔ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ بہت مشکل سے صفدر سلطان کی باتیں برداشت کر رہا ہے۔

"جی......" وہ کہتا ہے۔

بابا خوشیا چائے لے کر آتا ہے۔ صفدر سلطان پھر ہنستا ہے۔

"سنا بابا...... کیا حال ہے تیرا......؟" بابا خوشیا منہ میں کچھ لایعنی سی بڑبڑاہٹ پیدا کرتا ہے اور برتن سب کے سامنے رکھ کر چائے ڈالتا ہے۔ اور چلا جاتا ہے۔ صفدر چائے کا ایک کپ اٹھاتا ہے منہ سے لگاتا ہے۔ ہلکی سی چسکی کے بعد واپس رکھ دیتا ہے۔

"بہت گرم ہے۔" جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ بڑے انداز سے کھول کر ایک سگریٹ تھوڑا باہر نکالتا ہے۔ پھر سعید کمال کی طرف دیکھتا ہے۔

"کچھ کرلیں گے سر جی۔ کاغذ کا کام آ لینے دیں...... کیوں جی میڈم جی......" مسکراتے ہوئے انیلا کی طرف دیکھتا ہے اور سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتا ہے۔ وہ دوسری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اچٹتے ہوئے اشارے سے منع کر دیتی ہے۔ صفدر کا چہرہ اتر سا جاتا ہے۔

"اوہ...... تو پھر اپنے پلا دیں...... ہمیں تو بھولتے نہیں جی۔ آپ کے سگریٹ......"

انیلا خاموش رہتی ہے اور سیفی کی طرف شعلے برساتی نظروں سے دیکھتی ہے۔ پھر سعید کمال سے مخاطب ہوتی ہے۔

"سعید...... اب ہماری...... اگر کوئی ضرورت ہو یہاں تو بتاؤ...... ورنہ میرا خیال ہے ہمیں جانا چاہیے......"

ماسٹر تیزی سے معذرت خواہانہ انداز میں سیٹھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ "میڈم نے سگریٹ چھوڑ دیے ہیں۔"

"اوہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ خو۔ خو۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہمیں لگا کر خود چھوڑ دیے اچھا۔ اچھا...... اُدھر...... اُدھر سے مطلب آنے کے بعد۔۔۔" اُس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ گہری خاموشی میں دیر تک صرف صفدر سلطان کی ہوں۔ ہوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ پھر عجیب سی ہنسی ہنستا ہے اور سعید کمال سے مخاطب ہوتا ہے۔

"باقی...... آپ کے بندے کا۔ اُدھر ہال کا کچھ انتظام ہو جائے گا۔۔۔ ضمانت پر...... شاید ابھی...... ماسٹر نے مجھے بتایا ہے۔۔۔ جو محلے میں۔ بعد۔۔۔ میں ہوا تھیٹر جدھر میں نے بھی جانا تھا شاید...... تھانہ...... اللہ بچائے۔۔۔ توبہ۔ توبہ۔ بڑے [illegible] ہوتے ہیں یہ پولیس والے...... باقی وہ تھیٹر والے...... وہ تو خیر ہوتے ہی تجربہ کار لوگ ہیں۔ ان کا تو کام ہی یہ ہے...... ویسے...... مجھے ماسٹر کے بتانے سے پہلے ہی پتہ لگ گیا تھا۔۔۔"

سعید کمال حیرت سے اور اب کافی غصے سے صفدر سلطان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

"کیا مطلب...... پہلے ہی پتہ چل گیا...... وہ کیسے۔۔۔؟"

صفدر ہنستا ہے۔ "میڈم بلقیس...... اُسے جانتی ہیں۔۔۔ کہاں کہاں پہنچ ہے۔ توبہ۔۔۔ تھیٹر کے مالک کو جانتی ہیں...... چھوڑیں...... ویسے وہ لنگڑا بالی ہمیں بھی چاہیے کیمرے کے لیے...... میڈم کہتی ہیں کیمرے کا سب کام اُسے دینا ہے۔۔۔ میڈم نے کہا ہے۔۔۔ اُسے نکالو وہاں سے کسی طرح...... پیسے میں بڑی طاقت ہے سر جی۔۔۔ بھاگاں والا۔۔۔ کیا تھا ماسٹر۔۔۔"

"ہاں...... بھاگاں والا......" ماسٹر کا موڈ بہت خراب لگتا ہے۔ شدید شکایتی غصے سے صفدر سلطان کی طرف دیکھتا ہے۔

"ہاں بھاگاں والا...... وہ تھانیدار سر جی بس دو تین لاکھ کی مار ہے۔۔۔ آپ فکر نہ کریں بالی ہمیں بھی چاہیے۔ کیمرے کا سارا کام......"

سعید کمال یک دم غصے میں بہت سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ "آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے صفدر سلطان صاحب...... اچھی طرح سُن لیں...... اس معاملے کی ہائی لیول انکوائری شروع ہونے والی ہے...... ایسا نہ ہو کہ آپ خود کسی مصیبت میں پھنس جائیں، یہ معاملہ بہت سیریس ہے۔"

صفدر سلطان سعید کے لہجے سے متاثر ہوتا ہے اور ایک احمقانہ سی سنجیدگی اس پر طاری ہوتی ہے۔ سر ہلاتا ہے۔

"سیریس ہے...... معاملہ...... بہت سیریس...... اوخو۔ اچھا...... ویسے...... جی۔ جی
جی۔ سمجھا...... مطلب...... اچھا۔ اچھا یعنی......" پھر انیلا کی طرف ایک نظر دیکھ کر خاموش ہو
جاتا ہے۔ پھر بولتا ہے۔ "مطلب...... بڑے نامراد ہوتے ہیں یہ پولیس والے کسی کو نہیں
چھوڑتے...... میڈم کو...... تو...... سب ٹھیک...... رہا...... میرا مطلب ہے سب ٹھیک رہا
نا......؟"

سیفی کا چہرہ اچانک ایسا نظر آتا ہے جیسے مسخ ہو چکا ہو۔ سامنے پڑا ہوا ابلتی چائے کا
کپ اٹھاتا ہے اور تیزی سے صفدر سلطان کے چہرے پر پھینک دیتا ہے۔ صفدر سلطان کی چیخ
نکلتی ہے۔ سیفی جھٹکے سے اٹھتا ہے۔ کرسی پیچھے گرتی ہے۔ تیزی سے صفدر سلطان کے بالوں اور
کالر کو جکڑ کر اس کا سر وحشیانہ انداز میں میز سے ٹکرانے لگتا ہے۔

"اگر تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اُسے ریپ کیا گیا ہے یا نہیں تو۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔
نہیں......"

صفدر سلطان کی دلدوز چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ ماسٹر اور سعید کمال شدید افراتفری اور
بوکھلاہٹ کے عالم میں جھپٹ کر سیفی کو دھکیلنے کھینچنے اور صفدر سلطان سے الگ کرنے کی کوشش
کرتے ہیں۔

"سیفی۔ سیفی۔ سیفی صاحب۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ سیفی صاحب۔ سیفی۔
پلیز۔ پلیز۔ چھوڑو...... چھوڑو......"

بابا خوشیا بھی دوڑتا ہوا آتا ہے۔ تینوں بدقت تمام سیفی کو کھینچ کر الگ کرتے ہیں۔
صفدر سلطان کا ہونٹ پھٹ چکا ہے۔ منہ اور ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ خون کے قطرے میز
پر گرتے ہیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے۔ گرنے لگتا ہے۔ ماسٹر اُسے سہارا دینے کی کوشش کرتا
ہے لفظ ٹوٹ پھوٹ کر صفدر سلطان کے منہ سے نکلتے ہیں۔ "میں۔ مم۔ تم۔ میں نے تمہیں......
چھوڑوں گا...... بہن چود...... کتے...... میں۔ میں۔ تمہیں......"

سیفی پھر اس کی طرف جھپٹنا چاہتا ہے انیلا تیزی سے اُس سے لپٹ کر اُسے روکتی
ہے۔ سیفی بولتا ہے اور اُس کی آواز بے حد اجنبی ہے۔ "اب...... ایک لفظ بھی تم نے بولا...... تو۔
تو...... اس...... اس...... میز پر...... یہ میز دیکھ رہے ہو۔ اس میز پر تمہیں لٹا کر تمہارے ہاتھوں
اور پیروں میں کیل ٹھونکوں گا پھر...... ایک۔ ایک انچ...... زندہ تمہاری کھال اتاروں گا......"

انیلا تیزی سے سیفی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ ماسٹر بھاگتا ہوا جاتا ہے اور ایک
گیلے تولیے سے صفدر سلطان کا منہ صاف کرتا ہے۔

"سیٹھ صاحب۔ سیٹھ صاحب۔ آ جائیں۔ آ جائیں۔ آ جائیں...... میں۔ میں آپ
کو چلیں۔ چلیں...... میں گاڑی میں...... چلیں...... آ جائیں۔ چلیں۔"

ماسٹر صفدر سلطان کو سہارا دیتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر لے جاتا ہے۔
کھڑکی سے باہر گہری شام کی تاریکی نظر آتی ہے۔

انیلا سیفی کو اس کی نشست پر بٹھاتی ہے اور اس کے ساتھ کرسی جوڑ کر اس کے
کندھے پر بازو پھیلا دیتی ہے۔ اور تھپکتی ہے اور سرگوشی میں کہتی ہے۔

"تمہیں کیا ہو گیا سیفی۔ میری جان......" سیفی کے ماتھے پر بوسہ دیتی ہے۔

سعید کمال اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا ہے، ایک شدید ہیجانی کیفیت میں اس کا جسم
تھر تھر کانپ رہا ہے۔ وہ میز کو کنارے سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ بابا
خوشیا مسلسل رو رہا ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے جا رہے ہیں۔ وہ کچھ چھپانے کی کوشش
نہیں کرتا۔ وہ سعید کمال کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہو کر اس کے کندھوں کو دبا کر اُسے پرسکون کرنے
کی کوشش کرتا ہے۔ سعید کمال کا لرزا تھم جاتا ہے۔ بابا گیلے تولیے سے میز پر گرے خون کے
قطرے صاف کرتا ہے۔ پھر کچن سے پانی کے گلاس لا کر سب کے سامنے رکھتا ہے۔

بابا خوشیا ایک طرف بیٹھ جاتا ہے۔ ہر طرف چھائے گہرے سناٹے میں وقت کسی
نامعلوم رفتار سے آگے بڑھتا ہے۔ پھر چاہ پریاں والا کی طرف سے الو بولنے کی آواز آتی
ہے۔ سیفی پانی کا ایک گھونٹ لیتا ہے۔ پھر اس کی پیروی میں سعید کمال اور انیلا......

انیلا بلال، سعید کمال، سیفی، بابا خوشیا ویسے ہی بیٹھے ہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے۔
الو بولنے کی آواز پھر سنتے ہیں۔ پھر ایک پرشور آواز انہیں بُری طرح دہلا دیتی ہے۔ ٹیلی فون
کی گھنٹی ایک بار بجتی ہے۔ دو بار۔ تین بار...... پھر سعید کمال جیسے چونک کر کسی نیند سے بیدار ہو
جاتا ہے۔ سر جھٹکتا ہے۔ اور تیزی سے ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگاتا ہے۔

"ہیلو...... جی سعید...... جی۔ جی۔ سعید کمال بول رہا ہوں۔ جی...... کک
کیا......" سعید کمال کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلتے ہیں۔ "کیا ہوا سعید؟" انیلا
اضطراری انداز میں پوچھتی ہے۔ سعید کمال چند لمحے مزید سنتا رہتا ہے۔ پھر لرزتے ہاتھوں

سے رسیور واپس کریڈل پر رکھتا ہے۔ پھر اس کے ہونٹ لرزتے ہیں اور منہ کھلتا ہے لیکن جیسے آواز اس کے منہ سے باہر آنے سے گریزاں ہے۔ سیفی اور انیلا دونوں اٹھ کر تیزی سے اس کے پاس جاتے ہیں اور۔ دائیں بائیں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

''سعید۔ کیا ہوا سعید......؟''

''سیفی...... سیفی...... انیلا...... انیلا......'' وہ اس کی تیز سرگوشی جیسی آواز سنتے ہیں۔

''سر...... سر...... سرکو...... کسی نے...... حکمت بہزاد صاحب کو کسی نے...... گولی مار دی۔ ان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی۔ ان کا ڈرائیور...... باڈی گارڈ بھی مارے گئے۔''

2۔ حسن سے خالی حسن

حسن کی صورتِ حال سمجھنے کی کوشش میں ہم حسن کی اچٹتی منظر بینی اور تحیر اور امکان کی دنیا میں اُس کے ہمسفر رہے۔ مگر اب یہ ہمسفری ہمیں امکانی اور احتمالی سے ہٹا کر ناممکن کا تعاقب کرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ ناممکن کی زرد روشنی جب حسن کو چندھیا دیتی ہے تو حسن حسن سے خالی ہو جاتا ہے اور تحیر کی یہ انتہا اُس کے لیے کرب کا دورانیہ بن جاتی ہے۔ کیا ہم اس دورانیے میں بھی حسن کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ کیا ہم اُس حسن کے ساتھ چلنے کے اہل بھی ہیں جو سورج مکھی سے آیا ہے۔ ہم نہیں جانتے لیکن ناممکن کی پہلی دُھند میں اور وقت کے امکانی، غیر امکانی بہاؤ میں حسن کو تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتے...... ایک مدت ہے جو بیت جاتی ہے۔

حسن اب کافی بوڑھا ہو چکا ہے۔ کئی برس پہلے ذاتی وجوہات اور پھر کمپنی ڈاکٹر ہارون پاشا کی طبی تکنیکی سفارشات کی بنا پر قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کرنے کے بعد حسن نے ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں جُز وقتی آڈیٹر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ حسن نے یہ ملازمت خاندانی اصرار پر —— سارا دن گھر بیٹھے رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ دل بہلا رہے گا۔ کافی پیسے بھی مل جائیں گے —— اور اپنی عمر بھر کی اُچٹتی منظر بینی کو برقرار رکھنے کے لیے اختیار کی تھی اور اُس وقت اپنے فیصلے سے ڈاکٹر ہارون کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔

اُس وقت ڈاکٹر ہارون پاشا حیران رہ گیا تھا۔ وہ ان چند انتہائی نایاب ڈاکٹروں میں سے تھا جو معمول کے مریضوں کو معمول کی دوائیاں دینے کے علاوہ غیر معمولی کے لیے بھی اپنی آنکھیں اور کان کُھلے رکھتے ہیں۔ حسن کا کیس بھی ایسا ہی تھا۔ اُس نے benzo حسن رضا ظہیر، نور خان رپورٹ کے نام سے جو کیس فائل بنائی تھی وہ اُسے کیس adverse کے مسلسل follow up کے ذریعے آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ غیر ملکی میڈیکل جرنل میں چھپنے والے اُس کے مضمون میں خود Roche کمپنی نے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ حسن ڈاکٹر کے لیے بہت اہم تھا۔ ڈاکٹر پاشا کے لیے کئی معمے تھے۔ مثلاً حسن جب ایک مخصوص پر اسرار سے

لہجے میں کہتا ہے 'میں دیکھتا ہوں'' تو اس سے اُس کی کیا مراد ہے۔ benzo کی overdose کے بعد چھتیس گھنٹے اس کی زندگی سے غائب ہوگئے تھے۔ لیکن اب بھی اچانک اس غائب زندگی سے کوئی لمحہ یا واقعہ۔ کہنا مشکل ہے کیا۔ کسی نہ کسی طرح جب واپس آتا ہے تو اس پر عجب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور وہ اس کیفیت کے دوران یا اس کے گزر جانے کے جلد بعد اُس کے پاس آنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور اکثر اس کی گفتگو میں زرد رنگ، پیلا اور اس سے ملتے جلتے بھری اسمائے صفت ضرور ہوتے ہیں۔ اور وہ کسی سکول کی گھنٹی کی آواز سننے کی بات بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کی یہ کیفیت پاگل پن کا واہمہ بھی نہیں۔ hallucination نہیں کہی جا سکتی۔ کبھی کبھی جب وہ کیفیت اُس پر آتی ہے تو وہ جیسے اپنے آپ سے خالی ہو جاتا ہے۔ ورنہ وہ بالکل حاضر دماغ ہے اور سب سے حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ اعداد و شمار سے متعلق اُس کی پیشہ ورانہ صلاحیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑا۔

کمپنی کی ملازمت چھوڑ دینے کے بعد بھی ڈاکٹر پاشا اور حسن میں رابطہ برقرار رہتا ہے اور کمپنی ڈرائیور نور خان کی وفات کے بعد بھی نور خان رپورٹ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ برسوں تک فارماسیوٹیکل کمپنی کے لیے جز وقتی کام کے دوران اور بعد میں بھی اب حسن پیدل چلتا ہے...... پاؤں پاؤں آگے بڑھتا ہے۔ دائیں اور بائیں کی ''اُچٹتی منظر بینی'' کے دوران کبھی کبھار کسی راہ گیر سے ٹکرا جانا اُس کے لیے اپنی طرز زندگی کا ایک ناگزیر چھوٹا موٹا خطرہ ہے۔ حسن دنیا دیکھتا ہے۔ حسن چلتا ہے۔ فٹ پاتھوں پر، سڑکوں پر، بازاروں میں، پارکوں میں، گلیوں میں، سیڑھیوں سے اوپر، سیڑھیوں سے نیچے، برآمدوں میں، دکانوں میں دائیں بائیں...... تحیر کا لمحہ ضرور آتا ہے اور حسن حیرانیے کے خالی کو اب بھی بے حد احتمالی، احتمالی، کم احتمالی، بے حد کم احتمالی سے پُر کرتا ہے یا پھر اُسے 'ہو سکتا ہے یہ میری نظر/ذہن کا دھوکہ ہو' جان کر ایک عبوری شکست قبول کر لیتا ہے۔ اور اُس کے قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

حسن اب کافی بوڑھا ہو چکا ہے۔ لیکن ''اُچٹتی منظر بینی'' کے چکراؤ میں وہ اب بھی گھومتا ہے۔ دنیا اب بھی حیرانیوں سے بھری ہے کیونکہ بقول مصنف 'اچٹتے خوف کی داستان' چیزوں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ مناظر جوابا آپ کو گھورتے ہیں۔ گلیوں کی نکڑیں آپ پر ہنستی ہیں۔ چوک تیوری چڑھاتے ہیں اور کھڑکیاں آنکھیں مارتی ہیں۔ مگر حسن کی صورت حال میں اب کچھ ایسا ہے جو پہلے نہ تھا۔ اچانک کہیں جاتے کہیں آتے کچھ دیکھتے کچھ سنتے دنیا یک دم ایک پیلی دھند سے بھر جاتی ہے اور حسن حسن سے خالی ہو جاتا ہے۔ ہم حسن سے خالی حسن کے

ساتھ چلتے ہیں۔

ایک بڑے ہسپتال کی پارکنگ میں ایک وہیل چیئر حرکت کرتی ہے۔ اچٹتے خوف کے ایک لمحے میں حسن دیکھتا ہے کہ وہیل چیئر میں دو سروں والا آدمی بیٹھا ہے۔ وہیل چیئر کے ساتھ لگے اسٹینڈ پر ایک ڈرپ لگی ہے۔ اور ایک عورت ساتھ ہے۔ جس کا ہاتھ ڈرپ کے کنٹرول پر ہے۔ نہیں یہ دو سروں والا آدمی نہیں کوئی بچہ ہے جو وہیل چیئر چلانے والے کا سر کرسی میں بیٹھے مریض کے بالکل اوپر ہے۔ نہیں یہ بچہ نہیں یہ ایک بڑا جاتا بونا ہے۔ وہ ایک بونا ہے جو عورت سے کوئی بات کرتا ہے اور وہ دونوں دور کھڑی ایک ایمبولینس کی طرف جاتے ہوئے حسن کے پاس سے گزرنے والے ہیں۔ عورت پھر ڈرپ سے کچھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہے۔ حسن بونے کو دیکھتا ہے—— اور کہیں بہت دور سے آتی سکول کی گھنٹی کی آواز سنتا ہے۔ اور دنیا ایک زرد گرم بھاپ سے بھر جاتی ہے جس میں سورج مکھی کے گچھے کھیتوں بھی پاس ہے۔ حسن تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ''یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ کہاں میں نے اسے دیکھا ہے کب میں نے اسے دیکھا ہے؟ کیسے میں نے اسے دیکھا ہے؟ وہیں۔ کیا وہیں؟ بلیک شیپ اور آئینوں کے لاانتہا حسن در حسن عکسوں کے درمیان گیا تھا۔ میں کہاں تھا؟ میں کیا تھا؟ میں وہاں...... کیا تھا؟ میرے خدا یہ بونا کون ہے؟'' مدتوں پہلے نور خان نے اُسے ایک ناقابل یقین کہانی سنائی تھی اور حسن اُس کے جھوٹ پر خوب ہنسا تھا۔ پھر نور خان بھی چلا گیا۔ وہ بھی چلا گیا۔ سب چلے گئے۔

لیکن ڈاکٹر پاشا جو جوان عمری سے کہیں آگے جا چکا ہے۔ اب بھی ہے۔ بوڑھا حسن بھی ہے۔ حسن کی سانس پھولتی ہے اور سر چکراتا ہے وہ جانتا ہے۔ اُسے جلد از جلد اپنے ہم نام کی قبر پر جانا ہوگا۔ جہاں وہ سارا سال سورج مکھی کے پھول اگاتا رہتا ہے۔ اور پودے بیج کے پھوٹنے سے لے کر پھول دینے تک کے ہر مرحلے میں ایک ساتھ اسے نظر آتے ہیں۔ گورکن اُس سے بہت خوش ہیں۔ اس قبر پر اُس کے علاوہ کبھی کوئی نہیں آتا۔ وہ ان کی خدمت گزاری پر انہیں بہت خوش رکھتا ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر اُسے بلاتا ہے۔ حسن جانتا ہے ڈاکٹر کے پاس ایک گہرا راز ہے۔ ڈاکٹر سب کچھ جانتا ہے۔ وہ اُسے بتانا نہیں چاہتا۔ وہ جاننا نہیں چاہتا۔ گہرا راز تمہارے اندر ہی رہتا ہے اور تمہارے ساتھ ہی دفن ہو جاتا ہے۔

ادارتی نوٹ

ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کی یہ کیفیت اچھتے خوف کے مصنف کے اُس مبہم تصور کے قریب پہنچ جاتی ہے جسے وہ حسن کا ''مثالی حقیقی صدمہ'' جیسے ناموں سے یاد کرتا ہے۔

حسن قبرستان تک پہنچنے کے لیے چاہ پریاں والا کا رستہ اختیار کرتا ہے۔ مزار پر قوالی ہو رہی ہے۔ اب حسن یہاں قوالی سُننے بھی آ جاتا ہے۔ اس کے پاس کافی وقت ہے۔ حسن کے پاس وقت ہے۔ مگر اس وقت اُس کے پاس وقت نہیں۔ وہ تیزی سے قبرستان میں اس ٹیڑھے میڑھے رستے پر بڑھنے لگتا ہے۔ جو سورج مکھی کو جاتا ہے۔

حسن اب ڈاکٹر کے پاس ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اور سانس ابھی تک غیر ہموار ہے۔ ایسے موقعوں پر ڈاکٹر پاشا ہمیشہ اُسے اپنے چھوٹے سے ریٹائرنگ روم میں لے جاتا ہے۔ وہ اُس کی بات غور سے سنتا ہے اور نور خان رپورٹ میں درج کرتا ہے۔ ''اُس دور سے تعلق رکھنے والا کوئی جزوی مبہم مکمل یادداشت کو انگیخت (trigger) کر سکتا ہے۔ اور یہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' وہ اس کی نبض، دھڑکن، بلڈ پریشر نوٹ کرتا ہے۔ اور اُسے benzo کی ایک بہت ہی نپی تلی مقدار اپنے سامنے کھلاتا ہے۔ وہ اُسے وہیں کچھ دیر آرام کرنے کو کہتا ہے۔ اور اپنے کلینک میں مریضوں کو دیکھنے چلا جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر پھر آتا ہے۔ حسن گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مسکراتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے، وہ جان جاتا ہے کہ حسن خواب دیکھ رہا ہے مگر جو بات ڈاکٹر ہارون پاشا نہیں جانتا مگر ہم جانتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہلتے بند پپوٹوں کے پیچھے ایک روشن اسٹیج ہے جس پر ایک عورت اور ایک بونا ناچ رہے ہیں۔ بونے نے عورت کی کمر کو اس کے لمبے دوپٹے سے باندھا ہوا ہے۔ بونا گاتا ہے۔ ٹانگہ لہوری میرا گھوڑا پشوری میرا۔ ایک شخص آتا ہے اور نوٹوں کی گڈی سے نوٹ اتار اتار کر ان کی طرف پھینکنے لگتا ہے۔ اب وہی شخص موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلا رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے اچانک موٹر سائیکل نیچے گرتی ہے۔ حسن جاگ جاتا ہے۔

حسن سے خالی حسن کا حیرانیہ خود حسن ہے۔ وہ دو سَروں والے آدمی سے الگ ہونے والے بونے کو بھی بھول چکا ہے۔ وہیل چیئر میں کون تھا اور ڈرپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی عورت کون تھی؟ اور کیا کر رہی تھی؟ حسن کو اس سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ہر طرف زردی زردی ہے حسن بھی کہیں نہیں۔ ہم امکان اور غیر امکان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمارے لیے

بس اتنا ہی باقی ہے کہ اس بیانیے کے آخری دور میں حسن سے خالی حسن کے ساتھ چلتے ہوئے حسن کی دیرینہ روایت میں تحیر کی بے چینی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اخلاقی، غیر اخلاقی کا پرانا ہتھکنڈا ہی استعمال کرتے رہیں۔ مگر یہ دعویٰ نہ کریں کہ ہم حیرت کے سفر میں راہ گم کر دینے والے کو راہ دکھانے والے ہم سفر ہیں۔

ہو سکتا ہے وہ بونا کبھی سٹار تھیٹر کا بونا پیارا ہو۔ اور کیا وہیل چیئر میں بیٹھا شخص کبھی سٹار تھیٹر کا مالک شمشاد ایرانی ہے۔ جو کسی موذی مرض میں مبتلا ہو کر اب قریب المرگ ہے۔ کیا صرف پیارا جانتا تھا کہ شمشاد ایرانی کی سٹار تھیٹر سے اچانک غائب ہو کر سب کو چھوڑ جانے کی دراصل مردوں کی سیانی عورت بجلی کے ٹھکانے پر جاتا تھا اور چند ماہ اس کی کسی کوٹھڑی سے نکاح کر کے گزارتا تھا اور پھر طلاق کے بعد واپس آ جاتا تھا۔ کیا شمشاد ایرانی کی موت کی سٹار تھیٹر کی موت کے متوازی آگے بڑھتی رہی۔ کیا تھانیدار رانا شاہد کے پیارا بونے اور شمشاد ایرانی سے کیے وعدے ایک ایک کر کے پورے ہو چکے ہیں۔ کیا بقول اس کے رومانی داستانوں کی آڑ میں زنا کا دھندہ کرنے والوں کو — ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال، لیلیٰ مجنوں اور دوسرے سب زانیوں کو پہاڑوں سے گرتے پتھر سنگسار کر چکے ہیں۔ کیا ابا لوگی سٹار تھیٹر کی سسی سعید کمال کسی سٹار تھیٹر کا رانجھا خودکشی کر چکے ہیں۔ کیا تھانیدار رانا اب ایک بہت بڑا پولیس آفیسر ہے۔ کیا وہیل چیئر کے ساتھ کھڑی اور ڈرپ سے کچھ چھیڑ چھاڑ کرتی عورت خود بجلی ہے اور کسی طرح اپنے اس 'مالک' کے موت سے قربت کے اذیت ناک سفر کو مختصر ترین کر دینا چاہتی ہے...... کیا؟ کیا......؟ ان سب سوالوں کے جوابات اثبات میں بھی ہو سکتے ہیں اور نفی میں بھی۔ کچھ اثبات میں کچھ نفی میں بھی۔ سب کچھ بے حد احتمالی سے بے حد غیر احتمالی کے درمیان ہمیشہ سے موجود ہے۔

یہ ایک اور روشن نیم سرد سہ پہر ہے۔ نیلا آسمان نمایاں اور شفاف ہے۔ اکا دکا سفید بادلوں کے ٹکڑے آسمان میں گہرے تیرتے ہیں۔ حسن فٹ پاتھ پر دھیمے مسلسل قدم اٹھاتا چوک خداداد کی طرف بڑھتا ہے۔ بائیں طرف کی عمارتیں اس کی نظروں کے پیچھے پیچھے پیچھے رہ جاتی ہے۔ ''دیکھ کر چلیں انکل'' ایک آواز ''منہ ادھر اٹھایا ہوا ہے'' دوسری آواز۔ وہ ایسی آوازوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ حسن دیکھتا ہے کہ اس پرانی عمارت کی دیوار میں اگ کر بڑھتا جانے والا وہی پرانا پیپل کا درخت اور بھی بڑا ہو چکا ہے اور ساتھ ہی دیوار کا شگاف بھی مگر نہ عمارت کے مالک کچھ پرواہ کرتے ہیں نہ دیوار بالکل پختہ ہے۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ اور

پھر حسن حیران رہ جاتا ہے۔
دیوار میں اُگے پیپل کی شاخوں کے بیچ آسانی سے نظر نہ آنے والا ایک جوتا پڑا ہے۔ اور وہ جوتا...... جو ایک مردانہ بوٹ جیسا ہے۔ گھنی شاخوں میں اٹکا ہوا ہے۔ حسن رُکتا ہے...... گاڑیوں کے سفر کے برعکس اس کے پاؤں اب کہیں بھی رُک سکتے ہیں۔ وہ فٹ پاتھ اور عمارت کے درمیان مختصر سی گھاس کی پٹی عبور کر کے قریب جاتا ہے۔ اور پیپل کے چوڑے پتوں کو ذرا ہٹا کر دیکھتا ہے۔ اس کی حیرت بڑھ جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ بوٹ کے اندر پاؤں اب بھی موجود ہے۔ پھر حسن کی حیرت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ پاؤں شاید لکڑی کا ہے۔ ہاں لکڑی کا ہے۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتا ہے۔ اردگرد دیکھتا ہے مگر زندگی کے اپنے دھندوں میں دوڑتے بھاگتے لوگ اس بوکھلائے ہوئے سے بوڑھے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ پرانی عمارت کی ہمیشہ بند رہنے والی کھڑکی کی بیرونی سرخ اینٹوں کی دہلیز کے اوپر گھنی پھیلی پیپل کی شاخوں اور پتوں کے نیچے اور پیچھے چند فٹ لمبی چوڑی جگہ حسن کی توجہ کا مرکز ہے اور وہاں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو وہاں نہیں ہو سکتیں۔ نہیں ہونی چاہئیں مگر ہیں۔ ایک کیمرے کا ٹوٹا ہوا بیرونی لینز جو حسن پہچان نہیں پاتا کہ کسی مووی کیمرے کا حصہ ہے۔ تلی ہوئی دال کے بہت سے دانے جیسے دال سیویاں بیچنے والے بڑی سی ترازو نما ٹوکریاں کندھے سے لٹکائے بیچتے پھرتے ہیں۔ اور پھر بدرنگ سی سیاہی جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کی شکل میں۔ یہ سب کیا ہے؟ اور پھر حسن دیکھتا ہے کہ اُن ڈھیریوں میں تیزی سے حرکت کرتی چیونٹیاں کچھ چیزوں کو چمٹی انہیں سیاہ کر رہی ہیں۔

اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ حسن کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت سے چیونٹیوں کے دَل کے دَل یک دم ان چیزوں کو چھوڑ کر ہر طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ چیزیں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ یہ لمبی سی چیز گاجر ہے...... نہیں شاید...... بلکہ یہ گاجر کا مربہ ہو سکتی ہے۔ اور یہ سبز سی چیز بھی مربے۔ یہ یہاں کیسے پہنچے؟ حسن حیران ہوتا ہے۔ اور پھر تیزی سے غائب ہوتی چیونٹیاں اور ایک تیز بُو حسن کے لیے پہچان کو اور بھی آسان کرتی ہے۔ یہ تو کوئی...... کسی قسم کے گوشت کے ٹکڑے ہیں۔ شاید اِدھر سے گزرتے کسی قصاب نے فالتو ٹکڑے اِدھر پھینک دیے ہوں گے۔ مگر مربے...... حسن اپنی عینک اتارتا ہے۔ شیشے صاف کرتا ہے۔ پھر دیکھتا ہے۔ وہ کسی قصاب کے پھینکے فالتو گوشت کے ٹکڑے نہیں۔ دو کٹے ہوئے انسانی ہاتھوں کے ٹکڑے ہیں۔ جن کی چند انگلیاں غائب ہیں۔ چند ابھی تک سلامت ہیں۔ اور اس گلی سڑی حالت میں بھی

نظر آتی ہیں کہ دو مختلف افراد کے ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ چھوٹا ایک بڑا۔ ادھر چیونٹیاں اس کی مداخلت سے عارضی پسپائی کے بعد پھر آہستہ آہستہ اپنے اہداف کی طرف بڑھ رہی ہیں۔
اور حسن گہری سانس لیتا ہے۔ اور سب جان جاتا ہے کہ یہ کیا ہے اور کیسے ہے۔
اب کچھ عرصے سے کچھ لوگوں نے اپنے نظریے اور یقین کی قوت کو دنیا پر ظاہر کرنے کے لیے بارود کی بے پناہ قوت کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ بارودی ایمان کی قوت کا چوکوں، بازاروں، دفتروں میں زبردست مظاہرہ کرنے والا اپنی جان تو گنوا ہی دیتا تھا لیکن ساتھ ہی قرب و جوار میں موجود بے شمار بعض اوقات درجنوں، مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کی جانیں بھی چلی جاتی تھیں۔ شروع شروع میں لوگوں نے، اخبارات نے ان انوکھے بارودی مظاہروں پر کافی جذباتی ردعمل کا اظہار کیا۔ ایک عورت کے کٹے ہوئے پستان سے چمٹے شیر خوار بچے کے سر کا دیر تک چرچا ہوتا رہا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ یہ مظاہرے بالکل معمول کی بات بن گئے۔ اب بارودی مظاہرے کی اطلاع پانے پر لوگ اپنے پیاروں کی گنتی کرتے اور کسی کے کم ہونے کی صورت میں مظاہرے کی جگہ ہر طرف بکھرے مردہ نیم مردہ جسموں میں انھیں پہچانتے یا پھر انسانی ٹانگوں، انتڑیوں، گردوں، پھیپھڑوں، آنکھوں، سروں، پاؤں، ہاتھوں، خون، بالوں، بھیجے کے نرم ٹکڑوں، پھیپھڑوں، ناکوں، ہونٹوں اور دیگر انسانی اعضا کے ڈھیروں میں اپنے بھائیوں، بہنوں، ماؤں، بیٹوں، بیٹیوں، دوستوں، بیویوں، خاوندوں کے جسموں کا کوئی قابل شناخت حصہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور ناکامی کی صورت میں سرکار کے مشورے پر انسانی اعضا کے ڈھیر کی اجتماعی تدفین کی اجازت دے دیتے۔ بعض اہل ثروت زیادہ یقین کے لیے کہ ان کا پیارا انسانی گوشت کے ڈھیروں کے اندر ہی ہے۔ مہنگے مہنگے DNA ٹیسٹ کروانے کی کوشش کرتے جو بہت کم جگہوں پر میسر تھے۔ ایسے ٹیسٹوں کو عام کرنے پر بہت زور دیا جاتا تاکہ سائنس کی یہ حیرت انگیز شناختی دریافت/ایجاد دکھی انسانیت کے کام آ سکے۔ انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے گروپ اس حوالے سے بہت سرگرم تھے۔ حسن جانتا تھا کہ اس طرح کے کسی مظاہرے کے بعد اردگرد کی عمارتوں، بعض اوقات دور کی عمارتوں، درختوں میں جسموں سے الگ انسانی اعضا کا ملنا کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں تھا۔ ہفتہ پہلے ہی چوک خداداد میں بھی شام کے وقت بے پناہ بارودی قوت کا ایسا ہی ایک مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جب کہ لوگوں کا ایک ہجوم سہانی شام منانے میں مگن تھا۔ وہ سب دال سویاں کھاتے، گاجر، سیب کے مربے کھاتے، چائے پیتے اپنے کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ بلکہ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ کچھ فلم کے لوگ

چھپ کر اس سارے ہلے گلے کی فلم بھی بنا رہے تھے۔ کیا وہ لینز انہیں لوگوں کے کسی کیمرے کا ٹکڑا تھا، حسن نے یہ نہ سوچا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس کا حیرانیہ ختم ہو چکا تھا سوائے لکڑی کے پاؤں کے۔ ہو سکتا ہے یہ میری نظر کا دھوکہ ہو۔

اور پھر جب حسن گہری سانسیں لیتا واپس فٹ پاتھ کی طرف جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو ایک اور حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ سہ پہر کا سورج کچھ اور شام کی طرف ڈوبا تو روشنی کی پتلی سی شعاع غیر قدرتی جگہ اُگے پیپل کے پتوں شاخوں میں سے گزرتی سیدھی اُن پاس پاس پڑی انسانی انگلیوں پر پڑی، ایک ہی لمحے میں نیلی اور سبز روشنی کی دو شعاعیں ان سے پھوٹ نکلیں۔ حسن کی آنکھوں میں پھر تحیر اُترا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں انگلیوں میں دو انگشتریاں تھی جن کے دھاتی جسے خون سے سیاہ ہو چکے تھے اور انگلیوں سے الگ نظر نہ آتے تھے مگر نیلم اور زمرد کے پتھر اب بھی صاف تھے اور سیدھی سورج سے آنے والی شعاع میں اپنی پہچان ضرور کراتے تھے۔ حسن نے چیونٹیوں کی کھائی ہوئی ان دونوں انگلیوں میں مشکل سے نظر آنے والی انگشتریوں میں سبز اور نیلے پتھروں کو پھر دیکھا۔ اور دیکھتا رہا...... پھر سب کچھ بدل گیا۔

میں نے انہیں دیکھا ہے۔ ان ساتھ ساتھ رکھی انگلیوں کو سبز نیلے پتھروں کی انگشتریوں کو۔ انگلیوں کو ساتھ ساتھ کہیں دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا۔ کب دیکھا ہے۔ دیکھا ہے۔ ایسے ہی دیکھا ہے۔ انگلیوں میں سبز، نیلے پتھروں کی انگشتریاں ساتھ ساتھ...... حسن کا سر زور سے چکرایا۔ سانس پھولی۔ دل کی دھڑکن تیز ہوئی اور حسن حسن سے خالی ہوا تو پیلا غبار اُمڈ کر آیا اور حسن سیدھا سورج مکھی کے دل میں اُتر گیا۔ وہ پیپل کے انوکھے دیواری پودے سے ہٹ آیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے مگر وہ جانتا تھا کہ اُسے کدھر جانا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کے اچانک حسن سے خالی ہو جانے کے زرد لمحے سے پہلے پھٹی ہوئی دیوار میں اُگے پیپل کے پودے کے پیچھے سرخ اینٹوں کی دہلیز پر بکھرے حیرانیے کو حسن نے خالی سے احتمالی کے اپنے آزمودہ اسلوب سے جس طرح نمٹایا ہے وہ ہماری طرف سے کسی بھی قسم کی مداخلت کا قطعاً محتاج نہیں۔ ہم چونک خدا داد میں بارودی ایمان کے مظاہرے کے اس بیان میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کریں گے۔

3۔ ہم نامی کی گمنامی

ادارتی نوٹ

حسن کی صورتِ حال میں خالی کو خالی سے پُر کرو کا آخری منظر نامہ کہیں موت اور دیوانگی کی شکل اختیار کرتا ہے تو کہیں ناکامی اور گمنامی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ گمنامی جو ہم نامی سے جنم لیتی ہے۔

سعید کمال کون ہے۔ انیلا بلال کون ہے؟ سیفی کون ہے؟ صفدر سلطان کون ہے؟ اور خود حسن کون ہے؟ ''حسن کی صورت حال'' ایک سطح پر ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے نتیجے میں بھی سامنے آتی ہے۔ مگر پھر بھی کچھ نام ہم نامی کی گرفت سے آزاد ہو کر گمنامی کی دھند میں غائب ہوتے نظر آتے ہیں۔ ہم انہیں اس ہم نامی کے بڑے دائرے کے اندر رکھنے کے لیے اُن کی وہاں موجودگی کے چند متبادل امکانات کا بہت مختصر جائزہ لے سکتے ہیں۔

سعید کمال

جو پروفیسر صفدر سلطان کا شاگرد عزیز ہے۔

○ پروفیسر کا تہذیبی خرد افروزی پر تحقیق کا مسودہ ردی میں بک جانے کے بعد اور پروفیسر کے شدید علیل ہونے کے بعد سعید کمال کچھ دن پروفیسر کی ذہنی بحالی پر بھرپور توجہ دیتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ دراصل مسودے کی فوٹو کاپی پہلے ہی اُس کے پاس موجود تھی۔ کچھ سال بعد اُسے ایک امریکن یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے سکالر شپ مل جاتا ہے۔ وہ اسی موضوع پر تحقیق میں پروفیسر کے کام کو بہت سلیقے سے استعمال کرتا ہے۔ ڈگری لینے کے علاوہ اعلیٰ علمی حلقوں میں اس کی دھاک بیٹھ جاتی ہے اور تعلیم اور ترقی پر بننے والی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹیوں میں اس کا نام ضرور شامل کیا جاتا

ہے۔ وہ آخر اپنی تہذیب کی خردافروزی کے موضوع پر ایک کتاب بھی چھپواتا ہے۔

○ پروفیسر صفدر سلطان (غیر فلمی) کو جب اپنے شاگرد عزیز کے اصل بقول اُس کے گھناؤنے کردار کا پتہ چلتا ہے تو وہ اخبارات میں اس کے خلاف مضمون لکھتا ہے اور کتاب کو اپنی تحقیق قرار دینے کے لیے کئی شواہد پیش کرتا ہے۔ سعید کمال کہتا ہے کہ وہ کسی بھی صورت اپنے انتہائی قابل احترام استاد کی شان میں گستاخی نہیں کرے گا۔ لیکن پھر پراسرار واقعات رونما ہوتے ہیں اور پروفیسر پر ایک طالبہ پر جنسی دست درازی کا الزام ثابت ہو جاتا ہے۔ پروفیسر کو نہ صرف ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے بلکہ یونیورسٹی پر مذہبی بدمعاشی کے ذریعے مدتوں سے قابض خردافروزی کے دشمن طالب علموں کا ایک حکمران جتھا اُسے بُری طرح زدوکوب بھی کرتا ہے۔ یاد رہے کہ پروفیسر مذکور عرصہ پہلے بھی ان نظریاتی بنیادوں کے مخالف طلبہ کی خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرا تھا۔ پروفیسر بالآخر ایک ذہنی شفاخانے میں پرسکون زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

○ سعید کمال پروفیسر کی علالت کے ایام میں اس کی بھرپور خدمت کرتا ہے۔ پھر اس کی صحت یابی پر اُسے ردی میں بک جانے والے مسودے کی مکمل فوٹو کاپی دکھا کر ششدر کر دیتا ہے۔ شدید خوشی کی کیفیت پروفیسر کو ایک دفعہ پھر دل کے دورے کی طرف لے جانے لگتی ہے۔ چیف میڈیکل آفیسر شاگرد کو بہت لعنت ملامت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دل کے عارضوں میں مبتلا پروفیسروں کو اُن کے گمشدہ مسودے ملنے کی اطلاع اک دم دینا medically سخت منع ہے، بعد میں استاد شاگرد دونوں مسودے پر بھرپور کام کر کے کتاب چھپوا دیتے ہیں۔ تہلکہ مچ جاتا ہے۔ پروفیسر کو عہد حاضر کا عظیم مصلح کہا جاتا ہے لیکن اُس پر کفروالحاد کا الزام بھی لگتا ہے۔ تہذیبی خرد افروزی پر پروفیسر کی کتاب بہت بکتی ہے۔ پھر کئی سال بعد ایک اور عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ تعلیمی، تحقیقی حلقوں میں علمی سرقہ یعنی plagarism نامی کوئی عمل دریافت ہوتا ہے۔ پروفیسر کی کتاب کو اس کا ایک دشمن پروفیسر ثابت کرتا ہے کہ سرقہ ہے اور وہ صفحوں کے صفحے quote کرتا ہے جو چوری کے ہیں، پروفیسر کو لگتا ہے کہ وہ کہیں کا نہیں رہا۔ لیکن پھر وہ دبئی اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہاں سے سستے ٹکٹ پر مختلف مذہبی مقدس مقامات پر جا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے لیکن کوشش کے باوجود اس

پر رقت طاری نہیں ہوتی۔

○ سعید کمال اور پروفیسر صفدر سلطان بالآخر مسودے کی گمشدگی کے ناقابل تلافی نقصان کے صدمے سے نکل آتے ہیں اور مسلسل آٹھ علمی بحثوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ قوم یہ معاشرہ دراصل خردافروزی کے قابل ہی نہیں۔ وہ خردافروزی پر لعنت بھیجتے ہیں اور اپنی اپنی حقیقی ترقی کے لیے جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں، پروفیسر اعلیٰ مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کروانے والی ایک اکیڈمی میں جزوقتی ملازمت اختیار کرتا ہے۔ اعلیٰ معیار کی درسی کتابیں لکھتا ہے۔ اور قلمی ناموں سے گائیڈیں، خلاصے، میڈ ایزیاں بھی لکھ ڈالتا ہے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی کوششوں میں کچھ کامیاب اور کچھ ناکام رہتا ہے مگر ذاتی مکان بنا لیتا ہے۔ اُدھر شاگرد سعید کمال تیزی سے اعلیٰ ملازمتی ترقی کر کے گریڈ 22.21.20 تک جا پہنچتا ہے۔ ایک سفیر کی بیٹی سے شادی کرتا ہے اور ہر شام آفیسرز کلب میں چیف سیکرٹری، سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری، ڈپٹی سیکرٹری، ڈائریکٹر، سفارت کار، اعلیٰ پولیس آفیسران — خفیہ ایجنسیوں کے خفیہ لوگ وغیرہ۔ وغیرہ کے ساتھ شواز ریگل وسکی پیتا اور فرائیڈ جھینگے کھاتا ہے اور سیاستدانوں، فوجیوں، مولویوں کے ساتھ ان کے پرلطف ہنس ہنس کر دہرا کرنے والے واقعات سنتا ہے تو سوچتا ہے کہ خردافروزی کلب کے اس کمرے کے علاوہ اصل میں کہیں بھی ممکن نہیں۔ اور پھر وہ محفل دیکھ کر اپنے پرانے یونیورسٹی پروفیسر کے مسودے کے ردی میں بک جانے کا واقعہ سناتا ہے۔ اور خردافروزی پر لعنت بھیجنے کا استاد شاگرد دونوں کا فیصلہ بتاتا ہے۔ زراعت کا ایڈیشنل سیکرٹری قہقہے لگاتا ہے۔ ''تو تم نے کہا سعید کہ enlightenment جو ہے وہ bull shit ہے۔'' ''نہیں یہ جو ہے وہ bull shit نہیں سیدھی سیدھی shit ہے۔'' وہ ڈی۔ آئی۔ جی۔ کو متوجہ کرتا ہے ''کل جلوس میں تم نے جو شکلیں دیکھی تھیں وہ enlightenment والی ہیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ آئندہ سو سال تک ادھر نہیں آ سکتی enlightenment—'' ''یار سوے کچھ کم کرو—'' ''چلو ستر کر لو......'' ''یار یہ جھینگے اچھے ہیں۔'' ''تم کبھی تھائی لینڈ کے کنگ پرونز کھاؤ—'' ''تو کوئی ٹور بناؤ یار۔''

کٹی ہوئی انگوٹھی کے شاخسانے

(سعید کمال اور انیلا بلال رخصتی سے پہلے محبت میں گرفتار ہونے کا تجربہ کرتے ہیں)

جب سعید کمال ایک تازہ اے۔ ایس۔ پی کو سنار یہ بتاتا ہے کہ اُس کی شادی کی انگوٹھی پیتل کی ہے اور اُس پر سونے کی پتری چڑھائی گئی ہے تو وہ بھونچکا رہ جاتا ہے۔ کہ کس طرح اس کی منکوحہ مگر بغیر رخصتی بیوی انیلا بلال کے خاندان نے اُسے دھوکہ دیا۔ دو امکان سامنے آتے ہیں۔

(پہلا امکان)

سعید کمال اس واقعے کو شادی کے بعد محبت میں گرفتار ہونے کی بغیر رخصت شدہ میاں بیوی کی تجرباتی کوشش کے لیے ایک مہمیز کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ انیلا کو بتاتا ہے کہ اس طرح ہوا ہے لیکن یہ ہماری متوقع محبت کے لیے ایک امتحان ہے۔ ہم کسی کو یہ بات نہیں بتائیں گے۔ انیلا سعید کے کردار سے بے حد متاثر ہوتی ہے۔ اور کمال کی طرف دھندلی سی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے اکثر فلموں میں محبت کرنے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ملتے رہتے ہیں۔ لیکن ابھی باقاعدہ رخصتی کہیں بہت دور ہے۔ اگرچہ دونوں طرف کے خاندانوں کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ اب اکثر دونوں کو شک پڑنے لگتا ہے کہ واقعی وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ پھر ایک روز ایک گہرے رازدان دوست کی مہیا کردہ خلوت میں دونوں بے قاعدہ طور پر خود ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور محبت کا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ لیکن رخصتی اب بھی بہت دور ہے۔ وہ سوچتے ہیں یہ کیا بکواس ہے۔ اور اچانک ایک الگ مکان لے کر رہنے لگتے ہیں۔ اور خاندانوں کی تیاریاں، جہیز، مال و اسباب، رسومات، عزیز و اقارب وغیرہ سب کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خاندانوں میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ دونوں طرف سے بعض جوشیلے افراد میں بحث مباحثہ دھینگا مشتی تک جا پہنچتا ہے اور لگتا ہے سب کچھ تہس نہس ہو جائے گا۔ لیکن سعید کمال اور انیلا کے عزم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس سماجی مہم جوئی میں برابر کے شریک ہونے پر ایک عجیب طرح کا تعلق ان میں پیدا ہوتا ہے اور ایک سہانی شام باغ سے واپس آتے ہوئے انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے لگے ہیں۔ بعد میں یہ سارا واقعہ ایک انٹرویو کی شکل میں

خواتین کے ایک مقبول پندرہ روزہ رسالے میں چھپتا ہے۔ جس میں انیلا کا [illegible] پر سامنے آتا ہے۔ 'محبت کے لیے بغاوت لازمی ہے'۔ ایک خاتون افسانہ نگار اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ایک ناول لکھتی ہے جو ہو بہو چھپ نہیں پاتا۔

دوسرا امکان:

انیلا بلال کے خاندان کی دھوکہ دہی پر سعید کمال بے حد دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور سیدھا اپنی ماں کے پاس جا کر اُسے ساری صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کی ماں آگ بگولا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک تباہی مچ جاتی ہے۔ اور ماں گھٹیا گندے خاندان والوں کو طلاق دینے کا حکم دیتی ہے۔ اس سے آگے پھر دو مزید امکان سامنے آتے ہیں۔

(الف) جیسے تیسے رخصتی کرو اور چند دن بعد طلاق دے دو۔ سعید کمال ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ مگر چند دن کیا چند ہفتوں بعد تک بھی طلاق میں بہت ہی لیت و لعل سے کام لینے لگتا ہے۔ پھر انیلا کو اعتماد میں لے کر اسے کسی طرح ماں کو قابو کرنے کی التجا کرتا ہے۔ اس سے آگے پھر دو امکان سامنے آتے ہیں۔ (1) انیلا ایک ذہین۔ انسانی فطرت کی نباض لڑکی تو ہے ہی۔ وہ ماں جی کی بعض کمزوریوں کو بھانپ کر اسے شیشے میں اتار لیتی ہے۔ ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک بچے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ (2) اپنی انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پر انیلا بڑھیا کو ناکوں چنے چبوا دیتی ہے اور وہ اس کی شکل دیکھتے ہی اِدھر اُدھر چھپ جاتی ہے یا تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔ ماں بیٹا دونوں انیلا سے نفرت کرتے ہیں۔ بچے پھر بھی ٹھیک ٹھاک پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

(ب) طلاق رخصتی کے بغیر ہی ہو جاتی ہے۔ انیلا بے حد بیمار ہو جاتی ہے۔ لیکن پندرہ دن کی بیماری کے بعد راکھ میں سے ایک سنہرے پرندے کی طرح نکلتی ہے۔ وہ ڈری ڈری، چھوئی موئی، اطاعت گزار، شوہر پرست انیلا بلال کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے وہ ایک بیوٹیشن کی خدمات حاصل کرتی ہے۔ جو اُسے ریتا ہیورتھ سٹائل دیتی ہے۔ پھر وہ ایک بہت مہنگے ڈینٹسٹ کے کلینک میں بطور ریسپشنسٹ ملازمت حاصل کرتی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے کاروبار کی کامیابی میں اعلیٰ پائے کی دندان سازی کے علاوہ اس کی ریسپشنسٹ کے حسن و جمال کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ یوں سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن انیلا گلیمر میں سب سے بڑھ کر ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد ایک نوجوان سی۔ ایس۔ پی

افسر داڑھ نکلوانے آتا ہے۔ انیلا اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے۔ خوب توجہ دیتی ہے۔ افسر کے جبڑے سے داڑھ تو نکل جاتی ہے لیکن انیلا اُس کے دل سے نہیں نکل پاتی۔ ٹیلی فون کالیں، ملاقاتیں، رومانس، محبت، شادی ہو جاتی ہے۔ انیلا کو یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ سیفی اس کا خاوند اور سابقہ ادھورا خاوند سعید کمال بیچ میٹ تھے۔ ولیمے کی تقریب میں انیلا کو سیفی کی بیوی بنے دیکھ کر سعید کمال لڑکھڑا جاتا ہے۔ انیلا سیفی سے اس کا تعارف کراتی ہے۔

"سیفی۔ یہ میرے سابقہ میاں ہیں...... آہ...... رخصتی نہ ہو سکی۔ you know he did'nt want to sleep with me۔ ہا۔ ہا۔ ہا......"

سیفی اور سعید کمال دونوں کے رنگ پیلے پڑ جاتے ہیں۔ پھر سرخ۔ پھر عام گندمی ہو جاتے ہیں۔ سعید کمال خاموش رہتا ہے جبکہ سیفی ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

"That's what I love you for darling, your stunning boldness."

انیلا لاپروائی سے کندھے جھٹکتی ہے۔ اور ہنستی ہے۔ اس کے پرفیوم کی خوشبو اڑتی ہے اور بریانی کھاتے چند مردوں کو گہری سانس لینے پر مجبور کر دیتی ہے اور انیلا سعید کمال کے ساتھ کھڑی اس کی گھریلو ٹائپ بیوی کو جھک کر آنکھ دبا کر کہتی ہے۔ hi cutie...... کیسا چل رہا ہے۔" cutie شرم سے سر جھکا کر سیون اپ پینے لگتی ہے۔

سعید کمال۔ کمال دین (مولوی کمالے کا بیٹا۔ صوفی بزرگ صفدر سلطان کے ساتھ دو دن)

گاؤں کے امام مسجد کمال دین کا بیٹا۔ شہر جا کر ایف ایس سی کی تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بننے کی کوشش کے دوران ایک بارودی گروہ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ مولوی صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اُس کے جانے اور شہید ہونے کے متوقع خطرے کے سبب بوڑھے ماں باپ دن رات روتے رہتے تھے۔ آخر ہزار جتن کر کے مولوی صاحب اُسے ایک غار میں سے نکلوا کر لائے۔ جہاں وہ گرنیڈ پھینکنے کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ رات بھر وہ ماں باپ کے سامنے غصیلی تقریریں کرتا رہا۔ وہ خاص طور پر یہ بات کرتا تھا "ابا جی یہ گاؤں والے...... امام مسجد کو کمین سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں جمعرات کی روٹیاں مانگنے کے لیے جاتا تھا۔ اور چوہدری مجھے کتا سمجھتے تھے۔ میں ان سے انتقام لوں گا۔" مولوی کمال روتے رہے۔ صبح نماز فجر کے بعد انہوں نے ایک صوفی بزرگ صفدر سلطان سے سعید کمال کی ملاقات کرائی۔ صوفی بزرگ

صفدر سلطان نے سعید کمال سے کہا "بیٹا جو چاہے کرنا بس دو دن میرے ساتھ گزار لو۔"

سعید کمال اگلی صبح نماز فجر کے بعد بزرگ صفدر سلطان کے ہمراہ مسجد سے باہر آیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ بیرونی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی دو سائیکلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُنہوں نے ایک سائیکل خود سنبھالی اور دوسری اُسے سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ سعید کمال کو حیرت ہوئی اور اُس نے پوچھنا چاہا کہ اُنہیں کہاں جانا ہے اور کیوں۔ لیکن اُس کے پوچھنے سے پہلے ہی بزرگ نے کہا۔

"بیٹا عمل خود ہی سب کچھ بتا دیتا ہے۔ کردار گفتار سے زیادہ مضبوط شہادت ہے۔ ہاں۔ جب سمجھنے میں مشکل ہو تو ضرور پوچھو اور خوب پوچھو۔"

سعید کمال حیران رہ گیا کہ اُنہوں نے اُس کے دل کی بات کیسے جان لی۔ بزرگ کے ہمراہ سائیکل چلاتا وہ قریبی قصبے پہنچا۔ تو اُنہوں نے غریبوں کی ایک بستی کا رخ کیا۔ ایک مکان کے سامنے سائیکل روکی دونوں اُترے۔ اُنہوں نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد اندر سے ایک نسوانی آواز آئی تو اُنہوں نے اپنا نام بتایا۔ پھر چند ہی لمحوں بعد نو دس سال کے دو بچے جو یقیناً بہن بھائی تھے سکول کے لباس میں بستے پکڑے مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ بزرگ سلطان نے شفقت سے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بچے نے اُنہیں ایک گٹھڑی سی دی جس میں سے کشیدہ کاری وغیرہ کے نمونے باہر جھلک رہے تھے۔ بزرگ نے بچوں کو اُن کے سکولوں تک پہنچایا اور پھر ایک حلوائی کی دُکان کے سامنے ناشتہ کرنے رُکے۔ وہاں کافی رش تھا سعید کمال نے دیکھا کہ کئی لوگ اُنہیں دیکھ کر احتراماً اُٹھے اور اُن کی لیے جگہ خالی کرنا چاہی لیکن بزرگ سلطان نے قبول نہ کیا اور اپنی باری پر ہی ایک جگہ بیٹھے۔ ملازم لڑکا اُن کے لیے ناشتہ لایا تو اُنہوں نے اُس سے گھر بار کی خیریت دریافت کی۔ گاؤں سے شہر آنے کے مسائل اور پیچھے بوڑھے ماں باپ کی صحت سلامتی کے بارے میں کئی تجاویز دیں۔ وہاں سے اُٹھے تو سعید کمال نے گٹھڑی اُٹھالی۔ تب اُنہوں نے بات کی اور پتہ چلا کہ وہ کشیدہ کاری کا کام ایک غریب بیوہ کی روزی کا واحد وسیلہ ہے۔ وہ اُس کے بچوں کو سکول لانے اور واپس لے جانے اور اُس کے محنت کے کام کو آگے فروخت کرنے کی ذمہ داری اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے زنانہ لباس کی چند دُکانوں پر کشیدہ کاری کے کام کو سب سے بہتر داموں پر فروخت کیا اور پھر وہ واپس چلے۔

یہ ایک قدیم قصبہ تھا جس کے چھوٹے اینٹوں کے فرش والے بازار سے گزرتے وہ دائیں بائیں دیکھتے جاتے تھے۔ پھر وہ اچانک رُک گئے اور ایک جانب دیکھنے لگے۔ سعید کمال نے اُن کی نظروں کا تعاقب کیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ بازار سے نکلنے والی گلی کی نکڑ پر لکڑی کے چھوٹے سے تخت پوش پر بیٹھے ایک بوڑھے درزی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ سعید کمال نے غور کیا تو دیکھا کہ موٹے دُھندلے شیشوں والی عینک پہنے بوڑھا درزی ایک سُوئی میں دھاگہ ڈالنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ بزرگ صفدر سلطان بے حد اصرار کر کے بوڑھے درزی کو ایک عینک ساز کی دُکان پر لے گئے، اُس کی نظر چیک کروائی اور اپنی جیب سے اُس کو نئی عینک بنوا کر دی۔ بوڑھے درزی کے اظہارِ تشکر پر اُنہوں نے اُس کے اڈّے کے سامنے کھڑے ہو کر آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور ہاتھ اُٹھا کر دعا کی اور دونوں پھر وہاں سے چلے۔ اس کام میں بچوں کا سکول سے چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے بچوں کو ہمراہ لیا اور کچھ دیر پیدل چلتے رہے اور اُن کے سکول کے کام کے بارے میں پوچھا۔ بچی نے انگریزی زبان کے کسی نئے Tense کی بات کی تو اُنہوں نے اُس کو کئی مثالیں دے کر سمجھایا۔ بچے نے سائنس کی کلاس میں نظامِ شمسی کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا، اُس نے بتایا۔ تو بزرگ صفدر سلطان نے زہرہ، مریخ، زحل اور دیگر سیارگان کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بچے کو بتائیں۔ سعید کمال اُن کی شخصیت کے اس رُخ پر ششدر رہ گیا۔ بعد میں اُنہوں نے بتایا کہ اُنہوں نے کسی زمانے میں سائنس میں گریجوایشن بھی کی تھی۔

بزرگ صفدر سلطان نے کہا کہ ”زاہد کی نسبت عالم کا درجہ بلند ہے۔“ اِس پر سعید کمال اور اُن کے درمیان خالق مخلوق تخلیق اور اِن کی وحدت کے حوالے سے ایک مکالمہ شروع ہو گیا۔ جو روزمرہ کے مختلف واقعات کے دوران جاری رہا۔ دو دن کے آخر میں جب رات کو وہ ایک محفلِ سماع میں موجود تھے تو سعید کمال کے لیے اُن کے آنسوؤں کی گہری حقیقت سمجھنا مشکل نہ تھا اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ وہ دو دن اُس کی بیس سالہ زندگی پر حاوی ہیں۔ الغرض صوفی بزرگ صفدر سلطان نے ان دو دنوں کے دوران سعید کمال کو نیکی، امن، اخوت، بھائی چارے، ماں باپ کی خدمت، حقوق العباد، نماز، روزے کی پابندی اور انسانیت کی راہ دکھائی۔ سعید کمال راہ راست پر آ گیا۔ نہ صرف تعلیم کی طرف واپس آ گیا بلکہ اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کو بھی صوفی بزرگ صفدر سلطان سے متعارف کروانے کا اہتمام کرنے لگا۔ وقت

گزرتا رہا۔ گزرتا رہا۔ سعید کمال ڈاکٹر تو نہ بن سکا لیکن زوالوجی کا لیکچرار بن گیا۔ کتنے ہی برس گزر گئے۔

بابا بلیک شیپ کا مترجم سعید کمال

سورج مکھی کی طرف حسن کے خلاف معمول سفر کے دوران اُس کی اچھتی صحبت میں اُچٹ کر آ جانے والا بچہ سعید کمال جو دو متجسس افراد کے لیے معروف نرسری رائیم بابا بلیک شیپ کا ترجمہ کرتا ہے، زبانوں کے حوالے سے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر واقعی ہی ایک انتہائی باصلاحیت Interpreter بن گیا۔ ترقی یافتہ اقوام کی کئی زبانوں پر کمال مہارت حاصل کرنے کے علاوہ اُس نے پسماندہ اقوام کی کئی زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا اور اس طرح اپنے شعبے میں ایک نادر خصوصی پیشہ ورانہ مقام حاصل کیا۔ اُسے ترقی یافتہ اور پسماندہ وفود کے درمیان کئی طرح کے نازک مکالموں کے لیے ایک اعلیٰ پائے کے Interpreter کے طور پر بلایا جاتا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ سعید کمال نے جو تحقیقی ذہن بھی رکھتا تھا۔ اپنے مترجم کے تجربات کے دوران ایک حیرت انگیز بات محسوس کی۔ اُس نے دریافت کیا کہ ترقی یافتہ زبانوں اور پسماندہ زبانوں کے درمیان سیدھا سادھا ایک سے ایک کا مکالمہ ناممکن ہے اور مفہوم کبھی بھی آسانی سے اِدھر سے اُدھر منتقل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ Interpreter اُن میں کچھ غیر معمولی لیکن بظاہر غیر محسوس اضافہ یا کمی نہ کرے۔ یوں اُس نے تجرباتی طور پر بین اللسانی قطع و برید کا یہ عمل شروع کر دیا اور طرفین کے رویوں کے حوالے سے حیرت انگیز طور پر مثبت نتائج سامنے آنے لگے لیکن پھر بدقسمتی سے اُس کے ایک ہم پیشہ حاسد کولیگ نے اُس کی اس پیشہ ورانہ انحراف کو بھانپ لیا اور صورتِ حال کو آگے رپورٹ کر دیا۔ چند ماہ بعد جب سعید کمال کچھ اعلیٰ مقتدر شخصیات کے ساتھ بیرون ملک گیا تو ایک دن ایک ہوٹل کے کمرے میں اُسے مُردہ حالت میں پایا گیا۔ تمام تر تفتیش کے باوجود اس کی موت کا معمہ کبھی حل نہ ہو سکا۔

4۔ یہ فلم نہیں بن سکتی

حسن اب بے حد بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی کمر جھک چکی ہے۔ سر کے بال اور بھنویں برف کی طرح سفید ہو چکی ہیں۔ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک ہے۔ وہ دائیں ہاتھ میں لاٹھی تھامتا ہے اور کبھی بائیں بغل میں چھتری۔ ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر حسن چلتا ہے حسن دیکھتا ہے۔ حسن دنیا دیکھتا ہے۔

اب اس کا معمول روز کا ایک متعین سفر ہے۔ وہ گھر سے نکلتا ہے اور گلیوں فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے ایسے رستے کو اپناتا ہے جس پر پاؤں پاؤں چلتے لاٹھی ٹیک کر بوجھل قدم اٹھاتے اُسے کم کم سڑکیں عبور کرنی پڑیں۔ وہ گھر سے چوک خداداد تک کا محفوظ ترین مختصر ترین رستہ اختیار کرتا ہے۔ جسے کوئی بھی معمر پیدل چلنے والا اختیار کرنا پسند کرے گا۔ چوک خداداد میں پہنچ کر وہ ایک مخصوص بینچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ دائیں بائیں دیکھتا ہے۔ دنیا کی آوازیں سنتا ہے۔ اور کبھی سو بھی جاتا ہے۔

بہار کا ایک دن ہے سب جانتے ہیں...... مگر بارش بھی ہو سکتی ہے۔ حسن چھتری بھی لایا ہے۔ صبح کے بعد اور دوپہر سے پہلے کا وقت ہے۔ مصروف لوگ مصروف دنیا بھاگم بھاگ۔ اب لوگ اُس سے کم ٹکراتے ہیں۔ خود ہی اُسے دیکھ کر احتیاط کرتے ہیں۔ یوں بھی وہ اتنا دھیما چلتا ہے! آہستہ بہت آہستہ مگر اتنا آہستہ بھی نہیں کہ کہیں پہنچ ہی نہ سکے واپس ہی نہ آ سکے۔ حسن چوک خداداد کے قریب ہے، وہ بائیں طرف دیکھتا ہے جہاں کبھی ایک پرانی عمارت کی دیوار میں پیپل کا عجیب وغریب درخت اُگا ہوتا تھا۔ اب وہ عمارت وہ پیپل وہاں نہیں، اُس جگہ ایک چار منزلہ پلازہ کھڑا ہے۔ جس کی نچلی منزل پر کاروں کا ایک شوروم ہے۔ حسن ایک کار کا رنگ دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔ رنگ نہ سرخ ہے، نہ سبز، نہ پیلا، نہ نیلا، وہ چمکیلا بھی ہے اور نہیں بھی۔ یہ کیا رنگ ہے؟ کیا ہر رنگ کا کوئی نام ہوتا ہے؟ نام ہو بھی سکتا ہے؟ وہ سوچتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ اب وہ جلد بھول بھی جاتا ہے۔ وہ کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ حسن

آگے بڑھ جاتا ہے۔

وہ چوک خداداد میں اپنے پسندیدہ بینچ کے قریب پہنچتا ہے۔ لیکن مایوسی سے ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ بینچ پر کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ چوک میں رونق آج بہت ہی زیادہ ہے۔ عجیب بات ہے وہ حیران ہوتا ہے۔ پھر بینچ پر بیٹھا ایک نوجوان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اُسے بیٹھنے کی دعوت دیتا ہے۔ حسن اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی بینچ پر بیٹھے دوسرے دو نوجوان بھی ہنس کر اُٹھتے ہیں۔

"میرا خیال ہے شروع کرنے لگے ہیں۔" ایک نوجوان اشتیاق سے کہتا ہے۔

وہ سب نوجوان چوک خداداد کے پارک کے بائیں طرف جاتے ہیں جہاں پولیس کی کافی نفری لوگوں کو وہاں اکٹھے ہونے سے روکنے کی اور دور ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حسن کے لیے سیٹ خالی کرنے والا نوجوان جاتے جاتے پلٹ کر ہنس کر کہتا ہے۔

"بابا جی۔ اُدھر فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ دیکھنی ہے؟" حسن بھی ہنس پڑتا ہے۔

"فلم" وہ چاروں طرف اشارہ کرتا ہے۔ "ہر طرف فلم ہی تو لگی ہے اگر دیکھو تو۔" وہ پھر ہنستا ہے۔ اور دائیں اور پھر بائیں دیکھتا ہے جہاں بینچ سے کچھ ہی دور ایک چائے کا سٹال ہے۔ ایک اخبار والا ریلنگ کے ساتھ اخبار بچھائے بیٹھا ہے۔ بڑی بڑی ترازو جیسی ٹوکریوں میں دال سویاں بیچنے والا اور اُس کے ساتھ ہی ایک مرغیوں کا گوشت بیچنے والا۔

"ہٹو۔ ہٹو۔ پیچھے۔ نہیں تو سوٹے پڑیں گے—— تماش بین قوم۔" حسن ایک پولیس والے کی آواز سنتا ہے پولیس والا اب بلند آواز سے ایک طرف کھڑی وین کے سامنے مووی کیمرے کے قریب کھڑے شخص سے مخاطب ہوتا ہے۔

"سر جی۔ آپ شروع کریں...... اِدھر پبلک بڑی ڈھیٹ ہے——"

....

سیفی پولیس والے کی بات سُن کر ہنستا ہے اور ویسے ہی آواز لگاتا ہے۔

"کوئی بات نہیں ہم بھی بہت ڈھیٹ ہیں۔ بس ہم سر کا انتظار کر رہے ہیں۔" کچھ فاصلے پر کھڑے ایکٹروں کے ایک گروپ کی طرف دیکھ کر اشارہ کرتا ہے اور آواز دیتا ہے۔

"انیلا...... تم نے سر کو پھر فون کیا......؟"

انیلا کاغذوں کا ایک فولڈر پکڑے سیفی کی طرف آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون ہے۔

"ہاں۔ سر پہنچنے ہی والے ہیں۔ لیکن اتنے میں چیف تم moves کر لو۔"

"مجھے چیف مت کہا کرو...... تمہیں کتنی بار کہا ہے۔" سیفی کہتا ہے۔

"اچھا لگتا ہے یار ڈائریکٹر کے لیے...... چیف...... چیف......"

"تم مجھے جانی کہہ سکتی ہو۔ جانو مانو......"

انیلا ہنستی ہے۔ "بکواس...... اور میں تمہیں بتاؤں۔ شوٹ پر ذرا حواس میں رہا کرو...... وہ...... وہ۔ جو پرانا سکرپٹ تھا...... اصل میں تو وہی سارا میں نے ذرا آج کے مطابق کیا...... اس میں ایک فقرہ ہے۔ تمہارے جیسوں کے لیے۔"

"وہ کیا......؟" سیفی اشتیاق سے پوچھتا ہے۔

"جو پارٹ میں عاشقی لاتا ہے وہ عاشقی میں بھی پارٹ کرتا ہے۔"

سیفی قہقہے لگاتا ہے۔ "اچھا ہے...... واہ۔"

"Infact...... میں بولوں گی یہ فقرہ I love it...... تھیٹر کا sequence جب آئے گا...... سی۔ ہائے......"

"یہ ایکٹروں کے لیے ہے۔ پارٹ والی لائن۔ ڈائریکٹر کے لیے...... نہیں۔"

"ڈائریکٹر بھی ایک پارٹ ہے...... سیفی...... چلو moves کراؤ۔"

سیفی تالی بجاتا ہے۔ اور کیمرہ مین سے مخاطب ہوتا ہے۔

"ماسٹر۔ ادھر آئے سڑک پر سے مٹھائی کھلانے والے۔ ڈبے اٹھائے ہوئے۔ آئے۔ آئے...... ریلنگ سے نکلے...... لوگوں کو کھلانے لگے۔ تم follow کر رہے ہو......"

"یس باس۔ بالکل...... کٹ کیا نہیں zoom in...... کھلا رہے ہیں۔" کیمرہ مین کہتا ہے۔

"بس...... ادھر...... وہ بندہ جو مٹھائی کھانے سے انکار کرتا ہے۔ کدھر ہے؟"

انیلا ادھر دیکھتی ہے آواز دیتی ہے۔

"ارشد۔ ارشد......"

سیفی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ "ویسے تمہارا یہ رائٹر۔ ایکٹر۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھری ان ون ہونا...... غلط ہے کوئی ایک پارٹ کرو......"

"لو بجٹ فلم بنا رہے ہیں چیف۔ رکھ لو کسی سٹار کو۔ چندریاں اتنے پیسے مانگیں گی تا کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ سستی مل رہی ہوں اس لیے باتیں بنا رہے ہو۔ ویسے یار یہ

لفظ چندری مزے کا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ چندری۔"

ایک ایکٹر تیزی سے بھاگتا ہوا آتا ہے۔

"یس سر۔ یس میڈم......"

"ادھر وہ تمہیں گرا کر تمہارے منہ میں مٹھائی ٹھونسیں گے۔" سیفی کہتا ہے۔

"یس سر۔ وہ ایک سوال تھا سر۔ میم۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"سر وہ ناشتہ ڈبل کیا ہوا ہے۔ اوپر سے یہ مٹھائیاں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ "عظیم نجات دہندہ" سے نجات اور نئے "عظیم نجات دہندہ" کے آنے کی خوشی میں کھائی ان مٹھائیوں کی تم نے اٹھیاں کرنی ہیں۔ اٹ از گڈ...... انیلا۔ جبار۔ جبار کدھر ہے؟" سیفی کہتا ہے اور انیلا چاروں طرف دیکھتی ہے۔

"جبار۔ جبار۔ یعنی سکندر کدھر گیا ہے؟" وہ بے چینی سے کہتی ہے۔ ایکٹر ارشد ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔

"میڈم۔ سکندر اُدھر کھڑا ہے لائنیں کر رہا ہے۔" انیلا دیکھتی ہے۔ تیزی سے اُس طرف جاتی ہے۔ جہاں ایک ایکٹر مٹھائی کے ڈبے میں مٹھائی اکٹھی کر رہا ہے۔ اور تقریر کر رہا ہے۔ انیلا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے لگتی ہے۔

"بچے یہ میسو کا ڈلا تجھ سے کھایا نہیں جا رہا مجھے دے دے چندا۔ تاریخ میں محفوظ ہو جائے گا۔ حاجی صاحب یہ چم چم۔ میاں صاحب یہ لڈو...... تھینک یو۔ تھینک یو...... جناب کا شکریہ۔ شکریہ......"

قہقہوں کی آوازیں۔ انیلا ایک طرف ہاتھ سے اوپر اٹھانے کا اشارہ کرتی ہے۔

قہقہوں کی آوازیں اور بھی بلند ہو جاتی ہیں۔ اطمینان کا اظہار کرتی ہے۔

"یہ لیول رکھنا ہے۔"

"جی۔ تو پھر میں نے جیل سے واپسی پر عظیم رہنماؤں کی ذات سے۔ جسم سے۔ دماغ سے۔ زندگی سے تعلق رکھنے والی کچھ ایسی چیزیں جمع کرنا شروع کیں جو کسی نے نہ کی ہوں گی۔"

یک دم بلند آوازیں۔ "مثلاً۔ مثلاً۔ مثلاً۔"

''آہ۔ آپ پوچھتے ہیں مثلاً...... مثلاً عظیم رہنما کا تھوک۔ دیکھیں میرا نظریہ یہ ہے کہ عظیم رہنما کی ہر چیز عظیم ہوتی ہے۔ اس کی کوئی بھی چیز عامیانہ اور گھٹیا نہیں ہوسکتی۔ اس کا بول و براز۔ اُس کا فضلہ بھی...... نہیں جناب میں ابھی پاگل نہیں ہوا...... کیا آپ جانتے ہیں۔ عظیم رہنما وہ ہوتا ہے جو دلیری سے تاریخ پر تھوک سکتا ہے...... اور جو جب چاہے رہنمائی مانگنے والے ہجوم پر پلٹ کر پیشاب کرسکتا ہے۔ اور اپنے فضلے سے لت......''

''ہولڈ اٹ۔ ہولڈ اٹ...... Excellent...... کافی ہے۔ It would be the performance of your life Sikandar۔'' انیلا تالی بجاتے ہوئے کہتی ہے۔

چوک خداداد میں ایکٹروں کے گروپ میں شامل ایک غیر ملکی ایکٹر جس کے ہاتھ میں کیمرہ ہے بار بار باقی ایکٹروں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔

''سر آپ کا رول بس یہی ہے۔ غیر ملکی اخباری نمائندہ......''

جان قہقہہ لگاتا ہے۔ ''نہیں۔ مجھے گنیز بک آف ریکارڈز کا مالک بھی بننا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ کیا رول ہے۔ کیا رول ہے...... ابھی تو مجھے...... ایک Junkyard کیا ہے...... کباڑ کمپلیکس جانا ہے۔ یونو۔ ہا۔ ہا...... شیکسپیئر کے ڈائیلاگ جو...... Junkman بولتا ہے۔ اور وہ کمر کی خارش کرنے والا...... آلہ۔ حیرت انگیز ایجاد......'' جان پھر قہقہے لگاتا ہے۔

ایک دوسرا سینئر ایکٹر جان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے ایک طرف لے جاتا ہے۔

''ہم...... میرا خیال ہے جان یہ کچھ اچھی طرح ڈسکس کریں...... میں۔ مطلب...... پروفیسر صفدر سلطان کا رول کر رہا ہوں...... بائی داوے۔ یہ۔ خرد افروزی ہے کیا چیز......؟''

جان پھر قہقہے لگاتا ہے۔ ''اپنی رائٹر...... اس Pretty Lady سے پوچھو جو ابھی تتلی کی طرح اُڑتی پھرتی تھی...... ہا...... یا پھر...... اوہ...... لیں...... ہماری آج وہ اس شخص سے میٹنگ تو کروا رہے ہیں؟ جو ابھی آنے والا ہے...... وہ سب کچھ جانتا ہے......''

''ہاں...... سعید کمال صاحب۔ فلم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر......''

''آہ۔ Yes۔ He is the man......''

''اور پھر...... اس فلم کا نام مائی گاڈ...... یہ پاگل پن ہے...... تمہارا کیا خیال ہے ن۔ یہ فلم بزنس کرے گی......؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا...... یہ فلم نہیں بن سکتی...... اب یہ بن ہی نہیں سکتی۔ کوئی کیا کرے۔''

دونوں قہقہے لگاتے ہیں۔

''ہمارا سارا sequence تو پھر ادھر ہی ہوگا اُن خبطی کباڑیوں کے کباڑ خانے میں......؟'' فلم کا پروفیسر صفدر سلطان پوچھتا ہے۔

جان سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ ''نہیں...... سیف آئی...... آئی مین ڈائریکٹر...... بتا رہا تھا۔ بیرونی حصہ اُدھر لیں گے۔ پھر سیٹ پر چلے جائیں گے۔''

''ہاں میں نے سنا ہے۔ تہہ خانے۔ عجائب خانے کا سیٹ لگایا گیا ہے۔''

''بالکل...... میں ان دونوں کبڑے کباڑیوں سے ملا ہوں...... But I loved them...... ہا۔ ہا۔ ہا۔''

''تو تم مجھے بتاؤ گے نہیں جان کے خرد افروزی کیا چیز ہے؟''

''خرد افروزی ایک خارش ہے جو یورپ میں اٹھارویں صدی میں شروع ہوئی اور اُسے رفع کرنے کا آلہ اب کہیں آ کر تم نے ایجاد کیا ہے پروفیسر...... ہا۔ ہا۔ ہا۔''

''عجیب سکرپٹ ہے۔ حد ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کس چیز کے خلاف بات ہو رہی ہے کس کے حق میں۔''

''اور پتہ نہیں اس پر شیکسپیئر کیا کہتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ تم ملے ہو ان دونوں سے......''

''ہاں...... دیکھے ہیں...... کباڑ خانہ یا پاگل خانہ۔''

کباڑ خانے کا صحن

ایک نظر میں منظر برس ہا برس کے معمول کے مطابق نظر آتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر کاٹھ کباڑ کے مختلف ڈھیروں میں جدید سے جدید ترین الیکٹرانک آلات کی کثرت نظر آتی ہے۔ اور سب سے نمایاں تبدیلی ''جبار جمع کرنے والا'' اور ارشاد کباڑیا کے جسمانی حلیوں میں نظر آتی ہے۔ دونوں کی کمریں جھک چکی ہیں۔ ارشاد کا سر مکمل گنجا ہو چکا ہے اور چہرے پر ہر طرف گھنی سفید داڑھی اُگ آئی ہے۔ جبکہ جبار نے اپنے لمبے سفید بالوں کو مہندی سے سرخ رنگا ہوا ہے اور اس کا چہرہ ایک عجیب وحشیانہ سا تاثر دیتا ہے۔

دونوں کباڑ خانے کے پچھلے صحن میں ایک بڑی چٹائی پر قریب قریب بیٹھے ہیں۔ ارشاد نے اپنے سامنے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے لاتعداد ایڈیشنوں کا ڈھیر لگایا ہوا ہے اور اُن کی

جھاڑ پونچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں کسی خاص ترتیب میں رکھ رہا ہے۔ پاس ہی بیٹھا جبار اپنے سامنے پہلی نظر میں کچھ نا قابل شناخت چیزوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگائے بیٹھا ہے اور گنتی کر رہا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ ایک ڈھیری ٹوٹے پھوٹے موبائل فونوں کی ہے۔ دوسری موبائل فون sims کی ڈھیری ہے اور تیسری ڈھیری موبائل فون بیٹریوں کی ہے۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک سیل فون۔ براہ راست بات چیت کرنے کی بجائے فون پر ایک دوسرے سے بات کر رہے ہیں۔

جبار sims کی گنتی ختم کرتا ہے اور آہ بھرتا ہے۔ ''صرف نو سو بیالیس سمیں۔ دُور ہے ابھی ریکارڈ۔ بہت دور ہے...... رومانیہ کے بندے کے گیارہ ہزار آٹھ سو پچھتر سے کوسوں دُور ہے۔''

ارشاد اپنے سیل فون کو کان سے دباتا ہے۔ ''اونچا بول تیرے موبائیل میں کچھ پھنسا ہوا ہے کیا......؟'' ارشاد بیزاری سے کہتا ہے۔ اور جبار بلند آواز میں بولتا ہے۔

''ہیلو۔''

''ہاں۔ اب ٹھیک ہے۔ مان لے جمع کرنے والے میرے کارندے اب وہ بات نہیں رہی تجھ میں۔ بڑھاپا بڑی ظالم چیز ہے۔ اور میرے گینز کے ایڈیشن بھی کئی سالوں کے ابھی کم ہیں۔ کورین زبان کا نہیں ہے۔ نیپالی کا نہیں ہے کارندے......''

''پہلے تو اپنی زبان درست کریں ارشاد صاحب۔ ساری عمر گزر گئی یہ گندی عادت نہیں گئی آپ کی مجھے اپنا کارندہ کہنے کی۔ میں برابر کا حصے دار ہوں......'' جبار بُرا سامنہ بنا کر کہتا ہے۔

''چل ہے تُو برابر کا حصے دار۔ آگے بول...... اور یہ موبائل اپنا بدل دے۔ سامنے اس ڈھیری میں ڈال دے۔ ایک نمبر بڑھ جائے گا۔ نیا ماڈل آیا ہے۔ وہ لے لے...... کچھ ٹیکنالوجی کی سرپرستی بھی کر......''

''وہ تو پروفیسر صفدر سلطان ہی کرے گا۔'' دونوں اپنے اپنے سیل فون میں ہنستے ہیں۔

''آخ...... آخ...... آخ...... کُھم۔ کیا...... کھی......''

''باقی رہا بڑھاپا تو...... ذرا شیکسپیئر کو ٹٹولیں۔ بڑھاپے پر کیا کہتا ہے......'' جبار کے انداز میں ایک چیلنج ہے اور اُس کے سرخ بال لہراتے ہیں۔ ارشاد پر بوکھلاہٹ سی طاری ہوتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ جبار ہنستا ہے۔

''نہیں کچھ ملا نا؟ آخ۔ آخ۔ آخ...... شیکسپیئر نے بڑھاپے پر کچھ نہیں کہا۔''

''دیکھتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہوگا۔'' ارشاد تھکے ہوئے انداز میں کہتا ہے۔ ''سُن

فلم والے آج ہی آ رہے ہیں نا۔''

''نہیں کل۔ نہیں پرسوں......''

''یہ سب...... بھی دکھائیں گے۔'' سامنے پڑی ڈھیریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ''نیا کباڑ کمپلیکس ہے آخر۔''

''ہاں۔ بالکل۔ دکھائیں گے سب۔ سب دکھائیں گے۔ لیکن باہر باہر سے...... تہ خانے۔ عجائب خانے کا انہوں نے سیٹ لگانا ہے۔''

''ہوں...... جو چیزیں ادھر سے جائیں حساب رکھنا۔ تُو مجھ سے زیادہ ضعیف ہے۔ مجھے تیرا فکر ہی رہتا ہے۔''

جبار سیل فون کو پریشانی سے نظروں کے سامنے لا کر دیکھتا ہے۔

''پھر بولیں شاید سگنل Disconnect ہو رہا ہے۔'' وہ کہتا ہے۔

''نہیں تیرے کان کا مسئلہ ہے۔ ثقلِ سماعت بھی تیری بہت ہو چکی ہے۔''

جبار غصے سے بولنے لگتا ہے۔ ''نہیں۔ سُن لیا ہے۔ سُن لیا ہے۔ میں نے ارشاد صاحب...... آپ مجھ سے زیادہ بڈھے ہو۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ دیکھا ہوا ہے میں نے...... آپ کا...... اگر جعلی نہیں تو......''

''نہیں جعلی نہیں ہے۔ آگے بول......''

''آگے کیا...... اِدھر شوٹنگ ہونی ہے۔ سب کچھ تیار رکھنا پڑے گا۔'' اک دم چونکتا ہے۔ ''اوہ...... خدایا......''

''کیا ہوا؟''

جبار چاروں طرف دیکھتے ہوئے آوازیں دینے لگتا ہے۔ ''Sad.Sad.Sad.Sad......''

ٹوٹے پھوٹے وی۔ سی۔ آر، ڈی وی۔ ڈی پلیئرز کے بہت بڑے ڈھیر کے پیچھے سے ایک مریل منحنی سا کتا دم ہلاتا آہستہ آہستہ چلتا جبار کی طرف آتا ہے۔ جبار آہ بھرتا ہے۔

''......Sad. Sad. Sad بچے۔ انسانوں کی خوشیوں کی خوراک تجھے کچھ لگ نہیں رہی۔ راس نہیں آ رہی۔ Sad......''

''اس کا نام بدل دے۔'' ارشاد سیل فون میں کہتا ہے۔

''کیا......؟'' جبار اپنے فون کو دوسرے کان پر منتقل کر کے جواب دیتا ہے۔

"Mad کر دے......"

"کیا...... کیا کہا...... تا کہ اِدھر سے نکلتا ہی مارا جائے...... مجھے تو ارشاد صاحب آپ نو......"

"پتہ نہیں کیا کہہ رہا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" سیل فون بند کر دیتا ہے۔ جبار تلملاتا رہتا ہے۔ فون دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن کچھ بولتا نہیں۔ دونوں پھر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ Sad کچھ دیر اُداسی سے دونوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے پھر بیرونی دیوار میں بنے T.V فریم کے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اچانک پچھلی دیوار کے ساتھ جو تان سین بینڈ اور جم جم جم سے ملحق ہے، سجان خان اپنے شامل باجے کا منہ رکھتا ہے۔ بوڑھا سجان خان اپنا لرزتا ہوا سر باجے کے منہ کے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ناکام رہتا ہے۔ کئی کوششوں کے بعد آخر اُس کا پوپلا منہ باجے کے منہ پر فٹ ہو جاتا ہے۔ زور لگا کر آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یک دم پاں کی آواز بلند ہوتی ہے۔ جبار اور ارشاد بُری طرح ہڑبڑا کر بیٹھے بیٹھے لڑکھڑا جاتے ہیں۔ سجان خان باجے میں ہی ہنسنے اور پھر کھانسنے لگتا ہے۔

"نہیں۔ خا۔ خب۔ کھس۔ کھس۔" پھر باجے سے منہ ہٹا کر سر کے رعشے پر قابو پا کر بلند آواز میں کہتا ہے۔ "شوٹنگ والے کب آ رہے ہیں۔ کبازیو......" جبار اور ارشاد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جبار اپنا سیل فون اُٹھا کر سجان خان کو دکھا کر دائیں بائیں لہراتا ہے اور دوسرے ہاتھ کو کان کے گرد ڈُگڈگی کی طرح گھماتا ہے۔ سجان خان سمجھ جانے کے انداز میں زور زور سے سر ہلانے کی کوشش کرتا ہے اور جیب سے اپنا موبائل فون نکال کر سامنے لاتا ہے۔

"سمجھ۔ سمجھ...... کر۔ کرتا ہوں......"

جبار اپنے سیل فون پر بٹن دباتا ہے۔ سجان خان سنتا ہے۔ اور پھر بولتا ہے۔ "ہاں شوٹنگ والے کب آ رہے ہیں؟"

"کل۔ نہیں۔ پرسوں۔"

اتنے میں جم جم جم کی دیوار کے ساتھ ایک نوجوان باڈی بلڈر نمودار ہوتا ہے۔ اور دو تین تیز movements میں اپنے بازوؤں، گردن اور کمر کے مسلز دکھاتا ہے۔ پھر مُڑ کر منہ میں انگلیاں ڈال کر تیز سیٹیاں بجاتا ہے۔

جبار اور سجان خان میں ٹیلی فونی گفتگو جاری ہے۔

"ماسٹر پوچھ رہا تھا کون کون سے گانے تیار کرنے ہیں؟"

"وہ لسٹ دے گئے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب۔ ابھی تمہیں دیتا ہوں......"

"سیٹیوں کی آواز پر ارشاد کباڑیا باڈی بلڈر نوجوان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ارشاد اور جبار پھر پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر ارشاد اپنا سیل فون نوجوان کی طرف بلند کر کے لہراتا ہے۔ نوجوان ہنستا ہے۔

"سمجھ گیا انکل۔" تیزی سے اپنا سیل فون نکالتا ہے۔ بٹن دباتا ہے۔ ارشاد اٹینڈ کرتا ہے۔

"ہاں بیٹا۔"

"انکل۔ میرے ابو کہتے ہیں غریب باڈی بلڈروں کے لیے یہی جم سب سے اعلیٰ ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ ٹھیک کہتے ہیں۔ تیرے بائی سیپز کی پیائش اب کیا ہے؟"

"ہاں۔ ریہرسل جاری رکھو۔ ہاں پرانے گانے بھی۔" جبار سجان خان سے کہتا ہے۔

"ٹھیک۔ سجان خان سیل فون بند کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے اور لڑنے کی آوازیں آتی ہیں۔ Sad بوکھلایا ہوا اندر واپس آ جاتا ہے۔ اور ایک طرف بیٹھ کر ہانپنے لگتا ہے۔ جبار دُکھ سے اُس کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ارشاد کی طرف جو سیل فون پر باڈی بلڈر سے بات کر رہا ہے۔ جبار اپنے سیل فون کا بٹن دباتا ہے اور کان سے لگاتا ہے۔

"یہ پیائش تو بیٹا اب اتنی زیادہ نہیں۔ خوراک کا کچھ کر......"

جبار اپنے سیل فون پر پھر بٹن دباتا ہے۔ ارشاد سکرین دیکھتا ہے۔

"اچھا بیٹا میری ایک کال آ رہی ہے۔"

"جی۔ انکل...... نوجوان فون بند کرتا ہے۔ اور پھر مسلز کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے۔

ارشاد فون اٹینڈ کرتا ہے۔

"ہاں...... کیا ہوا...... جبار......"

جبار گہری اُداسی کی کیفیت میں۔ "مجھے ہوپ کی یاد آ رہی ہے۔"

"اوہو......" جبار کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا۔ لیکن دیکھتا ہے کہ جبار آب دیدہ ہو رہا ہے۔ ارشاد وہی کپڑا جس سے گینٹر بکس کی جھاڑ پونچھ کر رہا ہے جبار کی طرف بڑھاتا ہے۔ جبار کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اور گلوگیر لہجے میں کہتا ہے۔ "آخری دنوں میں...... تو بالکل ہی Hopeless ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں۔ پہروں کسی سوچ میں گم رہتا تھا......"

''اصل میں وہ اس وقت کا ''عظیم نجات دہندہ'' جس سے نجات پر ٹو بہت ہی خوش ہوا تھا۔ اس کی خوشی کی عظیم مٹھائی کھا کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا......''

اچانک تان سین بینڈ کی فلک شگاف دُھن سنائی دیتی ہے۔

......او۔ بڑے میاں دیوانے ایسے نہ بنو...... حسینہ کیا چاہے......

''لو۔ اتنا پرانا گانا لے بیٹھے ہیں......'' ارشاد بلند آواز سے فون میں کہتا ہے۔

''کیا کہا؟'' جبار چیخ کر پوچھتا ہے۔

آواز بلند ہے۔ دونوں کے لیے سُننا مشکل ہے۔

''کیا؟'' جبار پھر سیل فون میں چیختا ہے۔

''کچھ نہیں۔ اچھا یہ بتا۔ سُن۔ مجھے لگتا ہے یہ ہمارا ریکارڈ بن ہی جائے گا۔'' ارشاد بھی گلا پھاڑ کر کہتا ہے۔

''ہاں۔ تین ماہ دس دن ہے۔ مسلسل صرف موبائل فون پر بات کرنے کا ریکارڈ......''

''ہمیں ابھی کتنے دن ہوئے ہیں......؟''

''چار......''

پھر ایک اور دُھن...... مائی نیم از شیلا...... شیلا کی جوانی...... بجنے لگتی ہے۔ ''ہاں یہ نیا گانا ہے۔'' ارشاد کہتا ہے۔ ''اچھا سن آج اُن کی شوٹنگ شروع ہو گئی ہے؟''

جبار گھڑی دیکھتا ہے۔ ''میرا خیال ہے اس وقت ہو رہی ہو گی چوک خداداد میں۔'' وہ کہتا ہے۔ اور دونوں اپنے اپنے سیل فون بند کر کے پھر کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

....

چوک خداداد سے ملحقہ سڑک پر ایک لمبی سیاہ گاڑی رکتی ہے۔ سعید کمال اترتا ہے۔ ڈرائیور ایک بریف کیس اٹھائے اس کے پیچھے چلتا ہے۔ اُسے راستہ دکھاتا ادھر لے جاتا ہے جدھر فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ دونوں بینچ پر بیٹھے حسن کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک جاتے ہیں...... عمر اور بہت سے بیتے برسوں کے اثرات سعید کمال کے چہرے پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر وہ اب بھی ویسا ہی پروقار اور متاثر کرنے والا ہے۔ وہ اپنا چشمہ درست کرتا ہے۔

''سیکورٹی کا انتظام تو اس دفعہ کافی ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ اور حسن اُس کی طرف اچٹتی

نظر سے دیکھتا ہے۔ اُس کی نگاہ رکتی ہے اور پھر وہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ لاٹھی پر ٹکا اس کا بایاں ہاتھ اور سر لرزتے ہیں۔ اس کے چہرے اور ماتھے کی جھریاں اور بھی سکڑ کر بکھر کر ایک مہلک ہیجان کا لمحہ اس کی نظروں کے سامنے مصور کرتی ہیں۔

''اسے۔ اس۔ اس چہرے۔ چہر۔ شخص۔ یہ شخص۔ میں نے کہیں دیکھا ہے یہ شخص۔ کہاں دیکھا؟ کب دیکھا ہے؟ کیسے دیکھا ہے؟''

سعید کمال اور اس کا ڈرائیور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر عرصے بعد وہ لمحہ پھر آتا ہے۔ حسن حسن سے خالی ہو جاتا ہے۔ مگر وہ خلا ایسا ہے جیسا پہلے کبھی نہ تھا...... زرد دھوئیں کا غبار ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ مگر حسن دیکھتا ہے۔ عورتیں۔ مرد۔ چیختے روتے۔ فریاد کرتے۔ پتلونوں کے بٹن بند کرتے پولیس مین...... وہ سلاخوں میں سے دیکھتا ہے۔ وہ عورت اب سگریٹ نہیں پی رہی۔ وہ عورت کہاں ہے؟

....

سیفی اور انیلا گہری توجہ اور عقیدت جیسے انداز میں سعید کمال سے باتیں کر رہے ہیں۔

''ہاں لوئی بیوئل بنیادی ہے۔ ہم نے تو...... اُس زمانے میں...... میں پراگ سے لایا تھا ریلیں۔ (اچانک اس کی آواز میں لرزش آتی ہے) بہرحال۔ اب تو تم net پر سب کچھ دیکھ سکتے ہو۔''

''جی سر...... اس وقت سر یہ سین...... (دور اشارہ کرتی ہے) شاید اس طرف ہوا تھا وہ؟'' انیلا پوچھتی ہے۔

سعید کمال کی آنکھوں میں نمی آتی ہے۔

''بس اتفاق ہے محض ورنہ میں بھی یہاں نہ ہوتا۔ اس زمانے میں یہ سیل فون نہیں تھے۔ مجھے فون کرنا تھا۔ میرا ڈرائیور مجھے اگلے چوک ایک ایکسچینج میں لے گیا وہیں ہم نے وہ آواز سنی۔ جیسے آسمان گر پڑا ہو یا زمین پھٹ گئی ہو۔ واپس آئے تو کچھ بھی نہیں تھا۔''

چند لمحے گہری خاموشی سب پر چھا جاتی ہے۔ پھر سعید کمال تیزی سے گھڑی دیکھتا ہے۔

''ہاں...... شاید...... تو ساری کاسٹ اور کرُو سے میری میٹنگ چھ بجے ہے نا۔''

''جی سر...... بالکل...... وہ۔ ایک اور بات تھی سر...... لوگ اس فلم کے ٹائٹل کے بارے میں۔ آئی مین...... باتیں کرتے ہیں۔ سیفی ہچکچاتے ہوئے کہتا ہے۔

سعید کمال کے چہرے پر ایک تلخی کی لہر گزر جاتی ہے۔
"کرنے دو...... فلم کا ٹائیٹل یہی ہوگا...... "یہ فلم نہیں بن سکتی"۔
"But I love it......" انیلا ہنس کر کہتی ہے۔
"I love it too" سیفی کہتا ہے۔
سعید کمال مسکراتا ہے۔
"I think you should......" گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھتا ہے۔
سعید کمال کے سیل فون پر رنگ ٹون سنائی دیتی ہے۔ دیکھتا ہے۔ ایک طرف ہٹنے لگتا ہے۔ اور پھر سیفی اور انیلا سے مخاطب...... ہوتا ہے۔
"Go ahead. OK پلیز۔ شام کو ملیں گے۔"
سعید کمال ڈرائیور کے ساتھ جانے لگتا ہے۔ فون سنتا ہے۔
"ہاں۔ بلی...... میں۔ ادھر ہی ہوں...... ہا۔ ہا۔ تم ایسی لونڈی ہو۔ جس کے کئی غلام ہیں۔ میں آرہا ہوں۔"
فون بند کرتا ہے۔ اور پارک سے باہر جانے کے لیے گزرتے ہوئے اچانک اس کی نظر مرغیوں کا گوشت بیچنے والے کی میز پر پڑتی ہے اور وہ ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ یہ ایک بڑی مگر ٹوٹی پھوٹی گول میز ہے۔ مرغیاں بیچنے والا۔ بے تکان ایک رفتار سے مرغیوں کی گردنیں۔ ٹانگیں۔ سر۔ بازوؤں سینے کاٹتا چلا جا رہا ہے۔
سعید کمال چہرے پر تحیر کے تاثرات لیے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور تحیر حسن میں بھی ہے۔ اور حسن تحیر میں ہے کہ وہ پیلی دُھند سے گزرتے اُس شخص کو پھر دیکھتا ہے جو شاید پیچھے کسی میز پر کٹتی ہوئی مرغیوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ کہاں دیکھ رہا ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟ میں نے اُسے دیکھا ہے......................................

بونا اور عورت قریب کھڑے ہیں۔ "سر میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ بھی فلم یونٹ میں ہیں۔ وہ سب ہمارے ساتھ ہی ہیں ہمارے تھیٹر میں ٹینٹ میں...... میلہ زوروں پر ہے۔"
اور پھر وہ سب واپس آتے ہیں۔ زرد غبار میں گم سورج مکھی کے لاکھوں پھول۔
ایک لرزہ تلووں سے تالو تک حسن کے جسم کے ہر ریشے میں سے تھرتھراتا گزرتا ہے۔
"میلہ...... زوروں پر ہے۔" اُس کے ہونٹ لرزتے ہیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھتا

ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر پھر وہی الفاظ کانپتے ہیں اور خفیف سی مسکراہٹ آتی ہے۔ وہ جانتا ہے وہ کہاں جائے گا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔
بینچ پر پاس بیٹھا نوجوان تشویش کی ایک نگاہ اُس کانپتے لڑکھڑاتے بوڑھے پر ڈالتا ہے اور زور سے آواز دیتا ہے۔
"بابا جی لاٹھی تو لے جائیں۔" اور پھر وہ خود ہی تیزی سے اُٹھ کر لاٹھی اُسے تھما دیتا ہے اور تیزی سے واپس بینچ پر بیٹھ کر اُس طرف دیکھتا ہے۔ جدھر فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔
پولیس نے تماش بین ہجوم کو اب قابو کر لیا ہے اور وہ دیکھ سکتا ہے۔
چوک خدا داد میں ایکٹر مٹھائی کے ڈبے پکڑے کھڑے ہیں۔ کیمرہ مین اپنے اینگل پر کھڑا ہے۔
سیفی انیلا کی طرف دیکھتا ہے اور بلند آواز میں بولتا ہے۔ "On your Marks۔ لائیٹس۔ کیمرہ۔ ایکشن۔"
سین ون ٹیک ون۔ clapperboard والا لڑکا بورڈ کو کیمرے کے سامنے لا کر clap کرتا ہے۔

....

پرتعیش ڈرائنگ روم میں بلی اور سعید کمال۔ صفدر سلطان آتا ہے، پہچاننا مشکل ہے ہاتھ میں ایک صفائی کرنے جھاڑ پونچھ کرنے والا کپڑا۔ سامنے سے میز صاف کرتا ہے۔ ادھر اُدھر جھاڑ پونچھ کرتا ہے اور سلام کر کے چلا جاتا ہے۔
سعید کمال حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر بلی کی طرف۔ بلی ہنستی ہے۔ عمر اس پر نمایاں ہے لیکن دلکشی اب بھی باقی ہے۔
"لونڈی صرف ان پر ظلم کرتی ہے مالک...... جو خود اپنے اوپر ظلم کرنا چاہتے ہیں۔"
"میں جانتا ہوں...... لونڈی...... مردوں کی سیانی بلی......"
دونوں ہنستے ہیں۔ ایک خوبصورت جوان عورت چائے کے برتن لاتی ہے۔
سعید کمال کے سیل فون پر کال آتی ہے۔ اٹینڈ کرتا ہے۔
"آ۔ ہیلو۔ سائرہ۔ آ۔ نہیں ڈیئر۔ آج شام ملاقات نہیں ہو سکتی۔ آئی۔ ایم۔ ساری۔ Really Sorry۔ میری فلم کی شوٹنگ آج شروع ہوئی ہے۔ کاسٹ سے میٹنگ ہے

شام کو۔" (ہنستا ہے)۔

ببلی گہری نظروں اور عجیب سی مسکراہٹ سے اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

"ہاں۔ سائرہ...... وہی "یہ فلم نہیں بن سکتی" ہاں یہ پاگلانہ نام ہے۔ آج نہیں پلیز...... Take care۔" سیل فون بند کرتا ہے۔

ببلی چائے بناتی ہے۔ کپ سعید کمال کے سامنے رکھتی ہے۔

"لونڈی یہ کہے گی مالک کہ اب تو آپ کا انکار بنتا بھی ہے۔ مطلب اس عمر میں......"

دونوں ہنستے ہیں۔

"کیا مطلب تمہارا۔ اس عمر...... میں اب بھی ویسا ہی ہوں......"

"جی مالک......"

سعید کمال چند لمحے غور سے ببلی کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر گہرے رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے۔

"ایک بات تمہیں بتاؤں ببلی۔"

"جی مالک۔ جی...... میرے لائق کوئی حکم ہے؟......"

"نہیں۔ حکم میرا اپنا ہے۔ میرے اپنے لیے......"

"لونڈی کچھ نہیں......"

سعید کمال ہنستا ہے۔ "سنو۔ اگر ہم لوگ پھر کسی بارود میں غائب نہ ہو گئے تو اگلی فلم میں تم پر بناؤں گا......"

ببلی کی آنکھیں اور منہ حیرت سے کھل جاتے ہیں۔ پھر تیزی سے اُٹھ کر سعید کمال کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے۔

"مالک۔ مالک۔ یہ۔ یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے مالک۔ لونڈی خوشی سے مر جائے گی۔"

سعید کمال ببلی کو بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھاتا ہے۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ببلی کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔

"You know لونڈی۔ تم دنیا میں اپنی قسم کی بس ایک ہی ہو......"

گورکن حسن کو سہارا دے کر اس کے ہم نام کی قبر کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیتا ہے۔ اور گہری تشویش سے سوچتا ہے کہ اس قبر پر آنے والا، برسوں برسوں سے آنے والا یہ بوڑھا پہلے کبھی ایسے نہ آیا تھا۔ وہ اُسے اپنی صراحی سے پانی پلاتا ہے۔ حسن قبر کے مرکز میں بنی مٹی سے بھری چوڑی کیاری میں اُگے ہر عمر کے پودوں کو دیکھتا ہے۔ اور سیدھا سورج مکھی کے دل میں اتر جاتا ہے۔ پھر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سانس رک نہیں رہا سکون میں جا رہا ہے۔ دل بند نہیں ہو رہا آرام میں آ رہا ہے...... وہ سورج مکھی کے گھنے کھیتوں سے نکلتا ہے اور میلہ دیکھتا ہے۔ حسن میلہ دیکھتا ہے۔ میلہ زوروں پر ہے......

سورج مکھی کے کھیت میں برہنہ کھڑی عورت اب لباس میں ہے اور ناچتی ہے۔ بونا اس کی کمر کے گرد ایک لمبا گلابی دوپٹہ لپیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ بونا ناچتا ہے۔ عورت ناچتی ہے۔

تانگہ لاہوری میرا...... گھوڑا پشوری میرا

"نور خان تم ڈر رہے ہو۔ دیکھو میں بالکل نہیں ڈر رہا۔ بالکل نہیں۔ یہ سو کا نیکٹ مجھے دو......" حسن ہنس کر کہتا ہے۔ رقص کرتی عورت کا چہرہ حسن کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ وہ اُس کے ہاتھ میں دبے کرنسی نوٹ کی طرف منہ بڑھاتی ہے اور دانتوں سے اُچک لیتی ہے۔ اُس کی بھوری حسین آنکھیں حسن کی آنکھوں میں گہری اُتر جاتی ہیں اور حسن ہنس پڑتا ہے۔

"ہے کوئی مائی کا لال جو بے بی جان کی جگہ میرے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھے اور موت کا نظارہ کرے۔ سو روپے انعام۔"

"میں کروں گا۔" حسن کہتا ہے۔

موٹر سائیکل طوفانی رفتار سے لکڑی کے تختوں سے چپکی اوپر اوپر اٹھتی چلی جاتی ہے۔ "کیا میں گر جاؤں گا۔ مر جاؤں گا۔" حسن قہقہے لگاتا ہے۔ "جینا، گرنا، مرنا سب ایک ہی بات ہے۔"

موٹر سائیکل کان پھاڑ دینے والی آواز سے موت کے کنوئیں میں گھومتی اوپر کے کنارے تک پہنچ جاتی ہے۔ لوگوں کی حیرت سے پھٹی آنکھیں اُسے دیکھتی ہیں۔

"نور خان دیکھو میں اُڑ رہا ہوں......" حسن کہتا ہے اور ہم نام کی قبر کے ساتھ گرا بیٹھا حسن...... ہنستا ہے۔

مگر اُس کی ہنسی بس اُس کے جسم کی ہلکی سی لرزش ہے چہرے پر پھیلی ہلکی سی نرماہٹ ہے اور کھلے ہونٹوں کی کپکپاہٹ ہے۔ وہ آئینوں میں حسن ہی حسن دیکھتا ہے۔ سورج مکھی کے لاکھوں پھول جو سورج کو تکتے ہیں۔ ''اور وہ بھی جو نہیں تکتے؟'' حسن حسن کو سنتا ہے حسن حسن کو دیکھتا ہے اور اپنا بازو قبر کے ساتھ لمبا پھیلا دیتا ہے۔ اور آہستہ بہت آہستہ اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور حسن گاتا ہے۔

BA BA BLACK SHEEP
HAVE YOU ANY WOOL
YES SIR YES SIR
THREE BAGS FULL
ONE FOR THE MASTER
ONE FOR THE DAME
ONE FOR THE LITTLE BOY
WHO LIVES DOWN THE LANE

چھوٹا لڑکا جو آگے کہیں گلی میں رہتا ہے۔ حسن اپنی آواز سنتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے۔ گلی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دُور۔ دُور۔ دُور۔ دُور۔ چھوٹا لڑکا کہاں رہتا ہے۔ وہ نہیں جان پاتا۔ اور گلی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سورج مکھی کا پھول ہوا میں بکھرتا ہے اور پیلی پتیاں ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔

....

17-03-2014
24-02-2015